

العواصم من القواصم اور المنتقى سے اہم ترین حواشی اور تخریج حدیث کے ساتھ

مِنْهَا مَسَاجِدُ السُّنَّةِ

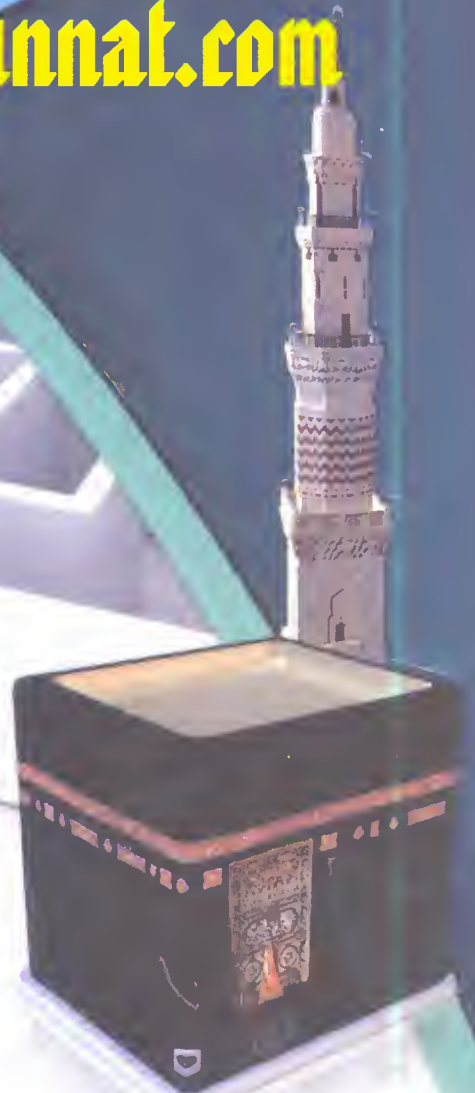
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

www.KitaboSunnat.com

جلد اول

اختصار و ترجمہ و تعلیقات و حواشی

پیرزادہ شفیق الرحمن شاہ الراوی



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

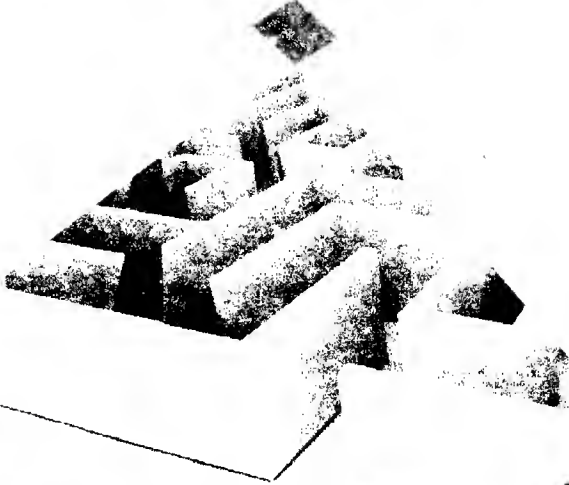
www.KitaboSunnat.com

العواصم من القواصم اور المنتقى سے اہم ترین حواشی کے ساتھ

مِنْهَاجُ السُّنَّةِ

مکمل تخریجِ حدیث اور معتبر اہل کتب سے مفید حواشی کے ساتھ

جلد دوم



تصنیف

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ

اختصار و ترجمہ و تعلیقات و حواشی

پیر زادہ رفیق الرحمن شاہ الداوی رحمہ اللہ

www.KitaboSunnat.com

الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور
+92 321 42 10 145

دار المعرفۃ
پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ادارہ تمام کتب معاشرتی اصلاح و تربیت اور نیک نیتی سے شائع کرتا ہے، البتہ مصنف و مترجم کی آراء سے ادارے کا متعلق ہونا ضروری نہیں، تاہم فنی و طباعتی غرائب کی صورت میں کتاب کسی بھی وقت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ (ادارہ)

منہاج النبویہ

اختصار و ترجمہ و تعلیقات و حواشی

سید زلالہ شفیق الرحمن شاہ الدراوی

تصنیف

شیخ الاسلام ابن تیمیہ

- دار القبس للنشر والتوزيع | شارع امير سبطام، البديعة، الرياض. ت: ۳۶۸۱۰۴۵، ف: ۴۳۵۱۲۹۵
- دار العلوم النديه للنشر والتوزيع شارع باخشب جده ۳ س ت: ۰۱۰۲۰۴۸۷۶، ۰۱۰۲۰۴۸۷۶، ۰۲۶۳۳۶۶۴۰
- المكتب الرئيسي الرياض، حي الفيصلية | هاتف: ۰۱۲۴۲۳۱۲۶
- مكتبة دار الفرقان، الرياض | هاتف: ۰۱-۴۳۵۸۶۴۶، ۰۱-۶۴۷۳۶، ۰۵۰۷۴۱۹۹۲۱، ۰۵۰۶۳۰۶۴۷۳۶
- مكتبة بيت السلام، الرياض | جوال: ۰۵۳۲۶۶۶۶۴۰
- مكتبة دار الكتاب والسنة، الرياض | جوال: ۰۵۵۵۲۸۱۵۳۷

- مكتبة الكتاب..... حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321 42 10 145
- جامعہ احیاء العلوم لہنات الاسلام، مظفر آباد آزاد کشمیر فون: 0301 53 65 383

- اسلامی اکیڈمی..... الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042 373 57 587
- کتاب سرائے..... الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون: 042 373 20 318
- نعمانی کتب خانہ..... حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 042 373 21 865
- مکتبہ اسلامیہ..... غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 042 372 44 973
- دارالکتب الشافیہ..... اقراسٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون: 042 373 61 505
- مکتبہ قدوسیہ..... غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321 40 45 775
- الحرم پبلیکیشنز..... اقراسٹر، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون: 0322 48 14 274

021-32212991: فضلی بکس

کراچی

0321 53 36 844 دار النور

021-32628939: علی کتاب گھر

051 355 35 168 تجلیات طیبہ

052-34591911: مکتبہ رحمانیہ

سیالکوٹ

051 322 61 356 المسعود اسلامک بکس

0321-5075075: مکتبہ عالم

فیصل آباد

0300-322-4814274: الحرم (اسلامک بکس)

راولپنڈی

افضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

+92 321 42 10 145

دار المعرفۃ

پاکستان

فہرست موضوعات

91	[شورائے عمر رضی اللہ عنہم]	7	فصل: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزامات
92	[صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلافات]	11	[سلسلہ جوابات]
93	[حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری]	19	فصل: [نبی کریم ﷺ کے بعد معصوم ہونے کا اعتقاد]
94	[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا واقعہ]	21	[اسباب مغفرت]
95	[حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت]	29	حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب
95	[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اختلاف]	31	معائب صحابہ حسد یا کذب پر مبنی ہیں
97	[شہرستانی پر اعتراض]	34	[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام خط کا مسئلہ]
98	شیعہ کا طرز فکر و عمل	38	[أقرباء پروری کی حقیقت کیا ہے]
100	تیسری فصل: امامت علی رضی اللہ عنہ کے دلائل	40	[حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ]
104	[اپنے آپ سے سوال]	42	[حضرت عمار اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما]
108	روافض و نصاریٰ کی مشابہت	43	[ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پٹائی کا واقعہ]
109	معصومیت امر کا مسئلہ	46	[حدود و تعزیر اور مصائب گناہوں کا کفارہ ہیں]
115	رافضی جہالت کا ثبوت	48	[حکم بن العاص کی جلاوطنی کی حقیقت]
126	[رافضیت کا بانی کون؟]	49	[جلاوطنی کے مستحق کون؟]
128	[دوسرے مقدمہ پر رد]	53	[حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری کی حقیقت]
131	[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت]	55	حدود الہی کی پامالی کا الزام اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ
132	[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نص امامت؟]	57	[حکمران کے قاتل کی سزا]
134	فصل: [امام کا تقرر کیسے ہوگا؟]	60	[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ہرمزان کا قصاص]
135	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت	62	[ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد]
138	جزئیات کی تخصیص ممکن نہیں	63	[عہد عثمانی اور اذان کا اضافہ]
142	فصل: امام معصوم کا تصور اور فہم کتاب و سنت	66	[کیا مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے؟]
146	امام معصوم کا تعین قدرت الہی کی دلیل؟	68	فصل: [مسلمانوں کے مابین اختلافات]
152	[عصمت امام کی ایک اور اندھی بہری دلیل]	74	جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قصہ
153	[رافضی مصنف کے بودے دلائل]	78	[رسالت مآب ﷺ کی وفات میں اختلاف]
156	[اسماعیلیہ اور نصیریہ کی گمراہی کی وجہ]	78	[امامت میں اختلاف]
160	[متنازعہ آیت کی صحیح تفسیر]	87	[وراثت فک میں اختلاف]
162	حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مخالفین پر کامیابی؟	89	[مکرین زکوٰۃ سے جنگ اور شیعہ کا اعتراض]
164	[من گھڑت روایت کا پس پردہ محرک]	90	[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تعین بطور خلیفہ]

246	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھارہویں دلیل	165	✽ [اہل اسلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کا الزام]
250	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل	167	✽ [موالات (دوستی) کی حقیقت]
252	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی بیسویں دلیل	168	✽ [دلی اور ستولی میں فرق]
254	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اکیسویں دلیل	170	✽ امام علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دوسری دلیل
261	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی بائیسویں دلیل	171	✽ محدثین کرام اور ان کی خدمات جلیلہ
263	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھبیسویں دلیل	175	✽ بے بنیاد روایات
267	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چوبیسویں دلیل	181	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری دلیل
273	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی پچیسویں دلیل	184	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی دلیل
278	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھیسیویں دلیل	188	✽ [روایت کی حقیقت]
281	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی ستائیسویں دلیل	190	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں دلیل
282	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھائیسویں دلیل	191	✽ آیت تطہیر سے شیعہ کا استدلال
287	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل	193	✽ [ارادہ الہی کی اقسام]
289	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل	196	✽ آیت تطہیر اور شیعہ دعویٰ کی حقیقت
291	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اکتیسویں دلیل	201	✽ [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دعویٰ امامت؟]
293	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی بیستویں دلیل	203	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی دلیل
295	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی تینتیسویں دلیل	207	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں دلیل
299	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چونتیسویں دلیل	211	✽ ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ سے استدلال
300	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی پینتیسویں دلیل	212	✽ جمیع صحابہ واجب الاحترام ہیں
304	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھتیسویں دلیل	217	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں دلیل
305	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی سینتیسویں دلیل	219	✽ واقعہ ہجرت
308	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اڑتیسویں دلیل	223	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی نویں دلیل
313	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی اثنائیسویں دلیل	226	✽ آیت مباہلہ سے استدلال
315	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چالیسویں دلیل	228	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں دلیل
319	✽ فصل: امامت علی رضی اللہ عنہ پر احادیث نبویہ سے استدلال	229	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں دلیل
319	✽ [سلسلہ اشکالات] پہلی حدیث	232	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی بارہویں دلیل
324	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث	234	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیرہویں دلیل
332	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری حدیث	236	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چودھویں دلیل
334	✽ حدیث اختلاف کی توضیح	238	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی پندرہویں دلیل
342	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی حدیث	241	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی سولہویں دلیل
350	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں حدیث	244	✽ امامت علی رضی اللہ عنہ کی سترہویں دلیل

- 424 353 امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی حدیث [حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ اور کلام رافضی]
- 424 356 امامت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں حدیث [ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کی شاگردی رضی اللہ عنہ]
- 425 359 امامت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم کلام]
- 426 369 امامت علی رضی اللہ عنہ کی نویں حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تفسیر]
- 427 374 امامت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تصوف]
- 429 377 امامت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فصاحت و بلاغت]
- 431 380 امامت علی رضی اللہ عنہ کی بارہویں حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آسمانی راستہ کا علم]
- 432 381 شیعہ مرویات ناقابل اعتماد [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ مرجع صحابہ؟]
- 433 385 ائمہ سے متعلق شیعہ کے بلند باگ و دعویٰ [حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رد]
- 434 386 [قبول احادیث کا وجوب] [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری]
- 436 392 [فصل: احوال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے امامت پر استدلال] [وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق رضی اللہ عنہ کے کارنامے]
- 439 395 [حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صلہ رحمی] [فصل: حقیقت شجاعت]
- 441 396 [حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل] [فصل: شمشیر علی رضی اللہ عنہ اور ارکان اسلام کی مضبوطی]
- 441 397 [حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زہد و تقویٰ] [فصل: عدم فراغ علی رضی اللہ عنہ]
- 444 400 [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مقتولین بدر] [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے قاضی؟]
- 445 401 [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت] [غزوہ اُحُد و شیعہ کے افتراء پر دازی]
- 448 404 [حضرت علی رضی اللہ عنہ أعلم الناس تھے] [غزوہ اُحُد اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 451 405 [فصل: فضائل شیخین] [فصل: غزوہ بنی نضیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 453 412 [حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑے قاضی؟] [فصل: غزوہ سلسلہ]
- 455 413 [حدیث "أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ" کی حیثیت] [غزوہ بنی مصطلق اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 456 415 [خلفاء اربعہ کے مسائل و فتاویٰ میں موازنہ] [فصل: غزوہ خیبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 458 416 [نیوش پر گوش علی رضی اللہ عنہ] [فصل: غزوہ حنین اور ہمسائے حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 460 416 [فطانت علی رضی اللہ عنہ] [فصل: غیبی خبریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 467 418 [فصل: یحییٰ کا علم] [حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات]
- 470 419 [فصل: علوم علی رضی اللہ عنہ سے استفادہ] [فصل: جنگ صفین]
- 472 420 [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم نحو] [حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنات سے جنگ]
- 473 420 [فصل: فقہاء کی مراجعت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ] [فصل: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رجوع آفتاب]
- 475 421 [فصل: امام مالک اور علوم علی رضی اللہ عنہ] [کوفہ کا سیلاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 477 421 [امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی شاگردی] [فصل: سانپ کا واقعہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]
- 479 422 [امام شافعی رضی اللہ عنہ اور محمد بن حسن رضی اللہ عنہ کی شاگردی] [چوتھی فصل: ائمہ اشاعہ عشرہ کی امامت کا اثبات]

547	واقعہ غار کی فضیلت: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾	483	فصل: [خروج مہدی]
549	[صحابی کی تعریف]	485	فصل: [امام معصوم کا وجوب]
550	[ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مشاورت رسول اللہ ﷺ]	487	فصل: [فضائل سے امامت پر استدلال]
551	[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت گزاری]	488	فصل پنجم: شیعہ کی دروغ گوئی اور اصحاب ثلاثہ
553	فضائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ	489	[قول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور استدلال باطل]
559	زیر تبصرہ آیت کی مزید توضیح	496	فصل: [بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور شیعہ اعتراض]
560	مغل بادشاہ خدا بندہ کا عجیب قصہ	497	فصل: [خلفاء ثلاثہ پر کم علمی کا بہتان]
561	رفاقت نبوت و صداقت اور رافضی حسد	499	فصل: [اصحاب ثلاثہ کے واقعات]
562	سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت	500	فصل: [شیعہ کا اعتراض: خلفائے ثلاثہ کا فرقتے.....]
564	[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بے صبری کی تہمت]	502	فصل: [قول ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غلط استدلال]
565	غم و حزن ناقص ایمان نہیں	503	فصل: [خلافت میں انصار کا حصہ]
569	حزن و ملال ایمان کے منافی نہیں	504	سیدہ فاطمہ کی خانہ تلاشی کا واقعہ
573	[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بے یقینی کی تہمت]	505	فصل: [جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ]
573	فصل: [غم کا محال ہونا؟]	506	فصل: [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ولایت منصب]
577	فصل: [روافضی کی کج فہمی]	507	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت حج کا واقعہ
584	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یقین و ثبات	509	[امام کی ذمہ داری اور شیعیت]
587	﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ اور رافضی استدلال	510	فصل: [حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول.....]
593	﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ﴾ سے شیعہ کا استدلال	512	لشیعہ کے نزدیک نماز تراویح بدعت
597	[زیر تبصرہ آیت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]	517	فصل: [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات]
602	جہاد سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فرار؟	520	چھٹی فصل: امامت و خلافت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
606	فصل: [احوال ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جھوٹا دعویٰ]	520	[اجماع پر رد؟]
608	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ معلیٰ؟	524	بنو حنیفہ کا ارتداد اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
609	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ سلائی؟	526	[مرتدین کے خلاف جنگ اور موقف فاروقی]
612	[ابوبکر رضی اللہ عنہ پر عدم اتفاق کا الزام]	530	[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ]
612	[ابوبکر رضی اللہ عنہ کا افلاس؟]	531	[انفرادی اختلاف اور خلافت]
613	[صدقات ابوبکر رضی اللہ عنہ]	533	حجیت اجماع کی بحث
614	فصل: [حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کا جواب]	539	اجماع پر شیعہ کے اعتراضات
619	امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ اور بشارت نبوت	542	فصل: [شیعہ اقتداء شیخین رضی اللہ عنہما کے منکر]
621	[خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ارشاد نبوت]	544	فصل: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رافضی اعتراضات
		546	جوابات

فصل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزامات ۱

[اعتراضات]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”جہاں تک عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے اس نے نا اہل لوگوں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے تھے۔ ان میں سے بعض خائن و فاسق بھی تھے۔ اپنے اقارب کو ولایات عطا کیں۔ اور کئی بار کے عتاب کے باوجود اس سے باز نہ رہے۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کیا اس نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی۔ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ ۲ کو کوفہ کا والی مقرر کیا اس نے وہاں ایسے کام کیے جن کی بنا پر اسے کوفہ سے نکال دیا گیا۔ بلاد مصر میں عبد اللہ بن

۱ اعداء صحابہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا ہے قاضی ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ نے ان کا نام تو اصرم رکھا ہے۔ اور ہر ”قاصمہ“ کا جواب کتاب دست کے دلائل و براہین سے ”عاصمہ“ کے نام سے دیا ہے اس مجموعے کا نام ”العواصم من العوامم“ ہے جس پر علامہ محبت الدین رحمہ اللہ نے بڑے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ صحابہ کے لغض و عناد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ اعداء صحابہ نے اپنی تصانیف کو جھوٹ کا پلندہ بنا دیا تھا۔ یہ جھوٹ لوگوں میں خوب پھیلتا رہا اور بعض مسلمان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بدول ہونے لگے قاضی ابن العربی رحمہ اللہ کی اس قابل قدر تصنیف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق کا بول بالا کیا اور لوگ بڑی حد تک مستفید ہوئے۔ واللہ الحمد۔

۲ سیدنا سعید بن عاص رضی اللہ عنہ قریش میں سے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن کریم لکھوانا شروع کیا تو سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس کی عبارت درست کی، کیوں کہ سعید کا لہجہ نبی کریم ﷺ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ سعید اس حد تک مخلص مسلمان تھے کہ جب ایک مرتبہ سیدنا عمرؓ نے کہا کہ: ”میں نے تمہارے والد کو قتل نہیں کیا، بلکہ اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا تھا۔“ اس کے جواب میں سعید نے کہا: ”اگر آپ قتل بھی کرتے تو آپ حق پر ہوتے اور وہ باطل پر۔“ سعید بن عاص نے طبرستان کا علاقہ فتح کیا اور جرجان پر بھی چڑھائی کی تھی۔ آپ کی فوج میں سیدنا حذیفہ اور دیگر کبار صحابہ شامل تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت دھاری دار چادر لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ یہ چادر اس شخص کو دوں گی جو عرب بھر میں سب سے زیادہ باعزت ہو۔ آپ نے فرمایا، اس لڑکے کو دے دو۔“ (الاصباہ ۴۸/۲) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۳۴/۶)۔ وہ لڑکانہی گرامی مجاہد و فاتح سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھا۔ جس کے بارے میں رافضی نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کی ہے کہ انھوں نے اسے کوفہ کا والی مقرر کیا۔ اگر قرآن کی عربیت کی تصحیح شیعہ کے نزدیک قابل فخر کارنامہ نہیں ہے تو نبی کریم ﷺ کا سیدنا سعید رضی اللہ عنہ کو اکرم العرب قرار دینا یقیناً دین و دنیا میں باعث فخر ہے۔ سیدنا سعید رضی اللہ عنہ میں صرف ایک ہی عیب پایا گیا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے طبرستان کو فتح کیا اور کبار صحابہ نے اس کے قاتل کی حیثیت سے جرجان پر حملہ کر کے اہل ایران کو مجوسیت سے نکال کر دین اسلام سے روشناس کرایا۔ سیدنا سعید کی مرویات صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں موجود ہیں۔ محدث طبرانی بطریق محمد بن قانع بن جبر بن مطعم وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سعید بن عاص کی عیادت کرتے دیکھا۔ آپ ایک کپڑے کو گرم کر کے سعید کو گوار کر رہے تھے۔ (الاصباہ ۴۸/۲)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے دادا سے متعلق ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اکرم العرب ہے، اعلام نبوت میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کو نور وحی کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ سعید رضی اللہ عنہ بہت بڑے فاتح ہوں گے اور اسی طرح اکرم العرب قرار پائیں گے۔ ابن ابی شیبہ بطریق یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ محمد بن عثیم بن ابی طالب رحمہ اللہ اپنے والد کے پاس آئے اور پوچھا سب لوگوں میں سے افضل کون ہے؟ فرمایا: میں امیر ابھائی۔ ”سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”سعید بن عاص رضی اللہ عنہ قریش کے نور نظر ہیں۔“

سعید بن عاص رضی اللہ عنہ بڑے سخی تھے۔ جب سائل کوئی چیز مانگتا اور آپ کے پاس موجود نہ ہوتی تو اسے لکھ کر دے دیتے کہ میں فلاں چیز تجھے دے دوں گا۔ جب فوت ہوئے تو ان پر اسی ہزار دینار قرض تھا جو ان کے بیٹے عمرؓ نے ادا کیا۔ صحابہ بن کيسان روایت کرتے ہیں کہ سعید رضی اللہ عنہ بڑے با وقار اور متحمل مزاج تھے، جب کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرتے تو اس کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا قول ہے: ”دل کی حالت بدلتی رہتی ہے، یہ موزوں نہیں کہ آدمی ایک چیز کی آج تعریف کرے اور کل اسی کی مذمت کرنے لگے۔“

یہ ہیں سیدنا سعید بن عاص اموی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب جن کے بارے میں رافضی امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو مطعون کرتا ہے کہ انھوں نے سعید کو والی کوفہ مقرر کیا۔

ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ^۱ کو حاکم مقرر کیا جہاں اس نے بہت مظالم ڈھائے۔ لوگوں نے جب اسکی شکایت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوشیدہ طور پر اسے لکھا کہ وہ اپنے عہدے پر ڈٹا رہے۔ یہ اس کھلے خط کے خلاف تھا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ اور حکم دیا کہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے۔^۲ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر بلاد شام مقرر کیا جہاں اس نے کئی طرح کے فتنے پیا کیے۔ حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی مقرر کیا جہاں اس نے بہت برے کام

۱ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے صحابی ہیں۔ یہ سیدنا عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ فتح مکہ کے روز سیدنا عثمان نے جب ان کے لیے پناہ طلب کی تو نبی کریم ﷺ نے ان کو پناہ دے دی۔ یہ مخلص مسلمان اور عظیم مجاہد و فاتح تھے۔ جب ملک مصر دین اسلام کے حلقہ میں داخل ہوا تو ابن ابی سرح ان مجاہدین صحابہ کے سرخیل تھے۔ جن کو مصر فتح کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہاد مصر میں یہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کے دائیں بازو میں تھے اور بڑے کارہنما بنائے انجام دیے۔ ابن سعد نے طبقات میں ابن ابی سرح کا ذکر ان صحابہ میں کیا ہے جنہوں نے مصر میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ حافظ ابن جریر نے الاصابہ (۳۱۷/۲) میں البرقی کی تاریخ سے روایت ابی صالح کا تب لیث بن سعد امام مصر سیدنا لیث بن سعد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”خلافت فاروقی میں ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ علاقہ الصعيد کے حاکم تھے۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو آپ نے مصر کا سب علاقہ ان کو تفویض کر دیا۔ مصر کے عظیم امام و فاضل سیدنا لیث بن سعد کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رواض نے ابن ابی سرح پر کس قدر جھوٹ باندھا ہے۔ ۲۵ھ میں ابن ابی سرح پورے مصر کے حاکم اعلیٰ تھے۔ ۲۷ھ میں پورا افریقہ فتح ہو گیا۔ یہ عظیم ترین فتح تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی، مال غنیمت کی یہ فراوانی تھی کہ ایک سوار کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے۔ چاروں عبادلہ (عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر، عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص و جندبہ بن جندبہ) جلالت قدر کے باوصف ابن ابی سرح کے زیر قیادت تھے۔ شمالی افریقہ فتح ہونے کے بعد بھی ابن ابی سرح نے ۳۱ھ تک جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۳۴ھ میں ذات السواری پر چڑھائی کی۔ اسی دوران باغیوں نے سیدنا عثمان کے خلاف خروج کیا۔ ابن ابی سرح نے سیدنا عثمان کو لکھ کر امداد کی پیشکش کی اور براست عریش و عقبہ مدینہ پہنچنے کی اجازت چاہی۔ سائب بن ہشام بن عمیر کو حاکم مقرر کیا۔ ابھی مدینہ نہیں پہنچے تھے کہ ابن ابی سرح کو سیدنا عثمان کی شہادت کی خبر پہنچی اور آپ مصر لوٹ آئے۔ مصر پر ابن ابی حذیفہ نے قبضہ جمایا تھا۔ اس نے ابن ابی سرح کو حد و دھم میں داخل ہونے سے روکا، چنانچہ آپ فلسطین چلے گئے اور عسقلان و رملہ کے درمیان سکونت اختیار کی۔ ۵۷ھ تک فلسطین میں گوشہ نشین رہے۔

بغوی نے مسند صحیح یزید بن ابی سرح سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابن ابی سرح مقام رملہ کی طرف چل دیے، جب صبح ہوئی تو کہا: ”اے اللہ! اس صبح کو میرا آخری عمل بنادے۔“ پھر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ پھر دائیں جانب سے سلام پھیرا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرنے لگے تو ان کی روح نقص عنصری سے پرواز کر گئی۔“ اسد الغابہ (۲/۲۶۴)۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت اسی سند سے ذکر کی ہے۔ تاریخ کبیر (۵/۲۹) مختصراً۔

۲ العواصم من القواصم ص ۱۰۹-۱۱۰، نیز (۱۲۹-۱۲۶) کے حواشی پر اس خط کے بارے میں علمی تحقیق ہے جو بقول شیخ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا مروان نے ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام ارسال کیا تھا۔ نیز سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اظہار حیرت کرنے پر گفتگو کی ہے کہ عراقی فتنہ پرداز اور مصر کے شریر لوگ مختلف راستوں سے بیک وقت مدینہ پہنچ گئے جیسے پہلے انھوں نے یہ بات طے کر رکھی ہو، حالانکہ عراق والوں کو مطلقاً اس خط کا علم نہ تھا جو اہل مصر نے حال خط سے لے لیا تھا۔ جب سیدنا علی نے اس پر اظہار تعجب کیا تو اہل عراق نے کہا: ”کیا آپ نے ہمیں تحریر نہیں کیا تھا۔ کہ واپس مدینہ آ جاؤ۔“ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا کہ انھیں اس خط کا کوئی علم نہیں۔“ مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کا مظہر ہے کہ دو جعلی خط تحریر کیے گئے تھے۔ ایک سیدنا علی کی جانب سے اہل عراق کے نام اور دوسرا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اہل مصر کی طرف۔ یہ بات عقل و قیاس کے منافی ہے کہ یہ خط سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا مروان نے ابن ابی سرح کے نام لکھا۔ خصوصاً جب کہ انھیں معلوم تھا کہ اس نے مدینہ حاضر ہونے کی اجازت چاہی ہے اور وہ اس وقت فلسطین اور مدینہ کے درمیان غالباً عقبہ کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جب ابن ابی سرح مصر میں موجود ہی نہیں تھے۔ تو یہ خط ان کی جانب مصر کیوں کر بھیجا گیا؟

فتنہ ہامانی کے دور کی تاریخ لکھنے والے مصنفین اس حقیقت سے مطلع نہ ہو سکے کہ جب عراق و مصر کے انقلابی مدینہ سے چلے گئے تھے تو انقلاب کے دور عظیم لیڈر اور سیدنا عثمان کے شدید مخالف یعنی اشتر جنحی و حکیم بن جلدہ مدینہ سے نہیں گئے تھے۔ مدینہ قیام پذیر رہنے سے ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ جس مشن کے لیے وہ مدینہ آئے تھے (سیدنا عثمان کا قتل) اس کو بہر صورت پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے، چنانچہ انھوں نے سیدنا عثمان و علی کی جانب سے دو جعلی خط تیار کیے اور زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے دواؤں کو کرایہ پر لے کر دوا اعمالیوں کے ذریعہ ایک کومشتری راستہ سے عراق اور دوسرے کومشتریوں کی طرف بھیجا جو غربی جانب ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ خطوط نویسی کا واحد مقصد سوئے ہوئے فتنہ کو جگانا اور اسر و شر کو امت میں پھیلانا تھا۔ فتنہ کے ان دونوں بانئوں کے سوا کسی اور کو اس فتنہ پرداز میں ہرگز دلچسپی نہ تھی۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: العواصم من القواصم۔

کیے۔^① مروان کو والی مقرر کر کے اپنی انگٹھی اس کے حوالے کر دی۔ جس کا نتیجہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے امت میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے اقارب کو بہت زیادہ

① امت محمدی کے بچوں (شیعہ) کی نگاہ میں سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بدترین فعل یہ تھا کہ اس نے ایران میں کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ عبد اللہ بن عامر کے عہد امارت میں فارس کے آخری بادشاہ یزدگرد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جب عبداللہ بن عامر پیدا ہوئے اور انہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے ہوجہد شمس کو مخاطب کر کے فرمایا: ”یہ بچہ تمہاری نسبت ہم سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔“ آپ بچے کے منہ میں تھوک ڈالتے جاتے تھے اور وہ لگتا جاتا تھا آپ نے فرمایا: ”یہ بچہ تروتازہ ہے۔“ نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عامر رضی اللہ عنہ جس زمین میں بھی کام کرتے، وہاں پانی نکل آتا۔ ابن عامر پہلا شخص ہے جس نے عرفات میں حوض بنائے اور شمسے کا پانی وہاں پہنچایا۔ مستدرک حاکم (۶۳۹/۳-۶۴۰) و سندہ ضعیف۔

ابن عامر بڑے غنی، شجاع اور نیک فال تھے۔ سیدنا عثمان نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بعد ۲۹ھ میں ابن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کیا، پھر عثمان بن ابو العاص کے بعد فارس کا علاقہ بھی ان کو سونپ دیا۔ ابن عامر نے پورا خراسان۔ اطراف فارس و سیستان اور کرمان کے ممالک فتح کر لیے اور غزہ کے قریب جا پہنچے۔ ان فتوحات کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے ابن عامر نے نیشاپور سے احرام باندھا اور حالت احرام میں پایادہ حجاز پہنچے۔ اتفاق سے وہ سردی کا موسم تھا۔ جب سیدنا عثمان کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ملامت کی اور فرمایا: ”آپ نے یہ اقدام فریب دہی کیلئے کیا ہے۔“ ان فتوحات سے کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ یہ ہیں سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ افعال ”شیعہ“ جن پر رافضی قلم کار نقد و جرح کر رہا ہے۔ اس پر جس قدر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ یہ صحابہ و فاتحین شیعہ کی نگاہ میں مذموم ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہلاک خواں اور سلطان خدا بندہ تک اس کی نسل قابل مدح و ستائش ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صح فرمایا: کہ روزِ شرا آدمی کو اس شخص کی رفاقت نصیب ہوگی۔ جس کے ساتھ وہ محبت رکھتا ہو۔“

شیعہ کی یہ تضاد خیالی صرف دینی مرض ہی نہیں، بلکہ عقلی و اخلاقی بیماری بھی ہے۔ ”وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانَا مِمَّا بَسَلْنَا بِہِ کَثِیْرًا مِّنْ خَلْقِہِ“ انگٹھی سپرد کرنے سے رافضی مصنف کا اشارہ اس جعلی خط کی جانب ہے۔ قائد کوئٹہ اشتر غفری اور قائد بصرہ حکیم بن جبلة جب اپنے مقصد میں ناکام رہے اور کوئٹہ بصرہ کے انقلابی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دلائل سے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ عراقیوں نے مشرق کی جانب عراق کا رخ کیا اور مصری جانب غرب عازم مصر ہوئے؟ یہ دونوں لیڈر مدینہ میں مقیم رہے اور اپنے رفقاء کے ساتھ واپس نہ گئے۔ چند دنوں کے بعد بیک وقت دوسو مصری و عراقی قافلہ سے ملے جو سو امر مصری قافلہ سے ملتا تھا وہ ان کے قریب پہنچ کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ قافلہ والوں نے اسے دیکھ لیا ہے تو پھر چھپنے کی کوشش کی، جب انھوں نے وجہ پوچھی تو اس نے ایک خط دکھایا جس پر سیدنا عثمان جیسی مہر لگی تھی، اس نے بتایا کہ وہ یہ خط لے کر امیر مصر عبداللہ بن ابی سرح کی طرف جا رہا ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ محمد بن ابی بکر کو قتل کر دو۔ بعینہ اسی وقت عراقی قافلہ کو ایک شخص ملا جس کے پاس ایک خط تھا جس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مہر کی مانند مہر لگی تھی، خط میں لکھا تھا کہ ”مدینہ واپس آ جاؤ“ جب دونوں فریق مدینہ پہنچے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ وجہ دریافت کرنے کے لیے نکلے، مصری لوگوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے جعلی خط کا ذکر کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پھر عراقیوں سے وجہ دریافت کی انھوں نے کہا کیا آپ نے خط کے ذریعہ ہمیں واپس آنے کا حکم نہیں دیا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا کہ مجھے اس خط کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا عثمان و علی کے نام سے یہ جعلی خط تیار کیے گئے تھے خصوصاً جب کہ سیدنا عثمان و مروان کو معلوم تھا کہ عبداللہ بن ابی سرح مصر میں موجود ہی نہیں۔ مروان ایک آدمی کے ساتھ بھی خیانت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر وہ ازراہ خیانت سیدنا عثمان کی انگٹھی کیوں استعمال کر سکتے تھے جو امور خلافت میں بڑی اہم چیز سمجھی جاتی ہے بغرض حال اگر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی انگٹھی ازراہ فریب مروان نے استعمال کی تھی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی انگٹھی استعمال کرنے والا کون تھا؟ درواغ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مروان وہ شخص ہے کہ سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ جیسے لوگ اس سے دینی احکام پر مشتمل روایات اخذ کرتے ہیں۔ مروان سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ایک سیدنا زین العابدین رضی اللہ عنہ علی بن حسین رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ جن حفاظ و ائمہ حدیث نے یہ بات بیان کی ہے ان میں سے آخری محدث حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جنھوں نے ”الاصابہ“ میں اس پر ردی ڈالی ہے۔

آپ کے شاگردوں میں سرخیل تابعین سعید بن مسیب اور ان کے برادر فقہائے سبغہ ابو بکر بن عبدالرحمن و غیدہ اللہ بن عبداللہ و عروہ بن زبیر اور ان کے نظائر و امثال مثلاً عراک بن مالک غفاری مدنی جو صائم الدہر تھے۔ نیز عبداللہ بن شداد جو سیدنا عمر و علی و معاذ سے روایت اخذ کیا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر کی مروان سے روایت صحیح بخاری، کتاب الوکالتہ میں شامل ہے۔ نیز دیکھیے مسند احمد (۳/۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳،

نوازتے اور انہیں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ قریش میں ان کے چار داماد تھے، انہیں چار لاکھ دینار عطا کیے۔^① مروان کو دس لاکھ دینار دیئے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بناتے اور ان کی تکفیر کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اس قدر پتوایا کہ ان کی موت واقع ہو گئی۔ عمار رضی اللہ عنہ کو اس قدر پتوایا تھا کہ ان کو قتل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: ”عمار میرا نور نظر ہے، اسے ایسی باغی جماعت قتل کرے گی جو میری شفاعت کی مستحق نہیں ہے۔“ عمار رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کیا کرتے تھے۔ نبی ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حکم اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ سے نکال دیا تھا، وہ عہد رسالت مآب میں اور عہد صدیقی و فاروقی میں مدینہ بدرہی رہا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر مدینہ میں بلالیا۔ اور مروان کو اپنا مشیر اور کاتب بنالیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ﴾ [المجادلة ۲۲]

”اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔“

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو انتہائی سخت مار پیٹ کر ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔^② حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

”اس کرۃ ارضی کے اوپر اور فلک نیلگوں کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا اور کوئی نہیں۔“

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: ”بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ میرے صحابہ میں سے چار افراد سے محبت کرتا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بھی ان سے محبت کروں۔“ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”ان چاروں کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور ان کے علاوہ سلیمان، مقداد اور ابوذر رضی اللہ عنہم۔“

”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ امیر المؤمنین کے آزاد کردہ غلام ہرمزان کے قصاص میں عید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کیا تھا؛ حالانکہ وہ [ہرمزان] اسلام لا چکا تھا۔ امیر المؤمنین نے عید اللہ کو قصاص کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر وہ بھاگ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی اور فرمایا: ”میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔ جمعہ کے دن ایک اذان کا اضافہ کیا جو کہ بدعت ہے۔ مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی اور اس کے کاموں پر تنقید کی۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا گیا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ اور غزوہ احد کے دن بھاگ گئے۔“

① قبل ازیں اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اپنے ذاتی مال سے یہ عطیہ جات دیا کرتے تھے۔

② یہ صاف جھوٹ ہے۔ مورخ ابن خلدون اپنی تاریخ ج 2، صفحہ ۱۳۹ پر لکھتے ہیں: ”سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین عثمان سے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ابوذر نے کہا: مجھے نبی کریم ﷺ نے مامور فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی تسلیع نامی مقام تک پہنچ جائے تو اس سے نکل جائیں۔“ چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔ (مسند رک حاکم ۳/۳۳۳)، ابوذر رضی اللہ عنہ ربذہ نامی جگہ میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں مسجد بنوائی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوذر کو اونٹوں کا ایک ربوڑ اور دو غلام عطا کیے تھے۔ ان کی تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ میں آیا جایا کرتے تھے، وہ جگہ جہاں وہ اقامت پذیر تھے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت لکھتا ہے: ”مدینہ کے راستہ پر یہ بہترین جگہ تھی۔“

بیعت الرضوان میں بھی شامل نہ ہوئے۔^① خلاصہ یہ کہ ایسے واقعات لاتعداد ہیں۔“ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

[سلسلہ جوابات]:

شیعہ مصنف کے وارد کردہ جملہ اعتراضات کا جواب علی الترتیب یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال و حکام نے ان سے خیانت کی اور ان کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ناسین اس ضمن میں ان سے دو قدم آگے ہی تھے۔ لوگوں نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں کہ جن لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا نائب مقرر کیا تھا مگر انہوں نے مال لے لیا اور آپ کے ساتھ خیانت کی۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل عبید اللہ بن زیاد کے والد زیاد بن ابی سفیان کو والی مقرر کیا تھا۔ آپ نے اشتر نخعی اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کو بھی حاکم مقرر کیا تھا۔ حالانکہ کسی بھی عاقل کو اس بات میں ذرا بھر بھی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان سب سے بہتر تھے۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ شیعہ جس امر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بناتے ہیں اسی بات کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے قرابت دار اور بنو امیہ کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے والد اور والدہ کی جانب سے اپنے قرابت داروں کو حاکم و والی مقرر کیا۔ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبید اللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کو یمن پر والی مقرر کیا؛ نیز قتسم بن عباس رضی اللہ عنہ مکہ اور طائف پر والی بنایا۔ مدینہ پر سکھیل بن حنیف کو اور کہا جاتا ہے کہ ثمامہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو والی بنایا۔ بصرہ پر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ [یہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے]۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو والی مصر مقرر کیا جو آپ کا تربیت کردہ تھا۔ [کیوں کہ حضرت صدیق اعظم رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ

① سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بیعت الرضوان میں اس لیے شرکت نہ کر سکے کہ نبی کریم ﷺ نے انھیں قریش مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے سفارت کا منصب پہلے سیدنا عمر کو پیش کیا انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! کہ میں میرے قبیلہ کا ایک آدمی بھی نہیں جو میری حفاظت کر سکے۔ میں آپ کو ایک شخص بتاتا ہوں جو اس مقصد کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں ہے۔ وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہے۔ چنانچہ آپ نے سیدنا کو بلا کر اس خدمت پر مامور کیا۔ اگر مسلمانوں میں کوئی اور شخص ہوتا جو وادی مکہ میں زیادہ پر قوت و شوکت ہوتا تو آپ عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ اسے اس کام پر مامور فرماتے۔ (صحیح بخاری، حوالہ سابق سیرۃ ابن ہشام (ص: ۵۰۲-۵۰۳))

تاریخ اسلام کی اس اولین سفارت کے جرم میں عثمان رضی اللہ عنہ مکہ میں چند روز محبوس رہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے ہیں۔ نبی کریم نے سیدنا عثمان کا قصاص لینے کے لیے صحابہ سے بیعت رضوان لی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیعت رضوان سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت کا بین ثبوت ہے۔ عظمت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ آپ کا انتقام لینے کے لیے اسلام کی پوری قوت و شوکت سیدنا اولین والا آخرین رضی اللہ عنہ کے زیر قیادت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اپنے اس داماد سے کتنی کبریٰ الفت و محبت رکھتے تھے۔

جب سب صحابہ عقد بیعت کے لیے جمع ہو گئے تو اس آخری لمحہ میں نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا کہ عثمان رضی اللہ عنہ بخیر و عافیت ہیں۔ تاہم آپ نے بیعت کے معاملہ کو تھوڑے تکمیل چھوڑنا مناسب خیال نہ کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو دہرا شرف یہ حاصل ہوا کہ بیعت کرتے وقت نبی کریم ﷺ کے ہاتھ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی جگہ کام کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا اور کہا: ”یہ عثمان کا ہاتھ ہے“ پھر اسے دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا: ”یہ بیعت عثمان کے لیے ہے۔“ صحیح بخاری، حوالہ سابق۔ مقام افسوس ہے کہ شیعہ تاریخ اسلام کی اس عظیم مدح و ثنا کو نقص و عیب پر محمول کرتے ہیں، رفض کی اصل حقیقت یہی ہے، اگر وہ یوں نہ کرتے تو رافضی نہ کہلاتے۔ یہ بیعت اتنی اہم تھی کہ نبی کریم ﷺ کے زیر قیادت اسلام کی پوری قوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی سابقہ بیعت نے صحابہ کرام کو شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر قصاص کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا اور نہ انھیں سیدنا علی سے کوئی عناد نہ تھا۔

کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بعیرہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے بیٹے جعدہ بن ابی ہبیرہ کو خراسان کا والی مقرر کیا تھا۔ امامیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اولاد کو صراحتہ والی وامیر مقرر کیا تھا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اگر اقارب کو عہدے تفویض کرنا جرم ہے تو ان کو بعض علاقوں کی ولایت کی نسبت سے خلافت عظمیٰ پر فائز کرنا جرم عظیم ہے۔ نیز یہ کہ چچا زاد بھائیوں کی نسبت اولاد کو والی مقرر کرنا مذموم تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام رضی اللہ عنہم کے ایک قول کے مطابق جو وکیل [ایجنٹ] یا ولی اپنے ذات کے لیے لین دین کرنے کا مجاز نہ ہو وہ اپنی اولاد کے لیے بھی لین دین نہیں کر سکتا۔ اور ایک قول کے مطابق جس انسان نے وکیل کو کچھ مال دیا ہو کہ وہ جسے چاہے نواز دے؛ وہ اس میں سے نہ ہی خود کچھ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی اولاد کو دے سکتا ہے۔

ایسے ہی خلافت کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کیا خلیفہ اپنی اولاد کے لیے وصیت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔ باپ کی گواہی بیٹے کے حق میں ناقابل اعتماد ہے؛ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ جب کہ اپنے چچا زادوں کے بارے میں یہ گواہی رد نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح دیگر احکام میں بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

”تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کے لیے ہو۔“ [رواہ ابن ماجہ ۲/۷۶۹]

نیز رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

”کسی بھی جہہ کرنے والے کو اپنے جہہ میں رجوع کرنے کا اختیار نہیں سوائے والد کے؛ وہ اپنے بیٹے کو کئے گئے جہہ میں رجوع کر سکتا ہے۔“ [رواہ أبو داؤد ۳/۳۹۴؛ والترمذی ۳/۲۹۹]

اگر شیعہ کہے کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نص کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔“

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً: ہمارا اعتقاد ہے کہ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد ہیں ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ راشد ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے اعمال و افعال پر اس کی دلیل کو جانیں؛ یہ جاننا ضروری ہے کہ [ایسے مسائل میں بحث کرنے سے] جو جہتیں اور بدگمانیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق پیدا ہوتی ہیں وہ ان جہتوں سے کہیں بہت بڑھ کر ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق پیدا ہوتی ہیں۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس [اپنے افعال و اعمال پر] دلیل و حجت موجود ہے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم ہونے کے باوجود اس اقارب نوازی کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور کسی شخص کو بنا بر عصمت آپ پر حرف گیری کی مجال نہیں ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدافعت اس دعویٰ سے ممکن ہے کہ آپ ایک مجتہد تھے۔ لہذا یہ امور ان سے اجتہادی غلطی کی بنا پر صادر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ عقل و نقل سے زیادہ میل کھاتا ہے۔

شیعہ کی بڑی مشکل یہ ہے کہ: جب ایسے اشخاص کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں سے بعض لوگ صحیح منقول اور صریح معقول دلائل کی روشنی دوسرے بعض افراد سے افضل و اکمل ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ فاضل کو قابل مذمت ٹھہراتے ہوئے اس پر قدح اور طعن کرنا شروع کر دیتے ہیں؛ اور مفضول کو معصوم اور قابل مدح و تعریف ٹھہراتے ہیں۔ ان کا یہ فعل بالکل نصاریٰ کے فعل کی جنس سے ہے۔ نصاریٰ جب ان انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت

سے نوازا ہے۔ تو مفضول نبی کو خدا بنا لیتے ہیں اور فاضل نبی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں سے بھی پیچھے کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے حقائق بالکل الٹ جاتے ہیں۔ اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین کو جو کہ نبی نہیں ہیں؛ خطاؤں سے معصوم مانتے ہیں؛ اور اس کے ساتھ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں توہین و تنقیص اور گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت سارے دلائل کی روشنی میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت افضل ہیں۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آپ سے افضل ہیں۔ تو پھر کیسے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کو محمد اور ابراہیم علیہم الصلوٰات والسلام سے افضل ٹھہراتے ہیں؟

یہ سب کچھ اس جہالت اور غلو کا آئینہ دار ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿يَا هَلْ أَلِيبُ لَكُمْ لَّا تَعْلَمُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلٰى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ اَلْقَهْآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلَهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهُ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿۱۷۱﴾﴾ [النساء ۱۷۱]

”اے اہل کتاب اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ اور اللہ پر بجز حق کے کچھ نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) تو صرف اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ (کن سے پیدا شدہ) ہیں جسے مریم بنتی مہدی کی طرف سے ڈال دیا گیا تھا اور اس کے پاس کی روح ہیں اس لئے تم اللہ کو اور اس کے سب رسولوں کو مانو اور یہ نہ کہو کہ اللہ تین ہیں؛ اس سے باز آ جاؤ یہ تمہارے لئے بہتری ہے، عبادت کے لائق تو صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کافی ہے کام بنانے والا۔“

یہی حال اس امت میں رافضیوں کا ہے؛ یہ بھی انتہائی سخت غلو کا شکار ہیں۔ ان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب مانتے ہیں۔ یہ لوگ عیسائیوں سے بھی برے ہیں۔ اور پھر ان میں سے بعض شیعہ ایسے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی مانتے ہیں۔ اور جو کوئی محمد ﷺ کے بعد کسی نبی کو مانتا ہے وہ میلہ کذاب کے اور دوسرے جھوٹے انبیاء کے پیروکاروں سے مشابہت رکھتا ہے۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام قسم کے دعووں سے [اس طرح] بری ہیں [جس طرح بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کے خون سے بری تھا]۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اپنے لیے خود نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں جیسے میلہ کذاب اور دوسرے لوگ [اصل میں یہ خود حقیقی مجرم ہیں]۔

امامیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے۔ نیز آپ اور آپ کی بہت ساری اولاد معصوم تھے۔ اور لوگوں نے آپ پر ظلم کیا اور آپ کا حق غصب کیا۔

معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نبوت کے دعویٰ کی طرح ہے۔ اس لیے کہ معصوم جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں اس کی اتباع واجب ہوتی ہے۔ اور کسی چیز میں بھی اس کی مخالفت کرنا ہرگز جائز نہیں ہوتی۔ یہ بات تو صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہی خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ بھی انبیاء پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لائیں؛ ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ رَبِّهِمْ وَإِسْحَاقُ وَيَعْقُوبُ وَ
الْأَسْبَاطُ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَ
نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ [البقرة ۱۳۶]

”اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس چیز پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَكَيْتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [البقرة ۲۸۵]

”رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اترے اور مومن بھی ایمان لائے یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ﴾ [البقرة ۱۷۷]

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو۔“

انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ہوئے پیام پر ایمان لانے اور اس کا اپنی زبان سے اقرار کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ یہ ان امور میں سے ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور جو کوئی کسی ایک نبی کا انکار کرتا ہے گویا کہ وہ تمام انبیاء کا انکار کرتا ہے۔ اور جو کوئی کسی نبی کو گالی دیتا ہے تو بالاتفاق اس کو قتل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ حکم انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔ بھلے کسی کو امام کا خطاب دیا جائے یا ولی ہونے کا یا حکیم ہونے کا یا عالم کہا جائے؛ یا اس طرح کا کوئی دوسرا نام دیا جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دوسرے کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہے سوائے انبیاء کے۔ پس جو کوئی انبیاء کرام کے بعد کسی کو معصوم مانتا ہے کہ اس کے ہر قول پر ایمان لانا واجب ہے تو یقیناً وہ اسے نبوت کے معانی دیتا ہے اگرچہ وہ الفاظ میں اسے نبی نہ بھی کہے۔

ایسے آدمی سے کہا جائے گا کہ: اس معصوم اور بنی اسرائیل کے انبیاء کرام علیہم السلام جو کہ شریعت موسوی [تورات] کی اتباع کے لیے مامور تھے؛ ان کے مابین کون سا فرق باقی رہ گیا؟

بہت سارے گمراہ صوفی بھی اپنے مشائخ کے متعلق اس قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں: شیخ گناہ سے محفوظ ہے۔ اور یہ صوفیا اپنے شیخ کے ہر حکم میں اس کی اتباع کا حکم دیتے ہیں؛ کسی بھی چیز میں شیخ کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ یہ بھی

رافضیوں؛ اسماعیلیوں اور عیسائیوں کی مانند غلو ہے۔ جو اپنے اماموں کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے امام معصوم ہیں۔ ابن تومرت جس نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا؛ اس کے ساتھی بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ابن تومرت معصوم ہے۔ وہ اپنے جمعہ کے خطبہ میں یوں کہا کرتے تھے: ”امام معصوم اور مہدی معلوم۔“

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت سارے ان لوگوں کو قتل کر دیا تھا جو ابن تومرت کو معصوم نہیں مانتے تھے۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ یہ تمام اقوال و عقائد کتاب و سنت اور اجماع امت اور [ائمہ سلف و خلف کے اقوال] کی روشنی میں اسلام کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَ الرَّسُولِ﴾ [النساء ۵۹]

”فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹا، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔“

آیت مبارکہ میں اختلاف کے وقت ہمیں صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس جو انسان رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو معصوم مانتا ہے؛ وہ حقیقت میں اس کی طرف رجوع کرنے کو واجب ٹھہراتا ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ اس معصوم کے پاس رسول کی طرح حق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یا عقیدہ و نظریہ قرآن کے صریح خلاف ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معصوم کی اطاعت مطلق طور پر بغیر کسی قید کے واجب ہوتی ہے۔ اور اس کی مخالف وعید کا مستحق ہوتا ہے۔ جب کہ قرآن اس وصف کو صرف رسول کے ساتھ خاص مانتا ہے۔ [اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَ الرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِينَ وَ حَسَنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء ۶۹]

”اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا﴾ [الجن ۲۳]

”جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نہ مانے گا اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔“

قرآن نے کئی ایک جگہ پر یہ بات دلائل کے ساتھ واضح کی ہے کہ جو کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا اس کا شمار اہل سعادت میں سے ہوگا؛ اس میں کسی اور معصوم کی اطاعت کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔

اور جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرے گا وہ وعید کا مستحق ٹھہرے گا۔ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کوئی انسان کسی کی اطاعت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسے معصوم خیال کرتا ہے۔ مگر پھر بھی [یہ معلوم ہونا چاہیے کہ] رسول اللہ ﷺ ہی وہ ہستی ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل جہنم؛ نیکوکار اور بدکردار؛ حق اور باطل؛ کامیابی اور ناکامی؛ سرکشی

اور اطاعت و فرمانبرداری اور گمراہی اور ہدایت کے مابین تفریق کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو قاسم [تقسیم کرنے والا] بنایا تھا۔ آپ کے ذریعہ لوگوں کو دو گروہوں نیک بخت اور بد بخت میں تقسیم کر دیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کی اطاعت کی وہ نیک بخت ٹھہرے؛ اور جن لوگوں نے آپ کی نافرمانی اور مخالفت کی وہ بد بخت قرار پایا۔ یہ مرتبہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل علم۔ اہل کتاب و سنت۔ کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں؛ ہر ایک کی بات قبول بھی کی جاسکتی ہے اور رد بھی کی جاسکتی ہے؛ مگر رسول اللہ ﷺ کی بات صرف قبول ہی کی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرنا اور آپ کے ہر ایک حکم کی تعمیل کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی وہ موصوم ہستی ہیں جو اپنی مرضی سے بات تک نہیں کرتے۔ بلکہ آپ جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ اور روز قیامت لوگوں سے آپ ہی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ﴾ [الأعراف 6]

”پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔“

آپ ہی وہ ہستی ہیں جن کی بابت قبروں میں لوگوں سے امتحان ہوگا۔ مردوں سے پوچھا جائے گا:

تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ تمہارا نبی کون ہے؟

اور کہا جائے گا: ”اس آدمی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟“

پس اللہ تعالیٰ ایمان والے کو ثابت قدم رکھے گا؛ اور وہ کہے گا: ”وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ آپ ہمارے پاس واضح دلائل اور ہدایت کی باتیں لیکر آئے۔ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی اتباع کی۔ اگر کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کی بجائے صحابہ؛ ائمہ؛ تابعین اور علماء میں سے کسی کا نام لے گا تو اسے اس کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کے بارے میں قبر میں امتحان نہیں ہوگا۔“

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منکرات کے بارے میں جو جواب یا عذر پیش کیا جائے گا اس سے بڑا عذر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں موجود ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت اور ولایت کے لیے لوگوں سے جنگ کی جس میں خلق خدا کی بہت بڑی تعداد قتل ہوئی۔ آپ کی خلافت کے دوران مسلمانوں کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ نہ ہی کفار سے جہاد جاری رہا؛ اور نہ ہی مزید کوئی شہر فتح ہوا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کو کوئی بڑی خیر نصیب ہوئی۔ اور آپ نے اپنے اقارب میں سے کئی لوگوں کو دالی یا گورنر بنایا۔ اقارب کو دلیات پر مامور کرنے کا اقدام مشترک ہے۔ پس اتنا فرق ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نائبین بہت ہی اطاعت گزار تھے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین اطاعت سے بہت دور اور شر کے زیادہ قریب تھے۔

جب کہ اموال کے تقسیم کرنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسے ہی متاواں تھے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کا خون بہانے میں۔ حالانکہ خون کا معاملہ مال کی نسبت زیادہ سخت اور خطرناک ہوتا ہے۔

دوسری بات: ان سے کہا جائے گا کہ: جس نص کا آپ دعویٰ کرتے ہیں؛ تمہارا آپس میں اس نص کے بارے میں اتنا

اختلاف ہے جس سے وجوہاً علم ضروری حاصل ہوتا ہے کہ یہ نفس تمہارے ہاں قابل اعتماد نہیں ہے۔ بلکہ تم میں سے ہر ایک گروہ جیسے چاہتا ہے ویسی روایات گھڑ لیتا ہے۔

جمہور مسلمین کہتے ہیں: ہم یقینی ہی نہیں بلکہ ضروری طور پر جانتے ہیں کہ نصوص جھوٹی ہیں۔ یہ بات ہم نے کئی جگہ پر واضح کی ہے۔ [یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ جو الزامات لگائے جا رہے ہیں سب جھوٹ ہیں]۔

تیسری بات: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حجت دوسرے لوگوں پر غالب ہی رہے گی؛ اس لیے کہ آپ کے بارے میں یہ عذر بھی صحیح ہے کہ بنو امیہ کو عہدہ ہائے جلیلہ عطا کرنے میں ان کے سامنے اسوۂ نبوی موجود تھا۔ اور نبی کریم ﷺ کے بعد ان لوگوں نے بھی امویوں کو عہدوں پر تعینات کیا جن پر قرابت کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا؛ ان میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔ عرب قبائل میں سے کوئی بھی قبیلہ ایسا نہیں جس میں بنو عبد شمس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے عمال کی تعداد زیادہ ہو۔ اس کی وجہ ہے کہ:

۱۔ بنو عبد شمس تعداد میں زیادہ تھے۔

۲۔ ان میں سیادت و قیادت اور شرف کا عنصر موجود تھا۔

سرور کائنات ﷺ نے اسلام کے غلبہ اور عزت کے دور میں:

۱۔ عتاب بن اسید بن ابوالعیص بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا؛ جو کہ روئے زمین کا سب سے محترم گوشہ ہے۔^①

۲۔ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل مقرر فرمایا۔

۳۔ خالد بن سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کو صنعاء یمن اور بنی مذحج سے صدقات وصول کرنے پر عامل مقرر کیا تھا۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک اسی منصب پر فائز رہے۔

۴۔ حضرت عثمان بن سعید ابن العاص رضی اللہ عنہ کو تیماء؛ خیبر؛ اور عرینہ کی بستیوں پر عامل مقرر فرمایا تھا۔

۵۔ ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پہلے بعض سرایا پر امیر مقرر کیا اور پھر آپ کو بحرین کا والی مقرر کیا۔ آپ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کے بعد نبی کریم ﷺ کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

۶۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے جب ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ کو [بنی امیہ کے صدقات وصول کرنے پر] عامل مقرر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِبَهَالَةٍ﴾ [الحجرات ۶]

”تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو۔“

نظر بریں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے انہی افراد اور اسی جنس و قبیلہ کے لوگوں کو عہدے عطا کیے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی ڈگر پر گامزن رہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فتوحات شام کے سلسلہ میں یزید بن ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس عہدہ پر قائم رکھا۔

① سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان (ح: ۶۳۳)، سنن ابن ماجہ۔ کتاب الاذان۔ باب الترجیع فی الاذان (ح: ۷۰۸) و کتاب التجارات، باب النهی عن بیع ما لیس عندک (ح: ۲۱۸۹)۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ منصب عطا کیا۔ بنو امیہ کو حاکم و عامل مقرر کرنے کی روایت نبی کریم ﷺ سے نہ صرف ثابت و مشہور بلکہ اہل علم کے نزدیک متواتر کی حد تک معروف ہے۔ علماء یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں، ان میں سے کسی ایک نے اس کا انکار نہیں کیا۔

لہذا اس سے بنو امیہ کو عہدے عطا کرنے پر احتجاج کرنا نبی کریم ﷺ کی نص کے مطابق اور ہر عامل کے نزدیک خلافت کو بنی ہاشم کے ایک ہی فرد میں محدود کرنے کی نسبت اظہر ہے۔ کیوں کہ بنو ہاشم میں مناصب جلیلہ کو محدود کرنے کا دعویٰ باتفاق محدثین کذب و دروغ گوئی ہے اور بنو امیہ کو عہدے تفویض کرنے کی روایت بالاتفاق اہل علم و نقل صدق ہے۔ جہاں تک بنو ہاشم کو عامل و حاکم بنانے کا تعلق ہے نبی ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم مقرر کیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنے آزاد کردہ غلام بن حارثہ اور عبد اللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں غزوہ موتہ کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔

دیکھ لیجیے! اس موقع پر نبی کریم ﷺ اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر بنا کر روانہ فرما رہے ہیں؛ حالانکہ آپ کا تعلق قبیلہ کلب سے تھا۔ اور ان کے ساتھ مأمورین میں جعفر بن ابوطالب ہیں [جو آپ کے چچا زاد بھائی تھے] اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے ولایت طلب کی تھی؛ مگر آپ نے انہیں والی نہیں بنایا۔

بنی ہاشم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حمزہ؛ جعفر بن ابوطالب؛ اور عبید بن حارث بن مطلب رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی بھی افضل نہیں تھا۔ عبید بن حارث بدر کے دن شہید ہوئے۔ ایسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی کوئی ولایت عطا نہیں کی؛ اس لیے کہ آپ غزوہ احد میں شہید کر دیئے گئے تھے۔

بعض ترک اور ان کے مشائخ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ روایت کرتے ہیں؛ اور جو کچھ ان کے بارے میں ترکوں کے ہاں متداول ہے؛ جس میں آپ کی کئی جنگوں اور محاصروں کا ذکر ہے؛ یہ تمام جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ یہ بالکل اسی جنس سے ہے جیسے جھوٹے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق من گھڑت جنگی کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسے جھوٹ رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی گھڑے گئے ہیں۔ یہ تمام واقعات ابوالحسن الکمری کی سیرت کی کتاب "أنوار التنقلاات" میں بیان کیے گئے جھوٹ کی جنس سے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے غزوات اہل علم کے ہاں معروف ہیں۔ اور وہ ان واقعات کو ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی تعداد بیس سے زیادہ [ستائیس] ہے۔ لیکن ان میں سے صرف نو غزوات میں قتال کی نوبت آئی:

غزوہ بدر؛ غزوہ احد؛ خندق؛ بنی مصطلق؛ الغابہ؛ فتح خیبر؛ فتح مکہ؛ حنین اور طائف۔ طائف وہ آخری غزوہ ہے جس میں قتال تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔ یہ غزوہ تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ؛ اور تیاری کے لحاظ سے بڑا پر مشقت تھا۔ اسی غزوہ میں اللہ تعالیٰ نے سورت برأت [توبہ] نازل فرمائی۔ اس غزوہ میں بھی قتال تک نوبت نہیں پہنچی۔

اور جاہل حجاج تبوک کے محاصرہ کا جو ذکر کرتے ہیں؛ اس کی کوئی اصل نہیں۔ تبوک میں نہ ہی کوئی قلعہ تھا اور نہ ہی قتال ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے بیس روز تک وہاں قیام کیا اور پھر واپس مدینہ تشریف لائے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں بنی ہاشم میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد افضل انسان تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ

نے قبیلہ کلب کے ایک آدمی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقدیم فضیلت ایمان؛ تقویٰ اور بعض دوسرے امور مصلح کی وجہ سے ہوتی ہے نسب کی وجہ سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ اپنے اقارب پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مقدم رکھا کرتے تھے۔ بلا شک و شبہ آپ اللہ کے رسول تھے اور اللہ کے حکم کے مطابق ہی حکم دیا کرتے تھے۔ آپ ان بادشاہوں میں سے نہیں تھے جو اپنی خواہشات کی وجہ سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو مقدم کرتے ہوں۔ یہی حال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بھی تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”جو حاکم اپنی قرابت یا دوستی کی وجہ سے کسی کو تعینات کرے؛ حالانکہ مسلمانوں میں اس سے بہتر لوگ موجود ہوں؛ تو یقیناً اس نے اللہ اور اس کے رسول سے اور مومنین سے خیانت کی۔“

فصل:

[نبی کریم ﷺ کے بعد معصوم ہونے کا اعتقاد؟]

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کے بھی معصوم ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ بلکہ خلفاء اور غیر خلفاء سب سے غلطی ہونے کا امکان موجود ہے۔ اور ان لوگوں سے جو گناہ واقع ہوتے ہیں؛ بسا اوقات وہ ان سے توبہ کر لیتے ہیں۔ اور کبھی نیکیوں کی بہتات کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ انہیں مصائب میں مبتلا کر دیتے ہیں؛ اور وہ مصائب ان کے لیے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ان کے علاوہ کسی دوسرے سبب کی بنا پر ان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

[ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کے مدعی نہیں ہیں لیکن] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بھی منقول ہے؛ وہ زیادہ سے زیادہ نطاً یا گناہ ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے اتنے اسباب مغفرت موجود ہیں [جن کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہو گئے ہوں گے۔ ان اسباب میں سے:]

آپ کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہے۔ آپ نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور ان کے علاوہ دیگر اطاعت کے کام بھی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک بلوہ کی وجہ سے جنت کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ نیز یہ کہ عام طور پر آپ کے بارے میں جن باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے؛ آپ نے ان سے توبہ کر لی تھی۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بہت بڑی آزمائش سے دوچار کیا۔ اس کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے گناہ معاف کر دیئے۔ آپ نے آزمائش کی گھڑی میں صبر کیا یہاں تک کہ مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیئے گئے۔ یہ سب سے بڑی اور اہم ترین وجہ جو اللہ کے ہاں گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے۔

ایسے ہی خوارج یا کچھ دوسرے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جن چیزوں کا انکار کرتے ہیں ان کی آخری حد یہ ہو سکتی ہے کہ یہ امور گناہ یا خطا ہوں۔ اور آپ کے لیے بھی ایسے ہی بہت سارے اسباب مغفرت موجود ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ:

آپ کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہے۔ آپ نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور ان کے علاوہ دیگر بھی اطاعت کے کام ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو جنت کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ نیز یہ کہ عام طور پر آپ کے بارے میں جن باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے؛ آپ نے ان میں سے بہت سارے امور سے توبہ کر لی تھی؛ اور آپ ان امور کے سرزد ہو جانے پر نادم و پشیمان تھے۔

اور آخر کار آپ کو شہید کر دیا گیا۔

یہ قاعدہ کلیہ ہمیں اس بات سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کے فعل کو بغیر کسی ضرورت کے واجب یا پھر مستحب شمار کرنے لگ جائیں۔

اس باب میں منحرف ہو جانے والے لوگوں کے دو گروہ ہیں:

- ۱۔ قادیان: [طعن و تشنیع اور جرح و قدح کرنے والے] جو کسی بنا پر ایسے افراد پر قدح کرتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت کر دی ہے۔ یہ اتنی جفا پر اتر آتے ہیں کہ ایک گناہ کو بھی ساری نیکیوں کو ختم کرنے والا عمل شمار کرتے ہیں۔
- ۲۔ مادحون: [بے جا تعریف کرنے والے]: وہ لوگ ہیں جو امور مغفورہ کو سعی مشکور کے باب میں سے شمار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی انسان کی مدح سرائی میں اتنے رطب اللسان ہو جاتے ہیں اور اس کی شان میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ اس کی برائیوں کو بھی نیکیاں شمار کرنے لگتے ہیں۔

تمام مسلمانوں - حتیٰ کہ خوارج - تک کا اجماع ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور بعض گناہ ایسے ہیں جو نیکیوں سے مٹ جاتے ہیں۔ اور کسی ایک کے لیے بھی یہ کہنا خارج از امکان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کی تھی۔

یہ خارجیوں پر حجت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں۔ اور ان شیعہ پر بھی حجت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ پر طعن کرتے ہیں۔ اور ان نواصب پر بھی حجت ہے جو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرتے ہیں۔

جب کہ اہل سنت حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرتے ہیں اور ان سے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ اور شیعیت اور دین میں تفرقہ پیدا کرنے والے ان تمام گروہوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں جو کسی ایک کی محبت کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے صحابہ کرام سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے مابین یہ امر معلوم چلا آ رہا ہے کہ ان چاروں خلفاء کرام کو رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی تھی۔ اور ان کے علاوہ حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ دیگر وہ صحابہ جنہیں جنت کی بشارت ملی ہے [وہ سب جنتی ہیں]۔ اس موضوع پر ہم نے اپنے مقام پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ کا یہ بھی خیال تھا کہ جنتی ہونے کی گواہی صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے ہی دی جا سکتی ہے۔ یہ قول محمد بن الحنفیہ؛ امام اوزاعی اور بعض دوسرے محدثین جیسے علی المدینی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: وہ صحابہ کرام [جن کے لیے جنت کی بشارت دی گئی ہے] وہ جنت میں ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ: ہم ان کے لیے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ جیسے ہم نے اہل سنت والجماعت کے مذہب میں پایا ہے؛ ہم ان حضرات کے لیے اپنی زبانوں سے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبل اور علی المدینی کا مناظرہ بھی ہوا ہے۔ رضی اللہ عنہما۔

ایک گروہ ان کی شان میں غلو کرتے ہوئے انہیں معصوم یا معصوموں جیسے قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ ناکارہ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان حضرات پر بعض امور کی وجہ سے طعن و تشنیع کرتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ امور اگر سچے تھے تو تب

بھی ان لوگوں کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان امور کی وجہ سے ان حضرات سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ ان کے جتنے بھی وہ افعال ہیں جن پر لوگوں کو اعتراض ہے یا تو وہ خطا ہیں۔ یا پھر اجتہادی امور ہیں۔

[اسباب مغفرت]:

اگر انہیں خطا شمار کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطا پر مواخذہ ختم کر دیا ہے۔ جب کہ گناہ کے بخشے جانے کے کئی ایک اسباب ہیں جو کہ ان حضرات کے ہاں پائے جاتے تھے۔ ان اسباب کے دو اصول ہیں: خاص اور عام۔ عام: عامۃ المسلمین میں سے کسی ایک شخص میں مخلوط اعمال جمع ہوتے ہیں۔ ایسے اعمال بھی ہوتے ہیں جن پر وہ ثواب کا مستحق ہے اور ایسے اعمال بھی جن پر وہ سزا کا مستحق ہے۔ اس عموم میں صحابہ، تابعین اور مسلمان ائمہ سب لوگ شامل ہیں۔ اس مسئلہ میں اختلاف خوارج اور معتزلہ کے ساتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں: آخرت میں لوگ دو ہی قسم کے ہیں

۱۔ جنہیں ثواب دیا جائے گا۔

۲۔ جنہیں عذاب دیا جائے گا۔ اور جو کوئی جہنم میں داخل ہو گیا وہ کبھی بھی جہنم سے باہر نہیں آئے گا؛ نہ ہی کسی شفاعت کی بنا پر اور نہ ہی کسی اور بنا پر۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: کبیرہ گناہ تمام نیکیوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور ایسے انسان کے پاس ایمان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

حالانکہ نبی کریم ﷺ سے مشہور اسناد کے ساتھ ثابت ہے کہ کچھ لوگوں کو جل کر کوئلہ بن جانے کے بعد جہنم سے نکالا جائے گا اور ایسے ہی نبی کریم ﷺ کی اپنی امت کے کبیرہ گناہ والے لوگوں کے متعلق شفاعت کرنا بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے منقول احادیث اتنے بڑے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ ایسا تواتر؛ چوری کے نصاب؛ زانی کے رحم؛ زکوٰۃ کے نصاب؛ وجوب شفعہ؛ دادا کی میراث اور ان جیسی دوسری احادیث کو نصیب نہیں ہوا۔ لیکن اس اصل کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے جنہیں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا تھا؛ اور وہ آخرت میں انہیں کوئی سزا نہیں دے گا۔ بلکہ ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ عشرہ مبشرہ جنتی ہیں۔ اور بیعت رضوان کرنے والے جنتی ہیں۔ اہل بدر جنتی ہیں۔ جیسا کہ صادق و مصدوق رسول اکرم ﷺ؛ جو کہ وحی کے بغیر اپنی زبان سے بات تک نہیں کرتے؛ بلکہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی ہوتا ہے؛ آپ سے یہ روایات ثابت ہیں۔

[جب مسلمانوں میں فتنہ پیدا ہوا تو] جن لوگوں کے لیے جنت کی گواہی دی گئی ہے ان میں سے بھی کئی حضرات اس فتنہ میں داخل ہو گئے۔ جس نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ اس کا نام ابو عادیہ تھا؛ یہ بھی بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابی تھے۔ ابن حزم نے یقین کے ساتھ دونوں کا نام لیا ہے۔

ہم حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اور آپ کا قاتل اگر واقعی بیعت رضوان والوں میں سے تھا تو اس کے لیے بھی جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ جب کہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم دوسرے حضرات کی نسبت ان کی قدر و منزلت تو بہت ہی بلند ہے۔ اگر ان سے کچھ بھی ہو گیا ہوتا تب بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ ان میں سے کوئی ایک گناہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں

عذاب نہیں دیں گے۔ اور نہ ہی انہیں جہنم میں داخل کرے گا۔ بلکہ ہم بغیر کسی شک و شبہ کے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ آخرت کی سزا ان سے کئی اسباب کی بنا پر ختم ہو سکتی ہے:

۱۔ توبہ کرنے کی وجہ سے۔ ۲۔ ان کی نیکیوں کی کثرت کی وجہ سے۔

۳۔ دنیا میں پیش آنے والے ان مصائب کی وجہ سے جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم تفصیل سے کلام کر چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق طور پر مؤمنین کے گناہ ان کے لیے عذاب کا سبب بنتے ہیں؛ لیکن آخرت میں تقریباً اس اسباب کی بنا پر سزا کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

پہلا سبب توبہ: بیشک گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ اور ہر گناہ جیسے کفر؛ فسق؛ نافرمانی وغیرہ سے توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ﴾ [الأنفال ۳۸]

”آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دئے جائیں گے۔“

اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے بہت ساری احادیث ثابت ہیں۔ صحابہ کرام جو کہ اس امت کے افضل ترین قرون کے لوگ تھے؛ یہ زمانہ سب سے زیادہ معرفت الہی رکھنے والوں کا زمانہ تھا۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی موت کے بعد بھی سب سے زیادہ توبہ پر قائم رہنے والے لوگ تھے۔ پس جو کوئی ان صحابہ کرام کے عیب تو شمار کرتا ہے؛ مگر ان کی توبہ کا ذکر نہیں کرتا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے درجات بلند کیے ہیں؛ وہ انسان یقیناً ان صحابہ کرام پر ظلم کرنے والا ہے۔ جس طرح کے بعض صحابہ کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ اور پھر انہوں نے اپنی اس حرکت پر توبہ کر لی۔ حالانکہ صحابہ کرام کا ارادہ محض خیر کا تھا۔ اور ایسے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی ہے؛ جس سے آپ نے توبہ کر لی۔ اور زانیہ کا قصہ جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اسے معاف کر دیا جاتا۔ اور حضرت ماعز بن مالک نے توبہ کی اور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ پر حد قائم کر کے پاک کیا جائے۔ ایسے ہی ان کے بعد غامدیہ کا واقعہ بھی ہے۔ یہی حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا۔ اگر کوئی انسان شراب پی لیتا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا؛ اور کہتا: اے امیر المؤمنین مجھ پر حد قائم کر کے مجھے پاک کیجیے۔ یہ اس انسان کا فعل ہے جس سے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہوا اور وہ اس کی حرمت کو جانتا ہو۔ تو پھر ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن سے کوئی صغیرہ گناہ ہوا ہو یا انہوں نے کسی تاویل کی بنا پر کوئی کام کیا ہو۔ اور پھر بعد میں اس کے لیے خطا واضح ہوئی ہو؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جن امور کا انکار کیا جاتا تھا؛ جب آپ کے لیے واضح ہو گیا کہ واقعی یہ کام برے ہیں تو آپ نے ان سے توبہ کر لی تھی۔ یہ آپ کی سیرت میں مشہور و معروف ہے۔

ایسے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کی طرف کوچ کرنے پر ندامت اختیار کی۔ اور جب آپ اپنے اس خروج کا ذکر کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آپ کی اودھنی تر ہو جاتی۔

ایسے ہی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے نصرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو تفریط واقع ہوئی؛ اس پر آپ بہت ہی نادام تھے۔ زبیر رضی اللہ عنہ جنگ جمل پر نادام تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قتال کے علاوہ اپنے کئی ایسے امور پر نادام تھے۔ آپ صفین کی راتوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

”اللہ ہی کے لیے اس مقام کی بھلائی ہے جس پر عبد اللہ بن عمر اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہما ہیں۔ اگر وہ مقام نیکی تو پھر اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔ اور اگر گناہ ہے تو اس کا خطرہ بہت کم ہے۔“

اور آپ فرمایا کرتے تھے: ”اے حسن! اے حسن! تیرے باپ کا یہ خیال نہیں تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔ اور تیرے باپ کو یہ بات پسند تھی کہ وہ اس دن سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا۔“

جب آپ صفین سے واپس پلٹے تو آپ کی رائے بدل چکی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ”معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو برا نہ سمجھو؛ اگر تم اس امارت کو ختم کر دو گے تو تم دیکھو گے کہ کندھوں سے سر اڑ رہے ہیں۔“

یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دو یا تین اسناد کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔ اور آخری عمر میں آپ سے ان احوال کی کراہت تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ یہ تمام احوال ایسے تھے کہ اگر آپ کو اس معاملے کا پہلے سے اندازہ ہوتا تو آپ نے جو کچھ کیا وہ ہر گز نہ کرتے۔

خلاصہ کلام! ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کی توبہ سے آگاہ ہوں۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ توبہ ہر انسان کے لیے مشروع ہے۔ انبیاء کرام کے لیے بھی اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو کسی ایسے گناہ میں مبتلا کرتے ہیں جس سے توبہ کی جائے تو پھر توبہ کی وجہ سے اپنے بندے کا مقام و درجہ بھی بلند کرتے ہیں۔ مقصود خاتمہ کا کمال ہے ابتداء کا نقص نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے اور پاک رہنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ اور توبہ کی وجہ سے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔

دوسرا سبب: استغفار: استغفار کا مطلب ہے دعا اور سوال کے ذریعہ مغفرت طلب کرنا۔ غالب طور پر استغفار توبہ کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ اور توبہ کی طرح استغفار بھی مامور بہ ہے۔ لیکن ایسے بھی ہوتا ہے کہ کبھی انسان توبہ تو کرتا ہے مگر دعا نہیں کرتا اور کبھی دعا تو کرتا ہے مگر توبہ نہیں کرتا۔

تیسرا سبب: اعمال صالحہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (ہود ۱۱۳)

”بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور برائی کے بعد نیکی کرو؛ یہ نیکی اسے مٹا دے گی؛ اور لوگوں کے ساتھ خوش

اخلاقی سے پیش آؤ۔“ [رواہ الترمذی ۲۳۹/۳]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک اپنے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں جب تک کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے۔“ [صحیح مسلم: جلد اول: حدیث نمبر ۵۵۲]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

”اگر کسی کے دروازے پر کوئی نہر جاری ہو، اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو، تو تم کیا کہتے ہو کہ یہ (نہانا) اس کے میل کو باقی رکھے گا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ: ”اس کے جسم پر بالکل میل نہ رہے گا۔“ آپ نے فرمایا کہ: ”پانچوں

نمازوں کی یہی مثال ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ص ۵۰۳]

آیات و احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتے ہیں۔ نمازوں سے بھی گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ نماز کے درمیانی اوقات میں جو گناہ ہوتے ہیں جب وہ نمازوں سے معاف ہو جاتے ہیں تو پھر جمعہ، رمضان، عرفہ و عاشوراء کے روزہ سے کون سے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

بعض لوگ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جب گناہ باقی نہ ہوں تو ان کے درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن اعمال سے گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے وہ اعمال مقبولہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (المائدہ: ۲۷)

”اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو قبول کرتے ہیں۔“

علماء کے اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

۱۔ خوارج و معتزلہ کا قول ہے کہ جو شخص کبائر سے بچتا ہے اسکے اعمال قبول کیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صاحب کبائر کا کوئی عمل مقبول نہیں۔ پس ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کے مرتکب سے کوئی بھی نیکی کسی بھی طرح قبول نہیں کی جاتی۔

۲۔ مروجہ کہتے ہیں کہ جو شرک سے اجتناب کرتا ہے وہ متقیوں میں داخل ہے۔ اگرچہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو۔

۳۔ علمائے سلف و ائمہ کہتے ہیں کہ جو شخص خلوص دل سے اور خوف الہی سے کوئی کام کرتا ہے تو اس کا وہ عمل قبول کیا جاتا ہے۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ آیت کریمہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ”تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔“ تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ”احسن“ سے مراد وہ عمل ہے جو شرعاً درست ہو اور خلوص پر مبنی ہو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا: ”عمل اگر پر خلوص بھی ہو مگر شرعاً درست نہ ہو تو وہ مقبول نہیں ہوگا اور اگر شرعاً درست ہو اور خلوص سے عاری ہو تب بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ عمل خالص کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ کے لیے ہو اور شرعاً درست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سنت نبوی کے مطابق ہو۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب جب کسی بھی عمل میں اللہ ڈرتے ہوئے خالص اس کی رضا کے لیے انجام دے تو اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت بخشے ہیں۔ اور اگر اس سے کوئی افضل انسان کو عمل کرے؛ مگر وہ اپنے اس عمل میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا یہ عمل قبول نہیں کریں گے؛ اگرچہ کسی دوسرے عمل کو قبول بھی کر لیں۔

بس اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتے ہیں جو اس کے حکم کے مطابق ادا کیا جائے۔ سنن میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”بعض آدمی نماز سے فارغ ہوتے ہیں اور ان کی نصف یا تہائی یا چوتھائی نماز نکھی جاتی ہے۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ بعض آدمیوں کو نماز کا دسواں حصہ (۱/۱۰) نصیب ہوتا ہے۔“^①

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہیں نماز [روزہ، حج اور جہاد] میں سے صرف اسی عبادت کا ثواب ملے گا جو عقل و فہم سے ادا کرو۔

اور ایک حدیث میں آتا ہے: ”بسا اوقات روزہ وار کے حصہ میں پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا۔ اور بسا اوقات تہجد گزار کے لیے اس کے حصہ میں رتجگے کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا۔“ یہی حال حج اور جہاد کا بھی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جہاد دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جہاد ہے جو رضا الہی کی خاطر کیا جاتا ہے اور اس میں امام کی فرمانبرداری کی جاتی ہے اور بہتر سے بہتر مال اس میں خرچ کیا جاتا ہے ساتھی کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے۔ اور فساد سے پرہیز کیا جاتا ہے پس ایسے جہاد میں تو سونا اور جاگنا بھی عبادت ہے۔ دوسرا جہاد وہ ہے جس میں فخر شامل ہو اور جو دکھانے اور سنانے کی غرض سے کیا جاتا ہے جس میں امام کی نافرمانی ہو اور زمین میں فساد مطلوب ہو ایسے جہاد کا کوئی اجر نہیں۔“^②

بعض سلف صالحین کے سامنے ذکر کیا گیا کہ حاجی بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: ”حاجی بہت کم ہو گئے ہیں اور بوجھ اٹھا کر چلنے والے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

بہر کیف گناہوں سے معافی ایسے اعمال کی بنا پر ملتی ہے جو بارگاہ ربانی میں مقبول ہوں۔ اکثر لوگ نیکیوں کے بجالانے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں، یہاں تک کہ نماز پڑھنے میں بھی کوتاہی کرتے ہیں۔ وہ خوش نصیب آدمی ہوگا جس کی آدھی نماز قبولیت سے مشرف ہو۔ اندریں صورت کچھ گناہ مقبول نمازوں سے معاف ہو جائیں گے اور جو بچیں گے وہ جمعہ و رمضان سے معاف ہوں گے۔ معافی کا امکان صغائر و کبائر دونوں قسم کے گناہوں میں ہے۔

ایک ہی قسم کا عمل کبھی انسان پوری طریقہ سے ادا کرتا ہے؛ اس میں کامل اخلاص اور عبودیت ہوتی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف فرمادیتے ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”بروز قیامت میری امت کے ایک شخص کو لوگوں کے روبرو پکارا جائے گا۔ اس کے سامنے نانوے رجسٹر کھول کر رکھ دیے جائیں گے جن میں اس کے اعمال قبیحہ درج ہوں گے، ہر رجسٹر وہاں تک پھیلا ہوا ہوگا جہاں تک نظر پہنچے۔ اس سے کہا جائے گا۔ ان میں جو اعمال مندرج ہیں کیا تم ان میں سے کسی کے منکر ہو؟ وہ کہے گا، نہیں، اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا، پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھیل کے برابر لایا جائے گا جس میں ”لا الہ الا اللہ“ تحریر ہوگا۔ وہ شخص کہے گا، کاغذ کا یہ پرزہ ان رجسٹروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ چنانچہ یہ پرزہ ایک پلڑے

① سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلاة، باب ما جاء فی نقصان الصلاة، (حدیث: ۷۹۶)

② سنن ابوداؤد: ج ۲، ح ۷۵۰۔

میں اور وہ رجسٹر دوسرے پڑے میں رکھے جائیں گے۔ کاغذ کے پرزے والا پلڑا جھک جائے گا اور رجسٹروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا۔“^①

اس میں مذکور ہے کہ اس کا عمل سب گناہوں پر چھا جائے گا، یہ اس شخص کا حال ہے جس کے اعمال صدق و اخلاص اور عجز و انکسار کے آئینہ دار ہوں، ورنہ اہل کبار جو دوزخ میں داخل ہوں گے وہ سبھی کلمہ گو ہوں گے۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”ایک آدمی چل رہا تھا، اسی دوران میں اسے پیاس لگی وہ ایک کنویں میں اتر ا اور اس سے پانی پیا، کنویں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی وجہ سے کچھڑ چاٹ رہا ہے، اس نے کہا کہ اس کو بھی ویسی ہی پیاس لگی ہوگی جیسی مجھے لگی تھی، چنانچہ اس نے اپنا موزہ پانی سے بھرا پھر اس کو منہ سے پکڑا پھر اوپر چڑھا اور کتے کو پانی پلایا اللہ نے اس کی نیکی قبول کی، اور اس کو بخش دیا۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ح ۲۲۲۵]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

”ایک کتا ایک کنویں کے گرد گھوم رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ پیاس سے مر جائے گا اتفاق سے کسی بدکار اسرائیلی عورت نے اس کتے کو دیکھ لیا اور اس زانیہ نے اپنا جو تار کر کنویں سے پانی نکال کر اس کتے کو پانی پلادیا جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی بات پر بخش دیا۔“^②

اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

”ایک آدمی راستے میں جا رہا تھا کہ اس نے راہ میں کاٹا پڑا ہوا دیکھا تو اسے ہٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نیکی قبول کی اور اس کی مغفرت کر دی۔“ [صحیح بخاری: ۱/۱۲۸، مسلم ۳/۱۵۲۱]

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”ایک عورت ایک بلی کے متعلق عذاب میں مبتلا کی گئی جسے اس نے باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ وہ بھوک کے سبب سے مر گئی، چنانچہ وہ عورت دوزخ میں داخل ہو گئی، اور آپ نے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ تو نے نہ اسے کھانا کھلایا اور نہ پانی پلایا، جب کہ تو نے اسے باندھ رکھا تھا اور نہ تو نے اسے چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر گزارہ کرتی، یہاں تک کہ وہ بلی مر گئی۔“ [صحیح بخاری: جلد اول: حدیث نمبر ۲۲۲۷]

پہلی عورت نے کتے کو اخلاص قلب اور ایمان و یقین کے ساتھ پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔ ورنہ ایسے نہیں ہے کہ جو بھی زانیہ عورت کتے کو پانی پلائے اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ اور ایسے ہی جس آدمی نے راستہ سے کاٹا ہٹایا؛ اس نے یہ کام اخلاص اور ایمان کی بنیاد پر کیا۔ ایمان اور اخلاص اس کے دل میں موجود تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے اس کی بھی مغفرت کر دی۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ دل میں موجود اخلاص و ایمان کی بنا پر اعمال کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ

① سنن ترمذی کتاب الایمان، باب ما جاء فیمن یموت و هو یشہد ان لا الہ الا اللہ (حدیث: ۴۳۰۰)، سنن ابن ماجہ کتاب الزہد، باب ما یرجی من رحمۃ اللہ یوم القیامۃ (حدیث: ۴۳۰۰)

② صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب (۵۴)، (حدیث: ۳۴۶۷)، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب فضل سقی البہائم المحترمة (حدیث: ۲۲۴۵)۔

امر بھی قابل غور ہے کہ دو آدمی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی نمازوں میں اتنا فرق ہوتا ہے جتنا کہ فاصلہ مشرق و مغرب میں پایا جاتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ راستہ سے ہر کاٹا ہٹا دینے والے کی مغفرت کر دی جائے گی۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو وہ صحابہ کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔“

ابوبکر بن عیاش فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حصہ میں جو فضیلت آئی وہ کثرت صوم و صلوة کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس (صدق و خلوص) کی وجہ سے حاصل ہوئی جو آپ کے دل میں جا گزریں تھا۔“

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا:

”ستارے آسمان کے لیے باعث امن ہیں جب ستارے رخصت ہو جائیں گے تو آسمان سے جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا کر دیا جائے گا۔ اسی طرح میری ذات صحابہ کے لیے باعث امن و سکون ہے جب میں نہیں ہوں گا تو صحابہ موعود مصائب سے دوچار ہو جائیں گے۔ میرے صحابہ میری امت کے لیے باعث امن ہے جب میرے صحابہ رخصت ہو جائیں گے تو امن و امان اٹھ جائے گا۔“ (صحیح مسلم: ۲۵۳۱)

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک جماعت مصروف جنگ ہوگی۔ ان سے دریافت کیا جائے گا، کیا تم میں کوئی صحابی ہے؟ وہ کہیں گے ”ہاں“ چنانچہ انھیں فتح نصیب ہوگی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کر رہی ہوگی۔ اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے کسی صحابی کو دیکھا ہو؟ کہیں گے: ”ہاں“ چنانچہ ان کو فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک جماعت مصروف پیکار ہوگی۔ اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے کسی نے کسی تابعی کو دیکھا ہے؟ کہیں گے: ”ہاں“ چنانچہ وہ فتح و نصرت سے ہم کنار ہوں گے۔“^①

حدیث ہذا کے تمام طرق میں تینوں طبقات (صحابہ تابعین، تبع تابعین) کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے طبقے کا ذکر بعض روایات میں ملتا ہے۔^② متعدد روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے قرون ثلاثہ کی مدح و ستائش فرمائی۔^③

مقصود یہ ہے کہ اعمال کی فضیلت کا انحصار ان کی ظاہری صورت پر نہیں، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر ہے جو کہ دل میں پنہاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بڑا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اس سے ان علماء نے احتجاج کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ہر صحابی بعد میں آنے والے ہر شخص سے افضل ہے۔ جمہور علماء اس مسئلہ میں متحد الخیال ہیں کہ جملہ صحابہ جملہ تابعین سے افضل ہیں، البتہ اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ہر صحابی ہر تابعی سے افضل ہے یا نہیں؟ اسی قاعدہ کے مطابق کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن عبد العزیز سے افضل ہیں یا نہیں؟

① صحیح بخاری، کتاب الجہاد۔ باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب (حدیث: ۲۸۹۷)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونہم (حدیث: ۲۵۳۲)

② صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۲۵۳۲/۲۰۹)

③ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ (ح: ۳۶۵۰، ۳۶۵۱)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونہم (ح: ۲۵۳۳-۲۵۳۵)۔

قاضی عیاض وغیرہ نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کیے ہیں۔ اکثر علماء صحابہ کے ہر فرد کو ہر تابعی سے افضل قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک اور احمد بن حنبل سے یہی منقول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ تابعین کے اعمال صالحہ صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے زہد و عدل میں بڑھ کر تھے۔ مگر فضیلت کا انحصار حقیقت ایمان پر ہے جو کہ ایک قلبی چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ [سبق تخریجہ]

اس نظریہ کے حامل علماء یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ بعض تابعین کے اعمال صحابہ سے بڑھ کر تھے، مگر ہم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا ایمان بھی صحابہ کے ایمان پر فائق تھا۔ اس حدیث میں نبی کریم نے فرمایا کہ متاخرین جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے اگر سونے کا پہاڑ بھی خرچ کریں تو اولین صحابہ کے نصف مد (ایک عربی پیانہ جو کہ قریباً گیارہ چھانک کا ہوتا ہے) کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز نے لوگوں کے حقوق ادا کیے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔ اگر فرض کیا جائے کہ آپ نے لوگوں کو جو کچھ دیا وہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ نے صدقہ کر دیا۔ تاہم اس سے صحابہ کے انفاق فی سبیل اللہ کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور احد پہاڑ جتنا سونا آئے کہاں سے کہ اسے خرچ کیا جاسکے؟ پھر جب کہ بفرض محال اسے خرچ بھی کیا جائے تو بقول نبی کریم وہ نصف مد کے برابر بھی نہ ہوگا۔

علماء سلف میں سے بعض کا قول ہے کہ: ”سرور کائنات ﷺ کی رفاقت میں جو غبار حضرت معاویہ کی ناک میں داخل ہوا وہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے سب اعمال سے افضل ہے۔“

چوتھا سبب: مؤمنین کی دعا: میت پر مسلمانوں کا نماز جنازہ پڑھنا؛ اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنا گناہ بخشے جانے کے اسباب میں سے ایک ہے۔ ایسے ہی نماز جنازہ کے علاوہ دعا کرنا اور اس میت کے لیے استغفار کرنا بھی مغفرت کے اسباب میں سے ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے لوگ آج تک دعا کرتے چلے آ رہے ہیں۔

پانچواں سبب: نبی کریم ﷺ کی دعا اور استغفار: (اپنی زندگی میں اور موت کے بعد) جیسا کہ روز قیامت نبی کریم ﷺ کی شفاعت؛ اس لیے کہ آپ کی دعا اور شفاعت آپ کی حیات و ممات میں سب سے خاص ہے۔

چھٹا سبب: نیک اعمال کا ہدیہ: مثال کے طور پر میت کی طرف سے صدقہ کرنا؛ اس کی طرف سے حج کرے اور روزے رکھے۔ حدیث میں یہ ثابت ہے کہ ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور اس سے انہیں فائدہ ہوتا ہے۔ یہ اولاد کی دعا کے علاوہ ہے۔ اس لیے کہ اولاد خود انسان کے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”جب انسان مر جاتا ہے تو تین اعمال کے علاوہ تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔“ [صحیح مسلم: ۱۹۹۲/۴ والترمذی: ۲۲۰/۲]

انسان کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے۔ ان کی دعا اس انسان کے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔ بخلاف اولاد کے علاوہ دوسرے لوگوں کی دعا کے۔ اس کا شمار اس کے اپنے اعمال میں تو نہیں ہوتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ اس سے نفع دیتا ہے۔

ساتواں سبب: دنیاوی مصائب: جن سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کسی مومن آدمی کو جب بھی کوئی تکلیف یا ایذا کوئی بیماری یا رنج یہاں تک کہ اگر اسے کوئی فکر ہی ہوا اگر کوئی کاٹنا چھتا ہے تو اللہ اس کے بدلہ میں اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔“ (اصحیح مسلم: ج ۳: ح ۱۲۰۶)

[حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل]:

یہ سبھی کو معلوم ہے نبی کریم ﷺ کے بعد افضل ترین زمانہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا زمانہ تھا۔ ان کے بعد مسلمان بادشاہوں کے زمانوں میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے بڑھ کر بہتر زمانہ کسی کا بھی نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ ہی کسی بادشاہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اتنی بہتر اور اچھی رہی ہے جیسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھی۔ یہ اس وقت ہوگا جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا مقابلہ بعد میں آنے والوں کے ادوار سے کیا جائے۔ اور اگر اس دور کا مقابلہ پہلے کے زمانوں سے کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے کی فضیلت ظاہر اور غالب ہے۔

ابوبکر الاثرم رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: ”اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کام کرنے لگو تو لوگ پکار اٹھیں یہ مہدی ہے۔“ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ پالیتے تو کہتے: یہ مہدی ہے۔“ احمد بن حنبل جواس کہتے ہیں مجھے ابو ہریرہ الکلبی نے بتایا کہ اعمش رحمہ اللہ کے ہاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ان کے عدل و انصاف کا ذکر چل پڑا تو اعمش نے کہا: ”اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ لوگوں نے کہا: ”کیا آپ معاویہ کی بردباری کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟“ اعمش نے کہا: ”نہیں اللہ کی قسم! میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل کی بات کر رہا ہوں۔“

ابوبکر ابن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابو اسحق رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ کہتے ہیں: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تو لوگوں کے لیے ان کے باپ دادا کے حساب سے عطیات دینے شروع کیے؛ جب میری باری آئی تو مجھے تین سو درہم ملے۔“ ابو اسحق السمعی رحمہ اللہ کے سامنے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”اگر تم ان کا دور پالیتے؛ یا فرمایا: تم انہیں پالیتے تو کہتے یقیناً یہی مہدی ہے۔“ نیز آپ یہ بھی فرماتے ہیں: ”میں نے معاویہ کے بعد کوئی آپ جیسا نہیں دیکھا۔“ امام بغوی نے اپنی سند سے ابوقیس سے روایت کیا ہے: آپ فرماتے ہیں: ”امیر معاویہ نے ہر قبیلہ پر ایک آدمی مقرر کیا ہوا تھا۔ ہم میں ایک آدمی تھا جس کی کنیت ابو یحییٰ تھی۔ وہ ہر دن صبح کے وقت مجالس کا چکر لگاتا؛ اور پوچھتا: کیا کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ کیا آج رات کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟ کیا آج تمہارے ہاں کوئی نیا آدمی آیا؟ تو لوگ کہتے: ہاں آج رات یمن سے ایک آدمی اپنے اہل و عیال کے ساتھ آیا ہے؛ پھر اس کا اور اس کے عیال کا نام لیتے۔ جب یہ نگران اس مہم سے فارغ ہو جاتا تو وظائف کا رجسٹر لایا جاتا؛ اور ان لوگوں کے نام اس میں لکھ دیئے جاتے۔

عطیہ بن قیس فرماتے ہیں: میں معاویہ بن ابوسفیان کو سنا وہ ہمیں خطبہ دے رہے تھے؛ آپ کہہ رہے تھے:

”تم لوگوں کے وظائف دینے کے بعد بھی بیت المال میں کچھ مال بچ گیا ہے۔ بیشک میں وہ مال تمہارے درمیان تقسیم کرنے والا ہوں۔ اگر آئندہ سال بھی ایسے ہی زیادہ مال آگیا تو میں آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو

مجھ پر کوئی عیب نہ لگانا۔ بیشک یہ میرا مال نہیں ہے۔ بیشک یہ وہ مال ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو نوازا ہے۔“
سیرت و کردار اور عدل و احسان کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا دامن ایسے فضائل و مناقب سے پر ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں۔ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: معاویہ نے ٹھیک کیا، وہ فقیہ ہیں۔^①
حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ”میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی شخص کو نہیں دیکھا جس کی نماز نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہو۔“^②

یہ ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تہذیب و ثقہ کے بارے میں! فقہت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گواہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، اور حسن صلوٰۃ کی گواہی دینے والے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ، دونوں جس پایہ کے صحابی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے مویذ آثار اور بھی بہت ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سابقین اولین صحابہ میں شمار نہیں ہوتے۔ بخلاف ازیں کہا گیا ہے کہ آپ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت معاویہ خود اس بات کے معترف تھے کہ وہ فضلاء صحابہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے بادصف آپ کثیر اوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی سلطنت حدود خراسان سے لے کر مغرب میں بلاد افریقہ اور قبرص سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی تھی، اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ معاویہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تو درکنار عظمت و فضیلت میں حضرت عثمان و علی کے قریب بھی نہ تھے۔ پھر کسی اور بادشاہ کو ان کے مشابہ کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟ نیز مسلم سلاطین میں سے کوئی مسلم سلطان سیرت و کردار کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا حریف کیسے ہو سکے گا؟

یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ امت میں جو فتنے پیدا ہوئے اور جو گناہ سرزد ہوئے ان سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہیں بہت دور کا اور بہت کم ہی واسطہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی گناہوں کا کفارہ بننے والے امور و اعمال موجود ہیں۔ جب کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم افاضل لوگ ہیں۔ اور ان کی اکثریت فتنوں میں شریک نہیں ہوئی۔

اکابر صحابہ نے فتنہ پردازی میں حصہ نہیں لیا تھا ایوب بختانی رضی اللہ عنہ ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:
جب فتنہ کی آگ بھڑکی تو اس وقت دس ہزار صحابہ بقید حیات تھے، مگر سوا صحابہ نے بھی فتنہ پردازی میں شرکت نہ کی، بلکہ بالفاظ صحیح تر تیس صحابہ بھی اس میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ ابن سیرین کا قول ہے جو زہد و ورع کی وجہ سے بڑی محتاط گفتگو کرنے کے خوگر تھے۔ منصور بن عبد الرحمان نے کہا کہ امام شعبی کا قول ہے:

”نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے جنگ جمل میں صرف حضرت علی، عمار، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہوئے، اگر کوئی شخص پانچویں صحابی کا نام بتا دے تو میں کاذب ٹھہروں گا۔“ امام شعبی رضی اللہ عنہ کا مطلب سابقین مہاجرین صحابہ کا ذکر کرنا تھا۔

عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جنگ صفین میں ستر بدری صحابہ رضی اللہ عنہم نے شرکت کی تھی۔“
جب شیعہ نے یہ بات سنی تو انھوں نے کہا اللہ کی قسم! یہ جھوٹ ہے، صرف خزیمہ بن ثابت نے صفین میں شرکت کی تھی۔

① صحیح بخاری، باب ذکر معاویہ رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۷۶۵) ② طبرانی کما فی المجمع (۹/۳۵۷)۔

امام ذہبی فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل و صفین میں بہت تھوڑے صحابہ شامل ہوئے تھے۔

اتھواں سبب: فتنہ قبر: جن اسباب کی بنا پر ایک مومن عذاب دوزخ سے نجات پائے گا۔ ان میں وہ تکلیف بھی شامل ہے جو مومن قبر میں اٹھائے گا۔ نیز منکر و نکیر کا سوال کرنا اور روز محشر کا درو و کرب سب اس میں داخل ہے۔

نواں سبب: محشر کی سختیاں: میدان محشر کے خوف اور سختیوں کی وجہ سے بھی لوگوں کے گناہ معاف کیے جائیں گے۔

دسواں سبب: پل صراط کا عبور: بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مومن جب پل صراط سے گزریں گے تو جنت و جہنم کے درمیان انھیں ایک پل پر پھرا لیا جائے گا، جہاں وہ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے بعد پاک صاف ہو کر جنت میں جا داخل ہوں گے۔^①

یہ ایسے امور ہیں جو شاذ و نادر ہی مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، پھر صحابہ خیر القرون کے مصداق ہونے کے باوجود انھیں کیوں کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ ان گناہوں کے بارے میں جو حقیقت میں سرزد ہوئے ہوں۔ پھر ان کا کیا کہنا ہوگا جو آپ کے ذمہ جھوٹ موٹ لگا دیئے گئے ہوں؟ یا وہ امور جو حقیقت میں تو نیکیاں اور اچھائیاں ہیں، مگر جان بوجھ بدل کر برائیوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے؟

یہ صحیح روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی موجودگی میں حضرت عثمان پر تنقید کی اور کہا کہ وہ جنگ احد میں بھاگ گئے تھے۔ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اور بیعت رضوان میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ سن کر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا:

”احد میں بھاگ جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی تھی۔ ایک روایت میں ہے: آپ نے فرمایا:

وہ احد کے دن بھاگے اللہ تعالیٰ نے یہ لغزش معاف کر دی، مگر تم اسے گناہ سمجھ کر ابھی تک معاف نہیں کر رہے ہو۔ جب کہ بدر میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی بیٹی کی تیار داری کے لیے پیچھے چھوڑ دیا اور مال غنیمت میں سے ان کو حصہ بھی دیا تھا۔ جب کہ بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ بیعت کرتے وقت اپنا ہاتھ استعمال کیا تھا اور آپ کا ہاتھ عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے بہتر تھا۔^②

[معائب صحابہ حسد یا کذب پر مبنی]:

[حضرات صحابہ پر وارو کیے جانے والے عام اعتراضات یا تو بغض و حسد کے آئینہ دار ہیں یا کذب و دروغ گوئی پر مبنی ہیں]۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نا اہل لوگوں کو عہدے عطا کیے تھے۔“

[جواب]: اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ یہ دعوے ہی سرے سے باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ نے صرف وہی لوگ مناصب پر تعینات کیے تھے جو ان کے اہل تھے۔ کسی نا اہل کو ہرگز کوئی منصب نہیں دیا۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ [بالفرض اگر مان لیا جائے کہ] آپ نے نا اہل لوگوں کو منصب عطا کیے تھے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

① صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص، يوم القيامة، (حدیث: ۶۵۳۵)

② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۶۹۹)

ایسا کرنے میں ایک مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی۔ آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ انسان اس منصب کا اہل مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہ ہوا ہو۔ [یہ ایسی غلطی ہے جو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دی]۔ تو پھر ایسی بات آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہو سکتی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ تفسیر و حدیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ بڑا مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ بن معیط کو کچھ قبائل سے صدقات لینے کے لیے والی مقرر فرمایا۔ جب یہ ان کی بستی کے قریب پہنچا تو وہ لوگ اس کے استقبال کے لیے نکلے؛ [چونکہ ان کے مابین کچھ پرانی رنجشیں تھیں؛ اس وجہ سے یہ غلط سمجھا] اس نے سوچا یہ لوگ مجھ سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ لوگ تو جنگ کرنے پر اترا آئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قبیلہ کی سرکوبی کے لیے لشکر روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا؛ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْحَبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾ [الحجرات ۶]

”اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی ناقابل اعتماد آدمی کوئی خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے لئے پریشانی اٹھاؤ۔“

اگر ایک عامل کا حال نبی کریم ﷺ پر مخفی رہ سکتا ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیسے مخفی نہیں رہ سکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد بھی ایسے لوگ تعینات کیے؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: تو بہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ مرتد ہو گیا تھا، پھر مسلمان ہو کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا، تو آپ نے اس کی معذرت قبول کی حالانکہ آپ نے اسے مباح الدم قرار دیا تھا۔ مزید یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے سابقہ پڑا تھا اور عتال کی ایسی حرکات ان کے علم میں آئیں جن کی آپ کو توقع نہ تھی۔ ایسی باتیں نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں موجب طعن ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کی شان میں۔ اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ علم ہونے کے باوجود کہ دوسرے افراد اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہیں، پھر بھی انہی کو تعینات کیا۔ تو یہ مسئلہ اصل میں اجتہاد کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: ”آپ کے اقارب کی محبت نے آپ کو ان کی طرف مائل کر دیا تھا؛ یہاں تک کہ آپ ان لوگوں کو دوسرے لوگوں کی نسبت سے زیادہ حق دار سمجھنے لگے۔ یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ آپ نے کیا؛ وہ گناہ کا کام تھا۔“ اس سے پہلے یہ بیان گزر چکا ہے کہ آپ کے گناہوں پر آخرت میں مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”آپ کے بعض عمال سے فسق و فجور کے کام سرزد ہوئے اور بعض نے خیانت کی۔“

[جواب]: اس سے کہا جائے گا کہ: ولایت مل جانے کے بعد کسی چیز کا ظاہر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ

مرض اس سے پہلے بھی موجود تھا۔ اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ آپ نے یہ علم ہونے کے بعد انہیں ولایت پر تعینات کیا تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے شراب پی ہے تو آپ نے اسے بلا کر اس پر حد قائم کی۔ اور آپ ان لوگوں کو معزول بھی کیا کرتے تھے جنہیں معزول کرنے کا مستحق سمجھا کرتے تھے۔ اور جسے حد کا مستحق سمجھتے تھے اس پر حد بھی

تاکم کیا کرتے تھے۔

[اعتراض:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب میں مال تقسیم کیا تھا۔“

[جواب:] ہم کہتے ہیں کہ حد سے زیادہ یہ گناہ ہو سکتا ہے؛ پھر یہ ایسا گناہ نہیں جس پر آخرت میں سزا دی جائے۔

اسے ایک اجتہادی غلطی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

یہ مسئلہ علماء کے یہاں مختلف فیہا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں جن اختیارات سے بہرہ ور تھے۔ آپ کے امام و خلیفہ کو وہ اختیارات حاصل ہوں گے یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ اور ایسے ہی اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب یتیم کا ولی دولت مند ہو تو کیا وہ یتیم کے مال میں سے اپنی اجرت وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا اجرت کا ترک کرنا واجب ہے یا افضل؟ جو علماء تو نگری کے باوجود یتیم کے مال میں سے اجرت لینے کو جائز تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک امام و خلیفہ بھی بیت المال میں سے اپنی اجرت وصول کر سکتا ہے۔ اسی طرح قاضی و حاکم کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

اور جو علماء یتیم کے مال میں سے اجرت وصول کرنے کو ناروا تصور کرتے ہیں، ان میں سے بعض بیت المال میں سے اپنی اجرت لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، جس طرح زکوٰۃ وصول کرنے والا تو نگری کے باوجود اس میں سے اپنی اجرت لینے کا مجاز ہے۔ یتیم کے ولی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء: ۶)

”جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو تنگ دست ہو وہ حسب دستور اس میں سے کھالیا کرے۔“

بعض فقہاء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقارب کا حصہ خلیفہ و امام کے رشتہ داروں کو ملے گا۔ حضرت حسن [بحری] اور ابو ثور رحمہما اسی کے قائل ہیں۔ نبی ﷺ اپنے اقارب کو بحکم ولایت عطیہ جات دیا کرتے تھے۔ اکثر علماء کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی وفات سے آپ کے اقارب کا حق ساقط ہو گیا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا نظریہ یہی ہے۔

جب آپ کا حق ساقط ہو گیا تو اب اس ساقط شدہ حق کے متعلق علماء کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ اس سے گھوڑے اور دیگر سامان حرب خریدنے پر خرچ کیا جائے؛ اور مصلحت کے امور پر خرچ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اسی پر عمل فرماتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس حق پر اب آپ کے بعد خلیفہ کا حق ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی تاویل سے کام لیا تھا، ان سے منقول ہے کہ آپ نے خود اس کا ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے کام کی اجرت لے لیا کرتے تھے، اور ایسا کرنا آپ کے لیے جائز تھا۔ اگرچہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل بلاشبہ افضل تھا۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں باتوں پر عمل کرنے کے مجاز تھے۔ اور جو مال آپ کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا اس میں سے اپنے اقارب کو دیا کرتے تھے۔

وہ اپنے اقارب کو اس خیال سے عطیہ جات دیا کرتے تھے کہ وہ بقول مجوزین امام و خلیفہ کے اقارب تھے۔

خلاصہ کلام! جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے وہ اپنے اقارب کو مال دیا کرتے تھے یا ان کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اقارب کو بعض علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کیا اس نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی۔
[جواب]: اس میں کوئی ملامت والی بات نہیں۔ کیونکہ جب آپ کو اس چیز کا علم ہوا تو آپ نے ولید بن عقبہ کو بلا بھیجا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان پر حد قائم کی؛ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اٹھیے اور انہیں کوڑے لگائیے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ کوڑے لگائیں مگر انہوں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن جعفر سے کہا: آپ انہیں اور انہیں کوڑے لگائیں؛ پھر آپ نے انہیں چالیس کوڑے لگائے۔ پھر فرمایا: رک جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے چالیس کوڑے ہی لگائے تھے؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگائے؛ ان میں سے ہر ایک سنت ہے؛ مگر یہ عدد میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے۔ [رواہ مسلم]۔
جب آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے اور ان کے سامنے حد قائم کی تو یقیناً آپ نے واجب ادا کر دیا۔
[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا والی مقرر کیا اس نے وہاں ایسے کام کیے جن کی بنا پر اسے کوفہ سے نکال دیا گیا۔“

[جواب]: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اہل کوفہ نے سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور انہیں کوفہ سے نکال دیا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سعید قصور وار بھی ہوں اور آپ کو وہاں سے نکالنا واجب ہو چکا ہو۔ اس لیے کہ اہل کوفہ اپنے امراء کے خلاف ہمیشہ بغاوت و سرکشی کا مظاہرہ کرنے کے خوگر تھے۔ اسی قدیم عادت کے پیش نظر انہوں نے سعید رضی اللہ عنہ سے یہ سلوک روا رکھا حالانکہ آپ نے ہی شہر فتح کئے تھے؛ اور کسری کے لشکروں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ آپ چھ اہل شوریٰ میں سے ایک تھے۔ سعید رضی اللہ عنہ جیسا امیر کوفہ والوں کو نصیب نہیں ہو سکا۔ اہل کوفہ تو ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ یہی کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے عمار بن یاسر؛ سعد بن ابی وقاص؛ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر بددعا کی تھی:

”اے اللہ! انہوں نے مجھ پر اس امارت کو ملتیس [خلط ملط] کر دیا ہے تو ان پر اس کو ملتیس کر دے۔“

اور اگر مان لیا جائے کہ آپ نے کوئی گناہ کا کام کیا تھا۔ تو اس سے کہیں بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس گناہ پر راضی بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین نے بہت ہی زیادہ گناہ کیے تھے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے متعین کردہ نائبین سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ امام تو اس وقت [شریک گناہ یا] گنہگار ہوتا ہے جب وہ اپنا واجب فریضہ چھوڑ دے اور ان پر حد قائم نہ کرے۔ یہ کسی کا حق پورا نہ کرے؛ یا کسی پر ظلم و تعدی کا ارتکاب کرے۔ اور اگر گناہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی اس بارے میں تفصیل سے کلام پہلے گزر چکا ہے۔

[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام خط کا مسئلہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: بلا دمصر میں عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا جہاں اس نے بہت مظالم

۱ ہم قبل ازیں سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سیرت و سوانح اور مدارم اخلاق پر روشنی ڈال چکے اور بتا چکے ہیں کہ انھوں نے دعوت اسلام کو فروغ دینے میں کس حد تک مساعی جلیلہ انجام دی تھیں۔ اہل کوفہ کی یہ حالت تھی کہ اگر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی ان کا امیر بنا دیا جاتا تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔

ڈھائے۔ لوگوں نے جب اسکی شکایت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوشیدہ طور پر اسے لکھا کہ وہ اپنے عہدے پر ڈٹا رہے۔ یہ اس کھلے خط کے خلاف تھا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ [جس میں اسے معزول کیا گیا تھا]۔

[جواب]: یہ صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا تھا کہ انھوں نے یہ نہیں لکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یقیناً اپنی قسم میں سچے اور حق پر تھے۔ بلکہ حد سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مروان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بتائے بغیر یہ خط لکھ دیا تھا۔ جب انھوں نے مروان کو ان لوگوں کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا تھا تا کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ تو آپ نے اس سے انکار کر دیا۔

اگر مروان کا قتل ناروا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا واجب ادا کر دیا تو پھر آپ کا یہ اقدام درست ٹھہرا۔ اور اگر اسے قتل کرنا جائز تھا اور واجب نہ تھا؛ تو آپ نے ایک جائز کام کیا۔ اور اگر وہ واجب القتل تھا؛ تو یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ آپ کے ہاں کسی بھی دلیل سے مروان کا شرعاً واجب القتل ہونا ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے کہ محض جھوٹی باتیں گھڑ لینے سے کوئی واجب القتل نہیں ہو جاتا۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مروان کو قتل نہ کر کے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ تو ہم اس بارے میں تفصیلی کلام کر چکے ہیں۔ نیز ہم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ گناہوں سے پاک تھے؟ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے بے شمار اچھے کام بھی کیے ہیں۔ مزید برآں آپ بدی صحابہ میں شامل ہیں، جن کی مغفرت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔“

[جواب]: یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر صریح افتراء پر دازی ہے۔ جو شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار سے آگاہ ہے، اور وہ ذرا بھی مجرب عدل و انصاف سے کام لینے والا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ آپ نے کبھی بھی محمد بن ابوبکر یا ان جیسے کسی بھی دوسرے انسان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی آپ کے بارے میں کبھی یہ ثابت ہو سکا ہے کہ آپ نے کسی ایسی بات پر کسی کو قتل کروایا ہو۔ [بلکہ] لوگ ان کو قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ آپ نے کسی ایک کو بھی اپنی ذات کے دفاع کے لیے لڑنے کا حکم دیا۔ تو پھر آپ ایک معصوم الدم کو بلا وجہ کیوں کر قتل کر سکتے تھے؟

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا؛ تب بھی یہ بات آپ پر موجب طعن نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اگر آپ نے محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شراک ازالہ کیا جائے۔ لہذا امت کی مصلحت کے نقطہ خیال سے ایسا کیا۔ اور اگر آپ نے ایسا حکم دیا تھا تو آپ ان لوگوں کی نسبت اطاعت کے زیادہ حق دار تھے جو مروان کو طلب کر رہے تھے تاکہ اسے قتل کیا جائے۔

اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہدایت، کے امام ہیں۔ آپ خلیفہ راشد ہیں۔ اور امت کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کی سیاست کرنا آپ کی ذمہ داری تھی۔ [اور آپ پر] واجب تھا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جائے جن کے قتل کے بغیر شر و فساد کا خاتمہ ہونا ممکن نہ ہو۔ جب کہ مروان کو قتل کرنے کے لیے طلب کرنے والے کچھ باغی لوگ تھے جن کے پیش نظر زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ نہ ہی انہیں کسی ایک کو قتل کرنے کا اختیار حاصل تھا اور نہ ہی کسی پر حد قائم

کرنے کا اختیار تھا۔ ان کی انتہائی غایت یہ ہو سکتی ہے کہ بعض امور میں ان پر ظلم ہوا ہو۔ تو کسی بھی مظلوم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ظلم کرنے والے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے۔ بلکہ انہیں تو کسی پر حد قائم کرنے کا بھی اختیار حاصل نہیں۔

مروان محمد بن ابوبکر سے بڑھ کر شریر اور فسادی نہ تھے۔ اور نہ ہی محمد بن ابوبکر علم اور دین داری میں مروان سے زیادہ مشہور تھا۔ بلکہ صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں مروان سے کئی ایک احادیث روایت کی ہیں۔ اور اہل علم و فتویٰ کے ساتھ اس کے اقوال بھی نقل کیا جاتا ہے۔ آپ کے صحابی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔

جب کہ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے ہاں یہ مقام حاصل نہیں۔ انہوں نے ذوالقعدہ سے لیکر ربیع الاول کے شروع تک کی نبی کریم ﷺ کی زندگی کے صرف چند ماہ پائے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کی پیدائش پچیس جتہ الوداع والے سال ذوالقعدہ کے مہینے میں ذوالحلیفہ کے مقام پر ہوئی۔ جب کہ مروان کا شمار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ و معاصرین میں سے ہوتا ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کو پایا ہے۔ اور ممکن ہے کہ فتح مکہ پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھا بھی ہو؛ یا پھر جتہ الوداع کے سال رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔ اور جن لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا اس لیے کہ آپ اپنے والد کے ساتھ طائف میں تھے۔ اور نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو ان کے والد طائف میں ہی تھے۔ اور آپ بھی اپنے والد کے ساتھ ہی تھے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ان کے والد کو طائف کی طرف جلا وطن کر دیا تھا۔ بہت سارے اہل علم اس کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے طائف گئے تھے۔ آپ کو جلا وطن کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔

یہ فتح مکہ کے بعد کی بات ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کے والد سارے آزاد کردہ لوگوں کے ساتھ مکہ میں موجود تھے۔ اور اس مروان کی عمر حد تمیز [بلوغت کے قریب] کو پہنچ چکی تھی۔ اس بنا پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے والد نے جب لوگوں کے ساتھ حج کیا تو آپ نے رسول اللہ ﷺ کا دیدار بھی کیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ مدینہ آئے ہوں اور وہاں پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔ الغرض شرف دیدار کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ آپ کے معاصر حضرت عبداللہ بن زبیر؛ حضرت مسور بن مخرمہ؛ یہ لوگ مدینہ میں موجود تھے اور نبی کریم ﷺ سے ان کا سامع ثابت ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ حضرت عثمان نے ان کو والی شام مقرر کیا اور آپ نے وہاں پر نئے نئے فتنے پیدا کیے۔“

[جواب]: معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس وقت اس منصب پر تعینات کیا تھا جب ان کے بھائی یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ بھائی کی جگہ یہ منصب آپ کو تفویض کیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپ اسی منصب پر قائم رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی ولایت میں وسعت دیدی تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت اپنی رعایا کے ساتھ تمام والیوں سے زیادہ بہتر تھی۔ لوگ آپ کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث مبارک میں ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

”تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں، تمہارے بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں، جن پر تم لعنت

بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہوں۔“ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حوادث اور فتنے اس وقت ظہور پذیر ہوئے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ یہ ایسا اور اتنا سخت فتنہ تھا کہ اس نے تمام لوگوں کو اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا؛ صرف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ بلکہ [حق تو یہ ہے کہ] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دوسرے کئی لوگوں سے بڑھ کر امن و سلامتی کے طلبگار تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی نسبت شروفساد سے بہت زیادہ دور رہنے والے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ولایت و حکام مثلاً اشتر بنی و محمد بن ابی بکر و عبید اللہ بن عمر و ابوالاعور سلمي؛ ہاشم بن ہاشم بن ہاشم المرقال؛ اشعث بن قیس الکندی؛ اور بشر بن ارطاة کے علاوہ دوسرے جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے؛ ان سے یقیناً افضل تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”آپ نے عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی بنایا؛ جس نے بہت سارے برے کام کیے۔“

[جواب]: حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی اتنی نیکیاں ہیں اور لوگ آپ سے اس قدر محبت کرتے تھے جو کہ بیان محتاج نہیں۔ بالفرض اگر آپ نے کوئی گناہ کا کام کیا بھی تھا تو اس کا بوجھ آپ پر ہی ہے۔ یہ کس نے کہہ دیا کہ کسی برائی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راضی تھے؟

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”آپ نے مروان کو والی مقرر کر کے اپنی انگلیوں اس کے حوالے کر دی جس کا نتیجہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے امت میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔“

[جواب]: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کیے جانے کا سبب صرف اکیلے حضرت مروان نہیں تھے۔ بلکہ اس میں کئی امور جمع ہو چکے تھے۔ ان جملہ امور میں سے وہ امور بھی تھے جن کا مروان پر انکار کیا جاتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑی عمر کے ہو چکے تھے۔ یہ لوگ بعض ایسی حرکات کرتے جن کے بارے میں آپ کو نہیں بتایا کرتے تھے۔ پس آپ نے انہیں ایسے امور کے کرنے کا نہیں حکم دیا جن کا تم انکار کرتے ہو۔ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ ایسی باتوں سے دور رہنے؛ اور انہیں ختم کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ پس کبھی ایسے کیا کرتے اور کبھی ایسے کیا کرتے تھے۔ اس کا عام جواب پہلے گزر چکا ہے۔

جب مفسدین مدینہ میں آدھمکے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کئی باتوں کی شکایت کی۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان تمام شکایتوں کو ازالہ کیا۔ اور جن لوگوں کو ان فساد یوں نے معزول کرنے کا مطالبہ کیا تھا؛ انہیں معزول کیا۔ اور یہ بھی اعلان کیا کہ بیت المال کا کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جائے گا جنہیں وہ پسند کرتے ہوں گے۔ اور یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے بغیر کسی کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اب ان کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

”انہیں تم نے ایسے نچوڑ دیا جیسے کپڑے کو نچوڑ دیا جاتا ہے؛ اور پھر تم نے ان کا قصد کیا اور ان پر ظلم کرتے ہوئے قتل

کر دیا۔“ [مسلم ۱۴۸۱/۳]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کے نام سے ایک جھوٹا خط لکھ لیا گیا تھا؛ جس میں ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ اور انہوں

نے یہ خط راستہ میں پایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خط کا بھرپور انکار کیا تھا۔ آپ اپنے قول میں بالکل سچے تھے۔ پھر انہوں نے اس کا الزام مروان پر لگایا؛ اور آپ سے مطالبہ کیا کہ مروان کو ان کے حوالہ کیا جائے تاکہ وہ اسے قتل کر سکیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اگر مان لیا جائے کہ بات صحیح بھی ہے؛ تو پھر بھی جو کچھ ان لوگوں نے عثمان کے ساتھ کیا؛ وہ اس بات کی بنا پر مباح یا جائز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہو سکتی ہے کہ مروان ان لوگوں کو قتل کروانے کے اپنے ارادہ میں گنہگار ہو۔ لیکن اس کی مراد پوری نہ ہو سکی۔ جو کوئی کسی انسان کو قتل کرنے کی کوشش کرے؛ مگر اسے قتل نہ کرے؛ تو صرف اس کوشش کی وجہ سے اس کو قتل کرنا واجب نہیں ہو جاتا۔ پس ایسے معمولی سے مسئلہ کی بنا پر مروان کو قتل کرنا واجب نہیں ہو گیا تھا۔ ہاں ایسے لوگوں کو بچنا ضروری تھا جو اس قسم کی حرکات کرتے ہوں۔ اور ان لوگوں کو ان کے مناصب سے سبکدوش کر کے ادب سکھانا چاہیے تھا۔ لیکن قتل کرنا یہ بہت ہی خطرناک معاملہ ہے۔

[اُقرباء پروری کی حقیقت کیا ہے:]

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے اقارب کو بہت زیادہ نوازتے رہتے؛ اور انہیں دوسرے لوگوں پر ترجیح دیتے تھے۔ قریش میں سے ان کے چار داماد تھے، ان کو چار لاکھ دینار عطا کیے۔ مروان کو دس لاکھ دینار دیئے۔“

[جواب]: پہلی بات: اس واقعہ کی نقل کہاں ثابت ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنے اقارب کو بھی بیت المال میں سے ایسے ہی دیا کرتے تھے جیسے دوسرے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ آپ تمام مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنے والے تھے۔ لیکن جس صورت میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کو صحیح ثابت کرنا بھی چاہیے۔ [یہ محض جھوٹ ہے۔]

دوسری بات: یہ تو ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور نہ ہی خلفاء راشدین میں سے کسی دوسرے خلیفہ نے اپنے اقارب کو اس قدر مال دیا۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کی تالیف قلب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ دیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے تیس لاکھ درہم دیئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی رقم کبھی کسی کو نہیں دی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے بعض اقارب کو دیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے آپ پر انکار بھی کیا گیا۔ مگر اس کی تاویل پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ایسا کیوں کرتے تھے۔ جب کہ اس بارے میں عام جواب آگے آئے گا۔

اپنے اقارب کو نوازنے میں آپ دو تا ویلوں کا شکار تھے؛ ان میں سے ہر تا ویل فقہاء ایک طائفہ کا مذہب ہے۔ پہلی تاویل: اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت میں جو حصہ اپنے رسول ﷺ کا رکھا تھا؛ وہ آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء کا حق ہے۔ فقہاء کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ اس بارے میں اس مسند اور معروف حدیث روایت کی گئی ہے۔ اس کے جزئیات کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زندگی میں جیسے لوگ آپ کے ذوالقربی تھے؛ [یعنی مال غنیمت میں ان کا حصہ متعین تھا] آپ کے بعد ویسے ہی لوگ آپ کے خلفاء اور جانشینوں کے ذوالقربی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ: حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما

کے اتنے زیادہ رشتہ دار نہیں تھے جتنے زیادہ رشتہ دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تھے۔ اس لیے کہ بنو عبد شمس قریشی قبائل میں سے سب سے بڑا قبیلہ تھا؛ ان کے برابر کا قبیلہ صرف بنو مخزوم تھے۔ اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے اپنے خونی رشتہ داروں پر خرچ کرے۔ جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ولی امر کے پاس وہ مال آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذوالقربیٰ کا حصہ مقرر کیا ہے؛ تو اس بات پر وہ مستحق ٹھہرتے ہیں کہ وہ مال انہیں دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ خلیفہ یا امام کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ ولی امر کی مدد اور اس کا دفاع کرنا فرض ہے۔ اور جس طرح اس کے اقارب اس کی مدد یا دفاع کر سکتے ہیں؛ ایسے کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔

خلاصہ کلام! ہر حاکم کے لیے ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر اس کی مدد کریں۔ اور جو لوگ اسے ضرر پہنچانا چاہتے ہوں؛ ان سے دفاع کریں۔ جیسا کہ لوگ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھے۔ اور پھر ان لوگوں کی بھی کفالت [اور کفالت] کا کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ ایک تاویل ہے۔

دوسری تاویل: آپ ان اموال میں تصرف کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ [زکوٰۃ و صدقات کے مصارف بیان کرتے ہوئے] فرماتے ہیں: ﴿وَالْعَلَمِينَ عَلَيْنَا﴾ [التوبہ ۶۰]

”اور اس میں کام کرنے والوں کا بھی حصہ ہے۔“

صدقات اور زکوٰۃ وصول کرنے والا عامل اپنی تو نگری کے باوجود اس مال میں سے اپنی اجرت لینے کا مجاز ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

یتیم کے مال کی دیکھ بھال کرنے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء: ۶)

”جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو تنگ دست ہو وہ حسب دستور اس میں سے کھالیا کرے۔“

اس میں اختلاف ہے کہ کیا بیت المال کا والی؛ ناظر وقف بھی صدقہ وصول کرنے والے اور یتیم کے مال کی دیکھ بھال کرنے والے کی طرح ہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

اگر امام یا خلیفہ کو صدقات وصول کرنے والے عامل کی طرح سمجھا جائے تو وہ غنی ہونے کے باوجود اس مال میں سے لینے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اور اگر اسے یتیم کے ولی کی طرح سمجھا جائے تو پھر اس میں دو قول ہیں۔ سب ملا کر کل یہ تین قول ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں ان میں سے دو قول تھے۔

آپ کے لیے مالدار ہونے کے باوجود اس مال میں سے لینا جائز تھا۔ یہ فقہاء کا مذہب ہے؛ اس میں بادشاہوں کی سی اغراض کو کوئی دخل نہیں جن پر کوئی بھی اہل علم موافقت نہ کرتا ہو۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر یہ تاویلات شریعت کے مطابق رائج ہیں تو پھر ان میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ تاویلات مرجوح ہیں؛ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو کچھ ہوا؛ اور مسلمانوں کے مابین جتنی خوزیزی ہوئی وہ اس سے زیادہ تاویل یا عذر کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ ان اقوال سے حجت اخذ کرنا ان لوگوں کی جنتوں سے زیادہ مضبوط ہے جن کی رائے کی وجہ سے جنگوں کی آگ بھڑکی۔

[حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جناب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بناتے اور ان کی تکفیر کیا کرتے تھے۔“

[جواب]: یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک جھوٹا الزام ہے۔ علماء کرام اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کو فہ تشریف لے گئے اور وہاں پر فرمایا:

”ہم نے اپنے سے سب سے اعلیٰ اور اونچا مقام رکھنے والے کو والی مقرر کیا ہے؛ اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔“
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلافت کے پہلے چند سال نظام بالکل درست چلتا رہا۔ جب آخری چند سال آئے تو آپ پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ بعض امور ایسے تھے جن میں لوگ معذور تھے۔ اور بہت سارے امور ایسے تھے جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معذور تھے۔

ان جملہ امور میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معاملہ بھی ہے۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس لیے ناراض ہو گئے تھے کہ آپ نے قرآن کریم کی کتابت ان کی بجائے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سپرد کی تھی^① اور باقی صحابہ کو حکم دیدیا تھا کہ اپنے پاس موجود مصاحف کو دھو کر ختم کر دیں۔ جمہور صحابہ اس ضمن میں حضرت عثمان کے ساتھ تھے۔ اس سے پہلے جمع

① ابو عبد اللہ زہدانی ایک شیعہ معاصر نے اپنی کتاب تاریخ القرآن کے صفحہ ۴۶ پر لکھا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف ابن طاووس التوسی (۵۸۹-۶۶۳) ایک شیعہ عالم نے اپنی کتاب ”مسند السعد“ میں علامہ شہرستانی کی تفسیر کے مقدمہ سے بروایت سدید بن علقمہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے: ”ارے لوگو! اللہ سے ڈرو اور عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لو اور یہ نہ کہو کہ انھوں نے قرآن کے اوراق جلا دیے تھے۔ اللہ کی قسم یہ اوراق انھوں نے صحابہ کی ایک جماعت کے رو برد جلائے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ہمیں جمع کیا اور کہا: ”ان مختلف قراءتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ایک شخص دوسرے سے مل کر کہتا ہے کہ میری قراءت تم سے بہتر ہے اس کا نتیجہ کفر کی صورت میں برآمد ہوگا۔“ ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں لوگوں کو ایک قرآن پر جمع کرنا چاہتا ہوں۔ اگر قراءت قرآن میں ابھی تمہارے یہاں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو بعد میں آنے والے مسلمان شدید اختلافات میں مبتلا ہو جائیں گے۔“ ہم نے کہا: ”آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔“ خطیب نے العوام من القوام ص ۶۳-۶۴، کے حواشی میں لکھا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جملہ بلاد اسلامیہ میں قرآن کے ایک ہی نسخہ کو پھیلانا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس بات پر متفق کرنا چاہا۔ مصنف عثمانی ہی قرآن کریم کا وہ کامل نسخہ ہے جو قرآن کریم کی اس قراءت کے مطابق ہے جس کے مطابق سیدنا جبرائیل نے نبی کریم ﷺ کو آخری مرتبہ قرآن کریم سنایا تھا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ کتابت قرآن کی خدمت انھیں سپرد کی جائے، آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ قبل ازیں قرآن کا جو نسخہ جمع کر چکے ہیں اسے باقی رکھا جائے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ دونوں باتیں تسلیم نہ کیں۔

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت تجویز کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے آپ کو خلافت صدیقی میں اس کام پر مامور فرمایا تھا۔ کیوں کہ آخری مرتبہ جس قراءت کے مطابق قرآن نبی کریم ﷺ کو سنایا گیا تھا۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو وہ قراءت یاد تھی، لہذا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت تفویض کرنے میں حق بجانب تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علم و فضل اور صدق ایمان سے آگاہ نہ تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس فعل میں بھی حق بجانب تھے کہ آپ نے قرآن کریم کے تمام نسخوں کو دھوا ڈالا تھا، اس میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف بھی شامل تھا۔ اجماع صحابہ کے مطابق پوری امت کو قرآن کریم کے ایک صحیح تر اور کامل نسخہ پر جمع کرنا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ تاہم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قدر افزائی کرتے رہے اور اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ اسی طرح سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مطیع فرمان رہے اور انھیں سب مسلمانوں سے افضل خیال کرتے رہے، کیوں کہ آپ نے صدق دل سے ان کی بیعت کی تھی اور آخری دم تک اس پر قائم رہے تھے۔

صحف کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کی خدمات حاصل کر چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کی خدمات حاصل کیں جسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قرآن کی جمع و تدوین پر مامور فرما چکے تھے۔ یہ اختیار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک بہت محبوب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے آخری مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو جب قرآن مجید سنایا تھا، حضرت زید رضی اللہ عنہ اس قراءت کے دیگر صحابہ سے زیادہ واقف تھے۔

جب ولید بن عقبہ نے شراب پی۔^{۱۰} تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی مذمت کی تھی۔ پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ مدینہ آئے۔ ابھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو شادی کرنے کے لیے کہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اہل بدعت رافضیوں کا وظیفہ حیات یہی ہے کہ یہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر اور تفسیق ایسے امور کی بنا پر کرتے رہیں جن کی وجہ سے کسی بھی حاکم کو کافریا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ تو پھر خلفاء راشدین کے بارے ایسی بات کہنا کیونکر روا ہو سکتی ہے؟ اور یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ متنازع فریقین میں سے کسی ایک قول کی بنا پر دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قدح وارد نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی دو جھگڑا کرنے والوں میں سے کسی ایک کا کلام دوسرے پر قدح کا موجب ہو سکتا ہے۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بفرض محال ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کیا تھا تو یہ امر دونوں حضرات کے لیے موجب قدح ہے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے لیے نہیں، بلکہ اسے دونوں کی اجتہادی غلطی پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ دونوں حضرات جلیل القدر بدری صحابہ میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خطائیں معاف کر دی ہیں، اور ان کی نیکیوں پر ان کو اجر و ثواب سے نواز دیا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ ہوا تھا؛ تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کا ولی تھا؛ [انہیں جنت کی بشارت دی گئی تھی۔ اس لیے] وہ اہل جنت میں سے ہے؛ اور ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ پر آخرت میں عذاب نہیں دیگا۔ پھر یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں زبان کو بند رکھنا اولیٰ و افضل ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان تمام لوگوں سے افضل ہیں جو آپ کی شان میں جرح و قدح کرتے ہیں۔ آپ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کئی وجوہات کی بنا پر افضل ہیں۔ یہ بات بہت سارے دلائل کی روشنی میں ثابت شدہ ہے۔

مفضول کا کلام فاضل میں قدح ہونے کی بجائے اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ خود مفضول کی ذات پر ہی قدح ہو۔ بلکہ اگر ان دونوں کے مابین علم کی روشنی میں عدل کیساتھ کلام کرنا ممکن ہو تو ٹھیک؛ ورنہ اس طرح کلام کیا جائے جس سے دونوں کی فضیلت اور دین داری معلوم ہو۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جو جھگڑے پیش آئے ان کا انجام کار آخر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اس سلسلہ میں ہمیں اپنی زبانوں کو کنٹرول میں رکھنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

۱۰ حقیقت یہ ہے کہ خلافت عثمانی کے مخالفین اور ولید بن عقبہ کے دشمنوں نے ولید پر افتراء باندھا تھا۔ ولید کے خلاف شراب نوشی کی شہادت دینے والے سب جھوٹے، چور اور کہنے آدی تھے۔ ان کی یہ شہادت صاف جھوٹ تھی۔ دیکھیے: (العواصم من القواصم ۹۳-۹۹)

”اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے خون سے آلودہ نہیں کیا۔ میں اپنی زبان کو بھی اس سے ملوث نہیں کرنا چاہتا۔“

کسی دوسرے نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

”یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لیے وہ جو تم نے کیا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔“ (البقرہ ۱۳۴)

لیکن جب ایسے مبتدعین ظاہر ہوں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تنقید کر رہے ہوں، تو اس وقت ان کا دفاع کرنا؛ اور باطل کی جتوؤں کو علم اور عدل کے ساتھ ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

[حضرت عمار اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما]:

ایسے ہی حضرت عمار سے منقول روایت بھی ہے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کہا: ”عثمان رضی اللہ عنہ صراحۃً کافر ہو گئے تھے۔“

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی یہ بات ناپسند کی تھی؛ اور اس کا انکار کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

”اے عمار رضی اللہ عنہ! کیا آپ اس اللہ سے منکر ہیں جس پر عثمان رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے؟

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ بعض اوقات ایک ولی اللہ اور مومن شخص دوسرے ولی کی ازراہ خطا تکفیر کرتا ہے، وہ اپنے اس اعتقاد [اور قول] میں غلطی پر ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوصف دونوں کے ایمان میں قدرح وارو نہیں ہوتی۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ انس بن خنیس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: ”تو منافق ہے اور منافقین کی وکالت کرتا ہے۔“^①

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا:

”اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”حاطب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شرکت کر چکا ہے۔ اور تمہیں کیا پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانک کر دیکھا ہے؛ اور فرمایا ہے: ﴿اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ﴾ (جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمہیں بخش دیا۔“^②

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے کئی درجہ

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک (حدیث: ۴۱۴۱)، وصحیح مسلم، کتاب التوبة، باب

فی حدیث الافک (حدیث: ۲۷۷۰)

② صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شہد بدر (حدیث: ۳۹۸۳، ۴۲۷۳)، صحیح مسلم، کتاب

فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۴۹۴)

افضل ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ حاطب رضی اللہ عنہ کے لیے کہا؛ اس میں ان کی حجت عمار رضی اللہ عنہ کی حجت کی نسبت زیادہ ظاہر ہے۔ مگر اس کے باوجود دونوں حضرات اہل جنت میں سے ہیں۔ تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنتی کیسے نہیں ہو سکتے۔ جب ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو ایسی ویسی بات کہہ دے۔ حالانکہ علماء کرام کی ایک جماعت نے انکار کیا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کہی۔

[ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پٹائی کا واقعہ:]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس قدر پیٹا کہ ان کی موت واقع ہو گئی۔“

[جواب]: یہ بڑا ذلیل اور گھٹیا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں ان کے منصب پر بحال رکھا۔ یہاں تک عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ پیش آیا۔ اور یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا؛ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بالکل نہیں پیٹا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمار اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو پیٹا تھا۔ بشرط صحت اگر ہم اس واقعہ کو درست مان بھی لیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور برابر اجتہاد انھیں تعزیر کا حق حاصل تھا خواہ یہ اجتہاد صحیح ہو یا غلط۔ اس سے ان حضرات میں سے کسی ایک کی شان میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ تینوں حضرات [ان شاء اللہ] جنت میں ہوں گے۔ اور یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے بڑے متقی ولیوں میں سے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کبھی ولی اللہ سے کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہو جاتا ہے جس پر وہ شرعاً سزا کا مستحق ہوتا ہے تو پھر تعزیر کیوں نہیں ہو سکتی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو درہ سے مارا جب دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! یہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ متبوع کے لیے باعث فتنہ اور تابع کی رسوائی کا موجب ہے۔“

اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کچھ ادب سکھایا تھا؛ یا تو اس تأدیب میں حق پر تھے؛ اس لیے کہ آپ کو ایسا کرنے کا استحقاق حاصل تھا۔ یا پھر جس بات پر ان لوگوں کی تعزیر کی ہوگی؛ اس پر انہوں نے پہلے سے توبہ کر لی ہوگی۔ یا اس تعزیر کی وجہ سے ان کا کفارہ ہو گیا ہوگا؛ یا دیگر مصائب و آلام ان خطاؤں کا کفارہ بن گئے ہوں گے۔ یا کوئی اور ایسا سبب پیش آ گیا ہوگا۔

یا تو پھر یہ کہا جائے کہ: جن لوگوں کی تعزیر کی گئی وہ بالکل مظلوم تھے۔ تو جیسے آپ ان حضرات کے بارے میں کوئی بات کہیں گے وہی بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی عذر ہوگی۔ اس لیے کہ بلا ریب آپ ان لوگوں سے افضل تھے۔ اور آپ رحمت و مغفرت کے زیادہ مستحق تھے۔

بسا اوقات امام سزا دینے میں اجتہاد سے کام لیتا ہے؛ اس پر اسے ثواب بھی ملتا ہے۔ اور مجتہدین اپنے اجتہاد کی وجہ سے جو کام کرتے ہیں اس پر انہیں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے اجتہاد کی وجہ سے انہیں ثواب ملتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر گواہی دی تھی۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا شمار نیک و صالحین مسلمانوں میں سے ہوتا

ہے۔ وہ اپنے اس گواہی دینے میں اجر و ثواب کی امید رکھتے تھے۔ اور ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ حد قائم کرنے میں اجر و ثواب کے مستحق تھے۔ تو اس میں کوئی مانع نہیں ہو سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ سلوک حضرت عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے کیا؛ وہ بھی اسی باب سے ہو۔

جب ایک دوسرے کو قتل کرنے والوں میں سے ہر ایک مجتہد اور اس کے گناہ و خطائیں بخشا گیا ہوتا ہے تو پھر آپس میں اختلاف کرنے والے بھی بدرجہ اولیٰ حق پر ہو سکتے ہیں۔

یا تو پھر یہ کہا جائے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی مجتہد تھے؛ اور دوسرے صحابہ بھی اجتہاد پر تھے۔ ایسے واقعات بہت زیادہ پیش آتے ہیں۔ کوئی انسان کوئی کام اپنے اجتہاد سے کرتا ہے۔ اور مسلمان حکمران کا خیال ہوتا ہے کہ اس حرکت پر اسے لازمی سزا ملنی چاہیے۔ جیسا کہ کسی ظلم کرنے والے سرکش کو سزا ملتی ہے۔ بھلے وہ حاکم کے پاس پیش ہونے کے بعد توبہ ہی کیوں نہ کر لے۔ بیشک زانی؛ شرابی اور چور جب عدالت میں پیش ہونے اور ان پر جرم ثابت ہونے کے بعد توبہ کریں تو اس توبہ سے حد ساقط نہیں ہوتی۔ بلکہ انہیں اپنے جرم کی سزا ملے گی۔ اور توبہ کی وجہ سے وہ جنت کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور حد کا لگنا بھی ان امور میں سے ہوگا جس پر انہیں اجر و ثواب ملے گا۔ اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے وہ گناہ معاف کر دے گا جنہیں ابھی تک معاف کرنے کی ضرورت ہوگی۔

مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کسی ایسے آدمی کو قتل کر دے جو قتل کرنے کی وجہ سے قصاص کا مستحق ہو؛ یا اس کا مال یہ سمجھ کر لے لے کہ حقیقت میں وہ اسی کا مال ہے۔ پھر مقتول کے وارث یا مال والے حاکم کے پاس اپنے حق کا دعویٰ دائر کر دیں اور حاکم ان لوگوں کے حق میں فیصلہ دیدے۔ اور جو انسان ان کا حق انہیں تسلیم کرنے سے انکار کرے تو حاکم اسے سزا دیگا؛ بھلے وہ آدمی کسی تاویل کی وجہ سے ہی ایسا کر رہا ہو۔ بلکہ وہ باطن میں اسے بری ہی کیوں نہ ہو۔

نبیز جو کہ متنازع فیہ ہے؛ اکثر فقہاء نبیز پیٹنے پر بھی حد لگانے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ انسان متاویل ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی متاویل باغی کو بھی اس کی بغاوت سے نجات حاصل کرنے کے لیے قتل کرنے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مگر اس کی تاویل کی وجہ سے اس پر فاسق ہونے کا فتویٰ نہیں لگاتے۔

صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار اور حسن رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا تا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ملک جمع کر سکیں؛ تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دنیا میں نبی کریم ﷺ کی بیوی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے باوجود فرمایا کرتے:

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمایا ہے کہ آیا تم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کرتے ہو یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی۔“^①

حضرت عمار رضی اللہ عنہ لوگوں کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ابھارتے بھی تھے تا کہ آپ کی خلاف قتال کے ذریعہ یا دیگر کسی بھی طرح سے ہر ممکن دفاع کیا جاسکے۔ تاہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو جنتی اور آخرت میں نبی کریم ﷺ کی بیوی قرار دیتے تھے۔

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضل عائشہ رضی اللہ عنہا۔ (حدیث: ۳۷۷۲، ۷۱۰۰)۔

جب حضرت عمار رضی اللہ عنہما اس عائنہ نبیؐ سے برسرِ پیکار ہونے کے باوجود جنتی ہونے کی گواہی دے سکتے ہیں تو پھر کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے جنتی ہونے کی گواہی نہ دیں؟

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”عمار میرا نورِ نظر ہے، اسے ایسی باغی جماعت قتل کرے گی جو روزِ قیامت میری شفاعت کی مستحق نہیں ہوگی۔“

اس میں سے صحیح صرف اتنا جملہ ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ”عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔“^①

علماء کرام کی ایک جماعت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان علماء میں سے ایک حسین الکرایمی بھی ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایسے ہی نقل کیا گیا ہے۔

اس روایت کے یہ الفاظ: ”روزِ قیامت میری شفاعت کی مستحق نہیں ہوگی۔“

یہ حدیث میں اپنی طرف سے جھوٹ داخل کیا گیا ہے۔ کسی بھی اہل علم نے معروف سند کے ساتھ یہ روایت نقل نہیں کی۔ ایسے ہی یہ جملہ: ”عمار میرا نورِ نظر ہے۔“ کسی بھی معروف سند کے ساتھ کسی محدث نے نقل نہیں کیا۔

اور اگر ایسا جملہ ثابت بھی ہو جائے تو یہ بھی اس صحیح حدیث کی طرح ہے جس میں ثابت ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، مجھے بھی وہ چیز شک میں ڈالتی ہے جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔“^②

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔“^③

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے محبت کیا کرتے تھے، اور دعا فرمایا کرتے تھے:

”اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت کر۔“ [بخاری ۵/۲۳، صحیح مسلم: ۱۳/۱۳۱۵]

مگر اس کے باوجود جب آپ نے ایک آدمی کو قتل کروا کر رسول اللہ ﷺ نے اس پر بہت سخت انکار کیا، آپ نے فرمایا:

”اے اسامہ! کیا لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار یہی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بار بار آرزو ہونے لگی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔“ [صحیح مسلم ج: ۱، ح: ۲۷۸]

اور صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اے رسول اللہ کے چچا عباس بن عبدالمطلب! میں تمہیں اللہ کے عذاب سے کچھ بھی نہیں بچا سکتا،..... اور اے فاطمہ..... میں اللہ کے عذاب سے تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔.....“ [صحیح بخاری: ج: ۲، ح: ۲۶]

یہ بھی صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عبد اللہ بن الحمار نامی ایک شخص پر کئی بار شراب کی حد قائم کی۔ مگر اس کے باوجود آپ نے فرمایا: ”یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے۔“ [صحیح بخاری، کتاب الحدود، ح: ۶۷۸۰]

① صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب مسح الغبار عن الرأس فی سبیل اللہ (حدیث: ۲۸۱۲)۔

② بخاری۔ (ح: ۳۷۲۹) و صحیح مسلم (۲۴۴۹) مفصل خروج گزر چکی ہے۔

③ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب اقامة الحدود علی الشریف والوضیع (حدیث: ۶۷۸۷، ۶۷۸۸)۔

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی تلواروں میں سے ایک تلوار قرار دیا کرتے تھے۔ لیکن جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب غلطی سے بنو جذیمہ کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے دعا کی:

”اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا ہے، میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔“ [البخاری ۴/۱۰۰]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”تم مجھ سے ہواور میں تجھ سے ہوں۔“ لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا:

”بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے کی اجازت طلب کی ہے۔“

واضح رہے کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، [آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے]۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ اگر میری بیٹی کو طلاق دے دیں تو ان کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔ اللہ کی قسم! اللہ کے نبی کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک ہی آدمی کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔“ [اس کی تخریج کثر جکی ہے۔]

اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حالت احرام میں اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ”دیکھو یہ محرم کیا کر رہا ہے۔“ ابو داؤد ۲/۲۲۳ و ابن ماجہ ۲/۴۳۲۔

[حدود و تعزیر اور مصائب گناہوں کا کفارہ ہیں:]

کبھی کوئی انسان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے ادب سکھایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

”کسی مومن آدمی کو جب بھی کوئی تکلیف یا ایذا یا کوئی بیماری یا رنج یہاں تک کہ اگر اسے کوئی فکر ہی ہو یا اگر کوئی کاٹنا

چھتا ہے تو اللہ اس کے بدلہ میں اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔“ [صحیح مسلم ج ۳: ح ۲۰۶۴]

جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ﴾ [النساء ۱۲۳]

”جو کوئی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔“

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کمر توڑنے والی آیت نازل ہو گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کیا تمہیں کبھی کوئی غم نہیں پہنچتا؟ کیا تمہیں تھکاؤ نہیں ہوتی؟ کیا تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی؟ یہی وہ چیزیں

جو بدلہ میں تمہیں دی جاتی ہیں۔“ [مسند احمد ۱/۱۸۱]

حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”حدود مجرم کے لیے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔“ [مسند البزار ۶/۳۶۵]

صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”تم لوگ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور چوری نہ کرنا اور زنا نہ کرنا اور اپنی اولاد کو

قتل نہ کرنا اور نہ ایسا بہتان (کسی پر) باندھنا جس کو تم (دیدہ و دانستہ) بنا لاؤ۔ اور کسی اچھی بات میں اللہ اور رسول کی نافرمانی نہ کرنا پس جو کوئی تم میں سے (اس عہد کو) پورا کرے گا، تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ اور جو کوئی ان (بری

باتوں) میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا اور دنیا میں اس کی سزا سے مل جائے گی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائے گی اور جو ان (بری) باتوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا اور اللہ اس کو دنیا میں پوشیدہ رکھے گا تو وہ اللہ کے حوالے ہے، اگر چاہے تو اس سے درگزر کر دے اور چاہے تو اسے عذاب دے۔“ [البخاری: ج ۱: ح: ۱۷]

جب آسانی مصائب و آفات جو کہ انسان کے فعل کے بغیر حاصل ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے انسان کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔ پس پھر جو انسانوں کی طرف سے ظلم کیا جاتا ہے، یا خلق کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے تو یہ بطریق اولیٰ انسان کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ جیسے کفار کی طرف سے مجاہدین کو پہنچنے والی تکلیف۔ اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے جھٹلانے والوں کی طرف تکلیف پہنچتی ہے۔ اور جیسے مظلوم کو ظالم کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔ جب یہ امور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے پیش آتے ہیں [اور اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے] تو اسی طرح حاکم کی طرف سے لگائی جانے والی حد یا تعزیر کی سزا بالاولیٰ گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ حال تھا کہ اگر کوئی انسان شراب پی لیتا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا؛ اور کہتا: اے امیر المؤمنین مجھ پر حد قائم کر کے مجھے پاک کیجیے۔
حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ اور غامد یہ عورت خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انہیں گناہ سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

پس جب کوئی انسان اللہ کا ولی ہو تو اس بات میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی کہ اسے یہ بھی ضرورت پیش آئے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے۔ ولی امر کی تادیب سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے امور سے بھی۔
اگر یہ کہا جائے کہ ان صحابہ کرام سے جو کچھ ہوا تھا؛ اس میں وہ مجتہد اور معذور تھے؛ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بالاولیٰ کہا جاسکتا ہے کہ آپ بھی انہیں ادب سیکھانے میں مجتہد اور معذور تھے۔ اس لیے کہ آپ امام اور خلیفہ ہونے کی وجہ رعیت کی تادیب و اصلاح پر مامور تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خواہشات نفس سے بہت زیادہ دور تھے۔ اور ان حضرات کو ادب سکھانے میں عدل و انصاف اور علم کے زیادہ قریب تھے۔ رضی اللہ عنہم۔

اگر کوئی انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قروح کرے کہ آپ نے جناب حضرت زبیر حضرت طلحہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم سے جنگ کی۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ علم و عدل میں ان لوگوں کی نسبت اولیٰ اور افضل ہیں جنہوں نے آپ سے جنگ کی۔ ایسے ہرگز جائز نہیں ہے کہ آپ سے جنگ کرنے والوں کو تو عادل کہا جائے اور آپ کو ظالم کہا جائے۔ بالکل اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حدود قائم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ آپ ان لوگوں کی نسبت علم و عدل کے زیادہ قریب اور ان لوگوں سے افضل تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والوں سے آپ کا دفاع واجب ہوتا ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والوں سے آپ کا دفاع بالاولیٰ واجب ہوتا ہے۔

[حکم بن العاص کی جلاوطنی کی حقیقت:]

[اعتراض]: شیخہ مصنف لکھتا ہے:

”نبی ﷺ نے عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حکم بن العاص اور ان کے بیٹے کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔ حکم اور اس کا بیٹا عہد رسالت مآب میں اور عہد صدیقی و فاروقی میں مدینہ بدر ہی رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر واپس مدینہ میں بلالیا۔ اور مروان کو اپنا مشیر اور کاتب بنالیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ﴾ [المجادلة ۲۲]۔

”اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے۔“ [شیخہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: حکم ابن العاص فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت اسلام قبول کرنے والے تقریباً دو ہزار افراد تھے۔ تب تک مروان ابھی چھوٹا بچہ تھا۔ اس کا شمار ابن زبیر اور مسور بن خرمہ کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ سن تیز کو پہنچ چکا تھا یعنی سات سال یا اس سے کم و بیش عمر تھی۔ مروان کا کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اپنے وقت میں انہیں جلاوطن کرتے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد مسعود میں طلقاء مکہ مدینہ میں بود و باش نہیں رکھتے تھے۔ بالفرض اگر نبی کریم ﷺ نے کسی کو جلاوطن کیا بھی ہوگا تو مکہ سے کیا ہوگا: مدینہ سے نہیں۔ اگر آپ مدینہ سے جلاوطن کرتے تو پھر مکہ کی طرف بھیجتے۔ بہت سارے اہل علم نے جلاوطن کیے جانے کی روایت پر تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گیا تھا۔

خود حکم کا قصہ صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے جس سے اس کا اصل حال معلوم ہو سکے۔ لوگوں میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے چلنے میں نبی کریم ﷺ کی نقل اتاری تھی۔ اور بعض کہتے ہیں: اسے طائف کی طرف جلاوطن کیا گیا تھا۔ جو لوگ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ (طلاق) ان میں سے کسی نے بھی ہجرت نہیں کی تھی۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”لَا هَجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ“^①

”فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں لیکن جہاد اور اس کی نیت ہے۔“

یہی وجہ تھی کہ جب صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ وارد ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں مکہ لوٹ جانے کا حکم دیا۔^②

جب رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس ایک آدمی کو لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ اس سے ہجرت پر

① صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب فضل الجہاد والسير، (حدیث: ۲۷۸۳)، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب المبايعۃ بعد فتح مکہ، علی الاسلام (حدیث: ۱۳۵۳)۔

② مسنن نسائی، کتاب البیعة۔ باب ذکر الاختلاف فی انقطاع الهجرة (حدیث: ۴۱۷۴)، مسند احمد (۴۰۱/۳) طبقات ابن سعد (۴/۵)، اسد الغابۃ (۲۶/۳)۔

بیعت لی جائے؛ تو انہوں نے ایسا کرنے کی قسم اٹھالی۔ آپ نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ”میں صرف اپنے چچا کی قسم پوری کر رہا ہوں۔ فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے۔“

حکم کو مدینہ سے جلا وطن کرنے کا واقعہ بلا سند ہے۔ اگر اس کی اسناد ہوتی تو اس کی صحت معلوم کی جاسکتی تھی۔ اگر خارج از بلد کیا بھی تھا تو مکہ سے کیا ہوگا نہ کہ مدینہ سے، اور اگر مدینہ سے نکالا تھا تو وہاں سے مکہ جانے کا حکم دیا ہوگا۔

فتح مکہ کے سال حضرت عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے وہاں مدینہ کی طرف ہجرت کی نیت سے نکل چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے آپ کی ملاقات راستے میں ہوئی۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

[جلا وطنی کے مستحق کون؟]

خارج از بلد [جلا وطن] کرنے کی سزا تعزیر ازانانی یا مخنث کو دی جاسکتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو جلا وطن کیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر میں قدم نہ رکھ سکے۔ یہ سزا شرعاً کسی جرم میں بھی ثابت نہیں کہ دائماً کسی شخص کو خارج از بلد کر دیا جائے۔ بخلاف ازیں جلا وطن کرنے کی سزا سنت میں صرف ایک سال کے لیے ہے۔ یہ سزا ازاناً کا ر اور مخنث کے لیے ہے۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کر لیں۔ جب حاکم کسی بات پر تعزیراً سزا اس لیے دے کہ مجرم توبہ کر لے، تو جب بھی وہ توبہ کر لے گا؛ تعزیر ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اپنے گناہ پر ہی قائم رہے تو یہ ایک اجتہادی معاملہ ہے اس میں بھی کوئی متعین سزا نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی وقت مقررہ ہے۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیں؛ تو جلا وطنی کی سزا ہجرت کے آخری دور میں شروع ہوئی؛ تو اس کی مدت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے تک طول نہیں کھینچتی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک تو مدت اور ہی لمبی ہو جاتی ہے۔ نیز یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی سرح کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سفارش کی تھی۔ عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کاتب وحی تھا۔ پھر اسلام سے مرتد ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے باقی لوگوں کے ساتھ اسے بھی مباح الدم قرار دیا تھا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسے لیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے؛ تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش قبول کر لی؛ اس کی بیعت لے لی۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ حکم کے بارے میں آپ کی شفاعت قبول نہ کی جاتی؟

یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے حکم کو واپس بلانے کی اجازت طلب کی تھی اور آپ نے انہیں یہ اجازت دیدی تھی۔

ہم یہ بات بھی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حکم بن العاص کا گناہ عبد اللہ بن ابی سرح کے گناہ سے کئی درجہ کمتر تھا۔ عبد اللہ کا قصہ ثابت شدہ اسناد کے ساتھ مشہور و معروف ہے۔ جب کہ حکم کا قصہ جن لوگوں نے ذکر کیا ہے؛ عام طور پر انہوں نے مرسل سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور اس قصہ کے ذکر کرنے والے بھی ایسے مؤرخ ہیں جن کے ہاں بہت زیادہ جھوٹ پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بہت کم ہی کوئی روایت کمی یا زیادتی سے محفوظ رہتی ہے۔ اس لیے کوئی ایسی ثابت شدہ روایت نہیں مل سکی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کم درجہ بھی کسی انسان کی شان میں قدح کا موجب بن سکتی ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل؛ نبی کریم ﷺ کی آپ سے محبت؛ آپ تعریف و توصیف بربارہ؛ امت ماب؛ اور

خصوصی طور پر اپنی دو بیٹیوں کی ان سے شادی؛ آپ کے لیے جنت کی شہادت؛ اور صلح حدیبیہ کے موقع پر بحیثیت سفیر آپ کی مکہ مکرمہ روانگی؛ اور آپ ﷺ کا اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر ان کی طرف بیعت کرنا؛ اور صحابہ کرام کا خلافت کے لیے آپ کو مقدم کرنا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گواہی دینا کہ رسول اللہ ﷺ جب فوت ہوئے تو آپ سے راضی تھے؛ [یہ باتیں] سب کو معلوم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر بھی کچھ امور ایسے ہیں جن کی بنا پر ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آپ بہت بڑے متقین اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے تھے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا تھا۔ ان امور کو کسی ایسی روایت کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کی سند ہی ثابت نہ ہو۔ اور نہ ہی یہ پتہ ہو کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔ اور پھر ایسے امور کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گناہ قرار دیا جائے جن کی حقیقت کا کوئی پتہ ہی نہ ہو۔ بلکہ اس کی مثال تو ان لوگوں کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب سے محکم آیات کے مقابلہ میں تشابہ آیات پیش کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ان لوگوں کا فعل ہے جن کے دلوں میں کجی ہے اور جو فتنہ تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں؛ [اس کے علاوہ ان کا کوئی کام نہیں ہوتا]۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کج رو و رافض ان شرار الخلق لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ فتنہ بچانے کی سوچتے رہتے ہیں اور ان کی مذمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کی ہے۔

خلاصہ کلام! ہم یہ بات قطعی طور پر جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی انسان کو ہمیشہ کے لیے جلاوطن نہیں کیا تھا؛ کہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہوئے اسے واپس بلا لیتے؛ اور مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس پر اعتراض نہ کرتا اور سب خاموش رہتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے۔ آپ اس بات سے بری ہیں کہ کوئی بھی ایسا کام کریں۔ بلکہ یہ کام اجتہادی امور میں سے ہے۔ [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم بن العاص کو نافرمانی اور اسلام کی تذلیل کے لیے مدینہ نہیں بلایا تھا، بلکہ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خیال میں حکم کی حالت سدھر گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ آپ کا یہ اجتہاد صحیح تھا یا غلط]۔^①

① قاضی ابن العربی العواصم من القواصم جس: ۷۷ پر لکھتے ہیں: "ہمارے علماء کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حکم کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: "اگر آپ اس بات کا کوئی گواہ پیش کریں تو ہم حکم کو واپس بلا لیں گے۔" سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اپنے علم کے مطابق انھوں نے حکم کو واپس بلا لیا۔ مشہور محدث امام ابن حزم رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "الایمانت والفاضلہ" میں جو ان کی کتاب الفضل کی جلد چہارم میں شامل ہے، صفحہ ۱۵۴، پر علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حکم کو جلاوطن کرنا ایک واجب حد شرعی کی بحیثیت نہیں رکھتا اور ہمیشہ کے لیے بھی نہ تھا۔ بخلاف ازیں آپ نے حکم کو کسی جرم کی سزا دی تھی جس کی بنا پر وہ خارج از بلد ہونے کا مستحق قرار پایا۔ دین اسلام میں تو بدکار و زوردار ہر وقت کھلا ہے، بصورت تو یہ اس کی یہ سزا باقائے اہل اسلام ساقط ہو جائے گی اور وہ جہاں چاہے جاسکتا ہے۔" فرق زیدیہ کے عظیم مجتہد سید محمد بن ابراہیم الوزیری یعنی التونی ۸۴۰ھ نے اپنی کتاب الروض الباسم (۱/۱۳۲-۱۳۱) پر مشہور شیعہ معتزلی محسن بن کرامہ کی کتاب "سرح العیون" سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اجازت دے دی تھی کہ حکم کو مدینہ بلا لیں۔ ابن الوزیری کہتے ہیں۔ معتزلہ اور شیعہ زیدیہ کو چاہیے کہ اس حدیث کو قبول کر کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بنانا ترک کر دیں، کیونکہ اس حدیث کا راوی شیعہ کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور صحت عقیدہ و علم و فضل کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ پھر ابن الوزیری نے اس پر کھل کر کلام کیا ہے اور امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے دفاع کرنے میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیا ہے جو تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک شیعہ عالم ہے، ابن الوزیری جنھوں نے سیدنا عثمان کی مدافعت میں دینا، دیے ہیں وہ بھی زیدی شیعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ و اہل سنت علماء سب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بریت پر متفق ہیں۔

شاید ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اس لیے اسے واپس نہیں بلایا کہ اس نے خود اس کا مطالبہ ہی نہ کیا ہو۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا تو آپ نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے اس کی توبہ واضح نہ ہوئی ہو اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے توبہ واضح ہو گئی تو آپ نے اسے واپس بلایا۔

اور آخر میں انتہاء درجہ کی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ سے اجتہادی غلطی یا گناہ کا کام سرزد ہو گیا ہو تو اس بارے میں مفصل کلام پہلے گزر چکا ہے۔

جہاں تک مروان کو کا تب بنانے پر اعتراض ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مروان کا اس میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ مروان اس وقت چھوٹا تھا اس وقت تک شرعی احکام کا مکلف نہیں ٹھہرا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا اس وقت تک مروان بلوغت کی عمر تک نہیں پہنچا تھا۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ بلکہ اس وقت تک اس کی زیادہ سے زیادہ عمر دس سال یا اس کے قریب قریب ہو سکتی ہے۔ [مروان میں خامیاں ہو سکتی ہیں]، مگر اس کے ظاہر و باطناً مسلمان ہونے میں شبہ نہیں وہ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتا اور اس پر عمل پیرا رہتا تھا؛ دین کی فقہ و سمجھ حاصل کرتا۔ اس فتنہ [قتل عثمان رضی اللہ عنہ] سے پہلے اس کا کوئی ایسا گناہ معروف نہیں تھا جس کی وجہ سے اس پر اعتراض کیا جاسکے۔ لہذا یہ اعتراض لغو ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے کا تب کیوں مقرر کیا۔

لیکن جب فتنہ پھیلا تو اس کا شکار وہ لوگ بھی ہو گئے جو مروان سے کئی درجہ افضل و بہتر تھے۔ مروان ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوں۔ جب کہ اس کے باپ حکم کا شاربھی طلقاء میں ہوتا ہے۔ اور طلقاء میں سے اکثر لوگ بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے ہیں۔ جب کہ بعض کی سیرت محل نظر ہے۔ [لیکن ان تمام باتوں کے باوجود] صرف ایسے گناہ کی وجہ سے باطن میں نفاق کا ہونا لازم نہیں آتا جس گناہ پر تعزیر ہو سکتی ہو۔

منافقین پر ظاہری طور پر اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد طلقاء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا اظہار کرتا ہو۔ بلکہ وہ [اسلامی اصولوں کے مطابق] وراثت پاتے تھے اور وراثت چھوڑتے تھے۔ ان پر نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی۔ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا تھا۔ اور ان پر اسلامی احکام ایسے ہی جاری ہوتے تھے جیسے دوسرے مسلمانوں پر جاری ہوتے تھے۔

اوس اور خزرج کی ایک جماعت کا نفاق صاف واضح اور معلوم شدہ تھا؛ جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے امثال و ہموا۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھار مسلمان اس کے لیے تعصب کر جاتے تھے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی کے بارے میں تعصب کا اظہار کیا تھا۔ اور انہوں نے سعد بن معاذ سے کہا:

”اللہ کی قسم! تم اسے قتل نہیں کرو گے اور نہ ہی ایسا کرنے پر قدرت رکھتے ہو۔“

اگرچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا ایسا کہنا بھی غلطی تھی؛ لیکن اس غلطی کی وجہ سے آپ اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔ بلکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اہل جنت میں سے ہیں۔ آپ کا شمار سابقین اولین انصار میں سے ہوتا ہے۔ تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے آدمی کو ٹھکانہ دیا جس کا منافق ہونا معلوم ہی نہیں۔

اگر مروان منافق ہوتا تو پھر بھی اس کے ساتھ احسان کرنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات پر قدح کا موجب نہیں ہو سکتا۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُهَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوا كُفْرًا عَنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [المستحنة ۸]

”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتا کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے آپ کہتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی جو مسلمان نہیں ہوئی تھی [اسلام میں رغبت رکھتی تھی]۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں اس سے صلہ رحمی کروں؟ تو آپ نے فرمایا: ”ہاں! اس سے صلہ رحمی کرو۔“ [صحیح بخاری: ج ۱۹۲۴]

حضرت صفیہ بنت حبیبہ بنی النبیہ اپنے یہودی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ کرنے کی وصیت کیا کرتی تھیں۔ جب کوئی مسلمان اپنے کسی کافر رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی وجہ سے اسلام سے خارج نہیں ہوتا تو پھر اپنے مسلمان رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی وجہ سے کیسے اسلام سے خارج ہو سکتا ہے؟

حضرت صفیہ بنت النبیہ کا والد حبیب بن اخطب بڑے سرداروں میں سے تھا؛ اور بڑا سرکش کافر تھا؛ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی روا رکھتا تھا؛ مگر حضرت صفیہ بنت النبیہ ام المؤمنین ہیں؛ آپ انتہائی نیک اور دیندار عورت تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جنت کی بشارت سنائی ہے۔ جب آپ کا انتقال ہونے والا تھا تو آپ نے اپنے بعض قریبی یہودی رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرنے وصیت کی تھی۔ اس پر آپ کی تعریف و توصیف اور مدح کی جاتی ہے؛ مذمت نہیں کی جاتی۔

اس سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان اہل ذمہ کے ساتھ صدقہ و خیرات کر کے اور ان کے لیے وصیت کر کے صلہ رحمی کر سکتا ہے۔ تو پھر امیر المؤمنین پر اعتراض کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس چچا کے ساتھ احسان اور صلہ رحمی کا برتاؤ کیا جو اسلام کا اظہار کرتا تھا۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے نام خط لکھا تھا؛ جس میں انہوں نے قریش کو نبی کریم ﷺ کے فتح مکہ کے پیش نظر پیش قدمی کی اطلاع دی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا: ”حاطب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر اور بیعت رضوان میں شرکت کر چکا ہے؛ اس وجہ سے وہ اہل جنت میں سے ہے۔ اور جس نے حاطب کو منافق کہا تھا؛ اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”اور تمہیں کیا پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانک کر دیکھا اور فرمایا ہے:

((اعْمَلُوا مَا بَشَرْتُمْ فَقَدْ عَصَرْتُ لَكُمْ))

”جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمہیں بخش دیا۔“ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

کہاں حاطب اور کہاں عثمان رضی اللہ عنہما؟ - العیاذ باللہ - اگر یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کا کام کیا تھا؛ تو تب بھی ہمارے قول کی بھلائی اس میں تھی کہ ہم آپ کے لیے جنت کی گواہی دیں؛ آپ حاطب سے زیادہ اس احسان کے حق دار ہیں۔

[حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری کی حقیقت:]

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے] حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو انتہائی سخت مار پیٹ کر ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

”اس کمرۃ ارضی کے اوپر اور فلک نیلگوں کے نیچے ابو ذر سے زیادہ سچا اور کوئی نہیں۔“ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: ”بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ میرے صحابہ میں سے چار افراد سے محبت کرتا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بھی ان سے محبت کروں۔“ آپ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”ان چاروں کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور ان کے علاوہ سلیمان، مقداد اور ابو ذر رضی اللہ عنہم۔“

[جواب]: جہاں تک ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے آپ نے ربذہ میں ہی سکونت اختیار کی اور وہیں پر وفات پائی۔ اس کی وجہ آپ کے اور لوگوں کے مابین ہونے والی چپقلش تھی۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ انتہائی نیک اور صالح انسان تھے۔ آپ کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ جو مال بھی ضرورت سے زائد ہو اسے خرچ کر دینا چاہیے۔ جو شخص ایسا مال جمع کرے گا بروز قیامت اس مال کو آگ میں گرم کر کے اس شخص کو داغا جائے گا۔ وہ اس آیت سے استدلال کیا کرتے تھے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (التوبة ۳۴) ^۱

”اور جو لوگ سونا چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے۔“

نیز نبی کریم ﷺ کا یہ قول پیش کرتے تھے:

”اے ابو ذر! میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس خود احد پہاڑ کے برابر سونا ہو۔ تیسری رات گزر جائے اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی ہو؛ سوائے اس دینار کے جس قرض ادا کرنے کے لیے روک رکھا ہو۔“ ^۲

نیز نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

”زیادہ مال دار لوگ بروز قیامت کم درجہ والے ہوں گے سوائے ان لوگوں کے جو مال کو ادھر ادھر بکھیر دیں۔“ ^۳

جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور بہت سال پیچھے چھوڑا تو حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اسے کنز (خزانہ) پر محمول کیا جس پر سزا دی جائے گی۔ اس ضمن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابو ذر رضی اللہ عنہ سے تبادلۂ افکار کر رہے تھے۔ اتنے میں کعب بن لؤی داخل ہوئے اور انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید کی تو ابو ذر رضی اللہ عنہ نے ان کو پیٹا۔ انہی نظریات کی بنا پر حضرت

^۱ صحیح بخاری، کتاب الزکاة، باب ما ادى زكاته فليس بكنز (حدیث: ۱۴۰۶، ۱۴۰۸)، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب فی الكنایین للاموال (حدیث: ۹۹۲)۔

^۲ مستدرک حاکم ۳۰/۳۴۴

^۳ صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔ باب المكثرون هم المقلون (حدیث: ۶۴۴۴)، صحیح مسلم۔ کتاب الزکاة، باب الترغیب فی الصدقة (حدیث: ۳۲/۹۴)۔

حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی بیوی ام ذر رضی اللہ عنہا نے کہا: ”اللہ کی قسم! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو ربذہ کی طرف نہیں نکالا بلکہ نبی کریم ﷺ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی سلع تک پہنچ جائے تو وہاں سے نکل جانا۔“ بخاری (ح: ۶۴۴۴)۔ حضرت حسن البصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اللہ کی پناہ اللہ کی قسم! کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان نے مدینہ سے نکالا ہو۔“

ابو ذر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ملک شام میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

عباد اور زاہدین کی ایک جماعت نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے موقف کی حمایت کی ہے۔ جیسا کہ عبدالواحد بن زید کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اور بعض لوگ شبلی کو بھی انہی لوگوں میں سے شمار کرتے ہیں جن کا یہ مسلک ہے۔ مگر پوری امت خلفاء راشدین؛ جمہور صحابہ اور تابعین [اور علماء کی رائے] اس کے خلاف ہے۔

صحیح بخاری میں یہ حدیث ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”پانچ اونس سے کم میں زکوٰۃ نہیں؛ اور نہ ہی پانچ اونس سے کم میں زکوٰۃ

ہے۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ح: ۱۸۰۶]

رسول اللہ ﷺ نے پانچ اونس سے کم غلے پر زکوٰۃ کی نفی کی ہے۔ اور اس میں یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ اس مال کا محتاج ہو یا نہ ہو۔ جمہور علماء کرام کا کہنا ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ورثاء کے حصص مقرر کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میراث اسی شخص کی ہوتی ہے جس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا ہو۔ نبی کریم ﷺ کے عہد میں بھی صحابہ میں ایسے لوگ کثیر التعداد تھے جن کے پاس بہت سا مال تھا مگر کسی نے ان کو ہدف ملامت نہ بنایا۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام بھی مال دار ہوئے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ لوگوں پر وہ چیز واجب کرنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر واجب نہیں کی۔ اور اس چیز میں لوگوں کی مذمت کرنا چاہتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنے اس قول میں مجتہد تھے۔ اور آپ کو اس اطاعت گزاری پر اللہ تعالیٰ اجر سے نوازیں گے جس طرح آپ کی مانند دوسرے تمام مجتہدین کو اجر و ثواب ملے گا۔

نبی کریم ﷺ کے اس فرمان میں: ”میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس خود واحد پہاڑ کے برابر سونا ہو۔ تیسری رات گزر جائے اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی ہو۔“ مال کو تیسرے دن سے پہلے نکال دینے کا استحباب ہے وجوب نہیں۔ اور ایسے ہی نبی کریم ﷺ کا فرمان: ”زیادہ مال دار لوگ بروز قیامت کم درجہ والے ہوں گے۔“ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس کا مال بہت زیادہ ہوگا روز قیامت اس کی نیکیاں اتنی ہی کم ہوں گی؛ ایسا اس وقت ہوگا جب وہ اس مال میں سے اسی کثرت کے ساتھ خرچ نہیں کرے گا۔ اس سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ جس کی نیکیاں کم ہوں گی وہ جہنم میں جائے گا؛ جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے؛ یا پھر اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض میں سے کسی فریضہ کو ترک نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری طرح سے اپنی رعایا کی نگہبانی اور اصلاح کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی کو ظلم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی؛ نہ ہی اغنیاء کو اور نہ ہی فقراء کو۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو مالدار لوگوں نے دنیا میں بڑی وسعت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ بہت سارے لوگ مباحات میں انواع و اقسام اور مقدار کے لحاظ سے بہت آگے نکل گئے۔ ادھر حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اس میں اس حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ لوگوں کو ایک مباح چیز سے بھی روک دیا؛ یہی بات فتنہ کا سبب بنی اور پھر حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ ان سے الگ ہو گئے۔ اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے کوئی دوسری غرض نہیں تھی۔

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا سچے لہجے والا ہونا“ اس سے کہیں بھی یہ لازم نہیں آتا کہ آپ دوسرے لوگوں افضل ہوں۔ بلکہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مومن تھے مگر ان میں کمزوری موجود تھی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اے ابوذر! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور ہو میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے۔ دیکھیے دو آدمیوں کا بھی امیر نہ بننا۔ اور نہ کسی یتیم کے سر پرست بننا۔^①

اور یہ بھی صحیح اور ثابت شدہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”طاقت ورمومن اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے عزیز تر ہے۔ یوں دونوں اچھے ہیں۔“^②

چونکہ اہل شوری صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال کی نسبت اقویٰ ہیں، یہ لوگ ضعیف اور کمزور ہیں۔ پس وہ اہل ایمان جو خلافت نبوت کے اہل ہیں جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بدیں وجہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال سے افضل ہیں۔

اور مذکورہ بالا حدیث جن الفاظ میں رافضی نے ذکر کی ہے؛ صرف ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہے؛ اس کی کوئی سند نہیں ہے جس سے حجت قائم ہو سکے۔

حدود الہی کی پامالی کا الزام اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ:

[اعتراض:] شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ امیر المؤمنین کے آزاد کردہ غلام ہرمزان کے قصاص میں عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کیا تھا؛ حالانکہ وہ اسلام لا چکا تھا۔ امیر المؤمنین نے عبید اللہ کو قصاص کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر وہ بھاگ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی اور فرمایا میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب:] پہلی بات: شیعہ مصنف کا قول کہ: ”ہرمزان امیر المؤمنین کا آزاد کردہ غلام تھا۔“

ہم کہتے ہیں یہ صاف جھوٹ ہے۔ [یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام نہ تھا] بلکہ ہرمزان ان فارسیوں میں سے تھا جنہیں کسری نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مسلمانوں نے اسے قید کیا تھا، اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اسلام کا اظہار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر احسان کر کے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اگر اس پر کسی کی ولایت تھی تو وہ مسلمانوں کی تھی۔ اور اگر آزاد کرنے کی وجہ سے کسی کی ولایت اس پر تھی تو پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور اگر اس پر کسی کی کوئی ولایت نہیں تھی؛ بلکہ اس کا معاملہ ان قیدیوں کی طرح تھا جنہیں اگر احسان کر کے آزاد کر دیا جائے تو ان پر کوئی ولایت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ علماء کرام کا اختلاف ہے کہ اگر قیدی اسلام قبول کر لے تو کیا وہ اپنے اسلام کے باوجود غلام بن جائے گا یا پھر آزاد ہی رہے گا۔ اس پر احسان کر کے آزاد کرنا اور اس کے بدلہ میں فدیہ لے کر آزاد کرنا دونوں امر جائز ہیں؛ جیسے اسلام سے پہلے تھا؟ حالانکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ قیدی اسلام لانے کی وجہ سے معصوم الدم ہو گیا ہے۔

① صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب کراہۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ (حدیث: ۱۸۲۶)۔

② صحیح مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان لہ (حدیث: ۲۶۶۴)۔

اس مسئلہ میں دو قول مشہور ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی دو قول ہیں۔

اس کو غلام بنانے اور آزاد کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جہد و سعی کو کوئی دخل نہیں ہے۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ کو قتل کرنے شخص حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولولؤ فیروز تھا۔ ابولولؤ اور ہرمزان کے مابین مجانست پائی جاتی تھی۔ اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا؛ اس وقت ابولولؤ کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ہرمزان اس بات سے متہم تھا کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کی امداد کی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ نے ان سے کہا تھا:

”تم باپ بیٹا دونوں یہ چاہتے تھے کہ مدینہ میں عجمی کافروں کی بھرمار ہو جائے گی۔“

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ”ہم ان کو قتل نہ کر دیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تم جھوٹ بولتے ہو؛ جب یہ تمہاری بولی بولنے لگے اور تمہارے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے لگے ہیں تو تم ان کو کیوں کر قتل کر سکتے ہو؟

غور کیجیے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فقاہت اور دینداری کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مدینہ میں پائے جانے والے عجمی کفار کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا اعتقاد تھا کہ جب وہ فساد پیا کرتے ہیں تو پھر ان کا قتل کرنا جائز ہے۔ پھر عبید اللہ ہرمزان کے قتل کو کیوں کر جائز نہ سمجھتے ہوں گے؟

جب عبید اللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے عبید اللہ کو ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا۔ متعدد صحابہ نے اس کو قتل نہ کرنے کا مشورہ دیا اور کہا ابھی کل اس کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور آج اسے قتل کر دیا جائے تو اس سے بڑا فساد رونما ہوگا۔

گویا ان کے نزدیک ہرمزان کا معصوم الدم ہونا مشتبہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہرمزان کا شمار ان حملہ آور فساد یوں میں تھا جن سے دفاع کرنے کا استحقاق حاصل ہے۔ یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک لوگوں میں سے تھا جن کا قتل جائز تھا؟

علماء و فقہاء کا قتل میں شریک لوگوں کے بارے میں: جب بعض قتل کریں اور بعض اس کے پیچھے کارفرما ہوں؛ تو اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قصاص صرف براہ راست قتل کرنے والے سے لیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ: جب سب قوی ہو تو مباشر [براہ راست قتل کرنے والا] اور متسبب [اس کا سبب بننے والا] دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا؛ جیسے کہ مجبور کیا گیا اور مجبور کرنے والا۔ اس کی مثال زنا اور قصاص کے گواہوں کی ہے جب وہ اپنی گواہی سے رجوع کریں اور کہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر یہ جھوٹی گواہی دی تھی۔ جمہور جیسے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم کا یہ مسلک ہے۔

پھر اگر ایک نے پکڑا ہوا اور دوسرے نے قتل کیا ہو؛ تو امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پکڑنے والے اور قتل کرنے والے دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو تا حیات قید کیا جائے گا؛ یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ جیسا کہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا گیا ہے کہ قصاص صرف قتل کرنے والے پر ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے۔

پھر ایسے ہی قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں بھی اختلاف ہے جب وہ قتل کرنے پر مجبور نہ کرے؛ اور کسی ایسے آدمی کو قتل کرنے کا حکم دے جس کے قتل کرنے کو وہ حرام سمجھتا بھی ہو۔ تو کیا اس صورت میں حکم دینے والے کو بھی قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

جب کہ مددگار؛ راہزنی یا اس طرح کے کاموں میں جس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؛ [اس کے بارے میں] جمہور علماء کرام رضی اللہ عنہم کا مذہب یہ ہے کہ مددگار اور براہ راست مجرم دونوں پر حد جاری کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ امام مالک؛ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ڈاکوؤں کے لیے راستہ کی نگرانی و حفاظت کرنے والے کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

جب ہرمزان کا شمار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مدد کرنے والوں میں ہوتا ہے تو ایک قول کے مطابق اس کو قصاص میں قتل کرنا جائز تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صنعاء میں قتل ہونے والے آدمی کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

”اگر اس پر تمام صنعاء والے ٹوٹ پڑے ہوں تو میں اس کے بدلے میں ان سب کو قتل کر دوں۔“

[حکمران کے قاتل کی سزا]

ایسے ہی حکمران کو قتل کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا حاکم کے قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا یا حد میں قتل کیا جائے گا؟ اس میں امام احمد رضی اللہ عنہ کے مذہب اور باقی مذاہب میں دو قول ہیں۔

پہلا قول: انہیں حد میں قتل کیا جائے گا۔ جیسے بغاوت میں قتل کرنے والے کو حد لگا کر قتل کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حکمران کو قتل کرنے میں ڈاکہ زنی اور رہزنی سے بڑھ کر فساد ہے۔ پس حکمران کو قتل کرنے والا اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والا اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرنے والا ہے۔ اسی پر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے قتل کو قیاس کیا گیا ہے؛ جب انہوں نے اپنے باپ کے قاتل عبدالرحمن بن ملجم کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا مسئلہ بھی ہے۔

جب ہرمزان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مدد کرنے والوں میں سے تھا تو اس کا شمار زمین میں فساد پھیلانے والے اور اعلان جنگ کرنے والوں میں سے ہوا؛ اس وجہ سے اس کو قتل کرنا واجب ٹھہرا۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ قاتل ہرمزان معصوم الدم تھا۔ تاہم عبید اللہ نے تاویل کی بنا پر اس کے قتل کو حلال تصور کیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا شبہ صاف ظاہر تھا۔ پس اس شبہ کی بنا پر قاتل کو قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جس طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا تھا؛ آپ یہ سمجھے تھے کہ اس کلمہ کے پڑھنے سے یہ قتل سے نہیں بچ سکتا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی زبانی تعزیر کی؛ اور ان کو قتل نہیں کیا اس لیے کہ آپ متاؤل تھے۔^①

① صحیح بخاری، کتاب الدیات باب ومن احیاه؛ (حدیث: ۶۸۷۲)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قوله لا الہ الا اللہ (حدیث: ۹۶)۔

لیکن جس کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا؛ وہ قتل سے پہلے مباح الدم تھا؛ لیکن اس کے کلمہ پڑھ لینے کی وجہ سے اس کے معصوم الدم ہونے میں شک ہو گیا تھا۔

جب عبید اللہ بن عمر متاؤل تھے؛ اور ان کا اعتقاد تھا کہ ہرمزان نے ان کے والد کے قتل میں مدد کی ہے؛ اور ان کے لیے اب جائز ہو گیا ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ اس شبہ کی وجہ سے مجتہد کے لیے جائز ہو جاتا ہے کہ وہ اسے قصاص میں مانع قرار دے۔ اس لیے کہ قصاص کے مسائل میں بہت سارے مسائل اجتہادی ہیں۔

علاوہ ازیں ہرمزان کے خون کا مطالبہ کرنے والا بھی کوئی نہ تھا؛ بلکہ اس کے خون کا وارث حاکم ہی تھا۔ جب ایسی صورت حال ہو تو حاکم وقت کو شرعاً اختیار حاصل ہے کہ قاتل کو معاف کر دے یا اسے قتل کر دے یا دیت وصول کرے؛ تاکہ مسلمانوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ بنا بریں حضرت عثمان نے آل عمر رضی اللہ عنہما کو معاف کر دیا اور ان سے دیت وصول نہ کی۔ جب اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف کر کے عبید اللہ کی جان بچالی تھی؛ اور آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ آل عمر کو بھی دیت کے قدر ادا کر دیا جائے؛ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تقریباً اسی ہزار قرض تھا۔ اور انہوں نے حکم دیا تھا کہ یہ قرض ان کی اولاد کے اموال سے ادا کیا جائے۔ ورنہ بنو عدی اور پھر قریش کے اموال سے یہ قرض ادا کیا جائے۔ اس لیے کہ کسی انسان کے رشتہ دار ہی اس کی طرف سے کوئی بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ دیت کا مطالبہ اگرچہ عبید اللہ نے کیا تھا؛ یا عبید اللہ کے دیگر عصبی رشتہ داروں نے کیا تھا۔ جب یہ مسئلہ قتل خطا کا تھا؛ یا پھر اس کے بدلہ میں معاملہ دیت پر آ گیا تھا۔ اب معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قرض کا تھا؛ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قرض ادا کرنے میں ان کے اہل خانہ کی مدد کی۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان محاسن میں سے ہے جن پر آپ کی مدح کی جانی چاہیے نہ کہ مذمت۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المال میں مال کی بہت کثرت تھی۔ آپ لوگوں کو اس سے کئی گنا زیادہ عطیات دیا کرتے تھے۔ تو پھر آل عمر کو اس میں سے کیوں نہ دیئے؟

بہر حال کچھ بھی ہو یہ اجتہادی مسئلہ تھا؛ اجتہادی مسئلہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اور کچھ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ اسے قتل کیا جائے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ اپنے اجتہاد کی وجہ سے کیا؛ صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلوں پر کسی نے کلام کیا۔

ہم نے حاکم کے قتل کے بارے میں ائمہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ کیا یہ مسئلہ قتل زمین پر فساد پھیلانے کے باب سے تعلق رکھتا ہے کہ حاکم کے قاتل کو حتمی طور پر قتل ہی کیا جائے گا [اس میں دیت یا معافی کی کوئی گنجائش نہیں]۔ جیسے کہ ڈاکوؤں یا مال و اسباب چھیننے والوں کو حتمی طور پر قتل ہی کیا جاسکتا ہے؛ یا باقی عام قتل کی طرح یہ بھی ایک قتل ہی ہے کہ کوئی کسی کو اپنی کسی خاص غرض کی وجہ سے قتل کرتا ہے تو اس صورت میں قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں ہم نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی دو قول ہیں انہیں قاضی ابو یعلیٰ رحمہ اللہ اور دوسرے لوگوں نے ذکر کیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ: اسے حد میں قتل کیا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ: حکمران کو قتل کرنے کے جرم سے اتنا فتنہ و فساد پھیلتا ہے کہ اتنا فساد ڈاکہ زنی یا راہزنی کی وجہ سے نہیں پھیلتا۔ تو حاکم کو قتل کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اللہ اور اس کے رسول سے

اعلان جنگ کرنے والا اور زمین میں فساد پھیلانے والا۔

اس کی دلیل صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا انتظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا

چاہتا ہو تو اسے قتل کر دو؛ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔“ [صحیح مسلم ۱۴۷۹/۳؛ مسنن ابو داؤد ۴/۳۳۴]

پس آپ ﷺ نے جماعت میں تفریق پیدا کرنے کا ارادہ کرنے والے کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو پھر اس کا کیا

حکم ہوگا جو مسلمان حکمران کو قتل کرے اور مسلمانوں کی جماعت میں تفریق پیدا کرے۔

جن لوگوں کا یہ قول ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کو قتل کرنا حتمی طور پر واجب ہو گیا تھا۔ اور ایسے ہی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل کرنا بھی واجب ہو گیا تھا؛ اور ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے کو قتل کرنا حتمی طور

پر واجب ہو گیا تھا۔

یہی جواب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی طرف سے ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو آپ پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں:

انہوں نے [یعنی حضرت حسن نے] قاتل علی رضی اللہ عنہ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ آپ کے وارثوں میں چھوٹے بھی تھے؛ بڑے بھی؛

اور چھوٹے بچے ابھی تک بلوغت کی حد کو نہیں پہنچے تھے؟ [یعنی ممکن ہے ان میں سے کوئی ایک دیت یا معاف کرنا چاہتا ہو]۔

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس کے دو جواب دیئے جاتے ہیں:

۱۔ اس قاتل کو قتل کرنا حتمی طور پر واجب ہو گیا تھا۔

۲۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے امثال کا قتل زمین میں سب سے بڑا فساد اور اللہ اور اس کے رسول سے جنگ

ہے۔ [زمین میں فساد پھیلانے والے کی حتمی سزا قتل ہے؛ لہذا آپ کا اقدام درست ہے]۔

ان میں سے بعض یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ قصاص لینے کا اختیار صرف بڑی عمر کے افراد کو ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام ابو

حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے؛ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے۔

حضرت عمرو عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے قاتل محاربہ کے باب سے ہے۔ محاربہ میں براہ راست قتل کرنے والا اور اس کی مدد

کرنے والا دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پس اس بنا پر جس نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کی مدد کی تھی؛ بھلے وہ

ایک کلمہ بول کر ہی کیوں نہ کی ہو؛ تو اس کا قتل کرنا واجب ہو گیا تھا۔ اور ہرمزان ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کہا

جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں مدد کرنے والا تھا۔ جب معاملہ ایسے ہی تھا تو اس کو قتل کرنا واجب ہو گیا تھا۔ لیکن اسے

قتل کرنے کا اختیار حاکم وقت کو تھا۔ لیکن عبید اللہ بن عمر نے اسے قتل کر کے غلطی کی تھی؛ اور امام کو یہ حق حاصل تھا کہ اس غلطی کو

معاف کر دے۔^①

① یہ عجیب بات ہے کہ ہرمزان کے خون کا دعویٰ کھڑا کیا جاتا ہے حالانکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل سے متعمم تھا۔ اس کے برعکس امام المسلمین حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا کچھ احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ جن کو بے گناہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ”تین باتیں ہیں

جس نے ان سے نجات حاصل کر لی وہ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہوا۔ (۱) میری وفات (۲) غلیظہ مظلوم کا ناحق قتل (۳) دجال۔“ مسند احمد

(۱۰۵/۴ - ۱۰۶)، مستدرک حاکم (۱۰۱/۳)۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ہرمزان کا قصاص]:

باقی رہا رافضی کا یہ قول کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ ہرمزان کے بدلہ میں عبید اللہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔“
 [ہم کہتے ہیں]: اگر یہ روایت صحیح بھی ثابت ہو جائے تو یہ بجائے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں موجب قدح ہے۔ رافضیہ کی کوئی عقل نہیں ہوتی۔ وہ ایسی باتوں پر مدح کرتے ہیں جو حقیقت میں مذمت کے قریب تر ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔ حاکم وقت کے عصمت الدہم [معاف کرنے] کا فیصلہ کر دیا تھا۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اس فیصلہ کو توڑنا کیونکر روا ہو سکتا تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقتول کے وارث بھی نہیں تھے۔ اور نہ ہی مقتول کے وارثوں نے قصاص کا مطالبہ کیا تھا۔ جب اس کا حق بیت المال میں شمار ہوتا تھا تو پھر اس صورت میں امام وقت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ معاف کر دے۔ یہی بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاف کرنے میں بیان کی جاتی ہے۔ ہرمزان کا کوئی مصیبت وارث نہیں تھا سوائے حاکم وقت کے ولی ہونے کے۔ جب کوئی ایسا آدمی قتل ہو جائے جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو تو حاکم کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس قاتل کو قتل کر دے۔ اور اسے یہ بھی اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسے قتل نہ کرے بلکہ دیت لے لے، یہ دیت مسلمانوں کا حق ہوگی۔ اسے بیت المال کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ جب آپ نے آل عمر کے لیے دیت ترک کر دی تو یہ [اس وجہ سے کہ یہ] مسلمانوں پر ان کے حق کا کچھ حصہ تھا۔ بہر کیف جو بھی ہو؛ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معاف کر دیا تھا؛ تو اس کے بعد قتل کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف ہو۔ تو پھر یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسا فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جائے؟

پھر ان سے یہ بھی سوال کیا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کب عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کب یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ عبید اللہ کو قتل کر سکیں؟ اور آپ کو یہ فرمت ہی کب ملی تھی کہ حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوچتے رہے ہوں؟ عبید اللہ کے ساتھ ہزاروں اس کے چاہنے والے تھے۔ اس کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور وہ لوگ بھی جن میں عبید اللہ بن عمر کی نسبت بہت بڑی خیر پائی جاتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا جا سکا۔ بس صرف آپ کو معزول کرنا تھا۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ عبید اللہ کو قتل کر لیتے؟
 جب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو لوگ متفرق ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک نیک انسان تھے؛ آپ مکہ چلے گئے۔ آپ نے کسی ایک کی بھی بیعت نہ کی۔ آپ فتنہ سے اس وقت تک علیحدہ رہے یہاں تک کہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر جمع ہو گئے۔ حالانکہ آپ کی محبتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔ اور یہ یقین رکھتے تھے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔ اس لیے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے اور آپ سے دوستی رکھتے تھے اور آپ کا مذمت کرنے والوں سے آپ کا دفاع کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ مسلمانوں کو قتل کرنے کے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نظریہ کے خلاف تھے۔ اور آپ مسلمانوں کے ساتھ جنگ و قتال کے علاوہ ہر مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کر دیئے جانے کے بعد عبید اللہ بن عمر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ جس طرح دوسرے وہ لوگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف میلان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے تھے، وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے

جائے تھے۔ مگر اس کے باوجود عبید اللہ بن عمر کے بارے میں اس قدر فتنہ و فساد برپا کرنے کی خبر نہیں ملی جس قدر فتنہ و فساد محمد بن ابوبکر اور اشتر جنجی اور ان کے ایشال نے برپا کیا تھا۔ بیشک یہ سارے لوگ جنگ کے بعد فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے کچھ لوگ تھے جو مسلمانوں میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ [مگر اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا تھا]۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہرمزان کے خون کا دعویٰ کر کے قیامت قائم کی جاتی ہے حالانکہ وہ نفاق سے متم تھا؛ اس نے زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کر کے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تھی؛ [اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں مدد سے متم تھا]۔ اس کے برعکس امام المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا کچھ احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ [جن کو بے گناہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا]۔ نبی کریم ﷺ نے آپ کو جنت کی بشارت دی تھی۔ آپ اپنے دونوں بھائیوں [ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما] کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اس امت کے افضل ترین انسان تھے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امت کے خون سے سب سے زیادہ بچنے والے تھے۔ اور جو کچھ تکالیف آپ کو پہنچی تھیں ان پر سب سے زیادہ صبر کرنے والے تھے۔ جب آپ کا محاصرہ کیا گیا؛ اور آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی؛ اور ان فسادی لوگوں کے ارادے بھانپ لیے گئے تھے کہ وہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہر طرف سے مسلمان آپ کی حفاظت اور مدد کے لیے آپ کے پاس پہنچنا شروع ہو گئے؛ اور آپ کو ان لوگوں سے جنگ و قتال کا مشورہ دینے لگے؛ مگر آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو برابر جنگ سے رکے رہے۔ کہنے کا حکم دیتے رہے۔ اور آپ اپنے اطاعت گزاروں کو حکم دیتے کہ ان لوگوں سے جنگ نہ کی جائے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے غلاموں سے کہا تھا: جو کوئی جنگ سے اپنے ہاتھوں کو روکے رکھے؛ وہ آزاد ہے۔ آپ سے یہ بھی کہا گیا: آپ شام چلے جائیں؟ تو آپ نے فرمایا: ”میں اسبنہ اور ہجرت کو نہیں چھوڑوں گا۔ تو آپ سے کہا گیا: پھر آپ ان باغیوں سے قتال کریں؟ فرمایا: میں نبی کریم ﷺ کی امت میں پاب تواریز چلانے والا نہیں بننا چاہتا۔

مسلمانوں کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ بہت بڑی فضیلت تھی کہ آپ نے صبر کیا یہاں تک کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کی وجہ سے جو جنگ لڑی؛ اس میں جتنے لوگوں کا خون بہایا گیا؛ اس سے پہلے کبھی بھی مسلمانوں کا اتنا خون نہیں بہایا گیا۔ پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہو سکتا؛ بلکہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خوارج اور نواصب جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرنے والے لوگوں سے آپ کا دفاع کرنا واجب تھا؛ تو اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم کرنے والوں سے لڑنا بدرجہ اولیٰ واجب اور حق پر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت مسلمانوں کے خون کو مباح جاننے سے بہت ہی دور تھے۔ اور جو کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے خون کو حلال و مباح سمجھتے تھے؛ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح و طعن کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے؛ [اس لیے کہ آپ کے دور میں بہت زیادہ مسلمان قتل ہوئے ہیں]۔ اور جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض و دشمنی رکھتے ہیں؛ اور جنہوں نے آپ سے جنگ کی؛ ان کے لیے یہ کہنے کا جواز پیدا کرنا چاہتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حدود کو معطل کیا۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی حد کو پامال کرنا ہرمزان کے قتل میں حدود کی پامالی سے زیادہ فساد پر مبنی ہے۔

اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع واجب ہے کہ آپ مجتہد اور معذور تھے؛ یا عاجز آگئے تھے؛ تو پھر اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے عذر پیش کرنا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔

[ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد:]

[اعتراض:] شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی۔“

[جواب:] یہ بیان ان دونوں حضرات [عثمان و علی رضی اللہ عنہما] پر جھوٹ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے ولید پر حد لگائی تھی۔ صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر حد لگاتے ہوئے تخفیف کی اور صرف چالیس کوڑے لگائے تھے۔ اگر آپ اسی کوڑے لگاتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس پر اعتراض نہ کرتے۔^① رافضی کا یہ قول کہ ”میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔“

یہ صریح کذب ہے۔ اگر اس واقعہ کو سچا بھی تسلیم کر لیں تو یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی فضیلت اور مدح کا موجب ہے؛ کیونکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مان لیا؛ اور آپ کو حد قائم کرنے سے نہیں روکا۔ حالانکہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حد قائم نہ کرنا چاہتے ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روک سکتے تھے۔ اس لیے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تھے تو پھر اسے کر گزرتے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بس میں نہیں تھا کہ آپ کو روک سکتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو کسی بھی کام سے جسے آپ برا سمجھتے ہوں؛ روکنے کی قدرت رکھتے ہوتے؛ تو پھر اس کی باوجود جن باتوں کی وجہ سے آپ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر انکار نقل کیا جاتا ہے؛ مگر اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو ان کاموں سے روکا نہیں؛ تو یہ امر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح و اعتراض کا موجب ہوتا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو حد قائم کرنے کا حکم دیا؛ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات مان بھی لی؛ تو اس سے آپ کا عدل و انصاف اور دین داری ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا ولید بن عقبہ کو کوفہ پر والی تعینات کیا تھا۔ شیعہ کے نزویک ایسا کرنا جائز نہ تھا۔ اگر اسے والی تعینات کرنا حرام تھا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے روکنے پر قادر تھے؛ تو آپ پر واجب تھا کہ اس سے منع کرتے۔ جب

① صحیح مسلم: ج ۱۹۶۵ میں یہ حدیث اس طرح ہے کہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ ان کے پاس ولید بن عقبہ کو لایا گیا..... اور اس کے خلاف دو آدمیوں نے گواہی دی۔ ان میں سے ایک نے گواہی دی کہ اس (ولید) نے شراب پی ہے۔ دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے اسے قے کرتے دیکھا ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس نے شراب پیئے بغیر قے نہیں کی۔ اے علی رضی اللہ عنہ! اٹھو اور اسے کوڑے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا اٹھو اور کوڑے مارو۔ حضرت حسن نے کہا خلافت کی گرمی بھی اس کے سپرد کریں جو اس کی ٹھنڈک کا والی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے اس بات کی وجہ سے حسن رضی اللہ عنہ سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا اے عبداللہ بن جعفر اٹھو اور اسے کوڑے مارو۔ پس انہوں نے اسے کوڑے مارے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ شمار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ چالیس تک پہنچے تو فرمایا ٹھہر جا۔ پھر فرمایا نبی کریم ﷺ نے چالیس اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگوائے اور سب سنت ہیں اور مجھے یہ (چالیس کوڑے) زیادہ پسندیدہ ہیں۔ [الدری: کشمیری]

آپ نے منع نہیں کیا تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں جائز ہونے کی دلیل ہے۔ یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا کرنے سے عاجز تھے۔ اگر آپ اس کو والی بننے سے روکنے میں عاجز تھے؛ تو پھر حد قائم کرنے سے عاجز نہیں آگئے؟ تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بذات خود ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد قائم کرنے پر قادر نہ تھے اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا نہ چاہتے ہوتے۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ بھی حد قائم کرنا چاہتے تھے تو یہ ان کی دین داری اور عدل و انصاف کی دلیل ہے۔

یہ امر باعث حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ خود اس بات کے دعوے دار ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حدود کو پامال کیا جاتا رہا؛ حتیٰ کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کو پامال کیا جاتا رہا اور آپ تقیہ کی بنا پر خاموش رہا کرتے تھے۔ اگر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں یہ بات کہی بھی تھی تو اس لیے کہی ہوگی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس کے اعدا و انصار اقامت حدود میں ان کی اعانت کرتے تھے، اگر آپ اس سے تقیہ کرتے ہوتے تو یوں نہ کہتے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حضرات سے بڑھ کر حدود شریعت قائم کرنے پر قادر تھے۔ اس لیے کہ شیعہ کے قول کے مطابق تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے سامنے حق کا اظہار کرنے پر قادر نہ تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی موجودگی میں عبید اللہ بن عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ نائب ولید بن عقبہ پر حد قائم نہ کر سکے تھے۔

رافضیوں کا المیہ یہی ہے کہ یہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو آپس میں متناقض ہوا کرتی ہیں۔

[عہد عثمانی اور اذان کا اضافہ:]

[اعتراض:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ میں ایک اذان کا اضافہ کیا جو بدعت ہے؛ یہ اذان اب

تک سنت سمجھی جاتی ہے۔“

[جواب:] ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عہد عثمانی میں بھی اس پر موافقت کا اظہار کیا تھا؛ اور اپنے عہد خلافت میں اسی پر عمل کیا اور اس اذان کو بند نہ کیا۔ حالانکہ اس کا بند کرنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے اور ان کے خلاف نبرد آزما ہونے سے آسان تر تھا۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں کئی ایک لوگوں کو والی بنانے پر اعتراض کیا تھا۔ بلکہ آپ نے مشورہ دیا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے منصب سے معزول کیا جائے۔ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ ان والیان کو معزول کرنے اور ان کے ساتھ اُس جنگ کرنے کی نسبت بہت آسان تھا جس جنگ میں آخر کار آپ عاجز آگئے۔ [اگر زیادہ نہیں تو] کم از کم کوفہ اور اپنی عملداری کے دیگر علاقوں سے اس بدعت کو ختم کرنا تو آپ کے لیے آسان تھا۔ اور ایسا کرنا آپ کی قدرت و استطاعت سے باہر بھی نہ تھا۔ اور اگر آپ نے اس اذان کو بند کیا ہوتا تو لوگ یہ خبر نقل کرتے [اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا کوئی وجود ہوتا]۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس اذان کو بند کر دیتے تو لوگ اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔“

ہم کہیں گے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس اذان کے مستحب ہونے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم نوا تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسر، ہبل بن خنیف اور دیگر سابقین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موید تھے۔ اور اگر یہ اکابر صحابہ اس کا انکار کرتے تو کوئی بھی ان کی مخالفت نہ کرتا۔ مزید برآں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک نے اختلاف بھی کیا تھا تو اجتہادی امور میں اختلاف ایک عام بات ہے۔ اس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی عیب

نہیں اگایا جاسکتا۔

اور اگر کہا جائے کہ یہ اذان بدعت ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہو کہ یہ اذان اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ اہل قبلہ سے لڑنا بھی بدعت ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے کسی حاکم نے اہل قبلہ سے قتال نہیں کیا۔ [خود انصاف کیجیے اس آذان کو اہل قبلہ کے ساتھ قتال سے کیا نسبت ہے؟]

اور اگر یہ کہا جائے کہ: یہ اذان اس لحاظ سے بدعت ہے کہ اس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ: تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو بغیر شرعی دلیل کے اس آذان کا اضافہ کیا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اہل قبلہ کو قتل کرنے کے لیے شرعی دلیل موجود تھی؟

مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جامع مسجد میں دوسری نماز عید کی بدعت کا اضافہ کیا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں ایک شہر میں ایک ہی جمعہ ہوا کرتا تھا۔ اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر صرف ایک ہی بار عید کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ جمعہ کی نماز لوگ مسجد میں پڑھا کرتے تھے اور عید کھلے میدان میں پڑھا کرتے تھے۔ اور نبی کریم ﷺ عرفہ کے دن اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیا کرتے تھے۔ اور عید کے دن نماز کے بعد خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب کہ استقواء کی نماز کے بارے میں اختلاف ہے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد آیا تو آپ سے کہا گیا: ”شہر میں ایسے کمزور اور معذور لوگ ہیں جو عید گاہ کی طرف نکلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک نائب مقرر فرمایا جو مسجد میں ان لوگوں کو عید پڑھایا کرتا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تکبیرات کے ساتھ دو رکعت پڑھائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار رکعت بغیر تکبیرات کے پڑھائیں۔

ایسے ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بصرہ میں عرفہ کے دن خطبہ دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی انکار نہیں کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں جس اذان کا اضافہ کیا تھا؛ بعد میں لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا۔ جیسے کہ اہل مذاہب اربعہ اور دوسرے لوگوں کے ہاں موجود ہے۔ جیسا کہ لوگوں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس سنت پر اتفاق ہو گیا تھا کہ رمضان میں تراویح کے لیے لوگوں کو ایک ہی امام پر جمع کر دیا۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو دو عیدیں پڑھنا شروع کی تھیں اس میں علماء کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ رافضی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جو آپ نے حضرات صحابہ مہاجرین و انصاری کی موجودگی میں اور ان کی موافقت سے کی تھیں؛ اور تمام مسلمانوں نے اس پر ان کی اتباع کی۔ جیسے جمعہ کے دوسری اذان۔ جب کہ خود شیعہ نے اذان میں ”حَیَّ عَلَی خَیْرِ الْعَمَلِ“ اپنے مخصوص شعار [نشان] کا اضافہ کیا ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں، اور نہ ہی کسی نے رسول اللہ ﷺ سے ایسی کوئی چیز روایت کی ہے کہ آپ نے یہ الفاظ کہنے کا حکم دیا ہو [تو کیا یہ بدعت نہیں؟]

اگر فقہاء یہ ثابت بھی نہ کر سکیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بعض اوقات یہ الفاظ بطور تاکید کہا کرتے تھے۔ جس طرح بعض صحابہ ”حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ“، ”حَیَّ عَلَی الْفَلَاح“ کے درمیان یہ الفاظ کہا کرتے تھے؛ اس کو نداء الامرا کہتے تھے اکثر علماء کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ بعض علماء کرام نے ایسا کہنے کی رخصت دی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے لوگوں سے اس کی کراہت منقول ہے۔

ہم یہ بات اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کی مسجد میں جو اذان حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما دیا کرتے تھے؛ اور جو اذان حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ مکہ میں دیا کرتے تھے؛ اور سعد القرظ مسجد قباء میں دیا کرتے تھے؛ اس میں یہ مخصوص الفاظ نہیں ہیں جو کہ رافضی شعا ر سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کہیں بھی کوئی ایسی بات ہوتی تو مسلمان اس کو ضرور نقل کرتے اور اس میں کوئی سستی یا کمی بیشی نہ کرتے۔ جیسا کہ اس سے بہت کم درجہ کی چیزیں بھی انہوں نے نقل کی ہیں۔ جب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی نقل کردہ اذان میں مذکورہ الفاظ نہیں تھے؛ اور کسی نے یہ زیادہ کردہ الفاظ نقل نہیں کیے تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک باطل امر اور بدعت ہے۔

یہ چاروں حضرات نبی کریم ﷺ کی اجازت سے اذان دیا کرتے تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے ہی اذان سیکھی تھی۔ اور افضل ترین مساجد میں اذان دیا کرتے تھے؛ مسجد الحرام مکہ مکرمہ؛ مسجد نبوی مدینہ طیبہ؛ مسجد قباء؛ مدینہ طیبہ۔ اور ان کی اذان عوام و خواص کے ہاں تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔

یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن کے اعراب سے بڑھ کر تواتر کے ساتھ اذان نقل کی گئی ہے۔ جیسا کہ ﴿وَأَرْجُلُكُمْ﴾ کا اعراب وغیرہ۔ اسلامی شعائر میں نماز سے بڑھ کر مشہور کوئی دوسری چیز نہیں۔ بقیہ تمام اسلامی شعائر سے بڑھ کر شہرت اذان کو حاصل ہوئی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اذان کی صفات کے بارے میں اختلاف ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: احادیث میں جو بھی نقل صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے؛ وہ سنت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو جو اذان سکھائی تھی؛ اس میں ترجیع ہے۔ اور اس کی اقامت اذان کی طرح دودو بار ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے جو اذان سکھائی تھی؛ اس میں اذان کے کلمات دودو بار ہیں؛ جب کہ اقامت کے کلمات ایک ایک بار ہیں۔ ان کی اذان میں ترجیع نہ تھی۔ اس لیے اقامت کے الفاظ کو افراد میں نقل کرنا بھی صحیح اور ثابت ہے۔ اور دودو بار کے الفاظ بھی بغیر کسی شک و شبہ کے صحیح ہیں۔ محدثین کرام نے ان دونوں طریقوں کو صحیح کہا ہے۔

اس کی دوسری مثال تشہد کے الفاظ کا متعدد طرق سے روایت کیا جانا ہے۔ لیکن آخر کار حجاز میں اقامت کے اکہرے کلمات مشہور ہو گئے؛ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تعلیم دی تھی۔ جب کہ ترجیع کے کلمات سر ا کہے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو یہ الفاظ ترجیع کے ساتھ اس لیے سکھائے تھے کہ ایمان آپ کے دل میں جڑ پکڑ جائے۔ ترجیع کے کلمات اذان کا حصہ نہیں تھے۔ لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو ان کلمات کی تلقین کی تھی۔ تو اس وجہ سے لوگوں کے مابین معروف اذان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔^①

① ترجیع یہ ہے کہ جب مؤذن اذان دیتے ہوئے اُشہدُ اَن محمد رسول اللہ کہتا تو پھر دوبارہ سے دودو بار اُشہدُ اَن لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور اُشہدُ اَن محمد رسول اللہ کہتا۔ اس صورت میں اذان دینے کو ترجیع کہتے ہیں۔ اور جب اذان ایسے دی جائے تو اقامت میں ایک بار کلمات کہے جائیں۔ یہ سنت ہے۔

[کیا مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے؟]

[اعتراض] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”سب مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی اور اس کے کاموں پر تنقید کی۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا گیا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ اور غزوہ احد کے دن بھاگ گئے۔ بیعت الرضوان میں بھی شامل نہ ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ ایسے واقعات لا تعداد ہیں۔“

[جواب] رافضی کا اعتراض: ”سب مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔“

اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حد تک مخالف تھے کہ وہ آپ کو مباح الدم خیال کرتے تھے اور ان تمام نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور آپ کے قتل پر راضی رہے تھے؛ یا آپ کے قتل میں مددگار ثابت ہوئے تھے۔ تو پھر اس کے بارے میں ہر انسان جانتا ہے کہ یہ صریح کذب و بہتان ہے۔ اس لیے کہ آپ کو چند ظالم باغیوں نے قتل کیا تھا۔ [سابقین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم] اس پر رضا مند نہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”خدا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرے، وہ چوروں کی طرح بستی کی کچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ اللہ ان کو ہر طرح سے غارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات بھاگ گئے تھے اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی۔ مدینہ میں جو لوگ موجود تھے انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ تمام مسلمان آپ کے خلاف ہو گئے تھے؛ آپ کے ہر ایک فعل میں آپ کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ جن امور میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر انکار کیا گیا ہے ان میں تمام مسلمان آپ کے مخالف تھے؛ تو یہ کہنا بھی بالکل جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں سب لوگ آپ کے خلاف ہو گئے ہوں، بلکہ اکثر آپ کے ہم خیال تھے۔ آپ پر جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان میں اکثر مسلمان آپ کو حق بجانب قرار دیتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ جو شیعہ علماء مہانت فی الدین کے عادی نہیں ہیں وہ بھی حضرت عثمان کی تائید کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان اعتراضات کے بارے میں حضرت عثمان کا ساتھ دیا ہے وہ ان مسلمانوں کی نسبت اکثر و افضل ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وارد کردہ مطاعن سے متعلق جملہ امور یا اکثر امور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پشت پناہی کی تھی۔ یا تو تمام امور میں ہی ایسا تھا یا پھر غالب امور میں ایسا تھا۔ بہت سارے امور میں حق بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ بعض امور میں آپ مجتہد تھے؛ اور بعض امور میں آپ کے مخالف اجتہاد پر تھے۔ خواہ یہ اجتہاد درست ہو یا غلط۔

جب کہ آپ کے قتل میں شریک لوگ سارے کے سارے خطا پر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ظالم اور باغی اور سرکشی کرتے تھے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ان میں کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جس کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے ہوں تو پھر بھی اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مظلوم مقتول [اور جنتی] ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

[اعتراض] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ آپ احد

میں بھاگ گئے اور بیعت رضوان میں شریک نہیں ہوئے تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں یہ جاہل شیعہ کا قول ہے [مسلمانوں یہ بات بہت کم ہوئی ہے] جہالت کی وجہ سے [دو یا تین افراد نے یہ اعتراض کیا تھا۔ حضرت عثمان و ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان معترضین کو جواب دیا تھا کہ:

۱۔ بدر کے دن غائب رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمان کو مدینہ میں رہنے دیا تھا۔ واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مال غنیمت میں سے آپ کو بھی حصہ دیا تھا۔

۲۔ بیعت رضوان میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیکر ان کی طرف سے بیعت کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے ہر حال میں بہتر اور افضل تھا۔ اس بیعت کا سبب بھی آپ ہی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ جب آپ کو خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے تو آپ نے صحابہ سے موت کی بیعت لی۔ تو اس بیعت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کو خاص طور پر قریش کے پاس روانہ فرمایا تھا تا کہ آپ قریش سے صل کر بات کر سکیں۔ قریش نے آپ کو کہا کہ: آپ بیت اللہ کا طواف کر لیں؛ اور رسول اللہ ﷺ اور باقی صحابہ کرام کو رہنے دیں؛ تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: اس وقت تک میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتا جب تک رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کا طواف نہ کر لیں۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ اس کام کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جائے۔ مگر آپ نے گزارش کی کہ مکہ مکرمہ میں ان کے حمایتی نہیں ہیں۔ جب کہ اس کام کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مناسب ہیں؛ بنو امیہ کی بڑی تعداد آپ کی حمایت کے لیے مکہ میں موجود ہے۔ آپ کا شمار بھی مکہ کے سرداروں میں سے ہوتا ہے اس لیے قبیلہ کے لوگ آپ کی حمایت کریں گے۔

۳۔ صحابہ میں سے جو لوگ جنگ احد سے واپس آ گئے تھے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دیا تھا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (آل عمران: ۱۵۵)

”بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں لڑ پڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلا یا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بیشک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے احد کے دن پلٹ کر واپس چلے جانے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ تو اس معافی میں وہ لوگ بھی داخل تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت کم درجہ کے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس میں کیسے داخل نہیں ہو سکتے کہ آپ کی اتنی بڑی فضیلت ہے اور آپ کی نیکیاں اور بھلائیاں انتہاء درجہ کی ہیں۔



فصل:

[مسلمانوں کے مابین اختلافات]

[اشکال:] رافضی کہتا ہے: ”علامہ شہرستانی جو کہ امامیہ کے خلاف انتہائی سخت متعصبین میں سے ہے، اس نے ذکر کیا ہے کہ: ابلیسی شبہ کے بعد فساد کی سب سے پہلی کڑی رسول اللہ ﷺ کی بیماری میں واقع ہونے والا اختلاف ہے۔ پہلا اختلاف آپ ﷺ کی بیماری میں ہی پیدا ہوا۔ جسے امام بخاری نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی مرض الموت کی تکلیف بڑھ گئی تو آپ نے فرمایا: ”قلم دوات لاؤ کہ میں تمہیں کچھ لکھ دوں، جس کی موجودگی میں تم میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”آپ کے حواس بجا نہیں ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔“ جب شور و غل پھا ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”میرے یہاں سے چلے جاؤ نبی کے پاس شور و غل زیب نہیں دیتا۔“ [یعنی کلام الرافضی]۔

[جواب:] جو کچھ علامہ شہرستانی یا ان جیسے دوسرے مصنفین نے ”الملل و النحل“ میں نقل کیا ہے۔ اس میں عام طور پر یہ لوگ ایک دوسرے سے ہی نقل کرتے ہیں۔ اور بہت سارے اقوال اس میں نقل نہیں بھی کیے گئے۔ اور ایسے عام ہی عام طور پر نقل کیے جانے اقوال کی سند نہیں ذکر کی گئی۔ بلکہ انہوں نے عقائد اور فرق کے بارے میں پہلے سے تحریر شدہ کتابوں سے نقل کی ہے۔ مثلاً: ابو یسی الوراق؛ یہ رافضی مصنف تھا؛ اس پر بھی بہت زیادہ نقل کی تہمت ہے۔ اور ایسے ہی ابویہی اور ان کے علاوہ دوسرے شیعہ مصنفین۔ اور ایسے ہی انہوں نے زیدیہ اور معتزلہ کی کتابوں سے بھی نقل کی ہے حالانکہ یہ دونوں فرقے بہت سارے صحابہ کرام پر طعنہ زنی کے مرتکب ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ: امام اشعری رحمہ اللہ نے جو کچھ نقل کیا ہے، وہ ان کی نقل سے بہت زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ آپ فرقوں اور عقائد کے ماہر تھے۔ اور اس بارے میں جھوٹوں کے جھوٹ سے بہت زیادہ بخ کر رہے والے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ کی منقولات میں اور عام طور پر ان مصنفین کی منقولات میں جو کہ سند اور صاحب قول کے الفاظ کا لحاظ کئے بغیر کلام نقل کر دیتے ہیں، ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کے عقیدہ اور ان سے نقل کئے گئے الفاظ میں فرق صاف ظاہر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء کرام جب ایک دوسرے کا مذہب نقل کرتے ہیں تو اس میں بھی بہت زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ نقل کرنے والے کا مقصد کذب بیانی نہیں ہوتا۔ اور ایسے لوگوں کے بارے میں غلط بیانی ہو جاتی ہے جس کے بارے میں جھوٹ بولنے میں کوئی مقصد یا غرض نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ انسان اس دوسرے کی تعظیم بجالانے والا اور اس کے پیروکاروں میں سے ایک ہوتا ہے۔

تمام مسلمانوں کا رسول اللہ ﷺ کی تعظیم، آپ سے دوستی و موالات اور آپ کی اتباع کے واجب ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے باوجود علماء حدیث کے علاوہ بہت سارے دوسرے علماء سے آپ سے حدیث روایت کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی آپ ﷺ کے کلام میں ایسی کمی و زیادتی ہو جاتی ہے جس سے معنی بدل جاتا ہے۔ بلکہ

ان امور کی معرفت میں بھی غلطی ہو جاتی ہے جو کہ عام اہل علم کے ہاں بھی تو اتر کے ساتھ مشہور و معروف ہوتے ہیں۔

ہم نے اگرچہ رافضی مصنف کی نقل کردہ روایات میں بہت سارے جھوٹ کو واضح کیا ہے؛ لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بہت ساری منقولات میں یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ نہ ہی یہ اور نہ ہی اس جیسے دوسرے مصنفین۔ لیکن پھر بھی کبھی عدا جھوٹ واقع ہو جاتا ہے اور کبھی غلطی یا حافظہ کی خرابی کی وجہ سے۔ پھر باقی لوگ اسے یا تو اپنی خواہشات کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں یا پھر انہیں اس کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ خواہشات نفس انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہیں۔ خواہش پرست اپنی خواہش کے موافق چیز کو بغیر کسی دلیل کے بھی قبول کر لیتا ہے۔ اور اپنے مخالف کی بات کو بغیر کسی دلیل اور حجت کے رد کر دیتا ہے۔

❁ تمام فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں جو کہ رافضیوں سے بڑھ کر حق بات کی تکذیب اور باطل کی تصدیق کرنے والا ہو۔ اس لیے کہ اس مذہب کے سرغننے اور مؤسسين جنہوں نے اس فرقہ کی بنیاد رکھی؛ وہ زندیق اور ملحد لوگ تھے۔ جیسا کہ کئی ایک اہل علم نے یہ بات بیان کی ہے؛ اور غور کرنے والے کے لیے یہ معاملہ بالکل ظاہر ہے۔

❁ جب معاملہ ایسے ہی ہے تو ہم کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جو فضائل و مناقب اور محاسن کتاب و سنت اور نقل و متواتر سے ثابت ہیں؛ ان کو منقطع اور محرف اور ناقابل حجت روایات سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہ اصول ہے کہ یقین کو شک کی بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا۔ اور ہمیں اس بات پر یقین ہے جس پر کتاب و سنت اور ہم سے پہلے سلف صالحین کا اجماع اور منقولات متواترہ کے ساتھ ساتھ عقل بھی دلالت کرتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین مخلوق ہیں۔ پس ان پر مشکوک اور قابل قدر امور کی بنیاد پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر وہ امور ان کی شان میں کیسے قابل قدر ہو سکتے ہیں جن کا باطل ہونا سب کو معلوم ہے۔

❁ رافضی کا یہ کہنا کہ: ”شہرستانی امامیہ مذہب کے خلاف سخت ترین تعصب رکھنے والوں میں سے تھا۔“

❁ [جواب: ہم کہتے ہیں:] ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ وہ بہت ساری باتوں میں شیعہ مذہب کی طرف میلان رکھتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھار ان میں سے اسماعیلیہ ملاحہ کا کلام نقل کرتا اور اس کی توجیہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس پر اسماعیلی ہونے کا الزام لگایا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں معاملہ ایسے نہیں تھا۔ جن لوگوں نے اس پر یہ تہمت لگائی ہے؛ انہوں نے اپنے اس دعویٰ پر شہرستانی کے کلام اور اس کی سیرت سے کچھ شواہد بھی پیش کئے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بعض وجوہات کی بنا پر شیعہ کے ساتھ تھا اور بعض وجوہات کی بنا پر امام اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔

❁ اس طرح کی باتیں بہت سارے واعظین اور متکلمین کے کلام میں آ جاتی ہیں۔ یہ لوگ صحیفہ علی بن حسین میں ماثور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر دعائیں علی بن حسین رضی اللہ عنہ پر جھوٹ گھڑی گئی ہیں۔

خلاصہ کلام شہرستانی کا شیعہ مذہب کی طرف میلان صاف ظاہر ہے۔ بھلے وہ باطن میں بھی ایسا ہی تھا یا پھر صرف بطور مداخلت و لجاجت کے ایسا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب ”الملل والنحل“ اس نے ایک شیعہ رئیس کے لیے تصنیف کی تھی۔ اسے ولایت دیوانیہ حاصل تھی۔ اور شہرستانی کا مقصد یہ تھا کہ اس کا دل نرم کیا جائے۔ ایسے ہی اس شیعہ رئیس کے لیے ایک اور کتاب ”المصارعة“ بھی تصنیف کی گئی ہے؛ جس میں اس کے مابین اور ابن سینا کے مابین تقابل و نزاع

کا بیان ہے۔ اس لیے کہ یہ مصنف خود شیعیت اور فلسفہ کی طرف مائل تھا۔ اس کا سب سے بہتر حال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر یہ خود اسماعیلی یا ملحد نہ بھی ہو تب بھی شیعہ ضرور ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں واضح طور پر شیعہ مذہب کی طرف میلان ظاہر کیا گیا ہے۔

✽ اگرچہ اس کے علاوہ اس کی دیگر کتابوں میں امامیہ مذہب کو باطل ثابت کیا گیا ہے؛ تو یہاں پر یہ واضح ہو جاتا ہے جس شیعہ رئیس کی خاطر یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے مدافعت سے کام لیا گیا ہے۔

✽ ایسے ہی وہ شبہ جسے شہرستانی نے اپنی کتاب ”الممل واخل“ کے شروع میں نقل کیا ہے جو ابلیس اور ملائکہ کے مابین مناظرہ کا واقعہ ہے؛ اس طرح کی چیزیں تو منقولات کی بنیاد پر ہی معلوم ہو سکتی ہیں؛ مگر اس نے اس واقعہ کی کوئی سند ذکر نہیں کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی کوئی سند ہی نہیں۔ اس لیے کہ یہ قصہ نہ ہی نبی کریم ﷺ سے منقول ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک سے۔ نہ ہی مشہور ائمہ اسلام میں سے کسی ایک نے یہ قصہ ذکر کیا اور نہ ہی اہل کتاب کے ہاں اس قسم کی کوئی روایت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کے واقعات انبیاء کرام علیہم السلام سے منقول ہونے کی بنیاد پر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ البتہ اس قصہ کا کچھ حصہ نصاریٰ کی بعض کتابوں میں اور بعض دوسرے فرقوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

✽ شہرستانی اکثر طور پر فرقوں کے عقائد معتزلہ کی کتابوں سے نقل کرتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ تقدیر کے منکر ہیں۔ پس یہاں سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض لوگوں نے یہ قصہ گھڑ لیا ہوتا کہ تقدیر کو ثابت ماننے والے لوگوں پر حجت قائم کی جاسکے۔ واللہ اعلم۔ جیسا کہ یہ لوگ یہودیوں کی زبانی شعر بھی گھڑ لیا کرتے تھے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ منکرین تقدیر اکثر طور پر کفار کی زبانی ایسے قصے گھڑ لیتے ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ پر حجت بنا سکیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کیسے تقدیر کو جھٹلایا جاسکے۔ اور جو کوئی اس کی تصدیق کرتا ہے یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف مخلوق کے حق میں حجت قائم کر سکیں۔ جیسا کہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بہت سارے شیعہ یہودی کی زبان پر جھتیں گھڑ لیتے ہیں اور پھر اہل سنت والجماعت سے کہتے ہیں: یہودیوں کے اس شبہ کا جواب دو۔ اور ایسی باتیں ان عوام الناس کے سامنے کرتے ہیں جو اس حجت کے فساد و بطلان کو نہیں جانتے۔

✽ رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ: ”ابلیسی شبہ کے بعد فساد کا سب سے پہلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے متعلق واقع ہوا۔“

✽ [جواب]: یہ ایک باطل دعویٰ اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اگر اس سے رافضی کی مراد یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا گناہ کا کام تھا جس کا ارتکاب کیا گیا؛ تو یہ کئی ایک وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

✽ پہلی وجہ: ابلیسی شبہ کی بنیاد پر ملائکہ میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی یہ شبہ بنی آدم نے ابلیس سے سنا کہ ان کے مابین اختلاف پیدا کیا جائے۔

✽ دوسری وجہ: بنی آدم کے مابین حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں کے مابین

جو اختلاف پایا جاتا تھا؛ وہ اسلام میں پائے جانے والے اختلاف کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ فرمان الہی ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ نَهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ [البقرة ۲۱۳]

”در اصل لوگ ایک ہی گروہ تھے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا؛ اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے۔ صرف ان ہی لوگوں نے جو اسے دیئے گئے تھے، اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض و عناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا؛ اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیت سے رہبری کی؛ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے۔“

❖ بدر کے موقع پر مسلمانوں کے مابین مال غنیمت کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ مال جمع کرنے والوں نے کہا: یہ ہمارا حصہ ہے۔ اور دشمن کا پیچھا کرنے والوں نے کہا: اس پر ہمارا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور حضرات کہنے لگے: یہ ہمارا حق ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَأَتَقُوا اللَّهَ وَاصْلَحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ [الأنفال ۱]

”آپ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرمادیجیے: یہ اموال اللہ اور اس کے رسول کیلئے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنے باہمی تعلقات درست رکھو۔“

❖ واقعہ انصاریہ کے متعلق انصار کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ قریب تھا کہ دو گروہ آپس میں لڑ پڑتے؛ تو رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو خاموش کرادیا۔ یہ اختلاف ایک آدمی کے متعلق ہوا تھا کہ کیا اسے قتل کرنا جائز ہے یا ناجائز۔

❖ ایک بار انصار کے مابین ایک یہودی کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا جو کہ انہیں عہد جاہلیت کی ان جنگوں کی یاد دلارہا تھا جو کہ اوس و خزرج کے مابین واقع ہوئیں۔ یہاں تک یہ دو گروہ آپس میں لڑ پڑے؛ قریب تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگ جائیں؛ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فِرْعَانَ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ ☆ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَ أَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَةُ اللَّهِ وَ فِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ [آل عمران ۱۰۰-۱۰۱]

”اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کی کسی جماعت کی باتیں مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد مرتد و کافر بنا دیں گے۔ (گویا یہ ظاہر ہے کہ) تم کیسے کفر کر سکتے ہو؟ باوجودیکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں رسول اللہ ﷺ) موجود ہیں جو شخص اللہ کے دین کو مضبوط تھام لے تو بلاشبہ اسے راہ راست دکھا دی گئی۔“

صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک سفر میں تھے۔ ان میں سے ایک مہاجر اور ایک انصاری آپس میں لڑ پڑے۔ مہاجر نے آواز دی: اے مہاجر! اور انصاری نے آواز لگائی: اے انصار۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم جاہلیت کی پکار پکارتے ہو اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں؛ اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ نازیبا بات ہے۔“

[البخاری ۶/۱۵۳؛ مسلم ۴/۱۹۹۸]

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ صحابہ کرام کے مابین مراد رسول سمجھنے پر اختلاف ہو جاتا۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم لوگوں سے فرمایا:

”تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر۔“ چنانچہ بعض لوگوں کے راستے میں ہی عصر کا وقت ہو گیا۔ تو بعض نے کہا کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ بنی قریظہ تک نہ پہنچ جائیں۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر غروب آفتاب کے بعد عصر کی نماز پڑھی۔ اور بعض نے کہا: ”ہم تو نماز پڑھیں گے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم قضاء کریں۔ جب اس کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو ملامت نہ کی۔“ [صحیح بخاری: ج ۹۰۳۔ مسلم ۳/۱۳۹۱]

✽ اور صحیح بخاری میں ہے: ”بنو قیم کے سوار [وفد] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے تو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: ان کا امیر تعلقا بن معبد بن زرارہ کو بنائیے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: نہیں؛ بلکہ اقرع بن حابس کو بنائے۔

تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم صرف مجھ سے اختلاف کرنا چاہتے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا مقصد آپ سے اختلاف کرنا نہیں۔

دونوں میں تکرار ہوئی یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ تو اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ [الحجرات ۲]

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔“ [صحیح بخاری: ج ۲: دوم: ح ۱۵۲۴]

اس واقعہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی پست آواز میں گفتگو کرتے تھے۔

✽ تیسری وجہ: آپ ﷺ کی مرض الموت میں جو واقعہ پیش آیا وہ انتہائی آسان ترین اور واضح تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے بیماری کی حالت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا:

”اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک عہد نامہ لکھوا دوں؛ تاکہ میری بعد لوگ آپ کے مسئلہ میں کوئی اختلاف نہ کریں۔“ پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اور مومنین ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خليفة) تسلیم نہیں کر سکتے۔“ [صحیح بخاری: ۵۶۶۶]

پھر جب جمعرات کا دن آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا کہ ایک تحریر لکھوا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخاری کی حالت میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ آپ یہ حکم شدت مرض کی وجہ سے دے

رہے ہیں یا حسب معمول (بھائی ہوش و حواس) صحیح حالت میں یہ بات فرما رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں آپ بیماری کی حالت میں ایسا نہ فرما رہے ہوں۔ جیسا کہ مریض کے ساتھ حالت مرض میں ہوتا ہے؛ یا آپ کا عام عرف کے مطابق کلام تھا جس کی اطاعت کرنی واجب تھی؛ یہ بات آپ پر ایسے ہی مخفی رہی تھی جیسے آنحضرت ﷺ کی موت مخفی رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی شک پر مبنی تھا کہ نبی کریم ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ دلیل و برہان سے آپ کی وفات ثابت ہو گئی۔“

پھر بعض لوگ کہہ رہے تھے: قلم کا غد لیکر آؤ؛ اور بعض کہہ رہے تھے: ان کے لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ [نبی کریم ﷺ وہ عہد نامہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا]۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب لوگ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ نے سوچا کہ اب یہ عہد نامہ لکھنے سے بھی شک کا ازالہ نہ ہوگا۔ لہذا اب اس کے لکھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔“ اس لیے کہ لوگ سوچیں گے کہ کیا آپ نے بیماری کی حالت میں تبدیلی احوال کی بنا پر یہ عہد نامہ لکھوایا ہے یا پھر صحیح سلامتی کی حالت میں۔“ پس یہ تنازعہ اب ختم نہیں ہوگا۔“ اس لیے آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

یہ عہد نامہ لکھوانا ان امور میں سے نہیں تھا جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر واجب کیا ہو کہ اسے لوگوں کے لیے تحریر کر دیا جائے یا پھر اس وقت میں اس کی تبلیغ کی جائے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو کبھی بھی تعمیل کئے بغیر نہ چھوڑتے۔ لیکن آپ مصلحت اسی چیز میں سمجھتے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نزاع ختم کرنے کے لیے ایسا کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب آپ نے دیکھا کہ اب تو یہ اختلاف ہو کر ہی رہے گا؛ [اس لیے آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا]۔

اس سے قبل آپ ﷺ نے اپنے رب سے تین چیزیں مانگی تھیں؛ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمادیں؛ اور ایک سے منع کر دیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ: آپ کی امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز آپ کو دے دی۔ پھر آپ نے دعا مانگی کہ: ان کے اپنے علاوہ ان پر کوئی دشمن بھی مسلط نہ کرے۔“ یہ بھی آپ کو مل گیا۔ اور اللہ عز و جل سے سوال کیا کہ ان کی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہو؛ تو اس سوال سے منع کر دیا گیا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول کہ: ”مصیبت اس انسان کے لیے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد لکھنے میں حائل ہوا۔“ یہ صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ بلاشبہ عہد نامہ کا نہ لکھنا اس انسان کے لیے باعث مصیبت ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک کرتا ہے؛ یا اس پر یہ امر مشتبہ ہے اگر آپ عہد نامہ لکھوادیتے تو شک کا ازالہ ہو جاتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بات اس وقت کہنا شروع کی جب خوارج اور روافض نے پردہ پر زے نکالنے شروع کئے۔

① صحیح مسلم ج ۲۷۶۱: میں اس کی تفصیل ہے: رسول اللہ ﷺ ایک دن بنو معادیہ کی مسجد کے پاس سے گزرے تو اس میں تشریف لے گئے اور اس میں دو رکعتیں ادا کیں؛ اور پھر آپ ﷺ نے اپنے رب سے لمبی دعا مانگی پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں نے اپنے رب سے تین چیزیں مانگی ہیں دو چیزیں مجھ کو عطا کر دیں گئیں اور ایک چیز سے مجھے رک دیا میں نے اپنے رب سے مانگا کہ میری امت کو قحط سالی کے ذریعہ ہلاک نہ کرے پس یہ مجھے عطا کر دیا گیا اور میں نے اللہ عز و جل سے مانگا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کر پس اللہ عز و جل نے یہ چیز بھی مجھے عطا کر دی اور میں نے اللہ عز و جل سے سوال کیا کہ ان کی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہو تو مجھے اس سوال سے منع کر دیا گیا۔ [در راوی؛ کشمیری]

وگر نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کتاب اللہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اور اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ پاتے تو سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے۔ اور اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی کوئی چیز نہ ملتی تو پھر آپ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فتویٰ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث ابن عیینہ کی سند سے عبد اللہ بن ابی یزید سے ثابت ہے؛ انہوں نے اسے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

✽ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے احوال کی معرفت رکھنے والا جانتا ہے کہ آپ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر افضلیت اور ترجیح دیا کرتے تھے۔

✽ پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے عہد نامہ لکھوانے کا ارادہ اپنی مرضی سے ترک کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر آپ اس عہد نامہ کے لکھوانے پر اصرار کرتے تو کسی کے بس میں نہیں تھا کہ آپ کو اس سے منع کرتا۔

✽ اس قسم کے؛ بلکہ ان سے بڑھ کر تنازعات تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اہل قباء کے مابین پیش آنے والا معاملہ اس سے بڑھ کر تھا۔ جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات 9]

”اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کر دیا کرو۔“

لیکن روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے اس لڑائی میں کھجور کی شاخوں اور جوتوں کا استعمال کیا تھا۔

✽ رافضی اپنی جہالت کی وجہ سے یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید رسول اللہ ﷺ یہ تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے لکھوانا چاہتے تھے۔ اس پورے قصہ میں کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جو کسی بھی طرح اس موقف پر دلالت کرتی ہو۔ اور نہ ہی محدثین اور اہل علم کے ہاں کوئی ایسی معروف روایت پائی جاتی ہے جس میں یہ اشارہ ملتا ہو کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ سے ایسی نص جلی و قطعی کی روشنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہے کہ جس کے بعد اس کے نہ ماننے کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ ہم کہتے ہیں: اگر واقعی رسول اللہ ﷺ نے ایسے کیا تھا تو پھر کوئی عہد نامہ لکھوانے کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ اور اگر معاملہ ایسے تھا کہ اس وصیت کے سننے والے آپ کی اتباع نہیں کریں گے تو پھر یہ احتمال بھی مکمل طور پر موجود تھا کہ وہ لکھی ہوئی بات کو بھی نہیں مانیں گے۔ تو پھر شیعہ گمان کے مطابق ایسا کوئی عہد نامہ لکھوا لینے میں کون سا فائدہ مضر تھا۔

جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قصہ:

[اعتراض:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”دوسرا اختلاف: جو کہ آپ کی بیماری کی حالت میں پیش آیا کہ: نبی کریم ﷺ نے مرض الموت کی حالت میں متعدد بار فرمایا: اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیج دو۔ اللہ اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔“ تو بعض لوگ کہنے لگے: ہم پر آپ کا حکم ماننا واجب ہے۔ اور اسامہ رضی اللہ عنہ تیار ہو چکے ہیں۔ اور کچھ لوگ کہنے لگے: ”آپ کی بیماری بہت بڑھ گئی ہے۔ اس حالت میں ہمارے دل آپ کی جدائی گوارہ نہیں کرتے۔“

[جواب:] اس قصہ کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا: ”اللہ اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔“ اور نہ ہی یہ بات کسی ثابت شدہ سند کے ساتھ آپ سے منقول ہے۔ بلکہ کتب حدیث میں اس کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں۔ اور اصحاب اسامہ کو ان کے ساتھ جانے سے کوئی روکنے والا بھی نہیں تھا۔ بلکہ خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے خروج سے توقف کیا تھا۔ اس لیے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا اندیشہ تھا؛ اس لیے یوں عرض گزار ہوئے تھے: ”میں کیسے چلا جاؤں اور آپ کی یہ حالت ہے؟ کیا میں قافلوں سے آپ کے متعلق پوچھتا رہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو کچھ دن رکنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اگر رسول اللہ ﷺ جزم کے ساتھ آپ کو جانے کا حکم دیتے تو آپ کے لیے اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اور اگر اسامہ روانہ ہو جاتے تو آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہتا۔ یہ تمام لوگ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس غزوہ پر روانہ ہوئے اور ان میں سے کوئی ایک بھی پیچھے نہیں رہا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں ہرگز نہیں تھے؛ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ آپ اس لشکر میں شامل تھے۔ اور آپ بعد میں ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے؛ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسامہ سے اجازت طلب کی کہ عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں رہنے دیا جائے؛ وہاں پر ان کی سخت ضرورت ہے۔ تو آپ نے اس کی اجازت دیدی۔ حالانکہ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کے لیے سب سے زیادہ حریص انسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ جمہور صحابہ نے دشمن کے خوف کے اندیشہ سے یہ مشورہ دیا تھا کہ جیش اسامہ کو ان حالات میں روانہ نہ کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا:

”اللہ کی قسم! میں اس جھنڈے کو کبھی نہیں کھول سکتا جسے رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہو۔“

جیش اسامہ کی روانگی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع کے ایام میں سب سے بڑے مصلحت خیز کاموں میں سے تھی۔ اس میں کوئی بھی چیز سبب اختلاف تھی ہی نہیں۔

❦ شہرستانی کو حدیث اور آثار صحابہ و تابعین کا کوئی علم و تجربہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہرستانی نے اپنی اس کتاب میں وہ اختلافات بھی نقل کئے ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین نقل کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اصول میں صحابہ و تابعین اور ائمہ اہل اسلام کا مذہب نقل نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ اور اس جیسے دوسرے لوگ اصل میں اس چیز کی معرفت ہی نہیں رکھتے۔ اور وہی چیز نقل کر دیتے ہیں جسے کتب مقالات میں پاتے ہیں۔ اور ان کتابوں میں بہت سارے ایسے جھوٹ پائے جاتے ہیں جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں جھوٹ پایا جاتا ہے۔

❦ لیکن افتراء پرداز یہ گمان کرتے ہیں کہ: اس لشکر میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ اور ان کو اس لشکر میں نکالنے کا مقصد یہ تھا تا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلافت کے مسئلہ پر اختلاف نہ کر سکیں۔ بلا شک و شبہ یہ جھوٹ اور بہتان وہی شخص گھڑ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال سے سب سے بڑا جاہل ہو۔ اور جان بوجھ کر سب لوگوں سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والا ہو۔ ورنہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مرض وفات کے تمام ایام میں [

نمازیں پڑھانے کے لیے امام مقرر کر رکھا تھا؛ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حالانکہ اس وقت سبھی لوگ موجود ہوا کرتے تھے۔

اگر رسول اللہ ﷺ لوگوں پر کسی بھی انسان کو والی بنا دیتے تو لوگ ضرور آپ کی اطاعت کرتے۔ مہاجرین و انصار اس انسان سے لڑ پڑتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کسی بات میں اختلاف کرتا ہو۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کی تھی۔

✽ اور اگر رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نمازیں پڑھانے کے لیے امام بناتے تو کسی میں مجال نہیں تھی کہ اسے رد کر سکے۔ اور اگر حج میں آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور باقی لوگوں پر امیر بنانا چاہتے تو پھر بھی کسی میں اختلاف یا رد کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ اور ایسے ہی اگر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے یہ فرما دیتے: یہ میرے بعد تمہارا امیر اور امام ہے۔ تو کیا کوئی آپ کی بات کو رد کر سکتا تھا؟

✽ آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ یہ سبھی لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنے والے تھے؛ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والا نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی ان لوگوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف و بغض رکھنے والا تھا جن کے کسی قرہی کو آپ نے کسی غزوہ میں قتل کیا ہو۔

✽ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا۔ ایک ہزار مجاہدین بنو سلیم سے تھے؛ ایک ہزار بنو مزینہ سے؛ جبینہ سے ایک ہزار بنی غفار سے ایک ہزار۔ اور باقی لشکر بھی اسی طرح سے تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے: ”قبیلہ اسلم کو اللہ تعالیٰ نے سالم رکھا؛ اور قبیلہ غفار کی اللہ تعالیٰ نے بخشش فرمادی۔“ اور فرمایا کرتے تھے: ”قریش انصار جبینہ مزینہ اسلم اور غفار کے قبائل میرے دوست ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی دوستی حاصل ہے۔“ [صحیح بخاری: ج: ۲، ص: ۷۳۸]

✽ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا۔ اور نہ ہی انصار میں سے کسی ایک کو قتل کیا۔ اس کے برعکس حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب سے اسلام لائے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت مشرکین سے بہت سخت دشمنی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین بھی سب صحابہ سے بڑھ کر آپ سے نفرت رکھتے تھے۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی اور شدت کی وجہ سے آپ سے دور بھاگتے تھے۔ ایسا حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نہیں تھا۔ ان سے لوگ اتنا بغض و نفرت نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو خلیفہ متعین کیا تو بعض لوگوں نے اس بات کو ناپسند کیا۔ اور بعض لوگوں نے تو حق کی ناپسندیدگی کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ٹکرا بھی کیا۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس یہاں کوئی ایسا سبب نہیں پایا جاتا تھا کہ جس کو رسول اللہ ﷺ اپنی نبوت والی زبان سے خلیفہ و امام مقرر کر دیں؛ اور اس کے متعلق نص موجود ہو؛ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو پیچھے کر دیں اور جس کا حق بعد میں ہوا سے [یا بغیر حق کے کسی کو] آگے کر دیں یا صاحب حق کو حق سے محروم کر دیں۔

✽ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے کسی خوف کے پیش نظر ان دو کو حبش اسامہ رضی اللہ عنہ میں نکالا بھی ہوتا تو آپ لوگوں کو یہ بھی کہہ

دیتے کہ ان دونوں کی بیعت نہیں کرنا۔ ہائے افسوس! کوئی یہ تو بتائے کہ رسول اللہ ﷺ کو کس سے خوف لاحق تھا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی، آپ کو غلبہ اور سر بلندی عطا فرمائی؛ آپ کے ارد گرد مہاجرین و انصار کی ایک جماعت تھی جنہیں اگر رسول اللہ ﷺ یہ حکم دیتے کہ اپنے والدین اور بیٹوں کو قتل کر ڈالو، تو وہ ضرور ایسا کر گزرتے۔

اللہ تعالیٰ نے سورت برأت نازل فرمائی؛ جس میں منافقین سے پردہ چاک کیا؛ اور مسلمانوں کو ان کی پہچان کروائی۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور عام مسلمانوں کے نزدیک پست، ذلیل اور سرنگوں و حقیر تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین اشخاص میں سے تھے۔ اور آپ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ عزت مند، محبوب اور خاص الخواص تھے۔ دن اور رات میں ہر وقت باقی تمام لوگوں سے بڑھ کر آپ کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی موافقت اور محبت رکھنے والے تھے۔ آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل اور اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے سب سے بڑھ کر حریص تھے۔ تو پھر کوئی مسلمان کیسے اس بات کو جائز سمجھ سکتا ہے کہ: یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کے نزدیک منافقین کی جنس سے تعلق رکھتے تھے۔ منافقین کے بارے میں صحابہ کو علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان سے بے رخی برتتے تھے؛ اور آپ کے نزدیک سب سے بڑھ کر ذلیل یہی لوگ تھے۔ سورت برأت نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے قریب بھی نہیں چھٹکتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا﴾ مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِلُوا تَقْتِيلًا ﴿[الأحزاب ۶۰-۶۱]

”اگر منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں مرض ہے اور مدینہ میں دہشت انگیز افواہیں پھیلانے والے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔ پھر وہ تھوڑی ہی مدت آپ کے پڑوس میں رہ سکیں گے۔ یہ لوگ ملعون ہیں جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں پکڑ کر بری طرح قتل کر دیا جائے گا۔“

ان آیات کے نزول کے بعد یہ لوگ نفاق کا اظہار کرنے سے باز آ گئے۔

جب کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے نزدیک انتہائی محبوب اور سب سے بڑھ کر عزت والے تھے۔

[رسالت مآب ﷺ کی وفات میں اختلاف]:

[اشکال]: رافضی نے کہا ہے: ”تیسرا اختلاف: نبی کریم ﷺ کی موت میں واقع ہوا۔“

[جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں آپ ﷺ کی وفات کا معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مخفی رہا۔ پھر دوسرے

دن اس کا اقرار کر لیا۔ اور یہ اعتراف کر لیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا انکار کرنے میں خطا پر تھے۔ پس یہ اختلاف ختم ہو گیا۔ یہ حدیث کے الفاظ دیے نہیں ہیں جس طرح شہرستانی نے ذکر کئے ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں [ابو سلمہ کا بیان ہے کہ] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو کر رہے

تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر کہا کہ: بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے پھر انکار کر دیا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تشہد پڑھا لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور عمر کو چھوڑ دیا؛ آپ نے فرمایا:

((أما بعد! فمن كان منكم يعبد محمداً صلى الله عليه وسلم فإن محمداً صلى الله عليه وسلم قد مات ومن كان يعبد الله فإن الله حي لا يموت . قال الله تعالى:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ [آل عمران 144]

”اما بعد! تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”(حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول ہی ہیں۔ آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے۔ کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔“

[آپ فرماتے ہیں:] بخدا اس سے پہلے لوگ گویا جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی لوگوں نے یہ آیت ان سے سن کر اخذ کی اور کوئی شخص سنا نہیں جاتا تھا مگر اس کی تلاوت کرتا تھا۔ [صحیح بخاری: ج ۱: ص ۱۱۷۷]

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں نے جب سنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی تلاوت فرما رہے تھے، یہاں تک کہ میری ٹانگوں نے جواب دیدیا اور میں زمین پر گر پڑا اور مجھے علم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے ہیں۔“ [البخاری ۷۲/۲]

[امامت میں اختلاف]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”چوتھا اختلاف: امامت میں واقع ہوا۔ امت میں سب سے بڑا اختلاف امامت کا اختلاف ہے۔ کہ اس طرح اسلام کی چھاؤنی پر تلوار لہرائی گئی جیسا کہ ہر دور میں امامت پر تلوار آویزاں رہی ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ سب سے بڑی غلط بات ہے۔ الحمد للہ کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اسلام پر کوئی تلوار آویزاں نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان حضرات کے دور میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف پایا جاتا تھا۔ اور نہ ہی اس دور میں مسئلہ امامت میں کوئی اختلاف تھا۔ چہ جائے کہ تلوار چل رہی ہو۔ اور نہ ہی ان کے مابین کسی دینی معاملہ پر تلوار سوئی گئی تھی۔ بعض انصار نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں کہ ان کے بڑوں نے ہی ان باتوں کو رد کر دیا؛ جیسا کہ حضرت اسید بن حنیز اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما وغیرہ جو کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے بھی ذاتی اور خاندانی طور پر افضل ہیں۔

صحیحین میں کئی اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سب سے بہترین انصاری گھرانہ بنی نجار کا ہے پھر بنی عبد الاشہل پھر بنی حارث بن خزرج اور بنی ساعدہ کا ہے اور

ویسے تو ہر انصاری گھرانہ میں بہتری ہے۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ص ۹۹۴]

فضیلت والے تین گھرانے یہ ہوئے: بنی نجار؛ پھر بنی عبد الاشہل پھر بنی حارث بن خزرج۔“ ان میں سے کسی ایک کے

بارے میں بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے امامت کے بارے میں کوئی اختلاف یا تنازع کیا ہو۔ بلکہ بنی نجار کے لوگ جیسے حضرت ابویوب الانصاریؓ اور ابی طلحہ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم ان تمام حضرات نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بیعت کے لیے پسند ہی نہیں کیا۔

✽ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع انصار کے سالار تھے۔ آپ نبی کریم ﷺ کی بائیں جانب تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دائیں جانب۔ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا تعلق بنی عبد الاشہل سے تھا۔ آپ لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیعت کرنے کے لیے حکم دے رہے تھے؛ یہی حال دوسرے انصار کا بھی تھا۔

✽ مسئلہ خلافت میں اختلاف کرنے والے حضرت سعد بن عبادہ اور حباب ابن منذر کے علاوہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ پھر ان لوگوں نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور سوائے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

✽ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ایک نیک انسان تھے؛ لیکن آپ معصوم نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے گناہ بھی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ بعض مسلمان ان چیزوں کو جانتے تھے۔ آپ انصار میں سے سابقین اولین میں سے تھے؛ رضی اللہ عنہم؛ اور آپ کا شمار اہل جنت [عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم] میں سے ہوتا ہے۔

✽ شہرستانی نے جو لکھا ہے کہ: انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر متفق ہو گئے تھے؛ تمام اہل علم اصحاب روایت و درایت اس بات کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔ صحیح اور ثابت شدہ احادیث اس کے خلاف ہیں۔ شہرستانی اور اس کے امثال اگرچہ خود جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بھی بولتے؛ مگر پھر بھی وہ ایسے لوگوں کی کتابوں سے روایات نقل کرتے ہیں جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔

✽ ایسے ہی کہنے والے کا یہ قول بھی ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق آپ کی تجہیز و تکفین اور قبر کے امور میں مشغول ہو گئے تھے۔ "یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اور ان کے دعویٰ کے متناقض بھی ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین رات کو عمل میں آئی۔ یہ کام دن کو نہیں ہو سکا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: آپ کی تدفین آنے والی رات میں ہوئی۔ اور آپ ﷺ نے کسی کو بھی اپنی قبر کے ساتھ لگے رہنے کا حکم نہیں دیا؛ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا۔ بلکہ آپ کی قبر اطہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ام المؤمنین کے لیے ناکرم تھے۔

✽ پھر آپ کو اپنی قبر پر لگے رہنے کا حکم بھی کیسے دیا جاسکتا ہے جب کہ ان لوگوں کے خیال مطابق رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنے بعد امام متعین کیا تھا۔

✽ دوسری بات یہ ہے کہ: آنحضرت ﷺ کی تجہیز و تکفین میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی مصروف نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے ساتھ حضرت عباس اور ان کے بیٹے بھی تھے؛ رضی اللہ عنہم۔ آپ کا غلام شتران رضی اللہ عنہ بھی تھا؛ اور بعض انصار بھی اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما گھر کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ غسل اور تجہیز کے وقت یہ حضرات حاضر اور موجود تھے؛ اس وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں نہیں تھے۔

✽ سنت یہ ہے کہ: میت کی تجہیز و تکفین اس کے گھر والے کریں۔ پس آپ کے اہل بیت کے افراد نے آپ کو غسل دیا۔ اور تدفین میں تاخیر اس لیے ہوئی تاکہ مسلمان آپ پر درود شریف پڑھ لیں۔ اس لیے کہ لوگ آپ پر افرادی طور پر درود پڑھتے تھے۔ خواتین و حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد تھی؛ اسی لیے غسل اور تکفین کے باوجود پیر کے روز تدفین ممکن نہ ہو سکی۔ بلکہ منگل کے روز بھی لوگ آکر درود و سلام پڑھتے رہے اور بدھ کے روز تدفین عمل میں آئی۔

✽ مزید برآں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جو جنگیں ہوئیں وہ امامت کے مسئلہ پر نہیں ہوئیں۔ اس لیے کہ اہل جمل، اہل صفین، اور اہل نہروان ہر گز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہنا کر کسی دوسرے کو خلیفہ بنایا جائے۔ نہ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ میں امیر ہوں اور نہ ہی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے ایسی کوئی بات کہی۔

✽ تحکیم الحکمین سے قبل جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑیں انہوں نے کوئی دوسرا امام بھی مقرر نہیں کیا ہوا تھا جس کی اطاعت کی خاطر جنگ لڑی جاتی۔ نہ ہی ان جنگوں کا مقصد قواعد امامت میں سے کسی قاعدہ پر جنگ کرنا تھا۔ اور نہ ہی ان متحارب گروہوں میں سے کوئی خلفاء ثلاثہ کی خلافت پر تنقید کرتے ہوئے لڑ رہا تھا۔ اور نہ ہی کسی ایک نے ان کے علاوہ کسی اور کے لیے کسی نص کا دعویٰ کیا۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے جواز پر تنقید کی۔

✽ امامت کے جس مسئلہ لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا ہے، جیسے کہ روافض، معتزلہ اور خوارج اور دوسرے لوگوں کا اختلاف؛ اس پر صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے کوئی جنگ کی ہی نہیں۔ اور نہ ہی کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ منصوص علیہ امام ہیں۔ اور یہ کہ پہلے تین خلفاء کی خلافت باطل تھی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے یہ کہا کہ: حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور جو کوئی ان سے دوستی رکھے، سب کافر ہیں۔

✽ پھر کسی مدعی کا یہ دعویٰ کرنا کہ اہل قبلہ کے مابین سب سے پہلے تلوار مسئلہ امامت اختلاف کی وجہ سے آویزاں ہوئی؛ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے جو کسی ایک پر بھی مخفی نہیں۔ ان واقعات کا معمولی سا علم رکھنے والا ایک ادنیٰ غور و فکر کے بعد اس جھوٹ کو سمجھ سکتا ہے۔

✽ اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ بہت سارے علماء کے نزدیک یہ فتنہ کی جنگیں تھیں۔ اور بہت سارے علماء اسے اہل عدل اور اہل بغاوت کی جنگیں قرار دیتے ہیں۔ یہ ایسی جنگیں تھیں جو غیر امام کی اطاعت پر تاویل کی وجہ سے ہوئیں۔ کسی دینی قاعدہ کی بنیاد پر نہیں تھیں۔

✽ اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تنازعہ کرنے والے امامت کے مسئلہ میں اختلاف کرتے اور آپ ان لوگوں سے قتال کرتے تو آپ کا قتال کرنا بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کی جنس سے ہی ہوتا۔ اگرچہ ان لوگوں کے مابین کسی دینی قاعدہ کی بنیاد پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔

✽ اسلام میں دینی اختلاف کی بنیاد پر سب سے پہلے جو تلوار اٹھائی گئی وہ خوارج کی تلوار تھی۔ اور ان کے جنگ بہت بڑی جنگ تھی۔ ان لوگوں نے ایسے عقائد گھڑ لیے تھے جو صحابہ کرام کے عقائد کے خلاف تھے۔ پھر ان کی بنیاد پر انہوں نے جنگیں لڑیں۔ ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا: ”مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا“

اور فریقین میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہونگے۔“ [مسلم ۲/ ۱۷۴۵، ابوداؤد ۴/ ۳۰۰]۔

✽ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی امامت کے مسئلہ پر جنگ نہیں لڑی۔ اور نہ ہی آپ نے کسی ایک سے اپنی امامت منوانے کے لیے لڑائی کی۔ اور نہ ہی آپ کے عہد میں کسی ہفہ یہ دعویٰ کیا کہ وہ آپ سے بڑھ کر خلافت و امامت کا حق دار ہے۔ نہ ہی حضرت عائشہؓ نہ ہی حضرت طلحہ و زبیرؓ نہ ہی حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم؛ اور نہ ہی خوارج نے ایسا کوئی دعویٰ کیا۔ بلکہ تمام امت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور سابقت اسلام کا اعتراف کرتی تھی۔ اور آپ کے عہد خلافت میں صحابہ کرام میں کوئی دوسرا فرد ایسا بھی نہیں تھا جو کہ آپ کا ہم پلہ و ہمسر ہو۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دور میں تھے۔ اور ایسا بھی ہرگز نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں سے کسی ایک نے آپ سے خلافت و امامت کے مسئلہ پر قتال کیا ہو۔ اور نہ ہی دو افراد اس بات میں اختلاف کرنے والے تھے کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا آپ سے زیادہ خلافت کا حق دار ہے۔ چہ جائے کہ کوئی اس بات پر جنگ کرتا۔ یہی حال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بھی تھا۔

✽ خلاصہ کلام! جو انسان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال کا علم رکھتا ہے؛ وہ علم ضروری کے طور پر جانتا ہے کہ مسلمانوں کے گرد و ہوں کے مابین خلفاء ثلاثہ کی امامت کے مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ چہ جائے کہ اس بات پر جنگیں ہوتیں؟

✽ یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ کسی ایک گروہ نے بھی اس بات پر جنگ نہیں کی کہ کوئی دوسرا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلافت کا حق دار ہے۔ اگرچہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو خلفاء اربعہ کی خلافت کو ناپسند کرتے ہوں گے۔ ایسا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو محمد ﷺ کی نبوت کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ تو پھر بعض خلفاء کی خلافت کو ناپسند کرنے والے کیوں نہیں ہو سکتے؟

✽ لیکن اس مسئلہ میں بھی لوگوں میں کوئی ظاہری اختلاف نہیں تھا؛ کجا کہ وہ ایک دوسرے پر تلواریں سونت لیں۔ جیسا کہ اہل علم کے مابین عقائد اور علمی مسائل میں اختلاف مشہور ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو اختلاف کرنے والے گروہ مل بیٹھتے ہیں اور بعض علمی مسائل میں آپس میں مناظرہ کرتے ہیں۔

✽ خلفاء اربعہ کے دور میں کوئی دو گروہ ایسے نہیں تھے جن میں کھلا ہوا اختلاف ہو۔ اور نہ ہی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ان کے بعد میں آنے والوں پر تقدیم و فضیلت اور ان کی امامت کی صحت کے مسئلہ پر کوئی اختلاف تھا۔ نہ ہی ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت و صحت امامت میں کوئی اختلاف ہوا۔ اور نہ ہی ان تین یاروں کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت و امامت کے مسئلہ پر کسی کوئی اختلاف ہوا۔ اور ان چار یاروں کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو ان سے افضل ہو۔ اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں میں سے کسی ایک نے اس بات پر اختلاف کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ان سے بہتر بھی کوئی انسان موجود ہے۔ مسلمانوں کے معروف گرد و ہوں میں سے کسی ایک نے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت نہیں دی چہ جائے کہ وہ حضرت معاویہؓ کو فضیلت دیتے۔ اگرچہ ان لوگوں پیش آمدہ شبہ کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ بھی لڑی۔ لیکن یہ جنگ ہرگز نہ اس بنیاد پر تھیں کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر افضل کوئی دوسرا ہے اور نہ ہی اس بنیاد پر تھیں کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ و امام ہے۔ اور نہ ہی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما میں سے کسی نے اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہا؛ اور نہ ہی کسی ایک نے اس بات پر ان میں سے کسی ایک کی بیعت کی۔

جب کہ بہت سارے مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اہل مدینہ کے اکثر لوگ آپ کو امیر المؤمنین مانتے تھے۔ جب کہ کسی ایک نے بھی حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما میں سے کسی کی بھی بیعت نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے لوگوں کو اپنی بیعت کرنے کی دعوت دی۔ اور نہ ہی لوگوں نے یہ کہا کہ: آپ اپنی بیعت لے لیجیے۔ ان دونوں حضرات کا مقام و مرتبہ اس سے بہت زیادہ بلند اور جلیل القدر تھا کہ یہ حضرات کوئی ایسی حرکت کرتے۔

یہی حال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کسی ایک نے بھی آپ کی بیعت اس بات پر نہیں کی کہ آپ امام اور خلیفہ ہیں۔ اور نہ ہی جب آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسرِ پیکار تھے تو کسی نے آپ کو امام قرار دیکر آپ کی بیعت کی۔ اور نہ ہی آپ اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلاتے تھے۔ نہ ہی لوگوں میں سے کسی ایک نے آپ کو یہ خطاب دیا۔ اور نہ ہی تحکیم الحکمین سے قبل امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ولایت کا مطالبہ کیا۔

جب کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کا تمام عرصہ خود کو امیر المؤمنین لکھا کرتے تھے۔ اور مسلمان آپ کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملکر آپ سے جنگیں لڑیں وہ آپ کو امیر المؤمنین نہیں مانتے تھے۔ اور نہ ہی وہ آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے۔ حالانکہ وہ اس بات کے معترف تھے کہ لوگوں میں اب آپ سے افضل کوئی دوسرا باقی نہیں بچا۔ لیکن ان لوگوں کے اپنے اتنے تحفظات تھے جن کی بنا پر وہ آپ کی اطاعت میں داخل نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود کسی ایک نے آپ سے اس بات پر جنگ نہیں کی کہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں اور نہ ہی آپ کو یا آپ کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی دعوت دی گئی اور نہ ہی یہ کہا گیا کہ: اگرچہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں؛ مگر وہ آپ سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ آپ پر واجب ہوتا ہے کہ ان کی اطاعت کریں ورنہ ہم آپ سے جنگ کریں گے۔

جیسا کہ بہت سارے زیدی شیعہ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے افضل تھے۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ان لوگوں کی خلافت منعقد کی جائے۔ اس لیے کہ بہت سارے لوگوں کے دلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اس وجہ سے نفرت تھی کہ آپ نے ان کے بہت سارے اقارب کو قتل کیا تھا۔ تو یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کی خلافت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو جاتا۔ اس وجہ سے مفضل کو خلیفہ مقرر کیا جانا جائز تھا۔

یہ قول ان لوگوں کا ہے جو شیعہ کے بہترین طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ باقی لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ یہی کہتے ہیں: حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق ہے؛ اس میں کسی طرح بھی تنقید کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح سے یہ لوگ اپنی کوشش کے مطابق جامع القولین ہیں۔

ان لوگوں کا عذر وہ آثار ہیں جو انہوں نے سن رکھے تھے؛ اور وہ امور تھے جو ان کے ذہن میں کھٹکتے تھے؛ ان کا تقاضا تھا

کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر افضلیت دیں۔ جیسا کہ عوام الناس کے مابین مشہور اس طرح کے دیگر مسائل میں بھی ہوتا ہے: جن میں حق ان دو میں سے ایک گروہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر دوسرے گروہ کے پاس بھی ایسی منقولات ہوتی ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی سچ اور درست ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ آثار جھوٹ و اختراع ہیں۔ اور ان کے پاس جو آیات اور صحیح احادیث ہیں ان میں وہ لوگ اپنے گمان کی وجہ سے تاویلات کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ نص سے یہی مراد ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسے نہ تھا۔ اور ان لوگوں کے پاس ایک نوعیت کی قیاس اور رائے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ حق ہیں۔ جبکہ وہ باطل ہیں۔

تمام باتوں کا مجموعہ یہی تمام سرمایہ ہے جس کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ اگر انسانی نفوس ہوائے نفس سے خالی ہوں تو یہ شبہات پیدا نہیں ہو سکتے۔ مگر بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل ہوائے نفس سے پاک ہوں۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْهُدَىٰ﴾ [النجم ۲۳]

”یہ لوگ صرف اُٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج سے قتال کرنا نص رسول اللہ ﷺ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں تھا۔

جب کہ جمل اور صفین کی جنگوں کے بارے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کے پاس اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے منقول کوئی نص نہیں تھی؛ بلکہ یہ محض آپ کی رائے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہ نے اس قتال میں آپ کی موافقت نہیں کی تھی۔ بلکہ اکثر کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے: حضرت سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر، اسامہ بن زید، محمد بن مسلمہ، اور ان کے امثال سابقین اولین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین نے ان میں سے کسی بھی گروہ کا ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ یہ سبھی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم بجالانے والے تھے۔ آپ سے محبت کرتے؛ دوستی رکھتے؛ اور باقی لوگوں پر آپ کو مقدم رکھتے تھے۔ اور آپ کے زمانہ میں آپ سے بڑھ کر کسی دوسرے کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جنگ کے مسئلہ میں آپ کی رائے کی موافقت نہیں کی۔

ان لوگوں کے پاس ایسی نصوص تھیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھی تھیں؛ جن کی دلالت کا تقاضا تھا کہ جنگ اور فتنہ میں داخل ہونے سے بہتر یہ ہے کہ قتال اور جنگ کو ترک کر دیا جائے۔ ان نصوص میں قتال سے ممانعت کی روایات بھی تھیں۔ اس بارے میں معروف آثار تو بہت زیادہ اور کثرت کیساتھ تھے۔

جب کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشہور سابقین اولین میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ بلکہ سابقین اولین میں سے بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ان کی اکثر فتنہ سے الگ اور دور رہی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض سابقین اولین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ بھی تھے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے حضرت ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ اہل بیعت رضوان میں سے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں

سابقین اولین کہا جاتا ہے۔ یہ بات ابن حزم رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء نے ذکر کی ہے۔

یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے بھی اس وجہ سے جنگ نہیں کی کہ کوئی دوسرا انسان امام یا خلیفہ ہے۔ اور نہ ہی کسی نے آپ کو کسی دوسرے کے پرچم تلے آنے کو کہا۔ پھر یہ کہ جب مصاحف بلند کیے گئے؛ اور آپس میں فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی جانے لگی؛ اور اس بات پر ان کا آپس میں اتفاق بھی ہو گیا۔ اور اگلے سال جب جمع ہوئے تو فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ: حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کر دیا جائے؛ اور مسلمانوں کی خلافت کا مسئلہ شوری کے ذریعہ حل کیا جائے۔

حکمین میں سے ایک نے کہا: اس نے اپنی ساتھی کو معزول کر دیا ہے؛ اور میں اپنے ساتھ کو معزول نہیں کر رہا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا میلان تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہ بہت غصہ ہوئے۔ ان لوگوں کا اتفاق اس بات پر نہیں تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے منصب سے معزول کیا جائے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے آپ نے امیر المؤمنین نہیں تھے۔ بلکہ آپ کو شام کی ولایت سے معزول کرنے پر اتفاق تھا۔ اس لیے کہ آپ یہ کہتے تھے: مجھے اس سے پہلے دو خلفاء حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے والی مقرر کیا ہے۔ اور میں اس وقت تک اپنی ولایت پر باقی رہوں گا یہاں تک کہ لوگوں کا ایک خلیفہ پر اتفاق ہو جائے۔

حکمین کا اتفاق ہو گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے منصب سے معزول کیا جائے۔ اور معاویہ کو شام کی ولایت سے معزول کیا جائے۔ ان میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ اس کا ساتھی اپنے منصب پر باقی رہے؛ مگر اس نے اس چیز کا اظہار نہیں کیا۔ جب اس نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تو لوگ بغیر کسی اتفاق کے منتشر ہو گئے؛ اور اس کے بعد کوئی جنگ و قتال نہیں ہوا۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ: اس واقعہ کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بجائے خود امیر المؤمنین ہونے کا دعویٰ کیا تھا؛ تو پھر بھی شیعہ کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت تسلیم کروانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی گئی۔

اس سے واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں اس وجہ سے نہیں لڑی گئیں کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام تھا اور آپ کے اطاعت گزار۔ بلکہ ریب جو لوگ امامت کے مستحق تھے؛ جیسے حضرت ابو بکر حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہ؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بات میں اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ڈر و خوف رکھتے تھے کہ وہ ان کے خلاف اپنے قول یا فعل سے خروج کریں۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت باقی تمام لوگوں سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس عہد کے لوگ اتنے عادل اور صاحب علم تھے کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہے کہ: آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں۔ بلکہ کوئی آپ کو حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے کا کہنے والا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات اہل شوری میں سے تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتقال خلافت عثمانی میں ہو گیا تھا؛ اب حضرت عثمان کا وفات کے بعد چار حضرات

رہ گئے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس سارے فتنہ سے الگ تھلگ رہے۔ آپ نے مسلمانوں کے مابین قتال میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور ان سب کے بعد تک زندہ رہے۔ عشرہ مبشرہ میں سے سب سے آخر میں وفات آپ کی ہوئی۔ آپ فتنہ سے الگ ہو کر وادی عقیق میں عزت نشین ہو گئے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر لایا گیا اور بقیع میں تدفین عمل میں آئی۔

مقصود یہ ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین قواعد اسلام میں سے کسی قاعدہ پر اختلاف کی وجہ سے ہرگز کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی قواعد اسلام میں ان کے متعلق ان کے مابین سرے سے کوئی اختلاف تھا۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق، نہ ہی تقدیر کے متعلق، نہ ہی اسماء و احکام کے متعلق، نہ ہی امامت کے مسئلہ میں۔ ان مسائل میں تو کسی کا زبان اختلاف بھی نہیں ہوا چہ جائے کہ ایک دوسرے پر تلواریں سونت لی جائیں۔ بلکہ یہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو ثابت مانتے تھے جن کے متعلق اس نے خود خبر دی ہے، اور اس کے ساتھ مخلوق کے ساتھ ان صفات کی مماثلت کی نفی کرتے تھے۔ تقدیر کو ویسے ہی مانتے تھے جیسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خبر دی ہے۔ اور کسی ایک نے امامت کے مسئلہ پر بھی کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے ان کے مابین امامت کے مسئلہ پر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اور آپ کے عہد ولایت میں بھی کسی ایک نے آپ سے اس بات پر جنگ نہیں کی آپ اس کی اجازت کریں [یا پھر وہ خلافت کا حق دار یا دعویدار ہے]۔ اور اس [حسد کی] بنیاد پر بھی آپ سے کوئی جنگ نہیں کہ آپ میں کوئی ایسا خاص وصف پایا جاتا ہے جو آپ سے پہلے خلفاء میں نہیں تھا۔ بلکہ جن لوگوں نے آپ سے جنگ لڑی وہ آپ سے پہلے کے خلفاء کی امامت و خلافت کو تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ بات ان کے مابین مشہور تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں۔ اور آپ سے بھی تو اتر کے ساتھ منقول ہے کہ آپ برسر منبر اس بات کا اعلان فرمایا کرتے تھے۔ قرن اول کے شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر ہرگز کوئی فضیلت نہیں دیتے تھے؛ کچا کہ وہ ان کی خلافت پر جرح و تنقید کرتے۔

بہر حال جو بھی ہو؛ اہل سنت اور اہل بدعت کا ہر خاص و عام انسان جانتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آپ کے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ اس وجہ سے ہوئی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ اہل شام نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی بیعت کیوں کی۔ اور جو لڑائی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین ہوئی، ان میں سے ہر فریق یہ گمان کر رہا تھا کہ وہ فریق مخالف کے حملہ سے اپنا دفاع کر رہا ہے۔ اس لڑائی نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی غرض تھی اور نہ ہی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی کوئی غرض۔

بلکہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہاں آنے سے پہلے قاتلین عثمان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور ان قاتلین کے بڑے بڑے قبیلے تھے جو ان کا دفاع کر رہے تھے۔ اس وجہ سے وہ کسی کے کنٹرول میں نہیں آ رہے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے، اور انہوں نے بھی اپنا مقصد بیان کیا؛ اور آپ نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا کہ میری بھی یہی رائے ہے؛ لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں ہے یہاں تک کہ حالات سنبھل جائیں۔ جب بعض قاتلین کو اس بات کا علم ہوا انہوں نے ایک

لشکر پر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ دوسرے فریق نے جنگ شروع کر دی ہے۔ پس یہ جنگ اہل فتنہ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے پیش آئی، اس میں ساتھین اولین کا کوئی دخل نہیں تھا۔

یہ اسلام میں ولایت کے بڑے واقعات ہیں۔ جو اس پر قائم رہے، یا جنہوں نے حکام کے خلاف خروج کیا؛ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس عقیدہ امامت کی بنیاد پر کوئی جنگ نہیں لڑی جس میں شیعہ سنی اختلاف ہے۔ یہی عقیدہ اس وقت ظاہر ہوا جب کچھ لوگوں نے رافضیت کی دعوت پھیلانا شروع کی۔ اور خود کو بلا وجہ امیر المؤمنین کہلانے لگے؛ اور پھر اس عقیدہ پر انہوں نے جنگیں لڑیں۔ ان لوگوں نے اپنی شاہی قائم کی؛ اور یارو مدگار مہیا کیے۔ یہ معاملہ بنی عبد اللہ القداح کے دور میں پیش آیا۔ جنہوں نے ایک مدت تک مغرب کے کچھ علاقے پر حکومت کی اور مصر پر تقریباً دو سو سال تک حکمران رہے۔

ان لوگوں کے ملحد ہونے اور ان کا نسب باطل ہونے پر تمام اہل علم و دین کا اتفاق ہے۔ نہ ہی ان کا نسب رسول اللہ ﷺ سے ملتا تھا اور نہ ہی یہ لوگ آپ کے دین پر تھے۔ ان لوگوں نے نسب کا جھوٹا دعویٰ کیا؛ اور اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرنے لگے۔ تاکہ اس طرح وہ شیعہ لوگوں کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کر سکیں۔ اس لیے کہ تمام گروہوں میں سب سے کم عقل اور بے دین؛ سب سے بڑے جاہل شیعہ ہوتے ہیں۔ وگرنہ یہ عبیدہ جو کہ اپنے آپ کو اسماعیل بن جعفر کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ ان کا معاملہ اتنا کھلا ہوا اور واضح ہے کہ کسی بھی مسلمان پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان۔ جو کہ اہل ایمان ہیں۔ بشمول اہل سنہ و اہل شیعہ ان لوگوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ زید یہ اور امامیہ انہیں کافر قرار دیتے ہیں؛ اور ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ بیشک اسماعیلیہ ملاحدہ خود کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اسماعیلیہ خود یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر ہیں۔ جیسا کہ ابن الصباح کافر؛ جس نے ان لوگوں کے لیے چھری نکالی تھی۔

ابو سعید الجنبانی کے پیروکاران بحرین کے قرامطی شیعہ ان سے بھی برے ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو بالکل اسلام کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں نے [بیت اللہ میں] حجاج کرام کو قتل کیا؛ اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔

یہ ان جنگوں کے واقعات ہیں جو اہل اسلام کے مابین پیش آئے۔ ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو کہ امامت کے قاعدہ پر اختلاف کی وجہ سے پیش آیا ہو؛ جیسا کہ رافضی شیعہ کا دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شہروں میں خروج کرنے والے خوارج نے اپنی ذات کے لیے امامت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور ان کے ساتھ لڑنے والے لوگ بھی تھے۔ سو یہ بھی اہل ابوداؤد پہاڑی اور چھوٹے شہروں میں بسنے والے روافض کی جنس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی جماعت تھی؛ جن کی عام جماعت مسلمین کے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کے پاس اتنی قوت و طاقت نہیں تھی کہ مسلمانوں پر اپنی تلوار آویزاں کر سکیں۔ تاکہ کسی کہنے والے کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ امت میں واقع ہونے والا سب سے بڑا اختلاف مسئلہ امامت کی وجہ سے تھا۔ یا پھر کوئی یہ کہہ سکے کہ: اسلام میں ایسے تلوار کسی چیز پر نہیں سونتی گئی جیسے ہر زمانہ میں امامت پر تلوار سونتی گئی۔

✽ اگر یہ بات کہنے والے کی مراد یہ ہے کہ: ”لوگوں کے مابین مسئلہ امامت کی وجہ سے لڑائیاں پیش آتی رہیں؛ جو کہ اس زمانے میں ایک شخص کی ولایت سے عبارت تھی۔ سو لوگوں کا ایک گروہ امام کے ساتھ مل کر لڑتا تھا اور دوسرا گروہ امام کے خلاف بغاوت کرتا تھا۔“ تو پھر آگاہ رہنا چاہیے کہ اہل سنت اور شیعہ دونوں کے مذہب میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں۔ یہ بات سمجھی جانتے ہیں کہ جب ایک نبی اور ایک دین پر ایمان رکھنے والے لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک گروہ کے پاس ایک ایسا آدمی ضرور ہونا چاہیے جسے وہ آگے بڑھائیں اور اپنا متولی بنائیں۔ تو پھر ان میں سے ہر گروہ اپنے متعین کردہ امیر یا بڑے کی سرکردگی میں لڑ سکتی ہے۔

✽ لیکن ان لوگوں کی لڑائی کسی دینی قاعدہ کی وجہ سے نہیں تھی۔ نہ ہی کسی کا یہ دعویٰ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے؛ اور نہ ہی کوئی خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کو باطل کہتا تھا۔ بلکہ ان کے اکثر لوگ خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کے معترف تھے۔

✽ پھر یہ بھی واضح ہو چکا کہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں صحابہ کرام کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوئی؛ تو پتہ چلا کہ ان حضرات کے عہد خلافت میں کسی پر کوئی تلوار مسلط نہیں تھی۔ یہ تلوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلط ہوئی۔ اگر تلوار کا ایسے چلنا موجب قدح ہے تو پھر یہ قدح اس شخصیت پر ہوگی جس کے دور میں تلوار چلی ہوگی۔

✽ خوارج کی یہ حجت تھی۔ ان کی حجت شیعہ کی حجت کی نسبت قوی تر ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی تلواریں شیعہ کی تلواروں سے قوی تر ہیں۔ اور ان کی نسبت خوارج کا دین بھی صحیح ہے۔ اور وہ ہیں سچے لوگ؛ شیعہ کی طرح جموئے اور کذاب نہیں۔ مگر اس کے باوجود نبی کریم ﷺ سے منقول مشہور سنت کی روشنی میں اور باجماع صحابہ یہ لوگ گمراہ بدعتی اور خطا کار ہیں۔ تو پھر رافضیوں کا کیا حال ہوگا جو کہ علم و عقل؛ دین و صداقت؛ شجاعت و ورع اور دیگر خیر و بھلائی کی خصلتوں سے بہت دور کے لوگ ہیں۔

✽ کسی بھی گروہ سے ایسے جنگیں نہیں لڑی گئیں جیسے خوارج کے ساتھ لڑی گئی۔ مگر اس کے باوجود ان لوگوں نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے مسئلہ پر کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ بلکہ یہ لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی ولایت و امامت پر متفق تھے۔

[وراثتِ فدک میں اختلاف]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”پانچواں اختلاف فدک اور توراث کے مسئلہ میں ہے۔ اہل سنت رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”نحن معاشر الانبياء لا نورث؛ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ۔“ ”ہم انبیاء کی جماعت وراثت نہیں چھوڑتے۔ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”یہ ایک شرعی مسئلہ میں اختلاف تھا جواب زائل ہو چکا ہے۔ اس میں جو اختلاف تھا وہ اس اختلاف سے کم ہے جو اس مسئلہ میں پایا جاتا ہے کہ میت کے بھائیوں کو دادا اور چچا کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ علاوہ ازیں مسئلہ اقاربہ اور اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ وادی کو اس کے بیٹے کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ اسی طرح وہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ ماں کی موجودگی میں دو بھائیوں کو حصہ نہیں ملے گا۔ نیز یہ کہ اگر میت کا دادا اور ماں دونوں زندہ ہوں

تو داد اس وقت باپ کا حکم رکھتا ہے اور اس قسم کے دیگر مسائل۔

✽ ظاہر ہے کہ ان مسائل میں مسئلہ فدک کی نسبت عظیم تر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: ان کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے اور کسی ایک قول پر ایسے اتفاق نہیں ہو سکا جیسا کہ اس مسئلہ پر اتفاق ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی وراثت نہیں [بلکہ ان کا متروکہ مال صدقہ ہوتا ہے]۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ باقی مسائل میں ایسی صریح نصوص روایت نہیں کی گئیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی وراثت کے مسئلہ میں روایت کی گئی ہیں۔

تیسری وجہ: یہ اختلاف مکرر نہیں، بلکہ ایک ہی معاملہ پر مبنی ہے۔ جب کہ دیگر مسائل میں اختلاف بھی متعدد جنس کا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اختلاف بھی معمولی سے مال میں تھا؛ کہ کیا یہ چند متعین لوگوں کے ساتھ خاص ہے؟ حالانکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے فدک کی جاگیر سے کئی گنا زائد مال بیت المال سے اہل بیت کو عطا کیا تھا۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم ﷺ کا ترک کردہ مال وراثت تھا؛ حالانکہ یہ نظریہ ہی باطل ہے؛ تو پھر بھی آپ نے اہل بیت سے ایک چھوٹا سا گاؤں لیا تھا؛ کوئی بڑا گاؤں یا بڑا شہر نہیں تھا۔ [جس سے کئی گنا زائد اہل بیت کو دے بھی دیا تھا۔]

✽ بیشک علماء کرام کے مابین فرائض کے اور دیگر مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ہاشمیوں اور دیگر لوگوں کے اموال میں اختلاف فدک کے مسئلہ سے کئی گنا زیادہ تھا۔ مگر ان میں اختلاف کرنے والوں کو ظالم نہیں کہا جاتا۔ اس لیے کہ اس میں اجتہاد سے فیصلہ کیا گیا۔

✽ فرض کر لیجیے: خلفاء نے اجتہاد کیا؛ اور میراث غیر مستحق کو دیدی۔ اجتہاد کرنے والے علماء کرام سے اس سے بھی بڑے بڑے واقعات صادر ہو جاتے ہیں۔ اور ان علماء کا مقام بھی ان ائمہ کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک کی دین داری پر کوئی تنقید اور قدح نہیں کی جاتی۔ بالفرض اگر یہ مان لیں کہ انہوں نے باطن میں غلطی کی ہے؛ اس لیے کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے؛ تو پھر خلفاء راشدین کے متعلق کیسے کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔

✽ اصل قصہ یہ ہے کہ جنہاں اور شرارت پسند لوگ بات کا بھنگڑ بنا کر فدک کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جھوٹ اور بہتان کے شر کا دروازہ کھول سکیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حضرات کے بعد خلیفہ بنے۔ آپ کے عہد خلافت میں فدک اور دیگر جملہ اموال آپ ہی کے زیر تصرف تھے، مگر آپ نے اولاد فاطمہ کو واپس نہیں کیے تھے؛ اور نہ نبی کریم ﷺ کا ترکہ وراثہ میں تقسیم کیا۔ نہ ہی ازدواج مطہرات سے کچھ لیا دیا اور نہ ہی اولاد عباس سے۔ بقول شیعہ اگر مان لیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ظلم کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جب صاحب استطاعت و قدرت تھے؛ تو اس کا ازالہ کیوں نہ کیا؟ حالانکہ اس ظلم کا ازالہ کرنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر سے لڑنے کی نسبت بہت آسان تھا۔ کیا آپ یہ سوچ سکتے

ہیں کہ آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ تو لڑیں، جس کے نتیجہ میں اتنا بڑا شروفساد پیدا ہوا، مگر ان مستحقین کو معمولی ساقی بھی نہ دیتے حالانکہ ایسا کرنا آپ کے لیے بہت آسان بھی تھا۔

[مکرمین زکوٰۃ سے جنگ اور شیعہ کا اعتراض]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”چھٹا اختلاف مکرمین زکوٰۃ کے متعلق ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اجتہاد سے کام لے کر لونڈی، غلام اور مال ان کو واپس کیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے جو مسلمانوں کے احوال کا علم رکھنے والے کسی بھی انسان پر مخفی نہیں۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں مکرمین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں متفق تھے۔ اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس مسئلہ پر بحث و تکرار کی تھی۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گزارش کی: اے خلیفہ رسول! آپ لوگوں سے کیسے جنگ کریں گے حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

”مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ جب یہ بات کہہ دی تو ان کا خون و مال محفوظ ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے کسی حق کی وجہ سے ان کا خون و مال مباح ٹھہرے اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”کیا یہ نہیں کہا: مگر اسلام کے حق کے ساتھ؛ اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔“ بلا شک و شبہ ”زکوٰۃ بھی حقوق اسلامی میں سے ایک ہے۔ اور اللہ کی قسم! اگر مجھ سے ایک جانور بھی روکیں گے جو کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دیا کرتے تھے؛ تو میں اس کے روکنے پر بھی ان سے جنگ کروں گا۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سمجھ گیا کہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ قتال کے کھول دیا ہے؛ اور میں جان گیا کہ یہ حق ہے۔“^①

اور صحیحین کی ایک روایت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فہم کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللَّهِ، وَيَقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا)).

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی

① صحیح بخاری، کتاب الزکاة۔ باب وجوب الزکاة، (ح: ۱۳۹۹، ۱۴۰۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتى يقولوا لا اله الا الله (حدیث: ۲۰)، سنن نسائی (۳۹۷۶)۔

معبود برحق نہیں اور بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ۔“ [بخاری ۱۰/۱، مسلم ۵۳/۱]

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مرتدین سے جنگ کے مسئلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی؛ انہوں نے با اتفاق صحابہ رضی اللہ عنہم منکرین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ روک لینے کے بعد پھر سے اس کا اقرار کر لیا تھا۔ آپ نے کسی کو قیدی بنایا نہ کسی کو محبوس رکھا۔ بلکہ مدینہ میں خلافت صدیقی میں سرے سے کوئی قید خانہ ہی نہ تھا؛ اور نہ ہی عہد رسول اللہ ﷺ میں کوئی قید خانہ تھا۔ تو پھر قید خانہ میں موت کی خبر کیسے درست ہو سکتی۔ لہذا یہ جھوٹ ہے کہ بہت سے لوگ قید خانہ میں مر گئے۔

اسلام میں سب سے پہلا قید خانہ مکہ مکرمہ میں بنایا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفوان بن امیہ سے اس کا گھر خرید کر اسے قید خانہ بنایا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ افراد ان کے اہل خانہ کو واپس کر دیئے تھے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو پھر بھی یہ اس چیز کی دلیل نہیں ہے کہ ان حضرات کے مابین کوئی اختلاف تھا۔ یہ بہت ہی ممکن ہے کہ جب انہیں قیدی بنایا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس نظریہ کے موافق ہوں؛ مگر بعد آپ نے یہ قیدی واپس کر دیئے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا کہ بنی ہوازن کے قیدی انہیں واپس کر دیئے تھے۔ حالانکہ یہ قیدی مسلمانوں کے مابین تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ جن لوگوں نے اپنی خوشی سے قیدی واپس کر دے تو یہ بہت اچھا ہوا؛ ورنہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ان کا معاوضہ دیکر قیدی واپس دلوائے۔ اس لیے کہ ان کے اہل خانہ مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے؛ اور اپنے قیدی واپس کرنے کے لیے عرض گزاری کی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ مرتدین کو نہ ہی گھوڑے سوار ہونے دیا جائے اور نہ ہی اسلحہ اٹھا کر چلنے کی اجازت ہو۔ بلکہ انہیں ایسے چھوڑ دیا جائے کہ مال مولیشی کے پیچھے لگے رہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خلیفہ رسول اور اہل ایمان کو دکھا دے کہ یہ لوگ اچھے مسلمان ہو گئے ہیں۔ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے ان لوگوں کا اچھا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا تو آپ نے ان کے قیدی واپس کر دیئے؛ اور ایسا کرنا جائز تھا۔

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تعین بطور خلیفہ:]

[اعتراض:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ساتواں اختلاف: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور خلیفہ متعین کرنا ہے۔ ”لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے تھے کہ تو نے ایک سنگ دل آدمی (حضرت عمر) کو ہمارا حاکم بنا دیا۔“

[جواب:] ایسی بات کو کس نے اختلاف کہہ دیا؟ ایسی باتیں تو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایسی باتوں کو اختلاف پر محمول کرنا متکلم کے جاہل اور بدعتی ہونے کی دلیل ہے۔ صرف طعن کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بعض صحابہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے پر معترض ہوئے تھے، مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے پیچھے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے پر اعتراض کیا تھا۔ ایسے بہت سارے صحابہ ان امراء پر اعتراض کیا کرتے تھے جنہیں حضرت ابوبکر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعینات کیا کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

امارت پر اعتراض حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے اس موقف سے رجوع کر لیا تھا؛ اور وہ سب لوگوں سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعظیم بجالایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت زید اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کی امارت پر اعتراض کرنے والوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں اپنے موقف سے رجوع کر لیا تھا۔

[شورائے عمر رضی اللہ عنہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”آٹھواں اختلاف: شوری کا معاملہ ہے۔ اختلاف کے بعد صحابہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے، جو شیعہ کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ مؤرخین و محدثین کا اس واقعہ کے

جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ اس لیے کہ خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ ہوا تھا کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین روز تک لوگوں سے مشورہ کرتے رہے تھے۔ مشورہ کے بعد آپ نے بتایا کہ لوگوں کی نگاہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ آپ نے گھروں کے پردہ نشین دو شیرازوں تک سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا۔ اگر کوئی شخص آپ کی بیعت میں اختلاف کرتا؛ یا اس کے دل میں کوئی ناپسندیدہ بات ہوتی تو تاریخ اسے ضرور نقل کرتی۔ لیکن کسی بھی ایسی چیز کا نقل نہ کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی نے کچھ بھی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ ایسے کاموں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جس چیز میں مشاورت سے کوئی بات طے کی جائے وہاں پر لوگ باتیں کرتے ہیں اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ لیکن کسی ایسی بات کے متعلق بغیر کسی دلیل کے دو ٹوک طور پر کہنا ممکن نہیں۔

ہمیں صحیح روایات کی روشنی میں یہ بات معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولایت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی گروہ نے یہ بات کہی کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کو ولایت تفویض کی جائے۔ اگر کسی نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو اس کا قول ہم تک پہنچ کر رہتا جیسے انصار کا یہ قول ہم تک پہنچ گیا کہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے۔“

✽ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لوگ اتنے باہمت بھی تھے، اور ایسے اسباب بھی موجود تھے کہ اعتراض آگے نقل کیا جاتا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے بارے میں بعض انصار کا اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ تو اس سے پتہ چلا کہ اس قسم کے اعتراض کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا اور بہتان تراش ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”کسی خلیفہ کی بیعت پر اس قدر اتفاق نہیں ہوا جیسا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہوا تھا۔“

✽ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں نے تین دن کی مشاورت کے بعد ولایت تفویض کی تھی۔ اس پر ان تمام کا اتفاق و اتحاد تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت و الفت رکھنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی اجتماعیت کے ساتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غلبہ عطا کیا تھا۔ اور ان لوگوں کے ذریعہ اپنے اس دین کو غالب کیا جو دین دے کر محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کفار کے خلاف ان کی مدد کی؛ اور ان کے ہاتھوں پر بلا و شام؛ عراق اور خراسان کے

کچھ علاقے فتح ہوئے۔

یہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا تھا۔ اسی لیے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت کر لی۔

بعض حضرات نے جو ذکر کیا ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ شرط لگائی کہ آپ شیخین کی سیرت پر عمل پیرا رہیں گے تو آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔“ ایسا یا تو عاجزی و کمزوری کی وجہ سے تھا کہ ان جیسے حضرات کی سیرت پر عمل کیسے ممکن ہے، یا پھر اس لیے کہ آپ یہ خیال کرتے تھے کہ: تقلید واجب یا جائز نہیں۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ شرط لگائی تو آپ نے اس بات کو قبول کر لیا۔ اس کی یا تو اس بات کا امکان تھا کہ آپ ان حضرات کی سیرت پر عمل کر سکتے تھے: یا پھر آپ تقلید کو جائز سمجھتے تھے۔“ یہ ایک باطل نقل ہے؛ اس کی کوئی ثابت شدہ اصل نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ خود ساختہ روایت اس صحیح اور ثابت شدہ روایت کے خلاف ہے، جس میں ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین دن اور تین رات تک بغیر آرام کئے لوگوں سے مشورہ کرنے میں مشغول رہے۔ آپ تمام مسلمانوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ اور یہ بات کھل کر آپ کے سامنے آرہی تھی کہ لوگ کسی کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں سمجھتے۔ بلکہ لوگ دوسروں سے بڑھ کر آپ کو خلافت و ولایت کا حق دار سمجھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے ان حضرات پر سوائے عدل کے کوئی شرط نہیں لگائی۔ آپ نے ان دونوں حضرات سے کہا تھا:

”تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! اگر میں نے ولایت تمہیں سوئپ دی تو تم عدل و انصاف کرو گے۔ اور اگر تم پر امیر مقرر

کر دیا تو تم اس کی بات سنو گے اور اطاعت کرو گے۔“ تو ہر ایک نے یہی جواب دیا: ”ہاں ہم ضرور ایسا کریں گے۔“

پس متولی پر عدل کی شرط لگانا اور متولی علیہ پر سماع و اطاعت کی شرط لگانا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام میں سے ہے جس پر کتاب و سنت دلالت کرتے ہیں۔

[صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن میں اختلافات]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”صحابہ میں لاتعداد اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم بن امیہ کو واپس مدینہ بلا لیا۔ حالانکہ اسے رسول اللہ ﷺ نے بھگادیا تھا۔ اور اسے طرید رسول کہا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ان کی خلافت کے ایام اس کے لیے سفارش کی تھی؛ مگر انہوں نے یہ بات نہیں مانی۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس کی جگہ سے چالیس فرسخ تک یمن کے اندر بھگادیا تھا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: اگر ایسی معمولی باتوں کا نام اختلاف ہے تو خلیفہ جو حکم بھی صادر کرے گا اور دوسرا کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا نام اختلاف رکھا جائے گا؛ اس طرح اختلاف ایک غیر محدود چیز ٹھہرے گا۔ جس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ اس سے پہلے آپ کی جانب سے وہ مسائل ذکر کئے گئے ہیں جن میں اختلاف واقع ہوا تھا جیسا کہ: وراثت اور طلاق کے مسائل اور دیگر امور؛ جو کہ صحیح بھی ہیں اور فائدہ مند بھی۔ بلاشبہ ان امور میں اختلاف صحیح روایات سے ثابت ہے جسے اہل علم نے نقل کیا ہے۔ اور ایسے مسائل میں بحث و مناظرہ کرنے سے لوگوں کو فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک امر کلی

میں اختلاف ہے جو اس لائق ہے کہ اس میں مناظرہ کیا جائے۔

✽ جب کہ یہ امور ایسے ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ ان کے جزئی امور ہونے پر ختم ہوتی ہے۔ انہیں اختلافی امور قرار نہیں دیا جاسکتا جن میں لوگ مناظرے کرتے پھریں۔

✽ اس کے باوجود مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں بہت زیادہ جھوٹ ہے۔ ان ہی میں سے ایک معاملہ حکم بن امیہ کا بھی ہے۔ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھگا دیا تھا۔ اور لوگ اسے راندہ رسول کہا کرتے تھے۔ اور آپ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ان کی خلافت کے ایام اس کے لیے سفارش کی تھی؛ مگر انہوں نے یہ بات نہیں مانی۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس کی جگہ سے چالیس فرسخ تک یمن کے اندر بھگا دیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں: یہ واقعہ کس نے نقل کیا ہے؟ اس کی سند کہاں ہے؟ اور حکم کب یمن گیا؟ اور آپ کے دعویٰ کے مطابق جب نبی کریم ﷺ نے اسے طائف میں چھوڑ دیا تھا تو پھر کس سبب کی بنیاد پر اسے یمن کی طرف بھگایا گیا؟ حالانکہ طائف مکہ اور مدینہ سے زیادہ قریب تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے مکہ و مدینہ کے قریب برقرار رکھا تھا تو پھر کیونکر اسے یمن بھگایا گیا؟

✽ بہت سارے اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ حکم کی جلاوطنی کا قصہ باطل ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے طائف کی طرف جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود طائف چلا گیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ: اسے نکالا گیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس واقعہ کی کوئی صحیح سند اور کیفیت ذکر نہیں کی۔

[حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی مروان بن حکم کے نکاح میں دے دی تھی۔ آپ نے مروان کو افریقہ کے مال غنیمت کا خمس (۱/۵) دیا جس کی مالیت دو لاکھ دینار تھی۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ابوذر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے متعلق جواب پہلے گزر چکا۔ جب کہ مروان بن حکم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی شادی کے واقعہ کا اختلاف ہے کیا تعلق؟ نیز اس کی دلیل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے افریقہ کے مال غنیمت سے (۱/۵) پانچواں حصہ مال دیا تھا؟ اور یہ واقعہ کس نے نقل کیا ہے؟ اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ آپ نے مروان کو دس لاکھ دینار دیئے تھے۔ جب کہ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ افریقہ کے مال غنیمت کا خمس اس مقدار کو نہیں پہنچتا تھا۔

[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا واقعہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”سرور کائنات ﷺ نے ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو پناہ دی تھی۔ اور پھر اسے مصر کا والی مقرر کر دیا۔“

[جواب:] ہم کہتے ہیں: اگر رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ اس وقت تک مباح الدم ہی تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کا والی مقرر کر دیا؛ جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہری طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ تو ایسی بات وہی انسان کہہ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور احوال سے بہت بڑا جاہل ہو۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کی ایک جماعت کیساتھ اسے مباح الدم قرار دیا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسے لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کچھ مراجعت و اصرار کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسے بیعت کر دیا۔ اور اس کا خون محفوظ ہو گیا۔ اور اس کا شمار معصوم الدم مسلمانوں میں ہونے لگا: اس کے بھی وہی حقوق تھے جو باقی مسلمانوں کے تھے اور اس پر بھی وہی واجبات تھے جو باقی لوگوں پر تھے۔

شروع میں یہ سب سے لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا تھا۔ پھر اس نے اسلام قبول کیا تو اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ اور اس کا خون بھی اسی طرح مباح قرار دیا گیا تھا جیسے دوسرے کچھ لوگوں کا خون ان کے سخت کفر یا سخت ارتداد کی وجہ سے مباح قرار دیا تھا؛ جیسا کہ مقیس بن صباہ کا خون۔

❁ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابن ابی سرح ہجرت و اسلام سے مشرف ہو کر مدینہ میں کتابت وحی پر مامور تھا۔ پھر مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا اور آپ ﷺ کے خلاف افتراء پروازی کرنے لگا۔ جب مکہ فتح ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے بارگاہ نبوی میں پیش کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! عبد اللہ کو بیعت فرمائیے۔ مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ اور دودفعہ یا تین دفعہ اعراض فرمایا؛ پھر بیعت کر لیا اور فرمایا: ”تم میں کوئی دانش مند آدمی نہیں تھا جو مجھے دیکھتا اور جب میں نے اعراض کیا تھا اس وقت اس کا کام تمام کر دیتا۔“ ایک انصاری نے عرض کیا: ”آپ نے مجھے اشارہ کر دیا ہوتا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

”نبی کے لیے موزوں نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کا رہو۔“ ❁

اس کے بعد عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ خلوص دل سے اسلام لایا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ اور اس سے کوئی برا کام منقول نہیں۔ یہ اپنی رعیت میں بھی قابل تعریف انسان تھا۔ غزوات میں بڑا مجاہد اور جانباز سپاہی تھا۔ جب کہ مکہ کے بعض دوسرے طلقات اس سے بھی بڑے دشمن تھے۔ مثلاً صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سمیل بن عمرو، اور ابوسفیان بن حرب وغیرہ اور دوسرے لوگ۔ مگر یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً وَاللَّهُ قَدِيرٌ﴾ (الممتحنة: ۷)

❁ سنن نسائی، کتاب تخریم الدم۔ باب الحكم فی المرتد، (حدیث: ۴۰۷۲)، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد۔ باب قتل الاسیر (حدیث: ۲۶۸۲)۔

”عین ممکن ہے کہ جن کے ساتھ تمہاری عداوت ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اور تمہارے درمیان دوستی پیدا کر دے وہ اس بات پر بخوبی قدرت رکھتا ہے۔“

پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اور نبی کریم ﷺ کے مابین وہ محبت پیدا کر دی جس نے اس دشمنی کو ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے احوال بدلنے پر قادر ہے۔ اور وہ بہت ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کی سابقہ برائیوں کو ان کی نئی نیکیوں کی وجہ سے معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور ان کے گناہ معاف کرنے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر کام کو جانتا ہے۔

[حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت]:

شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”آپ کے لشکر میں معاویہ بن ابوسفیان بلا شام کا گورنر تھا۔ کوفہ کا گورنر سعید بن العاص تھا۔ اس کے بعد عبداللہ بن عامر کو متعین کیا گیا۔ اور ولید بن عقبہ بصرہ کا گورنر تھا۔“

جواب: جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی یزید بن ابی سفیان کا انتقال شام میں ہو گیا تو اس کی جگہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کو شام کا والی بنا دیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کو اس ولایت پر باقی رکھا بلکہ شام کا سارا علاقہ آپ کے زیر نگیں کر دیا۔ اہل شام میں آپ کی سیرت بہترین سیرت کے طور پر مشہور و معروف تھی۔ اور آپ کی رعیت آپ سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو۔“

یہی عالم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا تھا۔ رعیت ان سے محبت کرتی تھی اور ان کے لیے دعا گورہتی تھی۔ اور آپ رعیت سے محبت کرتے اور ان کے لیے دعا گورہتے تھے۔

جہاں تک حضرت سعید بن العاص کی ولایت کا تعلق ہے؛ تو اہل کوفہ ہمیشہ اپنے اعمال کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ اس سے پہلے ان پر سعد بن ابی وقاص؛ ابوموسیٰ اشعری؛ عمار بن یاسر؛ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کو والی مقرر کیا گیا تھا؛ مگر یہ لوگ پھر بھی شکایت ہی کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ ان جلیل القدر صحابہ کرام کے اخلاق و عادات اور مشہور و معروف تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کی شکایتیں بڑھ گئی تھیں۔ اور یہ بھی سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو ولایت کے مناصب تفویض کیے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو بھی باتیں کرنے کا موقع مل گیا اور بعض دوسری برائیاں بھی سامنے آئیں۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اختلاف]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”نواں اختلاف: وہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق اور آپ کی بیعت کرنے کے بعد پیدا ہوا۔ پہلے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ کی طرف خروج کیا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لیکر بصرہ گئے؛ اور وہاں پر جنگ لڑی۔ یہ جنگ جمل کے نام سے معروف ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین اختلاف رونما ہوا۔ جس کا نتیجہ

جنگ صفین کی صورت میں برآمد ہوا۔ پھر ابو موسیٰ کے خلاف عمرو بن عاص کی وعدہ خلائی قابل ذکر ہے۔ پھر مارقہ کا ظہور ہوا۔ جو کہ دین اسلام سے نکلے ہوئے تھے؛ اور ان کے خلاف نہروان کا واقعہ پیش آیا۔

✽ خلاصہ کلام! حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق تھے؛ اور حق آپ کے ساتھ تھا۔ اور ایسے ہی خوارج نے آپ کے خلاف خروج کیا۔ مثلاً اشعث بن قیس و مسعر بن فدک و زید بن حصن الطائی وغیرہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عبد اللہ بن سبا^۱ جیسے غالی پیدا ہوئے اور ان دونوں فرقوں سے بدعت و ضلالت نے پُر پُزے نکالے۔ ان پر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث صادق آتی ہے: ”محب غال و مبغض قال۔“ ”محبت کی وجہ سے غلو کرنے والا اور بغض کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا۔“

✽ پس چاہیے کہ اس انسان کے کلام کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کیا یہ شخص اپنے مشائخ کے موجب فتنہ سے نکل سکا ہے یا پھر ان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔“ [ابن کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شہرستانی کی اس کتاب میں موجود اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف میلان رکھتا تھا۔ مگر نہ اس نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر کیا ہے؛ مگر کہیں پر یہ نہیں کہا کہ ان کے مخالفین کے برعکس حق ان کے ساتھ تھا۔ [حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے تینوں خلفاء بھی حق و صداقت کے حامل تھے]۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو کہہ دیا کہ: ”خلاصہ کلام کہ حق علی کے ساتھ تھا اور علی حق کے ساتھ تھے۔“

✽ وہ ناقل جسے کسی سے کوئی غرض نہ ہو اسے چاہیے کہ یا تو جملہ امور کو امانت کے ساتھ نقل کرے یا پھر ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرے۔ مدعی کا صرف یہ دعویٰ کر لینا کہ: ”حق علی کے ساتھ تھا اور علی حق کے ساتھ تھے“ اور ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حق کو خاص کرنا ایسی بات ہے کہ شیعہ کے علاوہ کوئی بھی مسلمان یہ نہیں کہتا۔

✽ شیعہ مصنف کے دعویٰ کا فساد اور بودا پن اس کے اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اتفاق اور ان کی بیعت منعقد ہونے کے بعد اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔“

✽ حالانکہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ: مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ بہت سارے اہل مکہ و مدینہ جنہوں نے آپ کو دیکھا ہوا بھی تھا؛ انہوں نے بھی آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ دور کے لوگوں کو تو چھوڑے جیسے کہ: اہل شام نے بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ بہت سے اہل مصر اور اہل مغرب؛ اہل عراق و وخراسان نے بھی اس میں بیعت شرکت نہیں کی تھی۔ پھر یہ بات اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں نہیں کہی جاسکتی؛ جن کی بیعت پر دو مسلمانوں نے بھی اختلاف نہیں کیا؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں کیسے کہی جاسکتی ہے؟

حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کی معذرت اور رجوع کا ذکر کیے بغیر ان پر زبان طعن دراز کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طلحہ و زبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا نہیں

① اس شخص نے یہ عقیدہ اختراع کیا تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے وصی ہیں، جس طرح یوشع علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے اس کے بعد دوسرا مختار شیطان الطاق محمد بن جعفر رافضی تھا جس نے یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ امامت کے منصب پر چند مخصوص اشخاص فائز ہوں گے۔

چاہتا تھا بلکہ یہ لڑائی اچانک پیا ہو گئی تھی۔ ایسے ہی اہل شام کے ساتھ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ اور نہ ہی وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنا چاہتے تھے؛ مگر ان کے ارادہ و اختیار کے بغیر یہ فتنہ پیدا ہو گیا۔

جنگ جمل فریقین کے ارادہ و اختیار کے بغیر پیا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فریقین صلح پر آمادہ ہو گئے تھے اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے انتقام لیا جائے۔ دوسری جانب قاتلین عثمان نے جیسے پہلی بار فتنہ پیدا کیا تھا؛ ایسے ہی دوبارہ فتنہ پردازی پر اتر آئے؛ اور انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی جماعت پر دھاوا بول دیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقہ نے اسے حملہ سمجھ کر مدافعت کی سعی کی۔ ادھر قاتلوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج نے حملہ کر دیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدافعت کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے فریقین اپنا اپنا دفاع کر رہے تھے۔ ابتداء حملہ کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

بہت سارے اہل علم اور سیرت نگاروں نے ایسے ہی تحریر کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ اس طرح پیش آیا کہ اس پر کسی فریق پر کوئی بات اور ملامت نہیں کی جاسکتی۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک فریق سے یا دونوں فریقوں سے کوئی گناہ یا خطاء واقع ہوئی ہو تو کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بات معلوم ہے کہ یہ سبھی لوگ بہترین اولیاء اللہ اور اہل تقویٰ میں سے؛ اللہ کی کامیاب جماعت اور نیکو کار بندے تھے۔ اور یہ سبھی اہل جنت تھے۔

[شہرستانی پر اعتراض]:

رافضی مصنف نے کہا ہے: ”پس چاہیے کہ اس انسان کے کلام کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کیا یہ شخص اپنے مشائخ کے موجب فتنہ سے نکل سکا ہے یا پھر ان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔“ [یعنی کلام الرافضی]

جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں فتنہ و فساد شیعہ کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اور یہ قوم ہر فتنہ و فساد اور شرکی اصل جزیں۔ بلکہ یہ لوگ فتنہ کی چکی کے پاٹ ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلا فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

”تین چیزیں ایسی ہیں جو ان کے شر سے بچ گیا؛ وہ نجات پا گیا۔ میری موت؛ صابر خلیفہ کا ناحق قتل کیا جانا اور دجال

کا خروج۔“ [المسند ۱۱۵/۴]

جو انسان بھی دنیا بھر کے تمام فرقوں کے احوال کا مطالعہ کرے گا؛ تو اسے پتہ چلے گا کہ: رشد و ہدایت پر اتفاق میں اور فتنہ تفرقہ بازی اور اختلاف سے دور صحابہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی اور گروہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ جماعت دنیا کے تمام لوگوں سے بہتر جماعت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾

”تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے؛ نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے منع کرتے ہو؛ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔“

اور ہدایت یافتہ اور کامیاب و منصور جماعت کی راہ رافضیوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا گروہ دور نہیں۔ اس لیے کہ اہل قبلہ کی جانب گروہوں میں روافض سے بڑھ کر جاہل اور ان سے بڑا ظالم کوئی دوسرا گروہ نہیں۔ اس امت کے بہترین لوگ صحابہ کرام تھے۔ اس امت میں دین حق پر اجتماعیت و اتفاق اور افتراق اور اختلاف سے دور صحابہ کرام سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں تھا۔ صحابہ کرام کے متعلق جو بھی نقص و عیب کی بات نقل کی جاتی ہے اگر اسے امت میں موجود معائب و نقائص کے ساتھ قیاس کیا جائے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہوگی۔

✽ رہا یہ معاملہ کہ لوگ اپنی طرف سے جو کچھ تخلیق کردہ امور بیان کرتے ہیں: ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی ائمہ میں سے اپنی طرف سے معصوم گردانتا ہے۔ اور دوسرا گروہ معصوم جیسی کوئی دوسری چیز تراش لیتا ہے اگرچہ وہ معصوم نہ بھی ہو۔ پس نئے القاب و خطاب گھڑے جاتے ہیں جیسے: العالم، الشیخ، الملک، الامیر وغیرہ اس طرح کے دیگر القابات۔

روافض بھی عجیب لوگ ہیں کچی بات کہتے ہیں نہ کچی بات مانتے ہیں۔ ہر چیخ و پکار پر سر دھنسنے لگتے ہیں۔ صحابہ کبار کے جانی دشمن اور اعداء اسلام تاتاریوں کے گہرے دوست ہیں۔ اہل سنت عوام کو ایذا پہنچانے کے لیے تاتاری کفار کی طرف طلب امداد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ عراق و دیگر بلاد و امصار کو برباد کرنے کا فن کوئی ان سے سیکھے جیسے خلافت عباسیہ کے وزیر ابن العتبی نے کیا تھا۔ اس نے ہلاکو خاں سے مراسلت کر کے اسے عراق آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ بڑے پختہ ارادے کے ساتھ عراق آیا اور ہر طرف تباہی پھیلا دی۔ بغداد میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ علوی و عباسی خواتین کو قیدی بنا لیا۔ مسلمانوں کی اولاد کفر و شرک کی گود میں پرورش پانے لگی۔ بہر کیف شیعہ کا وجود اسلام اور اہل اسلام کے لیے نار آستین سے کم نہیں۔ وہ ملاحدہ اور غالی روافض کی تعظیم بجالاتے ہیں اور اصحاب رسول سے بغض و کینہ رکھتے ہیں۔

گویا روافض صحیح معنی میں اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِشِرْكٍ مُّشْرِكٍ ۚ سَبِّحُوا لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكُنُوا لِلَّهِ غٰلِيًّا ۝۵۱﴾ (النساء: ۵۱)

”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ جنت و طاغوت پر ایمان رکھتے اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان کی نسبت زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔“

شیعہ کا طرز فکر و عمل:

اس بات کا کیا علاج کہ شیعہ جھوٹی روایات سے ہمارے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور منقولات میں سے صرف انہی دلائل کو قبول کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے موافق ہوں، وہ معرفت اسناد سے بے گانہ اور فن حدیث سے نابلد محض ہیں، جب ان میں سے کوئی شخص جھوٹی یا سچی کوئی دلیل پیش کرتا ہے تو وہ اس سے کتاب و سنت کی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کون سی دلیل اس کی معارض ہے۔ جب ان کی تردید میں مخالف احادیث صحیحہ پیش کرتا ہے تو ضد و عناد سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ آیات قرآنیہ کی تحریف کرتے ہیں۔ اگر مخالف بالا دست ہو اور شیعہ اس سے خائف ہوں تو فوراً اس کے پیش کردہ دلائل کی تائید کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اس وقت وہ امامیہ سے اظہار براءت کرنے لگتے

ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے منافقین سے مناظرہ کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟

شیعہ نے تین اصول مقرر کر رکھے ہیں:

۱۔ ائمہ معصوم ہیں۔

۲۔ جو بات ائمہ سے نقل کی جائے وہ اسی طرح ہے جیسے نبی کریم ﷺ سے منقول ہو۔

۳۔ اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔

شیعہ کے ائمہ اہل بیت میں شامل ہیں، اس لیے گویا ان کے ہاں کوئی شرعی دلیل ہے نہ تعلیل۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ و تحقیق اور علم و توفیق سے محروم ہیں۔ شیعہ جن مسائل میں باقی امت سے منفرد ہیں ان میں شیعہ کا اعتماد انہیں اصول سہ گانہ پر ہے جو کتاب و سنت، عقل و فکر اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔



تیسری فصل:

امامت علی رضی اللہ عنہ کے دلائل

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”تیسری فصل میں رسول اللہ ﷺ کے بعد امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی امامت کے دلائل بیان کیے جائیں گے۔ اس بارے میں دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ لیکن ہم ان میں سے اہم ترین دلائل ذکر کریں گے۔ اور ان دلائل کو چار طریقوں پر پیش کریں گے:

پہلا طریقہ: عقلی دلائل: اس کی پانچ اقسام ہیں:

اول: [ہم کہتے ہیں کہ] امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ اگر امام کے لیے عصمت کی شرط تسلیم کر لی جائے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا خود بخود لازم آتا ہے۔

پہلا مقدمہ: [امام کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ] انسان اپنی طبیعت کے لحاظ سے [مدنی] اجتماعی زندگی گزارنے والا ہے، تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ اپنی بقاء میں کھانے پینے، لباس اور جائے سکونت کا محتاج ہے۔ یہ سارے کام وہ اکیلا نہیں کر سکتا؛ بنا بریں قیام نوع کے لیے وہ اعوان و انصار کا محتاج ہے۔ تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے۔ اور اس زندگی کا گزارنا ممکن ہو۔ جب بہت سے انسان ایک جگہ اکٹھے ہوں گے تو ان میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور حسد کی وجہ سے دنگ و فساد کا خطرہ لاحق ہوگا، اس لیے کہ بسا اوقات انسان کو ایسی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جس پر دوسرا شخص قابض ہوتا ہے۔ چنانچہ قوت شہوانیہ اسے وہ چیز جبراً حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کا نتیجہ فتنہ و فساد اور قتل وغیرہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے ایک امام معصوم کے متعین کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ان کو ظلم و فساد اور سرکشی سے روکے۔ اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے منع کرے۔ مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے۔ اور حق دار کو اس کا حق پہنچائے۔ اس امام سے سہو و خطاء اور گناہ کا صادر ہونا ممکن نہ ہو، ورنہ ایک اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے کہ امام کو اس ضرورت کے پیش نظر نصب کیا گیا تھا کہ امت سے خطاء کا صدور ممکن ہے۔ اگر امام سے بھی خطاء سرزد ہو سکتی ہو تو کسی اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اگر وہ امام خطاء سے معصوم ہوا تو پھر اس کی امامت درست ہے ورنہ ایک اور امام نصب کرنا پڑے گا، اور اس طرح تسلسل لازم لائے گا۔

دوسرا مقدمہ: صاف ظاہر ہے کہ ابو بکر و عمر و عثمان [رضی اللہ عنہم] بالاتفاق معصوم نہ تھے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے لہذا وہی امام ہوں گے۔“

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ دونوں مقدمات باطل ہیں۔ [تفصیلی جواب اس طرح سے ہے:]

[رافضی کا شبہ] پہلا مقدمہ: رافضی کا کہنا کہ: ایک امام معصوم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ان کو ظلم و فساد اور

سرکشی سے روکے۔ اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے منع کرے۔ مظلوم کو ظالم سے انصاف ولائے۔ اور حق وار کو اس کا حق پہنچائے۔ اس امام سے سہو و خطاء اور گناہ کا صادر ہونا ممکن نہ ہو؛ ورنہ ایک اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے کہ امام کو اس ضرورت کے پیش نظر نصب کیا گیا تھا کہ امت سے خطاء کا صدور ممکن ہے۔ اگر امام سے بھی خطاء سرزو ہو سکتی ہو تو کسی اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اگر وہ امام خطاء سے معصوم ہوا تو پھر اس کی امامت درست ہے ورنہ ایک اور امام نصب کرنا پڑے گا۔“

[ردشبہ ۱]: ہم کہتے ہیں: اگر اس مقدمہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو معصوم صرف رسول ﷺ کی ذات ہوتی ہے؛ اور اطاعت بھی آپ ہی کی ہر انسان پر اور ہر زمانے میں واجب ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اوامر و احکام کا علم اس امت کو بھرپور طریقہ سے حاصل ہے؛ بہ نسبت امام غائب یا امام منتظر کے اوامر و نواہی اور احکام کے۔ رسول اللہ ﷺ امام معصوم ہیں؛ اور امت آپ کے اوامر و نواہی کو جانتی ہے۔ جب کہ ان کے معصوم کا معاملہ ایک غائب منتظر پر جا کر رک جاتا ہے۔ جس کو اگر معصوم تسلیم بھی کر لیا جائے تو امت میں سے کسی ایک کو اس کے کسی حکم یا نبی کا کوئی علم نہیں۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت بھی آپ کے اوامر و نواہی کو ایسے نہیں جانتی تھی جس طرح یہ امت رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کو جانتی تھی۔ بلکہ امت محمد ﷺ کے پاس آپ کے احکام و اوامر و نواہی کا اتنا علم ہے جس کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی دوسرے امام سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اور انہیں دوسرے کسی ایسے متولی کی کوئی حاجت نہیں جو انہیں ان کے دین کی پہچان کرائے۔ اور نہ ہی انہیں اس شریعت پر عمل کرنے کے لیے کسی کے تعاون کی کوئی ضرورت ہے۔ اگر امام کے وجود کو علی التقدير تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی [اہل سنت] اپنے نبی ﷺ کے اوامر و نواہی کو امام منتظر کی رعیت کے کسی بھی فرد سے بڑھ کر جانتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی ایک بھی ایسے کو مسلمانوں پر متولی نہیں بنایا جس کے لیے عصمت کا دعویٰ کیا گیا ہو۔ یہ بات قطعی طور سے معلوم ہے کہ آپ کی رعیت یمن و خراسان اور دیگر بلا و اسلامیہ میں تھے۔ اور ان میں ایسے بھی تھے جن کو شرعی اوامر و نواہی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ بلکہ آپ کے متعین کردہ نائبین بھی ایسے امور میں بھی تصرف کرتے تھے جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی واقف نہ ہوتے تھے۔

جب کہ محمد ﷺ کے وہ وارث جنہوں نے یہ علم آپ سے وراثت میں حاصل کیا ہے؛ وہ آپ ﷺ کے احکام و اوامر و نواہی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے؛ اور آپ ﷺ کی طرف سے ملنے والے خبروں کی تصدیق کرتے تھے؛ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کے عالم اور باخبر تھے۔ جب کہ شیعہ ایک معصوم اور زندہ امام موجود ہونے کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ [مزید براں جو صفات شیعہ نے امام میں ضروری قرار دی ہیں، ایسا امام ہمارے زمانے میں کہیں موجود نہیں۔ شیعہ کے نزدیک وہ مفقود اور بے حقیقت ہے۔ بھلا ایسے امام سے امت کے مقاصد کس حد تک پورے ہو سکتے ہیں؟ ایسے فرضی امام سے تو ایک جاہل و ظالم بھی بہتر ہے۔ امام کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے اور اس کے اعمال کی پیروی کی جائے۔]

❦ **[شبہ نمبر ۲]:** شیعہ کا یہ قول ”کہ زندہ امام معصوم کا تقرر ضروری ہے۔“
❦ **جواب:** یہ کلام کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے۔

پہلی وجہ: بیشک امام موصوف اس صفت کیساتھ کہیں بھی پایا جاتا۔ جبکہ ہمارے اس زمانے میں کوئی ایسا معروف امام معلوم نہیں ہو سکا جس کے بارے میں ان صفات کا دعویٰ کیا جاتا ہو۔ اور نہ ہی کسی نے خواہ اپنے لیے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ ایسا امام اس کے ماننے والوں کے ہاں غائب اور مفقود ہے؛ اور اہل عقل کے ہاں معدوم ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور حقیقت میں ایسے لوگوں سے مقصود امامت سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر لوگوں پر کسی ایسے انسان کو حاکم اور امام بنادیا جائے جس میں اگرچہ کچھ جہالت اور ظلم کا عنصر بھی پایا جاتا ہو اس کا ہونا اس امام سے بہتر جس سے کسی طرح بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا ہو۔

جو لوگ اپنے آپ کو اس امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے علاوہ اپنا کوئی مددگار نہیں پائے۔ بلکہ جو لوگ اپنے آپ کو امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ وہ بڑے بڑے کافروں اور ظالموں سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ جب اس امام معصوم کی تصدیق کرنے والوں کو نہ ہی کوئی دینی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی دنیاوی؛ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو مقاصد امامت میں سے کچھ بھی مقصود حاصل ہوا۔ جب مقصود میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہو تو پھر اس کے لیے ہمیں کسی وسیلہ کے ثابت کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وسائل سے مراد تو اصل میں مقاصد سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم یقینی طور پر مقاصد کے حصول کی نفی کرتے ہیں تو اس کے وسائل میں کلام کرنا ایک بیکار کوشش ہے۔ اور کی مثال یوں بیان ہو سکتی ہے کہ جیسے کوئی کہے: ”لوگوں کو ضرورت ہے کہ کوئی انہیں کھانا کھلائے اور پانی پلائے؛ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ کھانا اس طرح کا ہو اور پینا ان اوصاف کا ہو اور ایسا فلاں گروہ کے لیے؛ اور ایسا فلاں گروہ کے لیے۔ حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہو کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیر ہے؛ وہ لوگ بھی اپنے افلاس میں معروف ہیں۔ جس کا معدوم ہونا معلوم ہو؛ اس کے طلب کرنے میں کون سا فائدہ ہے؟ اور جس سے حقیقت میں کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا ہو؛ اس کی اتباع کیسی؟۔ حالانکہ امام کی ضرورت دو چیزوں کے لیے ہوتی ہے:

یا تو علم کے لیے؛ تاکہ اس کی تعلیم و تبلیغ کی جاسکے۔

یا پھر عمل کے لیے تاکہ وہ اپنی قوت و شوکت کی بنا پر [اس علم پر] عمل کے لیے لوگوں کی مدد کر سکے۔

جب کہ اس امام سے نہ پہلا فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی دوسرا۔ بلکہ شیعہ کے پاس جو علم ہے؛ وہ اس [امام غائب] سے پہلے کے ائمہ کے اقوال و اعمال سے منقول ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز مسلمانوں کے موافق ہوتی ہے تو اس کے لیے مسلمانوں سے مدد حاصل کرتے ہیں؛ اور اگر ایسا نہ ہو تو کفار، ملحدین اور ان جیسے لوگوں سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ عمل کی دنیا میں سب سے زیادہ عاجز ہیں۔ اور علم کے میدان میں سب لوگوں سے بڑھ کر جاہل ہیں۔ حالانکہ وہ اس امام معصوم کے پیروکار ہونے کے دعویدار ہیں جس سے مقصود علم و قدرت ہے۔ مگر نہ ہی انہیں علم حاصل ہوا اور نہ ہی قدرت۔ تو پتہ چلا کہ ان کے دعویٰ کی کوئی حقیقت نہیں۔

مزید برآں کہ امت کو ان بارہ ائمہ میں سے کسی ایک سے بھی امامت کے پورے مقاصد حاصل نہیں ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جتنے بھی ائمہ ہیں لوگ ان کے علم سے ایسے ہی مستفید ہوئے ہیں جیسے ان کے ہم مثل دوسرے علماء سے۔

حضرت علی بن حسین، ان کے بیٹے ابو جعفر، ان کے بیٹے جعفر بن محمد لوگوں کو ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم سکھاتے؛ جس طرح ان کے زمانے کے علماء لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور ان کے زمانے میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان سے بڑھ کر عالم اور امت کے لیے زیادہ فائدہ مند تھے۔ یہ اہل علم کے ہاں معروف ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ ائمہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم اور دیندار تھے۔ تو فقط ان اہل علم و دین سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو صاحب قوت و شوکت حکمران سے ہوتا ہے؛ وہ لوگوں پر حق کی پیروی کو لازم ٹھہراتا ہے اور برائی و باطل سے بزور بازو منع کرتا ہے۔ ان تین ائمہ کے بعد آنے والوں کے پاس اتنا علم نہیں تھا جس سے امت فائدہ حاصل کرے۔ اور نہ ہی انہیں قوت و شوکت حاصل تھی کہ وہ [نیک اعمال و نفاذ احکام شریعت میں] امت کی مدد کرتے۔ بلکہ ان جیسے دوسرے لوگوں یعنی بنی ہاشم کو مقام و مرتبہ اور منزلت حاصل تھی۔ اور انہیں دین اسلام کے ضروری مسائل کی معرفت بھی حاصل تھی۔ جیسے کہ بہت سارے عام مسلمان بھی یہ مسائل جانتے تھے۔

البتہ وہ علوم جو ماہرین اہل علم کے ساتھ خاص ہیں، ان کے بارے میں ان کی کوئی شہرت نہیں تھی۔ اس لیے اہل علم نے اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی جیسے کہ ان سے پہلے کے تین ائمہ سے نقل کرتے آئے ہیں۔ اگر ان کے پاس کوئی نفع بخش علم ہوتا تو لوگ ان سے وہ علم حاصل کرتے۔ اس لیے کہ طالب علم کو اپنے مقصد کی معرفت ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بہت بڑے عالم تھے، اور امت یہ بات جانتی تھی۔ اس لیے ان سے فائدہ حاصل کیا اور عوام و خواص میں ان کا ذکر ہونے لگا۔ ایسے ہی امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس نفع بخش علم و فقہ تھا؛ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور ان کا نام علم فقہ کے میدان میں ایک روشن ستارہ ہے۔

لیکن جب انسان دیکھتا ہے کہ اس کا مقصد کسی جگہ پر نہیں مل رہا، تو وہ وہاں اس چیز کا طلب گار نہیں بنتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اگر کسی انسان کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بہت بڑا طبیب ہے یا بہت بڑا نحوی ہے، اور اس کی ایسی عظمت بیان کی جائے کہ اس سے علم حاصل کرنے کے لیے اہل طب اور نحوی حضرات حاضر ہو جائیں۔ مگر وہ دیکھیں کہ انہیں طب و نحو میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اس آدمی کے پاس نہیں مل رہی؛ تو وہ اس سے منہ موڑ کر چلے جائیں گے۔ فقط جاہل لوگوں کا دعویٰ کرنا اس کی تعظیم بجا لانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

امامیہ نے معتزلہ سے یہ عقائد لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اقدار، تمکین اور لطف واجب ہے جن سے مکلف اصلاح کے قریب تر اور فساد سے دور ہوتا ہے۔ باوجودیکہ اسے دونوں حالتوں [اصلاح اور فساد] پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔

پھر [اس کے بعد شیعہ حضرات] کہنے لگے: ”امامت واجب ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک امامت کا وجوب نبوت کے وجوب سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ [احکام شرعی] کی تکلیف میں اس سے مہربانی حاصل ہوتی ہے۔

نیز یہ بھی کہتے ہیں: ہم عادات اور زمانہ میں تجربات کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جب کسی جماعت کا کوئی باہمت امیر ہو، لوگ جس سے ڈرتے ہوں، اور اس کا حکم لوگوں پر چلتا ہو؛ تو اس امیر کی موجودگی میں لوگ اصلاح کے قریب تر اور فساد سے بعید ہوتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی امیر نہ ہو، تو لوگوں میں دنگا و فساد اور قتل و غارت واقع ہوتے ہیں۔ اس وقت لوگ اصلاح سے بعید اور فساد کے قریب تر ہوتے ہیں۔

یہ حالت عقلی طور پر معلوم شدہ ہے۔ اس کا انکار صرف وہی انسان کر سکتا ہے جو عادات سے جاہل ہو۔ اور کسی قاعدہ کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا عقلی طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ تو کہتے ہیں: جب ایسا ہونا تکلیف شرعی میں مہربانی ہے تو اس کا وجوب لازم آتا ہے۔ پھر اس کے بعد عصمتِ امام کی باقی صفات شمار کی ہیں۔

[اپنے آپ سے سوال]:

ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے آپ سے سوال کیا: جب تم کہتے ہو کہ امام کا ہونا اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اور مہربانی ہے اور امام تم سے غائب ہے تو اس غیب کی وجہ سے تمہیں کوئی مہربانی حاصل ہوئی؟ اگر امام کی غیبت کے ساتھ لطف حاصل نہیں ہو سکتا تو تکلیف جائز ہوئی۔ تو اس سے امام کے دین میں لطف و مہربانی ہونے کا نظریہ باطل ہوا۔ تو اس وقت پھر امام معصوم ہونے کے عقیدہ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔

پھر خود ہی اس سوال کے جواب میں کہنے لگے: ”یشک یہ لطف و مہربانی ان عارفین کو امام کے غائب ہونے کی حالت میں حاصل ہے جو اس کی حالت ظہور کے واقف کار ہیں۔ یہ مہربانی ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جو امامت کے واجب ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہ مہربانی اس انسان کو حاصل نہیں ہو سکتی جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اور ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کی معرفت رکھتے ہیں۔ کہنے لگے کہ: اس سے یہ سوال ساقط ہو گیا۔ اور معصوم کی امامت کا عقیدہ واجب ہو گیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ: اگر حالت غیبت میں یہ لطف و مہربانی ایسے ہی حاصل ہے جیسے کہ حالت ظہور میں؛ تو پھر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کے ظہور سے بے نیاز ہو جائیں۔ اور مرتے دم تک اس کی اتباع کرتے رہیں۔ یہ بات ان کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

کہنے لگے: ”عارفین کے ہاں لطف و مہربانی غیبت کی حالت میں تخفیر و تبیعد عن القبارح کے باب سے ہے، جیسا کہ حال ظہور میں ہوتا ہے۔ لیکن ہم امام کا ظہور کسی دوسری وجہ سے واجب قرار دیتے ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ مؤمنین سے ظالموں کا غلبہ ختم کیا جائے۔ اور ظالم لوگوں سے مال لیکر انہیں ان کی اصل جگہ پر واپس کیا جائے۔ اور ان ظالم حکومتوں کا خاتمہ کیا جائے جن کو ختم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور کفار سے جہاد کیا جائے جو کہ امام کے ظہور کے بغیر ممکن نہیں۔

ان سے کہا جائے گا کہ: ”اس کلام کا باطل ہونا ظاہر ہے۔“ اس لیے کہ جس امام کو تم لطف قرار دیتے ہو؛ جس پر عادات و عقول گواہ ہیں؛ جیسا کہ تم نے خود ذکر کیا ہے۔ تم کہتے ہو: ”جب جماعت کے لیے پرہیز، صاحب اطاعت، متصرف اور زور آور امیر ہو تو اس کے وجود کی صورت میں لوگ اصلاح کے قریب تر ہوتے ہیں اور فساد سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اور اس کے لیے تم نے معصوم ہونے کی شرط لگائی۔ اور آپ نے یہ بھی کہا کہ: اس کے بغیر ذرا وے کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جو ائمہ اس منتظر سے پہلے موجود تھے؛ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اوصاف نہ پائے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ ہی قوت و شوکت حاصل تھی اور نہ ہی وہ لوگوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوئے، مگر آپ کو وہ قوت اور تصرف حاصل نہ ہو سکا جو آپ سے پہلے کے خلفاء کو تھا۔ ان کے بعد آنے والے ائمہ میں سے تو کسی کو بھی نہ ہی کوئی قوت حاصل ہوئی اور نہ ہی لوگوں پر کوئی با تصرف اختیار چلا۔ بلکہ ان میں

سے بھی کسی ایک کو وہی مقام حاصل ہوا کرتا تھا جو ان کے دوسرے ہم پلہ [علماء و اکابر] کو حاصل ہوتا تھا۔

جب کہ امام غائب کو تو ان امور کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔ اس لیے کہ جو کوئی امام کے وجود کا اقرار کرتا ہے؛ اسے پتہ ہے کہ امام ساڑھے چار (اب بارہ) سو سال سے غائب ہے۔ اور وہ خوف سے لرزیدہ ہے، اس کا ظہور ممکن بھی نہیں؛ چہ جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم کرے؛ اور نہ ہی وہ کسی کو کوئی حکم دے سکتا ہے اور نہ ہی منع کر سکتا ہے؛ اور امت میں قتل و غارت گری اور دنگ و فساد بھی اب تک موجود ہے۔ نیز آپ دیکھ سکتے ہیں رافضی دیگر سب فرقوں سے زیادہ دنگ و فساد کرنے والے ہیں۔ ان میں زبانوں اور رنگ و نسل کے باوجود آپس میں ایک دوسرے پر بھی بہت بڑا وہ ظلم و تعدی اور اختلاف پائے جاتے ہیں جو کہ کفار سے دوستی رکھنے والوں کے مابین بھی نہیں؛ چہ جائے کہ وہ مسلمانوں سے محبت اور دوستی رکھنے والوں میں پائے جائیں۔ تو پھر ان لوگوں کو اس امام کی وجہ سے کونسا لطف اور مہربانی حاصل ہوئی؟

جن بستیوں اور شہروں کے رہنے والے امام منتظر ماننے والے اور اس کا عقیدہ رکھنے والے ہیں؛ آپ ان کا مقابلہ ان شہروں اور بستیوں سے کیجیے جو اس کا عقیدہ نہیں رکھتے؛ تو آپ دیکھیں کہ مؤخر الذکر لوگ معاش و معاد کے لحاظ سے ہر طرح سے اچھی حالت میں ہے۔ یہاں تک کہ احوال عالم پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ کافروں کے شہر جہاں منتظمین اور رؤساء موجود ہیں؛ جو ان کی دنیاوی مصلحتوں کو پورا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں؛ وہ ان لوگوں سے اچھی حالت میں ہیں جو اپنے آپ کو اس امام کی متابعت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ مگر اس امام کی وجہ سے ان کے لیے نہ کوئی دنیاوی مصلحت پوری ہوتی ہے اور نہ ہی دینی۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ وہ امام کے وجود کے اعتراف کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں کہ اگر امام ظاہر ہو گیا تو انہیں گناہوں پر سزا دے گا؛ تو پھر بھی یہ بات سبھی جانتے ہیں سزا میں مشہور حکمرانوں کا لوگوں پر خوف ان [امامیہ] لوگوں کے امام منتظر کے خوف سے بڑھ کر ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے کچھ گناہ ظاہری ہوتے ہیں۔ جیسے لوگوں پر ظلم کرنا، ظاہری فحاشی [وغیرہ]۔ ان گناہوں میں لوگ ڈرتے ہیں کہ حاکم انہیں سزا دے گا۔ یہ خوف امامیہ کے امام منتظر کی سزا کے خوف سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب لطف و مہربانی کو واجب قرار دیتے ہیں؛ وہ نہ ہی اس منتظر کے عارفین کے لیے حاصل ہوئی اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔

www.KitaboSunnat.com

❀ شیعہ کا یہ کہنا: ”یہ لطف امام کے عارفین کے لیے [ایسے ہی] حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حالت ظہور میں حاصل ہو“؟
❀ یہ ایک کھلی ہوئی معاندانہ اور سرکشی کی بات ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں جب امام مہدی کا ظہور ہوگا؛ وہ شرعی حدود قائم کرے گا؛ اور وعظ و نصیحت کا کام کرے گا اور ایسے امور سرانجام دے گا جن امور کا لطف ہونا واجب ہوگا؛ اور یہ امور عدم ظہور کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتے۔

لطف کے باب میں ان کا امام کی معرفت کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے تشبیہ دینا؛ اور یہ کہنا کہ: اس سے عارفین کو لطف و مہربانی حاصل ہوتے ہیں دوسروں کو نہیں؛ یہ ایک فاسد قیاس ہے۔ اس لیے کہ یہ معرفت کہ: اللہ تعالیٰ زندہ موجود اور قادر ہے؛ بھلائی کا حکم دیتا ہے؛ اور اس [کے بجالانے] پر ثواب سے نوازتا ہے؛ اور برائی سے منع کرتا ہے اور اس [کے ارتکاب] پر سزا دیتا

ہے [یہ معرفت] اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس سے امید کے بڑے اسباب میں سے ہے۔ یہ معرفت ثواب اعمال کے حصول میں رغبت پیدا کرے گی؛ اس بنا پر انسان مامور افعال کو بجالائے گا اور ممنوعہ کاموں کو اس کے عذاب کے خوف سے ترک کر دیگا۔ کیونکہ انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؛ اور اس کی سنت نیکو کاروں کو ثواب دینا اور بدکرداروں کو سزا دینا ہے۔

رہا ایسا شخص جس کے بارے میں لوگ جانتے ہوں کہ ساڑھے چار [اب بارہ] سو سال سے مفقود ہے؛ [اس کا کوئی اتنا پتہ ہی نہیں] اور نہ ہی اس نے کسی کو [نیکی پر] ثواب دیا؛ اور نہ ہی کسی کو [بدی پر] سزا دی۔ بلکہ اگر وہ ظاہر ہو جائے تو اسے اپنی جان کا خوف دامن گیر ہو؛ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے؛ تو پھر ایسے امام کی معرفت مامور کو بجالانے اور ممنوع کے ترک کر دینے کے لیے داعی [اور سبب] کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ جب کسی کو امام کے عجز و خوف کا پتہ چلے گا تو وہ زیادہ بے خوف ہو کر گندے افعال کا ارتکاب کرے گا۔ خصوصاً جب ایک لہذا زمانہ گزر جائے اور وقت پہ وقت گزرتا جائے اس دوران نہ ہی کسی کو [بد عملی کی] سزا ملی ہو اور نہ ہی کسی کو [نیک عمل پر] انعام ملا ہو۔

بلکہ اگر مان لیا جائے [جیسے بعض شیعہ دعویٰ کرتے ہیں] کہ: امام ہر سو سال میں ایک بار ظاہر ہوتا ہے؛ اور سزا دیتا ہے۔ تو پھر بھی اس امام سے وہ لطف و مہربانی حاصل نہیں ہو سکتی جو کسی ادنیٰ سے مسلمان حکمران سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ بھی کہہ لیا جائے کہ [یہ امام] ہر دس سال بعد ظاہر ہوتا ہے؛ یا ہر سال بعد ایک بار ظاہر ہوتا ہے تب بھی اس امام سے کوئی ایسی منفعت حاصل نہیں ہو سکتی جو اس حکمران سے حاصل ہو سکتی ہے جو ہر وقت لوگوں کے درمیان ظاہر اور موجود ہو۔ بلکہ یہ حکمران - بھلے یہ حکمران بعض گناہوں کے مرتکب بھی ہوں، اور بعض امور میں ظالم بھی ہوں پھر بھی - اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اسباب مہیا کیے ہیں۔ یہ جو لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں رغبت دلاتے ہیں [اس کا فائدہ] اس سے بہت بڑھ کر ہے جو ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہو؛ پھر اس کا کیا عالم ہوگا جو بالکل ہی مفقود ہو۔ جمہور عقلاء جانتے ہیں اس امام کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں۔ اس امام کے وجود کا اقرار کرنے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ [اگر وہ امام بالفرض موجود بھی ہے تو] وہ انتہائی عاجز اور خوف زدہ ہے۔ اس نے کبھی بھی کوئی فعل سرانجام نہیں دیا جیسے لوگوں میں سے کوئی بھی کوئی کام کر سکتا ہو۔ چہ جائے کہ اس کا مقابلہ کسی حکمران سے کیا جائے۔ [جو احکام جاری کرتا ہو اور قانون نافذ کرتا ہو]۔

اس امام غائب کی کون سی ہیبت ہے؟ اور کیسی اطاعت گزاری ہے؟ کون سا تصرف ہے اور کیسی دسترس حاصل ہے؟ تاکہ جب لوگوں کے لیے ایک بابیت، مطاع، متصرف اور دسترس رکھنے والا امام [تصور کیا جائے] جس کے دور میں لوگ اطاعت و اصلاح کے قریب تر ہوتے ہیں۔

جس انسان کو ان باتوں کا علم وہ جانتا ہے کہ شیعہ انتہائی سرکش، جہالت، عداوت اور حماقت کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ امام کی غیبت و عاجزی کی حالت میں اس سے وہ لطف و مہربانی جوڑتے ہیں جو اس کے ظہور کی حالت میں ہونی چاہیے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ: اس امام کے خوف، عاجزی، اور فقدان کے باوجود اس کی معرفت لطف و مہربانی ہے؛ جیسا کہ اگر وہ ظاہر و قادر ہوتا اور اسے امن حاصل ہوتا [تو وہ لطف و مہربانی حاصل ہوتی]۔ اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ: مجرد اس معرفت کا ہونا بھی ایسے لطف و مہربانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت لطف و مہربانی ہے۔

دوسری وجہ: تمہارا یہ قول کہ: ”امام معصوم کو مقرر کیا جانا ضروری ہے جو ان افعال کو انجام دے۔“

ہم پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا تمہاری مراد یہ ہے کہ ایسے امام کو پیدا کرنا اور نصب کرنا اللہ کے لیے ضروری ہے جو ان صفات سے متصف ہو؟ یا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کیلئے ان صفات سے متصف امام کی بیعت کرنا ناگزیر ہے؟ اگر تم نے جواب دیا کہ ہمارا مقصود پہلا قول ہے؛ تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان صفات سے متصف کسی ایک کو بھی پیدا نہیں کیا۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”بیشک علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے؛ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار نہ دیا، اور آپ کی تائید نہ فرمائی۔ نہ ہی خود مدد کی؛ اور نہ ہی کسی لشکر سے؛ تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ افعال سرانجام دیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔“

مگر تم کہتے ہو: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں مسند خلافت پر متمکن نہ ہو سکے، بلکہ آپ عاجز و مغلوب اور مظلوم رہے۔ جب آپ کو خلافت حاصل ہو گئی؛ تو ایک دوسرا لشکر کھڑا ہو گیا؛ جنہوں نے آپ سے جنگ و قتال کیا؛ یہاں تک کہ آپ وہ کام بھی نہ کر سکے جو آپ سے پہلے تین خلفاء نے کئے تھے؛ جو تمہارے نزدیک ظالم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تین ظالموں کو یکے بعد دیگرے خلافت پر فائز کیا اور انھوں نے امت کے لیے بڑے مفید کام کیے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ توفیق نہ بخشی اور اللہ تعالیٰ نے ایسی ضرورت کے زمانہ میں اس معصوم کو پیدا نہ کیا۔ اگر شیعہ کہیں کہ: ”امت کے لیے ایسے امام کا تقرر اور اس کی اعانت ضروری ہے۔“

تو ہم کہیں گے: ”یقیناً لوگوں نے بھی ایسا نہیں کیا خواہ وہ ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے۔ بہر تقدیر ہر صورت تمہارے نزدیک ان معصومین میں سے کسی ایک کو بھی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ نہ ہی خواص کی طرف اور نہ ہی عوام کی طرف سے۔ جن مصلحتوں کا تم نے ذکر کیا ہے ان کا حصول تائید کے بغیر ناممکن ہے۔ جب تائید نہیں ہوئی تو وہ مصالح بھی حاصل نہ ہو سکے جو ہونے چاہیے تھے۔ بلکہ اس کے فقط اسباب حاصل ہوئے تھے؛ مگر فقط اسباب سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

تیسری وجہ: یہ کہا جائے گا کہ: جب ان کے وجود سے جملہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے بلکہ اس کی بہت سی شرائط فوت ہو گئیں؛ تو عصمت کی شرط کس لیے باقی رکھی جائے؟ علاوہ ازیں جب عدم عصمت یا معصوم کے عاجز ہونے کی وجہ سے مقصود حاصل نہ ہو تو عصمت کا وجود و عدم یکساں ہے۔ پھر عقلی دلیل کی مدد سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ امام معصوم کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے؟ بیشک اس امام کا پیدا کیا جانا صرف اس وجہ سے تھا تا کہ مصالح العباد حاصل ہوں۔ اور جب اسے عاجز پیدا کیا گیا؛ وہ ان مصلحتوں میں کسی چیز پر قدرت بھی نہیں رکھتا؛ بلکہ اس امام کی وجہ سے وہ فساد پیدا ہوا کہ اگر اس امام کا وجود نہ ہوتا تو یہ فساد پیدا نہ ہوتا۔ جیسا کہ چوتھی وجہ میں یہ باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔

چوتھی وجہ: اگر اللہ تعالیٰ ایسا امام پیدا نہ کرتا تو وہ شر پیدا نہ ہوتا جیسا شر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ جب اس کے وجود سے کسی شر کو ختم نہیں کیا جاسکا؛ حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ اس [امام] کے وجود سے اس [شر] کا ختم کرنا ممکن ہوا۔ بلکہ اس کے وجود نے جمہور کو تکذیب پر براہیختہ کیا؛ اور انہوں نے شیعہ سے عداوت کی ٹھان لی۔ انہوں نے اس امام پر اور اس کے ماننے

والوں پر ظلم کیا؛ اور اتنا شر و فساد پیدا ہوا جس کو صحیح معنوں میں اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ امام معصوم ہے۔ اور اگر بالفرض تسلیم کر لیں کہ: حضرت علی معصوم نہیں؛ اور نہ ہی باقی بارہ اماموں میں سے کوئی ایک معصوم ہے؛ اور تینوں خلفاء بھی مقرر نہ ہوئے ہوتے؛ بنو امیہ اور بنو عباس کو حکومت بھی نہ ملی ہوتی تو پھر بھی اس [نظریہ] میں [بذات خود] شر و فساد موجود ہے۔ یہ اس صورت میں ہے اگر ان ائمہ کو معصوم تسلیم کر لیا جائے۔ معصوم ماننے کی صورت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی کوئی شرایعہ ختم نہیں کیا مگر جیسے دوسرے غیر معصوم لوگوں نے ختم کیا؛ تو معاملہ یہاں پہنچا کہ ان کے معصوم ہونے [کے عقیدہ] کی وجہ سے شر و فساد ہی پیدا ہوا؛ کوئی خیر و مصلحت حاصل نہیں ہو سکی۔

حکیم کے متعلق کیسے یہ بات جائز سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ کسی چیز کو پیدا کرے تاکہ اس سے خیر و بھلائی حاصل ہو؛ مگر پھر اس سے سوائے شر کے کوئی بھلائی و خیر حاصل نہ ہو؟

❁ [شیعہ کی جانب سے] اگر یہ کہا جائے کہ: یہ شر لوگوں کے اس امام پر ظلم کی وجہ سے حاصل ہوا۔“

❁ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: وہ حکیم جس نے اسے پیدا کیا؛ جب اس نے اس غرض سے پیدا کیا تھا تاکہ اس سے ظلم ختم ہو؛ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب وہ اسے پیدا کرے گا تو ظلم اور بڑھ جائے گا؛ تو پھر یہ حکمت کی بنا پر تخلیق نہیں ہوئی؛ بلکہ اس میں حماقت کا کردار ہے۔ یہ تو ایسے ہی جیسے کوئی انسان اپنا بیٹا اصلاح کی غرض سے کسی ایسے انسان کے سپرد کرے جو اسے نیکی اور اصلاح کا حکم دے؛ مگر اس کے ساتھ وہ جانتا بھی ہو کہ وہ اس کی بات نہیں مانے گا؛ بلکہ پہلے سے زیادہ بگڑ جائے گا۔ تو کیا یہ کسی دانشمند کا فعل ہو سکتا ہے؟

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان راستے میں سرائے تعمیر کرائے تاکہ گزرنے والے قافلے یہاں پر پناہ حاصل کریں۔ اور اپنے آپ کو کفار و رہزنوں سے بچاسکیں۔ اور اسے پتہ ہو کہ جب وہ اس تعمیر کو مکمل کر لے گا تو کفار اس کو اپنا قلعہ بنالیں گے؛ اور رہزن اسے اپنا ٹھکانہ بنالیں گے۔

دوسری مثال اس انسان کی ہے جو کسی آدمی کو مال دے تاکہ وہ مجاہدین اور سپاہیوں میں تقسیم کرے؛ اور اس کو یہ علم بھی ہو کہ [جب مال اس انسان کے ہاتھ میں آجائے گا تو] اسے کفار اور برسر پیکار لوگوں پر اور رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں پر خرچ کرے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان رافضہ قدریہ نے یہ جہتیں معتزلہ قدریہ کے اصولوں سے اخذ کی ہیں۔ جب معتزلہ اللہ تعالیٰ پر اصلاح اور اصلح کو واجب قرار دیتے تھے؛ تو انہوں نے بھی ان سے یہ عقیدہ اخذ کر لیا۔ اور ان [معتزلہ] کے اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دینے کی اصل یہ ہے کہ: وہ ہر مکلف کیساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کے دین و دنیا کے اعتبار سے اصلح [مناسب تر] ہو۔ یہ ایک بیکار و فاسد اصل ہے۔ اس لیے کہ رب تعالیٰ اپنی حکمت و رحمت سے اپنی خلقت کے لیے وہی کرتے ہیں جو ان کے دین و دنیا میں ان کے لیے مناسب تر اور اصلح ہو۔

[روافض و نصاریٰ کی مشابہت]:

روافض کا یہ قول نصاریٰ کے اس قول کی مانند ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر اتر آیا؛ یا اس نے اپنے بیٹے کو زمین پر بھیجا تاکہ اسے سولی دیا جائے اور یہ سولی دیا جانا سب بنی آدم کی مغفرت کا باعث ہو اور شیطان کو بھی اس سے دور کیا جائے۔“

نصاری کو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جب مسیح کا قتل و صلب اور تکذیب عظیم شرارت و ضلالت ہے تو گویا اس نے خود بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر کے چھوٹے گناہ کو معاف کرنا چاہا۔ اس کے باوجود اس نے شر کو کم کرنے کے بجائے اس میں اور اضافہ کیا۔ تو کسی مقصود کے لیے کیسے کچھ کیا جاسکتا ہے جب کہ جو حاصل ہے وہ مقصود کا الٹ ہے۔

[معصومیت ائمہ کا مسئلہ:]

[[شبیہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”جب انسان مدنی الطبع ہے تو اہل مدینہ سے شر کو دور کرنے کے لیے امام معصوم کا تقرر ضروری ہے۔“]

جواب: پانچویں وجہ: جب انسان مدنی الطبع ہے اور اہل مدینہ سے ظلم و فساد کے خاتمہ کے لیے امام کا مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے، کیا ہر شہر میں ایک ایسا امام معصوم موجود رہا ہے جو ان سے ظلم کا ازالہ کرتا رہا ہو یا نہیں؟

[ہم دوسرا سوال کرتے ہیں:] کیا اہل کتاب اور مشرکین کے شہروں میں بھی امام معصوم کا ہونا ضروری ہے؟

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ آیا شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بھی کوئی معصوم امام موجود تھا؟ اگر شیعہ اس کا جواب دیں کہ: تمام شہروں کے لیے امام معصوم ایک ہی ہوتا ہے، مگر اس کے نائین ہر جگہ موجود ہوتے ہیں تو یہ خلاف ظاہر ہے۔ اور اگر کہیں کہ ان کے نائب بعض شہروں میں ہوتے۔

تو پھر ہم سوال کریں گے کہ: کیا ہر امام معصوم کے نواب تمام شہروں میں موجود ہوتے ہیں یا بعض شہروں میں؟

اگر شیعہ کہیں کہ امام معصوم کے نائین ہر جگہ موجود ہوتے ہیں تو یہ خلاف ظاہر ہے۔

اور اگر کہیں کہ ان کے نائب بعض شہروں میں ہوتے ہیں اور بعض میں نہیں ہوتے۔ تو پھر تمہارے عقیدہ کے مطابق یہ

اللہ پر واجب کیسے ہوا؟ جب کہ سارے کے سارے شہر اس ایک امام معصوم کے محتاج ہیں؟

چھٹی وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں: کیا یہ امام اکیلا ہی معصوم ہوتا ہے یا پھر اس کے نائین بھی معصوم ہوتے ہیں؟

ان لوگوں کو نائین کو معصوم کہنے کی جرات کبھی بھی نہیں ہوگی۔ جو کہ کھلم کھلا انکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے نواب بھی معصوم نہیں ہوا کرتے تھے۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نواب معصوم تھے۔ بلکہ آپ کے بعض نوائین میں وہ شہر اور معصیت تھی جو کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نوائین میں نہیں تھی۔ تو پھر عصمت کہاں گئی؟

اور اگر شیعہ کہیں کہ: ”عصمت کی شرط صرف اکیلے امام کے لیے ہے۔“ تو ہم کہیں گے: ”تو پھر وہ شہر جو امام غائب سے دور ہیں؛ خصوصاً جب امام معصوم وہاں کے نواب پر غالب ہونے کی طاقت بھی نہیں رکھتا؛ اور بلکہ امام اس سے عاجز ہے۔ تو لوگوں کو امام معصوم سے کیا فائدہ پہنچا؟ خصوصاً جب کہ وہ غیر معصوم کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں؛ غیر معصوم ان پر حکم چلاتا ہے اور یہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے مال [زکوٰۃ و صدقات] بھی غیر معصوم لیتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ ان امور کا ذمہ دار امام معصوم ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: اگر وہ حضرت ابوبکر و عمرو عثمان رضی اللہ عنہما کی طرح با اقتدار ہو تب بھی اس کا عدل جو کہ اس پر واجب ہے؛ سب لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کی زیادہ

سے زیادہ حد یہ ہو سکتی ہے کہ ہر شہر کے لیے ایک طاقت ور اور افضل نواب کو مقرر کیا جائے۔ اور جب عادل کا دستیاب ہونا یوں بھی مشکل ہو یا ظالم کے علاوہ کوئی بھی میسر نہ آئے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ امام پر عادل و قادر نواب کو مقرر کیا جائے؟ جب امام معصوم کو ایسا شخص نہیں مل سکے گا تو اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پر قادر اور عادل مطلق کو پیدا کرنا واجب نہیں ہے؛ بلکہ اللہ پر وہی کچھ واجب ہے جس کے کرنے پر وہ قادر ہے۔ [امام معصوم کا تقرر پھر اللہ پر واجب کیسے ٹھہرا؟] پس ایسے ہی لوگوں پر واجب ہے کہ وہ مخلوق الہی میں سے نیک لوگوں کو اپنا حاکم بنائیں۔ اگرچہ اس میں بعض پہلوؤں کے لحاظ سے نقص بھی موجود ہو جیسے قدرت و عدل۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: ”اے اللہ میں تیری بارگاہ میں شکایت کرتا ہوں فاجر انسان کی بہادری اور ثقہ نیک کی عاجزی کی۔“ دنیا کی سیاست حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح دوسرا کوئی انسان نہیں کر سکا۔ تو پھر آپ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کے متعلق کیا خیال ہوگا؟

اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب متولی خود قادر و عادل ہو۔ تو جب امام معصوم خود عاجز ہو؛ تو پھر کیا عالم ہوگا؛ اور پھر جب امام بالکل ہوشیار ہو تو کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر کون ہوگا جو رعیت کا رابطہ امام سے کرائے گا؛ اور امام کو امت کے احوال کی خبر دے گا؟ اور کون امت پر اس امام کی اطاعت کو لازم ٹھہرائے گا؛ تاکہ وہ امام مطاع تصور ہو۔ اور جب بعض نواب اس کی اطاعت کا اظہار کریں تو وہ انہیں اپنا نائب مقرر کر دے۔ اور پھر وہ [نائب] جیسے چاہے لوگوں سے اموال وصول کرے۔ اور بادشاہوں کے شہروں میں بسیرا کرے؛ تو امام معصوم کا اس میں کیا حیلہ و چارہ باقی رہ جاتا ہے؟ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صرف اکیلے امام معصوم سے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا بھلے وہ قوت اور شوکت والا بھی ہو۔ اور پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب وہ خود مغلوب و عاجز ہو؟ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر جب امام بالکل ہی مفقود اور غائب ہو؛ اور کوئی انسان اس سے بات چیت کرنے پر قادر ہی نہ ہو؛ اور اس معدوم امام کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو [کیونکہ یہ امام معصوم شیعہ کے نزدیک عاجز ہے اور ہمارے نزدیک معدوم ہے]۔

ساتویں وجہ: ہم یہ کہتے ہیں کہ: امام معصوم اسی صورت میں ظلم کا ازالہ کر سکتا اور اپنی رعیت سے عدل و انصاف کا سلوک کر سکتا ہے جب وہ ظلم کے روکنے اور اپنا حق وصول کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ جب وہ خود ہی عاجز و مغلوب ہو اور اپنے نفس سے ظلم کو نہ روک سکتا ہو؛ اپنا حق وصول نہ کر سکتا ہو نہ ہی ولایت سے اور نہ ہی مال سے؛ اور نہ ہی اپنی بیوی کی میراث کا حق وصول کر سکتا ہو؛ تو پھر رعیت سے ظلم کو کیوں کر دور کر سکے گا؛ اور لوگوں کو کون سا حق ادا کرے گا؟

اور پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب امام خود ہی معدوم ہو یا پھر اتنا ڈرپوک ہو کہ ظالموں کے ظلم یا قتل کئے جانے کے خوف سے کسی شہر یا گاؤں میں ظاہر ہونے کی ہمت نہ کر سکتا ہو۔ [شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا امام خائف ہے] اور خوف قتل کی بنا پر چار سو ساٹھ سال سے باہر نہیں نکل رہا۔ اور زمین ظلم و فساد سے بھری ہوئی ہے؛ اور وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ کم از کم اپنے آپ کا تعارف ہی کر سکے۔ تو پھر وہ مخلوق سے ظلم کو کیسے ختم کر سکتا ہے؟ یا مستحق کو اس کا حق کیسے دلا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان لوگوں پر کس طرح برابر صادق آتا ہے؟ [اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:]

﴿أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ [الفرقان ۳۳]

”یا آپ گمان کرتے ہیں کہ واقعی ان کے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، وہ نہیں ہیں مگر چوپاؤں کی طرح، بلکہ وہ راستے کے اعتبار سے زیادہ گمراہ ہیں۔“

آٹھویں وجہ: یہ کہا جائے گا کہ: ”کیا اللہ تعالیٰ قبیح حرکت کا ارتکاب کرتا ہے؟“ اس مسئلہ میں علماء کے دو قول ہیں: بعض لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ سے ظلم کا صدور ممنوع ہے؛ اور قبیح کا ارتکاب مستحیل۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں وہ حسن ہوتا ہے۔ شیعہ کے ہاں یہ کہنا ممنوع ہے کہ اس سے بہتر یہ ہے۔ چرچائیکہ کوئی اسے واجب قرار دے۔ دوسرا قول: ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ: چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر واجب قرار دیا ہے اس لیے عدل و رحمت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ۱۲)

”تمہارے پروردگار نے رحمت کو اپنی ذات پر لکھ رکھا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر رکھا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ:

”اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے؛ اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کرتا ہوں؛ پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔“^۱ اس عقیدہ کے قائلین کہتے ہیں: یہ چیز عقل سے واجب ہوتی ہے۔

بہر کیف حال میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے ظلم کا ارتکاب ہوتا ہے نہ وہ امر واجب میں خلل ڈالتا ہے۔ اس نے امر واجب کو پورا کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود جن مصالح کا ظہور امام معصوم سے ضروری تھا وہ بروئے کار نہیں آئے۔ اگر ان مصالح کا حصول صرف امام کی تخلیق سے ہی پورا کر دیا ہے اور وہ حاصل نہیں ہوئے تو امام کو پیدا کرنا واجب نہیں ہوگا۔ اور اگر ان مقاصد و مصالح کا حصول تخلیق امام کے علاوہ چند دیگر امور کے پیدا کرنے پر موقوف تھا اور ان دونوں کے مجموعہ سے مقصد حاصل ہونا ضروری تھا تو اس نے وہ مجموعہ پیدا نہیں کیا۔ بھلے اس مجموعہ میں کچھ بھی نہ پیدا کیا ہو؛ یا بعض چیزیں نہ پیدا کی ہوں۔

قلیل ہو یا کثیر اخلال بالواجب اللہ تعالیٰ پر ممنوع ہے۔ بنا بریں دونوں صورتوں میں ان مقاصد کے موجبات کا پیدا کرنا اس پر ضروری نہ ٹھہرا۔ اور جب واجب نہ ہوا تو اس میں کچھ فرق نہیں کہ وہ معصوم کو پیدا کرے جس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو یا اسے پیدا نہ کرے اور اس پر یہ واجب بھی نہ ہو۔ بنا بریں اس کا وجود بھی ضروری نہ ہوگا۔ لہذا ہر صورت میں اس کے وجود کو ضروری قرار دینا باطل ٹھہرے گا۔

اگر کوئی یہ کہے: ”بیشک مقصود امام معصوم کی پیدائش اور مخلوق کی اس کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوگا۔“

تو ان سے کہا جائے گا: اگر مکلفین کی اطاعت گزاری اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تھی؛ مگر اس نے پیدا نہیں کیا؛ تو اس نے اس امام معصوم سے حاصل ہونے والی مصلحت کو بھی پیدا نہیں کیا۔ تو پھر ایسا کرنا اس پر واجب نہ ہوا؟ اور اگر اس کے اختیار میں نہ ہو تو پھر اس کے بغیر مکلف کے حق میں بھی واجب نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں کیسے واجب ہو سکتا ہے؟ اور جس چیز کے بغیر واجب پورا نہیں ہو سکتا؛ وہ سرے سے موجود ہی نہیں پھر اس صورت میں امر واجب نہیں ہوگا۔

^۱ صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة۔ باب تحریم الظلم (حدیث: ۲۵۷۷)۔

کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ جو مصلحت کسی دوسرے فعل کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو اس کا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ سوائے اس صورت کہ کوئی دوسرا اس فعل کے کرنے پر مدد کرے؟ جیسا کہ جمعہ کی نماز صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب امام موجود ہو اور جمعہ پڑھنے والی کی مطلوبہ تعداد پائی جاتی ہو۔ کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر دوسرے لوگوں کے اور بغیر امام کے اکیلا ہی جمعہ پڑھنا شروع کر دے۔ اور حج جو کہ اس انسان پر واجب ہوتا ہو جس کے لیے ایسے ساتھی کا ہونا ضروری ہو جس کی معیت میں وہ پرامن ہو۔ یا پھر اس کے ساتھ اس کے لیے کرایہ کی سواری کا بندوبست کرے۔ اگر ان امور کو بجالانے والا فرد میسر نہ ہو تو حج واجب نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جب ظلم کا ختم کرنا انصار و مددگار کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس اکیلے انسان پر ظلم سے دفاع کرنا واجب نہیں ہو جاتا۔

اگر وہ کہیں کہ: ”بیشک اللہ تعالیٰ پر اپنے بندوں کے لیے ان مصلحتوں کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے جو کہ معصوم کے پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہیں؛ اور یہ مصلحتیں اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتیں جب تک اس امام کی اطاعت کرنے والے موجود نہ ہوں۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے اطاعت گزار بنادے۔ تو پھر معصوم کو پیدا کرنا بھی اس پر واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے بغیر واجب پورا نہیں ہو سکتا، وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اور اکیلے امام معصوم سے یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ کہیں کہ: ”اللہ کو پیدا کرنا چاہیے شاید کہ کچھ لوگ اس کی اطاعت کر لیں۔“

جواب: ان سے کہا جائے گا یہ اس کے لیے ممنوع ہے جو عاقبت امور کو جانتا ہے۔ نیز ان سے یہ بھی کہا جائے گا: ”جب مطلوب کی شرط کبھی حاصل ہوتی ہو اور کبھی حاصل نہ ہوتی ہو؛ اور یقیناً غالب اوقات میں یا اکثر و بیشتر اوقات میں یہ حاصل نہیں ہوتی؛ تو پھر ممکن ہے وہ [ایسے] غیر معصوم کو پیدا کرے جو اکثر اوقات یا بعض اوقات میں عدل و انصاف کرنے والا ہو۔ اس لیے کہ جو اکثر اوقات میں عدل و انصاف کرتا ہو اور بعض اوقات میں ظلم کرتا ہو؛ اور جب اس کے وجود کی مصلحت اس کے فساد سے زیادہ ہو؛ [اس کا ہونا] اس امام کے ہونے سے بہتر ہے جو کسی بھی حال میں کبھی بھی انصاف نہ کر سکتا ہو؛ اور نہ ہی کسی سے ظلم کو ختم کر سکتا ہو؛ اس لیے کہ اس امام کے ہونے میں کسی طرح کی بھی کوئی مصلحت نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ پر معصوم کو پیدا کرنا واجب تھا، وہ اس نے کر دیا۔ مگر لوگوں نے اس کی نافرمانی کر کے اس مصلحت کو پورا نہ ہونے دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ لوگ مصلحت کی تحصیل کے سلسلہ میں امام معصوم کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، بلکہ نافرمانی کر کے عذاب میں مبتلا ہوں گے تو اس کا پیدا کرنا واجب نہ ہوا۔ اور نہ اس میں کچھ حکمت و مصلحت مضمر ہوئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے نافرمان نہیں بخلاف ازیں کچھ لوگ نافرمانی کرتے ہیں اور بعض اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں، پھر وہ ان لوگوں کو اطاعت کی توفیق کیوں نہیں دیتا۔

اور اگر وہ کہیں کہ: ”ان ظالموں نے لوگوں کو اس کی اطاعت سے روک کر رکھا۔“

ان سے کہا جائے گا: جب اللہ تعالیٰ ظالموں کو روکنے پر قادر تھا تو پھر انہیں ان کے اس عمل سے روکا کیوں نہیں؟ اور اگر

اس کے اختیار و قدرت میں نہیں تھا؛ اور اسے علم تھا کہ مصلحت کا حصول اس کی قدرت سے باہر ہے تو پھر اسے چاہیے تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو پھر اس تقدیر کی بنا پر آپ کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ: اس کے لیے نبی کے علاوہ غیر معصوم کا پیدا کرنا اس کے اختیار میں تھا؟ یہ قول ان کے ساتھ لازم ہے۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال پیدا کرنے والا ہے؛ تو پھر اس کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ظلم کے دواعی کو ختم کرے تاکہ لوگ اس کی اطاعت کرنے پر قادر ہو جائیں۔

اور اگر کہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ "تو اس وقت کہا جائے گا کہ: "عصمت اس وقت ہوتی ہے جب فاعل نیکیاں چاہتا ہو اور برائیوں کا اس کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ جب وہ آپ کے نزدیک کسی ایک کا ارادہ تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے تو پھر کسی کو معصوم بنانے پر بھی قادر نہیں ہے۔

یہ بذات خود مخلوق میں سے کسی ایک کو معصوم پیدا کرنے کے نظریہ کے بطلان کی دلیل ہے۔ قدریہ کے قول کے مطابق عصمت اس وقت ہو سکتی ہے جب انسان کا ارادہ صرف نیکیوں کا ہو؛ اسے برائیوں کا خیال تک نہ آئے۔ جب وہ خود ہی ارادہ کا پیدا کرنے والا ہے؛ قدریہ کے ہاں اللہ تعالیٰ کسی کے ہاں ارادہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؛ تو پھر کسی کو معصوم بنانا بھی ممتنع ہوا۔ اور اگر وہ کہیں کہ: "وہ ایسا پیدا کرتا ہے جس کا ارادہ خیر کی طرف مائل ہو۔"

جب اس طرح کی راہ موجود ہو تو پھر تکلیف کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی راہ پناہ موجود نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا کرنا تمہارے نزدیک اس کے اختیار میں تھا تو اس نے تمام لوگوں کے لیے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ ایسا کرنا تمام لوگوں کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ بندوں کی بہتری کے لیے تخلیق کرے۔ ایسا کرنے سے تمہارے ہاں ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اس طرح کا فعل تمہارے نزدیک امام کے حق میں ممتنع نہیں ہے۔

نویں وجہ: عصمت ائمہ کا مسئلہ اس لیے بھی درست نہیں کہ شہر کی اصلاح کے لیے جس قدر ایک ناظم و مدبر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی بذات خود اپنے بدن کی اصلاح کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو معصوم پیدا نہیں کیا تو اس پر معصوم رکھیں کو پیدا کرنا کیوں کروا جب ٹھہرا؟

اور اس کے ساتھ ہی انسان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے باطن میں کفر چھپائے رکھے یا باطن میں نافرمان ہو اور ظلم و فساد اور بہت سارے امور میں منفرد ہو مگر امام یہ باتیں نہ جانتا ہو۔ اور اگر امام کو پتہ بھی چل جائے تو ان کے ازالہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اگر یہ [یعنی لوگوں پاکیزہ و معصوم باطن پیدا کرنا] واجب نہیں ہے تو پھر کوئی دوسری چیز کیسے واجب ہو سکتی ہے؟

دسویں وجہ: ایک سوال یہ بھی ہے کہ معصوم کو پیدا کرنے کا مقصد آیا دنیا سے فساد کو ختم کرنا ہے یا کم کرنا؟ یا یہ کہ انسان ان ائمہ کے ساتھ فساد سے دور تر اور اصلاح کے قریب تر ہوتا ہے؟ یعنی اگر امام معدوم ہو جائیں تو کوئی ان کے قائم مقام نہ ہو؟ یا پھر یہ مقصود ہے کہ ایسی اصلاح ہو جائے جس کے ساتھ فساد کا کوئی وجود باقی نہ رہے؟ یا پھر ایک خاص مقدار میں اصلاح مقصود ہے؟ اگر ختم کرنا مقصود ہے تو دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا اور اگر فساد کی تسکین مقصود ہے تو یہ کام معصوم کے بغیر بھی اکثر حکمرانوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ مقصود حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں اس فساد میں جو کمی آئی تھی وہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں رونما نہیں ہوئی۔ اسی طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء دور میں جو اصلاح ہوئی وہ بارہ ائمہ کے وجود سے بہت بڑھ کر تھی۔ اس طرح کی اصلاح روم ترک اور ہند کے بادشاہوں کے ہاتھوں بھی ہوتی ہے جو کہ امام غائب المنتظر کے ہاتھ پر ہونے والی اصلاح سے بہت زیادہ اور بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی حاکم ایسا نہیں ہوتا جس کو اگر معدوم مان لیا جائے تو اس کے نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہونے والا فساد اس کے وجود سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ لیکن ایسے ہو سکتا ہے کہ اس حاکم کی نسبت کسی دوسرے میں اصلاح کا پہلو بہت زیادہ ہو۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

”ظالم امام کے زیر تسلط ساٹھ سال بسر کرنا ایک رات بدوں امام و حاکم گزارنے سے بہتر ہے۔“

اگر شیعہ یہ کہیں کہ: ”وجود امام سے ایسی اصلاح مقصود ہوتی ہے جس کے ساتھ کوئی فساد باقی نہ رہے۔“

تو ان سے کہا جائے گا: ”ایسا کبھی بھی نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی ایسا پیدا نہیں کیا۔ اور نہ ہی ایسے اسباب پیدا کئے ہیں جو اس کو لامحالہ طور پر واجب کریں۔ جس اس کو واجب کہتا ہے، وہ اس کے لوازمات کو اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دیتا ہے۔ ایسا کہنا یا تو اس کے عقل میں فساد کی وجہ سے ہے؛ یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی مذمت کرنا چاہتا ہے۔ اور ایسی مخلوق کو پیدا کرنا جس کے وجود کے ساتھ یہ سب ممکن ہو؛ صرف اس طرح سے حاصل نہیں ہو سکتا؛ جب تک وہ اسباب نہ پیدا کر دیئے جائیں۔ اس کی مثال افعال عباد میں بیان کی جاسکتی ہے۔ لیکن معصوم کے بارے میں کوئی بات کہنا بہت خطرناک ہے۔ اس لیے کہ امام کی مصلحت اس کی قدرت سے خارج کے اسباب پر موقوف ہے۔ صرف یہی نہیں؛ بلکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھی باہر ہے۔ یہ حقیقت میں رافضیوں کے معتزلی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ان چیزوں کو واجب کرنے کا عقیدہ ہر انسان کے لیے اس کی مصلحت پیدا کرنے کے عقیدہ سے بڑھ کر فاسد ہے۔

گیارہویں وجہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”اگر امام معصوم نہ ہو تو کسی اور امام کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس لیے کہ حاجت امام کی علت امت کے لیے خطا واقع ہونے کا جواز ہے۔ اگر یہ کہیں کہ امام سے بھی خطا ہو سکتی ہے تو پھر ایک ایسے امام کی ضرورت پڑے گی جو خطا سے پاک و صاف ہو۔“

جواب: ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: ایسے کہنا کیوں جائز نہیں ہو سکتا کہ جب امام سے غلطی صادر ہو تو امت کا کوئی فرد اس کی اصلاح کر دے، تاکہ سب لوگوں کا غلطی پر جمع ہونا لازم نہ آئے۔ جس طرح رعیت کا کوئی فرد غلطی کر رہا ہو تو امام یا اس کا نائب یا ان کا کوئی دوسرا فرد اس کی اصلاح کرتا ہے۔ ایسے ہی جب امام یا اس کے نائب سے غلطی ہو جائے تو امت کا کوئی فرد ان کی اصلاح پر تنبیہ کر دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ گناہ سے بچ جاتے ہیں اور اس پر جمع نہیں ہوتے؛ نہ کہ امت کا ہر ایک فرد معصوم ٹھہرتا ہے؛ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ خیر متواتر میں ایک ایک کر کے ہر شخص کے بارے میں کذب و خطا کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک فرد جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہو۔ مگر بہ حیثیت مجموعی عادیہ احتمال باقی نہیں رہتا۔ ایسی ہی مثال چاند دیکھنے والوں یا دیگر دقیق اشیاء میں غور کرنے والوں کی ہے۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے غلطی ہو جائے۔ مگر ان سب لوگوں کا غلطی پر اجماع ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے ہی حساب اور ہندسہ [انجینئرنگ] کے امور میں غور و فکر کرنے

والوں کا حال ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے ایک یا دو مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہوتا ہے۔ مگر جب کسی فن کے ماہرین کی بڑی تعداد کسی مسئلہ پر جمع ہو جائے تو عاداتاً ان سے غلطی کا امکان باقی نہیں رہتا۔

یہ بات سمجھی جانتے ہیں کہ: جب کسی قوم کا ایک بات پر اتفاق ہو جائے، ان کے لیے عصمت ثابت کرنا عقل اور وجود کے زیادہ قریب تر ہے بہ نسبت ایک انسان کے لیے اس کے اثبات کے۔ جب ایک [اہل علم و فن] بڑی تعداد کا جب کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے؛ اور ان کے لیے عصمت کا حصول ممکن نہ ہو، تو پھر یہ زیادہ مناسب ہے کہ اکیلا آدمی بھی معصوم نہ ہو۔ اور اگر فرد واحد کے لیے عصمت کا حصول ممکن ہے تو پھر اس جیسے لوگوں کی جماعت اور ایک بڑی تعداد کے لیے عصمت کا حاصل ہونا زیادہ اہم ہے۔

بنا بریں بہ حیثیت مجموعی پوری امت کو معصوم قرار دینا ایک شخص کو معصوم قرار دینے سے بہتر ہے، اس سے عصمت امام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور امام کو معصوم قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

رافضی جہالت کا ثبوت:

رافضی کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ ان کے خیال میں سب اہل اسلام غلطی پر ہو سکتے ہیں جب ان میں ایک معصوم امام نہ ہو، مگر ایک شخص کا غلطی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ صریح معقول اس بات کا گواہ ہے کہ جب بڑی تعداد میں علماء اپنے اجتہادات میں اختلاف کے باوجود کسی بات پر جمع ہو جائیں تو اس بات کا درست ہونا؛ فرد واحد کی رائے سے زیادہ قریب تر ہوتا ہے۔ اور جب خبر واحد سے علم کا حصول ممکن ہے تو پھر متواتر خبر سے علم کا حصول زیادہ اولیٰ ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ: عام مصالح میں امام لوگوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس طرح کے اگر وہ اکیلا ہو تو ان امور کو بجالانے پر قادر نہ ہو سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اس کام میں شریک ہو۔ امام کے لیے حدود کا قائم کرنا، لوگوں کے حقوق کا ادا کرنا؛ لوگوں سے اپنا حق وصول کرنا ان کی مدد کے بغیر ممکن نہیں؛ اور نہ ہی اس کی معاونت کے بغیر دشمن سے جہاد ممکن ہے؛ بلکہ امام کے لیے باجماعت نماز ادا کرنا یا جمعہ پڑھنا بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ لوگ نماز نہ پڑھیں۔ اور نہ ہی عام لوگوں کے لیے امام کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے جب تک اس کے اعوان و انصار اس کا ساتھ نہ دیں۔ جب یہ لوگ ارادہ و قدرت میں امام کے ساتھ شریک ہیں تو پھر وہ ان سے منفرد نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی علم و رائے میں بھی یہ واجب نہیں ہو سکتا کہ امام منفرد ہو؛ بلکہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جیسا کہ امام اپنے اختیارات کے استعمال میں ان لوگوں کی مدد کے بغیر عاجز آ جاتا ہے؛ ایسے ہی اسے اپنے علم میں بھی دوسرے لوگوں کی معاونت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بارہویں وجہ: وہ دینی علم جس کی ائمہ اور امت کو ضرورت ہوتی ہے؛ اس کی دو قسمیں ہیں: علم کلی؛ جیسے پانچ نمازوں کی فرضیت؛ ماہ رمضان کے روزے؛ زکوٰۃ اور حج؛ زنا، چوری؛ اور شراب کا حرام ہونا اور اس طرح کے دیگر مسائل۔

علمی جزئی؛ جیسا کہ فلاں انسان پر حد واجب ہوتی ہے؛ اور فلاں انسان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؛ وغیرہ۔ پہلی قسم: بیان شریعت اس قسم میں مستقل ہے۔ اس کے لیے کسی امام کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے یا

تو کلیات شریعت کو نص کے ساتھ بیان کر دیا ہے یا پھر کہیں پر جہاں قیاس کی ضرورت تھی؛ وہاں ویسے چھوڑ دیا ہے۔ اور اگر اس کا تعلق پہلی قسم سے ہے تو مقصود حاصل ہو گیا؛ اور اگر دوسری قسم سے ہے تو قیاس سے حاصل ہو جائے گا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: آپ ﷺ نے ایسے امور کا بیان ترک کر دیا ہے جو نہ نص سے معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی قیاس سے۔ بلکہ وہ صرف امام کے قول سے معلوم ہو سکتے ہیں؛ تو [اس سے لازم آتا ہے کہ] یہ امام نبوت میں شریک ٹھہرا پھر نائب باقی نہ رہا۔ اس لیے کہ جب امام نبی کریم ﷺ سے بغیر کسی سند کے لوگوں پر احکام کو واجب کرے، اور ان پر حرام و حلال ٹھہرائے تو یہ خود مستقل شارع ہوا؛ پیغمبر کا اتباع کار نہ رہا۔ اب یہ صرف نبی ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جو نبی کا خلیفہ یا نائب ہو وہ مستقل شارع نہیں ہوا کرتا۔

ایسے ہی جب قیاس حجت ہے تو لوگوں کو اسکا حوالہ دینا جائز ہے۔ اور اگر یہ حجت نہیں ہے تو بھر نبی کریم ﷺ پر واجب ہوتا تھا کہ آپ کلیات میں اس کو بیان کرتے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [البائدہ ۳۱]

”آج کے دن ہم نے آپ کے لیے آپ کا دین مکمل کر دیا، اور آپ پر اپنی نعت پوری کر دی، اور آپ کے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔“

یہ واضح نص ہے کہ دین اسلام مکمل ہے اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کی کوئی ضرورت نہیں۔

جب جزئیات کے ہر ایک مسئلہ پر نص کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اجتہاد کا ہونا ضروری ہے تاکہ شرعی احکام کو اس کے ساتھ ملایا جائے۔ مثال کے طور پر شارع کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان کو جا کر بتائے کہ اس کا قبلہ کس طرف بنتا ہے۔ اور حاکم ہر گواہ کی عدالت کے متعلق نہیں بتا سکتا۔ اس کی مثال اور بھی ہیں۔

اگر ان کا دعویٰ ہو کہ امام جزئیات میں معصوم ہے تو یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ اور حقیقت کا انکار ہے۔ اس کا دعویٰ کسی ایک نے بھی نہیں کیا۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو بھی نائب مقرر کیا تھا جن سے خیانت و عاجزی ظاہر ہوئی تھی۔ آپ نے دو آدمیوں کی گواہی کی بنیاد پر ایک آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا۔

پھر وہ گواہ کہنے لگے: ہم سے غلطی ہو گئی۔

تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ پتہ چل جائے کہ تم دونوں نے جان بوجھ کر اس کے خلاف ایسا کیا ہے، تو میں تمہارے ہاتھ کاٹ دیتا۔

یہی معاملہ نبی کریم ﷺ کا تھا۔ آپ نے فرمایا:

”تم اپنا جھگڑا میرے پاس لاتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو دوسرے سے عمدہ طریقے سے بیان

کرنے والا ہو اور میں اس کے لیے فیصلہ کر دوں اس بات پر جو میں نے اس سے سنی پھر میں جس کے لیے اس کے

بھائی کا حق دلا دوں تو اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لیے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“ ❶

اہل خیر کے کچھ لوگوں نے اہل شر بنوا بیرق کے لوگوں پر دعویٰ کیا کہ انہوں نے ہمارے غلہ اور اسلحہ کی چوری کی ہے۔ یہ

لوگ آئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس اپنی برأت کا اظہار کیا؛ نبی کریم ﷺ نے ان کو سچا خیال کیا؛ مگر فوراً ہی یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ بِالْحَقِّ لِنُحْكِمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَىٰكَ ۚ أَلَمْ تَكُنْ لِلْغَايِبِينَ خَصِيمًا ۚ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۚ وَلَا تَجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا﴾ [النساء ۱۰۵-۱۰۷]

”یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا، مہربانی کرنے والا ہے۔ اور ان کی طرف سے جھگڑانہ کرو جو خود اپنی ہی خیانت کرتے ہیں، یقیناً دعا باز نہ گہرا اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا۔“^۱

جملہ طور پر امور کی دو قسمیں ہوتی ہیں: کلیہ عامہ کلیہ خاصہ۔

جزئیات خاصہ میں سے وہ جزئیہ بھی ہے جس میں کسی دوسرے کے شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر کسی خاص میت کی میراث؛ اور کسی خاص گواہی کی دینداری اور شرعی عدالت؛ فلاں بیوی کے اخراجات۔ اس شوہر سے طلاق کا واقع ہونا۔ فسادِ انسان پر حد کا قیام وغیرہ۔

ان امور میں کسی نبی یا ولی یا کسی امام کے لیے ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان کے متعلق حکم بیان کیا جائے۔ اس لیے کہ بنی آدم کے ہر ایک انسان اور اس کے جزئی مسائل کی معرفت حاصل کرنے سے ہر ایک عاجز ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر فرد کے ساتھ پیش آنے والے احکام کی معرفت حاصل کر سکے۔ بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ انسان کلیات کا علم حاصل کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں جامع کلمات دیکر مبعوث کیا گیا ہوں۔“

[البخاری ۵۴/۴ - مسلم ۱/۳۷۱]

امام کے لیے تمام رعیت کے لیے حکم بغیر عام قضایا کلیات پر انحصار کیے حکم جاری نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی قاعدہ کلیہ کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کسی کو نواب مقرر کیا جائے؛ یا کسی کو ولی عہد بنایا جائے۔ پھر اعیان کو ان ہی کلیات کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ یا کسی خاص کو عام کے تحت میں داخل کیا جاتا ہے۔ جس میں نظر و اجتہاد ضروری ہوتا ہے؛ جس میں کبھی مجتہد سے اصابت رائے ہوتی ہے؛ اور کبھی وہ غلطی بھی کر جاتا ہے۔

اگر ان میں ہر ایک کے لیے عصمت کی شرط رکھی جائے؛ تو نواب کو پھر ان اعیان میں بھی عصمت کی شرط رکھنی پڑے گی۔ اس کے منقشی ہونے پر تمام عقلاء کا اتفاق ہے۔

اگر کلیات پر اکتفاء کیا جائے؛ تو نبی کریم ﷺ کے لیے ممکن ہے کہ وہ آپ کلیات کے متعلق حکم جاری فرمائیں۔ جیسا

① صحیح مسلم: ج ۲: ح ۱۹۸۱۔

② جامع ترمذی: ج ۲: ح ۹۸۵۔

کہ ہمارے نبی کریم ﷺ شریعت لے کر آئے ہیں۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عورتوں میں سے کون سی حلال ہیں اور کون سی حرام ہیں۔

کسی انسان کی قریبی رشتہ دار عورتیں اس پر حرام ہیں سوائے چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد لڑکیوں کے۔ ان کا ذکر قرآن مجید کی سورت احزاب میں آیا ہے۔

ایسے ہی پینے کی چیزوں میں سے ہر وہ چیز حرام ہے جس کے نوش کرنے سے نشہ آتا ہو۔ جس سے نشہ نہ آتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے محرمات کو ان آیات میں بیان کیا ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [الأعراف ۳۳]

”آپ فرمادیجئے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو اعلانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اس بات کو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات نہ لگا دو جس کو تم جانتے نہیں۔“
پس یہاں پر جو کچھ بھی حرام ذکر کیا گیا ہے، وہ مطلق طور پر حرام ذکر کیا گیا ہے؛ یہ کسی حال میں بھی حلال نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خنزیر یا خون، مردار کا حکم ہے۔

تمام واجبات کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّيَ بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾

”فرمادیجئے: میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا اور یہ کہ تم ہر جگہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خاص اللہ ہی کے واسطے رکھو۔“ [الأعراف ۲۹]

پس تمام تر واجبات حقوق اللہ اور حقوق العباد میں محصور ہیں۔ اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ صرف اس ایک اللہ کی بندگی کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور بندوں کے حقوق اس کا عدل ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

حضرت معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ آپ نے فرمایا:

”اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو، اس کو عذاب نہ دے۔“^①

پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے مواقع پر فحاشی، گناہ، اور حقوق العباد کی اقسام بیان کی ہیں۔ پس وراثت کے احکام کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ کون وراثت کا مستحق ہے اور کون اس کا مستحق نہیں ہے۔ اور وارث کی وراثت کی حیثیت کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا کہ کون سے نکاح جائز ہیں اور کون سے نکاح ناجائز ہیں۔

اگر نصوص کلیہ اس کی تمام انواع کو شامل ہیں، تو رسول اللہ ﷺ امام کی بہ نسبت اس کے بیان کے زیادہ حق دار ہیں اور اگر ایسا کرنا ممکن نہیں تو امام رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر بے بس ہیں۔ معین محرمات پر نصوص کے ہونے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے لیے ایسا ممکن تھا؛ اور نہ ہی امام کے لیے۔ بلکہ ان میں اجتہاد کیا جانا ہی لازمی تھا۔ اور مجتہد صحیح فیصلہ بھی کرتا ہے اور کبھی اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب حاکم کسی چیز میں اجتہاد کرے اور حق کو پالے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اور جب اجتہاد کرے اور حق کو نہ پاسکے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔“ ❶

رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے موقع پر جب ایک خاص معاملہ میں فیصلہ کرنے کا وقت تھا، تاکہ زیادہ مناسب فیصلہ کیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ ان کے لڑنے والوں کو قتل کر دیا جائے؛ اور بچوں اور عورتوں کو قیدی بنالیا جائے؛ تو [آپ نے] فرمایا: ”آپ نے سات آسمانوں کے اوپر اللہ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔“ ❷

جب رسول اللہ ﷺ کسی سریہ یا لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کے امیر کو نصیحت فرمایا کرتے تھے:

”جب تم کسی قلعہ والوں کو محاصرہ کر لو اور وہ قلعہ والے یہ چاہتے ہوں کہ تم انہیں اللہ کے حکم کے مطابق قلعہ سے نکالو تو تم اللہ کے حکم کے مطابق نہ نکالو بلکہ انہیں اپنے حکم کے مطابق نکالو کیونکہ تم اس بات کو نہیں جانتے کہ تمہاری رائے اور اجتہاد اللہ کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں۔“ ❸

اس سے واضح ہوا کہ امام کے لیے کوئی ایسی عصمت نہیں ہے جو اس سے پہلے رسول کے لیے موجود نہ ہو۔ ولسلہ الحمد والممنہ، واقعات اس کے موافق ہیں۔

بیشک ہم دیکھتے ہیں جو کوئی بھی اتباع سنت اور اتباع صحابہ کے قریب تر ہوتا ہے؛ اس کی دین و دنیا کی مصلحتیں زیادہ کامل ہوتی ہیں۔ اور جو کوئی بھی کتاب و سنت سے دور ہوتا ہے؛ وہ مصلحت کے حصول سے بھی اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ شیعہ لوگوں میں سے اس معصوم کی اتباع سے سب سے زیادہ دور ہیں جس کے معصوم ہونے میں کوئی شک نہیں؛ اور وہ معصوم ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے دین حق اور ہدایت دیکر ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر مبعوث فرمایا؛ جنہوں نے کتاب اللہ کے ذریعہ لوگوں کو کفر و گمراہی کے اندھیروں سے ہدایت اور صراط مستقیم کی طرف نکالا۔ حق اور باطل؛ ہدایت و گمراہی؛ ناکامی و کامیابی؛ نور و ظلمت؛ اہل شقاوت و اہل سعادت کے درمیان تفریق کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقسیم کرنے والا بنایا تھا؛ جنہوں نے اس کے بندوں کو نیک بخت اور بد بخت دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ سعادت مند وہ ہیں جو آپ پر ایمان لائے۔ اور بد بخت وہ ہیں جنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کی اطاعت سے روگردانی کی۔

شیعہ جو امام معصوم کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں؛ وہ حقیقی معصوم کی اتباع سے کوسوں دور ہیں۔ تو پھر یقینی طور پر آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ دینی اور دنیاوی ہر مصلحت کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے زیادہ محروم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ دیکھیں

❶ البخاری ۱۰۸/۹ - مسلم ۱۳۴۲/۳

❷ البخاری ۶۴/۴ - مسلم ۱۳۸۳/۳

❸ صحیح مسلم ۱۳۵۶/۳

گے کہ یہ لوگ دنیا کے ظالم ترین اور گمراہ ترین بادشاہوں کی سیاست کے زیر اثر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ اور ان کے لیے خیر صرف ان لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو ان میں سے نہیں ہوتے [یہ خود صرف شر کے پتلے ہیں]۔

اسی وجہ سے شیعہ اپنے بہت سارے احوال میں یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک مشابہت کا عنصر یہ بھی ہے کہ یہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی ہے؛ [فرمان الہی ہے:]

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَفْتَحُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَ حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَ بَاءٌ وَ بَغْضٍ مِنَ اللَّهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ [آل عمران ۱۱۲]

”ان کو ہر جگہ ذلت کی مار پڑی الایہ کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ یا لوگوں کی پناہ میں ہوں یہ غضب الہی کے مستحق ہو گئے اور ان پر فقری ڈال دی گئی۔“

یہ صرف اسی صورت میں زمین میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ بعض ایسے حکمرانوں کی پناہ میں رہتے ہیں جو خود معصوم نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے یہ لازمی طور پر اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے کے لیے زبان سے ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتیں۔ جو کچھ کتاب و سنت لے کر آئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ ہم پر پورے عالم میں اور خود ہمارے اندر اپنی نشانیاں ظاہر کر رہا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ﴾ [فصلت ۵۳]

”عقرب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔“

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی نشانیاں دیکھائی ہیں، ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو حقیقت میں امام معصوم ہیں؛ کے سچے پیروکار مصلحت دینی اور دنیاوی حصول کے اعتبار سے بزع خود اس امام کی طرف نسبت رکھنے والوں سے بہترین حال میں ہوتے ہیں۔ اگر ان کا خیال یہ ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والے ہیں تو یہ جان لینا چاہیے کہ شیعہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور سنن سے جا مل اور لابلہ ہوتے ہیں۔ پورے عالم پر نظر دوڑانے والا انسان اس بات کا ادراک کر سکتا ہے۔ اور اس بارے میں ہم سے ان ثقہ لوگوں نے بھی بیان کیا ہے جنہیں جہاں بھر کی خبریں ہوتی ہیں، اور وہ دنیا کے بسنے والوں کے احوال پر نظر رکھتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ: بلاد حجاز اور شام کے ساحلی علاقوں میں ایسے رافضی پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کا حال دیکھا ہے جو شام کے ساحلی علاقوں پر رہا کرتے تھے؛ مثلاً جبل کسروان کے رہنے والے۔ اور ہم تک ان لوگوں کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ ہم نے ان سے بڑھ کر دینی اور دنیاوی لحاظ سے بد حال فرقہ کوئی اور نہیں دیکھا۔ اور یہ بھی دیکھا ہے کہ جن حکمرانوں کے زیر سایہ وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں وہ علی الاطلاق ان سے کئی درجہ بہتر ہوتے ہیں۔

جو لوگ کافر حکمرانوں کے زیر سایہ رہتے ہوں، ان کی حالت لحدین، نصیریہ، اور اسماعیلیہ وغیرہ سے بہتر ہوتی ہے جو رسول

اللہ ﷻ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے الوہیت اور نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ہر وہ گروہ جو اہل سنت بادشاہوں کے زیر سایہ رہا ہے؛ بھلے وہ بادشاہ وین و دنیا کے اعتبار سے ظالم ترین بادشاہ ہو مگر اس کی رعیت کی حالت دوسرے لوگوں کی نسبت سے بہتر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جو بات اہل سنت کے مابین مشترک ہے اور جس کی وجہ سے اہل سنت اہل رفض سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن امور پر وین و دنیا کی مصلحتیں منحصر ہیں اس کی کئی وجوہات ہیں۔

وہ معاملہ جو رافضیوں کے مابین مشترک ہے اور اہل سنت اس سے ممتاز ہیں اس پر نہ ہی کسی شہر کی کوئی مصلحت منحصر اور نہ ہی گاؤں کی؛ اور کسی گاؤں یا شہر کے رہنے والوں کو آپ ایسا نہیں پائیں گے جن پر رافضیت غالب ہو؛ مگر وہ اپنی بقاء و قیام کے لیے دوسرے لوگوں کا سہارا لیکر چلتے ہیں خواہ یہ دوسرے لوگ اہل سنت مسلمان ہوں یا پھر کوئی کافر۔

صرف اکیلے رافضی اپنی بقاء کو ہرگز قائم نہیں رکھ سکتے۔ جیسا کہ یہودی اکیلے اپنے معاملات نہیں نبھاسکتے۔ بخلاف اہل سنت والجماعت کے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے بہت سارے شہر و ملک آباد ہیں جن کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ ہی کسی کافر کا محتاج کیا ہے اور نہ ہی کسی رافضی کا۔

خلفاء ثلاثہ نے ملکوں کے ملک اور شہروں کے شہر فتح کیے؛ مشرق و مغرب میں اسلام کا جھنڈا لہرایا؛ ان کے ساتھ کوئی رافضی نہیں تھا۔ ان کے بعد بنو امیہ آئے۔ باوجود اس کے کہ ان میں سے بہت سارے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منحرف ہو چکے تھے اور ان میں سے بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کرتے تھے؛ مگر وہ مشرق و مغرب کے تمام اسلامی شہروں پر غالب آ گئے تھے۔ بعد میں آنے والے زمانہ کی نسبت سے ان کے دور میں اسلام بہت ہی معزز و غالب تھا۔ بنو امیہ کا دور ختم ہونے کے بعد ایسا اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔ جب بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی اس وقت عبدالرحمن بن ہشام الداخل بلاد مغرب کی طرف چلا گیا۔ جسے قریش کا شاہین کہا جاتا ہے۔ اس نے مغرب میں اپنا قبضہ جمالیا اور وہاں پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اپنے گرد و نواح کے کفار کا قلعہ قمع کیا۔ دین و دنیا میں ان کی سیاست لوگوں میں بہت معروف رہی ہے۔

یہ لوگ اہل عراق کے مذہب سے بہت دور تھے۔ چہ جائے کہ شیعہ کے اقوال کو قبول کرتے۔ اہل مغرب اہل مدینہ کے مذہب پر عمل کرتے تھے۔ اہل عراق اور اہل شام امام اوزاعی کے مذہب پر تھے۔ یہ لوگ اہل حدیث کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اور بہت سارے امور میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ شیعہ کے مذہب سے سب سے دور رہتے تھے۔ ان میں بہت سارے لوگ ہاشمی اور حسینی بھی تھے۔ ان میں سے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے مطابق وہاں کے عمال اور امراء بھی متعین ہوئے۔

ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں سکوت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں امت کا ایک خلیفہ پر اجتماع نہیں ہو سکا۔ اور آپ کو گالی بھی نہیں دیتے تھے جیسے بعض شیعہ کرتے ہیں۔ بعض اہل مغرب علماء نے فتوحات پر بڑی بڑی کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدین ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی فتح کا ذکر نہیں ملتا؛ حالانکہ

وہ لوگ آپ سے محبت اور دوستی رکھتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کے زمانے میں کوئی نئی فتح نہیں ہوئی۔

تمام علماء اہل سنت والجماعت؛ امام مالک اور ان کے ساتھی؛ امام اوزاعی اور ان کے ساتھی؛ امام شافعی اور ان کے ساتھی؛ امام احمد بن حنبل اور ان کے ساتھی؛ امام ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی؛ اور ان کے علاوہ دیگر علماء کرام رضی اللہ عنہم؛ یہ تمام ان خلفاء سے محبت کرتے اور ان سے دوستی رکھتے تھے۔ اور ان کے خلفاء برحق ہونے کا ایمان رکھتے تھے۔ اور جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرتا تو اس پر رد کیا کرتے تھے۔ یہ تمام حضرات خوارج اور روافض کی طرح صحابہ میں سے کسی ایک کو نہ ہی حضرت علی اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو برائی کے ساتھ یاد کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔

پھر خوارج اور روافض کے کچھ گروہ مغرب میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ یہ لوگ پہلے سے مشرق میں اور بہت سارے اسلامی شہروں میں موجود تھے۔ لیکن ان شہروں کی اساس ان لوگوں کے مذہب پر قائم نہیں ہو سکی۔ بلکہ اگر کسی وقت تھوڑے سے عرصہ کے لیے اگر ان لوگوں کا غلبہ بھی ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے دین محمد ﷺ کے سچے پیروکاروں کو کھڑا کیا؛ جنہوں نے دین حق کا پھر برپا کیا؛ اور باطل کو بیوند زمین کر کے چھوڑا۔

بنو عبید شیعیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ لوگ مغرب کے کچھ علاقوں پر غالب آ گئے؛ اور وہاں پر امام بارگاہیں قائم کیں۔ پھر وہاں سے مصر کی طرف آئے۔ اور وہاں پر دو سو سال تک غالب رہے۔ ایسے ہی ایک سو سال تک حجاز اور شام پر غالب رہے۔ بسا سیری فتنہ کے وقت بغداد پر غالب آ گئے۔ ان کے ساتھ زمین کے مشرق و مغرب سے دیگر ملحدین بھی مل گئے۔ اہل بدعت و ضلال بھی جو کہ ان سے محبت کرتے تھے؛ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے لگے۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ ہمیشہ اہل سنت والجماعت کے محتاج رہے۔ ان کی حرفہ گری کے حاجت مندر ہے؛ اور ان کے ساتھ تقیہ سے پیش آتے رہے۔

رافضیوں کا راس المال تقیہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے باطن کے خلاف ظاہر کیا جائے جیسے منافقین کرتے ہیں۔ مسلمان شروع میں انتہائی کمزور تعداد میں بہت کم تھے؛ مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنا دین چھپاتے نہیں تھے۔ رافضیوں کا خیال ہے کہ وہ اس آیت پر عمل کرتے ہیں:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ﴾ [آل عمران ۲۸]

”ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا اور اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔“

ان کا گمان ہے کہ یہی لوگ مؤمن ہیں۔ جب کہ باقی تمام اہل قبلہ کفار ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاں جمہور کی تکفیر کے بارے میں دو قول پائے جاتے ہیں۔ مگر ہم نے دیکھا ہے کہ ان کے بڑے بڑے مفتی اور ائمہ اپنی کتابوں اور فتاویٰ میں جمہور مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں مرتد کہتے ہیں۔ اور ان کے علاقے مرتدین کے علاقے ہیں۔ ان کے ہاں کی مانع چیزوں کو نجس کہتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی ان کے مذہب کو چھوڑ کر جمہور کا مذہب قبول کر لے، اور پھر اس کے بعد وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مرتد جو فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس کا اسلام کی طرف رجوع قبول

نہیں کیا جائے گا۔

اسلام سے مرتد ہونے والے کے بارے میں سلف کے کئی اقوال ہیں۔ امام احمد سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں: جو مرتد کا فر تھا؛ پھر وہ مسلمان ہو گیا؛ پھر وہ کفر کی طرف واپس لوٹ گیا؛ اس کا معاملہ اس انسان سے مختلف ہے جو مسلمان پیدا ہوا ہو۔ جب کہ شیعہ کا یہی عقیدہ پوری امت کے متعلق ہے۔ پوری امت کے لوگ شیعہ کے نزدیک کفار ہیں۔ پس جو کوئی اہل سنت کے مذہب پر چلا؛ شیعہ کے نزدیک مرتد ہو گیا۔ یہ آیت ان پر جحت ہے۔ اس آیت میں اولاً ان مؤمنین سے خطاب ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ ان سے کہا جائے گا: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:]

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران ۲۸]

”ایمان والے مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں۔“

باتفاق علماء یہ آیت مدنی ہے اس لیے کہ پوری سورت آل عمران، سورت بقرہ، سورت نساء اور سورت مائدہ مدنی ہیں۔ یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک عہد میں مدینہ میں اہل ایمان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنا ایمان چھپاتا ہو اور کافروں کے لیے ظاہر کرتا ہو کہ وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔ جیسا کہ رافضی جمہور سے کرتے ہیں۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت بعض ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو کفار کے ساتھ محبت اظہار کرتے تھے؛ اس آیت میں انہیں اس محبت سے روکا گیا ہے۔ رافضی جمہور مسلمانوں سے محبت نہیں کرتے۔ امام شحاک رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے یہودی حلفاء تھے۔ آپ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ساتھ پانچ سو یہودی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان سے دشمنی کا اظہار کروں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابو صالح روایت کرتے ہیں: عبد اللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی یہودیوں سے دوستی رکھتے ہوئے تھے اور ان تک مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے۔ اور ان کے لیے نبی کریم ﷺ پر فتح حاصل ہونے کی امیدیں لگائے رکھتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو ان منافقین جیسا برا کردار ادا کرنے سے منع کر دیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے: کچھ یہودی انصار کے ساتھ بظاہر محبت کا دعویٰ کرتے تھے تاکہ انہیں ان کے دین میں فتنہ کا شکار کر سکیں۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا؛ کہ ان یہودیوں سے بچ کر رہو؛ مگر وہ باز نہ آئے۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: ”یہ آیت حاطب بن ابی بلتعہ جیسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؛ جو کفار مکہ کیساتھ محبت کا اظہار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔“

رافضی لوگوں میں سب سے بڑھ کر اہل سنت والجماعت سے محبت کا اظہار کرتے ہیں؛ ان میں سے کوئی ایک بھی ان کے سامنے اپنے دین کا اظہار نہیں کرتا؛ بلکہ ان لوگوں نے صحابہ کرام کے فضائل اور ان کی مدح کے قصیدے یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خود رافضی اپنی جہ میں اشعار یاد کر رکھتے ہیں جن کے ذریعہ سے اہل سنت والجماعت کیساتھ محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ مؤمنین اہل کتاب اور مشرکین کے لیے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ رافضی

اس آیت پر عمل کے لحاظ سے کوسوں دور ہیں۔ رہا یہ فرمانا کہ: ﴿لَا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَّةً﴾ [آل عمران ۲۸] ”مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا۔“

مجاہد کہتے ہیں: اس سے مراد ہے تصنع کرنا۔ یہاں ”تقۃ“ سے مراد [تقیۃ کرنا] نہیں کہ میں جھوٹ بولوں، اور اپنی زبان سے وہ بات کہوں، جو کہ میرے دل میں نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ مجھے وہ کچھ کرنا چاہیے جس پر مجھے قدرت حاصل ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه،

وذلك أضعف الإيمان)) [مسلم ۱۸۶]

”جو کوئی تم میں سے برائی کی بات دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے منادے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنی زبان سے منع کرے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔“

پس جب کوئی مؤمن کفار و فجار کے درمیان رہ رہا ہو اور اس کے لیے اپنی عاجزی کی وجہ سے ہاتھ سے جہاں کرنا ممکن نہ ہو؛ لیکن اس کے لیے زبان سے منع کرنا یا دل میں برا جاننا ممکن ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے [ڈر کر] جھوٹ نہیں بولنا؛ اور زبان سے اس چیز کا اظہار نہیں کرنا جو اس کے دل میں نہ ہو۔ خواہ وہ اپنا دین ظاہر کرے یا چھپائے رکھے۔ مگر کسی بھی صورت میں ان کے دین پر موافقت نہ کرے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ آل فرعون کے اس مؤمن۔ یا فرعون کی بیوی۔ کی طرح ہو؛ یہ لوگ فرعون کے پورے دین پر اس کے ساتھ موافق نہیں تھے۔ اور نہ ہی جھوٹ بولتے تھے؛ اور نہ ہی اپنی زبان سے ایسی بات کہتے تھے جو ان کے دل میں نہ ہو۔ بلکہ وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔

اپنے دین کو چھپانا ایک اور چیز ہے؛ جبکہ باطل دین کا اظہار کرنا ایک علیحدہ چیز ہے۔ ایسا کرنے کو اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی جائز نہیں ٹھہرایا؛ سوائے اس صورت کے انسان کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے باہر مجبوری زبان سے کلمہ کفر بولنے کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق اور کمرہ [مجبور] کے مابین فرق کھول کر بیان کیا ہے۔

رافضیوں کا حال تو منافقین کے حال جیسا ہے۔ ان کا حال اس مجبور جیسا نہیں جسے کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے؛ اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ یہ اکراہ بھی تمام جمہور بنی آدم کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ انسان کافروں کے پنجے میں قید ہو؛ یا کسی جگہ بلاد کفر میں اکیلا ہو۔ [ہاں] اگر اسے کوئی کلمہ کفر کہنے پر مجبور نہ کرے؛ اور نہ ہی وہ اپنی زبان پر ایسا کلمہ لائے؛ اور نہ ہی اپنی زبان سے ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہ ہو۔ تو کبھی یہ ضرورت پیش آ سکتی ہے کہ کفار کے ساتھ نرمی سے پیش آئے؛ تاکہ وہ اسے اپنا گمان کریں؛ مگر اس کے ساتھ زبان سے خلاف دل کوئی بات نہ کہے؛ بلکہ اپنے دل میں ایمان کو چھپائے رکھے۔ جھوٹ بولنے اور بات چھپانے میں جو فرق ہے وہ صاف واضح ہے۔ چھپانا اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں کوئی چیز ہو؛ مگر وہ اس کے ظاہر کرنے میں اللہ کے ہاں معذور ہو۔ جیسے کہ آل فرعون کے مومن کا حال تھا۔ اس کے برعکس جو انسان کفر یہ کلمات کہے؛ اور اس کا عذر صرف مجبور ہونے کی صورت میں قبول کیا جائے گا۔ منافق جو

جھوٹ بولتا ہے اس کا عذر کسی بھی حال میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے [چہرہ کے] اثرات سے جھوٹ کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر جو مؤمن اپنا ایمان چھپاتا ہے وہ کفار کے مابین بود و باش رکھنے والا ہوتا ہے جہاں کے لوگ اس کے دین و ایمان کو نہیں جانتے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کا اکرام کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس انسان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے ساتھ سچائی اور امانت کا اور خیر خواہی کا معاملہ کرے۔ اور ان کی بھلائی کا خواہاں رہے۔ اگرچہ وہ ان کے دین پر ان سے موافقت نہ رکھتا ہو۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کفار مصر کے درمیان معاملات چلا رہے تھے۔ اور جیسے آل فرعون کا مؤمن اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔ مگر اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتا تھا؛ اور کہتا تھا:

﴿اتَّقَتُلُونِ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾ [غافر ۲۸]

”کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔“

رافضی کسی کے ساتھ بغیر نفاق استعمال کیے بود و باش نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اس دل میں جو دین ہے وہ انتہائی درجہ کا فاسد دین ہے۔ جو اسے جھوٹ بولنے اور خیانت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لوگوں سے دھوکہ بازی پر ابھارتا ہے۔ اور ان کے ساتھ برائی کا سبق دیتا ہے۔ یہ لوگ کسی کی دوستی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور کوئی بھی شر کا کام ایسا نہیں جس کے کرنے پر قدرت رکھتے ہوں؛ مگر اسے کر گزرتے ہیں۔ جو لوگ انہیں نہیں بھی جانتے ان کے ہاں بھی یہ لوگ عتاب کا نشان رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ نہ بھی جانتے ہوتے کہ یہ رافضی ہے؛ تب بھی اس کے چہرے پر نفاق کی علامات اور بول چال میں کجی سے معلوم ہو جائے گا [یہ کون ہے]۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ رافضی کمزور ترین لوگوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ بھی منافقت کرے گا جن کیساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس لیے کہ رافضی کے دل میں منافقت ہے جس نے اسے کمزور کر دیا ہے۔

مؤمنین ایمان کی عزت اور غلبہ میں ہوتے ہیں۔ عزت اللہ اور اس کے رسول کے لیے اور مؤمنین کے لیے ہے۔ پھر یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ہم ہی مؤمن ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کے تمام گروہوں سب سے بڑھ کر ذلت و رسوائی و رافضی میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰۤاتِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ لَاۤ اَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

”یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگی دنیا میں بھی کریں گے اور ان دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔“

رافضی اس نصرت سے اہل اسلام کے تمام گروہوں میں سب سے زیادہ حق سے دور ہیں؛ اور ذلت و رسوائی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے گروہوں میں نفاق سے قریب تر اور ایمان سے بعید تر گروہ رافضیوں کا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ حقیقت میں وہ منافق جن میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا؛ وہ طہرین ہیں؛ جو کہ رافضیوں کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اور رافضی سب سے بڑھ کر ان کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”روحیں جند مجد ہیں؛ جن کا آپس میں تعارف ہو وہ مالوف ہوں گی۔ اور جو اوپری رہیں وہ اختلاف میں رہیں۔“

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں کو ان کے دوستوں سے پہچانو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ رافضیہ اور منافقین کی روحوں کے مابین خالص اتحاد اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ اور ان کے مابین مشترکہ اقدار اور مشابہات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضیوں میں بنیادی طور پر منافقت پائی جاتی ہے۔ منافقت کی کئی ایک اقسام ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”جس شخص میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے تو سمجھ لو کہ اس میں منافق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی جب تک کہ اس کو جھوٹ نہ دے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے۔ جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔ اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر ہو جائے۔“ [صحیح مسلم: ح ۲۱۱۲]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔“ [صحیح مسلم: ح ۱۲۱۳]

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں: ”اور اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو“ اہل قبلہ میں سے یہ تین نشانیاں جس گروہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں وہ رافضیہ کا گروہ ہے۔

قرآن اس بات پر گواہی دیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی ایک مواقع پر منافقین کے غدر و خیانت اور جھوٹ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ یہ اوصاف رافضیوں سے بڑھ کر کسی دوسرے گروہ میں نہیں پائے جاتے۔ اور نہ ہی صحابہ کرام کی راہ پر چلنے والے اہل سنت والجماعت سے کوئی فرقہ اتنا دور ہے جتنا دور یہ لوگ ہیں۔ اہل سنت والجماعت شعب ایمان کے زیادہ مستحق اور نفاق سے بہت زیادہ دور ہیں۔ جب کہ رافضی ایمان کے شعبوں سے بہت زیادہ دور اور نفاق کے شعبوں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ سارے گروہوں کا یہی حال جو سنت سے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ ایمان کے اتنا زیادہ قریب ہوگا اور جو بدعت کے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ ایمان سے اتنا دور اور نفاق کے اتنا ہی قریب ہوگا۔

ان تمام باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رافضی اس امام معصوم کی اتباع سے بہت زیادہ دور ہیں جس کے معصوم ہونے میں کوئی شک ہی نہیں؛ وہ امام ہیں خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ۔ سنت کے برخلاف رافضی جن ائمہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حقیقت میں یہ ایک منافق زندیق کی پیدا کردہ بدعت ہے۔ جیسا کہ اہل علم نے اس کا ذکر کیا ہے۔

[رافضیت کا بانی کون؟]:

متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے تشیع کی بنا ڈالی اور بنا برنص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ قرار دیا وہ ایک زندیق تھا اور دین میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو پولوس نے نصاریٰ کے ساتھ کیا تھا مگر اسے اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو پولوس کو ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نصاریٰ ضعیف العقل والدین تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھالیے گئے تھے اور آپ کے پیرو ایسے نہ تھے جو صحیح معنی میں دین عیسوی سے باخبر ہوں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ جب پولوس نے حضرت مسیح کے بارے میں غلو کا عقیدہ اختراع کیا تو بہت سے عیسائی اس

کی پیروی کرنے لگے، انہوں نے مسیح کی شان میں غلو کو بہت اچھا سمجھا؛ یہی نہیں بلکہ بہت سے سلاطین اس کے ہم نوا بن گئے۔ نصاریٰ کی ایک جماعت نے جب ان کی تردید کا بیڑا اٹھایا تو پولوس کے ہم نوا سلاطین نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بعض نصاریٰ نے بادشاہوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا اور عبادت گاہوں میں عزت گزین ہو گئے۔

واللہ الحمد کہ امت مسلمہ کا معاملہ نصاریٰ سے یکسر مختلف ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق مسلمانوں کی ایک جماعت حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔^① بنا بریں کوئی ملحد وہے دین اپنے غلو کی بنا پر یا حق پر غلبہ پا کر اس میں بگاڑ نہیں پیدا کر سکتا۔ البتہ جو شخص اس کی پیروی کرے گا وہ یقیناً گمراہ ٹھہرے گا۔

علاوہ ازیں امام معصوم کے نائب جن کے متعلق رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جزئیات میں معصوم نہیں ہو سکتے؛ اگر بات ایسے ہی ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر جزئیات میں عصمت کا وقوع تسلیم نہیں کرتے؛ اس کے باوصف اکثر بلکہ تمام امور وہی فیصل کرتے ہیں۔ اب کلیات میں معصوم ہونے کا مسئلہ باقی رہا۔ تو اس ضمن میں واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کلیات کی اسی طرح تصریح کر سکتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کلیات کی معرفت حاصل کرنے میں امام یا کسی دوسرے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ نص نبوی کو نص امام سے اکمل بنا دے۔ تو پھر اس صورت میں کلیات و جزئیات دونوں میں عصمت امام کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

تیرھویں وجہ: ہم شیعہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے رائے میں عصمت امام سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ امام اداء عبادات یا ترک معاصی میں مختار ہے؟ حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کا خالق ہے یا یہ معنی کہ وہ معصیت کی قدرت کو سلب کر سکتا ہے۔

اگر تم کہو گے کہ: ہماری مراد پہلی بات ہے: [تو یہ غلط ہے] حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ فاعل کے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ معصوم کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔

اگر تم کہو کہ ہماری مراد دوسری بات ہے؛ تو شیعہ کا تقدیر کے بارے میں اصولی نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔ اگر تم کہو کہ: اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ معصیت سلب کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ تو گویا کہ تمہارے ہاں معصوم گناہ کا کام کرنے سے ہی عاجز ہے۔ جیسا کہ کوئی اندھا قرآن کی ورق گردانی سے اور کوئی اپانچ انسان چلنے پھرنے سے عاجز و قاصر ہوتا ہے۔ اور جو کوئی کسی چیز سے عاجز ہوتا ہے، اسے تو نہ ہی کسی بات کا حکم دیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسے کسی چیز سے منع کیا جائے یا حکم دیا جائے تو پھر بھی اس کو اس اطاعت پر کوئی ثواب نہیں ملے گا [اس لیے کہ وہ اطاعت پر مجبور ہے؛ کیونکہ اس سے گناہ کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی ہے]۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ تمہارے ہاں امام معصیت ترک کرنے پر کسی ثواب کا مستحق نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی اطاعت کے کام بجالانے پر اسے کوئی اجر ملے گا؛ یہی تمہارے

① صحیح بخاری، باب (۲۸) (ج: ۳۶۴۰) مسلم، باب قوله ﷺ "لا تزال طائفة من امتی....." (ج: ۱۹۲۰)۔

مذہب میں انتہائی بڑا تناقض پایا جاتا ہے۔

تو پھر اس وقت کوئی بھی مسلمان اس امام معصوم سے بہتر ہوگا جو کہ گناہ کرے اور پھر توبہ کرے۔ اس لیے کہ توبہ کرنے سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ بلکہ ہر گناہ کو نیکی سے بدل دیا جاتا ہے، اور اس کی سابقہ نیکیوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ تو پھر اس صورت میں مکلفین کا ثواب اس امام معصوم سے بہتر ہوگا۔ یہ بھی ان کے عقیدہ میں انتہائی تناقض ہے۔

[دوسرے مقدمہ پر رد:]

اگر یہ مان لیا جائے کہ: ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے: تو پھر شیعہ کا یہ قول: ”علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔“ [یہ صحیح نہیں] بلکہ بالاتفاق ممنوع ہے۔ اس لیے کہ بہت سے عابد و زاہد، صوفیہ اور عسا کر اور عوام شیعہ کی طرح اپنے مشائخ کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے اثنا عشریہ رافضیہ کا دعویٰ۔ بسا اوقات اس کے لیے اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ ”شیخ گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے۔“

یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کا عقیدہ ہے کہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے شیوخ سے افضل ہیں۔ خلفائے راشدین تو بالادولی افضل ہوں گے۔ بہت سارے لوگوں میں اپنے شیوخ کے متعلق بالکل ایسے ہی غلو پایا جاتا ہے جیسے اثنا عشری رافضیوں میں ان کے ائمہ کے بارے میں غلو پایا جاتا ہے۔

فرقہ اسماعیلیہ والے اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں، ان کے امام بارہ اماموں سے الگ ہیں۔

بنو امیہ کے اکثر یا بہت سارے تابعین کہا کرتے تھے کہ خلفاء پر حساب و کتاب یا عذاب نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے ان امور میں کوئی مواخذہ نہیں کریں گے جس میں وہ امام کی اطاعت کر رہے ہیں۔ بلکہ ان پر ہر بات میں امام کی اطاعت واجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس بارے میں ان کا کلام بڑا معروف ہے۔

یزید بن عبد الملک نے کوشش کی تھی کہ وہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی سیرت پر گامزن ہو، مگر اس کے پاس ان کے مشائخ کی ایک جماعت پیش ہوئی: اور انہوں نے اس کے سامنے اللہ وحدہ لا شریک کی قسم اٹھائی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو حاکم بنا دیتا ہے تو پھر اس کی نیکیاں قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بڑے مشائخ کے کلام میں ولی امر کی مطلق اطاعت کے متعلق بہت زیادہ تاکید پائی جاتی ہے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی حاکم کی اطاعت کرتا ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ضرب النثل بیان کی جاتی تھی کہ:

”اگر اطاعت ہو تو اہل شام کی سی اطاعت ہو۔“

یہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں: ان کا امام و حاکم انہیں اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ان میں سے کوئی

ایک بھی شیعہ نہیں ہے۔ بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں آپ پر سب و شتم کرتے ہیں۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ امام جس چیز کا بھی حکم دیتا ہے اصل میں وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے حکم میں

واجب الطاعت ہے: اور اللہ تعالیٰ اس اطاعت پر ثواب دیگا۔ اور ترک اطاعت پر سزا دے گا۔ اسے اپنے امام کے علاوہ کسی معصوم کی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کا جواب دو طرح سے دیا جائے گا:

پہلا جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: ان میں سے کسی بھی گروہ سے جب کہا جائے گا کہ امام معصوم کا ہونا ضروری ہے؛ تو وہ کہہ سکتا ہے میرے لیے اس امام کی عصمت ہی کافی ہے جس کا میں پیرو ہوں۔ مجھے بارہ ائمہ کے معصوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ ہی علی اور نہ ہی کسی دوسرے کی کوئی ضرورت ہے۔ اور دوسرا کہے گا: میرے شیخ یا امیر کی عصمت ہی میرے لیے کافی ہے؛ وہی میرا امام و پیشوا ہے۔ تیسرا کہے گا: میرا امام اموی ہے؛ اسماعیلی ہے۔ اور بہت سارے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی اطاعت کرنے میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی بادشاہ ہو۔ اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

”اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرتے رہو۔“

اگر شیعہ کہیں کہ ان لوگوں کی مخالفت کچھ اہمیت نہیں رکھتی تو یہ بات ناقابل قبول ہے۔ یہ لوگ تو رافضہ اور اسماعیلیہ سے بہر کیف بہتر ہیں۔ اس لیے کہ وہ جس امام کے پیرو ہیں وہ موجود ہے۔ بخلاف ازیں رافض جس امام کی پیروی کے مدعی ہیں وہ امام منتظر معدوم ہے جس کی اطاعت قطعی طور پر بے سود ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی رافضیوں کا یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: اگر واقعی ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو تو تمہارا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ باطل ٹھہرا۔ اور اگر ان میں کوئی ایسا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو تو پھر خلفاء ثلاثہ کی عصمت کا دعویٰ کرنے والوں کے موجود ہونے میں کوئی بات رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے عصمت کا دعویٰ کیا جانا زیادہ اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو باقی صحابہ پر ترجیح اور فضیلت دیا کرتے تھے۔ بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ پس اس وقت حضرات شیخین کی عصمت کا دعویٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے دعویٰ کی نسبت زیادہ اولیٰ ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: ایسا دعویٰ صحابہ کرام سے نقل نہیں کیا گیا؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”صحاب رسول ﷺ تابعین اور اصحاب علم میں سے کوئی بھی عصمت علی کا مدعی نہیں ہے۔ اور ہم بھی ان میں سے کسی ایک فریق کے بھی معصوم ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن ہم کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کا دعویٰ کرتے ہوئے کسی ایک کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ باقی خلفاء ثلاثہ کی عصمت کی نفی کرے۔ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس فرق کا دعویٰ کر سکے۔ اور نہ ہی کسی ایک سے ایسا کوئی دعویٰ نقل کیا گیا ہے۔ پس یہ بات زمانہ نہیں جانتا کہ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا بارہ اماموں میں سے کسی دوسرے امام کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ پس شیعہ کا یہ دعویٰ باطل

ٹھہرا کہ خلفاء ثلاثہ تو معصوم نہیں ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے بارے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ [البتہ جاہل امامیہ اس دعویٰ میں اسی طرح منفرد ہیں جس طرح گمراہ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے میں اور نواصب آپ کو فاسق تصور کرتے ہیں۔]

چودھویں وجہ : ہم شیعہ سے کہیں گے کہ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں :

۱۔ ہر زمانے میں امام معصوم کا وجود ضروری ہے۔ ۲۔ امام معصوم کا وجود ضروری نہیں۔

بصورت ثانی شیعہ کا قول باطل ٹھہرا۔ اور اگر امام معصوم کا وجود ضروری ہے تو ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ معصوم علی رضی اللہ عنہ ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم معصوم نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں اگر یہ نظریہ درست ہے تو معصوم صرف حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ہوں گے، اس لیے کہ اہل سنت ان کو بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ معصوم ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اگر یہ حضرات معصوم نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بالاولیٰ معصوم نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ عصمت ممکن ہے تو پھر ان حضرات کے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر ممکن نہیں تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی کافی دور ہے۔ اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معصوم مانتا ہو۔ وہ اصحاب ثلاثہ سے صرف اسی صورت میں عصمت کی نفی کر سکتے ہیں جب یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منفی ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان تین خلفاء کے معصوم ہونے کی نفی کی جائے؛ اہل سنت والجماعت اس کو نہیں مانتے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ مسلمان موسیٰ و عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو نبی کریم ﷺ کی نبوت کے پہلو بہ پہلو تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مانتا ہو۔ بلکہ مسلمانوں اس شخص کے کافر ہونے پر اتفاق ہے جو بعض انبیاء کرام علیہ السلام کی نبوت کو مانتا ہو اور بعض کی نبوت کا انکار کرتا ہو۔ اور جو کوئی ان دونوں کی نبوت کو مانے اور محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرے، وہ اس سے بڑا کافر ہے جو محمد ﷺ کی نبوت کو مانتا ہو مگر عیسیٰ یا موسیٰ علیہ السلام میں سے کسی ایک کی نبوت کا انکار کرتا ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ محمد ﷺ پر ایمان لانا ان دونوں سابقہ انبیاء پر ایمان لانے کو مستلزم ہے؛ تو پھر ایسے ہی ان دونوں انبیاء علیہ السلام پر ایمان محمد ﷺ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ یہی معاملہ نفی عصمت اور ثبوت ایمان و تقویٰ اور ولایت الہی کا ہے۔ اہل سنت والجماعت اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان و تقویٰ اور ولایت کو اصحاب ثلاثہ کے ایمان و تقویٰ اور ولایت سے مقرون و متصل مانتے ہیں۔ اصحاب ثلاثہ سے جب عصمت کی نفی کی جائے گی تو اس کے پہلو بہ پہلو عصمت علی کو بھی رو کر دیا جائے گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے ہاں ان کے مابین اس طرح کا فرق باطل ہے۔

شیعہ کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت اجماع سے ثابت ہے، مگر اصحاب ثلاثہ کی امامت اجماعاً ثابت نہیں۔“

جواب : یہود کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اجماع سے ثابت ہے جب کہ محمد ﷺ کی نبوت اجماع سے ثابت نہیں۔ یا نصاریٰ کے اس قول کی مانند کہ محمد و موسیٰ علیہ السلام اجماع کی رو سے الٰہ نہیں مگر عیسیٰ الٰہ ہیں۔“

جب کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہ و معبود یارب ہونے کی بھی اسی طرح نفی کرتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب سیدنا محمد ﷺ کی الوہیت کی نفی کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کہ موسیٰ اور محمد ﷺ سے تو الوہیت کی نفی کریں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس کو ثابت مانیں۔ اگر نصرانی کہے کہ: ہمارا اتفاق ہے کہ یہ دونوں انبیاء [حضرت موسیٰ اور حضرت محمد ﷺ] الہ نہیں ہیں۔ اور اب ہمارا اختلاف صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باقی رہ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بشر کی صورت میں ظاہر ہو؛ تو اب یہ مقام حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ کسی کے لیے باقی نہیں رہا۔ یہ بالکل رافضی کی تقریر کی طرح ہے جو کہتا ہے: امام معصوم کا ہونا ضروری ہے، اور یہ مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتا۔ ہم بدلائے اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ میں الوہیت کی ایسی کوئی خصوصیت موجود نہیں جو محمد و موسیٰ علیہ السلام میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح ہمیں قطعیت کے ساتھ اس مسلمہ صداقت کا علم حاصل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ایسی کوئی عزت نہیں پائی جاتی جس سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ محروم ہوں۔ اور جو کوئی ان میں تفریق ڈالنا چاہے ہم اسے روکیں گے۔ ہم کہیں گے کہ: ہم ہر دو طرح سے ان حضرات میں برابری چاہتے ہیں۔ اگر نفی ہے تو نفی میں اور اگر اثبات ہے تو اثبات میں۔

اگر کہا جائے کہ: تم تو تینوں خلفاء سے عصمت کی نفی کے قائل ہو تو؟

ہم کہیں گے: ہم ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی معصوم نہیں مانتے۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ انھیں یہ بات کیوں کر معلوم ہوئی کہ علی معصوم تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ معصوم نہ تھے؟

اگر شیعہ کہیں کہ ہمیں اجماع سے اس بات کا علم حاصل ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی معصوم نہ تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: اگر اجماع دین میں حجت نہیں ہے تو شیعہ کا دعویٰ غلط ٹھہرا۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے اثبات میں اجماع حجت ہے جو کہ اصل ہے تو آپ کی عصمت سے جو چیز مقصود ہے یعنی شریعت کے حفظ و نقل کے بارے میں بھی اجماع حجت ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ اجماع کو حجت قرار نہیں دیتے مگر اپنے نظریات کے اثبات میں اجماع سے احتجاج کرتے ہیں۔ تو پھر ان کو کیسے معلوم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی معصوم ہیں دوسرا کوئی معصوم نہیں؟

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت]:

✽ اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معصوم ہونا نبی کریم ﷺ سے خبر متواتر سے ثابت ہے

✽ [جواب]: یہ دعویٰ تو اسی طرح ہے جیسے ان کا یہ دعویٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ تو اس صورت میں ان کے ہاں کوئی دوسری مستند دلیل نہ ہوگی۔

چوتھا جواب: مزید براں شیعہ کے نزدیک اجماع اس صورت میں حجت ہے جب اس میں معصوم کا قول ثابت ہو۔ اگر

معصوم کی معرفت اجماع پر موقوف ہو تو دور لازم آئے گا۔ اس لیے کہ اس امام کا معصوم ہونا اس کے اپنے قول پر منحصر ہے۔ اور

اس کے قول کا حجت ہونا اسی صورت میں پہچانا جاتا ہے جب یہ بات معلوم ہو کہ وہ معصوم ہے۔ لہذا دونوں میں سے کوئی بات

بھی ثابت نہ ہوگی۔ تو اس سے امام کے معصوم ہونے کی ان کی حجت کا بطلان ثابت ہو گیا۔

اس سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہو گیا کہ رافضیوں کے ہاں اس اصل میں کوئی مستند علمی دلیل ہی موجود نہیں کہ اجماع

جنت نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے ہاں اجماع اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں امام معصوم شامل نہ ہو۔ بیشک حجت ان کے ہاں صرف واحد امام معصوم کا قول ہے۔ سو اس صورت میں انہیں ایک مستقل شخص کے علم کی ضرورت ہوگی؛ تاکہ پتہ چل سکے اس کا قول حجت ہے۔ پس جب وہ اجماع سے حجت پیش کریں تو اس سے شیعہ کے ہاں حجت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس میں امام معصوم کا قول شامل نہ ہو۔ ان کے اس قول کا خلاصہ کلام یہ ہوگا کہ: ’فلاں شخص اس لیے معصوم ہے کہ اس نے کہا میں معصوم ہوں‘ اور میرے سوا کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔“

جب ان سے پوچھا جائے کہ: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہی امام معصوم ہے؛ اس کے علاوہ کوئی اور معصوم نہیں ہے؟ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں: اس لیے کہ اس نے کہا میں معصوم ہوں اور میرے سوا کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص یہ بات کہہ سکتا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے ”میری ہر بات سچی ہے۔“ اگر اس کی سچائی اسی بات پر موقوف ہے تو اس کی صداقت معلوم نہ ہوگی۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نص امامت؟]:

ان کی یہ دلیل بھی ان کے علم پر بھائیوں اسماعیلیہ کی دلیل کی جنس میں سے ہے۔

اسماعیلیہ کا دعویٰ بھی اسی طرح ہے وہ کہتے ہیں کہ امام معصوم ہوتا ہے اور اس پر امامت کا نشان لگا ہوتا ہے۔ اسماعیلیہ کہتے ہیں حصول علم کا ذریعہ سماع و عقل ہے اور اس کی صحت نشان زدہ امام معصوم اور اس کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کسی معین و مخصوص امام کے معصوم ہونے کی دلیل پوچھی جائے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے قول میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول پر عمل کرنے کے لیے تیار بھی ہوں کہ ”میں معصوم ہوں“ تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ قول ان سے کس نے نقل کیا؟ بخلاف ازیں بتواتر آپ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے قاضیوں کو بتا کید حکم دیا تھا کہ ان کی رائے کے برخلاف فیصلہ صادر کریں، یہ نقل صحیح ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میری اور عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ صاحب اولاد لونڈیوں کو فروخت نہ کیا جائے۔ اب میں ان کے فروخت کرنے کے حق میں ہوں۔“

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کی متفقہ رائے ہمیں آپ کی انفرادی رائے سے عزیز تر ہے۔“^①

قاضی شریح اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ نہیں لیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ضمن میں ان کے موید تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دیتے اور فیصلہ صادر کیا کرتے تھے، پھر اپنے اجتہاد ہی سے اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں آپ کے اقوال باسانید صحیح ثابت ہیں۔ پھر نصوص کے مخالف آپ کے اتنے اقوال پائے جاتے ہیں کہ اتنے اقوال حضرت عمر اور حضرت رضی اللہ عنہ سے نصوص کے

① مصنف عبد الرزاق، (۱۳۲۲۴)، کتاب الام للامام الشافعی (۷/۱۵۷)، سنن کبریٰ، بیہقی (۱۰/۳۴۸)۔

خلاف نہیں ملتے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک خاص کتاب جمع کی ہے جس میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اقوال میں اختلاف کو جمع کیا گیا ہے۔ جب اہل عراق آپ سے مناظرہ کرتے تھے تو کہتے تھے: ”علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا۔“ ان دونوں حضرات کے قول سے دلیل لیتے۔ تو پھر امام شافعی نے ایک کتاب میں ان کے وہ اقوال جمع کر دیئے جو ان لوگوں نے چھوڑ دیئے تھے۔ اس کے بعد محمد بن نصر المزنی نے کتاب ”رفع الیدین“ میں اس سے کئی گنا زیادہ مترکہ اقوال جمع کر دیئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے امام محمد بن نصر کے خلاف نماز میں رفع یدین کے مسئلہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے دلیل اختیار کی تھی۔

یہ کوفہ کے ان علماء کرام کے بارے میں کلام ہے جو شرعی دلائل سے استدلال کیا کرتے تھے جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے محمد بن الحسن رحمہ اللہ اور ان کے امثال؛ اس لیے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے اکثر مناظرے محمد بن الحسن اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ آپ نے نہ ہی ابو یوسف رحمہ اللہ کو پایا اور نہ ہی کبھی ان سے مناظرہ کیا۔ اور نہ ہی ان سے کوئی حدیث سنی۔ بلکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا انتقال امام شافعی رحمہ اللہ کے عراق میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابوں میں امام ابو یوسف کے اقوال امام محمد رحمہ اللہ کی سند کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جب کہ روافض کی جہی دامن کا یہ عالم ہے کہ امام علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے اور دوسروں سے عصمت کی نفی پر اپنے حق میں اپنے ہی اقوال سے استدلال کرتے ہیں۔ یعنی جہالت کو جہالت سے ثابت کرتے ہیں۔

میں نے ان کے مشائخ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ جب ان کے مابین کسی مسئلہ میں دو اقوال پر اختلاف ہو جاتا ہے؛ ایک قول کا قائل معلوم ہو اور دوسرے کے قائل کو کوئی پتہ نہ ہو؛ تو ان کے ہاں وہ قول حق اور درست ہوگا جس کے کہنے والے کا کوئی پتہ نہ ہو؛ [اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں:] جب کسی قول کا قائل معلوم نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امام معصوم کا قول ہے۔ کیا یہ بات انتہائی بڑی جہالت کے سوا بھی کچھ ہو سکتی ہے؟ انہیں یہ کیسے پتہ چل گیا کہ وہ دوسرا قول جس کا کوئی کہنے والا معلوم نہیں؛ وہ امام معصوم کا قول ہے؟ بالفرض اگر امام معصوم کے وجود کو مان بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس نے یہ کہا ہے۔ جیسا کہ اس کوئی اور دوسرا کہنے والا بھی موجود نہیں ہے۔ اور اگر ایسے ہی ہے تو پھر وہ قول امام کا کیوں نہیں ہو سکتا جس کا کہنے والا معلوم ہے؛ اور کسی دوسرے کے بارے میں علم ہے کہ فلاں آدمی نے یہ بات کہی ہے۔ جیسا کہ دیگر بھی بہت سارے اقوال ایسے ہیں جن میں دوسرے لوگ بھی ان کی موافقت کرتے ہیں۔ جب کہ دوسرے قول کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کس نے کہا؛ اور کہنے والے کو پتہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؛ ممکن ہے کہ یہ شیاطین جن والنس میں سے کسی ایک نے کہا ہو؟

پس رافضی کسی قول کے قائل اور اس کی صحت کا علم نہ ہونے کو اس قول کی صحت شمار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا یہ قول ہے کہ: کسی دوسرے کے معصوم نہ ہونے کا علم ہونا ان کے امام کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ اور پھر یہ کہ جس بات کے کہنے والے کا کوئی پتہ نہ ہو تو اس کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ امام معصوم کا فرمان ہے۔ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی معبود کردہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں کے نور سے اعراض کرے گا ان کا یہی حال ہوگا۔ وہ ایسی بدعات کی گہری کھانیوں میں جا گرے گا جس کے اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر [یعنی بڑھ کر] ہوں گے۔ [اعاذنا اللہ من شرهم؛ آمین]۔

فصل:

[امام کا تقرر کیسے ہوگا؟]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”دوسری وجہ: یہ واجب ہے کہ خلیفہ و امام کا تقرر نص کی بنا پر ہو، اس لیے کہ ہم طریق انتخاب کا بطلان ثابت کر چکے ہیں۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ بعض لوگ جو امام کو منتخب کرتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں سے افضل نہیں ہیں جو کسی اور امام کا انتخاب عمل میں لاتے ہیں، ورنہ تنازع پیدا ہو جائے گا، پس اس طرح امام کا انتخاب بہت بڑے فساد کا ذریعہ بنے گا۔ جب کہ ادنیٰ سے درجہ کے فساد کو ختم کرنے کے لیے ہم نے امام کے متعین ہونے کو واجب کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے ائمہ و خلفاء بالاتفاق منصوص علیہ نہ تھے، لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی امام برحق نہ ہوگا۔“

[جواب]: اس رافضی مصنف کے مقدمات کے کئی ایک جواب ہیں:

[پہلا جواب]: ہم ان دونوں مقدمات کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے مقدمہ میں پہلے مقدمہ کی نسبت اختلاف زیادہ واضح ہے۔ علمائے سلف و خلف محدثین و فقہاء اور اہل کلام و تفسیر کی کئی جماعتوں کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ ایک قلیل جماعت کے نزدیک حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی منصوص علیہ امام تھے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصوص علیہ امام ہونے پر اجماع کیسے رہا؟ اور یہ کیسے ہو گیا کہ آپ کے علاوہ کوئی بھی منصوص علیہ امام نہ تھا؟ یہ ایک یقینی اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

[دوسرا جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے منصوص علیہ ہونے کی نفی پر کوئی اجماع نہیں ہے۔ یہ رافضی مصنف اگرچہ اپنی جنس کے لوگوں میں سے افضل اور چنیدہ قسم کے لوگوں میں شمار ہوتا ہے؛ لیکن یہ پورے کا پورا طائفہ ہی جاہل لوگوں پر مشتمل ہے۔ ورنہ جس کو لوگوں کے عقائد و نظریات کی معرفت حاصل ہو، اس انسان سے اس قسم کے دعویٰ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

[تیسرا جواب]: اس موقع پر ہم ایک تیسرا جواب بھی دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(۱) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر ہے۔

(۲) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر نہیں ہے۔

بصورت اول ہم کہیں گے کہ پھر دوسرا مقدمہ ناقابل اعتبار ٹھہرا اور نص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت ہے [نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں]۔ بصورت ثانی اگر نص معتبر نہیں تو شیعہ کا پھلا دعویٰ باطل ٹھہرا۔

[چوتھا جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ کے نزدیک امام معصوم کا قول حجت ہے اور اجماع حجت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اثبات نص کے لیے امام معصوم کا قول ضروری ہوگا اور اس طرح نص ثابت ہوگی نہ امام کی معصومیت۔ بخلاف ازیں اس کی صورت منطقی اعتبار سے یوں ہوگی کہ جو انسان دعویٰ کرے گا کہ:

”میں امام معصوم ہوں اور میری امامت نصوص سے ثابت ہے؛ میں خود ہی معصومیت کی دلیل ہوں۔“
یہ دعویٰ کرنے والے کا قول حجت ہوگا؛ اگرچہ اس قول کا کہنے والا معلوم نہ ہو۔ یہ جہالت کی انتہاء ہے۔ یہ دلیل بھی اپنے سے پہلی دلیل کی مانند ہے۔

[پانچواں جواب:] ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ امام کا معصوم اور منصوص علیہ ہونا واجب ہے؟ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ بصراحت فرمائیں کہ فلاں شخص میرے بعد امام و خلیفہ ہوگا؛ اس کی بات سنو اور اطاعت کرو؟ تو صرف اس حکم کی بنا پر امامت ثابت ہو جائے گی؟ یا یہ کہ اس کی امامت اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک اس کی بیعت خلافت نہ کی جائے؟ پہلی صورت میں نص کا ہونا ضروری نہیں؛ اس صورت میں نص کے وجوب کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ شیعہ کا فرقہ زید یہ اہل سنت کی طرح ایسی نص کا انکار کرتا ہے۔ زید یہ ان شیعہ میں سے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کوئی بہتان یہ تہمت نہیں لگاتے۔

[حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت:]

[اشکال:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امام معصوم نہ ہونے کی صورت میں تنازع اور جھگڑا پیدا ہوگا۔“

[جواب:] ہم کہتے ہیں: ”جن نصوص سے نظر و استدلال کی بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور امامت ثابت ہوتی ہے، ان سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تمام احکام پر ایسی نص جلی نہیں ہوتی کہ اسے ہر خاص و عام برابر سمجھ لے۔ جب ان امور مکلیہ کی معرفت ہر زمانے میں واجب تھی؛ تو ان امور میں اتنی ہی نص کافی سمجھی جاتی ہے۔ تو پھر ایک جزوی معاملہ یعنی امام کے نصب و تعیین کے لیے یہ نص بدرجہ اولیٰ کافی و دافی ہے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کلیات پر تو انبیاء کرام علیہم السلام سے نص ثابت ہو سکتی ہے مگر ہر ہر جزئیہ پر ایسی نصوص کا ثابت ہونا ناممکن ہے۔

جب اس جماعت کے کچھ لوگوں کی افضلیت کے دلائل صاف ظاہر تھے؛ اور یہ دلائل بھی موجود تھے کہ وہ دوسرے لوگوں سے خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ تو پھر ان دلائل کی موجودگی خلیفہ کا نام لیکر متعین کرنے سے بے نیاز کرتی ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور خلافت کے مستحق ہونے کے دلائل انتہائی صاف و واضح اور ظاہر ہیں۔ ان میں کسی صحابی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ جن انصار نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا تھا وہ اس بات کے ہرگز منکر نہیں تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے افضل ترین ہستی ہیں۔ ان کا اختلاف صرف یہ تھا کہ ایک خلیفہ مہاجرین میں سے ہونا چاہیے اور ایک خلیفہ انصار میں سے۔

[چھٹا جواب:] ان سے کہا جائے گا کہ: احکام پر نص دو طرح کی ہوتی ہے:

۱۔ نص کلی: جو عام ہو؛ اور اس کے تمام اعیان کو شامل ہو۔

۲۔ نص جزئی: جو جزئیات کو شامل ہو۔

آپ کہتے ہیں کہ امام کے لیے نص کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر تمہاری مراد نص کلی اور عام مراد ہے یعنی امام کے لیے کیا شروط ہیں؛ اس پر واجب کیا ہے؛ اور امام کے لیے کیا واجب ہے۔ جیسے کہ حکام؛ مفتیان؛ شہود؛ نماز پڑھانے والے ائمہ؛

مؤذنین اور جہاد کے لیے امراء کے لیے شرط ہیں؛ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے کیا شرط ہیں جو مسلمانوں کے معاملات میں ان کی بات مانیں گے اور ان کے نقش قدم پر چلیں گے؛ تو الحمد للہ یہ نصوص ثابت ہیں۔ جیسا کہ باقی تمام احکام کی نصوص ثابت ہیں۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: والی یا خلیفہ بننے والے افراد کا متعین کیا جانا ضروری ہے۔“ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ احکام کی جزئیات پر نص کا ہونا واجب نہیں۔ بلکہ ایسا کیا جانا ممکن ہی نہیں۔ منصب امامت بھی من جملہ احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قیامت تک آنے والے مسلمان حکمرانوں کو نصوص کے ذریعہ متعین کیا جانا نہ ہی ایسا ہوا ہے اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے۔ کسی متعین امام کی طرف سے کسی دوسرے کو امام متعین کرنے کی نص صرف اس متعین شخص تک محدود ہوگی تمام معینین کو شامل نہیں ہوگی۔

اس صورت میں ان سے کہا جائے گا کہ: امام کا منصوبہ علیہ ہونا ممکن ہے۔ اور یہ نص ان کو بھی تفویض ہو سکتی ہے جو اس کے بعد خلیفہ یا نائب مقرر ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ [یہ پہلا حاکم] اپنے بعد اپنا نائب مقرر کرے۔ یا کسی کو اپنا وزیر مقرر کرے۔ اس صورت میں نص اپنے مقصد میں زیادہ بلیغ ہوگی۔

مزید برآں یہ کہ وہ متعین منصوبہ علیہ امام کیا اپنے بعد کسی کو متعین کرنے میں بھی معصوم ہے یا اس میں معصوم نہیں؟ اگر اس میں معصوم ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اس کے تمام نائبین بھی معصوم ہوں۔ یہ تمام باتیں ضروری طور پر باطل ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ امام اپنے بعد کسی غیر معصوم کو اپنا نائب مقرر کر دے۔ جب غیر معصوم نائب مقرر ہو گئے تو پھر امام معصوم کے وجود سے باقی تمام زمانے کے لوگوں کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

اگر [شیعہ کی طرف سے] یہ کہا جائے کہ امام اپنی زندگی کے بعد نائب مقرر کرنے میں معصوم ہے؛ جب کہ اپنی زندگی میں ایسا کرنا ضروری نہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ امام اور اس کا نائب دونوں معصوم ہوں۔ اور جو آدمی امام کے پاس حاضر اور موجود ہو اس کے بارے میں مستقبل میں آنے والے کی نسبت زیادہ علم ہوتا ہے۔ تو پھر آنے والا کیسے معصوم ہو سکتا ہے جب کہ جو حاضر اور موجود ہے وہ معصوم نہیں ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ: نص کا ہونا ممکن ہے؛ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے نص کے ذریعہ نائب مقرر کیا تھا۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کا اپنے بعد [کسی متعین] خلیفہ مقرر کرنا ایسے ہی ہے جیسے اپنی زندگی میں کسی کو اپنا نائب مقرر کرنا۔ لیکن ہم ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی معصوم ہونے کی شرط نہیں لگاتے۔ [ساتواں جواب] ان سے کہا جائے گا کہ: تم شیعہ کے نزدیک نص کا وجود قطع نزاع کے لیے ضروری ہے، تاکہ اس سے کوئی ایسا بڑا فساد پیدا نہ ہو۔ جس فساد کو ختم کرنے کے لیے آپ نے امام کے متعین ہونے کو واجب کہا ہے۔

[وضاحت: مطلب یہ ہے کہ جب کوئی حاکم اپنے بعد کسی دوسرے کو اپنا نائب یا حاکم مقرر کر دے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قیامت تک تمام آنے والے حکمرانوں کو متعین کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ حکم صرف اس متعین فرد تک محدود ہوگا جسے اس پہلے حاکم نے اپنی جگہ کیلئے منتخب کیا ہے۔ (دراوی ج 1)]

مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے بعد دیگرے منصب خلافت پر فائز ہوئے مگر کوئی فساد و نزاع نہ ہوا۔ فتنہ و فساد کا آغاز اس امام کے وقت میں شروع ہوا جو بقول شیعہ امام منصوم و معصوم تھے۔ آپ کے خلیفہ قرار پائے جانے کے بعد تو فتنہ بازی اوج کمال پر پہنچ گئی۔ تو جس کم درجہ کے فساد کو ختم کرنے کے لیے تم نے امام کو متعین کرنا واجب قرار دیا تھا؛ گویا کہ امام معصوم سے جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا بلکہ جس چیز کے لیے تم نے نصب امام کو وسیلہ بنایا تھا اس مقصود کا الٹ حاصل ہوا۔ اور تمہارے اس وسیلہ کے بغیر یہ مقصود [پہلے تین خلفاء کے دور میں] حاصل ہو گیا۔ پس جو وسیلہ تم نے اپنے دعووں میں ذکر کیا تھا وہ سب باطل ٹھہرا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ پر وہ چیزیں واجب کر دیں جو کہ اس پر واجب نہیں تھیں۔ اور ایسی چیزوں کی خبریں دینے لگے جن کا کوئی وجود واقع ہی نہیں ہوا تھا۔ ان کے اس جھوٹ اور جہالت کی وجہ سے ان کے اقوال میں تناقض کا لازم آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

[آٹھواں جواب:] ہم کہتے ہیں کہ: کسی امام کے بارے میں وجود نص سے فساد کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ نص کے متعدد طرق ہیں:

- ۱۔ نص کا ایک طریق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی شخص کی خلافت کے بارے میں پیش گوئی فرمائیں اور اس کی تعریف کریں۔ امت کو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر یہ شخص مسند امارت پر فائز ہوا تو لوگوں کے حق میں مفید ثابت ہو گا۔ بلاشبہ اس سے نزاع اٹھ جاتا ہے۔ اگرچہ آپ یہ نہیں فرماتے کہ فلاں شخص کو امام مقرر کرلو۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ ﷺ نے ایسی پیش گوئی فرمائی تھی۔
- ۲۔ نص کا دوسرا طریق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایسے امور کی پیش گوئی فرمائیں جو کسی شخص کی خلافت و امارت کی عمدگی کی دلیل ہوں جیسے آپ نے فارس^۱ و روم کے فتح ہونے کی بشارت دی تھی۔ جو خلافت صدیقی و فاروقی میں پوری ہوئی ہیں۔
- ۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے بعد میں آنے والے کو کسی شخص کے پاس جانے کا حکم دیں، یہ حکم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص خلیفہ ہوگا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔
- ۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلافت کے بارے میں ایک عہد نامہ لکھنا چاہتے ہوں اور جب اس کی تکمیل نہ ہو سکے تو فرمائیں: ”اللہ تعالیٰ اور مومن ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے۔“^۲

جیسے آپ نے فرمایا تھا، اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔

- ۵۔ پانچواں طریقہ: نبی کریم ﷺ اپنے بعد کسی شخص کی پیروی کا حکم صادر کریں اور وہ منصب خلافت پر فائز بھی ہو جائے۔
- ۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کی پیروی کا حکم دیں اور ان کی مدت خلافت کی تعیین کر دیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت کے اندر اندر جو لوگ منصب امامت پر فائز ہوں گے وہ خلیفہ راشد اور

① صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینہ۔ باب من رغب عن المدینہ، (حدیث: ۱۸۷۵)، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ترغیب الناس فی المدینہ (حدیث: ۱۳۸۸) ② مسند احمد (۵/۲۸۸) ③ صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۳۸۷)۔

ہدایت یافتہ ہوں گے۔

۷۔ ساتواں طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو چند باتوں کے ساتھ شخص کر دیں جو اس بات کی مقتضی ہوں کہ یہ سب پر فائق ہے، یہ صفت صرف ابو بکر میں موجود تھی۔

[نواں جواب:] یہ ہے کہ ترک نص رسول کے لیے موزوں تر ہے۔ اس لیے کہ اگر نص معصوم کے حق میں ہو تو نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں۔ اور اگر غیر معصوم کے حق میں ہو تو اس کی ہر بات کے واجب الطاعت ہونے میں بعض اوقات نص سے احتجاج کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد اس بات کا امکان باقی نہیں رہتا کہ آپ سے مراجعت کر کے اس امام و خلیفہ کی بات کو مسترد کر دیا جائے یا اسے معزول کیا جائے۔ اس لیے منصوص علیہ خلیفہ کا نہ ہونا اس کے ہونے سے بہتر تھا۔ یہ اس کے برعکس ہے جس کو رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں نائب یا والی مقرر کریں۔ اس لیے کہ جس شخص کو نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں تعینات کریں؛ اس لیے کہ اگر اس سے کوئی گناہ ہو جائے یا غلطی ہو جائے تو ممکن ہے کہ آپ اسے غلطی پر متنبہ کر سکیں گے اور اسے اس منصب سے معزول بھی کر سکیں گے۔ جب کہ موت کے بعد ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اور امت کے لیے بھی اس امام یا نائب کو معزول کرنا ممکن نہیں رہے گا؛ اس لیے کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے متعین کیا ہے۔ پس کسی متعین شخص پر نہ ہونا مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر اور مصلحت پر مبنی تھا۔ اور ایسے ہی ہوا۔ اگر رسول اپنے بعد کسی کو بصراحت اس بات کے لیے مقرر فرمائیں کہ ہم اس سے وین اخذ کریں؛ جیسے رافضی کہتے ہیں؛ تو اللہ کی حجت باطل ٹھہرے گی اور رسول کے سوا دوسرا کوئی شخص اس کا اہل بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ معصوم صرف رسول ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔

جو شخص ان باتوں پر اور دوسرے امور پر غور کرے گا اسے علم ہو جائے گا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کے لیے اختیار کیا تھا وہ زیادہ کامل و اکمل امور تھے۔

[جزئیات کی تفصیل ممکن نہیں:]

[دسواں جواب:] جزئیات کی تفصیل ممکن نہیں اور کلیات قبل ازیں منصوص ہیں۔ اگر رسول کسی مخصوص آدمی کو اس منصب پر مقرر کر دیتے اور کلیات کی تفصیل میں اس کی اطاعت کا حکم صادر کرتے تو یہ باطل ہوتا۔ اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت کا حکم دیتے؛ خواہ وہ جزئیات کلیات کے موافق ہوں یا مخالف تو یہ بھی باطل ہوتا۔ اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت اس صورت میں ضروری ٹھہرائی جائے جب وہ کلیات سے ہم آہنگ ہوں؛ تو ہر والی ایسا حکم صادر کرتا ہے۔

اور اگر رسول ﷺ تصریحاً بھی کسی متعین شخص کو اس منصب پر مقرر کر دیتے؛ تو جو اس کے بعد امام یا خلیفہ بنتا؛ اس کے ساتھ کوئی نص نہ ہوتی۔ تو کوئی بھی خیال کرنے والا یہ خیال کرتا کہ اس کی اطاعت امام سابق کی طرح نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ پہلے امام کی اطاعت نص کی روشنی میں واجب تھی جب کہ دوسرے امام کی امامت کسی نص قطعی سے ثابت نہیں ہوئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر امام اپنے بعد والے امام کا ذکر تصریحاً کرتا ہے تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دوسرا امام معصوم ہو۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں۔ بنا بریں قول بالنص عصمت امام کے عقیدہ کی فرع ہے۔ اس قول کا

فاسد ترین قول ہونا صاف ظاہر ہے۔

اسی طرح اس سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ روافض جس نص کے دعوے دار ہیں کہ حاکم و امیر کی ہر بات واجب الاطاعت ہو کر رہی ہے اور اختلاف کے وقت اسے کتاب و سنت کے معیار پر رکھ کر پرکھنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی فاسد ہے۔ اگر ہم ارشاد باری کے مطابق اختلاف کے وقت اپنے قول کو کتاب و سنت پر پرکھ کر دیکھیں تو نص کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ وہین محفوظ ہے۔ اور دین ان حکام یا ولایۃ کے بغیر بھی محفوظ رہے گا۔

خلاصہ کلام! کسی متعین شخص پر نص کے ہونے سے: اگر یہ مراد ہے کہ اس منصوص علیہ کی اس طرح اطاعت کی جائے جیسے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کے بر حکم و نبی میں اور مباح میں کی جاتی ہے؛ اور کسی ایک کو اس سے اختلاف کرنے کا حق حاصل نہیں؛ جس کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختلاف کرے؛ اور اس کے احکام کو ہر صورت میں نافذ کیا جائے؛ اور امت اس کے ساتھ اس طرح رہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھی؛ تو ایسا رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے ایسا ممکن ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایک پر بھی وحی نہیں آتی جیسا کہ آپ ﷺ پر وحی آیا کرتی تھی۔ اور آپ کے بعد کسی کو ہر ایک چیز کا علم ایسے حاصل نہیں ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھا۔ تو اس کی اطاعت کی کوئی راہ باقی نہ رہی؛ نہ ہی اپنی جہت سے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

اور اگر اس نص سے مراد یہ لی جائے کہ آپ ﷺ امت کے لیے بیان فرمادیں کہ یہ انسان تمہارا والی بننے میں دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ اور اس کی ولایت و امامت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اور تمہارے لیے تمہاری دنیا اور دین دونوں اعتبار سے زیادہ بہتر اور مصلحت پر مبنی ہے۔ یا اس طرح کا کوئی دیگر کلام ارشاد فرماویں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ خلافت نبوت میں فلاں شخص دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی بہت ساری نصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اور اگر اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں اس امام کی اتباع کرنے کا حکم دیا تھا جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع کریں۔ اور اس بارے میں امت سے کوئی عہد بھی لیا تھا۔ جب اس کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ امت ایسا ہی کرے گی تو پھر اس عہد کا ترک کرنا ہی بہتر تھا۔ اور اگر آپ کو اندیشہ ہو کہ امت آپ کے حکم کے بغیر ایسا نہیں کرے گی؛ تو پھر حکم دینا زیادہ اولیٰ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوف محسوس ہوا کہ آپ کے بعد امت میں اختلاف پیدا ہو جائے گا تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے عہد لے لیا [انہیں اپنا ولی عہد مقرر کر دیا]۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ امت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لے گی تو پھر آپ نے اس بارے میں کوئی حکم جاری نہ فرمایا۔

صحیحین میں ہے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ”اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک عہد نامہ لکھ دوں۔“ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے۔“^①

① صحیح مسلم (حدیث: ۲۳۸۷) واللفظ لہ۔ صحیح بخاری۔ ۱ (حدیث: ۵۶۶۶) سبق تخریجہ۔

آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو خلیفہ نہیں بنائے گا۔ اور اہل ایمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ ایسے ہی ساری صحیح احادیث دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہو گیا تھا۔ بیشک علم ہو جانے کے بعد حکم کا ترک کرنا افضل تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اس لیے کہ امت آپ ﷺ کی طرف سے لازم کیے بغیر اگر اپنی مرضی سے ہی آپ کو منتخب کر لے گی تو یہ بہت اچھا ہوگا؛ اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس پر راضی ہیں؛ اس لیے کہ آپ سب امت میں سے افضل انسان تھے۔ آپ کا علم و دینداری اس کی واضح دلیل ہیں۔

اس لیے کہ اگر امت پر اس امر کو لازم کر دیا جاتا تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ امت کو حق ماننے پر مجبور کیا گیا۔ امت آپ کو منتخب نہیں کرنا چاہتی تھی؛ جیسا کہ بنی اسرائیل میں ہوا کرتا تھا۔ تو کوئی بدگمانی کرنے والا یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ابھی تک ان لوگوں میں جاہلیت کا عنصر یعنی نسب کی وجہ سے مقدم کرنے کی روش باقی ہے۔ اور امت صرف ان لوگوں کو منتخب کرنا چاہتی تھی جو بنو عبد مناف سے تعلق رکھتے ہوں۔ جیسا کہ ابوسفیان اور دوسرے لوگوں کی رائے تھی۔ اگر مہاجرین و انصار پر اس امر کو لازم کر دیا جاتا؛ تو کوئی بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ یہ بالکل ابوسفیان اور اس کے امثال کے فعل کی جنس سے ہے۔

لوگ اولاً و آخراً نبی کریم ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اختصاص؛ اور آپ کے ساتھ ظاہری و باطنی موافقت کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا تھا: یہ لوگ باطن میں اس کو ناپسند کرتے تھے کہ ان پر کوئی ایسے حکم چلائے جیسے انہیں رسول اللہ ﷺ حکم دیا کرتے تھے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ان پر اس کو لازم کر دیا تو پھر وہ اس کو ماننے کے لیے مجبور ہو گئے۔ [تو اس صورت میں] اگرچہ اور کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت گزاری پر ان کی مدح و تعریف کی جاتی۔

تو پھر جب انہوں نے بغیر اس کے کہ ان پر لازم کیا جائے؛ اپنی مرضی اور اختیار سے ایسے آدمی کو خلیفہ چن لیا جس پر اللہ اور اس کا رسول راضی ہوں؛ یہ بات اللہ کے ہاں ان کی بہت بڑی قدر و منزلت اور اعلیٰ درجات اور بہت بڑے ثواب کی دلیل ہے۔ اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کے لیے اختیار کر لیا تھا؛ وہ ان [عوام اور خلیفہ] کے حق میں سب سے بہتر اور افضل تھا۔

ذرا غور تو کیجیے! رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر سر یہ مقرر فرمایا۔ اور پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ مگر اس کے باوجود وہ [اللہ اور اس کے رسول اور] ان امراء کی اطاعت پر کاربند رہے۔ پس اگر امت پر لازم کر دیا جاتا کہ ان میں سے کسی ایک کو امیر مقرر کیا جائے۔ تو کوئی یہ بھی گمان کر سکتا تھا کہ ایسی بات ان کے دلوں میں بھی تھی۔ پھر اس سے ان لوگوں کے ہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کوئی اس طرح کی خاص منزلت باقی نہ رہتی کہ اس میں کوئی بھی انسان بات نہ کر سکتا۔

جب لوگ خود آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق ہو گئے اور مہاجرین و انصار میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ میں صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلیفہ بننے کا حق دار ہوں۔ اس لیے کہ انصار نے شروع میں جو اختلاف کیا تھا؛ وہ اختلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ایک امیر قریش میں سے ہو؛ اور ایک امیر انصار میں سے۔

یہ اختلاف تمام قریش کے ساتھ عام تھا۔ جب ان کے سامنے دلیل کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ امارت و خلافت قریش کا حق ہے؛ تو انہوں نے اپنے اختلاف کو ختم کر دیا۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا تھا:

”ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی ﷺ بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر میری گردن مار دی جائے، تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی؛ اور یہ میرے نزدیک اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ مجھے اس قوم پر امیر بنادیا جائے جس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔“ ❶

اور آپ [حضرت عمر رضی اللہ عنہ] نے سب لوگوں کی موجودگی میں ارشاد فرمایا تھا:

”آپ ہمارے سردار ہیں، اور ہم سب سے بہتر ہیں۔ اور ہم سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہیں۔“ ❷

پھر اس کے بعد لوگوں نے بغیر کسی لالچ کے؛ بغیر کسی خوف کے؛ اور بغیر کسی رشوت کے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ ان لوگوں نے آپ کی بیعت کی جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی۔ اور جن لوگوں نے عقبہ کی رات رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی۔ اور جنہوں نے ہجرت کے وقت رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی۔ اور ان لوگوں نے بھی بیعت کی جنہوں نے ہجرت کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر اسلام قبول کرتے ہوئے بیعت کی تھی۔ جیسے طلقاء مکہ؛ اور دوسرے حضرات۔

ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر امر خلافت کا حق دار ہوں۔ اور نہ ہی آپ کی بیعت کرتے ہوئے کسی ایک نے یہ کہا کہ: ”فلاں آدمی آپ سے زیادہ اس امر کا حق دار تھا۔“

بیشک بعد میں جن لوگوں نے یہ بات کہی کہ: آل بیت رسول اللہ ﷺ اس کے زیادہ حق دار تھے؛ ان میں جاہلیت کے عربی اور فارسی فرق کا اثر باقی تھا۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ جاہلیت میں عرب رؤساء کے اہل بیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا اور اہل فارس میں بادشاہ کے اہل بیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔

بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں نقل کی گئی ہیں؛ جیسے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

اس رائے کا اظہار کرنے والے کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی غرض نہ تھی۔ بلکہ اس کی رائے کی روشنی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ جانتے تھے کہ اسلام میں تقویٰ اور ایمان داری کو نسب پر ترجیح حاصل ہے۔ تو آپ کا خیال یہ تھا کہ اس سے جاہلیت اور اسلام کے حکم کے مابین یگانگت قائم ہو جائے گی۔

مگر جو لوگ صرف اور صرف اسلام کے مطابق چلنا چاہتے تھے؛ اور اسلام کے علاوہ کسی حکم پر راضی نہیں تھے؛ یعنی ایمان اور تقویٰ کو ہی مقدم کرنا جانتے تھے؛ ان میں سے دو افراد نے بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اختلاف نہیں کیا۔ نہ اس قول کے قائلین نے اختلاف کیا اور نہ ہی کسی دوسرے نے کہ ان لوگوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر مضبوط ایمان اور تقویٰ والا

❶ بخاری، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذًا خليلاً“ (ح: ۳۶۶۸)۔ ❷ البخاری ۷/۵۔

کوئی انسان ان میں موجود ہو۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنے اختیار سے اور اطاعت گزاری کے ساتھ ان لوگوں نے باقی امت پر مقدم کیا۔ پس لوگوں کو آپ کو خلافت کے لیے مقدم کرنا آپ کے کمال ایمان و تقویٰ اور لوگوں کی آپ کی اطاعت گزاری کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی کو تقویٰ کی بنیاد پر تقدیم کے پیغام کے ساتھ مبعوث کیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو چیز [یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت] اپنے نبی اور اس کی امت کے لیے اختیار کی تھی؛ وہ ان سب کے حق میں افضل و بہتر تھی۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تر تعریف ہے کہ اس نے اس امت کو ہدایت بخشی۔ اور ہمیں ان کے اطاعت گزاروں میں سے بنایا۔

فصل:

امام معصوم کا تصور اور فہم کتاب و سنت

[اشکال]: شیعہ مسنف لکھتا ہے:

”تیسری بات یہ ہے کہ: امام کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ وحی ختم ہو چکی ہے اور کتاب و سنت میں ان جزئیات کی تفصیل نہیں ہے جو قیامت تک پیش آنے والے ہیں۔ لہذا ایک منصوص من اللہ امام کا وجود ناگزیر ہے، جو خطا اور کجی سے معصوم بھی ہو، تاکہ شرعی احکام میں عدا یا سہواً کمی بیشی نہ کر دے۔ یہ ظاہر ہے کہ بالا جماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرا کوئی شخص ان صفات کا حامل نہ تھا۔“ [بھی کلام الرافضی]

[جواب]: پہلی وجہ: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ امام کا حافظ شریعت ہونا ضروری ہے۔ بخلاف ازیں امت کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے۔ یہ مقصد جس طرح ایک سے حاصل ہوتا ہے اجتماعی طور پر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اہل تواتر کا شریعت کو نقل کرنا ایک شخص کے نقل کرنے سے بہتر ہے۔ جب اگر ہر گروہ میں سے ایک جماعت کے روایت نقل کرنے سے حجت قائم ہو جاتی ہے؛ تو اس سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

تمام بنی آدم کے ہاں اہل تواتر کے نقل کرنے میں اتنی بڑی عصمت پائی جاتی ہے کہ ایسی عصمت انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ اگر حضرت ابو بکر و عمر و عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اگر کہا جائے کہ یہ معصوم ہیں؛ تو جو کچھ باقی مہاجرین و انصار کی جماعت نے نقل کیا وہ ان کی نقل سے زیادہ مبلغ ہے۔

مزید برآں کہ [جب نقل کرنے والا ایک ہو تو] بہت سارے لوگ ناقل کی عصمت پر تنقید کرتے ہیں؛ تو اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ تو پھر اس صورت میں کیا کہا جاسکے گا جب کسی راوی کو امت کے بہت سارے لوگ کافر کہتے ہوں؟ جب بہت سارے خبر دینے والے لوگ کسی چیز کے بارے میں خبر دے رہے ہوں تو اسے مقصود تواتر حاصل ہو جاتا ہے اگرچہ ان کی عدالت کے بارے میں علم نہ بھی ہو۔

دوسری وجہ: ان سے پوچھا جائے گا کہ: کیا تمہاری مراد یہ ہے کہ امام کو شریعت کا محافظ ہونا چاہیے؛ اگرچہ وہ معصوم نہ بھی ہو؟ یہ شریعت کا محافظ صرف وہی ہو سکتا ہے جو معصوم بھی ہو؟ اگر اس کے جواب میں وہ کہیں کہ معصوم ہونا شرط

ہے؛ تو یہ پہلی وجہ ہے؛ اس کا جواب کئی بار گزر چکا ہے۔ اور اگر کہیں کہ صرف شریعت کی حفاظت شرط ہے تو پھر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کتاب و سنت کے سب سے بڑے محافظ تھے؛ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑے عالم تھے۔ بلکہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ سے بڑھ کر عالم دین تھے۔ لہذا شیعہ کا اجماع کا دعویٰ باطل ٹھہرا۔

تیسری وجہ: ان سے پوچھا جائے گا کہ: کیا آپ محافظ شریعت اور معصوم ہونے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے، لہذا شرع کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی مسئلہ کا آپ سے منقول ہونا ضروری ہے۔ تو پھر کیا کسی چیز کا صحیح ہونا آپ سے منقول ہوئے بغیر بھی معلوم ہو سکتا ہے؟ اگر شیعہ جواب میں کہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے؛ تو پھر ہمیں نہ ہی کسی محافظ شریعت کی ضرورت ہے؛ اور نہ ہی کسی معصوم کی۔ اس لیے اس کے بغیر بھی شریعت کی حفاظت ممکن ہے۔ کوئی بھی دوسرا یہ خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ یہاں تک پوری شریعت کی حفاظت بغیر معصوم کے ممکن ہے۔

اور اگر شیعہ کہیں کہ: ایسا نہیں بلکہ کسی بھی چیز کی صحت کی معرفت کے لیے اس کا محافظ شرع امام معصوم سے معلوم ہونا ضروری ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: تو پھر اس صورت میں امام معصوم سے منقول ہوئے بغیر اہل ارض پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ لازم آیا کہ اہل زمین پر حجت قائم کرنے کے لیے آپ سے نقل کا ہونا ضروری ہے۔ اور نقل کی صحت اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک آپ کا معصوم ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا علم ہمیں اس بات سے حاصل ہوا کہ دوسرا کوئی شخص بالاجماع معصوم نہیں۔ اگر معصومین کا اجماع ہو تو شریعت کی حفاظت اس سے ممکن ہے اور اگر وہ معصومین کا اجماع نہیں ہے تو ہمیں اس کا غلطی سے پاک ہونا بھی معلوم نہیں ہے۔

چوتھی وجہ: جو لوگ محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں ان کے ہاں آپ کی نبوت کس چیز سے ثابت ہوتی ہے؟

اگر اس کے جواب میں کہیں کہ: ”امام کے نبی کریم ﷺ کے معجزات بیان کرنے سے۔“

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو نہ مانتا ہو؛ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کو بھی نہیں مانے گا۔ بلکہ ان کی امامت بطریق اولیٰ قدح کرے گا۔ بلکہ وہ نبوت اور امامت دونوں میں قدح کرے گا۔“

اور اگر وہ کہیں کہ: پوری امت نبی کریم ﷺ کے جو معجزات تو اتر کیساتھ نقل کرتی چلی آئی ہے؛ جیسے قرآن وغیرہ سے؛ [ان کے ہاں نبوت محمدی ثابت ہوگی]۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”جب امت کے تواتر کے ساتھ نقل کرنے سے حجت اور اصل نبوت ثابت ہوتی ہے؛ تو پھر اس سے شریعت کے فروعی مسائل کیسے ثابت نہیں ہو سکتے؟“

پانچویں وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا امام ہر فرد بشر تک شرعی احکام کو بتواتر پہنچا سکتا ہے؟ یا یہ کہ شرعی احکام ایک معصوم سے دوسرے معصوم تک منتقل ہوتے رہتے ہیں؟

اگر امام کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے تو رسول ﷺ کے لیے بطریق اولیٰ ممکن ہے۔ اندریں صورت نقل امام کی حاجت نہ ہوگی۔ اور اگر شیعہ کہیں کہ امام ایسا نہیں کر سکتا؛ تو اس سے یہ لازم آیا کہ دین اسلام کا نقل کرنے والا اقارب رسول میں سے ایک شخص فرد واحد ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں منکر رسالت قدح کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اقارب جو چاہتے ہیں

رسول کے بارے میں کہتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کا دین یہود و نصاریٰ کے دین سے بھی برا ہو جائے گا جو علم دین کی روایت و نقل کو صرف اپنے علماء کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔

چھٹی وجہ: انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے؛ اس سے قدر نبوت میں نقص واقع ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ جس کے بارے میں معصوم اور محافظ شریعت ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے؛ وہ نبی کریم ﷺ کے اقارب میں سے ہے۔ اس سے نبوت پر بہت بڑی تہمت لگتی ہے۔ اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ: ”اس سے یہ لازم آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حکومت و سلطنت کے حریص اور طلبگار تھے؛ انہوں نے اپنے اقارب کے لیے عہد لیا؛ اور اب آپ کے بعد ان کے اقارب امور سلطنت کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اور کسی دوسرے سے کوئی دین کی بات معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں یہ معاملہ انبیاء کے حکم کے بجائے بادشاہوں کے حکم کے مشابہ لگتا ہے۔

ساتویں وجہ: ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ دین کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کیلئے معصومین کی ضرورت ہے۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ صحابہ کرام ہی وہ معصوم ہوں جنہوں نے قرآن و حدیث کی حفاظت کی؛ جن سے دین کا مقصد پورا ہوا اور جنہوں نے دین کو کائنات ارضی کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔ اور اس میں کیا برائی ہے کہ ہر گروہ کو حفظ دین اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اسی قدر عصمت حاصل ہو جس حد تک وہ اس کا حامل ہے۔ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ دین کی تبلیغ اور حفاظت میں عصمت کا مقصد اس کے نقل [روایت] کرنے والوں سے حاصل ہو جاتا ہے اگرچہ وہ امام نہ بھی ہوں۔

آٹھویں وجہ: ان سے پوچھا جائے گا کہ: ایسے جائز کیوں نہیں ہے کہ دین کی حفاظت اور تبلیغ کے لیے ہر گروہ کے اس کے تحمل شریعت کے مطابق معصوم قرار دیا جائے۔ مثلاً قراء حفظ قرآن اور اس کی تبلیغ میں معصوم ہیں۔ اسی طرح محدثین احادیث صحیحہ کے حفظ و ابلاغ میں معصوم ہیں۔ اور فقہاء فہم کلام اور استدلال اور احتجاج میں معصوم ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک معدوم امام سے بے نیاز کر دیا ہے۔

نویں وجہ: اگر شریعت کے حفظ و ابلاغ کا کام ایک معصوم ہی انجام دے سکتا ہے جو دوسرے معصوم سے اخذ کر رہا ہو تو یہ کیا بات ہے کہ چار سو ساٹھ سال کے طویل عرصہ میں کسی نے امام منتظر سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا؟ اب سوال یہ ہے کہ پھر شیعہ نے قرآن کریم اور دین کا علم کہاں سے حاصل کیا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ جو قرآن وہ پڑھ رہے ہیں وہ اس قرآن سے الگ ہو جو نازل ہوا تھا؟ بلکہ اس میں کلام اللہ کا ایک حرف بھی نہ ہو [جیسا کہ بعض شیعہ کا عقیدہ ہے]۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں نبی کریم ﷺ اور [حضرت علی رضی اللہ عنہ] کے حالات اور احکام سے کیوں کر آگاہی ہوئی۔ جب کہ بذات خود تم نے کسی معصوم سے اس ضمن میں کچھ نہیں سنا۔ اس لیے کہ وہ امام یا تو مفقود ہے یا پھر معدوم ہے۔ اگر شیعہ کہیں کہ: ہمارے نزدیک ائمہ معصوم سے اس کی نقل و اتار کی حد تک معروف ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ جب تمہارے ائمہ کا تواتر تحفظ شرع کا موجب ہے تو پوری امت کا تواتر اس کی نسبت اولیٰ و احریٰ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے نہ کہ ایک شخص کی نقل کو دوسرے سے معتبر تسلیم کیا جائے۔

شیعہ کہتے ہیں: ان کے پاس قبل از امام منتظر لوگوں سے منقول جو موروثی علم موجود ہے؛ اس نے انہیں بے نیاز کر دیا ہے

کہ امام منتظر سے کوئی نئی چیز حاصل کریں۔ [اگر واقعی ایسے ہی ہے] تو پھر جو کچھ امت کے پاس نبی کریم ﷺ سے منقول علم موجود ہے [اور جس صحت بھی ثابت ہے] یہ علم آپ کو دوسرے لوگوں سے علوم اخذ کرنے سے بے نیاز کیوں نہیں کر دیتا؟ جب یہ لوگ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ بارہ اماموں میں سے کوئی ایک بھی جو روایت نقل کرتا ہے؛ وہ ان کے ہاں ثابت ہوتی ہے تو پھر جو روایات باقی امت نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہے؛ وہ ثابت کیوں نہیں ہو سکتی؟

یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ مجموعی طور پر امت رافضیوں سے کئی گنا زیادہ اور بڑھ کر ہے۔ اور وہ رافضیہ کی نسبت دین کی حفاظت اور اس کی تبلیغ میں بڑے حریص بھی ہیں۔ اور رافضیوں کی نسبت اقوال کی حفاظت اور ان کے نقل کرنے پر زیادہ قدرت بھی رکھتے ہیں۔ یہ بات کسی بھی ادنیٰ معرفت رکھنے والے انسان پر بھی مخفی نہیں۔

دسویں وجہ: شیعہ مصنف سے کہا جائے گا کہ تمہارا یہ قول کہ ”وحی منقطع ہو جانے کی وجہ سے نصوص تفصیل احکام سے قاصر ہیں۔“ اس سے تم کیا مراد لیتے ہو؟ کیا تمہاری مراد کسی خاص جزئیہ کے بیان میں قصور یا کمی ہے؟ یا پھر تمہاری مراد کلی قصور جو تمام جزئیات کو شامل ہے؟

اگر تم کہو گے کہ میری مراد پہلی ہے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہر امام کا کلام اسی منزلت پر ہوتا ہے۔ ہر امیر کا طریق کار یہی ہوتا ہے۔ امیر جب عوام الناس سے مخاطب ہوتا ہے تو عوامی طرزِ خطاب اختیار کرتا ہے۔ جو کہ افراد اور افعال کو شامل ہوتا ہے؛ اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ فاعل کے ہر فعل کو ہر وقت میں معین کر دے۔ پس اس کے لیے صرف خطاب عام اور کلی کا ہونا ہی ممکن ہے۔ جہاں تک خطاب عام کلی کا تعلق ہے اور خطاب عام کلی رسول کے لیے بھی ممکن ہے۔ اگر روافض کہیں کہ نصوص رسول اللہ ﷺ قواعد کلیہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ ممنوع ہے۔ اور اگر نصوص رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تمہارا نظریہ مان لیا جائے؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ تو سب سے کامل و اکمل ہیں۔ تو پھر یہ بھی یہ مان لینا پڑے گا کہ امام کی نصوص کی کامل و کلی نہیں ہو سکتیں۔ پس اس صورت میں شیعہ کو خطاب امام میں دو میں سے ایک چیز کی ضرورت ہوگی:

۱۔ عموم الفاظ کا ثبوت۔
۲۔ یا پھر عموم معانی کا ثبوت۔

ان میں سے جو بات بھی امام کے لیے ثابت کی جائے گی؛ وہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے لیے خود بخود ثابت ہوگی۔ اندر میں صورت ہمیں بیان احکام کے لیے کسی امام کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

گیارہویں وجہ: اس سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ [ابراہیم ۴]

”ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تاکہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء ۱۶۵]

”تاکہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر رہ نہ جائے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ [النور ۵۴]

”رسول کے ذمے تو صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔“

ان کے علاوہ بھی اس طرح کی کئی آیات ہیں۔ تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں: کیا مخلوق پر رسول کے اس بیان کے بعد حجت قائم ہوگئی ہے یا نہیں؟ اگر حجت قائم نہیں ہوئی تو پھر یہ آیات اور ان کے معانی باطل ٹھہرے۔ اور اگر حجت قائم ہوگئی ہے تو پھر اس کے بعد کسی دوسرے متعین شخص کی حاجت باقی نہ رہی جو لوگوں کے لیے مزید کوئی چیز بیان کرے۔ چہ جائے کہ وہ تبلیغ دین کا محافظ بھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے کلام میں اپنے رسول ﷺ کی حدیث روایت اور بیان کرنے کی وجہ سے جو قوت نافعہ رکھی وہ کافی و ثانی ہے۔ خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے، بنا بریں کلام پاک تبدیل و تغیر سے مامون و مصون ہے۔

خلاصہ کلام! شیعہ کا یہ دعویٰ کا دین اسلام کی حفاظت اور اس کا فہم صرف ایک معین شخص کے ذریعہ ہی ممکن ہے؛ یہ اصول دین میں بہت بڑا فساد اور بگاڑ ہے۔ اس قول کے لوازم کو جانتے ہوئے صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو پکا زندیق اور طرد ہو۔ جس کا مقصد دین اسلام کی بنیادوں پر وار کرنا ہو۔ اور اس قول کو لوگوں میں صرف جاہل اور گمراہ انسان ہی پھیلا سکتا ہے [جو کہ نام نہاد محبت آل بیت کے نعرہ کا شکار ہو کر ان کے دام فریب میں پھنس جائے]۔

بارہویں وجہ: ان سے کہا جائے گا: پھر یہ بات ہر کس و نا کس کو معلوم ہے کہ اکثر مسلمانوں کو قرآن و حدیث کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وساطت کے بغیر حاصل ہوا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بلاد و امصار کو فتح کیا تو وہاں ایسے معلم صحابہ بھیجے، جنہوں نے لوگوں کو دینی و فقہی مسائل کی تعلیم دی۔ پھر ان لوگوں کی بدولت باقی مسلمانوں نے علم دین سیکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علم دین کو اسی حد تک پہنچایا جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے پہنچایا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ اگر ہم شیعہ کا دعویٰ مان لیں کہ دین صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے ہی پہنچ سکتا ہے تو [تمام بلاد و امصار کے] عوام الناس کا دین باطل ٹھہرے گا۔ [کیونکہ ان تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات نہیں پہنچی] یا بہت کم روایات پہنچی ہیں جن سے دین کا مقصد حال نہیں ہو سکتا۔ اور یہ روایات بھی متواتر نہیں ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں کوئی معصوم بھی نہیں ہے جس کی طرف رجوع کرنا ممکن ہو۔

لا حول و لا قوة إلا باللہ؛ ما شاء اللہ! روافض کی جہالت اور حماقت کے کیا کہنے؟

امام معصوم کا تعین قدرت الہی کی دلیل؟:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”چوتھی بات: اللہ تعالیٰ نصب امام کی قدرت سے بہرہ ور ہے اور اس میں کچھ خرابی بھی نہیں۔ بلکہ دنیا کی ضرورت اس کی داعی ہے، اور امام نصب کرنا واجب ہے۔ جب بالا جماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور میں یہ اوصاف موجود ہی نہیں تو صرف وہی خلیفہ برحق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا اس قدرت سے بہرہ ور ہونا صاف ظاہر ہے؛ اور دنیا کی ضرورت و حاجت

کا ہونا بھی ظاہر ہے؛ اس لیے کہ ہم عالم میں اختلاف کے واقع ہونے کو پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس سے خرابی کی نفی بھی ظاہر ہے؛ اس لیے کہ خرابی تو امام کے نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب کہ امام کو نصب کرنے کا وجوب اس لیے ہے کہ جب قدرت بھی ثابت ہوگئی؛ اور دنیا کی ضرورت بھی ثابت ہوگئی؛ اور خرابی کی نفی بھی ہوگئی تو اب امام کو متعین کرنا ہی واجب ہو گیا۔ [اشکال ختم ہوا]۔

[جواب]: یہ محض تکرار ہے ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں؛ اور اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اس لیے کہ اس کا پہلا مقدمہ ہی باطل ہے؛ اور اس کے استدلال کی خرابی بھی صاف ظاہر ہے۔ اس لیے کہ اس کے بیان کی بنیاد اجماع سے حجت پکڑنے پر ہے۔ [ہم بیان کر چکے ہیں کہ] اجماع اگر معصوم ہے تو عصمت علی رضی اللہ عنہ کی حاجت نہیں۔ اور اگر اجماع معصوم نہیں تو عصمت علی رضی اللہ عنہ پر اس کا دلالت کرنا باطل ہے۔ ہر دو صورتوں میں شیعہ کی دلیل باطل ٹھہرتی ہے۔

بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ رافضی جن چیزوں سے اپنے اصول دین ثابت کرتے ہیں، انہیں وہ اجماع اور نصوص کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ پوری امت میں نصوص اور اجماع کی معرفت اور ان سے طریقہ استدلال سے رافضیوں سے بڑھ کر جاہل کوئی دوسرا نہیں۔ بخلاف اہل سنت والجماعت؛ اس لیے کہ سنت نصوص کو متضمن ہے؛ اور جماعت اجماع کو متضمن ہے؛ پس اہل سنت والجماعت نصوص اور اجماع کے پیروکار ہیں۔

اب ہم رافضی کے اس بیان کے فاسد ہونے پر بات کرتے ہیں؛ اس بیان کے خراب و فاسد ہونے کی کئی وجوہات ہیں: پہلی وجہ: ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ امام نصب کرنے کی کسی حاجت کی وجہ موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ امت کی عصمت انہیں امام کی عصمت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ علماء کرام نے اس امت کی عصمت کی حکمتوں میں یہ ذکر کیا ہے۔

وہ علماء کرام فرماتے ہیں: ”اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سے پہلی امتوں میں جب لوگ دین میں کوئی تبدیلی کر دیتے تو اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرماتے؛ تاکہ وہ ان کے لیے حق بات کو واضح کر دیں۔ چونکہ اس امت کے بعد کوئی نبی نہیں ہے؛ اس وجہ سے ان کی عصمت نبوت کے قائم مقام ہے۔ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دین میں سے کوئی چیز بدل دے۔ جب بھی کوئی ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ کسی ایسے انسان کو کھڑا کر دیں گے جو اس میں تبدیل کردہ غلطی کو واضح کر دے گا۔ پس ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم کو قائم کرتی رہے گی جو ان کو رسوا کرنا چاہے گا یا مخالفت کرے گا تو ان کا کچھ بھی نقصان نہ کر سکے گا اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے۔“ [اصحیح مسلم: ج ۵۸: ۴۵۸]

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے نبی کی زبان پر اس بات سے بچالیا ہے کہ تم گمراہی پر جمع ہو جاؤ۔“ [ابو داؤد: ۴۷۹/۱۲۹]

ان کے علاوہ بھی کئی ایک دلائل ہیں جن کی روشنی اجماع کا درست ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری وجہ: اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ معصوم کے موجود ہونے کی صورت میں امت کی حالت اکمل ہوگی؛ تو بلاشبہ معصوم ناسخین کی موجودگی میں بھی ان کی حالت تمام و کمال سے بہرہ ور ہوگی اور اگر وہ بذات خود معصوم ہوں تو یہ

اور بھی بہتر ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جسے لوگ مانتے ہوں [یا اپنے حق میں بہتر خیال کرتے ہوں] اللہ تعالیٰ بھی وہی کرے؛ اور اللہ تعالیٰ پر ایسا کرنا واجب بھی نہیں ہے۔ [اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے۔] اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ ”جب معصوم نہ ہوگا تو لوگ جہنم میں جائیں گے اور دنیا میں زندہ نہ رہ سکیں گے یا یہ کہ سخت مصیبتیں آئیں گی۔“

ہم کہتے ہیں کہ بغرض محال اگر یہ درست ہے؛ تو تم نے یوں کیوں نہ کہا کہ مصائب و آلام کا ازالہ ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں بیماریاں اور ہوم و غوم موجود ہیں۔ اس کے علاوہ گھریاں اور مال میں مصائب؛ گرائی اور حوادث و آلام بھی پائے جاتے ہیں۔ پھلوں [اور فصلوں] کو مصیبت کا پہنچنا بھی موجود ہے۔ امام مظلوم کے ظہور پذیر ہونے کی صورت میں اسے جو ضرر لاحق ہوتا وہ ان مصائب سے زیادہ نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ازالہ بھی نہیں کیا۔ تیسری وجہ: شیعہ کا کہنا ہے کہ: ”قدرت اور داعی کے ثبوت؛ اور صارف کی نفی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر امام کو نصب کرنا واجب ہو گیا۔“

اس سے پوچھا جائے کہ: اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ: داعی ثابت ہے؛ اور صارف کی نفی ہے؟ اور شیعہ کا قول: ”عالم [دنیا] کی ضرورت امام نصب کیے جانے کی داعی ہے؟“ اس سے کہا جائے گا کہ: ”داعی تو وہ ہوتا جس کسی فاعل کا داعی ہو۔ تو تم نے یہ کیوں کہا کہ صرف ضرورت اللہ تعالیٰ کے لیے امام نصب کرنے کی داعی ہے۔“

ایسے ہی شیعہ نے ”انقضاء صارف“ کا کہا ہے۔ اس نے صرف اس کے داعی میں خرابی کے نہ ہونے کو انقضاء صارف [اور نصب امام کی ضرورت کے] طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ اس میں سرے سے کوئی خرابی ہے ہی نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ بشری حوائج و ضروریات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مثلاً انسان کو صحت و قوت مال و سرور اور لاتعداد امور کی ضرورت ہے۔ چوتھی وجہ: شیعہ کا کہنا ہے کہ: ”بیشک اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔“

کیا اس سے اس کی مراد ایسا معصوم ہے جو کہ نیکی کے کام بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے اور برائی کے کام بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کو پیدا کرتا ہے؛ جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے؟ یا پھر تمہاری مراد یہ ہے کہ امام معصوم اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اختیار کے بغیر ہی اطاعت گزاری کے کام کرتا ہے؟

اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد پہلی ہے تو ان کے اصولوں کے مطابق یہ باطل ہے۔ شیعہ کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ اس تفسیر کے مطابق معصوم مومن کو پیدا کرنے پر قادر نہیں؛ جیسا کہ ان کے ہاں اللہ تعالیٰ مومن و کافر کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس لیے کہ شیعہ کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ زندہ اور مختار کے فضل پر قدرت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی برائی کو چھوڑ کر محض نیکی کا ارادہ پیدا کرتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد دوسرا نکتہ ہے۔ تو پھر اس معصوم کو نیکی کا کام کرنے پر اور برائی کے ترک کرنے پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ تو اس صورت میں وہ تمام لوگ جو نیکی کا کام کرنے پر اور برائی کے ترک کرنے پر اجر و ثواب سے نوازے جائیں

گے وہ اس امام معصوم کی نسبت بہتر ٹھہرے۔ [کہ اسے عمل کے باوجود اجر نہیں مل رہا؛ لیکن لوگ عمل کر کے اجر کمار ہے ہیں۔]

تو پھر وہ امام معصوم اہل ثواب لوگوں سے افضل کیونکر ہو سکتا ہے جس کے پاس کوئی ثواب ہی نہ ہو۔؟

[اب سوال یہ ہے کہ وہ معصوم کو پیدا کرنے پر کس طرح قادر ہے؟ یہ بات پہلے گزر چکی ہے] اس سے شیعہ مذہب کا تناقض بھی کھل کر سامنے آیا۔ ایک طرف ان کا یہ دعویٰ ہے کہ معصوم کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ دوسری جانب ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار سے کسی کو اس طرح معصوم نہیں بنا سکتا کہ اسے طاعات و عبادات کا اجر دیا جائے اور معاصی کی سزا دی جائے۔^۱

پانچویں وجہ: شیعہ سے پوچھا جائے گا: تمہارا یہ قول مجمل ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔“ بیشک یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اس جسم کو کالا اور سفید؛ متحرک اور ساکن؛ زندہ اور مردہ بنا دے۔ یہ صحیح ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو سفید بنا دے؛ وہ چاہے تو کالا بنا دے۔ وہ چاہے تو اسے زندگی دیدے اور چاہے تو اسے مار دے لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہو سکتی کہ ایک ہی حالت میں کالا اور سفید بنا دے؛ اس لیے کی دو الٹ چیزوں کا جمع ہونے بذات خود ممنوع ہے۔ جو کوئی چیز نہ ہو؛ اسے آپ چیز نہیں کہہ سکتے۔ اس پر لوگوں کا اتفاق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں داخل نہیں:

﴿وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة ۲۸۳]

”اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔“

بات جب ایسے ہی ہے؛ تو پھر تمہارا یہ عقیدہ کہ: ”اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے“ اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ امام مقرر کرے اور نیکی کے کام بجالانے اور برائی ترک کرنے کا الہام کرے؛ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے؛ جیسا کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ امام کی طرح تمام بشریت کو معصوم بنا دے اور بشریت میں سے ہر ایک آدمی کو نبی بنا دے۔ اور اس طرح کے دیگر امور بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں۔

اور اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو اس کے وجود کے منافی ہے؛ یعنی اس حکمت کا وجود اس کے عدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو اس میں دو الٹ چیزوں کا اجتماع [اکٹھا ہونا] لازم آتا ہے۔ آپ نے یہ کہاں سے سیکھا ہے کہ: ”حکمت کی تمام اقسام اس کے وجود کے منافی ہیں۔“

اور اگر لوگوں کے لیے امام نہ ہو؛ اور اطاعت گزاروں کے لیے اتنے بڑے اجر کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو؛ تو پھر اس صورت میں اطاعت کی معرفت اور اس پر عمل لوگوں پر بہت شاق گزرتا۔ اور اس کا ثواب بہت زیادہ ہوتا۔ اور یہ ثواب امام معصوم کے وجود کی صورت میں فوت ہو جاتا ہے۔

۱ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا معصوم تحصیل مصالح اور ازالہ مفاسد پر قادر ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا معصوم عاجز ہونے کی صورت میں بھی معصوم رہے گا؟ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ بصورت مجر بھی وہ معصوم ہی رہے گا؛ کیوں کہ عاجز سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ قدرت کا ہونا اس میں شرط ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تحصیل مصالح پر قادر ہے تو یہ بات اس سے ظاہر نہیں ہوتی، لہذا یا وہ معصوم نہیں بلکہ عاصی ہوگا اور یا عاجز ہوگا۔

ایسے ہی لوگوں کا شریعت کی حفاظت کرنا؛ دین کی سمجھ اور سوچ بوجھ حاصل کرنا؛ اور دین کی معرفت کے لیے ان کا اجتہاد کرنا امام معصوم کے وجود کی صورت میں ختم ہو جاتا اور یہ حکمتیں اور مصلحتیں بھی ختم ہو جاتیں۔

ایسے ہی امام معصوم کے وجود کو تسلیم کرنے کی صورت میں غیر نبی کو نبی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے اقارب و خواص پر سب سے بڑا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ واجب ہے کہ امام کے ہر ایک قول پر ایمان لایا جائے؛ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ کے ہر ایک فرمان پر ایمان لانا واجب ہے؛ تو پھر اس میں نبوت کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو دیا ہے؛ ہم اس پر ایمان رکھیں۔ اگر کوئی اور انسان بھی معصوم ہونے میں ان انبیاء کرام علیہم السلام کے برابر ہو تو پھر اس کے بھی ہر ایک قول پر ایمان لانا واجب ہو جائے؛ اس طرح نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق ختم ہو جائے گا۔

چھٹی وجہ: شیعہ سے پوچھا جائے کہ: وہ معصوم جس کی ضرورت کا داعیہ موجود ہے؛ کیا وہ امام مصلحتوں کے حصول اور مفاسد کے ختم کرنے پر قادر ہے؟ یا پھر وہ ان امور کو بجالانے سے عاجز ہے؟ اس کا عاجز ہونا ممنوع ہے۔ اس لیے کہ عاجز سے نہ تو کوئی مصلحت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی فساد کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ قادر ہونا اس کے لیے شرط ہے۔ اس لیے کہ معصوم ہونے کا فائدہ یہی ہے کہ اصلاح کا پہلو اور عنصر موجود ہو۔ لیکن قادر ہونے کے بغیر داعی کا ہونا حصول مطلوب کو واجب نہیں کرتا۔

اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ: ”امام معصوم اس پر قادر ہے۔“

تو اس سے کہا جائے گا کہ: یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اگر یہ بارہ امام اس امر [فساد کے خاتمہ؛ اور اصلاح] پر قادر تھے؛ او راہوں نے پھر بھی ایسا نہیں کیا؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ نافرمان اور گنہگار تھے۔ اور اگر اس پر قدرت نہیں رکھتے تھے تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ عاجز تھے۔ ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات قطعی طور پر لازم ہے۔ یا پھر دونوں ہی باتیں لازم ہیں کہ ائمہ نہ ہی معصوم ہیں؛ اور نہ ہی قدرت رکھتے ہیں؛ بلکہ عاجز بھی ہیں۔ معاملہ جب ایسے ہی ہے تو ضرورت کے تحت اس امام معصوم کے وجود پر استدلال کا حنفی ہونا جانتے ہیں؛ اس لیے کہ ضروریات کا استدلال سے تعارض نہیں ہو سکتا۔

ساتویں وجہ: یہ مسئلہ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی ایسے ہی باقی ہے۔ اس زمانے میں بھی کسی کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ جان سکے کہ امام معصوم نے کیا کہا ہے [اور کس چیز کا حکم مایع کیا ہے]۔ چہ جائے کہ اس امام سے کوئی فائدہ حاصل ہو؛ یا اس سے کسی خرابی کا خاتمہ ہوا ہو۔ پس اس وجہ سے جو کچھ رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے وہ سب باطل ہے۔

آٹھویں وجہ: اللہ سبحانہ و تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ اس امام کے نصب کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ جو عوم نفی کی گئی ہے اس کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے؛ اس کے لیے خرابی کے علم کا نہ ہونا کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہی معدوم ہے۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ غیر نبی کی اطاعت اور تصدیق کو نبی کی اطاعت اور اس کی تصدیق کے مساوی کیا جا رہا ہے۔ جو کوئی دوسرا نبی کے ساتھ ہر بات کی اطاعت میں اور ہر چیز کی تصدیق میں اور ان سے ہر غلطی کی نفی میں برابر کا شریک ہو؛ تو پھر ہم پوچھتے ہیں کہ نبی

کے وہ کون سے انفرادی خصائص باقی رہ گئے جن کی وجہ سے یہ نبی ہو گئے؟
اگر یہ کہا جائے کہ: نزول وحی کی خصوصیت باقی رہتی ہے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر یہ [اصلاح کا] مقصود نزول وحی سے حاصل ہو گیا تھا؛ تو الحمد للہ اس تھکاوٹ اور سختی سے نجات مل گئی جو انبیاء کرام برداشت کرتے ہیں؛ اور وہ اس مقصود میں شریک ہو گیا۔

مزید برآں عصمت حق تعالیٰ کی طرف سے اسے الہام کرنے سے حاصل ہوتی ہے؛ اسی کو وحی کہتے ہیں۔

نیز یہ کہ یہ امام یا تو انہی چیزوں کی خبر دے گا جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے؛ اور وہی حکم دے گا جو نبی نے دیا ہے۔ اور اسی چیز سے منع کرے گا جس سے نبی نے منع کیا ہے۔ یا ان سے کچھ زیادہ احکام جاری کرے گا۔

پہلی صورت میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ باتیں تو رسول اللہ ﷺ کے بتانے اور آپ کے حکم دینے سے معلوم ہو گئی ہیں۔ اور آپ ان احکام کے بتانے میں معصوم ہیں [یہی نبوت ہے] اور آپ خود نبی ہیں؛ کسی دوسرے کی طرف سے کوئی پیغام نہیں پہنچاتے رہے۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ: امام معصوم کا کام رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو محفوظ رکھنا ہے۔

تو اس سے پوچھا جائے گا: کیا وہ شریعت کو اپنی ذات کے لیے محفوظ کرے گا یا اہل ایمان کے لیے؟ اگر وہ شریعت کو اپنی ذات کے لیے محفوظ کرے گا تو پھر لوگوں کو ایسی شریعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ وہ شریعت کو لوگوں کے لیے محفوظ کرے گا [تو پھر سوال یہ ہے کہ] وہ شریعت لوگوں تک کیسے پہنچے گی؟ کیا وہ خبر متواتر سے لوگوں تک پہنچے گی یا پھر خبر واحد سے؟ اور جو لوگ امام معصوم سے غائب ہیں ان تک شریعت کیسے پہنچے گی؟ کیا واسطوں بغیر کسی رسول کے ذریعہ سے ان تک پہنچے گی؟

خلاصہ کلام! رسول اللہ ﷺ کے بعد اس امام معصوم کے وجود میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ ہر مصلحت اس امام کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس امام معصوم کا عقیدہ و نظریہ رکھنے میں اتنی بڑی خرابی ہے جو کہ اس کے نہ ہونے سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ پس اس بنا پر شیعہ کا یہ کہنا کہ: ”حاجت امام کی داعیہ ہے۔“ ایک باطل اور بے اصل قول ہے۔

اور ایسے ہی یہ کہنا کہ: ”امام کے نہ ہونے میں خرابی ہے“ یہ بھی بے بنیاد اور ممنوع نظریہ و عقیدہ ہے۔

بلکہ حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خرابی تو امام کے ساتھ موجود ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی منفعت نہیں ہے۔ جب اس امام کا صرف اعتقاد رکھنے سے اتنی بڑی خرابی پیدا ہوئی ہے تو پھر اگر امام صاحب خود موجود ہوتا تو کیا حال ہوتا؟

[عصمت امام کی ایک اور اندھی بہری دلیل:]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”پانچویں وجہ: امام کا اپنی رعیت سے افضل ہونا ضروری ہے، یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فاضل دوراں

و یکتائے زمان تھے، لہذا وہی امام ہوں گے اس لیے کہ فاضل کی موجودگی میں مفضول کا تقدم عقلاً و شرعاً قبیح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَقْنِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يَهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ [یونس ۳۵]

”پھر آیا جو شخص حق کا راستہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بغیر بتائے خود ہی راستہ نہ سوجھے پس تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔“ [اسی کا نام الرافضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی بات: مصنف کا قائم کردہ دوسرا مقدمہ ممنوع ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے زمانے میں سب سے افضل تھے۔^۱ بلکہ نبی کریم ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اس امت کے افضل ترین لوگ تھے۔ جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں سے بھی ثابت ہے۔ اس کا تفصیلی جواب آگے آئیگا۔ [اور پھلے بھی گزر چکا ہے]۔

دوسری بات: ہمارے اصحاب اور دوسرے لوگوں میں سے جمہور سب کا یہی کہنا ہے کہ امکان موجود ہونے کی صورت میں افضل انسان کو والی بنانا واجب ہے۔ لیکن اس رافضی مصنف نے اپنے اس مقدمہ پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اس میں بہت سارے علماء کرام کے مابین اختلاف بھی ہے۔ جب کہ مذکورہ بالا آیت میں اس رافضی کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں بیان ہے کہ جو کوئی خود حق کی طرف راستہ بتانے والا یا پھر جسے بتائے بغیر راستہ کا پتہ ہی نہ چلتا ہو۔ اور مفضول پر راستہ پانا اس وقت تک واجب نہیں ہے جب تک فاضل اسے راستہ نہ دیکھا دے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سارے لوگ فاضل سے تعلیم حاصل کیے بغیر بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مفضول فاضل سے زیادہ علم والا ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے افضل انسان کی موت آجائے اور یہ جو زندہ موجود ہے اس نے افضل سے کچھ بھی تعلیم حاصل نہ کی ہو۔

پس مطلق طور پر حق کی طرف ہدایت دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جو راہ بتائے بغیر ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا وہ ساری مخلوق ہے۔ مخلوق کو جب تک اللہ تعالیٰ ہدایت سے نہ نوازیں اس وقت تک ہدایت نہیں پاسکتے۔ اور اس آیت سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مخلوق کی نسبت اللہ تعالیٰ عبادت کا زیادہ حق دار ہے؛ جیسا کہ اس آیت کے سیاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَن يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يَهْدَىٰ﴾ [یونس ۳۵]

”آپ فرمادیجیے: تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ حق کا راستہ بتاتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی حق کا راستہ بتاتا ہے تو پھر آیا جو شخص حق کا راستہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بغیر بتائے خود ہی راستہ نہ سوجھے۔“

ان آیات کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے شروع کی تھی:

۱ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کونہ کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا تھا: ”اس امت میں نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل ابو بکر اور پھر عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔“ مسنن ابن ماجہ، باب فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ج: ۱۰۶)، مسند احمد (۱/۱۰۶)۔

﴿قُلْ مَنْ يُزِقُّكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾
 ”آپ فرمادیجیے: وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔“ [یونس ۳۱]

اور یہ بیان آگے تک جاری رہا؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ مِنْ شَرِكَاكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ﴾ [یونس ۳۵]
 ”فرمادیجیے: تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ حق کا راستہ بتاتا ہے؟“

مزید براں اکثر علماء کے نزدیک افضل کو حاکم تعینات کرنا واجب ہوتا ہے۔ جب مفضل کو والی بنانے میں کوئی راجح مصلحت نہ پائی جاتی ہو؛ اور افضل کی ولایت میں کوئی خرابی نہ ہو۔ ان مباحث پر وہ لوگ گفت و شنید کرتے ہیں جن کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ؛ بعض معتزلہ؛ اور متوقفہ یہی نظریہ رکھتا ہے۔

جب کہ اہل سنت والجماعت اس مقدمہ کے امتناع کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک تمام امت کے لوگوں میں سب سے افضل ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم رافضیوں کے لیے واضح کریں کہ اگر یہ حق کہنا چاہیے تو اس پر کسی صحیح دلیل سے استدلال کرنا ان کے بس کا کام نہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے بہت سارے علم کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے حق بیان کرنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خوارج کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت کر سکیں۔ اور نہ ہی مروانیہ فرقہ اور آپ سے جنگ کرنے والوں کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جن دلائل سے رافضی استدلال کرے گا اسی جنس کے دلائل ان کے پاس بھی موجود ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کی جہالت اور خواہش پرستی؛ اور لاعلمی کی وجہ سے ان کے باطل اقوال پر کتنا فساد اور تناقض لازم آتا ہے۔

[رافضی مصنف کے بودے دلائل]:

[اشکال]: شیعہ مصنف امامت علی رضی اللہ عنہ پر قرآنی دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”ووسرا منج: قرآن سے مأخوذ دلائل اور براہین جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؛ بہت کثرت کے ساتھ ہیں۔“
 اول:..... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾

”بیشک تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔“ [المائدہ ۵۵]

علماء کا اجماع اس بات پر منعقد ہو چکا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ثعلبی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ”میں نے نبی کریم ﷺ سے اپنے ان دوکانوں کے ساتھ سنا اور اگر نہ سنا ہو تو یہ بہرے ہو جائیں۔ اور میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا؛ اگر نہ دیکھا ہو تو میری دونوں آنکھیں اندھی ہو جائیں۔“ فرماتے

تھے: ”علیؑ نیکوں کے قائد اور کفار کے قاتل ہیں، جو ان کی مدد کرے گا اس کی مدد کی جائے گی، اور جو ان کو بے یار و مددگار چھوڑے گا تو اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔“ میں نے ایک دن نبی کریم ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ اتنے میں ایک سالک نے آکر سوال کیا مگر کسی نے اسے کچھ بھی نہ دیا، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا: ”اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں نے تیرے نبی کی مسجد میں سوال کیا اور مجھے کچھ بھی نہیں دیا گیا۔“

حضرت علیؑ رکوع کی حالت میں تھے آپ نے حالت رکوع میں اپنی چھوٹی انگلی کی جانب اشارہ کیا: آپ نے اس میں انگلی پھین رکھی تھی۔ سالک نے آگے بڑھ کر آپ کی انگلی اٹار لی۔ نبی کریم ﷺ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آسمان کی جانب سر اٹھا کر کہا: اے اللہ! موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے سوال کیا تھا:

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ☆ وَأَحْلِلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ☆ يَفْقَهُوا قَوْلِي ☆ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي ☆ هَرُونَ أَخِي ☆ أَشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ☆ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي﴾ [طہ ۲۵-۳۲]

”اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنا دے۔ ہارون کو، جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔“ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكَ مُلْكًا مَلَكًا فَلَا يَصْلُونَ إِلَيْكُمَا بِالْإِنشَاءِ﴾ [القصص ۳۵]

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے فرعونی تم تک پہنچ ہی نہ سکیں گے۔“

آپ نے دعا کی: اے اللہ! میں محمد ہوں تیرا نبی اور تیرا برگزیدہ: اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنا دے یعنی حضرت علیؑ کو: اور اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں: آپ اپنی گھٹگو ختم نہ کر پائے تھے کہ جبرائیل مذکورہ بالا آیت لے کر حاضر ہوئے۔ [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:]

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾

”بیشک تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔“ [المائدہ ۵۵]

فقیہ ابن المغازی الواسطی الشافعی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں جو ولی کا لفظ مذکور ہے اس سے متصرف مراد ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے اور رسول ﷺ کے لیے ولایت فی الامم کا اثبات کیا ہے، اسی طرح حضرت علیؑ کے لیے بھی کیا۔“ (شیعہ کا بیان ٹم ہوا)

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: اس کا جواب یہ ہے کہ شیعہ مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ عقلاً قبول کیا جائے۔ بلکہ اس کا ذکر کردہ واقعہ صاف جھوٹ پر مبنی ہے۔ اور وہی فلاسفہ و متقاء کے کلام کی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر اسے عقلی طور پر مان لیا جائے تو پھر اسے برہان کہنا انتہائی منکر اور بری بات ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور دوسرے مقامات پر برہان کا لفظ اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے علم اور یقین کا فائدہ حاصل ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِي تِلْكَ آمَانِيَهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [البقرہ ۱۱۱]

”یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمَنْ يَبْدُوا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُوهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ ءَالَهُ مَعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [النمل ۶۴]

”کیا وہ جو مخلوق کی اول دفعہ پیدا کرنا کرتا ہے پھر اسے لوٹائے گا اور جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزیاں دے رہا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔“

سچے کو اپنی سچائی پر دلیل و برہان چاہیے۔ اور دو ٹوک سچائی وہی ہوتی ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ سچ ہے۔

اس رافضی مصنف نے جتنی بھی جہتیں پیش کی ہیں، ان میں جھوٹ ہے۔ اس کے بس میں نہیں کہ اپنے تمام مقدمات پر ایک بھی سچی جہت پیش کر سکے۔ کیونکہ سچے مقدمات کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کی بنیاد جھوٹ اور باطل پر رکھی جائے۔

ہم ان شاء اللہ اس کی ایک بات کا تار و پود کھول کر رکھ دیں گے جس سے اس کا جھوٹ بالکل واضح ہو جائے گا۔

ایسی جہتوں کو براہین کا نام دینا بذات خود بہت بڑا جھوٹ ہے۔

پھر یہ رافضی مصنف قرآن کی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کئے گئے اقوال پر اعتماد کرتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات اس میں بھی راوی پر جھوٹ گھڑ لیا گیا ہوتا ہے۔ اور اگر سچ بھی ہو تو بہت سارے علماء کرام نے اس کی مخالفت کر کے اس نظریہ یا تفسیر کو رد کیا ہوتا ہے۔ اگر کہیں پر واحدی کا قول نقل کیا گیا ہے تو واحدی کی صداقت خود مجہول ہے؛ نیز بہت سارے علماء کرام نے دلائل و براہین کی روشنی میں اس کے خلاف حق کو بھی بیان کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ واحدی کے اقوال کے خلاف اسی جنس کے بہت سارے اقوال ہیں جو اس کے متناقض ہیں۔ جب براہین کا تعارض اقوال سے ہو جائے تو اقوال متناقض شمار ہوتے ہیں جب کے اقوال کے مقابلہ میں براہین متعارض نہیں ہو سکتیں۔

بلکہ ہم ان شاء اللہ اس رافضی کی نام نہاد براہین کے خلاف حقیقی براہین قائم کریں گے جن کا آپس میں کوئی تعارض بھی نہیں ہوگا۔ اور رافضی کے اکثر اقوال میں جھوٹ بالکل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جھوٹ صرف ان لوگوں پر مخفی رہ سکتا ہے جن کے دلوں

کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہو۔ [اور واضح کریں گے کہ] رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی براہین برحق ہیں۔ اور بیشک قرآن بھی حق ہے۔ اور یہ کہ دین اسلام حق ہے۔ یہ ان تمام چیزوں سے متناقص ہیں جنہیں رافضی نے براہین کا نام دیا ہے۔ اگر عقلمند انسان کچھ دیر کے لیے غور کرے گا تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ رافضی مصنف جن دلائل کو براہین کا نام دیتا ہے اس کے لوازم سے ایمان و قرآن اور رسول اللہ ﷺ پر قدح وارد ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضیت کی اصل بنیاد کچھ زندیق لوگوں کے ہاتھوں پر اٹھائی گئی ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر؛ قرآن پر اور دین اسلام پر اعتراضات اور قدح کی جائے۔ اس غرض کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے ایسی روایات گھڑ لیں جن کو سچا ماننے سے دین اسلام پر طعن لازم آتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی وضع کردہ روایات کو لوگوں میں عام اور مشہور کر دیا۔ لوگوں میں جاہل بھی تھے اور ہوئی پرست بھی۔ ان لوگوں نے اپنی ہوئی پرستی کی وجہ سے ان حکایات و روایات کو قبول کر لیا؛ مگر یہ نہ دیکھا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟

ان میں سے بعض اہل نظر لوگ بھی تھے جنہوں نے ان میں غور و فکر کیا تو پتہ چلا کہ یہ روایات دین اسلام کی حقانیت پر قدح کرتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان روایات کے موجب عقیدہ اپنا لیا؛ اور دین اسلام پر قدح کرنے لگے۔ اس کی وجہ شروع سے ہی ان کے دین و اعتقاد کی خرابی تھی۔ یا پھر اس کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ روایات صحیح ہیں؛ اور جو کچھ وہ دین اسلام کا عقیدہ رکھتا تھا اس پر قدح وارد ہوتی تھی۔ [لہذا اس نے ان روایات کو قبول کر لیا]۔

[اسماعیلیہ اور نصیریہ کی گمراہی کی وجہ]:

یہی وجہ ہے کہ اکثر زنادق اسلام میں تشیع کے دروازہ سے داخل ہوئے، اور ان اکاذیب کے بل بوتے پر اسلام کو مطعون کرنا شروع کیا۔ وہ جبلاء ان مکذوبات کی بنا پر شبہات کا شکار ہو گئے جنہیں یہ علم نہ تھا کہ یہ روایات جھوٹی ہیں؛ بس انہیں صرف اتنا پتہ تھا کہ دین اسلام ایک سچا مذہب ہے۔

فرقہ ہائے اسماعیلیہ و نصیریہ بھی اسی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ جھوٹی اور من گھڑت روایات قرآن کی تفسیر اور حدیث کی شرح میں پیش کرتے ہوئے شیعہ کی روایت کردہ اکاذیب پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے آل محمد پر اظہار رحم و کرم کا آغاز کیا، پھر صحابہ پر نقد و جرح اور گالی گلوچ کا بیڑا اٹھایا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بنایا، کیوں کہ آپ یہ سب باتیں سن کر خاموش رہے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ کو تنقید کا نشانہ بنایا اور بعد ازاں اللہ کی تردید و تکذیب پر اتر آئے۔ جیسا کہ صاحب البلاغ الاکبر نے اس ترتیب پر روشنی ڈالی ہے۔ جیسا کہ عبیدی امہ کی بنیاد رافضیوں کے من گھڑت واقعات پر ہے؛ تاکہ اس طرح سے گمراہ شیعہ لوگوں کو اپنا شکار کر سکیں۔ پھر اس کے بعد صحابہ کرام میں طعن کرنا شروع کرتے ہیں؛ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرتے ہیں؛ پھر رسول اللہ ﷺ کی شان میں اور پھر الہیات میں طعن زنی کرتے ہیں جیسا کہ "البلاغ الاکبر اور الناموس الاعظم" کے مصنف نے ان کے لیے درجات مقرر کیے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رافضیت کفر و الحاد کا ریمسی دروازہ اور دھلیز شمار ہوتی ہے۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں: اس آیت کے جواب میں کئی امور ہیں:

اول: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے حدیث کو اس انداز میں پیش کیا جائے جس سے حجت قائم ہو سکتی ہو۔ کیونکہ صرف تفسیر ثعلبی کی طرف منسوب کر لینا، یا ان لوگوں سے اجماع نقل کرنا جو منقولات کا علم ہی نہیں رکھتے؛ اگرچہ وہ نقل کرنے میں سچے بھی ہوں؛ اہل علم کے ہاں بالا جماع یہ حجت نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی اسناد کی معرفت ثابت نہ ہو۔ ایسے ہی جب ثعلبی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں کوئی روایت نقل کرے؛ تو صرف اس روایت کے موجود ہونے کی وجہ سے اس فضیلت کے ثابت ہونے کا اعتقاد رکھنا جائز نہیں۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔

اہل سنت والجماعت کسی چیز کے ثابت کرنے کے لیے یہ طریقہ نہیں اپناتے۔ نہ ہی کوئی فضیلت ثابت کرنے کے لیے اور نہ ہی حکم ثابت کرنے کے لیے۔ اور نہ ہی دیگر کسی مسئلہ میں۔ اور ایسے ہی شیعہ [کو بھی کرنا چاہیے]۔ جب تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ صرف روایت کا موجود ہونا حجت نہیں ہو سکتا [جب تک کہ اس کی صحت ثابت نہ ہو جائے] بلکہ اس سے استدلال کرنا باطل ہے۔ ایسے ہی ہر وہ قول جسے ابونعیم، ثعلبی، نقاش، اور ابن مغازی جیسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے۔ [وہ صرف روایت کے موجود ہونے کی وجہ سے حجت نہ ہوگا]۔

دوم: شیعہ مصنف کا دعویٰ ہے کہ: ”اس آیت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع ہے۔“ [جواب:] ہم کہتے ہیں: یہ سب سے بڑا جھوٹا دعویٰ ہے۔ بلکہ اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کی حالت میں اپنی انگلی بطور صدقہ نہیں پیش کی۔ اور محدثین کرام کا اجماع ہے کہ شیعہ کی بیان کردہ روایت صاف جھوٹ ہے۔

اور جو کچھ اس نے ثعلبی کی تفسیر سے نقل کیا ہے؛ محدثین کرام کا اجماع ہے کہ ثعلبی ایک گروہ سے موضوعات اور من گھڑت روایات نقل کرتا ہے۔ جیسا کہ ہر سورت کے شروع میں اس نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے اس سورت کی فضیلت میں ایک روایت نقل کی ہے۔ ثعلبی اور اس کا تلمیذ واحدی دونوں اور ان کے امثال ”حاطب لیل (رات کا لکڑہارا جو خشک وتر میں تیز کیے بغیر ہر قسم کی لکڑیاں جمع کرتا ہے) تھے۔ ہر صحیح وضعیف [بلکہ موضوع] روایات تک نقل کرتے تھے۔ [علاوہ ازیں شیعہ مصنف کے ذکر کردہ دلائل سب باطل ہیں اور وہی شخص ان کو تسلیم کر سکتا ہے جو گونگا، بہرہ، صاحب ہوئی و ضلالت ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو قبول حق سے اندھا کر دیا ہو]۔

علامہ بغوی رحمہ اللہ حدیث کے بڑے عالم تھے؛ ثعلبی اور واحد سے بڑھ کر علم رکھتے تھے۔ آپ کی تفسیر ثعلبی کی تفسیر سے مختصر کی گئی ہے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں ان موضوع احادیث میں سے کوئی بھی روایت نقل نہیں کی جو کہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں۔ اور نہ ہی اہل بدعت کی تفسیر نقل کی ہے جیسے کہ ثعلبی نے نقل کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ثعلبی میں خیر اور دین داری ہے؛ لیکن صحیح اور ضعیف احادیث کے بارے میں آپ کی معلومات بہت کمزور ہیں۔ اور بہت سارے اقوال میں سنت اور بدعت میں تمیز نہیں کر پاتا۔

جب کہ بڑے اور مشہور اہل علم مفسرین جیسے: محمد بن جریر الطبری، قس بن خالد، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، عبد الرحمن بن ابراہیم دحیم اور ان کے امثال نے اپنی تفاسیر میں ان موضوع روایات میں سے کوئی بھی روایت نقل نہیں کی۔

اہل علم محدثین کا اجماع ہے کہ کسی ایک کے مجرد روایت کرنے سے استدلال نہیں کیا جاسکتا؛ اسی جنس سے ثعلبی؛ واحدی اور نقاش اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی تقائیر میں اکثر وہ احادیث روایت کرتے ہیں جو کہ ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہوتی ہیں۔ اگر ہمیں چند دوسری وجوہات کی بنا پر بھی ان لوگوں کا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہوتا تو پھر بھی ان کی روایات پر اس لیے اعتماد کرنا جائز نہ ہوتا کہ انہیں ثعلبی اور اس کے امثال نے روایت کیا ہے۔ تو پھر جب ہمیں اس جھوٹ کا پتہ بھی ہے تو ان روایات پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

ہم ان شاء اللہ وہ دلائل ذکر کریں گے جن سے ان کا جھوٹ عقلاً و نقلاً کھل کر سامنے آجائے گا۔ یہاں پر صرف اس مصنف کی افترا پر دازی اور کثرت جہالت کا بیان کرنا ہمارا مقصد ہے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ: ”اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔“ صد افسوس کہ اس بیچارے کو یہ بھی علم ہوتا کہ اہل علم میں سے جو لوگ ایسے امور میں اجماع کے حقائق کا علم رکھتے ہیں ان میں سے کس نے یہ اجماع نقل کیا ہے؟ اس لیے کہ ایسے امور میں غیر اہل علم کا نقل کردہ اجماع ہرگز قبول نہیں ہوتا۔ اور پھر اس میں اجماع بھی نہیں بلکہ اختلاف ہے۔ اس لیے کہ متکلم؛ مفسر اور مؤرخ جب بلا سند کوئی روایت نقل کر کے کسی معاملے کا دعویٰ کریں تو ان کی بات پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ تو پھر جب وہ اجماع کا دعویٰ کرے تو کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے؟

تیسری بات: اس سے پوچھا جائے کہ: شیعہ مصنف نے اپنی تائید میں ثعلبی کا حوالہ دیا ہے، وہ مفسرین جن کی کتابوں سے یہ تفسیر نقل کی گئی ہے؛ وہ ثعلبی سے زیادہ جانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے برعکس نقل کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ثعلبی نے حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔“ نیز ثعلبی نے عبد الملک سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو جعفر باقر سے اس آیت کی تفسیر پوچھی۔ تو انھوں نے فرمایا: ”اس سے سب مومن مراد ہیں۔“ میں نے عرض کیا، بعض لوگ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔

یہ سن کر امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اہل ایمان میں علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔“ ضحاک اور سدی سے بھی یہی مروی ہے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

”سب مومن و مسلم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ولی ہیں۔“

چوتھی بات: ہم شیعہ کے ادعاء اجماع کو معاف کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے دعویٰ کے اثبات میں ایک سند صحیح ہی پیش کریں۔ ثعلبی سے ذکر کردہ روایت ضعیف ہے اور اس کے راوی مقہم بالکذب ہیں۔ باقی رہا فقیہ ابن المغازی واسطی تو اس کی کتاب اکاذیب کا پلندہ ہے۔ اس حقیقت سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم حدیث سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہے۔ اور ہمارا صحیح سند کا مطالبہ ہر دو کتابوں کو شامل ہے۔

پانچویں بات: اگر آیت کا مطلب یہ قرار دیا جائے کہ حالت رکوع میں بھی زکوٰۃ ادا کی جائے؛ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالت نماز میں اپنی انگوٹھی صدقہ کی تھی؛ تو اس سے وجوہاً موالات کی شرط ٹھہرے گی؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی مسلمان ولی نہیں بن سکے گا۔ بنا بریں حسن و حسین رضی اللہ عنہ بھی موالات [دوستی] کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اور

نہ ہی باقی بنی ہاشم سے کوئی موالات و دوستی ہوگی۔ یہ بات سب مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔
چھٹی بات: علاوہ ازیں اس آیت میں ﴿الذین﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ لہذا فرد واحد حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کا مصداق نہیں ہو سکتے۔

ساتویں بات: علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعریف صرف کسی اچھے کام پر کی جاتی ہے۔ وہ اچھا کام یا تو واجب ہوگا یا پھر مستحب۔ صدقہ؛ غلام آزاد کرنا؛ بیہ؛ ہدیہ؛ اجارہ؛ نکاح؛ طلاق وغیرہ عقود کے معاملات نماز میں نہ ہی واجب ہیں اور نہ ہی مستحب؛ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے۔ بلکہ اکثر علماء کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے نماز باطل ہو جائے گی اگرچہ وہ زبان سے بات نہ بھی کرے۔ بلکہ ایسے اشارہ سے بھی نماز باطل ہو جاتی ہے جس کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہو۔ علماء کرام کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: ایسا کرنے سے شرعی ایجاب نہ ہونے کی بنا پر ملکیت حاصل نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے کہ نماز میں یہ کام کرنا فعل محمود نہیں ہے، اگر یہ اچھا [مستحب] کام ہوتا تو نبی کریم ﷺ بھی ایسا کرتے اور اس کی ترغیب دیتے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار یہ فعل سرانجام دیتے۔ لہذا یہ فعل نماز کے منافی ہے پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ ولی وہی شخص ہوگا جو حالت رکوع میں سجدہ کرے۔

جب نماز میں کوئی ایسی بات مشروع نہیں ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں صدقہ کرنا اعمال صالحہ میں سے نہیں ہے اور سائل کو دینے کا موقع ختم نہیں ہو سکتا؛ جب انسان نماز سے فارغ ہو جائے تب بھی وہ صدقہ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں ایک طرح کا انہماک ہوتا ہے۔ [اور اس میں حرکت یا فعل اس انہماک کے منافی ہے]۔

آٹھویں بات: اگر یہ بات مان لی جائے کہ نماز میں صدقہ دینا مشروع ہے۔ تو پھر بھی رکوع کو اس کام کے لیے خاص نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قیام یا قعود کی حالت میں ایسا کرنا زیادہ آسان تھا۔ تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارا ولی وہی ہو سکتا ہے جو صرف رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرے۔ تو کیا اگر کوئی حالت قیام یا قعود میں صدقہ کرے تو وہ موالات اور دوستی کا مستحق نہیں ہوگا؟

❁ اگر [شیعہ] اس کے جواب میں یہ کہیں کہ: اس سے مراد خصوصی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کرنا ہے۔
❁ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف جن کی وجہ سے آپ مشہور ہیں وہ بہت زیادہ اور صاف ظاہر ہیں۔ پھر معروف باتوں کو چھوڑ کر ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں کوئی جانتا ہی نہ ہو؟
جہور مسلمین نے یہ خبر نہیں سنی۔ اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی معتد کتاب میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ نہ ہی صحاح ستہ میں؛ نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی جوامع اور معجمات میں اور نہ ہی امہات الکتاب میں سے کسی ایک کتاب میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔ تو اب دو باتوں میں سے ایک بات لازم آتی ہے:

۱۔ اگر اس سے مقصود وصف کی مدح کرنا ہے تو یہ محال اور باطل ہے۔

۲۔ اور اگر اس سے مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کرنا تو بھی باطل ہے۔

نویں بات: علاوہ ازیں اس سے کہا جائے گا کہ: ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾ تمہارے قول کے مطابق اس آیت کا تقاضا

ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا رکوع کی حالت میں ہو۔ عہد رسالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے اور زکوٰۃ ان پر فرض نہ تھی۔ چاندی کی زکوٰۃ اس شخص پر فرض ہوتی ہے جو نصاب کا مالک ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ صاحب نصاب نہ تھے۔

دسویں بات: مزید براں اکثر علماء کے نزدیک زکوٰۃ میں انگوٹھی کا دینا کافی نہیں ہے۔ اس کی صرف یہ صورت ہو سکتی ہے جب زیور پر بھی زکوٰۃ کو فرض مان لیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیور کی اسی جنس سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ جن لوگوں نے اس کے بجائے قیمت ادا کرنے کو جائز کہا ہے تو ایسے چیزوں میں کوئی متعین قیمت مقرر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ احوال کے اختلاف کی وجہ سے ان کی قیمتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔

گیارہویں بات: حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مصنف کی ذکر کردہ آیت مندرجہ ذیل آیات کی مانند ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۱..... ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (البقرة: ۴۳)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“ یہاں پر رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲..... ﴿أَقْنِطِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (آل عمران: ۴۳)

”اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ ذکر ان الفاظ میں اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا جب رکوع کو پالے تو اسے رکعت مل جاتی ہے؛ بخلاف اس کے جو صرف حالت سجدہ میں نماز کو پاتا ہے؛ اور رکوع اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس سے رکعت بھی رہ جاتی ہے۔ قیام میں ادراک شرط نہیں ہے۔

بارہویں وجہ: سلف و خلف تمام مفسرین کے ہاں یہ بات عام طور سے معروف ہے کہ زیر نظر آیت موالات کفار سے روکنے اور اہل اسلام کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاق کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ نیز اس میں اہل ایمان کے ساتھ دوستی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب بعض منافقین جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول سے دوستی رکھتا تھا؛ اور وہ کہتا تھا: میں گردش ایام سے ڈرتا ہوں۔“ اہل ایمان میں سے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں اللہ اور اس کے رسول سے دوستی کرتا ہوں؛ میں ان کفار کے ساتھ اپنے اتحاد اور دوستی سے اللہ اور اس کے رسول کی جناب میں برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ بنو قریظہ والے دن عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی چالوں کی وجہ سے ان لوگوں پر وہ دن آگیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جس میں عمومی طور پر اہل ایمان کی محبت کو واجب کیا گیا تھا۔ اور کفار کے ساتھ محبت اور دوستی سے منع کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کا کلام گزر چکا ہے کہ یہ آیت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں۔

[متنازعہ آیت کی صحیح تفسیر:]

تیرہویں وجہ: غور کرنے والے کے لیے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس آیت کا سیاق ہمارے اس موقف پر دلالت کرتا

ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ [المائدة ۵۱]

”اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بیشک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا۔“

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسْرَوْا فِي أَنْفُسِهِمْ ذَلِيلِينَ ۚ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهْلَؤَالَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خِسرِينَ﴾ [المائدة ۵۲-۵۳]

”جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگ بھاگ کر ان (یہود و نصاریٰ) کی طرف جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں (ان کے ساتھ دوستی نہ لگانے کی صورت میں) کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ہی کسی فتح یا کسی اور بات کی بشارت سنائے گا، جس سے وہ ان باتوں پر نادم ہوں گے، جو انھوں نے اپنے جی میں پوشیدہ رکھی تھیں۔ اور ایماندار کہیں گے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے اعمال غارت ہوئے اور یہ ناکام ہو گئے۔“

یہ ان لوگوں کا وصف بیان کیا جا رہا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے [نفاق کا مرض ہے]۔ جو کہ کفار اور منافقین سے دوستی رکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۞﴾ [المائدة ۵۴]

”اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہو گئے مسلمانوں پر سخت اور تیز ہو گئے کفار پر، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دے، اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور زبردست علم والا ہے۔“

اس میں اللہ تعالیٰ نے مرتدین کا ذکر کیا؛ اور یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ

رَكُوعًا وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٥٥﴾ [المائدہ ۵۵]

”بیشک (مسلمانوں!) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقیناً مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔“

یہ کلام ان لوگوں کے احوال کو متضمن ہے جو منافقین میں سے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور مرتدین کے حال کو بھی متضمن ہے۔ اور ان لوگوں کے حال کو بھی شامل ہے جو ظاہری و باطنی طور پر اسلام و ایمان پر ثابت قدم رہے۔

اس سیاق پر جو بھی انسان غور و فکر کرے گا: اسے علم الیقین حاصل ہو جائے گا یہ آیت ان تمام مؤمنین کے لیے عام ہے جو ان صفات سے موصوف ہیں۔ کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں۔ نہ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور نہ ہی عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہی عثمان و علی رضی اللہ عنہما اور کسی دوسرے کے ساتھ۔ مگر یہ حضرات سابقین اولین صحابہ ان میں بالاولی داخل ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مخالفین پر کامیابی؟

چودھویں وجہ: جو شخص بھی اس روایت کے مذکورہ الفاظ میں غور و فکر کرے گا اس پر شیعہ مصنف کی نبی کریم ﷺ پر دروغ گوئی واضح ہو جائے گی۔ ”علی رضی اللہ عنہ تمام نیکوں کے قائد نہیں ہیں؛ بلکہ تمام نیکوں کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور ایسے ہی آپ تمام کفار کے قاتل بھی نہیں ہیں، بلکہ آپ نے بعض کفار کو قتل کیا ہے؛ جیسا کہ آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی بعض کفار کو قتل کیا ہے۔ آپ بھی کفار کو قتل کرنے والے مجاہدین میں سے ایک تھے۔ اور بعض کفار آپ نے ضرور قتل کیے ہیں۔

ایسے ہی شیعہ کا قول کہ: ”جوان کی مدد کرے گا اس کی مدد کی جائے گی۔ اور جوان کو بے یار و مددگار چھوڑے گا تو اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔“

یہ خلاف واقع ہے۔ نبی کریم ﷺ حق بات کے علاوہ کچھ بھی نہیں فرماتے۔ خصوصاً شیعہ کے قول کے مطابق۔ اس لیے کہ شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پوری امت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بے یار و مددگار چھوڑے رکھا۔ [اور اگر شیعہ کی ذکر کردہ تفسیر صحیح ہوتی تو جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑا تھا اور ان کی مدد کا حق ادا نہیں کیا تھا وہ ذلیل و خوار ہو جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ مظفر و منصور ہوئے اور انھوں نے بلاد فارس و روم اور قبط کو فتح کیا۔] یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک ہر میدان میں کامیاب و کامران اور منصور رہی، ایسا غلبہ بعد میں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاون تھا اور دوسرا مخالف۔ تیسرا گروہ بالکل غیر جانبدار تھا۔ انہوں نے کسی بھی فریق کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور جنگیں لڑیں۔ وہ دوسرے لوگوں پر حتیٰ کہ کفار پر بھی غالب نہ آ سکے۔ بلکہ دوسرے لوگ ہی ان پر غالب رہے۔ اور اس معاملہ کی دوران کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو مسلمانوں کو پھر سے کفار پر فتح نصیب ہوئی۔ انہوں نے علاقے فتح کرنا شروع کیے۔ ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دوسرے

بھائیوں کی طرح خوارج پر منصور و کامیاب رہے ہیں۔

اس کے برعکس وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے کفار اور مرتدین سے قتال کیا تھا؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت فرمائی اور بہت بڑی کامیابی سے نوازا۔ اور ایسے ہی نصرت نصیب ہوئی جیسے اللہ کا وعدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

”یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔“

وہ قتال جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا تھا؛ جو مؤمنین نے آپ کے ساتھ مل کر کفار و [منافقین] مرتدین اور خوارج سے کیا؛ اس میں یقین تقویٰ و صبر کی وجہ سے کامیاب رہے اور بہت بڑی نصرت و فتح نصیب ہوئی۔ اس لیے کہ تقویٰ اور صبر و بنیادی ایمانی عنصر ہیں کے ساتھ فتح و نصرت معلق رہتی ہے۔

ایسے ہی [شیعہ مصنف کی ذکر کردہ] وہ دعا جو آپ ﷺ نے انگوٹھی صدقہ کرنے کے بعد کی؛ اس کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ضرورت کے وقت کہیں بہت زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جس کا بہت بڑا فائدہ بھی حاصل ہوا؛ یہ صدقہ یقیناً انگوٹھی کے صدقہ کرنے سے بہت زیادہ تھا۔

صحیحین میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا؛ جتنا فائدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے۔“ ”میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔“ اگر میں اہل زمین سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی شخص کی کھڑکی مسجد کی جانب کھلی نہ رہے۔“ [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اللہ کی راہ میں ایک ہزار اونٹ صدقہ میں دیے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”آج کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ جو بھی کرے گا، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ [الترمذی ۲۸۹/۵]

شروع اسلام میں انفاق سمیل اللہ اور دین کی اقامت کے لیے خرچ کرنا ایک سائل پر خرچ کرنے سے بہت زیادہ باعث عظمت [واجب و ثواب] تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے؛ اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاس گ کو بھی پہنچ سکتا۔“ [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ﴾ [الحديد ۱۰]

”تم میں سے جنہوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیا، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔“

ایسے ہی اسلام کے شروع کے ایام میں اقامت دین کے لیے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کیا گیا: اس کی کوئی مثال باقی نہیں رہی۔ جب کہ سائل کو ضرورت کے وقت کچھ دے دینا ایسی نیکی ہے جو قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ جب اتنے عظیم الشان اور نفع بخش اور اہم ترین صدقات کے لیے بھی نبی کریم ﷺ نے کوئی ایسی دعا نہیں فرمائی تو پھر ایک سائل کو انگوٹھی دینے کی وجہ سے ایسی دعا کر سکتے ہیں؛ حالانکہ یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سائل اپنے سوال میں جھوٹا ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ روایت اور اس جیسی دوسری روایات ایک جاہل انسان کا من گھڑت جھوٹ ہے جس میں وہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برابری کرنا چاہتا ہے۔ [ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَيَجْزِيهَا الْآتِقَىٰ ۖ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۚ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ [اللیل ۱۷-۲۱]

”اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار و ور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔“

[من گھڑت روایت کا پس پردہ محرک:]

[رائضی مصنف چاہتا ہے کہ] اس طرح کے فضائل جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ثابت کیے جائیں۔ پس وہ ایسا نہیں کر سکا کہ شروع اسلام کے دنوں کے متعلق کوئی روایت گھڑ لیتا؛ تو اس کی جگہ یہ روایت گھڑ لی جسے صرف جاہل لوگوں میں پذیرائی حاصل ہو سکتی ہے۔ [جو حقائق جاننے والے لوگ ہوں وہ اس جھوٹ کو فوراً پکڑ لیتے ہیں]۔

نیز نبی کریم ﷺ کے لیے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے اور نصرت و مدد حاصل ہونے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ یہ دعا فرمائیں کہ اے اللہ! میرے اہل خانہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو میرا وزیر بنا دے؛ اور اس سے میری پشت کو مضبوط کر دے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اور پھر مومنین کے ذریعہ آپ کی مدد فرمائی؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي آيَدَكَ بِغَضَبِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ﴾ [الأنفال ۶۲]

”[اللہ آپ کو کافی ہے] اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِي الْأَثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزِنِ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

”اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

جس وقت کفار نے آپ کو نکالا؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اس وقت آپ دو تھے ایک رسول اللہ ﷺ اور دوسرے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ اور غزوہ بدر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کے لیے جھونپڑہ یا خیمہ لگایا گیا؛ تمام صحابہ

کرام میں سے اس خیمہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ داخل ہونے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کا رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں مبارک حصہ اور قابل صد شکر کوششیں ہیں۔ [اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔]
 اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب احد کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لیکر آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیتے ہوئے کہا: ”اسے دھوؤ، اس میں مذمت کی کوئی بات نہیں“ آج اس نے مجھے سچا کر دکھایا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس پر یہ فرمایا: ”اگر تم نے یہ اچھائی اور نیکی کی ہے تو یقیناً فلاں اور فلاں اور فلاں نے بھی ایسی کارکردگی دیکھائی ہے۔“ [تاریخ ابن کثیر ۴/ ۴۷]
 رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امثال وہموا صحابہ کو چھوڑ کر صرف آپ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی ایسے موقع کا علم ہو سکا ہے جہاں پر نبی کریم ﷺ کو باقی صحابہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کی ضرورت پڑی ہو۔ نہ ہی زبانی کلامی مدد کی ضرورت پڑی اور نہ ہی جانی طور پر۔

[اہل اسلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کا الزام]:

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ لوگوں کا نبی کریم ﷺ پر ایمان اور آپ کی اطاعت شعاری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو دعوت دی ہو؛ اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی اور خاص سبب تھا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے مابین اسباب تھے۔ بخلاف ازیں بنی اسرائیل ہارون علیہ السلام کو بے حد چاہتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے خائف و ہراساں رہتے تھے۔ ہارون علیہ السلام ان سے الفت و محبت کا سلوک روارکھتے تھے۔
 روافض کا دعویٰ ہے کہ اہل اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی اور ان کے بارے میں جو نص تھی اس کو پوشیدہ رکھا۔ پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسی طرح محتاج تھے جس طرح موسیٰ ہارون کے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لیجیے؛ ان کے دستِ حق پرست پر عشرہ مبشرہ میں سے چھ صحابہ نے اسلام قبول کیا تھا؛ ان صحابہ کے نام ہیں: عثمان، طلحہ، زبیر، سعد، عبدالرحمن بن عوف، ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہم)۔
 مگر ہمیں نہیں معلوم کہ سابقین اولین مہاجرین و انصار صحابہ میں سے کسی نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہو۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سابقین صحابہ میں شامل ہیں۔ عقبہ کی رات جب انصار نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ روانہ فرمایا۔ ان کے ہاتھ پر انصار کے سرداران جیسے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ وہ انسان ہیں جن کی موت پر اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ گیا تھا۔

موسم حج میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلتے اور کفار کو اسلام کی دعوت دیتے۔ اور دعوت کے میدان میں آپ کی بہت بڑی مدد کرتے۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے [انہیں شروع ایام اسلام میں یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تھی]۔
 یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

”اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔“ [حوالہ گزر چکا ہے۔]

اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا:

اے لوگو! مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا گیا؛ میں نے کہا: میں اللہ کا رسول ہوں؛ تم نے کہا: جھوٹ بولتے ہو۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ کیا تم میرے دوست کو یوں چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ [بخاری ۵/۵۰]

پھر موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کفار کو اسلام کی دعوت پہنچانے سے پہلے کی تھی؛ تاکہ آپ کو مددگار میسر آجائے۔ اور ہمارے نبی کریم ﷺ نے مبعوث ہونے کے وقت سے اکیلے ہی لوگوں تک دین کی دعوت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ اور بالفاق اہل علم سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے وہ چار ہیں: مردوں میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ؛ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا؛ بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ؛ اور غلاموں میں سے حضرت زید رضی اللہ عنہ۔

اس جماعت میں سے دعوت کے میدان میں سب سے نفع بخش ہستی بالفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اس لیے کہ آزاد مردوں بالفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لانے والے پہلے شخص تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ اپنی جان و مال سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احسان کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے کبھی یہ دعا نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ذریعہ ان کی پشت کو مضبوط کر دے؛ نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ دعا کی اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کرتے ہوئے؛ اس پر توکل کرتے ہوئے صبر و استقامت کے ساتھ ویسے ہی اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ وَرَبُّكَ فَكَبِيرٌ ﴿۱﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿۲﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿۳﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿۴﴾ وَلِلَّهِ نَفْثُكَ فَاصْبِرْ ﴿۵﴾ [المدثر ۷۲]

”اٹھ کھڑا ہو، پس ڈر۔ اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔ اور پلیدی کو پس چھوڑ دے۔ اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے۔ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر۔“ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ [ہود ۱۲۳]

’پس تجھے اس کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔‘

پس جو انسان یہ خیال کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ وہ لوگوں میں سے کسی شخص کے سبب سے آپ کی پشت کو مضبوط کر دے؛ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام سے میری پشت کو مضبوط کر دے؛ تو یقیناً اس انسان نے رسول اللہ ﷺ کے حق میں کوتاہی کی؛ اور آپ پر اپنی طرف سے ایک بہتان گھڑ لیا۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضیت شرک و نفاق اور الحاد سے نکلی ہوئی ہے۔ کبھی ان سے اس الحاد کا اظہار ہو جاتا ہے اور کبھی مخفی و پوشیدہ رہتا ہے۔

[موالات (دوستی) کی حقیقت:]

پندرہویں وجہ: ان سے کہا جائے گا کہ: اہل ایمان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دوستی رکھنا واجب ہے۔ پس وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی دوستی رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت و دوستی ہر ایمان والے انسان پر ایسے ہی واجب ہے جیسے دوسرے اہل ایمان کی محبت و دوستی اہل ایمان پر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ موالات کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ تَظْهَرَا عَلَيْهِ فَيَأْتِ اللّٰهُ هُوَ مَوْلَاُ وَجَبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [التحریم ۴]

”اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گے پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبرائیل اور نیک ایماندار۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بھی صالح مومن ہو اللہ تعالیٰ، اور جبریل امین سب رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ ہیں اور آپ ان کے مولیٰ ہے۔ جب صالح مؤمنین آپ کے مولیٰ ہیں؛ اللہ تعالیٰ بھی آپ کا مولیٰ ہے؛ جبریل امین بھی آپ کے مولیٰ ہیں؛ اس کا معنی یہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ ان کے مولیٰ و متصرف ہو گئے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (التوبة: ۷۱)

مومن مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کے مولیٰ ہیں۔“

آیت سے معلوم ہوا کہ ہر مومن و متقی اللہ کا ولی ہے اور اس کا دوست ہے۔ اس سے کہیں بھی یہ مراد نہیں نکلتی کہ یہ آپ میں ایک دوسرے پر امیر ہوں یا معصوم ہوں؛ یا پھر اس مولیٰ کے بغیر کوئی دوسرا متولی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا أَوْلِيَاءُ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ)

”آگاہ رہو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور

(برائیوں سے) پرہیز رکھتے ہیں۔“ [یونس ۶۲-۶۳]

پس ہر اہل ایمان والا مومن شخص اللہ کا دوست اور اللہ اسے دوست رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (البقرة: ۲۳۷)

”اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد ۱۱]

”وہ اس لئے کہ ایمان والوں کا کارساز خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس لئے کہ کافروں کا کوئی کارساز نہیں۔“

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُمْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا

.... وَ أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ كُلِّ شَيْءٍ عَلَيْهِمْ﴾ [الأنفال ۷۲-۷۵]

”جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ

دی اور مدد کی..... اور رشتے ناٹے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ کے حکم میں بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

ان تمام نصوص میں اہل ایمان کے مابین موالات اور دوستی ثابت ہے۔ یہ اس کا دوست ہے؛ وہ اس کا ولی و دوست ہے؛ اور تمام اہل ایمان اللہ کے ولی اور آپس میں دوست ہیں؛ اور اللہ اور اس کا رسول اور فرشتے بھی اہل ایمان کے دوست ہیں۔ مذکورہ صدر آیات میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں کہ جو کسی کا ولی ہوگا وہ اس کا متولی بھی ہوگا، اس کے علاوہ کوئی بھی اس کا متولی نہیں ہوگا۔ اور اس ولی کو اس پر متصرف بھی سمجھا جائے گا؛ باقی لوگوں کو نہیں۔

[ولی اور متولی میں فرق:]

سولھویں وجہ: ولایت [واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ] اور ولایت [واؤ کے اوپر زیر کیساتھ] کا فرق علماء میں عام طور پر معروف ہے۔ ولایت عداوت کی ضد ہے؛ ان نصوص میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ولایت مراد نہیں جو کہ حکومت اور امارت کے معنی میں ہے۔ شیعہ کی جہالت کا یہ عالم ہے وہ ولی کو امیر سمجھتے ہیں۔ اور ولایت اور ولایت میں کوئی فرق نہیں کر پاتے۔ چنانچہ امیر کو والی کہتے ہیں اور ولی نہیں کہتے۔ ہاں اسے ولی الامر کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: (ولیت أمرکم) یعنی تمہارے امور کی زمام کار مجھے سونپی گئی ہے۔

جب کہ ولی کے ارادہ سے مولیٰ کا لفظ بولنا بھی اہل عرب کے ہاں معروف نہیں ہے۔ [وہ اس لفظ کو ان معانی میں استعمال کرنا جانتے ہی نہیں]۔ بلکہ ولی کو مولیٰ کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے والی کے معنی میں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ جب دالی اور ولی دونوں جنازہ میں موجود ہوں تو جنازہ کون پڑھائے، بعض نے کہا ہے کہ والی کو مقدم کیا جائے گا؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: ولی کو مقدم کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ موالات معادات کی ضد ہے۔ یہ ولایت تمام اہل ایمان کے مابین ثابت ہے۔ اور یہ وصف خلفاء اربعہ؛ تمام اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کے مابین بھی ثابت ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا ولی اور دوست ہے۔ اس آیت میں کہیں بھی یہ دلیل نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر امیر ہے۔ بلکہ یہ نظریہ کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے۔ اگر اس سے شیعہ مصنف کی اس سے ولایت سے مراد امارت ہو؛ تو اسے یوں کہنا چاہیے تھا: بیشک تم پر اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان متولی ہیں۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے متولی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ عربی زبان میں دوست کے ولی اور حاکم کے لیے متولی یا والی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ لفظ ولی اور ولایت میں اور والی میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آیت تمام مومنین کے لیے عام ہے جب کہ امارت تمام لوگوں کے لیے عام نہیں ہو سکتی۔

سترھویں وجہ: اگر اس ولایت سے مراد امارت ہوتی تو یوں کہا جاتا: ”بیشک تم پر اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان متولی ہیں۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے متولی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لیے کہ جس کو امیر بنایا جاتا ہے اس کے لیے والی کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ عربی زبان میں دوست کے ولی اور حاکم کے لیے متولی یا والی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اٹھارھویں وجہ: اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے بندوں پر متولی ہے۔ یا وہ ان کا امیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا خالق و مالک اور رازق ہے؛ ان کا رب اور بادشاہ ہے۔ تمام خلقت اسی کی ہے؛ اور حکم اس کا چلتا ہے۔ ایسے نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین ہے؛ جیسا کہ متولی کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً

حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ لوگوں پر متولی ہیں۔ یا آپ ان کے امیر ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ بلکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی صحابہ کرام امیر المؤمنین نہیں کہا کرتے تھے؛ بلکہ آپ خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ سب سے پہلے جن کے لیے امیر المؤمنین کا لفظ استعمال کیا گیا وہ حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ایک سر یہ پر امیر تھے۔ تو آپ کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا گیا۔ لیکن آپ کی یہ امارت اس سر یہ کے ساتھ خاص تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے کسی کو بھی مسلمانوں کی امارت کی وجہ سے امیر المؤمنین کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ اور حقیقت میں آپ ہی اس نام کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔

ولایت عداوت کی ضد ہے۔ بیشک وہ [اللہ تعالیٰ] نیک اہل ایمان سے دوستی رکھتا ہے۔ اہل ایمان اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ اہل ایمان سے محبت کرتا ہے۔ وہ ان سے راضی ہوتا ہے؛ یہ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ اور جو اللہ کے کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اعلان جنگ کرتا ہے۔ یہ ولایت اس کی رحمت اور احسان ہے۔ یہ مخلوق کی آپس میں ولایت اور دوستی کی طرح نہیں ہے جو کسی ضرورت پر مبنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذَّنْبِ﴾

”اور یہ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک ساجھی رکھتا

ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی کی ضرورت ہو۔“ [الإسراء ۱۱۱]

پس ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کمزور ہے کہ اسے کسی کی ضرورت ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو خود یہ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْغَوَاةَ فَلِلَّهِ الْغَوَاةُ جَمِيعًا﴾ [فاطر ۱۰]

”جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی کی ساری عزت۔“

بخلاف بادشاہوں کے؛ بادشاہ جن لوگوں سے دوستی کرتے ہیں، وہ اپنی ضرورت کے لیے اس سے دوستی کرتے ہیں۔

[اس لیے کہ وہ اس طرح سے اپنے مددگار پیدا کرتے ہیں] ورنہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

انیسویں وجہ: جس پر بھی کوئی عادل امام حاکم بن جائے اس کے لیے لازمی نہیں ہے کہ اللہ کی جماعت میں سے ہو؛ اور

ہمیشہ غالب ہی رہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عادل حکمران کفار اور منافقین پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں رسول

اللہ ﷺ کے حکم کے تحت منافق اور ذمی بھی رہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی میں کفار بھی تھے اور منافقین بھی۔ اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾ [المائدہ ۵۶]

”اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقیناً مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت

ہی غالب رہے گی۔“

اگر یہاں پر مراد امارت یا حکومت ہوتی تو پھر معنی یہ ہوتا کہ جو کوئی بھی اہل ایمان پر والی بن جائے؛ وہ اللہ کی غالب

آنے والی جماعت میں سے ہوگا۔ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ کفار اور منافقین اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء و قدر کے ماتحت

ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کفار سے دوستی نہیں کرتا؛ بلکہ ان سے نفرت کرتا ہے۔

امام علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دوسری دلیل:

اشکال: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت علی رضی اللہ عنہ (بلافصل) کی دوسری دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ [المائدة ۶۷]

”اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔“

بالا تفاق یہ آیت کریمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ - جمہور میں سے - ابو نعیم اپنی سند سے ابن عطیہ سے روایت کرتے ہیں، آپ بیان کرتے ہیں کہ یہ ”آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری۔“

تفسیر ثعلبی میں ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ: ”آپ کے رب نے آپ پر جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں نازل کیا ہے، اس کی تبلیغ کیجیے۔ اس کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ۔“ ”جس کا میں مولی ہوں، علی بھی اس کا مولی ہے۔“

ظاہر ہے کہ نبی ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے اجماعاً مولی تھے، بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بھی مولی ہوں گے۔ لہذا وہی امام باقر حق ہوں گے۔

تفسیر ثعلبی میں ہے: ”سرور کائنات ﷺ نے غدیر خم کے روز صحابہ کو پکارا جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ۔“

چنانچہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہو گئی، جب حارث بن نعمان فہری رضی اللہ عنہ نے آپ کا یہ ارشاد مبارک سنا تو اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ پہنچا۔ اپنا اونٹ وادی میں بٹھایا اور اس کو باندھ دیا؛ پھر وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ آپ چند صحابہ رضی اللہ عنہم سمیت تشریف فرما تھے۔ اس نے کہا:

”اے محمد ﷺ! آپ نے ہمیں دو شہادتوں کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی۔ پھر آپ نہیں ہمیں پانچ نمازوں کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی، پھر آپ نے ہمیں اپنے اموال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی؛ اور آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ماہ رمضان کے روزے رکھیں؛ ہم نے آپ کی بات مان لی؛ آپ نے ہمیں بیت اللہ کا حج کرنے کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی۔ پھر آپ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔ اب آپ نے اپنے چچا زاد بھائی علی کا سر اونچا کر دیا اور اس کو ہم پر فوقیت بخشی ہے، اور آپ نے فرمایا: ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ۔“ کیا آپ اپنی طرف سے یہ کہہ رہے ہیں یا اللہ کے حکم سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟

نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: اللہ کی قسم! یہ اللہ کا حکم ہے۔“ چنانچہ حارث یہ کہتے ہوئے اپنی سواری کی طرف رخصت ہو گیا کہ: ”اے اللہ! اگر یہ بات تیری جانب سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسایا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کر۔“

ابھی وہ منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک پتھر اس کے سر پر گر اور دُبر سے نکل گیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ تب یہ آیت اتری: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:]

﴿سَأَلُ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [المعارج ۱-۳]

”ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کا سوال کیا جو واضح ہونے والا ہے۔ کافروں پر، جسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ اللہ کی طرف سے۔“ نقاش نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت بیان کی ہے۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

جواب: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں کہ یہ دلیل پہلی دلیل سے بھی زیادہ جھوٹی ہے۔ ہم آگے چل کر اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ رافضی کا یہ قول کہ یہ آیت بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ”یہ بہت بڑا اور صریح کذب ہے جو کہ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ بات کسی بھی ایسے عالم نے نہیں کہی جو تفسیر کو اچھی طرح جانتا ہے۔

باقی رہیں ابو نعیم، شعبی اور نقاش اور واحدی کی تصانیف تو محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ ان کتب میں لا تعداد جھوٹی روایات موجود ہیں۔ اور شعبی کی اس روایت کے بارے میں بھی محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ یہ موضوع اور جھوٹی روایت ہے۔ ہم آگے چل کر دلائل کے ساتھ واضح کریں گے کہ یہ روایت جھوٹی ہے۔ اور شعبی کا شمار محدثین میں نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہاں پر ایک قاعدہ کی یاد دلانی جائے۔ منقولات میں بہت ساری جھوٹی روایات بھی ہیں اور بہت ساری سچی روایات بھی ہیں۔ احادیث و روایات میں [صحیح اور موضوع میں فرق] کے بارے میں ان علماء پر اعتماد کیا جائے گا جو حدیث رسول اللہ ﷺ کے امین ہیں۔ جس طرح نحوی مسائل میں علمائے نحو کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور قراءت، لغت کے مسائل میں اہل لغت کی طرف اور طب کے مسائل میں ان علماء کی طرف رخ کیا جاتا ہے جو ان علوم میں ماہرانہ بصیرت رکھتے ہیں اس لیے کہ ”لِكُلِّ فَنٍّ رِّجَالٌ“۔ ”ہر فن کے لیے اس کے اہل لوگ ہوتے ہیں۔“

[محدثین کرام اور ان کی خدمات جلیلہ]:

محدثین کرام بہت زیادہ قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ سب لوگوں کی نسبت حق و صداقت کے زیادہ طلب گار تھے۔ ان کی منزلت باقی علماء سے بہت اونچی ہے؛ اور ان میں دین داری زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ سچائی اور امانت داری میں باقی سب لوگوں پر فائق ہیں۔ جرح و تعدیل کے بیان کرنے میں ان کا علم اور تجربہ بہت زیادہ ہے۔

[جیسا کہ علم حدیث سے واقفیت رکھنے والے حضرات کلیۃً اس سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ جس روایت کو وہ بالاتفاق ضعیف یا غور قرار دیں وہ ساقط عن الاحتجاج ہو گئی اور جس کی صحت پر متفق ہوں وہ صحیح ہوگی اور جس میں وہ مختلف الخیال ہوں اس میں عدل و انصاف کے تقاضا کے مطابق غور و فکر کیا جائے گا۔ محدثین کرام علم حدیث کا معیار و مدار ہیں۔ شہرہ آفاق محدثین حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:]

امام مالک، شعبہ، اوزاعی، لیث، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، ذوالنون، حماو، ابن مبارک، یحییٰ قطان، عبد الرحمن بن مہدی، وکیع، ابن علیہ، شافعی، عبد الرزاق، فریابی، ابو نعیم، قعنبی، حمیدی، ابو عیید، ابن المدینی، احمد، اسحاق، ابن معین،

ابو بکر رضی اللہ عنہ، ابن ابی شیبہ، ذہبی، بخاری، ابو زرعہ، ابو حاتم، ابو داود، مسلم، موسیٰ بن ہارون، صالح جزرہ، نسائی، ابن خزیمہ، ابو احمد بن عدی۔ ابن حبان، دارقطنی اور دیگر محدثین و ماہرین علم الرجال و جرح و تعدیل (رحمہم اللہ)۔

معرفت رجال کے موضوع پر متعدد چھوٹی بڑی کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ چند ایک کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔

طبقات ابن سعد، تاریخ صغیر بخاری، تاریخ کبیر بخاری، کلام ابن معین، کلام احمد بروایت تلامذہ، کتاب یحییٰ بن سعید القطان، کتاب علی بن مدینی، تاریخ یعقوب الفسوی، ابن ابی خثیمہ، ابن ابی حاتم، عقیلی، ابن عدی، ابن حبان، وارقطنی، مسند طبرانی، مسند احمد، مسند اسحاق، مسند ابو داود، مسند ابن ابی شیبہ، مسند العدنی، مسند ابن منیع، مسند ابو یعلیٰ، مسند بزار۔

مندرجہ ذیل کتب حدیث فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہیں:

موطا، سنن سعید بن منصور، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور دیگر لا تعداد کتب حدیث جن کا ذکر طوالت کا موجب ہے۔ یہ عظیم الشان علم باقی تمام اسلامی علوم میں عظمت و منزلت رکھتا ہے۔ خلاصہ کلام! اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ رافضی اس علم میں بہت ہی کم معرفت رکھتے ہیں تمام بدعتی اور گمراہ فرقوں میں اس علم میں رافضیوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا جاہل نہیں۔

باقی گمراہ فرقوں میں اس علم کے بارے میں کوتاہی پائی جاتی ہے؛ جیسے معتزلہ؛ مگر معتزلہ بھی خوارج سے زیادہ عالم ہوتے ہیں اور خوارج اپنی جہالت کے باوجود روافض سے زیادہ سچے؛ ان سے بڑے عالم؛ زیادہ دین دار؛ اور خوفِ الہی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ خوارج جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے۔ بلکہ وہ دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ سچے ہوتے ہیں۔ معتزلہ بھی باقی تمام فرقوں کی طرح ہیں۔ ان میں سچے بھی ہیں اور جھوٹے بھی؛ لیکن ان میں حدیث اور علوم حدیث کا وہ اہتمام نہیں پایا جاتا جو کہ اہل سنت والجماعت کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ حدیث کو دین کا حصہ سمجھتے ہیں [اس لیے انہیں معرفت حدیث کی ضرورت پڑتی ہے]۔ تو ضرورت ہوتی ہے کہ سچائی کو پہچان سکیں۔ جب کہ خوارج ایک دوسری راہ کے مسافر ہیں جسے انہوں نے خود ہی گھڑ لیا ہے؛ اور اسی پر ان کا اعتماد ہے [وہ نہ جھوٹی روایات سے احتجاج کرتے ہیں اور نہ ہی صحیح روایات سے۔ انہوں نے از خود کچھ قواعد گھڑ رکھے ہیں اور وہ انہی کو پیش نظر رکھتے ہیں]۔ جس میں ان کے ہاں حدیث کا ذکر تک نہیں پایا جاتا؛ بلکہ وہ اپنے اصول میں قرآن تک کو ذکر نہیں کرتے۔ صرف اس سے تقویت حاصل کرنے کے لیے؛ اعتماد کے لیے نہیں۔

روافض کا یہ عالم ہے کہ عقل و نقل دونوں سے تہی و امن ہیں۔ نہ ہی وہ کسی روایت کی اسناد دیکھتے ہیں اور نہ ہی باقی ساری شرعی اور عقلی دلیلوں کا خیال کرتے ہیں کہ کیا یہ ان کے موافق ہیں یا مخالف۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی بھی صحیح اور متصل سند نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ان کے ہاں جو بھی سند متصل ہوگی؛ اس میں کوئی نہ کوئی راوی ضرور ایسا ہوگا جس پر جھوٹ بولنے کی تہمت ہوگی یہ پھر وہ کثرت کے ساتھ غلطیاں کرنے والا ہوگا۔

رافضی اس باب میں یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی کوئی سند نہیں پائی جاتی۔ جب کہ اسناد اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور پھر اہل اسلام میں احادیث و آثار اور اسانید کی پہچان اہل سنت والجماعت کا خاصہ بن

کر رہ گیا ہے۔ روافض کے نزدیک کسی حدیث کی صحت کی علامت یہ ہے کہ وہ اس کے افکار و معتقدات سے ہم آہنگ ہو، امام مبد الرحمن بن مہدی فرماتے ہیں:

”اہل علم موافق و مخالف سب احادیث لکھتے ہیں، مگر مبتدعین وہی روایات لکھتے ہیں جن سے انکے نظریات کی تائید ہوتی ہو۔“
پھر یہ کہ ان کے پہلے لوگ بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ ان کی روایات ان لوگوں تک منتقل ہوئیں جو صحیح اور سقیم کی معرفت سے عاری تھے۔ پس ان کے پس میں صرف اتنا ہی تھا کہ یا تو تمام روایات کی تصدیق کریں اور یا پھر تمام روایات کی تکذیب کریں۔ اور غیر مستند اور منفصل دلائل سے استدلال کرتے رہیں۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آیا تم نفاش و غلبی و ابو نعیم کی مرویات ہر حال میں قبول کرتے ہو، مخالف یا موافق ہوں؟ یا مطلقاً ان کو ٹھکرادیتے ہو؟ یا موافق روایات کو قبول کرتے اور مخالف کی تکذیب کرتے ہو؟

ابو نعیم نے اپنی کتاب ”الحلیہ“ میں فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم جمع کیے ہیں۔ ان میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مناقب پر ایک کتاب ہے۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب موجود ہیں۔ ان میں صحیح روایات بھی ہیں، ضعیف بھی ہیں؛ بلکہ بعض منکر روایات بھی موجود ہیں۔ ابو نعیم اپنی منقولات کا خوب علم رکھنے والے انسان تھے۔ لیکن آپ اور آپ کے امثال ہر طرح کی روایات جمع کرتے ہیں تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ اس باب میں یہ روایت بھی موجود ہے۔ اور لوگوں کو روایات کے موجود ہونے کا پتہ چل جائے۔ ان کی مثال اس مفسر کی ہے جو تفسیر میں لوگوں کے اقوال نقل کرتا ہے؛ اور فقیہ جو فقہ میں لوگوں کے اقوال ذکر کرتا ہے؛ اور مصنف جو لوگوں کے دلائل ذکر کرتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو ان چیزوں کا پتہ چل جائے۔ اگرچہ وہ ان میں سے بہت ساری چیزوں کے صحیح ہونے کا اعتقاد نہیں بھی رکھتا؛ بلکہ انہیں ضعیف سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کہتا ہے: میں نے وہی چیزیں ذکر کی ہیں جو میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے نقل کی ہیں۔ اس کی ذمہ داری اس کے قائل پر ہوتی ہے نقل کرنے والے پر نہیں۔

بہت ساری ایسی کتابیں جو کہ عبادات کے فضائل اور فضائل اوقات یا اس طرح کے دیگر عنوانات پر لکھی گئی ہیں؛ ان میں بہت ساری ضعیف احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے؛ بلکہ موضوع روایات تک موجود ہیں۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ رجب کے روزوں کے بارے میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں اہل علم کے ہاں وہ تمام ضعیف ہی نہیں بلکہ جھوٹی ہیں۔

ایسے ہی صلاۃ رغائب جو رجب کے پہلے جمعہ کی رات کو پڑھی جاتی ہے؛ اور نصف شعبان کا الفیہ؛ اور فضائل عاشوراء محرم کے بارے میں جو اہل و عیال کے اخراجات میں وسعت دینے کی روایت ہے؛ اور مصافحہ کے فضائل؛ اور مہندی اور خضاب کے فضائل؛ غسل وغیرہ کے فضائل؛ عاشوراء کے دن کی نماز۔ یہ تمام روایات رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ہیں۔ عاشوراء کے روزہ کے علاوہ اس دن کی فضیلت کے بارے میں کوئی بھی صحیح روایت موجود نہیں۔

امام حرب الکرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”میں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس روایت کے متعلق پوچھا کہ: جو کوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کے کھانے میں وسعت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سارے سال کے لیے اس کے رزق میں

وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اس روایت کی کوئی اصل [بنیاد] ہی نہیں ہے۔“

فضائل صحابہ حضرت علی اور دوسرے اصحاب کے بارے میں بہت سارے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں؛ مثلاً: خیمہ بن سلیمان طرابلسی وغیرہ۔ خیمہ البو نعیم سے پہلے گزرے ہیں۔ ابو نعیم ان سے ان کی اجازت سے نقل کرتے ہیں۔ ابو نعیم اور اس کے امثال کی عادت ہے کہ جو کچھ بھی اس باب میں موجود ہوتا ہے اور جو کچھ سنتے ہیں وہ تمام روایات نقل کر دیتے ہیں۔

اگر شیعہ ہر حال میں ان کتابوں میں موجود تمام روایات قبول کرتے ہیں؛ تو ان کتابوں میں بہت ساری ایسی روایات بھی ہیں جو ان کے عقیدہ سے ٹکراؤ رکھتی ہیں۔ اور اگر تمام روایات کو رد کرتے ہیں تو پھر روایت کو محض ان کی طرف منسوب کرنے سے ہی ان سے استدلال کرنا باطل ٹھہرا۔ وراگر موافق روایات کو قبول اور مخالف روایات کو رد کرتے ہیں تو ان کے مخالف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ اس طرح کا کلام باطل ہے [اور ان کی مقبول روایات کو مسترد کر دے۔ اور ان کی رد کردہ روایات سے استناد کرے۔ لوگوں میں یہ بات عام طور سے رائج ہے کہ وہ مناقب و مثالب کے بارے میں ہر قسم کی روایات کو قبول کر لیتے ہیں]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی روایات سے مذہب کی صحت پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس سے کہا جاسکتا ہے کہ: اگر تم اپنے مذہب سے ہٹ کر اس حدیث کی صحت کو جانتے تھے؛ تو پھر اپنے مذہب کے صحیح ہونے پر دلیل لاؤ۔ اور اگر تم اس بنا پر اس روایت کو صحیح سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے مذہب کے موافق ہے؛ تو اپنے مذہب کی بنیاد پر روایت کو صحیح کہنا ممتنع ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں مذہب کا صحیح ہونا اس حدیث پر موقوف ہوگا۔ اور حدیث کا صحیح ہونا مذہب پر موقوف ہوگا۔ اس سے دور لازم آئے گا۔ جب کہ دور کا لازم آتا ممتنع ہے۔

مزید برآں کہ اگر تم نے کسی اور سند سے اس روایت کی صحت معلوم کی تھی؛ تو اس سے اس سند کا بھی صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ کبھی کبھار انسان کسی دوسرے پر کچھ جھوٹ بھی بول لیتا ہے اگرچہ وہ بات حق ہی کیوں نہ ہو۔ بہت سارے لوگ نبی کریم ﷺ سے ایسے اقوال روایت کرتے ہیں؛ جو اقوال بذات خود حق ہیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں ہیں۔ پس کسی چیز کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہو۔

اور اگر تمہیں اس کی صحت اسی طریق سے معلوم ہوئی ہے؛ تو یہ بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی چیز کے صحیح ہونے سے اس کی اصل صحت کو ثابت کیا جائے؛ اس سے دور لازم آئے گا۔

پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ اپنے مذہب کی موافقت ثابت کرنے کے لیے اس حدیث کی صحت ثابت نہیں ہو سکتی؛ خواہ مذہب کی صحت معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔

ہر وہ انسان جس کو منقولات سے ادنیٰ سا بھی واسطہ ہے؛ وہ جانتا ہے کہ ان میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اور لوگوں نے عیب جوئی اور فضائل بیان کرنے کے لیے بہت سارے جھوٹ بھی گھڑ لیے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے کئی امور میں بھی جھوٹ بولا گیا ہے۔ اور ان روایات میں بھی جھوٹ ہے جو ان کے موافق یا مخالف ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل میں بہت سارا جھوٹ بھی شامل ہے جیسا کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بھی بہت ساری روایات جھوٹی ہیں۔ لیکن جتنے بھی بدعتی اور ہوی پرست گروہ ہیں؛ ان میں رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹا کوئی نہیں ہے۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے؛ بلاشبہ خوارج بہت کم جھوٹ بولتے ہیں؛ بلکہ وہ اپنی بدعت اور گمراہی کے باوجود لوگوں میں سب سے سچے شمار ہوتے ہیں۔

جب کہ اہل علم اور اہل دین لوگ کسی روایت کی تصدیق یا تکذیب صرف اس بنا پر نہیں کرتے کہ وہ ان کے عقیدہ کے موافق ہے۔ بلکہ کبھی کوئی انسان رسول اللہ ﷺ اور اس امت کے فضائل میں بہت ساری احادیث نقل کرتا ہے تو انہیں صرف اس وجہ سے رد کر دیتے ہیں کہ وہ ان کا جھوٹ ہونا جانتے ہیں۔ اور بہت ساری احادیث کو ان کے صحیح ہونے کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کا ظاہر ان کے عقیدہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ یا تو ان کے بارے میں وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ احادیث منسوخ ہیں؛ یا پھر ان کی کوئی ایسی تفسیر ہے جس کی مخالفت وہ نہیں کرتے۔

منقولات میں اصل یہ ہے کہ ائمہ نقل اور اس فن کے علماء کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور جو کوئی ان کیساتھ اس علم میں شریک ہوتا ہے؛ وہ بھی ان کے علوم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ کسی روایت کے صحیح یا ضعیف ہونے پر علیحدہ سے تفصیل ہونی چاہیے؛ وگرنہ صرف کسی کے اتنا کہہ دینے سے کہ ”فلاں نے اسے روایت کیا ہے“ قابل حجت نہیں ہو سکتا؛ نہ ہی اہل سنت کے ہاں اور نہ ہی اہل شیعہ کے ہاں۔ اور مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہر مصنف کی ہر روایت سے استدلال کرنے لگ جائے؛ پس ہر وہ حدیث جسے بطور حجت پیش کیا جائے ہم سب سے پہلے اس کی صحت کا مطالبہ کریں گے۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ صرف کسی روایت کو شعبی کی طرف منسوب کر دینے سے اس کی صحت ثابت نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علماء حدیث جو مرجع سمجھے جاتے ہیں انہوں نے اپنی کتابوں میں کوئی ایسی روایت نقل نہیں کی۔ نہ ہی صحاح و سنن میں نہ ہی مسانید و معاجم میں؛ اور نہ ہی کسی دوسری معتبر کتاب میں۔ اس لیے کہ ایسی روایات کا جھوٹ ہونا کسی ادنیٰ علم رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

[بے بنیاد روایات]:

ایسی روایات اہل علم کے ہاں گمان کے درجہ میں ہوتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت باتفاق محدثین جھوٹی ہے اور حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں مندرج نہیں۔ اس حدیث کی صحت کا دعویٰ وہی شخص کرتا ہے جو اس حد تک جھوٹا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کا پیرو خیال کرتا ہے اور اس بات کا دعویٰ دار ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ نبی کریم ﷺ سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ یا جس طرح ترکوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں اور وہ ان لڑائیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں، حالانکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں شرکت کی تھی اور غزوہ احد میں شہادت سے مشرف ہوئے۔ یا جس طرح بہت سے عوام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا دمشق میں مدفون ہیں۔ یا عوام کا یہ نظریہ کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جامع دمشق کے باب القبرہ میں احادیث روایت کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح یہ افواہ بھی بے بنیاد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نجف میں مدفون ہیں، حالانکہ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو قصر الامارت میں دفن کیا گیا تھا کیونکہ اس بات کا خطرہ

دامن گیر تھا کہ خوارج ان کی قبریں نہ کھود ڈالیں۔^۵

اس لیے کہ خوارج نے ان تینوں حضرات کو قتل کرنے کے لیے قسمیں اٹھائی تھیں۔ پس اس کے نتیجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا؛ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے۔ جبکہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی جگہ نماز پڑھانے کیلئے خارجہ نامی ایک آدمی کو مقرر کیا تھا؛ جب قاتل نے حملہ کر دیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمرو بن العاص نہیں، بلکہ خارجہ ہے؛ تو اس نے کہا: ”میں تو عمرو کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ خارجہ کا تھا۔“ یہ بات لوگوں میں ضرب الشمل بن گئی۔

اس طرح کی بہت ساری چیزیں ہیں جو جہلاء کے خیالات پر مبنی ہیں۔ اور منقولات کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان روایات کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ: ہم کہتے ہیں کہ: بذات خود اس روایت میں ایسی باتیں موجود ہیں جو کئی لحاظ سے اس کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غدیر کے موقع پر موجود تھے..... الخ۔

جواب: اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ”غدیر خم“ پر نبی کریم ﷺ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے؛ وہ حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت کہے تھے۔ شیعہ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی دلیل شیعہ کا یہ عمل ہے کہ وہ اٹھارہ ذی الحجہ کو عید مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے بعد پھر کبھی مکہ تشریف نہ لائے۔ بلکہ آپ حجۃ الوداع سے مدینہ واپس تشریف لائے؛ ذوالحجہ کے باقی ایام؛ محرم اور صفر مدینہ طیبہ میں قیام کیا؛ اور ربیع الاول میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس حدیث [کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ من گھڑت حدیث ہے۔ اس میں] ہے کہ آپ نے جب غدیر خم کے مقام پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تو یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مثلاً یہ الفاظ کہ آپ مکہ میں بطحاء کے مقام پر تشریف فرما تھے کہ ”حارث آپ کے پاس آیا۔“ یہ ایسے جاہل انسان کا جھوٹ ہے جسے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ

① کوفہ کا قصر الامارت جس میں سیدنا علی مدون ہیں جامع کوفہ سے جانب قبلہ واقع ہے۔ مشہور شیعہ مورخ لوط بن یحییٰ کہتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جامع کوفہ کے ایک کونہ اور قصر الامارت کے محن میں ابواب کندہ کے قریب دفن کیے گئے تھے۔ شیعہ نے تیسری صدی ہجری میں سیدنا علی اور سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہم منیٰ کے ایک مدت بعد یہ دعویٰ کیا کہ آپ نجف میں مدفون ہیں، حقیقت شمس لوگوں کا قول ہے کہ نجف میں جو قبر سیدنا علی کی جانب منسوب ہے دراصل وہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ دمشق کا قصر الامارت جہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مدفون ہیں اس کو الخضر اء کہتے ہیں، یہ مسجد دمشق کی اس دیوار سے متصل ہے جو جانب قبلہ واقع ہے، اس کی مشرقی جانب حیرون نامی حوض ہے۔ مغرب میں باب البرید اور جنوب میں قصر اسعد پاشا واقع ہے۔ دمشق کے معرلوگ اپنے آباء اجداد سے نقل کرتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس دیوار کے نیچے مدفون ہیں جو جامع دمشق اور الدار الخضر اء کے درمیان واقع ہے دولت عباسیہ کے عہد اقبال میں حقد مین نے جامع دمشق کی قبلہ والی دیوار پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا تھا جس پر لکھا تھا: ”یہ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔“

اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حاسد لوگ آپ کی قبر نہ کھود ڈالیں۔ الدار الخضر اء میں ایک اور قبر بھی تھی جو آج کل ”الہزوریہ“ نامی بازار میں واقع ہے۔ غالباً یہ معاویہ رضی اللہ عنہ بن یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عید الفطر ۴۳ھ میں وفات پائی آپ کے بیٹے عبد اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی، مجھے تا دم آخر اس بات کی کوئی دلیل معلوم نہیں ہو سکی کہ آپ دارالامارۃ میں مدفون ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ آپ وادی المعظم میں گھاٹی کے دروازہ کے نزدیک مدفون ہیں، صحابہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آدمی اعمال سے زندہ جاوید ہوتا ہے، کئی قبریں نہیں، یہی وجہ ہے کہ فراموشی و جاہلہ کی طرح وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ صلحاء اور نامور فاتحین صحابہ کی قبروں پر مقبرے بنائے جائیں اور ان پر عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں۔

واقعہ کب پیش آیا۔

نیز یہ بات کہ پھر ﴿سَأَلْ سَائِلٌ﴾ والی آیت نازل ہوئی۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہ سورت غدیر خم کے واقعہ سے دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے نازل ہو چکی تھی۔ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی۔

علاوہ ازیں یہ آیت ﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ یہ سورت الانفال کی آیت ہے۔ یہ سورت بالاتفاق غزوہ بدر کے بعد غدیر خم سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ مثلاً ابوجہل وغیرہ کے ان اقوال کی وجہ سے نازل ہوئی تھی جو انہوں نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ سے کہے تھے۔ اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ان لوگوں کی باتیں یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے کہا تھا:

﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ﴾

یعنی اے پیغمبر! وہ وقت یاد کرو جب وہ لوگ آپ سے ایسی باتیں کہہ رہے تھے۔ یہ بالکل ان آیات کی طرح ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور وہ وقت یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا۔

اور فرمایا: ﴿وَإِذْ عَدُوَّتْ مِّنْ أَهْلِكَ﴾ اس وقت کو بھی یاد کرو جب صبح ہی صبح آپ اپنے گھر سے نکل گئے۔

اس طرح کی دیگر بھی بہت ساری آیات ہیں۔ ان میں حکم دیا جاتا ہے کہ آپ گزرے ہوئے واقعات کو یاد کریں۔ تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ واقعہ اس سورت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

اور ایسے ہی جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عذاب کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ تم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں ہوگا جب تک تم میں محمد ﷺ موجود ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ اثْنَا

بِعَذَابٍ آٰلِيهِمْ﴾ [الأنفال ۳۲]

”اور جب کہ ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔“

پھر اس کے بعد [عذاب نہ آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے] فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ [الأنفال ۳۳]

”اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے اور اللہ ان کو عذاب نہ دے گا اس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے ہوں۔“

علماء کرام کا اتفاق ہے کہ اس کے باوجود اہل مکہ پر پتھر نہیں برسائے گئے تھے۔ اگر یہ واقعہ درست ہوتا کہ پتھر حارث کے سر پر گرا اور دبر کے راستہ نکل گیا تو اصحاب الفیل کے واقعہ کی طرح یہ عظیم معجزہ تھا اور ہر کس و ناکس اس کو جانتا ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

جب علم نقل کرنے والے علماء کی ایک جماعت موجود تھی۔ اور کسی بھی اہل علم مستند مصنف نے اس روایت کو اپنی تصنیف میں ذکر نہیں کیا؛ نہ ہی مسند میں نہ ہی صحاح میں؛ نہ ہی فضائل میں؛ نہ تفسیر میں نہ ہی سوانح میں؛ بلکہ اسے روایت کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اس طرح کی منکر روایات جمع کرتے رہتے ہیں؛ تو اس سے معلوم ہوا یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔

اس حدیث میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان الفاظ کے کہنے والے نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا تذکرہ بھی کیا تھا؛ اس بنیاد پر وہ مسلمان تھا؛ کیونکہ وہ کہہ بھی رہا تھا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی۔ یہ بات ضرورت کے تحت کبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اس نام کا کوئی معروف آدمی تھا۔ بلکہ یہ نام بھی ان اسماء کی جنس سے ہے جسے طریقہ ذکر کرتے ہیں اور یہ واقعہ بھی عسکر اور دہمہ کے افسانوی قصوں کی طرح ہے۔ بہت سارے علماء کرام رضی اللہ عنہم نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام جمع کئے ہیں جن سے کوئی بھی روایت منقول ہے۔ حتیٰ کہ ضعیف احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ جیسے: ابن عبد البر کی کتاب ”الاستیعاب“ ابن مندہ کی کتاب: البو نعیم اصفہانی کی کتاب: حافظ ابو موسیٰ کی کتاب؛ اور اس طرح کی دیگر کتابیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس آدمی کا ذکر تک نہیں کیا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس نام کے کسی آدمی سے کوئی روایت ذکر نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف وہی روایات ذکر کرتے ہیں جو اہل علم کے ہاں متداول ہوں۔ اور اہل طریقت وغیرہ کی روایات نقل نہیں کرتے؛ جیسا کہ تنقلاۃ الکبریٰ میں الکبریٰ نے کیا ہے۔



تیسری وجہ: ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ یہ تھا کہ تم امامت کو قرآنی نصوص سے ثابت کرو گے۔ قرآن کے ظاہر میں اصل میں کوئی ایسی چیز موجود ہی نہیں۔ جو آیت تم نے پیش کی تھی:

﴿يَبْلُغُ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ [المائدة ۶۷]

”کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔“

یہ الفاظ تو عام ہیں؛ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس سب کو شامل ہیں۔ کسی بھی متعین چیز کی اس میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

مدعی کا یہ دعویٰ کہ امامت علی رضی اللہ عنہ بھی ان ہی امور میں سے ایک ہے جن کی تبلیغ آپ ﷺ نے کی تھی؛ یا آپ کو اس کی تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ محض قرآن سے ایسی کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ قرآن میں ایسی کسی متعین چیز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اگر ایسی کوئی بات نقل سے ثابت ہو جائے تو حدیث یا خبر سے ثابت تصور ہوگی نہ کہ قرآن سے۔ پس جو کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت قرآن سے ثابت ہے؛ اور آپ ﷺ کو اس کی تبلیغ کا حکم بھی دیا گیا تھا؛ یقیناً ایسا انسان قرآن پر بہتان تراشی کرتا ہے۔ قرآن میں کوئی بھی عام یا خاص ایسی دلیل موجود نہیں ہے۔



چوتھی وجہ: ان سے یہ کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کے جو احوال معلوم ہیں؛ ان کی روشنی میں یہ آیت تمہارے دعویٰ کے الٹ پر دلالت کرتی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ہی کوئی ایسا حکم نازل کیا؛ اور نہ ہی اس کی تبلیغ کا حکم دیا۔ اس لیے کہ اگر ایسی کوئی بھی چیز ہوتی جس کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا جاتا تو آپ ضرور ایسا کرتے؛ اور لوگوں تک یہ بات پہنچاتے۔ اس لیے کہ آپ کسی طرح بھی اللہ کی نافرمانی کرنے والے نہ تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اماں عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”جو کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے وحی میں سے کوئی چیز چھپائی تھی تو اس نے جھوٹ بولا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ مَا أَزِيلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ [البائدة ۶۷]

”اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔“

اہل علم بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کئی ایک دلائل موجود ہیں۔

علم نقل کرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی؛ اور نقل علم کے دواعی و اسباب بھی پائے جاتے تھے۔ اگر اس روایت کی کوئی اصل ہوتی تو جیسے اس طرح کی دوسری روایات نقل کی گئی ہیں؛ ایسے ہی یہ روایت بھی ضرور نقل کی جاتی۔ خصوصاً جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بہت ساری ایسی روایات بھی نقل کی گئی ہیں جن کی کوئی اصل ہی نہیں۔ تو پھر وہ حقانیت اور سچائی کیونکر نقل نہ کی جاتی جسے لوگوں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو حکم دیا تھا کہ وہ جو بات بھی آپ ﷺ سے سنیں اسے آگے لوگوں تک پہنچائیں۔ امت کے لیے بھی کسی ایک علمی بات کا چھپانا ہرگز جائز نہ تھا جس کی تبلیغ کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔

جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اور بعض انصار نے مطالبہ کیا کہ ایک امیر ان میں سے ہو؛ اور ایک امیر مہاجرین میں سے ہو؛ تو اس بات پر انکار کیا گیا۔ اور مہاجرین نے کہا کہ: امارت صرف قریش میں ہی ہو سکتی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی ایک متفرق مواقع پر ارشاد فرمائی گئی حدیث نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”امامت صرف قریش میں ہوگی۔“ اس مجلس میں یا کسی بھی دیگر موقع پر کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔

مسلمانوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی؛ بیعت کرنے والوں میں اکثر لوگ بنو عبد مناف - بنو امیہ اور بنو ہاشم وغیرہم - سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا بڑا مضبوط میلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا کہ آپ کو ولایت کے لیے اختیار کیا جائے۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نص ذکر نہیں کی۔ اور معاملہ ایسے ہی حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی رہا۔ اور پھر آپ کے عہد میں جب آپ خلافت و امارت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے تو پھر بھی نہ ہی آپ نے؛ نہ ہی اہل بیت میں سے کسی ایک نے؛ اور نہ ہی معروف صحابہ میں سے کسی ایک نے یہ نص ذکر کی۔ یہ نص اس کے بہت بعد میں سامنے آئی۔

سنت اور حدیث کا علم رکھنے والے اہل علم جیسے امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ کرام حضرت علیؓ سے محبت کرتے ہیں اور آپ سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ: آپ حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ برحق تھے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس میں اختلاف بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: آپ کا زمانہ امت میں فتنے اور اختلاف کا زمانہ تھا۔ آپ کے دور میں امت کا اتفاق نہ ہی آپ پر ہوسکا اور نہ ہی کسی دوسرے پر۔

ایک دوسری جماعت کرامیہ کا کہنا ہے کہ: آپ بھی خلیفہ برحق تھے؛ اور حضرت امیر معاویہؓ بھی خلیفہ برحق تھے۔ اور یہ لوگ ضرورت کے تحت دو خلیفہ ہونے کو جائز کہتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حضرت ابن زبیر اور یزید کے دور کے متعلق بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کا ایک خلیفہ پر اتفاق نہیں ہوسکا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ اپنے زمانے میں حدیث کے سب سے بڑے امام تھے؛ آپ نے حضرت علیؓ کی خلافت پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

”میرے بعد خلافت نبوت تیس سال تک ہوگی؛ پھر اس کے بعد بادشاہی ہوگی۔“ [سنن الترمذی ۳/ ۱۳۴۱]

بعض لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ مگر امام احمد اور دوسرے علماء کرام اسے صحیح ثابت کرتے ہیں۔

یہ حدیث ان کے مذہب میں خلافت علیؓ پر نصوص کی اساس اور سرمایہ ہے۔ اگر یہ کوئی ایسی صحیح اور مستند یا مرسل حدیث پالیستہ جو ان کی خواہشات کے مطابق ہو تو پھر ان کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہتی۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ رافضی جس نص کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں؛ اہل علم نے قدیم و حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال سے کوئی ایسی بات نہیں سنی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم ضرورت کے تحت ایسی روایات کے جھوٹ کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ان کے سامنے تمام جھوٹی روایات و اشکاف ہوتی ہیں۔

جب تحکیم الحکمین کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت اکثر لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے یہ نص بیان کی ہو؛ نہ ہی آپ کے ساتھیوں میں سے اور نہ ہی دوسرے لوگوں میں سے۔ حالانکہ اس وقت آپ کے شیعہ بھی کثرت سے تھے۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے یہ روایت بطور حجت پیش کی ہو۔ حالانکہ یہ ایسا موقع تھا کہ ایسی نصوص کو ہر حال میں سامنے لانا چاہیے تھا۔

اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ اگر شیعان علیؓ کے پاس ہی کوئی اس قسم کی نص موجود ہوتی تو معروف عادت کا تقاضا تھا کہ کوئی بھی یہ کہہ دیتا کہ آپ کی خلافت کے بارے میں یہ نص موجود ہے؛ لہذا حضرت امیر معاویہؓ پر آپ کو مقدم کرنا واجب ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ خود انتہائی نیک دل مسلمانوں میں سے تھے۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر نبی کریم ﷺ سے نص موجود ہے تو آپ کبھی بھی حضرت علیؓ کو معزول کرنے کی بات نہ کرتے۔ اور اگر آپ ایسی بات کرتے بھی تو اس کا انکار کیا جاتا کہ آپ کیسے اس انسان کو معزول کرنے کا کہہ رہے ہیں جس کی خلافت پر نبی کریم ﷺ سے نص موجود ہے؟۔

شیعہ نے ایک حجت یہ بھی پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔“

یہ حدیث خبر واحد ہے؛ یا پھر اس کو روایت کرنے والے دو یا تین افراد ہیں؛ متواتر نہیں ہے۔ اور نص کے لیے متواتر ہونا ضروری ہے۔

واہ سبحان اللہ! عجیب بات ہے کہ شیعہ حضرات صحیح منقول اور صریح منقول کو چھوڑ کر ایسی روایات سے استدلال کرتے ہیں؛ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی کوئی نص پیش نہیں کر سکتا؟

امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری دلیل:

اشکال: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امام علی رضی اللہ عنہ کی تیسری دلیل یہ آیت ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾

”آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھر پور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔“ [المائدة ۳]

ابونعیم اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے لوگوں کو غدیر خم پر بلایا۔ اور درخت کے نیچے سے کانٹے اور جھاڑیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دونوں بازو تھام لیے اور انہیں بلند کیا، یہاں تک کہ لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ ابھی لوگ جدا نہیں ہو پائے تھے کہ یہ آیت اتری: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دین کو تکمیل بخشی؛ اپنی نعمت پوری کی؛ اور میری رسالت اور علی کی ولایت پر رضامندی کا اظہار کیا، پھر فرمایا: ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ؛ اللہم وال من والاہ و عداد من عدادہ وانصر من نصرہ و اخذل من خذله۔“ ”جس کا میں مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے۔“ یا اللہ جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ؛ اور جو اس کی مدد کرے تو بھی اسکی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔“ [راضی کا بیان ختم ہوا۔]

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: استدلال کرنے والے پر واجب ہے کہ وہ اس کی حدیث کی صحت پیش کرے۔ بالاتفاق علماء شیعہ و اہل سنت صرف ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے سے روایت کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ابونعیم نے بہت ساری ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع احادیث تک روایت کی ہیں؛ اس پر بھی تمام شیعہ اور اہل سنت علماء کرام و محدثین کا اتفاق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابونعیم حافظ الحدیث تھے؛ اور آپ کی روایات کا باب بھی بہت وسیع ہے؛ لیکن روایت کرنے میں جیسا کہ ان جیسے محدثین کی عادت ہے؛ اس باب میں جو بھی روایت موجود ہوتی ہے؛ سب کو نقل کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس روایت کی معرفت حاصل ہو جائے۔ ورنہ ان کی تمام روایات قابل احتجاج نہیں؛ ان میں سے بعض روایات ایسی ہیں جن سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

اہل علم کی اپنی تصنیفات کے سلسلہ میں کئی اقسام ہیں:

ان میں ایسے محدثین بھی ہیں جنہیں اگر کسی بارے میں جھوٹ ہونے کا علم ہو جائے تو اس سے روایت نہیں لیتے۔ جیسے امام مالک؛ شعبہ؛ یحییٰ بن سعید؛ عبد الرحمن بن مہدی؛ اور احمد بن حنبل رحمہم وغیرہم۔ یہ محدثین کسی بھی ایسے شخص سے روایت نہیں کرتے جو ان کے ہاں ثقہ نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی ایسی روایت نقل کرتے ہیں جس کے بارے میں انہیں علم ہو کہ یہ روایت جھوٹ ہے۔ ایسے جھوٹے لوگوں کی احادیث روایت نہیں کرتے جن کے بارے میں عمداً جھوٹ بولنا معروف ہو۔ لیکن کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جس سے روایت کرتے ہیں وہ اس روایت میں غلطی کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں موضوعات کے علماء کے نزدیک یہ حدیث بالاتفاق جھوٹ ہے۔ جو لوگ اس باب میں مرجع سمجھے جاتے ہیں وہ اس حدیث کو جھوٹ روایت قرار دے رہے ہیں۔ اسی لیے حدیث کی وہ اہم ترین کتب جو کہ مرجع سمجھی جاتی ہیں ان میں اس روایت کا نام و نشان تک نہیں۔

تیسری بات: احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے واقعہ سے [نوروز] پہلے اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ عرفات میں قیام پذیر تھے۔^①

ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: اے امیر المؤمنین! تمہاری کتاب قرآن مجید میں ایک آیت ہے جسے تم پڑھتے ہو؛ اگر ہم یہودیوں پر وہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون سی آیت ہے؟ تو یہودی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں یہ آیت کس دن نازل ہوئی؛ اور کس جگہ پر نازل ہوئی؛ یہ آیت عرفہ کے دن میدان عرفات میں نازل ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ عرفات میں وقوف کیے ہوئے تھے۔

یہ روایت کئی دوسری اسناد کے ساتھ بھی مشہور ہے۔ اور اہل اسلام کی کتابوں؛ صحاح؛ مسانید؛ معاجم اور سنن؛ تفاسیر اور سیرت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے۔

تیسری بات: یہ آیت غدیر خم کے واقعہ سے نوروز پیشتر نازل ہوئی تھی۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور نو ذوالحجہ کی تاریخ تھی۔ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے موقع پر نازل ہوئی۔

چوتھی بات: اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرف کسی طرح کا بھی کوئی اشارہ بھی پایا جاتا۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف اس دین کے مکمل ہونے اور اہل ایمان پر اس کی نعت کے پورا ہونے اور دین اسلام پر رضامندی کی خبر دی گئی ہے۔ نظر بریں شیعہ کا یہ دعویٰ کہ قرآنی دلائل سے امامت علی کا ثبوت ملتا ہے صاف جھوٹ ہے۔ [البتہ صحیح احادیث سے انہیں اس بات کا ثبوت پیش کرنا چاہیے]۔

① البخاری، باب زیادة الايمان و نقصانه، (ج: ۴۵) مسلم۔ باب فی تفسیر آیات منفردة (ج: ۳۰۱۷)۔

اگر شیعہ کہیں کہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر حدیث صحیح سند سے ثابت ہو تو پھر دلالت حدیث سے ہوگی؛ آیت سے نہیں ہوگی۔ اور اگر حدیث صحیح نہ ہوئی تو پھر اس کے لیے نہ ہی آیت میں کوئی حجت ہے اور نہ ہی حدیث میں۔ پس دونوں لحاظ سے اس آیت میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اس سے مذکورہ روایت کا جھوٹا ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ [شیعہ مصنف نے] نزول آیت کا سبب اس روایت میں بیان کیا ہے 'حقیقت میں بھاس پر اس کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

پانچویں بات: اس روایت میں مذکور الفاظ: اللہم وال من والاہ و عاد من عاداہ وانصر من نصرہ و اخذل من خذلہ۔ "اے اللہ جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ۔ جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ؛ جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔" باتفاق محدثین جھوٹ ہیں۔ البتہ اس سے پہلے کے الفاظ: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ" جس کا میں مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے کے بارے میں ہم اپنی جگہ پر ان شاء اللہ تفصیل سے گفتگو کریں۔

چھٹی بات: نبی کریم ﷺ کی دعا مجاب [مقبول] ہوتی ہے۔ جب کہ یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصل میں رسول اللہ ﷺ کی دعا نہیں ہے۔ یہ بات سبھی لوگ جانتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو لوگ اس وقت تین گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو آپ سے مل کر لڑ رہے تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ سے لڑ رہا تھا۔ اور تیسرا گروہ وہ تھا جو بالکل الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان میں اکثر سابقین اولین تھے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض سابقین اولین نے قتال میں حصہ لیا تھا۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ نامی صحابی نے قتل کیا تھا۔ یہ ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ سابقین اولین میں سے ہیں؛ اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا۔ ان تمام کے بارے میں صحیحین میں ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ صحیح مسلم میں سرور کائنات ﷺ یہ ارشاد ہے کہ:

"درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔" (صحیح مسلم ج ۲۶: ۲۴۹۶)

ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا؛ جیسے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما؛ اگرچہ ان میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل بھی تھے؛ تاہم یہ لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ آگے تک پہنچے ہوئے تھے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر لڑنے والوں میں سابقین اولین میں سے بھی کچھ لوگ موجود تھے؛ جیسے حضرت سہیل بن حنیف اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ مگر جو لوگ اس جنگ سے اپنا دامن بچا کر بیٹھے رہے وہ لوگ زیادہ افضل تھے جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ مل کر قتال نہیں کیا۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان سے افضل کوئی دوسرا صحابی نہیں تھا۔ اور ایسے ہی انصار میں سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ سرور کائنات ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ: "فتنہ و فساد سے محمد بن مسلمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" [ابوداؤد ۴/ ۳۰۰]۔

آپ بھی اس جنگ سے الگ تھلگ رہے۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ جنگیں تاویل کی وجہ سے فتنہ کی جنگیں

تھیں۔ اس کا واجب یا مستحب جہاد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی نسبت زیادہ حق پر تھے۔ صحیح حدیث میں یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

مسلمانوں کے مابین تفرقہ بازی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔ [مسلم ۷۴۵/۲، سنن ابو داؤد ۴/۳۰۰]

پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ان کے ساتھ لڑنے والوں کی نسبت حق پر تھے۔ اس لیے کہ آپ نے ہی مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت خوارج کو قتل کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی اور ایک جماعت آپ کے خلاف تھی۔ پھر جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی وہ بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گئے۔ بلکہ وہ برابر کفار کو قتل کرتے رہے؛ اور مختلف شہر فتح کرتے رہے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا؛ ان کی مخالفت کرنے والے یا ان کا ساتھ چھوڑنے والا ان کو کوئی نقصان نہیں دے سکے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے۔“ [بخاری ۹/۸۲، مسلم ۳/۱۵۲۳]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ لوگ اہل شام ہیں۔

جن لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتل کیا؛ وہ کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گئے [اور نہ ہی انہیں کوئی رسوائی اٹھانا پڑی ہے] بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ کرنے میں بھی انہیں ناکامی نہیں اٹھانا پڑی۔ تو پھر نبی کریم ﷺ کی یہ دعا کہاں گئی جس میں آپ نے اللہ سے مانگا تھا:

”وانصر من نصرہ و اخذل من خذله۔“

”جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔“

بلکہ شیعہ خود کو خواص حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے شمار کرتے ہیں مگر وہ ہمیشہ بے یار و مددگار اور رسوا ہی رہے؛ اور لوگوں کا سہارا لیے بغیر انہیں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہو سکی۔ خواہ مسلمانوں کا سہارا لیں یا کفار کا سہارا لیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انصار ہیں تو پھر اللہ کی مدد و نصرت کہاں ہے؟ ان باتوں سے اس روایت کا جھوٹ ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

امامت علی کی چوتھی دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت علی کی چوتھی دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾

”اور ستارے کے قسم! جب وہ ٹوٹ جائے کہ تمہارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔“

فقیر ابن مغازی شافعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں بنی ہاشم کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہ نبوی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کے گھر میں یہ ستارہ ٹوٹا وہ میرے بعد میرا وصی ہو گیا۔ چنانچہ جو انوں کا ایک گروہ اس کی کھوج لگانے کے لیے چلا گیا؛ معلوم ہوا کہ وہ ستارہ حضرت علی

رضی اللہ عنہ کے گھر پر ٹوٹا ہے۔ تو وہ نو جوان کہنے لگے کہ: ”آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔“
تب یہ آیت اتری: ﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾ [انہی کلام الرافضی]

[جواب:] پہلی بات: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں؛ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم بار بار یہ مطالبہ کر چکے ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے اور بلا علم و معرفت اللہ کے بارے میں کوئی بات کہنا حرام ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (الاسراء: ۳۶)

”جس بات کا آپ کو علم نہیں وہ بیان نہ کریں۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [الأعراف ۳۳]

”کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجِبْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران ۶۶]

”دیکھو تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کے متعلق تمہیں کچھ علم تھا، تو اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الحج ۳]

”اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں کچھ جانے بغیر جھگڑتا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آلِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾

”وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، بڑی ناراضی کی بات ہے اللہ کے نزدیک اور ان کے نزدیک جو ایمان لائے۔“ [آفاقر ۳۵]

اس کی طرف سے دی گئی سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمْ أُنْزِلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِهَا كَأَنُوهَا بِهِ يُشْرِكُونَ﴾ [الروم ۳۵]

”یا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ بول کر وہ چیزیں بتاتی ہے جنہیں وہ اس کیساتھ شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمَّا لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِينٌ ۖ فَاتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الصافات ۱۵۷، ۱۵۸]

”یا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ تو لاؤ اپنی کتاب، اگر تم سچے ہو۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْبَآءٌ سَمِيتُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ [النجم ۲۳]

”یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، ان کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔“

جو چیز انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لیکر آئے ہیں اسے سلطان ”دلیل“ کہتے ہیں۔ ایسے ہی سنت بھی سلطان ہے۔ مگر سنت کی معرفت بھی اس وقت ہوتی ہے جب وہ صحیح سند کے ساتھ منقول ہو۔ جو شخص حدیث نبوی سے استدلال کرنا چاہے اس پر لازم ہے کہ احتجاج کرنے سے قبل اس کی صحت معلوم کر لے۔ اور جب اس سے کسی دوسرے کے خلاف احتجاج کرے تو ساتھ ہی اس کی صحت بھی بیان کر دے۔ ورنہ اس کا شمار بغیر علم کے بات کرنے والوں میں اور بغیر علم کے استدلال کرنے والوں میں ہوگا۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ فضائل وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھی گئی کتابوں میں جھوٹی روایات بھی پائی جاتی ہیں تو صرف ان کتابوں میں روایت کے موجود ہونے کی بنا پر اس پر اعتماد کرنا اسی طرح ہے جیسے فاسق کی شہادت سے استدلال کرنا جو سچ بھی بولتا ہو اور جھوٹ بھی۔ اگر ہمیں یہ علم ہو جائے کہ اس میں جھوٹ ہے؛ تو اس روایت سے ہمیں کوئی علمی فائدہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہمیں کسی صحیح روایت کا علم نہ ہو جائے جسے ثقہ علماء نے روایت کیا ہو۔

ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کئی صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں لوگ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے یا کسی دوسرے سے نقل کرتے ہیں اس میں جھوٹ بھی آ جاتا ہے اور سچ بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: ”عنقریب مجھ پر جھوٹ بولا جائے گا۔“ اگر یہ حدیث سچی ہے تو پھر [پیغمبر کی بات سچ ثابت ہونے کے لیے] ضروری ہے کہ آپ پر جھوٹ بھی بولا جائے۔ اور اگر یہ روایت جھوٹ ہے تو پھر یقیناً آپ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ جب یہ مسئلہ اس طرح سے ثابت ہو گیا تو پھر کسی انسان کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ کسی فرعی مسئلہ میں کسی حدیث سے استدلال کرے یہاں تک کہ اس حدیث کی صحت ثابت ہو جائے۔ تو پھر اصولی مسائل میں اس طرح کا استدلال کیوں کر جائز ہو سکتا ہے جس کی وجہ خیر القرون کے جمہور اہل اسلام؛ اہل تقویٰ اور اولیاء اللہ کے سرداروں پر اعتراض وارد ہوتا ہو؛ اور خود اس روایت کے صحیح ہونے کا کوئی علم ہی نہ ہو؟

ایسے انسان سے اگر پوچھا جائے: کیا تم حقیقت میں جانتے ہو کہ ایسا واقعہ پیش آیا تھا؟ اگر وہ جواب میں کہے: ہاں تو یقیناً اس نے جھوٹ بولا۔ اس لیے کہ اسے کس طرح پتہ چلا کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے؟ اس سے پھر پوچھا جائے گا: تمہیں اس واقعہ کے سچا ہونے کا کیسے پتہ چلا؟ یہ بات اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک واقعہ کی اسناد اور راویوں کے احوال معلوم نہ ہوں۔ جب کہ ان چیزوں کے بارے میں تمہیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اگر تمہیں راویوں کے احوال معلوم ہوتے تو تم جان

لیتے کہ یہ روایت جھوٹی ہے۔

اگر [شیعہ] اس کے جواب میں کہے: ”مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں؟

تو [پھر ہم اس سے پوچھتے ہیں] جس چیز کے صحیح ہونے کا تمہیں کوئی پتہ نہیں اس سے استدلال کرنا کیسے جائز ہوا؟

[روایت کی حقیقت]:

دوسری بات: محدثین کرام رحمہ اللہ کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ مغازی کا شمار محدثین میں نہیں ہوتا۔ ابو نعیم اور اس کے امثال بھی علوم [روایات] کو جمع کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسے لوگوں کی غالبیت ایسی روایات جمع کرتے ہیں جو حق ہوتی ہیں؛ لیکن ان میں سے بعض باطل چیزیں بھی لے آتے ہیں؛ جیسے ثعلبی اور ان کے امثال۔ بلکہ ان لوگوں کا اصل کام حدیث کی جانچ پرکھ نہیں تھا؛ اس لیے انہوں نے لوگوں کی کتابوں میں فضائل علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بھی دیکھا؛ اس سب کو جمع کر دیا۔ جیسا کہ خطیب خوارزمی نے کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات حدیث کی گہرائیوں سے لاعلم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک وہ روایات بھی جمع کر لیتا ہے جو لوگوں نے اپنی طرف فضائل کے باب میں جھوٹ گھڑ لی ہوتی ہیں۔ حدیث کے علوم سے ادنیٰ شناسائی رکھنے والوں پر بھی ان روایات کا جھوٹ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

ہم نہیں جانتے کہ ان حضرات میں سے کوئی ایک بھی جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہوگا۔ لیکن ہم یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو روایات انہوں نے نقل کی ہیں ان میں بہت زیادہ جھوٹ بھی ہے؛ اور اہل علم کا اس پر اتفاق ہے۔ ان کو اس سے پہلے بھی اہل علم نے جھوٹ کہا ہوتا ہے؛ مگر جب یہ لوگ روایت کرتے ہیں تو انہیں علم نہیں ہوتا کہ اس میں جھوٹ ہے۔ اور بسا اوقات انہیں اس کے جھوٹ ہونے کا علم بھی ہوتا ہوگا۔ [مگر پھر بھی اس لیے روایت کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ اس طرح کی روایات بھی اس بارے میں موجود ہیں]۔ لیکن ہمیں یہ پکا علم نہیں کہ کیا ان حضرات کو یہ علم تھا کہ یہ روایات جھوٹ ہیں؛ یا انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا؟

علاوہ ازیں محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بالفاظ دیگر موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے یہ حدیث بروایت محمد بن مروان ذکر کی ہے، اس نے کلبی سے، اس نے ابوصالح سے، اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ جب نبی کریم ﷺ کو ساتویں آسمان کی سیر کرائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے عجائبات دکھائے تو علی الصبح آپ نے وہ واقعات بیان کر دیے۔ اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی تکذیب کی؛ کچھ لوگوں نے آپ کی تصدیق کی۔ اسی دوران آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس کے گھر میں یہ ستارہ گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا؟ چنانچہ وہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں گرا۔ اہل مکہ کہنے لگے محمد گمراہ ہو گئے اپنے اہل بیت کی محبت میں گمراہ ہو گئے اور اپنے چچا زاد بھائی کی طرف جھک گئے۔ تب یہ آیت اتری:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾

محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث موضوع ہے، اس کا وضع کتابرا آدمی ہے اور اس نے کس قدر بعید از عقل بات بیان کی ہے۔ اس کی سند میں اندھیرا ہی اندھیرا (کذاب راوی) ہے۔ مثلاً ابوصالح نیز کلبی اور محمد بن مروان

سہی، کلبی متہم بالکذب ہے۔ ابو حاتم بن حبان لکھتے ہیں:

”کلبی ان لوگوں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے اور وہ لوٹ کر دنیا میں آئیں گے۔ جب

بادل کو دیکھتا تو کہتا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کی روایت سے احتجاج کرنا حلال نہیں ہے۔“

حیرانی کی بات ہے اس حدیث کو وضع کرنے والے نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عقل کے منافی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ستارہ کسی جگہ گرے اور وہ اتنی دیر وہاں موجود رہے کہ دوسرا شخص اسے دیکھ سکے۔ اس کی حماقت کا اندازہ لگائیے کہ اس نے اس روایت کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ ابن عباس کی عمر رضی اللہ عنہ اس وقت دو سال تھی۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے شاہد کیسے ہو سکتے تھے اور یہ روایت کیسے نقل کر سکتے تھے؟“

[محدث ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:] ”میں کہتا ہوں چونکہ یہ روایت کلبی کی معروف تفسیر میں نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث اس کے بعد وضع کی گئی ہے۔ اقرب الی الصحت یہی بات ہے۔ ابو الفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”بعض لوگوں نے اس حدیث کے الفاظ چرا لے، اس کی اسناد تبدیل کر دی اور ایک غریب سند کیساتھ اسے ابو بکر العطار سے؛ اس نے سلیمان بن احمد المصری سے ابو قضاۃ ربیعہ بن محمد کی سند سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں: ہم سے ثوبان بن ابراہیم نے بیان کیا: وہ کہتا ہے ہم سے مالک بن غسان النہشلی نے بیان کیا اس نے حضرت انس سے روایت کیا ہے: ”نبی کریم ﷺ کے عہد میں ایک ستارہ ٹوٹا تو آپ نے فرمایا: ”جس کے گھر میں یہ ستارہ گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا؟ چنانچہ وہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں گرا۔ اہل مکہ کہنے لگے محمد گمراہ ہو گئے اپنے اہل بیت کی محبت میں گمراہ ہو گئے اور اپنے چچا زاد بھائی کی طرف جھک گئے۔ تب یہ آیت اتری:

﴿وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾

ابو الفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ حدیث حقیقت میں وہ پہلے والی حدیث ہے۔ بعض لوگوں نے اس حدیث کے الفاظ چرا لے، اس کی اسناد تبدیل کر دی۔ اس کی غفلت کی انتہاء یہ ہے کہ اس نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے۔ حالانکہ معراج کے زمانہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ مکہ میں موجود ہی نہیں تھے۔ اور نہ ہی اس سورت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ معراج کا واقعہ ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ میں آمد کے بعد پہچانا ہے۔ اس کی سند میں اندھیرا ہی اندھیرا (کذاب راوی) ہے۔ مالک النہشلی کے بارے میں ابو حاتم بن حبان لکھتے ہیں:

”یہ ایسی روایات ثقات کے سر تھوپتا ہے جو کہ اصل میں جھوٹ ہوتی ہیں۔“

جب کہ ثوبان کے بارے میں کہا ہے: ”یہ ذوالنون مصری کا بھائی ہے۔ حدیث میں بہت ہی کمزور ہے۔

ابو قضاۃ منکر الحدیث ہے اس کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔

ابو بکر العطار اور سلیمان بن احمد دونوں مجہول ہیں۔

تیسری بات: جس چیز سے اس روایت کا جھوٹ ظاہر ہوتا ہے وہ راوی کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق کہنا ہے کہ

سورت نجم کے نزول کے وقت جب ستارہ ٹوٹ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر پر گرا تو اس وقت موجود تھے۔ سورت نجم پر لوگوں کا اتفاق ہے کہ مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت بھی نو خیز لڑکے تھے؛ ابھی بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ بخاری و مسلم میں یہ بات ثابت ہے۔

تو اس اعتبار سے ان آیات کے نزول کے وقت یا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اور اگر پیدا ہو بھی گئے تھے تو ابھی نا سمجھ بچے تھے۔ اس لیے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ہجرت کی اس وقت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً زیادہ سے زیادہ پانچ سال ہوگی۔ حق بات یہ ہے کہ اس سورت کے نزول کے وقت ابن عباس پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے کہ سورت نجم قرآن کی انتہائی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔^①

چوتھی بات: مزید براں ستارہ ٹوٹنے کا واقعہ صحیح نہیں۔ مکہ و مدینہ بلکہ کسی جگہ بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے اس وقت بکثرت انگارے آسمان سے پھینکے جانے لگے۔ مگر کوئی ستارہ زمیں پر نہیں اترتا۔ یہ واقعہ ان خارق عادت امور میں سے نہیں جنہیں دنیا جانتی ہو؛ بلکہ ان امور میں سے جن کے بارے میں کسی کو کچھ بھی علم نہیں۔ بایں ہمہ ایسی من گھڑت روایت بیان کرنا بڑے جرأت مند ڈھیٹ اور دینداری کے لحاظ سے انتہائی بے حیاء آدمی کا کام ہے۔ اور ایسے واقعات کو صرف ایسے لوگوں میں ہی پذیرائی حاصل ہو سکتی ہے جو لوگوں میں سب سے جاہل اور احمق ہوں اور علمی لحاظ سے بالکل تہی دامن۔

پانچویں بات: سورت نجم اسلام کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل بچے تھے۔ بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے؛ اور نہ ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا شادی ہوئی تھی؛ اس وقت نماز بھی فرض نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی زکوٰۃ اور حج اور رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اسلام کے عام قواعد مستحکم ہوئے تھے۔

اور اگر ان لوگوں کے دعویٰ کے مطابق امامت کے لیے وصیت کا واقعہ غدیر خم کے موقع پر پیش آیا تو پھر اس سورت کے

① شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام بالکل درست ہے۔ اعلان نبوت کے پانچویں سال بیت اللہ میں تلاوت قرآن کا واقعہ پیش آیا؛ اور آپ نے سورت نجم کی آیات تلاوت کیں؛ قرآن کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے: ﴿فاسجدوا للہ واعبدوا﴾ اب اللہ کے سامنے سجدے کرو اور (اسی کی) عبادت کرو۔“ مسلمانوں کے ساتھ کافر بھی بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے۔ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت میں سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ بیٹھے تھے (خواہ مسلمان تھے یا مشرک) سب نے سجدہ کیا۔ بجز ایک شخص امیہ بن خلف کے، اس نے بھی بھڑکی لی (منہ سے قریب کی) پھر اس پر سجدہ کیا۔ الخ۔ (بخاری، سنن ابی نعیم، اسی موقع سے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں: ﴿افراہم اللات والعزى ومنوۃ الغالیۃ الاخرى﴾ تو شیطان نے آپ کی آواز جیسی آواز میں آگے یہ الفاظ پڑھ دیئے۔ (تلك الغرایق العلی وإن شفاعتہن لیرتجى) ”یہ تینوں بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت متوقع ہے۔“ اور بعض کے نزدیک یہ واقعہ یوں ہوا کہ جب قریشیوں نے بھی مسلمان کے ساتھ مل کر سجدہ کر لیا تو بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم سے یہ کیا حماقت سرزد ہوگئی تب انہوں نے یہ الفاظ اپنی طرف سے گھڑے اور کہہ دیا کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے اور سمجھے کہ اب وہ بھی ہمارے دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کے ساتھ مل کر سجدہ کیا تھا۔ یہ واقعہ جو کچھ بھی تھا، یہ خبر یا افواہ اتنی مشہور ہوئی کہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں نے، جنہوں نے جب انہوں میں ہجرت کی تھی۔ جب ایسی صلیاں سمجھوتے کی خبر سنی تو شوال ۵ھ میں۔ مکہ واپس آ گئے۔ مگر مکہ آ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو سب کچھ ایک افسانہ تھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ ہجرت کر کے حبشہ کی طرف واپس چلے گئے۔ [ردای کشمیری]۔

نزول کے وقت وصیت کرنے کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟

چھٹی بات: مفسرین کرام رحمہم اللہ کا اس کے خلاف پر اتفاق ہے۔ سورت نجم میں جن ستاروں کی قسم اٹھائی گئی ہے وہ یا تو آسمان کے ستارے ہیں یا پھر قرآن کے ستارے۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مکہ میں کسی کے گھر میں ستارہ ٹوٹ کر گر ا تھا۔

ساتویں بات: جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے لیے کہے: ”آپ گمراہ ہو گئے“ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور کفار کو نبی کریم ﷺ شہادتین کے اقرار اور اسلام میں داخل ہونے سے پہلے فروعی احکام کا حکم نہیں دیا کرتے تھے۔ آٹھویں بات: اگر ستارے کا ٹوٹنا آسمان سے گرنے والی [بجلی] آگ تھی؛ تو پھر کسی کے گھر میں بجلی کا گرنا اس کی کرامت نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ ستارہ آسمانی ستاروں میں سے تھا تو یہ ستارے اپنے فلک سے باہر نہیں نکلتے۔ اور اگر یہ کوئی شہابیہ تھا تو شہابیہ شیاطین کو مارنے کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔ شہابیہ زمین پر نازل نہیں ہوتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ واقعی شیطان دوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تک پہنچا تھا اور شہابیہ نے اس کا پیچھا کر کے جلادیا تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پھر بھی کوئی کرامت نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔

امامت علی کی پانچویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”پانچویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾ [الأحزاب ۳۳]

”اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنادے۔“

امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے اپنی مسند میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: ”میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر میں تلاش کیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں آئے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پہنچ گئیں، آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو بائیں جانب اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دائیں طرف اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو اپنے سامنے بٹھایا پھر ان پر اپنی چادر تان لی اور فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾

”اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنادے۔“

① ولد ارکھتا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سورت کے نزول کے وقت بہت کم عمر تھے؛ اور آپ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں پرورش پا رہے تھے۔ آپ کا علیحدہ سے کوئی گھر نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں آپ کے دوسرے بے پاک جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد تھے وہ بھی رہا کرتے تھے؛ اور آپ کا آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی ہوا کرتے تھے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابوطالب کے گھر پر گرا تو پھر ان کے دوسرے بھائی بھی مسلمان تھے؛ جو آپ سے بڑے بھی تھے؛ تو ان میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اور امام ہونے کے لیے کیسے چنا گیا؟ اور اگر یہ ستارہ رسول اللہ ﷺ کے ہی گھر پر گرا تھا تو حضرت زید بن حارثہ؛ حضرت ہالہ اور دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپ کو متعین امام اور وصی مقرر کرنے کے لیے کوئی خاص دلیل ہونی چاہیے؛ وگرنہ یہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے؛ کوئی بھی دوسرا اس کا مستحق ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا کریں رافضی بیچارے عقل و علم سے بالکل کورے ہوتے ہیں؛ ان کو تو ڈھنگ نے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ [دراوی؛ کشمیری]

اور پھر فرمایا: ”اے اللہ! یہ میرے سچے اہل بیت ہیں۔“ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت میرے گھر میں تشریف فرما تھے۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پتھر کی ایک ہانڈی لیکر آئیں جس میں حریرہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کو بلا لاؤ۔“ تو آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلا لائیں۔ یہ سب لوگوں گھر میں داخل ہوئے اور گھر میں بیٹھ کر حریرہ کھانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت ایک خیمری چادر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور میں اپنے حجرہ میں کھڑی نماز پڑھ رہی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾

آپ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو اپنی چادر کے باقی حصہ میں داخل کر لیا: اور پھر اپنے ہاتھ باہر نکال کر آسمان کی طرف بلند کیے اور یہ دعا فرمائی:

”یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کر دے اور انکو بخوبی پاک کر دے۔“ آپ نے کئی بار ایسے فرمایا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اپنا سر اندر داخل کیا: اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں بھی ان کیساتھ ہوں (یعنی چادر میں آنے کا ارادہ کیا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اپنی جگہ رہو تم خیر پر ہو۔

مذکورہ صدر آیت میں ان کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ اور ﴿إِنَّمَا﴾ کے بعد اس کی خبر پر ”لام“ داخل کیا گیا ہے یہ لفظ بتا کہ اس خطاب میں اہل بیت کے اختصاص پر دلالت کرتا ہے۔ اور پھر ﴿يُطَهِّرَ﴾ کے لفظ سے اس مضمون کو دھرایا گیا ہے اور ﴿تَطْهِيرًا﴾ کے لفظ سے اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے بھی تاکید کا مفہوم نکل رہا ہے، اس آیت سے استفادہ ہوا کہ اہل بیت کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔ لہذا امام صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد اقوال میں اس کا دعویٰ کیا ہے، جیسے آپ کا یہ قول:

”ابن ابی قافہ نے یہ لباس اوڑھا (منصب خلافت پر فائز ہوئے) حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک بچہ میں درمیانی سخ کو حاصل ہوتا ہے۔“ علاوہ ازیں آپ سے نجاست کی نفی بھی کر دی گئی ہے، لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ صادق ہوں گے۔“ اہنی کلام الرافضی

[آیت تطہیر سے شیعہ کا استدلال]:

ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے، یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سب پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا کی:

”یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کر دے اور انکو بخوبی پاک کر دے۔“

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت اس حال میں نکلے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوپر ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھے کہ جس کے کناروں پر ہانڈیوں کے نقش سیاہ بالوں سے بنے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ آگئے تو آپ نے ان کو اپنی اس چادر کے اندر کر لیا پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر کے اندر کر لیا پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر میں کر لیا پھر

حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر میں کر لیا پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾

”اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔“^①

سنن میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت زیادہ مشہور ہے۔^② مگر اس میں عصمت و امامت کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا مضمون دو جگہ پر پایا جاتا ہے:

پہلا مقام: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا﴾

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ﴾

”اللہ تعالیٰ تمہیں کسی حرج میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔“

مندرجہ ذیل آیات بھی اسی قبیل سے ہیں:

۱..... ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

”اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ کوئی تنگی نہیں کرنا چاہتا۔“

۲..... ﴿يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنْنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

حَكِيمٌ﴾ (النساء: ۲۶)

”اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر

چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

۳..... ﴿وَاللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا﴾

”اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور

ہٹ جاؤ۔“ (النساء: ۲۷)

ان آیات میں ارادہ سے مراد محبت و رضا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے ایسا مشروع کیا ہے اور انہیں

ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کچھ پیدا کر دیا ہے اور یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نے

یہ بات مقدر کر دی ہے یا اسے ایجاد کر دیا ہے۔ اور نہ ہی یہ مقصد ہے کہ ہر حال میں ایسا ہو کر ہی رہے گا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ یہ میرے گھر والے ہیں تو ان

سے نجاست کو دور کر دے۔“

① صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل اہل بیت النبی ﷺ (حدیث: ۲۴۲۴)

② سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب ما جاء فی فضل فاطمة رضی اللہ عنہا (حدیث: ۳۸۷۱)۔

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ التجا کی ہے کہ ان سے نجاست کو دور کر دے اور انہیں ہر طرح سے پاک کر دے۔ اگر آیت کا مطلب ہوتا کہ اہل بیت کو پاک کیا جا چکا ہے تو دعا کی حاجت نہ تھی۔
[ارادہ الہی کی اقسام]:

فرق قدریہ (منکرین تقدیر) کے قول کے مطابق یہ بات اور بھی واضح ہے۔ اس لیے کہ قدریہ کے نزدیک اللہ کے ارادہ کے لیے وجود مراد ضروری نہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ ارادہ کرتا ہے اور وہ چیز وقوع میں نہیں آتی اور بعض دفعہ وہ چیز ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔

یہ رافضی اور اس کے امثال قدریہ وہ اس آیت: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ﴾ سے کیسے اپنی مراد کے واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں؟ کیا شیعہ اپنا قانون فاسد بھی بھول گئے؟
ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا تھا کہ تمام اہل زمین ایمان لے آئیں، مگر اللہ کا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔
تقدیر کا اثبات کرنے والے [اہل سنت] کی رائے میں کتاب اللہ میں ارادہ کی دو قسمیں ہیں:
۱۔ ارادہ شرعیہ دینیہ: جو اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا کو متضمن ہے جیسا کہ مذکورہ صدر آیات ہیں:
۲۔ ارادہ کوئیہ قدریہ: یہ اللہ تعالیٰ کی خلق و تقدیر کو شامل ہے۔
ارادہ کی پہلی اقسام کی مثالیں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِإِسْلَامٍ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

”سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے جس کو گمراہ رکھنا چاہے اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے کوئی آسمان پر چڑھتا ہے۔“
اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ﴾ (ہود: ۳۳)

”تمہیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، گو میں کتنی ہی تمہاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں، بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو۔“

بہت سارے مشتبہ اور قدریہ ارادہ کی صرف ایک ہی قسم شمار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارادہ اور محبت کو بھی ایک ہی چیز کہتے ہیں۔ پھر قدریہ آیات تقدیر میں واضح ارادہ [بمعنی تقدیر] کی نفی کرتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ ایک ارادہ بمعنی تشریع کی نفی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ چیز جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہو کہ یہ مراد ہے تو اس مراد کا پورا ہونا ہر حال میں ضروری ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ مؤمنین کی توبہ قبول کرنا اور انہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن لوگوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو توبہ کرتے ہیں [تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتے ہیں] اور کچھ لوگ توبہ نہیں کرتے۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے

ہیں جو پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور کچھ پاک نہیں ہوتے۔

جب آیت دلالت کرتی ہے کہ ان [اہل بیت] کو پاک کرنے کا اور ان سے نجاست دور کرنے کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا وقوع ہوا ہے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا [انہیں فی الفور پاک کر بھی دیا گیا ہو] جیسا کہ مصنف کا دعویٰ ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس سے ہوتی کہ زیر نظر آیت کے آغاز میں ازواج النبی ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ کلام ان ہی کی طہارت کے واجب ہونے کے بارے میں ہے اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کے لیے اس فعل پر ثواب کا وعدہ ہے؛ اور اس کے ترک پر سزا کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُنِيسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنْ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ يُضَعَّفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ مِنْكُنْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَلَ صَالِحًا تُوِّفَّهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا ۚ يُنِيسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَقرْنٍ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۚ﴾ [الأحزاب ۳۰، ۳۳]

”اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت ہی اہل (سی بات) ہے۔ اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو؛ اگر تم پر ہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے اور ہاں قاعدہ کے مطابق کلام کرو۔ اور اپنے گھروں میں قرآن سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو اللہ چاہتا ہے: نبی کی گھر والیو! کہ وہ تم سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔“

یہ پورا خطاب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے ہے۔ اس میں امر و نہی وعد و وعید سب چیزیں موجود ہیں۔ لیکن جب اس خطاب کے فائدہ [اور عموم حکم] کی بات ہے تو یہ اہل بیت اور غیر اہل بیت تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے یہ خطاب ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔ بنا بریں یہ خطاب ازواج سے ہے۔ نجاست دور کرنے کا ارادہ اور تطہیر اہل بیت صرف ازواج ہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ سب اہل بیت اس میں شامل ہیں۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم باقی اہل بیت کی نسبت انھیں ہیں یہی وجہ ہے کہ دعا میں خصوصیت سے ان کا ذکر کیا۔

یہ خطاب اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے: ﴿لَسْجُدْ أَسْبَسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ﴾ [التوبہ ۱۰۸]

”یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی۔“

یہ آیت مسجد قباء کے بارے میں نازل ہوئی؛ مگر اس کا حکم مسجد قباء کے لیے بھی اور اس مسجد کے لیے بھی جو اس سے زیادہ

اس حکم کی حق دار ہے یعنی مسجد نبوی شریف۔ یہ توجیہ خود نبی کریم ﷺ سے بھی حدیث مبارک میں ثابت ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ: ”وہ مسجد کون سی ہے جو تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ”میری یہ مسجد“ [ترمذی ۴/۳۴۴]۔

اور احادیث مبارکہ میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کو پیدل یا سوار ہو کر مسجد قباء آیا کرتے تھے۔ جمعہ اپنی مسجد میں پڑھایا کرتے تھے [اور وہاں قیام کرتے]۔ اور ہفتہ کو مسجد قباء میں تشریف لاتے۔ ان دونوں مساجد بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔ ایسے ہی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات؛ حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم یہ تمام لوگ اہل بیت میں سے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم ازواج کی نسبت زیادہ خاص ہیں، یہی وجہ ہے کہ دعا میں بطور خاص ان کا ذکر کیا ہے۔

علماء کرام رحمہ اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ آل محمد ﷺ سے کون لوگ مراد ہیں؟

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت ہے؛ یہ امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسرا قول: اس سے مراد امت محمد ﷺ کے متقی لوگ مراد ہیں۔ اس کی تائید میں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

”ہر متقی مؤمن آل محمد ہے۔“ [رواہ الخلال وتمام فی ”الفوائد“]

امام احمد کے اصحاب میں سے ایک گروہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ یہ حدیث موضوع ہے۔ اس روایت کو صوفیاء کی ایک جماعت نے اپنے نظریات و عقیدہ کی بنیاد بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: آل محمد ﷺ سے مراد خاص اولیاء ہیں۔ حکیم ترمذی نے ایسے ہی ذکر کیا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ آل محمد سے مراد آپ ﷺ کے اہل بیت ہیں۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے اور سید ابوجعفر رحمہ اللہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ لیکن کیا رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات آپ کے اہل بیت میں سے ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں؛ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں۔

پہلا قول: ازواج مطہرات اہل بیت میں سے نہیں ہیں۔ زید بن ارقم سے ایسے ہی روایت کیا گیا ہے۔

دوسرا قول: ازواج مطہرات رحمہم اللہ اہل بیت میں سے ہیں۔ یہی صحیح قول ہے۔ اس لیے کہ احادیث صحیحہ سے ثابت

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو یہ دعا سکھائی:

www.KitaboSunnat

”اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّاتِهِ۔“

”اے اللہ! رحمتیں نازل فرما محمد ﷺ پر اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔“

اور اس لیے بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا شمار آپ کے اہل بیت میں سے کیا گیا ہے؛ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا شمار آپ کی آل اور اہل بیت میں سے کیا گیا ہے۔ اس پر قرآن کی واضح دلالت موجود ہے۔ تو پھر نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رحمہم اللہ کا شمار آپ کی آل اور اہل بیت میں کیوں نہیں ہو سکتا۔

یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے کہ ازواج مطہرات رحمہم اللہ کا شمار آپ کے اہل بیت میں سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ سارا کلام بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کی امت کے متقی بھی آپ کے اولیاء [دوست] ہیں۔ جیسا کہ صحیح

حدیث میں ثابت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”بیشک بنی فلاں میرے دوست نہیں ہیں؛ بیشک میرا دوست اللہ تعالیٰ ہے اور نیکو کار اہل ایمان ہیں۔“ [مسلم ۱/۱۹۷]

اس حدیث میں آپ نے بیان کر دیا ہے کہ آپ کے اولیاء اور دوست صالح و نیکو کار اہل ایمان ہیں۔ ایسے ہی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: آپ ﷺ نے فرمایا:

”بیشک میرے دوست متقی لوگ ہیں وہ جہاں بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں۔“ [المسند ۵/۲۳۵]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ تَطَهَّرْتَ عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [التحریم ۴]

”اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کر دو گی پس یقیناً اس کا کار ساز اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک ایماندار۔“

صالح ستہ میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مجھے یہ بات پسند تھی کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں تم میرے اصحاب ہو میرے بھائی وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔“ ❶

آیت تطہیر اور شیعی دعویٰ کی حقیقت:

اگر شیعہ کہیں کہ فرض کیجیے قرآن کریم سے اہل بیت کی طہارت اور پاکیزگی ثابت نہیں ہوتی، مگر نبی کریم ﷺ کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع ان سے نجاست کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ صرف قرآن کریم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اہل بیت سے نجاست کو دور کر دیا گیا ہے۔ باقی رہی عصمت و امامت تو قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں پایا جاتا۔ جب کہ حدیث سے استدلال کا ایک علیحدہ مقام ہے۔

پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں: بالفرض اگر قرآن سے ان کی طہارت اور ان سے نجاست کا دور ہونا ثابت ہو بھی جائے؛ جیسے آپ ﷺ کی دعا مستجاب ہوتی ہے؛ ایسا ہونا ہر حال میں لازمی ہے۔ تو اس میں خطا سے عصمت کہاں سے لازم آئے گی؟

❶ صحیح مسلم میں ہے: رسول اللہ ﷺ قبرستان تشریف لائے اور فرمایا سلامتی ہو تم پر مومنوں کے گھر، ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں میں پسند کرتا ہوں کہ ہم اپنے دینی بھائیوں کو دیکھیں، صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم آپ ﷺ کے بھائی نہیں ہیں آپ نے فرمایا: تم میرے صحابہ ہو اور ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آپ ﷺ اپنی امت کے ان لوگوں کو اسے اللہ کے رسول! کیسے پہچانیں گے جو ابھی تک نہیں آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بھلا تم دیکھو اگر کسی شخص کی سفید پیشانی والے سفید پاؤں والے گھوڑے سیاہ گھوڑوں میں مل جائیں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو ان میں سے پہچان نہ لے گا صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ جب آئیں گے تو وضو کے اثر کی وجہ سے ان کے چہرے ہاتھ اور پاؤں چمکدار اور روشن ہوں گے اور میں ان سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا اور سنو بعض لوگ میرے حوض سے اس طرح دور کئے جائیں گے جس طرح بھٹکا ہوا ادھن دور کر دیا جاتا ہے میں ان کو پکاروں گا ادھر آؤ تو حکم ہوگا کہ انہوں نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد دین کو بدل دیا تھا تب میں کہوں گا دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔ صحیح مسلم ج: ۵۸۴۔ یہ صحاح ستہ کی روایت ہے۔ [الدرادی]

نیز اس کی دلیل کیا ہوگی کہ اہل بیت اور ازواج مطہرات میں سے کسی ایک سے سہو و خطا کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ازواج مطہرات کو جو احکام اس آیت میں دیے گئے ہیں۔ ان سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوگی۔ بلکہ ان سے خطا ہو سکتی ہے؛ لیکن اس کی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی معاف کر دیا ہے۔

آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے خبث و فواحش کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کو فواحش و منکرات اور دیگر گناہوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔

گناہوں سے پاکیزگی و طرح سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَتُيَاكَبُكَ فَطَهِّرْ﴾ [المذثر ۴] ”اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَخْطِبُونَ﴾ [الأعراف ۸۲] ”بیشک یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔“

اور ازواج مطہرات ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُنْسَاءُ النَّبِيُّ مَنْ يَأْتِي مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ يُضَعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ [الأحزاب ۳۰]

”اے نبی کی بیویوں! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔“

یا تو انسان کسی گناہ کے کام کا ارتکاب ہی نہ کرے۔ یا پھر گناہ کے بعد اس سے توبہ کر لے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ [التوبة ۱۰۳]

”آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجئے، جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں۔“

لیکن جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کرتے ہوئے ابتداء میں حکم دیا ہے؛ وہ فاحش اور بے حیائی کے امور سے نبی و ممانعت کو شامل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فی الحال ایسے واقع ہو چکا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان امور سے منع کر رہے ہیں؛ اور جن سے کوئی حرکت سرزد ہوگئی ہے؛ انہیں توبہ کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ط اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يَنْقَى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ ط اللَّهُمَّ اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالتَّلْجِ وَالْبَرَدِ)) (متفق علیہ)

”اے اللہ! دوری کر دے درمیان میرے اور گناہوں کے جیسے دوری پیدا فرمائی تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان۔“

اے اللہ! مجھے صاف کر دے میرے گناہوں سے جس طرح صاف کیا جاتا ہے سفید کپڑے کو میل کچیل سے۔ اے اللہ!

مجھے دھو دے میرے گناہوں سے برف اور پانی اور اولوں سے۔“

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ اک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابھی آپ کی برأت کا علم نہیں ہوا تھا؛ اور

اس معاملہ میں سخت بے چینی کا شکار تھے؛ تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

”اے عائشہ مجھے تیرے بارے میں ایسی ایسی خبر پہنچی ہے پس اگر تو پاک دامن ہے تو عنقریب اللہ تیری پاکدامنی واضح کر دیگا اور اگر تم گناہ میں ملوث ہو چکی ہو تو اللہ سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو پس بے شک بندہ جب گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ بھی اس پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہے۔“ [مسلم: 2521]

خلاصہ کلام! لفظ ”رجس“ اصل میں ناپاکی کے لیے بولا جاتا ہے اور اس سے مراد شرک ہوتا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ [الحج ۳۰]

”پس تمہیں بتوں کی گندگی سے بچتے رہنا چاہیے۔“

اور اس سے کھانے پینے کی وہ گندی چیزیں بھی مراد لی جاتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ فرمان الہی ہے:

﴿قُلْ لَا آجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مِمَّنْ أَوْدَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ﴾ [الأنعام ۱۴۵]

”آپ فرمادیتے جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ [المائدہ ۹۰]

”اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں۔“

اس قسم کی ناپاکی کو ختم کرنے سے مراد [اپنے جس کی] تمام ناپاکی کو ختم کرنا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان اکابر اہل بیت کو اللہ تعالیٰ شرک و خباثت کو دور کر کے ان کو فواہش و منکرات اور دیگر گناہوں سے پاک کر دیتا تھا۔

”رجس“ کا لفظ عام ہے؛ جو تمام قسم کی ناپاکی کو شامل ہے؛ اور اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ہر قسم کی ناپاکی دور کر دی ہو؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ایسی ہی دعا فرمائی تھی۔

جب کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ”وتطهروهم تطهيرا“ اور انہیں ہر طرح سے پاک و صاف کر دے۔ یہ مطلق طور پر سوال ہے [ہر اس چیز کو شامل جس کے لیے] طہارت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ مطلق ہے؛ طہارت کا کوئی ایک عنصر بھی پایا جانے سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے قیاس و عبرت کے لیے بولا جاتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾ [الحشر ۲]

”پس اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔“

حاصل کلام! طہارت کا اعتبار اس کے اطلاق کے لحاظ سے ہوگا۔ جیسا کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ: ”اکرم هذا“ اس کا اکرام کرو۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرو جسے عرف میں اکرام کہا جاتا ہے۔

ایسے ہی ”طاہر“ کا لفظ بھی ”طیب“ کی طرح ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ [النور ۲۶]

”اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿الْغَبِيثَاتُ لِلْغَبِيثِينَ وَالْغَبِيثُونَ لِلْغَبِيثَاتِ﴾ [النور ۲۶]

”خبیث عورتیں خبیث مرد کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں۔“

ایسے روایت کیا گیا ہے کہ [حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی] نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”ان کو اجازت دو؛ خوش آمدید پاکیزہ فطرت شخص کے لئے۔“ [سنن ابن ماجہ: ج ۱: ح ۱۴۶]

یہ لفظ بھی ”المتقی“ اور لفظ ”الْمُزَكَّى“ کی طرح ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [الشمس ۱۰-۹]

”جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوگا۔“

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (التوبة: ۱۰۳)

”ان کے مالوں سے صدقہ لے کر اس سے ان کو پاک کیجیے اور ان کا تزکیہ فرمائیے۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ [الأعلى ۱۴]

”وہ انسان کامیاب ہو گیا جس نے تزکیہ نفس کیا۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ﴾

”اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی پاک صاف نہ ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے پاک کرنا

چاہے، کر دیتا ہے۔“

مگر متقی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے صغیرہ گناہ بھی صادر نہ ہو۔ اور نہیں اس کے لیے خطا اور گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے۔ اگر متقی کے لیے یہ بات شرط ہوتی تو پوری امت میں ایک بھی متقی نہ ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے جو بھی گناہوں سے توبہ کر لے اس کا شمار متقین میں سے ہوگا؛ اور ایسے ہی جو شخص بھی نیک اعمال سے اپنے گناہوں کو زائل کرے وہ متقی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنْ تَحْتَسِبُوا كَبَإُتْرَ مَا تُتْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلَا كَرِيمًا﴾ [النساء ۳۱]

”اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور

عزت و بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔“

نبی کریم ﷺ کی ان حضرات کو پاک کرنے کے لیے دعا ایسے ہی جیسے آپ دعا فرمیں کہ: ان کا تزکیہ ہو جائے؛

اور انہیں پاک کر دیا جائے؛ اور انہیں نیک و متقی بنادیا جائے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ جس بارے میں پاک و صاف ہونا ثابت ہو جائے وہ اس حکم میں شامل ہے۔ [اہل بیت کے لیے کی گئی] یہ دعاء رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات کے لیے کی گئی دعاء سے بڑھ کر نہیں ہے؛ آپ نے یوں دعاء فرمائی تھی:

”اے اللہ! مجھے صاف کر دے میرے گناہوں سے جس طرح صاف کیا جاتا ہے سفید کپڑے کو میل پچیل سے۔ اے اللہ! مجھے دھو دے میرے گناہوں سے برف اور ٹھنڈے پانی اور اولوں سے۔“

پس جس کسی سے اگر گناہ سرزد ہو جائے یا تو وہ مغفرت کے لائق ہوتا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اس کا کفارہ بنا کر اسے بالکل پاک کر دیتے ہیں۔ لیکن جو کوئی اپنی گناہوں میں لت پت مر گیا وہ اپنی اس زندگی میں ان گناہوں سے پاک نہیں ہو سکا۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ انہیں صدقات کی وجہ سے گناہوں سے بالکل پاک کر دیتے ہیں۔ صدقہ لوگوں کی میل پچیل ہوتی ہے۔ پس جب نبی کریم ﷺ کوئی دعاء فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے موقع محل اور استعداد و اہلیت کے مطابق اسے قبولیت سے نوازتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اہل ایمان و خواتین و حضرات کے استغفار کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل ایمان میں کوئی گتہ کار رہی نہیں پایا جائے۔ اگر حقیقت حال میں واقعی ایسا ہوتا تو کسی اہل ایمان کو دنیا یا آخرت میں کوئی عذاب نہ دیا جاتا۔ بلکہ بعض افراد کی توبہ و استغفار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کر دیتے ہیں؛ اور بعض لوگوں کی نیکیاں ان کے گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔ اور کسی کے بہت سارے گناہ اللہ تعالیٰ دیگر کسی وجہ سے معاف کر دیتے ہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ آیت میں جس تطہیر کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے جو دعاء فرمائی تھی اس سے بالاتفاق اہل بیت کا معصوم ہونا مراد نہیں۔ جہاں تک اہل سنت کے نقطہ نظر کا تعلق ہے، وہ رسول ﷺ کے لیے عصمت کا اثبات کرتے ہیں۔ شیعہ نبی کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ کو بھی معصوم قرار دیتے ہیں۔ پس شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے کہ عصمت نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے [اور شیعہ کے نزدیک] امام بھی معصوم ہوتا ہے۔ بنا بریں نبی کریم ﷺ کی ازواج و بنات اور دیگر عورتیں عصمت کے حکم میں داخل نہ ہوں گی۔

جب یہ بات ہے تو جن چار اکابر کے حق میں تطہیر کی دعا کی گئی ہے وہ اس عصمت کو شامل نہ ہوگی جو نبی اور [شیعہ کے ہاں] امام کیساتھ مخصوص ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کی دعاء ان کے لیے یہ عصمت حاصل نہ ہوگی؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔ اس لیے کہ آپ نے چاروں کے لیے مشترکہ دعا کی ہیں ان میں سے کسی ایک کو خاص نہیں کیا۔

علاوہ ازیں گناہوں سے معصوم ہونے اور تطہیر کی دعا قدریہ کے قاعدہ کے مطابق ممتنع ہے (شیعہ بھی قدریہ یعنی مکرین تقدیر میں داخل ہیں) اس لیے کہ افعال اختیار یعنی واجبات کا بجالانا اور منکرات کا ترک کرنا قدریہ کے نزدیک اللہ کی قدرت میں داخل نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو پاکیزہ و اطاعت گزار بنا سکتا ہے نہ ہی نافرمان۔ نہ ہی گناہوں سے پاک بنا سکتا ہے اور نہ ہی ناپاک۔ لہذا اس اصل کی بنا پر فعل خیرات اور ترک منکرات کی دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ قدریہ کے نزدیک اللہ کی عطا کردہ قدرت نیک و بد دونوں قسم کے افعال کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس طرح تلوار سے

مسلمان کو بھی قتل کر سکتے ہیں اور کافر کو بھی۔ یا مال کو اطاعت میں بھی خرچ کر سکتے ہیں اور معصیت کے کاموں میں بھی۔ اسی طرح بندہ اللہ کی عطا کردہ قدرت سے اچھے کام بھی انجام دیتا ہے اور برے بھی۔

شیعہ کی پیش کردہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے جس سے ان کے بنیادی اصولوں پر وار ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس حدیث میں آپ نے اہل بیت کے لیے تطہیر کی دعا فرمائی ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل بیت کی مغفرت فرمائے گا اور وہ بروز آخرت ماخوذ نہیں ہوں گے۔ تو اس سے عصمت کے اثبات پر استدلال کرنا بالکل ہی غلط ہوگا۔ تو واضح ہوا کہ اس حدیث میں عصمت کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اور مطلق طور پر عصمت یعنی فضل مامور کا بجالانا اور حرام کا ترک کرنا شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو پاکیزہ و اطاعت گزار بنا سکتا ہے نہ ہی نافرمان؛ نہ ہی نبی کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔

شیعہ کے ہاں جو کوئی اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کو اختیار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت سے اس سے اختیار نہیں کرتا۔ [شیعہ کے نزدیک گناہوں سے معصوم رہنے کی دعاء بھی ممنوع ہے]۔

اس سے شیعہ مذہب کا عصمت کے مسئلہ میں تناقض واضح ہوتا ہے۔ بضر محال اگر عصمت ثابت بھی ہو جائے تاہم ہمارے نزدیک یہ امامت کے لیے مشروط نہیں ہے؛ اور نہ ہی ائمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے عصمت کی نفی پر کوئی اجماع ہے۔ پس اس صورت میں ہر لحاظ سے ان کی حجت باطل ہو جاتی ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دعویٰ امامت؟]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت کے مدعی تھے اور نجاست کا ازالہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ لہذا آپ ہی امام صادق ہوں گے۔“
[جواب]: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی اس قسم کا دعویٰ کیا ہو۔ بلکہ ہم علم یقینی اور قطعی کے طور پر جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ تک نے اپنی امامت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ کہا گیا ہے کہ: بیشک آپ دل سے امامت کے خواہاں تھے، مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں امام یا معصوم ہوں۔ نہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد مجھے امام بنایا اور میری اطاعت لوگوں پر واجب ٹھہرائی ہے۔ اور نہ اس قسم کے دیگر الفاظ ارشاد فرمائے۔

بخلاف ازیں ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جس شخص نے آپ کی نسبت سے اس قسم کے الفاظ نقل کیے ہیں وہ کاذب ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحیح معنی میں متقی تھے اور ایسے صریح کذب کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جس کا کذب ہونا سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر عیاں ہو۔

شیعہ مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ”ابن ابی قنفہ نے یہ لباس اوڑھا (منصب خلافت پر فائز ہوئے) حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک بچہ کی میں درمیانی سیخ کو حاصل ہوتا ہے۔“

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں:

پہلی بات: اس قول کی سند کہاں ہے؟ جس میں ثقہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اس قول کو ثقات سے نقل کیا ہو۔

ایسا ہرگز اس روایت میں کچھ بھی نہیں پایا جاتا۔

[یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نہیں ہے]۔ البتہ یہ قول نبی البلاغہ اور اس جیسی بعض دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ نبی البلاغہ کے اکثر خطبات خود ساختہ اور جھوٹے گھڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قھوپ دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی قدیم کتاب میں درج نہیں۔^① اور نہ ان کی کوئی سند معروف ہے۔ تو پھر ناقل نے کہاں سے نقل کیا ہے؟ یہ خطبات اسی طرح ہیں جیسے کوئی شخص کہے کہ میں علوی یا عباسی ہوں۔ حالانکہ ہمیں علم ہو کہ اس کے اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس کے لیے ایسا کوئی دعویٰ [اس سے پہلے کیا گیا تھا]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ نسب اپنی اصل کے اعتبار سے جانا پہچانا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی فرع سے مل جاتا ہے۔

ایسے ہی منقولات کے لیے ضروری ہے کہ صاحب قول سے لیکر ہم تک اس کی معروف سند ہونی چاہیے۔ اگر کوئی انسان کتاب لکھے؛ جس میں نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے بہت سارے خطبات جمع کر دے۔ لیکن اس سے پہلے کسی بھی دوسرے فرد نے یہ خطبات کسی معروف سند سے نقل نہ کیے ہوں؛ تو ہم یقینی طور پر اس کے جھوٹا ہونے کو جان لیتے ہیں۔ یہی حال نبی البلاغہ کے خطبات کا ہے۔ ہمیں یقینی طور پر علم حاصل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے برعکس فرمایا تھا۔ اس موقع پر ہمارا مقصد اس کا جھوٹ واضح کرنا نہیں؛ بلکہ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی صحیح سند پیش کی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر کسی ایسی چیز کی تصدیق کو واجب نہیں کیا جس کے سچا ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

نبی البلاغہ کے خطبات میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو کہ بالاتفاق ممتنع ہیں۔ اور خصوصاً جبکہ ”تکلیف مالا یطاق“ کا قول بھی ممتنع ہو۔ بیشک یہ سب سے بڑی ”تکلیف مالا یطاق“ ہے۔ پھر ہم چوتھی صدی ہجری میں جب ہر طرف جھوٹے لوگ بڑھ گئے تھے؛ اس وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعوائے خلافت کو ان لوگوں کے اقوال کی بنا پر کیوں کر تسلیم کر سکتے ہیں جو مہتمم بالکذب تھے؟ [چوتھی صدی ہجری میں] ان شیعہ لوگوں کی حکومت عمل میں آچکی تھی؛ جہاں پر یہ لوگ جس قسم کا بھی جھوٹ بولتے اسے پذیرائی حاصل ہوتی۔ ان کے ہاں اقوال کی سچائی کا مطالبہ کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس مسئلہ میں ہمارا یہ بنیادی جواب ہے۔ یہ ہمارے اور اللہ کے مابین ہے۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں: فرض کیجیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہا تھا؛ تو تم نے یوں کیوں کہا کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امام مصوص و معصوم ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ آپ یہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ دوسروں کی نسبت خلافت کے لیے موزوں تر ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا اعتقاد تھا کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں؛ اور خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ لہذا اس کا یہ مطلب نہ ہوگا

① اس کی حد یہ ہے کہ کتب ادب جن میں سند مذکور نہیں ہوتی ان میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں ہیں۔ مثلاً جاحظ کی ”اللبیان والتبیین“ میں سیدنا علی کا یہ خطبہ صرف چند سطروں تک محدود ہے۔ اگر اس خطبہ کا مقابل نبی البلاغہ میں ذکر کردہ خطبہ کے ساتھ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ نبی البلاغہ میں اس خطبہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور وہ اضافہ کیا گیا ہے جو جاحظ کے زمانہ تک موجود نہ تھا۔ مشہور شیعہ عالم رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی مرتضیٰ نے نبی البلاغہ میں جس جملہ سازی سے کام لیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ثابت شدہ چیز پر بے بنیاد باتوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ”لقد تقمصا“ کا جملہ بھی اسی میں شامل ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نبی البلاغہ میں ذکر کردہ اقوال سیدنا علی کے معروف ارشادات کی نقیض ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سند ہوتی ہے نہ دلیل۔ روانفی کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ اس طرح انھوں نے سیدنا علی کے اقوال میں تناقض ثابت کر دیا جس سے ان کا دامن پاک تھا۔

کہ آپ نے دانستہ جھوٹ کا ارتکاب کیا، بلکہ یہ بات آپ نے اپنے اجتہاد کی بنا پر کہی ہوگی۔ اور مجتہد کے رائے بنی برصواب بھی ہو سکتی ہے اور خطا بھی ہو سکتی ہے۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ ناپاکی کی نفی کرنے سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ کوئی معصوم عن الخطا بھی ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ نہیں تھی کہ وہ اہل بیت سے خطا کو بھی ختم کر دے۔ کیونکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ جب کہ خطا قابل مغفرت ہوتی ہے؛ اور اس کا وجود کوئی نقصان نہیں دیتا۔ مزید برآں کہ خطا میں عموم رخص (ناپاکی) شامل نہیں۔

نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خطا سے معصوم ہو۔ شیعہ اپنے ائمہ کو بھی خطا سے معصوم مانتے ہیں۔ جب کہ ناپاکی کے دور کیے جانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے اہل بیت بھی شریک ہیں۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے وہ اس بات سے بری ہیں کہ کوئی جھوٹ بولیں۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اللہ کے متقی والے تھے اور اس بات سے بری تھے کہ جان بوجھ کر کوئی جھوٹ بولیں۔

لیکن اس آیت سے استدلال کرنے والے رافضی سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جھوٹ کے پلید ہونے پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ جب اس پر کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر اس سے کسی جھوٹ کو ختم کرنا لازم نہیں آتا۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ناپاکی کو ختم کر دیا گیا ہے؛ تو یہ کہنے والا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا جو قرآن سے دلیل پیش کرتے ہیں؛ قرآن میں اس ناپاکی کے دور ہو جانے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ جھوٹ اور خطا بھی ناپاکی میں شمار ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی کچھ ایسا فرمایا ہو۔ بہر کیف اگر ان میں سے کوئی بات ثابت ہو بھی جائے تو وہ قرآن سے ماخوذ نہ ہوگی؛ اس کی بنیاد ایسے مقدمات پر ہوگی جو قرآن سے نہیں ہوں گے۔ پھر شیعہ مصنف کے قرآنی دلائل کہاں ہیں جن کا وہ ڈھنڈورا پیٹتا ہے؟ ایسے جھوٹے دعوے تو صرف وہی انسان کر سکتا ہے جو اہل رسوائی و ندامت میں سے ہو۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: ”امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿فَإِذَا بَيِّتَ اللَّهُ أَنْ تَرْفَعَ وَبَيَّنَّ كَرَفِئَهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾ ☆ اِلٰی قَوْلِهِ تَعَالٰی: ﴿يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾ (النور: ۳۶-۳۷)

”ان گھروں میں جن کے بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛ وہاں صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔..... اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔“

غالبی نے حضرت انس دبریدہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا اے اللہ کے رسول! ﴿فَإِذَا بَيِّتَ﴾ سے کون سے گھر مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”انبیاء کے گھر“ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ گھر یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی ان میں شامل ہے؟ آپ نے فرمایا: ”یہ ان میں سے افضل ترین گھروں میں سے ہے۔ اس میں وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو افضلیت پر دلالت کرتے ہیں؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں ورنہ فاضل پر مفضول کی تقدیم لازم آئے گی۔“ شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا۔

جواب: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں: اس دعویٰ کی صحت پر اس کی دلیل کیا ہے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ ہرگز اس کی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ کسی روایت کو ثعلبی کی طرف منسوب کر دینا حجت نہیں ہو سکتا۔ اس پر شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ جمہور میں سے کوئی ایک اگر کسی روایت کو نقل کر لیتا ہے تو یہ نقل جمہور کے ہاں حجت نہیں بن جاتی۔ بلکہ جمہور کا تو یہ اتفاق ہے کہ ثعلبی اور اس کے امثال کی روایات حجت نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل میں اور نہ ہی شرعی احکام میں۔ اس کی صرف یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کسی ثابت شدہ سند سے اس روایت کی صحت ثابت ہو جائے۔

پس کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہم آپ کے خلاف ایسی روایت سے دلیل پیش کرتے ہیں جو جمہور میں سے کسی ایک نے نقل کی ہے۔ یہ قول تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے: میں تم پر تمہارے خلاف جمہور کی گواہی کی روشنی میں فیصلہ دیتا ہوں۔ تو کیا علماء جمہور نے یہ کہا ہے کہ: ان میں سے جو کوئی بھی؛ جیسی بھی گواہی دے گا وہ عدل و انصاف پر مبنی ہوگی۔ یا کسی ایک نے یہ کہا ہے کہ: جمہور میں سے جو کوئی بھی؛ کوئی بھی روایت نقل کرے گا وہ ہر حال میں صحیح ہی ہوگی۔

پھر جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ ثعلبی اور اس کے امثال صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایات نقل کرتے ہیں۔ اور جمہور کا یہ بھی اتفاق ہے کہ: صرف ثعلبی کے نقل کرنے کی وجہ سے اتباع واجب نہیں ہو جاتی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ثعلبی تو ”حاطب لیل“ ہے؛ جو بھی روایت پاتا ہے اسے نقل کر لیتا ہے؛ خواہ وہ روایت صحیح ہو یا ضعیف۔ ثعلبی کی تفسیر میں اگرچہ اکثر احادیث صحیح ہیں لیکن باتفاق اہل علم اس میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جو کہ جھوٹ اور موضوع ہیں۔

دوسری وجہ: محدثین کرام رحمہم اللہ کے ہاں یہ حدیث بلاشبہ جھوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی معتد کتاب میں اس روایت کو جگہ نہیں دی۔ یہ روایت نہ ہی صحاح ستہ میں ہے؛ نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مسانید میں۔ حالانکہ ان میں سے بعض کتابوں میں ضعیف احادیث پائی جاتی ہیں۔ بلکہ بعض موضوع روایات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لیکن موضوع روایات بہت ہی کم ہیں؛ جب کہ مذکورہ بالا روایت ایسا واضح جھوٹ تھا کہ کسی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

تیسری وجہ: مزید برآں یہ آیت بالاتفاق مساجد سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے صاف ظاہر ہے:

﴿فِي بُيُوتِ الَّذِينَ اللَّهُ أَنْ تَرْفَعَ وَتُذَكَّرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْعُدْوِ وَالْآصَالِ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کے گھر کی یہ صفات نہیں ہو سکتیں۔

چوتھی وجہ: ہم شیعہ سے کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا گھر باتفاق مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر سے افضل تھا؛ مگر وہ اس خطاب میں شامل نہیں۔ اس لیے کہ آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے گھر میں خود آپ ﷺ اور آپ کی کوئی زوجہ

محترمہ موجود ہوا کرتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے گھر کا ذکر ناچا تو صاف الفاظ میں کیا؛ ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ﴾ [الأحزاب ۵۳]

”تم نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو۔“

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَإِذَا كُنْ مَائِتَلٰی فِیْ بُیُوتِکُمْ﴾ [الأحزاب ۴۳]

”اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور رسول کی جو احادیث پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو۔“

پانچویں وجہ: یہ کہنا کہ ”اس سے مراد انبیاء کے گھر ہیں“ صاف جھوٹ ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو اہل ایمان کا اس میں کوئی نصیب نہ ہوتا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَسْتَبِیحْ لَہٗ فِیْہَا بِالْعُدُوِّ وَالْاَصَالِ ۝ رَجَالٌ لَا تُلْہِیْہِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ [النور ۲۶]

”وہاں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خریداری اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔“

ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ان صفات سے موصوف ہوں۔

چھٹی وجہ: اس آیت کریمہ میں ﴿فِیْ بُیُوتِ اِذْنِ اللّٰہِ اَنْ تُرْفَعَ﴾ لفظ بیوت کو کمرہ موصوفہ لایا گیا ہے؛ اس میں کوئی تعین نہیں ہے۔ جب کہ اس سے آگے فرمایا ہے: ﴿اِذْنِ اللّٰہِ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَفِیْہَا اِسْمُہٗ﴾ اگر اس خطاب سے مراد وہ ذکر و اذکار اور نمازیں ہوں جو مساجد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ گھروں میں ادا کیے جاتے ہیں؛ تو اس میں اہل ایمان کے دیگر بہت سارے ایسے گھر بھی داخل ہوتے ہیں جو ان صفات سے موصوف ہیں؛ تو پھر یہ آیت انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں کے ساتھ خاص نہ ہوئی۔

اور اگر اس سے مراد پانچ نمازیں اور ان کے ساتھ ذکر و اذکار ہیں؛ تو پھر یہ آیت مساجد کے ساتھ خاص ہے۔ جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں میں مساجد کی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انہیں انبیاء کرام علیہم السلام کے مسکن ہونے کا اعزاز و فضیلت حاصل ہیں۔

ساتویں وجہ: شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں سے مراد وہ گھر ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے قیام کیا تھا؛ تو پھر مدینہ طیبہ میں ازواج مطہرات کے گھروں کے علاوہ کسی بھی نبی کا کوئی گھر نہیں تھا۔ تو ان گھروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر داخل نہ ہوا۔ اور اگر اس سے مراد وہ گھر ہوں جن میں انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کوئی ایک داخل ہوا ہے تو پھر نبی کریم ﷺ بہت سارے صحابہ کرام کے گھروں میں داخل ہوئے ہیں۔ جو بھی بات مان لی جائے؛ کسی بھی صورت میں حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے گھروں کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی کوئی فضیلت و خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ جب آپ کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی تو پھر مردوں کے مابین بہت سارے امور مشترک ہوتے ہیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

آٹھویں وجہ: اس شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: وہ مرد جن کی صفت اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

﴿وَرَجَالٌ لَا تُلْمِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [النور ۳۲]

”ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔“

اس آیت سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مرد دوسرے لوگوں سے افضل ہیں۔ اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کسی بھلائی کا وعدہ بھی نہیں کیا؛ بلکہ ان کے اس فعل پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جس کسی کی بھی کوئی تعریف کی جائے یا اسے جنت کی خوشخبری سنائی جائے تو وہ دوسروں سے افضل ہو جائے گا۔ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ انسان انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی افضل ہو۔

نویں وجہ: تصور کیجیے اس آیت سے ان لوگوں پر فضیلت ثابت ہوتی ہے جو ان صفات سے موصوف نہیں ہیں؛ تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے؟ بلکہ ہر وہ انسان جسے تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی؛ اور وہ آخرت کے دن کا بھی خوف رکھتا ہے؛ تو وہ اس صفت سے موصوف ہے۔ آپ پھر یہ کیونکر کہتے ہیں کہ: یہ صفت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں پائی جاتی ہے؟ جب کہ آیت کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ وہ بہت سارے لوگ ہیں؛ صرف کوئی ایک مرد نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت کریمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ آپ اور دوسرے لوگ اس صفت میں مشترک ہیں۔ پس اس بنیاد پر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اپنے مشارکین سے افضل ہوں۔

دسویں وجہ: اگر تسلیم کر لیا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اس صفت میں باقی لوگوں سے افضل ہیں۔ تو پھر بھی اس سے امامت کا وجوب کہاں سے لازم آگیا؟

جب کہ مفضل کو فاضل پر مقدم کرنے کے امتناع کے مسئلہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیشک ایسا ان مجموعی صفات میں ہوتا ہے جو کہ امامت کے لیے مناسب ہوتی ہیں۔ ورنہ ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ انسان جسے خیر کی کسی ایک خصلت میں دوسروں پر فضیلت حاصل ہو تو وہ امامت کا مستحق ہو جائے گا۔ اگر ایسا جائز ہو تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت زیادہ کفار کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بہت زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے اللہ کی راہ میں بہت زیادہ تکلیف دی گئی۔ ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے عمر میں زیادہ بڑے بھی تھے۔ ایسے بھی تھے جن کے پاس وہ علم تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس نہیں تھا۔

خلاصہ کلام! انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی دوسرے نبی کی صفات ہر لحاظ سے اس میں موجود ہوں۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک میں دوسری صحابی کی کوئی صفت ہر لحاظ سے پوری طرح موجود ہو سکتی ہے۔ بلکہ مفضل میں بھی کوئی نہ کوئی ایسی یگانہ چیز ہوتی ہے جس میں وہ فاضل سے آگے ہوتا ہے؛ لیکن بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر ساری صفات کو جمع کر کے انہیں معتبر سمجھا جاتا ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ [الشوری ۲۳]

”میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔“

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ [الشوری ۲۳]

”میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔“

تو صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کے کون سے قریبی رشتہ دار ہیں جن سے محبت رکھنا ہمارے لیے ضروری

ہے؟ آپ نے فرمایا: ”علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے دونوں بیٹے۔“

تفسیر نقشبندی اور بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دیگر تینوں خلفاء و صحابہ سے محبت

رکھنا واجب نہیں۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے افضل ٹھہرے اور وہی امام ہوں گے۔ بنا بریں ان کی مخالفت محبت کے

منافی ہے اور محبت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے، لہذا آپ واجب الاطاعت ہوئے۔ امامت سے یہی

مراد ہوتی ہے۔“ [شیعہ کلام ختم ہوا۔]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم اس حدیث کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیعہ کا یہ کہنا کہ: امام احمد نے اپنی مسند میں روایت

کیا ہے؟ ”ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ مسند احمد کے کئی نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ روایت موجود نہیں ہے۔

اس سے بھی بڑا جھوٹ یہ ہے کہ شیعہ کہتا ہے: یہ حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں میں کوئی ایسی

روایت موجود نہیں۔ بلکہ مسند اور صحیحین میں ایسی احادیث موجود ہیں، جو اس کی نقیض ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی مصنف اور اس جیسے دوسرے ان کے علماء اہل علم کی کتابوں سے جاہل ہیں۔ نہ ہی ان کا

مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو یہ علم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا: اس نے احادیث

کی متعدد کتابوں سے ایک کتاب جمع کی تھی۔ اس کی روایات کو کبھی بخاری کی طرف منسوب کرتا اور کبھی مسلم کی طرف؛ کبھی

مسند احمد کی طرف اور کبھی مغازی اور موفق کی طرف؛ اور کبھی خطیب خوارزمی اور نقشبندی اور ان جیسے لوگوں کی طرف۔ اس نے

اپنی اس کتاب کا نام رکھا تھا: ”الطرائف فی الرد علی الطوائف“، اور ایک دوسرے ابن بطریق نامی شیعہ مصنف نے ایک ایسی

ہی کتاب تصنیف کی اور اس کا نام رکھا: ”العمدة“۔

اپنی روایات میں کثرت کے ساتھ جھوٹ بولنے کے باوجود یہ لوگ پھر بھی ابو جعفر محمد بن علی اور اس کے امثال سے کسی

قدر بہتر ہیں۔ ابو جعفر نے بھی ان لوگوں کے لیے تصانیف لکھی ہیں؛ اور ان میں جھوٹ کی اس قدر بھرمار ہے کہ یہ جھوٹ

صرف انتہائی جاہل ترین انسان پر ہی مخفی رہ سکتا ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ بہت ساری روایات کو بخاری و مسلم اور

مسند احمد کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ حالانکہ ان کتابوں میں کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہوتی۔ مسند احمد کی طرف ایسی روایات منسوب کرتے ہیں جن کی اصل میں کوئی حقیقت ہی نہیں۔

پھر ان لوگوں کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ انہوں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند کا نام سن لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسند احمد میں جو کچھ ہے وہ سب امام احمد کا روایت کردہ ہے۔ چنانچہ امام احمد کی مسند میں جو قطعی کی زیادہ کردہ روایات ہیں؛ وہ ان کو بھی امام احمد کی روایات شمار کرنے لگ گئے۔ اور بسا اوقات قطعی کی روایات پر بھی زیادہ کر دیتے ہیں؛ اس لیے کہ یہ لوگ جھوٹ سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ”الطرائف“ اور ”العمدة“ کے مصنفین کبھی امام احمد کی طرف ایسی روایات منسوب کرتے ہیں؛ جو تو امام احمد نے نہ ہی کسی کتاب میں روایت کی ہوتی ہیں؛ اور نہ ہی آپ نے کبھی وہ روایات سنی ہوں گی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ روایات قطعی نے زیادہ کی ہوں۔ اور قطعی نے جو سن گھڑت اور جھوٹی روایات اس میں داخل کی ہیں؛ وہ کسی بھی عالم پر مخفی نہیں ہیں۔ ❶

اس رافضی کذاب کی نقول بھی ”العمدة“ اور ”الطرائف“ کے مصنفین کی جنس سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ اس مصنف نہ انہی کتابوں سے یہ سب کچھ نقل کیا ہے؛ یا پھر ان کے ناقلین سے نقل کیا ہے۔ مگر نہ جس انسان کو علم کی ادنیٰ سی بھی معرفت ہو؛ اسے ایسی روایات صحیحین یا مسند احمد کی طرف منسوب کرنے سے حیاء آتی ہے۔ صحیحین اور مسند کے نسخوں سے زمین بھری ہوئی ہے؛ ان میں کہیں بھی اس قسم کی کوئی روایت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ حقیقت میں کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے اسے روایت نہیں کیا۔ اس قسم کی روایات وہی نقل کرتے ہیں جو رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چن رہے ہوتے ہیں۔ جیسے ثعلبی اور اس جیسے دوسرے مصنفین؛ جو کہ ہر موٹی اور چھوٹی چیز کو جمع کر لیتے ہیں مگر صحیح اور خراب کی تیز سے عاری ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ: یہ حدیث با اتفاق محدثین و اہل علم جھوٹ ہے۔ حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس حدیث کی حقیقت جاننے کے لیے ان ہی سے پوچھنا چاہیے کہ کہاں سے گھڑ لائے ہیں؟

تیسری وجہ: اس پر مزید یہ کہ مذکورہ صدر آیت سورہ شوریٰ میں شامل ہے، جو بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ بلکہ تمام وہ سورتیں جو ”حکم“ سے شروع ہوتی ہیں؛ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مدینہ میں ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت حسن ۳ھ میں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح یہ سورت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے وجود سے بھی کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ تو پھر اب سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکی آیت کی تفسیر میں ان لوگوں کی محبت کو کیوں کر واجب قرار دے سکتے تھے؛ جو کہ ابھی تک نہ ہی پیدا ہوئے؛ اور نہ ہی ان کو کوئی پہچانتا تھا۔

❶ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے خلفاء اربعہ کے فضائل و مناقب میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں صحیح و سقیم ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ بعد ازاں امام احمد کے بیٹے عبداللہ القطعی نامی عالم نے بھی اس میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا جس میں جھوٹی اور ضعیف روایات شامل کر لیں۔ جبلاء نے سمجھا کہ یہ سب امام احمد کی مرویات ہیں حالانکہ یہ بدترین غلطی ہے۔ عبداللہ کی زیادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھوں نے اپنے والد حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نہیں کیں۔ القطعی کی زیادات بھی عبداللہ بن احمد کی بجا آئے دیگر راویوں سے منقول ہیں۔ [الدرادی؛ کشمیری]

چوتھی وجہ: صحیح بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ [الشوری ۲۳]

”کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔“

تو میں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ محمد ﷺ کو ان سے قربت کا تعلق رکھنے والوں اذیت نہ دو۔“ اس پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”تم نے بہت جلدی کی: قریش کی کوئی بھی شاخ ایسی نہیں ہے جس کیساتھ رسول اللہ ﷺ کا تعلق قربت داری نہ ہو۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”آپ نے جلد بازی سے کام لیا، قریش کا کوئی چھوٹا بڑا قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے قربت دارانہ روابط نہ ہوں۔ اس لیے فرمایا: ﴿لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا﴾ یعنی اس قربت داری کی بنا پر جو میں آپ سے رکھتا ہوں میں چاہتا ہوں تم مجھ سے محبت کا سلوک روا رکھو۔“

آپ نے مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ملاحظہ کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد سب اہل بیت میں بہت بڑے عالم تھے۔ آپ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ نہیں کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کی محبت کا سوال کرتا ہوں۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ: اے اہل عرب! اے قریش کی جماعت! میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ جو میرے اور آپ کے درمیان تعلق ہے: اس صلہ رحمی کا خیال کیجیے۔ اس پر کسی قسم کی سرکشی اور ظلم نہ کرو! اور مجھے اللہ کے دین کی دعوت دینے دو۔

پانچویں وجہ: اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ [الشوری ۲۳]

”کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔“

یہ امر قابل غور ہے کہ آیت کے الفاظ ہیں ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى﴾ یوں نہیں فرمایا: ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ لِلْقُرْبَى﴾ اور بھی نہیں فرمایا: ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبَى﴾ اور اگر وہ مطلب مراد ہوتا جو شیعہ کہتے ہیں تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبَى﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

۱..... ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبَى﴾ (الانفال ۴۱)

”جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور اہل قربت کا۔“

۲..... ﴿مِمَّا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِلَّذِي الْقُرْبَى﴾ (الحشر: ۷)

”بستیوں والوں کا جو (مال) اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بھڑے بغیر اپنے رسول کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے اور رسول کا

اور قربت والوں کا۔“

۳..... ﴿فَأَبِئْ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمُسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾ (الروم: ۳۸)

”قربت داروں کو ان کا حق ادا کیجیے؛ اور مساکین کو اور مسافروں کو بھی۔“

۴..... ﴿وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى﴾ (البقرة: ۱۷۷)

”اور اللہ کی محبت میں مال دیتے ہیں اپنے قریب داروں کو۔“

اس طرح کی آیات دیگر بھی کئی مقامات پر آئی ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اقارب کے حق میں وصیت کی گئی ہے اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں۔ [وہاں پر ان کے حق میں وصیت ہے تو] اس کے لیے ﴿ذَوِ الْقُرْبَى﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ [یہاں پر بھی] اگر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے: ﴿الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبَى﴾ یہاں پر ﴿فِي الْقُرْبَى﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں اہل قرابت کی محبت کا سوال نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرابت کی محبت کی رعایت کا کہا گیا ہے۔

چھٹی وجہ: اگر یہاں پر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے: ﴿الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبَى﴾ ﴿فِي الْقُرْبَى﴾ کے الفاظ نہ ہوتے۔ اس لیے کہ عربی محاورہ میں یوں نہیں کہتے: ﴿أَسْأَلُكَ الْمَوَدَّةَ فِي فَلَانٍ﴾ بلکہ ”فلان“ بولتے ہیں۔

ساتویں وجہ: ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول تبلیغ شریعت کی اجرت ہرگز طلب نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف اللہ سے اجرت کا طلب گار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾ (الفرقان: ۵۷)

”کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔“

نیز فرمایا: ﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ﴾ (الطور: ۴۰)

”کیا آپ اجرت طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔“

ارشاد ہوتا ہے: ﴿قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (سباء: ۴۷)

”فرمادیجئے: جو بدلہ تم سے مانگوں وہ تمہارے لئے ہے میرا بدلہ تو اللہ ہی کے ذمے ہے۔“

لیکن یہاں پر استثناء منقطع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾ [الفرقان: ۵۷]

”کہہ دیجئے کہ میں قرآن کے پہنچانے پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر جو شخص اپنے رب کی طرف راہ پکڑنا چاہے۔“

اس میں شبہ نہیں کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے، مگر اس کا دوجب اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ ان کی محبت کو رسول کی اجرت بھی نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ ان امور میں سے ہے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ وہ دیگر شرعی مامورات کی طرح عبادات کی حیثیت رکھتی ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے غدیر خم پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

”میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد

دلاتا ہوں۔“ ①

① صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب، ۲۴۰۸۔ (حدیث: ۲۴۰۸)۔

ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! لوگ اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکیں گے جب تک اللہ تعالیٰ اور میری قربت کی وجہ سے اہل بیت کو چاہنے نہ لگیں۔“^①

لیکن جس کسی نے اہل بیت کی محبت کو رسول اللہ ﷺ کی اجرت قرار دیا ہے! یقیناً اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر اہل بیت سے ہماری محبت آنحضرت ﷺ کی اجرت رسالت میں داخل ہوتی تو ہمیں اس کا اجر و ثواب نہ دیا جاتا۔ اس لیے کہ ہم نے آپ کی وہ اجرت ادا کی تھی جس کا آپ رسالت کی بنا پر استحقاق رکھتے تھے۔ کیا کوئی مسلمان یہ بات کہنے کیلئے تیار ہے؟ یہ بات ہمیں تسلیم ہے کہ دیگر دلائل کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہمارے لیے ضروری ہے، مگر اس سے ان کی افضلیت اور امامت و خلافت کیوں کر ثابت ہوئی؟

[إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى] سے استدلال:

آٹھویں وجہ: یہاں پر ﴿الْقُرْبَى﴾ کا لفظ ”ال“ لگا کر معرفہ بنا کر لایا گیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ قربت دار مخاطبین کے ہاں معروف ہوں؛ جنہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ: ﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا﴾ [الشوریٰ ۲۳]

”کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔“

ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت تک ابھی حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اور نہ ہی حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کی شادی ہوئی تھی۔ پس آیت میں جن اہل قربت کے لیے خطاب کیا گیا ہے؛ بہت ناممکن ہے کہ یہ لوگ ہوں۔ بخلاف اس قربت داری کے جو آپ کے اور قریش کے مابین تھی۔ یہ تعلق و قربت اس وقت کے لوگوں میں معروف تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ فرما رہے ہوں: میں تم سے اس خونی رشتہ داری کی رعایت کا سوال کرتا ہوں جو میرے اور آپ کے مابین ہے۔ جیسا کہ کوئی کہتا ہے: میں آپ سے اپنے اور آپ کے مابین عدل کا سوال کرتا ہوں۔ اور کوئی دوسرا کہتا ہے کہ: میں صرف آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

نویں وجہ: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اس آیت سے استدلال کیے بغیر بھی واجب ہے۔ لیکن آپ کی محبت اور دوستی کے واجب ہونے سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امامت صرف آپ کے لیے ہی خاص ہے؛ اور نہ ہی آپ کی کوئی خاص فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

[اشکال]: شیخ مصنف لکھتا ہے: ”خلفاء ثلاثہ سے محبت رکھنا ضروری نہیں ہے۔“

[جواب]: یہ بات ہمارے لیے ناقابل قبول ہے، بلکہ اہل بیت کی الفت و محبت کے دوش بدوش اصحاب ثلاثہ کی محبت بھی ناگزیر ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ خلفائے ثلاثہ سے محبت رکھتے ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہوں اس سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھنا ہم پر واجب ہے ”الْحُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ“^② اسلام کا

① سنن ابن ماجہ، المقدمة، باب فضل العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ، (حدیث: ۱۴۰)، مستدرک حاکم (۷۵/۴) و سندہ ضعیف لانقطاعہ اس کی سند منقطع ہے۔

② سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ۔ باب مجانبۃ اهل الاهواء (حدیث: ۴۵۹۹)۔

طرہ امتیاز اور ایمان کی مضبوط ترین کڑی ہے۔ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کبار اہل تقویٰ اولیاء اللہ میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے دوستی رکھنے کو واجب قرار دیا ہے۔ بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ اس پر قرآنی نصوص موجود ہیں۔ ہر وہ شخص جس سے اللہ راضی ہو جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ سے؛ احسان کرنے والوں سے؛ عدل و انصاف کرنے والوں سے؛ اور صبر کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان لوگوں میں سے افضل ترین لوگ ہیں جو ان نصوص میں داخل ہیں۔

[تمام صحابہ رضی اللہ عنہم واجب الاحترام ہیں:]

بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”مسلمانوں کے باہمی رحم و کرم اور الفت و محبت کی مثال ایک جسم جیسی ہے کہ جب اس کا کوئی عضو بیمار پڑتا ہے تو پورا

جسم بخار و بیداری سے بے قرار ہو جاتا ہے۔“^①

اس حدیث میں ہمیں خبر دی گئی ہے کہ اہل ایمان آپس میں محبت کرتے ہیں؛ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور رحم کی دعا کرتے ہیں۔ اور اس باب میں وہ ایک جسم کی مانند ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان نصوص کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں ثابت ہے؛ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت ہے۔ اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں قدح کرنا چاہیے تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان کبھی بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہر وہ دلیل جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان پر دلالت کرتی ہے؛ وہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان پر بہت زیادہ قوت کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔ اور جو بات بھی باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں قدح کے طور پر بیان کی جاتی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں بدرجہ اولیٰ قدح کا موجب بنتی ہے۔ اس لیے کہ جو رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تعصب کرتا ہے؛ اور باقی صحابہ پر قدح کرتا ہے؛ یہود و نصاریٰ کی طرح اس کی حجت بالکل ناکارہ اور بودی ہے؛ جو حضرت عیسیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت تو ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر محمد ﷺ کی نبوت پر قدح و اعتراض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک رافضی قوت دلیل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے اور آپ کے ایمان پر قدح کرنے والے خوارج و نواصب کو قائل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس مکالمہ سے ظاہر ہے۔ اگر خارجی و ناصبی ایک شیعہ سے کہیں تمہیں کیوں کر معلوم ہوا کہ علی اللہ کے ولی اور متقی مومن ہیں؟“

اگر شیعہ اس کے جواب میں کہے کہ ”مجھے تو اتر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا معلوم ہوا کیوں کہ آپ مسلمان تھے اور اعمال صالحہ انجام دیتے تھے۔“ تو خارجی و ناصبی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ”نقل متواتر تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے بارے میں بھی موجود ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی نیکیوں کے بارے میں موجود تو کسی بھی معارض سے محفوظ ہے۔“

① صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب رحمة الناس و البہائم (حدیث: ۶۰۱۱)، صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ۔ باب تراحم المؤمنین (حدیث: ۲۵۸۶)۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نقل کردہ تو اتر سے بڑھ کر ہے۔“

اور اگر شیعہ کہے کہ قرآن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا ثابت ہے۔

تو خوارج و نواصب کہہ سکتے ہیں کہ ”قرآنی عموماً میں تو دیگر صحابہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہیں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الفتح ۱۸]

”یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا۔“ اور اس طرح کی دوسری آیات بھی ہیں۔

مگر تم شیعہ اکابر صحابہ کو ان عموماً سے خارج کرتے ہو؛ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی جماعت کی بجائے آسان تر صرف ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے خارج کر دیا جائے۔

اگر شیعہ کہے کہ ”احادیث نبویہ سے اور ان کی شان میں قرآن کے نزول سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی ہونا ثابت ہے۔“ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب کی احادیث اکثر واضح ہیں مگر شیعہ ان پر قدح وارد کرتے ہیں۔ دوسری جانب فضیلت علی رضی اللہ عنہ میں شیعہ جو روایات بیان کرتے ہیں ان کے نقل و ہی صحابہ ہیں جو شیعہ کے نزدیک مطعون ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں:

۱۔ اگر صحابہ پر شیعہ کی جرح و قدح درست ہے تو فضیلت علی رضی اللہ عنہ میں ان کی روایات بھی معتبر نہیں ہیں۔

۲۔ اگر فضیلت علی رضی اللہ عنہ کی روایات قابل اعتماد ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر شیعہ کے مطاعن لغو ہیں۔

اگر روافض کہیں کہ فضیلت علی رضی اللہ عنہ کی روایات شیعہ کی نقل اور تو اتر کے مطابق معتبر ہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی رافضی نہیں تھا۔ اور معدودے چند کے سوا شیعہ کے

نزدیک سب صحابہ رضی اللہ عنہم مطعون ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دس سے زائد صحابہ ایسی روایات کے نقل کرنے میں یک زبان ہیں، جب روافض جمہور صحابہ کی مرویات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تو معدودے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت کردہ احادیث کیوں کر ان کے نزدیک جست ہوں گی؟ اس مسئلہ پر اپنی جگہ پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔^①

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ شیعہ کا قول کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ تینوں خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کی محبت واجب نہیں۔“ جمہور کے ہاں یہ کلام باطل ہے۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کے ہاں ان تینوں حضرات کی محبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت سے بڑھ کر واجب ہے۔ اس لیے کہ محبت فضیلت کی مقدار کے لحاظ سے واجب ہوتی ہے۔ پس جس کی جتنی زیادہ فضیلت ہوگی؛ اس کی محبت بھی اتنی زیادہ واجب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

① کافی میں ہے: ابو جعفر - علیہ السلام - سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: ”نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد لوگ مرتد ہو گئے تھے سوائے تین کے۔ میں نے کہا: وہ تین کون تھے۔ فرمایا: اور تین ہیں: حضرت مقداد بن اسود؛ اور حضرت ابوذر غفاری؛ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد لوگوں نے پہچان لیا۔ اور فرمایا یہی لوگ تھے جن پر ظلم کی۔ چکی چلی۔ اور انہوں نے بیعت کرنے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ امیر المؤمنین کو زبردستی پکڑ کر لائے اور انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیعت کی۔“ (روضۃ الکافی ۸/ ۲۳۵-۲۳۶ روایت نمبر ۳۳۱۔ [درودی: کشمیری])

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾ [مریم: ۹۶]۔

”بیشک جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمن محبت پیدا کر دے گا۔“

اس کی تفسیر میں علماء کرام فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ خود بھی ان سے محبت کرتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں بھی ان کے لیے محبت ڈال دیتا ہے۔ یہ جماعت اس امت میں نبی کریم ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سے افضل ترین لوگ تھے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔^① جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيِّئَاتِهِمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْطَهُ فَازْرَكَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوَابِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ [الفتح: ۲۹]

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھے گا رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے۔ ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ مثل اس کھیتی کے جس نے اکھوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔“^②

[یہ درست ہے کہ محبوب اللہ و رسول ﷺ ہونے کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہم پر واجب ہے۔ تاہم دیگر صحابہ کی محبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا]۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا کہ:

”سب لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا: ”عائشہ۔“

”عرض کیا گیا مردوں میں سے کون عزیز ہیں؟ فرمایا: ”ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ صدیق۔“^③

① یعنی دنیا میں لوگوں کے دلوں میں اس کی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے محبت پیدا کر دے گا، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی (نیک) بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اللہ جبرائیل علیہ السلام کو کہتا ہے، میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبرائیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنی شروع کر دیتے ہیں پھر جبرائیل علیہ السلام آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے، پس تمام آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لئے قبولیت اور پذیرائی رکھ دی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری)۔

② یعنی مسلمان پہلے صرف ایک تھا اور وہ تھی رسول اللہ کی ذات اقدس جو اپنی نبوت پر سب سے پہلے خود ایمان لائے۔ پھر ایک سے دو ہوئے، دو سے تین، تین سے سات۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اسلام کا پورا زمین سے باہر نکل آیا۔ فتح مکہ کے دن یہ پورا ایک مضبوط اور تدارد درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ جب یہ مضبوط درخت بن کر اپنی جڑوں پر استوار ہو گیا۔ اس درخت کی آبیاری اور نگہداشت کرنے والی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ مقدس جماعت تھی جو نبی اخرا زمان پر ایمان لائے تھے پھر عمر بھر دل و جان سے آپ کی اطاعت کرتے اور آپ کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ایسے لوگوں کا اللہ کے ہاں اجر بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو معاف کر کے انہیں جنت کے بلند درجات عطا فرمائے گا۔ اس آیت سے بعض علما نے یہ استنباط کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے چلنے والا اور ان کے متعلق بغض اور کینہ رکھنے والا شخص کسی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ [الدرای]۔

③ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذًا خليلاً“ (ح: ۳۶۶۲)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ح: ۲۳۸۴)۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سفیف بنی ساعدہ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

”آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے بہتر اور نبی کریم ﷺ کو ہم سب سے عزیز ہیں۔“^①

اس کی تصدیق ان احادیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جو صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں مشہور ہیں۔ سرور کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”اگر میں اس امت میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا؛ لیکن اسلام کی محبت [سب کیلئے ہے]۔“^②

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ روئے زمین بسنے والوں میں رسول اللہ ﷺ کی محبت کے سب سے بڑے حق دار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور جو رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہو؛ وہ اس بات کا بہت زیادہ حق دار ہے کہ اہل ایمان ان سے محبت کرتے رہیں۔ اس لیے کہ اہل ایمان اسی سے محبت کرتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسول محبت کرتے ہوں۔ اور اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس محبت کے سب سے بڑے حق دار ہونے کے دلائل بہت سارے ہیں۔ تو پھر یہ بات کہنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ مفضول سے محبت کرنا تو واجب ہے؛ مگر افضل سے محبت کرنا واجب نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت ان کی محبت کے منافی ہے۔ آپ کے احکامات کی تعمیل کرنا آپ کی محبت ہے؛ تو آپ واجب الاطاعت ٹھہرے؛ یہی امامت کا معنی ہے۔“

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: یہ ہے کہ اگر کسی سے محبت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت واجب ٹھہرتی ہے تو اقارب کی اطاعت بھی ضروری ہوگی، اس لیے کہ ان کی محبت واجب ہے۔ جس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا امام ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ باطل ہے تو پھر باقی امور بھی اسی کی طرح باطل ہیں۔

دوسرا جواب: محبت کے واجب ہونے کی صورت میں محبت و مودت کسی طرح بھی امامت کو مستلزم نہیں۔ اور نہ ہی جس کسی کی محبت واجب ہو تو وہ امام بن جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی محبت ان کے امام بننے سے پہلے بھی واجب تھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں امام نہیں تھے؛ پھر بھی آپ کی محبت واجب تھی۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل ہونے تک بھی آپ کی محبت واجب تھی۔

تیسرا جواب: اگر محبت کو امامت کا ملزوم قرار دیا جائے تو ملزوم کا انتفاء لازم کی نفی کا تقاضا کرتا ہے۔ بنا بریں صرف اسی شخص کی محبت لازم ہوگی جو امام معصوم ہو۔ تو اس صورت میں کسی بھی مؤمن سے محبت نہیں کی جائے گی؛ اور نہ ہی کسی اہل ایمان سے محبت و مودت رکھنا واجب ہوگی؛ اس لیے کہ وہ امام نہیں۔ نہ ہی شیعیان علی اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ یہ بات اجماع کے بھی خلاف ہے اور اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ امور کے بھی خلاف ہے۔

① صحیح بخاری حوالہ سابق (حدیث: ۳۶۶۸)، مطولاً۔

② صحیح بخاری حوالہ سابق (حدیث: ۳۶۵۸)، عن عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل ابی بکر الصديق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۴/۲۳۸۳) عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

چوتھا جواب: شیعہ کا یہ قول ہے کہ ”مخالفت محبت کے منافی ہے۔“

ہم پوچھتے ہیں: ایسا کب ہوگا؟ جب محبت واجب ہوگی یا پھر مطلق طور پر؟ مطلق کہنے کی صورت میں یہ ممنوع ہے۔
وگرنہ جو کوئی کسی دوسرے پر کوئی ایسی چیز واجب کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب نہیں کی؛ تو پھر اگر وہ اس کا حکم ماننے میں اس کی مخالفت کرے گا تو اس سے محبت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور کوئی مؤمن کسی مؤمن سے اس وقت تک محبت کرنے والا نہیں ہو سکتا جب تک اسکی اطاعت کے واجب ہونے کا یقین نہ کر لے؛ اس نظریہ کی خرابی صاف ظاہر ہے۔

پہلی صورت میں: جب مخالفت صرف اسی صورت میں محبت میں قاذر ہوتی ہے جب وہ شخص واجب اطاعت ہو۔ اس صورت میں پہلے وجوب اطاعت کا علم ضروری ہے۔ تاکہ اس کی مخالفت کی صورت میں اس کی محبت پر قرح کر سکیں۔ جب اطاعت کو اس لیے واجب قرار دیا جائے گا کہ محبت واجب ہے تو دور لازم آئے گا؛ جو کہ متعین ہے۔ اس لیے کہ کسی مخالفت سے اس وقت تک محبت پر قرح نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی اطاعت کا واجب ہونا معلوم نہ ہو۔ اور اطاعت کا واجب ہونا اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ امام ہے۔ اور امام ہونے کا اس وقت تک علم نہیں ہو سکتا جب تک اس کی محبت واجب ہونے کا علم نہ ہو؛ اور یہ علم ہو کہ اس کی مخالفت محبت میں قرح کا سبب ہوگی۔

پانچواں جواب: [ہم پوچھتے ہیں] کیا مخالفت محبت میں اسی صورت میں قاذر ہو سکتی ہے [جب وہ شخص امام ہو] اور اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو؟۔

دوسرے جواب کی ضرورت کے تحت نفی کی گئی ہے۔ جب کہ پہلے جواب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔

چھٹا جواب: یہی بات حضرات خلفاء ثلاثہ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی محبت و اطاعت بھی واجب ہے۔ اور ان کی مخالفت ان کی محبت میں قاذر ہے۔

ساتواں جواب: اس حدیث میں سے ترجیح کے امور: اس لیے کہ شیعہ نے اپنی ولایت و محبت اور اطاعت کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ امامت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اور [ان کا دعویٰ ہے کہ] اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت واجب کی ہے۔ اور ان کی مخالفت ان کے ساتھ محبت میں قاذر ہے۔ بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں بھی قرح کا سبب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس نے رافضیت کی بدعت کو ایجاد کیا؛ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھنے والا نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کا پکا دشمن تھا۔

ان لوگوں کا اہل سنت کے ساتھ ایسے ہی معاملہ ہے جیسا عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ۔ اس لیے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو رب قرار دیتے ہیں؛ اور حضرت ابراہیم؛ موسیٰ؛ اور محمد ﷺ کو ان حواریوں سے بھی کم درجہ کا سمجھتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

یہی حال شیعہ کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام معصوم؛ یا نبی یا پھر خدا تک قرار دیتے ہیں؛ اور باقی خلفاء رضی اللہ عنہم کو اشترنجی؛ اور اس جیسے ان لوگوں سے بھی کم تر قرار دیتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر برسر پیکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

جہالت اور دروغ گوئی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اسے احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان کا بڑا سہارا جھوٹی منقولات؛ مثلاً الفاظ؛ فاسد قیاس؛ اور اس طرح کی چیزیں ہیں مگر اس پر مستزاد یہ کہ کجی منقولات اور تو اتر؛ واضح دلائل و نصوص اور صریح معقولات کا دعویٰ کرتے ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ﴾ (البقرة ۲۰۷)

”اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔“

غلابی کہتے ہیں: جب سرور کائنات ﷺ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قرض اور امانتوں کی ادائیگی کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ میں ہی رہنے دیا۔ جس رات آپ غار کی جانب چلے اور کفار قریش نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ کی سبز چادر اوڑھے آپ کے بستر پر سو رہیں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”یا علی! میری سبز حضری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں دے سکیں گے۔ ان شاء اللہ۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد کردی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل و میکائیل کی طرف وحی کی کہ میں نے تمہارے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا ہے؛ اور ایک کی عمر دوسرے سے طویل کر دی ہے۔ بتائیے تم میں سے کون اپنی زندگی کا حصہ دوسرے کو عطا کرتا ہے۔ دونوں نے جینے کو پسند کیا اور کوئی بھی ایثار نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقلید نہ کی۔ میں نے محمد و علی کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ علی محمد کے بستر پر سو گئے اور ان کے لیے یہ ایثار قبول کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو زمین پر اترنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حفاظت کا حکم دیا۔ جبرائیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر کے پاس کھڑے ہو گئے اور میکائیل پاؤں کے پاس۔ جبرائیل نے کہا: ”شاباش! اے علی! تیرے جیسا اور کون ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے فرشتوں پر فخر کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ عازم مدینہ تھے کہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ﴾ (البقرة ۲۰۷)

”اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں نازل ہوئی جب آپ مکہ سے غار ثور کی طرف جارہے تھے۔ اس فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔ بنا بریں یہ واقعہ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی فضیلت پر زبردست دلیل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ ہی امام ہیں۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا۔)

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے اس واقعہ کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کسی روایت کو غلابی یا اس کے امثال کا نقل کر لینا حجت کے لیے کافی نہیں؛ بلکہ ان کی طرف منسوب کرنے میں ہی اس کا جھوٹ ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ ان کی روایت با اتفاق شیعہ و اہل سنت حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بہت ہی متأخر مرسل ہے۔ اور روایت کی اسناد ذکر نہیں کرتا۔ اس کی

روایات میں اسرائیلیات! اسلامیات اور ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کا موضوع ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ غلبی خود جان بوجھ کر جھوٹ نہ بھی بولتا ہو۔

دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین و مفسرین اور سیرت نگاروں کے جھوٹ ہے۔ [اس لیے اسے بطور حجت پیش نہیں کیا جاسکتا۔]

تیسری بات: حقیقت یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی۔ قریش مکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قطعی طور پر بے تعلق تھے۔ ان کا اصلی مطلوب نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے۔ قریش مکہ نے انعام بھی انہی دو حضرات کو پکڑنے والے کے لیے مقرر کیا تھا۔ جیسا کہ روایات صحیحہ میں مذکور ہے؛ جن کی صحت میں کسی بھی عاقل کو ادنیٰ شک بھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے بستر پر سنانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قریش اس وہم میں مبتلا رہیں کہ آپ گھر ہی میں ہیں اور آپ کی تلاش نہ کریں۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہاں پر سوئے ہوئے پایا؛ تو قریش پر ان کی ناکامی کا راز فاش ہوا۔ تاہم انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ ایذا نہ پہنچائی۔ ان سے صرف یہ دریافت کیا کہ نبی کریم ﷺ کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی کی بھی طرف سے ہرگز کوئی خوف ہی نہیں تھا۔ خوف تو نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں تھا۔ اگر انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی پر خاش ہوتی تو وہ انھیں ضرور تکلیف پہنچاتے۔ کفار مکہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعرض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ تو پھر کون سی جاں نثاری اور قربانی کا ذکر کیا جا رہا ہے؟

جس شخص نے قصداً آپ کا دفاع کیا؛ اور اس کے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے؛ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، خود آپ کو بھی خطرہ لاحق تھا۔ مگر پھر بھی آپ نبی کریم ﷺ کی حفاظت کے نقطہ خیال سے دوران سفر کبھی نبی کریم ﷺ کے آگے ہوتے اور کبھی پیچھے۔^①

جب آپ کو پیچھے تلاش کرنے والوں کا خیال آتا تو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ہو لیتے؛ اور جب آگے گھات کا خیال آتا تو رسول اللہ ﷺ کے آگے ہو جاتے۔ اور اگر نکل کر خبر لیتے کہ کہیں کوئی انتظار میں یا گھات لگائے ہوئے تو نہیں۔ جب کوئی خوف محسوس ہوتا تو آپ چاہتے کہ یہ پریشانی انہی پر آئے نبی کریم ﷺ پر نہ آئے۔

کئی صحابہ نے مختلف لڑائیوں میں اپنی جانیں تک نبی کریم ﷺ پر نثار کی تھیں۔ بعض شہید ہوئے اور بعض کے اعضاء تک شل ہو گئے۔ مثلاً طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔^②

① البخاری باب ہجرة النبي ﷺ و اصحابه (ح: ۳۹۰۶) سيرة ابن هشام (ص: ۲۲۲) مسند احمد (۱/ ۳۴۸)۔

② سيرة النبي لابن كثير (۱/ ۴۵۶)، مستدرک حاکم (۶/ ۳) دلائل النبوة (۲/ ۴۷۶) عن محمد بن سيرين مرسلاً

③ صحيح بخاری، كتاب المغازی باب ﴿اذْهَبْتَ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ...﴾ (حديث: ۴۰۶۳)۔

نبی کریم ﷺ کی تائید و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ مکہ مکرمہ میں بستر پر لیٹنا جان ثاری تھی؛ اور اس میں فضیلت کا پہلو موجود ہے تب بھی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں؛ بلکہ دوسرے لوگ بھی اس میں آپ کے شریک ہیں۔ اس لیے کہ دوسرے کئی صحابہ کرام نے بھی کئی مواقع پر رسول اللہ ﷺ پر جان ثاری کا حق ادا کیا ہے۔ تو پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوئی خطرہ ہی نہ تھا تو یہ کیسے خصوصیت ہوئی؟

سیرت ابن اسحاق میں ہے۔ حالانکہ ابن اسحاق کا شمار متولین علی رضی اللہ عنہ اور ان کی جانب میلان رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اس نے ہجرت کی رات مکہ مکرمہ میں اپنے گھر سے نبی کریم ﷺ کے خروج اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بستر پر لیٹانے کا واقعہ لکھا ہے؛ [وہ لکھتا ہے]: جبرائیل امین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ رات کے اندھیرے میں کفار آپ کے دروازے پر جمع ہو کر انتظار کرنے لگے کہ جب سو جائیں تو آپ پر حملہ کر دیں۔

ان کو کھڑے دیکھ کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ”میرے بستر پر میری سبز حضری چادر اوڑھ کر سو جائیں کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔“ {سیرۃ ابن ہشام (ص: ۲۲۲)، مسند احمد (۱/ ۳۴۸)}

واقعہ ہجرت:

محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ:

جب کفار مکہ نبی کریم ﷺ کی تلاش میں جمع ہوئے تو ان میں ابو جہل بھی تھا۔ اس نے کہا: محمد کہتے ہیں: ”اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے اور موت کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گے تو تمہیں ایسے باغات ملیں گے جیسے اردن کے باغات ہیں اور اگر تم نے ان کی پیروی نہ کی تو وہ تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے اور بعد از موت جب اٹھائے جاؤ گے تو تمہیں آگ میں جلایا جائے گا۔“

راوی کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ گھر سے نکلے اور مٹھی بھر مٹی ان پر دے ماری، پھر فرمایا: ہاں میں یوں ہی کہتا ہوں۔ ابو جہل کو مخاطب کر کے فرمایا: تو بھی آگ میں جلنے والوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی قوت بصارت سلب کر لی اور وہ آپ کو دیکھ نہ سکے۔ یہ مٹی ان سب آدمیوں کے سر پر پڑی۔ کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس کے سر پر وہ مٹی نہ پڑی ہو۔ اور وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ پھر ایک شخص ان کے پاس آیا؛ جو ان کے ساتھ نہیں تھا؛ اس نے کہا: ”تم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟“

انہوں نے کہا: ”محمد کا۔“

وہ کہنے لگا: ”اللہ کی قسم! محمد جا چکے ہیں تم اپنے مقصد میں ناکام ہوئے۔ جاتے جاتے وہ تمہارے سروں پر خاک بھی جھونک گئے ہیں۔“ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔

چنانچہ کفار میں سے ہر آدمی نے اپنا ہاتھ اپنے سر میں ڈالا تو دیکھا کہ ان کے سر پر مٹی پڑی ہے۔ پھر وہ گھر میں ادھر ادھر جھانکنے لگے کیا دیکھتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ آپ کی چادر اوڑھے سوئے ہیں۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! محمد ﷺ اپنی چادر

تانے سو رہے ہیں۔ اتنے میں صبح ہوگئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے؛ تو کفار نے کہا: ”اس شخص نے سچی بات کہی تھی کہ محمد ﷺ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَإِذْ يَبْغُرُكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكِيرِينَ﴾ [الأنفال: ۳۰]

”وہ وقت کو یاد کیجیے جب کافر آپ کے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر ڈالیں یا مکہ سے نکال دیں اور یہ تدبیریں کر رہے تھے اور ادر اللہ تعالیٰ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔“ [سیرۃ ابن ہشام ص: ۲۳۱]

نیز یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ﴾ [الطور ۳۰]

”یادہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں۔“

اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہجرت کی اجازت عطا فرمائی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی غرض نہیں تھی۔“

مذکورہ صدر روایت سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ فرمایا تھا کہ: ”میرے بستر پر میری سبز حضری چادر اوڑھ کر سو جائیں کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔“

بنابرین حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وعدہ کی روشنی میں ہر طرح سے سرور و مطمئن تھے۔

چوتھی بات: خود اس روایت میں اس کے جھوٹ ہونے کے وہ دلائل موجود ہیں جو کسی پر بھی مخفی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ ملائکہ کے بارے میں ایسی باطل باتیں نہیں کہی جاسکتیں جو ان کی شایان شان نہ ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھوکا نہیں تھا کہ دوسرے کو کھانے میں ترجیح دیتا۔ اور نہ ہی ان کے لیے کوئی خوف تھا کہ امن والا خوف والے کو ترجیح دیتا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جاسکتی ہے کہ اس نے فرشتوں سے کہا: تم میں سے کون ہے جو اپنے ساتھی کی زندگی کو ترجیح دے؟ نیز فرشتوں کے مابین اصل میں کوئی مواخات نہیں۔ بلکہ جبریل کی اپنی خاص ذمہ داری ہے؛ میکائیل کی اپنی خاص ذمہ داری ہے جو جبریل کی نہیں۔ جیسا کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے؛ کہ وحی لیکر آنا اور مدد لیکر نازل ہونا جبریل امین کی ذمہ داری ہے۔ اور روزی اور بارش پہنچانا میکائیل کی ذمہ داری ہے۔

پھر اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر ہی دیا تھا کہ ان میں سے ایک کی عمر دوسرے کی نسبت زیادہ ہوگی؛ تو پھر ویسے ہی ہونا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا تھا۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا فیصلہ بھی ہو گیا تھا؛ اور اب مشیت الہی یہ تھی کہ دونوں کا لمبی عمر پر اتفاق ہو جائے؛ یا ایک اپنی عمر کا کچھ حصہ دوسرے کو دیدے اور دونوں اس پر راضی بھی ہوں تو پھر اس میں کسی کلام کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ اور اگر وہ اس پر راضی نہیں تھے؛ بلکہ اس کو ناپسند کرتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے لیے کیسے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ فرشتوں کے مابین بغض و عداوت ڈالے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس بات کو سچ تسلیم کر لیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسی بودی اور بیہودہ باتوں سے بہت بلند و بالا اور منزہ و مبرا ہے۔

پھر اگر اس بات کو۔ بطور مناظرہ۔ باطل ہونے کے باوجود صحیح بھی مان لیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کی

تخلیق آدم علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے ہوئی ہے؛ اس وقت سے لیکر ہجرت کے بعد تک اس معاملہ میں تاخیر کیوں کی گئی؟ اگر واقعی کچھ ایسا ہی تھا تو پھر ان فرشتوں کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے بارے میں فیصلہ ہونا چاہیے تھا۔

پانچویں بات: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرور کائنات ﷺ سے مواخات کی روایت بھی صحیح نہیں اور نہ ہی آپ نے کسی دوسرے سے کوئی مواخات قائم کی۔ اس بارے میں جو کچھ روایت کیا جاتا ہے؛ وہ سب جھوٹ اور دروغ گوئی ہے۔ حدیث مواخات جو اس بارے میں روایت کی جاتی ہے؛ اس میں ضعف و بطلان کے باوجود واضح ہے کہ مواخات مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی۔ امام ترمذی نے ایسے ہی روایت کیا ہے۔ جبکہ کہ میں مواخات کی روایت ہر دو لحاظ سے باطل ہے۔ لیکن یہ بھی اس روایت میں کہیں بھی جاٹاری؛ یا اپنی زندگی پر ترجیح دینے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

چھٹی بات: جبریل و میکائیل و فرشتوں کا ایک انسان کی حفاظت کے لیے نازل ہونا سب سے بڑی جھوٹی بات ہے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی مخلوق میں سے کسی کی حفاظت اس کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ ان فرشتوں کا بدر کے دن جنگ کرنے کے لیے اور اس طرح کے بڑے اور اہم ترین امور میں نازل ہونا ثابت ہے۔ اگر انہوں نے کسی ایک آدمی کی حفاظت کے لیے نازل ہونا تھا تو پھر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے نازل ہوتے؛ جن کی تلاش میں ہر طرف سے کفار اڈ پڑے تھے؛ اور ان دونوں حضرات یعنی نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما پر انہوں نے انعام بھی مقرر کر رکھے تھے۔ اور یہی دو حضرات کفار پر سخت گراں بھی تھے۔

ساتویں بات: علاوہ ازیں یہ آیت ﴿مَنْ يَشِرْئِ نَفْسَهُ﴾ سورہ بقرہ میں ہے جو بالاتفاق مدنی سورت ہے۔ سورت بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ ہجرت تک اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اور مشرکوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو آپ نے اپنا مال ان کو دے دیا اور خود مدینہ پہنچ گئے۔ نبی ﷺ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: ”ابو یحییٰ! یہ سودا سودمند ہے۔“ (یہ واقعہ متعدد تفاسیر میں مذکور ہے) ^۱

یہ ممکن ہے؛ اس لیے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کرام کا اختلاف ہے کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور اس سے کون مروا ہے؟

ابوقادہ کا قول ہے کہ یہ آیت مجاہدین مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی؛ اور اس سے مراد مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں۔ عکرمہ کہتے ہیں یہ آیت حضرت صہیب و ابو ذر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب بدر والوں نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا مگر وہ ان سے چھوٹ کر بارگاہ نبوی میں پہنچ گئے۔ جب واپس لوٹے تو کفار پھر مرزا الظہران میں مل گئے آپ دوبارہ ان سے چھوٹ گئے۔

جب کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا تھا۔ آپ نے فدیہ دے کر ان سے رہائی حاصل کر لی۔ پھر ہجرت کرتے ہوئے نکل پڑے کہ قنفذ بن نفیل بن جدعان نے آپ کو پکڑ لیا۔ آپ کے پاس جو مال رہ گیا تھا؛ وہ اسے دیکر جان چھڑائی۔ علاوہ ازیں آیت کے الفاظ عام ہیں اور رضائے الہی؛ اور اطاعت و جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اپنی جان کو فروخت

① تفسیر ابن جریر (۲۴۸/۴)، مستدرک حاکم (۳/۴۰۰، ۴۹۸)

کرنے والا ہر شخص اس میں داخل ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بیعت الرضوان میں شمولیت کرنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے موت کی بیعت کی تھی۔ [بخاری ج: ۴۱۶۹، مسلم، ج: ۱۸۶۰]

یہ قول ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ: اس آیت کے نزول کا سبب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ تھے۔“

اتھویں بات: اس آیت کے الفاظ مطلق ہیں۔ اس میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر وہ انسان جو اپنے آپ کو اللہ کی رضامندی کے لیے بیچ ڈالے وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔ اور سب سے پہلے جو اس میں داخل ہونے کے بڑے حق دار ہیں وہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں پیش کر دیا تھا؛ اور اس وقت میں ہجرت کی جب دشمن ہر طرف سے آپ کی تلاش میں تھا۔

نویں بات: اس میں شبہ نہیں کہ غار میں جو فضیلت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی اس میں وہ دیگر صحابہ سے منفرد ہیں۔ کتاب و سنت اور اجماع اس پر دلالت کرتے ہیں۔ جو فضیلت آپ کے لیے ثابت ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام کے لیے بھی ثابت نہیں۔ پس اس بنا پر آپ ہی امام ہوئے۔ اسی طرح واقعہ ہجرت میں نبی کریم ﷺ کی رفاقت کا شرف بھی صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔ لہذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ برحق تھے۔ یہ وہ سچی دلیل ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ۴۰)

”اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو اللہ نے اس کی مدد کی تھی جب کفار نے ان کو نکال دیا تھا وہ دو اشخاص کا دوسرا تھا۔

جب وہ دونوں غار میں تھے اور اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اس طرح کی فضیلت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے کبھی بھی ہرگز حاصل نہیں ہو سکی۔ بخلاف اپنی جان نثار کرنے کے۔ اس لیے کہ کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے رسول اللہ ﷺ کے لیے جانثاری کا حق ادا کیا تھا۔ ہر مسلمان پر ایسا کرنا واجب ہے۔ یہ صرف اکابر صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

فضیلت خصوصیات کی بنا پر ثابت ہوتی ہے؛ مشترکہ امور کی بنا پر نہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت میں دیگر صحابہ کو جسمانی تکلیفیں پہنچی تھیں۔ کبھی ان کو مارا گیا؛ کبھی زخمی ہوئے؛ اور کئی حضرات قتل کر دیئے گئے۔ پس جو اپنی جان پیش کرے اور اسے اذیت بھی دی جائے وہ اس آدمی سے بڑھ کر ہے جو اپنی جان تو پیش کرے؛ مگر اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

علماء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو فضائل صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہیں؛ وہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشترک ہیں۔ بخلاف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے؛ آپ کے فضائل بہت زیادہ ہیں۔ اور ان میں سے اکثر صرف آپ کے ساتھ ہی خاص ہیں، ان میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے۔ یہ مسئلہ کافی تفصیل طلب ہے۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی نویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی نویں دلیل آیت مباہلہ ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ حَا جَكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَنِسَاءَنَا كُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ [آل عمران ۶۱]

”اس لیے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آ جانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں، پھر ہم عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“

جمہور کا قول ہے کہ اس آیت میں ﴿أَبْنَاءَنَا﴾ کا اشارہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی طرف ہے۔ ﴿نِسَاءَنَا﴾ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں اور ﴿أَنْفُسَنَا﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

یہ آیت امامت علی رضی اللہ عنہ کی زبردست دلیل ہے۔ اس لیے کہ آیت زیر دست میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ”نفس رسول“ قرار دیا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ رسول ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک تو ہونے لگتے۔ لہذا دونوں کی مساوات کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے قائم مقام ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر دوسرا کوئی شخص فضیلت میں ان کا ہم سر ہوتا تو اللہ اس کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم صادر کرتے، کیونکہ قبولیت دعا کے لیے ان کی ضرورت تھی جب اہل بیت سب سے افضل ہوئے تو پھر امام بھی وہی ہوں گے۔ یہ آیت اس قدر واضح ہے کہ اس کی دلالت صرف اس شخص پر پوشیدہ رہ سکتی ہے جس پر شیطان نے قبضہ جما رکھا ہو؛ اور اس کے دل کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کر لیا ہو۔ اور دنیا کو اس کیلئے محبوب بنا دیا گیا ہو؛ وہ اسے اہل حق سے ان کا حق روکے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو۔“ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)۔

جواب: جہاں تک مباہلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں بیٹوں کے لے جانے کا تعلق ہے؛ یہ صحیح

ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَنِسَاءَنَا كُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ﴾ [آل عمران ۶۱]

”آپ فرمادیں: آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں۔“

تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلا کر فرمایا: ”یا اللہ! یہ میرے گھر کے لوگ ہیں۔“^۱

مگر اس سے فضیلت اور امامت کیوں کر ثابت ہوگئی؟

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ”نفس رسول“ بنا دیا تھا۔ اتحاد محال ہے یعنی رسول ﷺ اور حضرت

علی رضی اللہ عنہ ایک تو ہونے لگتے۔ اب مساوات باقی رہ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو عام ولایت حاصل تھی؛ پس آپ کے مساوی کے

۱ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۲/۲۴۰۴)۔

لیے بھی ایسے ہی ولایت ہوگی۔“

[جواب:] ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مساوات کی علاوہ کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بلکہ اسے مساوات پر محمول کرنا ممنوع ہے، کیوں کہ کوئی بھی شخص رسول ﷺ سے مساوی نہیں ہو سکتا؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔

علاوہ ازیں ”اَنْفُسَنَا“ کا لفظ لغت میں مساوات کے لیے نہیں بولا جاتا۔ ایک کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَوْ لَا اِذْ سَبَعْتُمْوَهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِنَّ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

”اے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمان کیوں نہ کیا۔“

اس سے مومن مردوں اور عورتوں کا مساوی ہونا لازم نہیں آتا۔

نیز فرمایا: ﴿فَتَوْبُوْا اِلٰی بَارِكُمْ فَاَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِكُمْ﴾ (البقرة: ۵۴)

”اب تم اپنے خالق کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی میں ہے۔“

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ اس سے لازم نہیں آیا کہ یہ تمام لوگ آپس میں مساوی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن لوگوں نے پچھڑے کی پوجا کی تھی وہ ان لوگوں کے مساوی ہیں جنہوں نے اسے نہیں پوجا تھا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النساء: ۲۹)

”اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔“

مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ اگرچہ وہ برابر نہ بھی ہوں۔ [یہ مراد نہیں کہ وہ سب لوگ مرتبہ میں مساوی تھے۔ بخلاف ازیں ان میں بہت کچھ فرق مراتب پایا جاتا تھا]۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَلْبَسُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۱)

”اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ۔“

کوئی آپس میں ایک دوسرے پر طعنہ زنی یا ٹھٹھہ جوئی نہ کریں۔ یہ ممانعت تمام اہل ایمان کے لیے ہے۔ یعنی کوئی بھی کسی دوسرے کے ساتھ اس طرح کی عیب جوئی یا طعنہ زنی نہ کرے؛ حالانکہ تمام اہل ایمان آپس میں مساوی نہیں ہے۔ نہ ہی احکام میں اور نہ ہی فضیلت میں؛ جیسے ظالم اور مظلوم؛ اور امام اور مأموم وغیرہ۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَمَّا اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرة: ۸۵)

”لیکن پھر بھی تم نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا۔“ یعنی بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کو قتل کرنے لگے۔

جب اس آیت میں یہ لفظ: ﴿وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (ال عمران: ۶۱) ان دوسری آیات میں وارد لفظ کی طرح تھا؛ جیسا کہ ﴿وَلَا تَلْبَسُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۱) ﴿لَوْ لَا اِذْ سَبَعْتُمْوَهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِنَّ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)؛ حالانکہ یہاں پر مساوات واجب ہی نہیں بلکہ ممنوع ہے؛ ایسے ہی شیعہ مصنف کے استدلال میں بھی یہ لفظ مساوات پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ لفظ مختلف امور کی مشابہت و مماثلت پر دلالت کرتا ہے۔ مماثلت اور مشابہت بعض امور

میں اشتراک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایمان میں اشتراک؛ تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿لَوْ لَا إِذْ سَبَعْتُمْوهَ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)؛ میں یہی مراد ہے۔ اور ایسے ہی اس آیت میں بھی: ﴿وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ﴾ یہی مراد ہے۔

کبھی یہ اشتراک [ظاہر] دین میں پایا جاتا ہے؛ جب ان میں کوئی منافق بھی موجود ہو۔ جیسا کہ اسلام میں منافقین کا مسلمانوں کے ساتھ ظاہری اشتراک۔ اور اگر اس کے ساتھ نسب میں بھی اشتراک ہو تو زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ”اپنے نفوس“ اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَابْنَاتَكُمُ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ﴾ [آلعبران ۶۱]

”تو آپ فرمادیں آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی جانوں کو بلا لیں۔“

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے مردوں کو بلا لیتے ہیں اور تم اپنے مردوں کو بلاؤ۔ یعنی وہ مرد جو دین اور نسب میں ہماری جنس سے ہیں، اور وہ مرد جو تمہاری جنس سے ہیں۔ یا پھر یہاں پر بھانست سے مراد صرف قرابت ہے۔ اس لیے کہ آیت میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿أَبْنَاءَنَا وَابْنَاتَكُمُ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ﴾ [آلعبران ۶۱]

”اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو۔“

یہاں پر اولاد؛ عورتوں اور مردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قریبی رشتہ داروں کی اولاد عورتیں اور مرد اور اہل عصبہ کی اولاد مراد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا؛ مستورات میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اور مردوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ ظاہر ہے کہ عصبات میں سے نبی کریم ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، پھر آپ نے ان پر اپنی چادر بھی تان دی تھی۔ مہابلہ میں قریبی رشتہ داروں کو شامل کیا جاتا ہے، دور کے رشتہ داروں کو اگرچہ افضل ہوں تب بھی شامل نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ مراد یہ تھی کہ وہ بھی اپنے اقارب کو بلا لیں جیسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقارب کو بلایا ہے۔ انسانی نفوس قریبی رشتہ داروں پر بڑی شفقت کے پیکر ہوتے ہیں۔ ایسی شفقت غیروں کے بارے میں نہیں پائی جاتی۔ نصاریٰ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر انہوں نے مہابلہ کیا تو اس کی ساری مصیبت ان پر ہی گرے گی۔ اس وجہ سے انہیں اپنی جانوں کا اور اپنے عزیز و اقارب کا خوف لاحق ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ مہابلہ کرنے سے پیچھے ہٹ گئے۔ وگرنہ انسان پر کبھی ایسا بھی موقع آ جاتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اگر مر بھی جاؤں تو میرا بیٹا زندہ رہے۔ بوڑھی عمر کا انسان مرنے کو بھی گوارا کر لیتا ہے جب اس کے اہل و عیال و اقارب عیش و آرام میں رہ جائیں۔ اس کی مثالیں بہت ساری موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں سے مطالبہ کیا گیا کہ مہابلہ کے لیے اپنے آپ کو اپنے بیٹوں کو؛ اپنی عورتوں کو اور قریبی مرد رشتہ داروں کو بلا لیں۔

آیت مہابلہ ۱۰ھ میں وفد نجران کے وارد مدینہ ہونے پر نازل ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباس اس وقت زندہ تھے، باقی چچا سب فوت ہو چکے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو سبقت اسلام حاصل تھی اور نہ آپ کے ساتھ کوئی

اور خصوصیت تھی جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت تھی۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا زادوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا کوئی بھی نہ تھا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اس سے پہلے سن آٹھ ہجری میں غزوہ موئتہ میں شہید ہو چکے تھے۔

ان لوگوں کا متعین ہونا اس وجہ سے تھا کہ نبی کریم ﷺ کے اقارب میں کوئی بھی اور ایسا نہیں تھا جو ان کے قائم مقام ہو سکتا۔ مگر اس سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ یہ کسی بھی چیز میں رسول اللہ ﷺ کے مساوی تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اس وجہ سے آپ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علی الاطلاق افضل ہوں۔ بلکہ مہابلہ کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ اور یہ فضیلت بھی حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے مابین مشترک ہے۔ یہ امامت [ولایت] کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ امامت کے خصائص عورتوں کے لیے ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور اس کا تقاضا یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کو مہابلہ کے لیے ساتھ لینے کی وجہ سے آپ باقی تمام صحابہ کرام سے افضل ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے یہ بھی واجب نہیں ہوا کہ حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم باقی تمام صحابہ سے افضل ہو جائیں۔

[آیت مہابلہ سے استدلال]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”اگر کوئی اور شخص اہل بیت کے مساوی ہوتا یا اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا کی قبولیت میں ان سے افضل ہوتا؛ تو آپ اس کو بھی مہابلہ میں شریک کر لیتے۔ اس لیے کہ یہ ضرورت کا دقت تھا۔“

[جواب]: یہاں پر اجابت دعا مقصود نہ تھی۔ ورنہ اکیلے رسول اللہ ﷺ کی دعا ہی اس مقصد کے لیے کافی ہوتی۔ اگر ان لوگوں کو ساتھ لینے سے مراد استجاب دعا ہوتی تو نبی کریم ﷺ تمام اہل ایمان کو ساتھ بلا لیتے؛ اور ان کے ساتھ مل کر دعا کرتے۔ جیسا کہ نماز استسقاء کے لیے انہیں ساتھ لیکر دعا فرمایا کرتے تھے۔ اور پھر فقراء مہاجرین سے فتح کی دعا کروایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے:

”کیا تم مدد کیے جاتے ہو اور دردزی دیئے جاتے ہو مگر تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے؛ ان کی دعاؤں ان کی نمازوں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔“

یہ بات سب کو پتہ تھی کہ یہ لوگ مستجاب الدعوات ہیں۔ دعا میں زیادہ کثرت ہونے سے قبولیت کے امکان زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں پر مقصود یہ نہیں تھا کہ کسی کو اس کے مستجاب الدعوات ہونے کی وجہ سے بلایا گیا ہے۔ بلکہ اہل خانہ اور اہل خانہ کے مقابلہ کے طور پر بلایا گیا تھا۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر و عمر عثمان و علی؛ طلحہ و زبیر؛ ابن مسعود اور ابی بن کعب؛ یا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اور دیگر کبار صحابہ کو اس مقصد کے لیے طلب کرتے تو یہ سب لوگ تعمیل ارشاد کے لیے حاضر تھے، اور ان حضرات کی دعا بھی اجابت میں زیادہ بلیغ [اثر رساں] ہوتی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا حکم نہیں دیا تھا؛ اس لیے آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ اس سے مہابلہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نجران کے نصاریٰ اپنے ان اقارب و اعزہ کو مجلس مہابلہ میں لا رہے تھے جن پر فطری طور پر ان کے دل میں شفقت تھی؛ جیسے کہ ان کے بیٹے؛ عورتیں اور اپنے قریب ترین رشتہ دار مرد۔ اگر نبی کریم ﷺ اجنبی لوگوں کو بھی اس

میں آنے کی دعوت دیتے تو نصاریٰ بھی ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسے اجنبی اشخاص کی معیت میں مباہلہ میں شرکت کرنا ان پر کچھ بھی شاق نہ گزرتا جس طرح اقارب کے ہوتے ہوئے ان پر گراں گزر سکتا تھا۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ اقارب کی تکلیف کا احساس اس سے خائف و ہراساں رکھتا ہے اجانب کا الم ورنج اسے اس قدر پریشان نہیں کر سکتا۔

جب کسی قوم سے مصالحت کرنا مقصود ہو تو ہر فریق دوسرے سے کہتا ہے کہ اپنے بیوی بچے ہمارے یہاں رہن رکھ دو۔ اس کے برخلاف اگر وہ کچھ اجنبی لوگوں کو ان کے پاس گروی رکھ دیں تو وہ اس پر رضا مند نہیں ہوں گے۔ ایسے ہی اگر رسول اللہ ﷺ اجنبی لوگوں کو بلالائے تو فریق مخالف اس پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ کسی شخص کے اہل بیت ہونے کا یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی نسبت افضل ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اس آیت مبارکہ میں اصل میں رافضی کے مطلب کی کوئی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن یہ رافضی اور اس کے امثال جن کے دلوں میں کبھی پائی جاتی ہے؛ ان نصاریٰ کی طرح ہیں جو کہ مجمل الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور صریح نصوص کو ترک کر دیتے ہیں۔ پھر اپنے اس جھوٹے گمان کی بنیاد پر امت کے بہترین لوگوں میں قدح کرنا؛ اور ”افس“ کے لفظ سے مساوات مراد لینا یہ لغت عرب کے بھی خلاف ہے۔

دوسری بات جس سے معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ ”نساء نا“ یعنی ”ہماری عورتیں“ کا لفظ صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس میں دوسری بیٹیاں بھی اسی منزلت پر ہیں۔ لیکن اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں؛ جب کہ ام کلثوم؛ زینب اور رقیہ رضی اللہ عنہا پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر نبی کریم کی دوسری بیٹیاں بقید حیات ہوتیں تو آپ ان کو مباہلہ میں ضرور شریک کرتے۔

ایسے ہی ”افسنا“ کا لفظ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ یہ جمع کا صیغہ ہے؛ جیسا کہ ”نساء نا“ میں جمع کا صیغہ ہے۔ ایسے ہی ”ابناء نا“ بھی جمع کا صیغہ ہے۔ جب کہ آپ نے صرف حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا تھا؛ اس لیے کہ ان کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جسے آپ کا بیٹا کہا جاسکتا ہو۔ اگر آپ کا بیٹا ابراہیم اس وقت موجود بھی تھا تو وہ اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ اسے بلایا نہیں جاسکتا تھا؛ [اگر وہ جانا پہچانا ہوتا تو آپ اسے بھی مجلس مباہلہ میں ضرور لاتے]۔ ابراہیم ماریہ قبیلہ سے پیدا ہوا تھا؛ جو مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ کو ہدیہ میں بھیجی تھی۔ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کیلئے ایک خچر؛ حضرت ماریہ؛ اور حضرت سیرین ہدیہ بھیجے تھے۔ سیرین آپ نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دی۔ جب ماریہ اپنے لیے رکھی۔ ان سے ابراہیم پیدا ہوا؛ جو کہ تقریباً ایک سال کی عمر پا کر وفات پا گیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

”اس کے لیے جنت میں ایک دووہ پلانے والی مقرر کی گئی ہے جو اس کی مدت رضاعت پوری کرے گی۔“

مقوقس کی طرف سے یہ ہدیہ صلح حدیبیہ؛ بلکہ غزوہ حنین کے بعد آئے تھے۔ ❁

❁ [ان دلائل و براہین کی روشنی میں شیعہ کو چاہیے کہ وہ نصوص صریحہ کو نظر انداز کر کے مجمل الفاظ کا سہارا نہ لیں اور نہ کسی کو رسول کریم ﷺ کا ہم سر و ہم پلہ قرار دیں۔ اسی طرح اگر نبی کریم ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو وہ بھی مباہلہ میں ضرور شرکت کرتے۔] [الدرای]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرة: ۳۷)

”آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کیے اور ان کے ذریعہ توبہ کی۔“

فقیر ابن المغازلی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ ان ”کَلِمَاتٍ“ سے کیا مراد ہے جو حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے سیکھے تھے اور ان پر توبہ قبول کی تھی؟ تو آپ نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام نے بخت محمد و علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم اپنے گناہ کی بخشش چاہی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ گناہ معاف کر دیا۔“ پس اس سے معلوم ہوا کہ آپ ہی امام ہوں گے اس لیے کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں توسل حاصل کرنے میں نبی ﷺ کے ساتھ برابر ہیں۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ صرف ابن مغازلی کے روایت کر لینے کی بنا پر کسی روایت سے احتجاج کرنا جائز نہیں ہو جاتا۔

دوسرا جواب: اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ [ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت اللہ و رسول پر بدترین جھوٹ ہے۔ اور روافض اس کی صحت ثابت نہیں کر سکتے]۔ محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”الموضوعات“ میں امام دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الافراد الغرائب“ میں ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ روایت بیان کرنے میں عمرو بن ثابت منفرد ہے۔ اس نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے؛ وہ ابوالمقدام سے روایت کرتا ہے۔ ابوالمقدام حسین الاشقر یہ روایت بیان کرنے میں منفرد ہے۔

یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عمرو بن ثابت ثقہ اور مأمون نہیں ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ثقہ راویوں سے موضوع روایتیں بیان کیا کرتا ہے۔

تیسرا جواب: جو کلمات حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سیکھے تھے؛ قرآن کریم میں خود اس کی تفسیر مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الاعراف: ۲۳)

”دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا برا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

بعض سلف سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے؛ اور کچھ اس کے مشابہ تفاسیر بھی ہیں۔ لیکن اس شیعہ نے جو تفسیر وسیلہ کی ذکر کی ہے اس کی کوئی بھی سند ثابت نہیں ہے۔

چوتھا جواب: یہ ایک بدیہی بات ہے کہ توبہ کرنے میں حضرت آدم علیہ السلام کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ جب کوئی کافر و فاسق بھی اللہ کے حضور میں توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے؛ چاہے وہ اللہ کی بارگاہ میں کسی کا وسیلہ دے یا نہ دے۔ تو پھر

حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کرنے میں کسی ایسی چیز کی ضرورت کیونکر ہو سکتی ہے جس کی ضرورت کسی عام گنہگار کو بھی نہ ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر؟ ایک جماعت سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی تھی؛ تو اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ اور منصور کے مابین جو حکایت نقل کی گئی ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ اگرچہ یہ روایت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الشفاء“ میں نقل کی ہے۔

پانچواں جواب: نبی کریم ﷺ نے بھی کسی کو یہ کلمات پڑھ کر توبہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کسی کو بھی یہ حکم نہیں دیا کہ وہ توبہ کرتے ہوئے یا دعا میں اس طرح کے الفاظ استعمال کرے۔ اور نہ ہی آپ نے اپنی امت کے لیے یہ مشروع کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کا واسطہ یا قسم دیکر سوال کریں۔ اگر ایسی دعا مشروع ہوتی تو آپ ﷺ اپنی امت کو اس سے ضرور آگاہ فرماتے۔

چھٹا جواب: اللہ تعالیٰ کو ملائکہ یا انبیاء کرام علیہم السلام کی قسم یا وسیلہ دینے کی کوئی بھی دلیل کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ کئی ایک بڑے علماء کرام رحمہم اللہ جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ نے فتویٰ دیا ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کی قسم دینا جائز نہیں۔“ ہم اپنے موقع پر اس کی اچھی طرح وضاحت کر چکے ہیں۔

ساتواں جواب: [ماں لیجے کہ] اگر ایسا کرنا مشروع ہی تھا؛ تو حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ہیں۔ تو پھر آپ اللہ کو کسی ایسے کا وسیلہ کیونکر دیتے آپ خود جس سے افضل ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں؛ حضرت آدم علیہ السلام حضرت علی؛ وفاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔

آٹھواں جواب: [اگر اس کو ہم تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی] یہ ائمہ کی خصوصیت نہ ہوئی؛ اس لیے کہ یہ فضیلت تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی ثابت ہے۔ جب کہ ائمہ کی خصوصیات عورتوں کے لیے ثابت نہیں ہوتیں۔ اور جو چیز ان کی خصوصیات میں سے نہ ہو؛ اس سے امامت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ یہ لازم ہے کہ امامت کی دلیل مدلول کے ساتھ لازم و ملزوم ہو۔ اگر یہ روایت امامت کی دلیل ہو سکتی ہے تو پھر جو بھی اس تعریف کے دائرہ میں آتا ہو وہ امامت کا مستحق ہوگا؛ حالانکہ نص و اجماع کی روشنی میں عورت امامت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں دلیل:

[اشکال]: شیخ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ (البقرة: ۱۲۳)

”بیٹک میں آپ کو پیشوا بنانے والا ہوں“ فرمایا: اور میری اولاد میں سے۔“

فقہ ابن المغازی شافعی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”یہ دعا مجھ پر اور علی پر پہنچ کر ختم ہوگئی، ہم میں سے کسی نے بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ نے مجھے نبی اور علی کو وصی بنایا۔“ یہ دلیل اس بات میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔“ [شیخ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم اس حدیث کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

دوسری وجہ: یہ حدیث بالاتفاق اہل علم محدثین جھوٹی ہے۔

تیسری وجہ: رافضی کا یہ قول کہ: ”یہ دعا ہم تک پہنچ کر ختم ہوگئی“ ایسا کلام ہے جس کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دعا اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی کو نہیں پہنچی تو ایسا کہنا غلط ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام گزرے ہیں وہ اس دعا میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۚ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ۖ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمُ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ﴾ [الأنبياء ۷۲-۷۳]

”اور ہم نے اسے اسحاق و یعقوب اس پر مزید عطا فرمایا اور ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا۔ اور ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہبری کریں اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے کرنے اور نمازوں کے قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی (تلقین) کی۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ﴾ [الإسراء ۲]

”ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنا دیا۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ [السجدة ۲۴]

”اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۚ وَنُكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ [القصص ۶۵]

”پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں زمین میں بید کمر کر دیا گیا تھا، اور ہم انہیں کو پیشوا اور (زمین) کا وارث بنائیں۔“

قرآن کریم میں کئی ایک نصوص ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں کئی امتیں گزر چکی ہیں۔

اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دعا ”یہ دعوت ہم پر ختم ہوگئی ہے“ ہمارے بعد کسی کو نہیں پہنچی گی تو اس سے لازم آیا کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور ان کے بعد باقی اماموں کی امامت درست نہ ہوگی۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بت کو سجدہ

نہیں کیا تو ان کے بعد امت کے سارے لوگوں میں بھی یہ علت موجود ہیں۔

چوتھی وجہ: کسی شخص کا بتوں کو سجدہ نہ کرنا ایسی فضیلت ہے جس میں وہ تمام لوگ شریک ہیں جو اسلام کے بعد پیدا ہوئے۔ حالانکہ سابقین اولین ان لوگوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ تو پھر فاضل کو چھوڑ کر مفضل کو یہ درجہ کیوں دیا جا رہا ہے؟

پانچویں وجہ: اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے بتوں کو اس لیے سجدہ نہیں کیا کہ آپ بلوغ کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اسلام لے آئے تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد آپ نے بتوں کو سجدہ نہ کیا۔ تو سب مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ بچے غیر مکلف ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اسلام لانے سے قبل کبھی بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ تو پھر یہ نفی غیر معلوم ہے۔ اور نہ ہی اس کی خبر دینے والے کوئی ثقہ آدمی ہے۔

نیز [اس جواب میں] ان [شیعہ] سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ انسان جس نے کفر نہ کیا ہو یا کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو وہ اس انسان سے مطلقاً افضل ہو جائے گا جس نے کفر یا کبیرہ گناہ کے بعد اس سے توبہ کر لی ہو۔ بلکہ قرآنی دلائل کی روشنی میں بیشتر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گناہ یعنی کفر و فسق اور معاصی سے توبہ کرنے والا اس انسان سے افضل ہوتا ہے جس نے کفر یا گناہ کا ارتکاب ہی نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فتح سے پہلے اسلام لانے والوں؛ جہاد کرنے والوں اور اس کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو ان لوگوں پر بہت بڑی فضیلت دی ہے جنہوں نے فتح کے بعد اسلام قبول کیا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؛ اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ یہ تمام لوگ کفر کے بعد اسلام لائے تھے۔ اور ان بعد میں اسلام لانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی تھی۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے سابقین اولین کو تابعین پر فضیلت دی ہے۔ جب کہ تابعین وہ لوگ ہیں جو اکثر اسلام پر پیدا ہوئے اور سابقین اولین میں اکثر وہ لوگ ہیں جو کفر کے بعد اسلام لائے تھے۔ [تو کیا جنہوں نے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، تو کیا وہ بھی امام ٹھہریں گے؟ بخلاف ازیں عام صحابہ جو بتوں کے پجاری رہ چکے تھے وہ اپنی اولاد سے بالاتر افضل ہیں]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے حالانکہ وہ نبوت سے سرفراز تھے۔ [ایسے ہی] حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهُ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا﴾ (الاعراف: ۸۹)

”ہم تو اللہ تعالیٰ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آجائیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں، لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے مقدر کیا ہو۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾ [ابراہیم ۱۳]

”کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمہیں ملک بدر کر دیں گے یا تم پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔“

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے سلوک کے متعلق خبر دی ہے۔ اور پھر ان کی توبہ کی خبر بھی دی ہے۔ یہی وہ بارہ گروہ تھے جن کے بارے میں ہمیں سورت بقرہ اور آل عمران میں حکم دیا گیا ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لائیں۔

ان میں سے کوئی ایک بعد میں نبی بھی ہوا ہوگا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام دوسرے لوگوں کی نسبت افضل ہوا کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں رافضہ کا دوسرے لوگوں کے ساتھ اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس سے کسی گناہ کا صدور ہوا ہو تو وہ نبی نہیں بن سکتا۔ اور جو لوگ اسلام لائے ہیں ان کے بارے میں بھی بہت بڑا اختلاف ہوا ہے۔ لیکن معتبر وہی چیز ہوگی جس پر کتاب و سنت سے دلائل موجود ہوں گے۔ جو لوگ اس سے منع کرتے ہیں ان کے مذہب کی اساس اس عقیدہ پر ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ناقص اور مذموم ہوتا ہے اس لیے وہ نبوت کا مستحق ہرگز نہیں ہو سکتا؛ بھلے وہ لوگوں میں سے سب سے بڑا عبادت گزار بن جائے۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ جس میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ کتاب و سنت اور اجماع اس قول کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارہویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی بارہویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾ (مریم: ۹۶)

”بیٹک جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمن محبت پیدا کر دے گا۔“

حافظ ابو نعیم الاصفہانی رحمہ اللہ اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی: ”وُدًّا“ سے وہ الفت و محبت مراد ہے جو مومنوں کے دلوں میں موجود ہو۔ تفسیر ثعلبی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”اے علی! آپ کہہ دیں کہ اے اللہ! میرے لیے اپنے پاس عہد مقرر کر دے اور مومنوں کے دلوں میں میری محبت پیدا

کر دے۔“ تب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾

چونکہ یہ خصوصیت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں بیان کردہ روایت کی صحت نقل ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، ورنہ مقدمات کو ثابت کیے بغیر استدلال کرنا باطل اور قول بلا برہان ہے۔ اور انسان کو اس بات کے کہنے سے یا استدلال کرنے سے روکا گیا ہے جس کا اسے کوئی علم نہ ہو۔ باتفاق شیعہ دلائل سنت مذکورہ بالا نسبت روایت کے ثابت ہونے کا فائدہ نہیں دیتی۔ دوسری وجہ: مزید براں شیعہ مصنف کی پیش کردہ دونوں روایتیں باتفاق محدثین و اہل علم موضوع ہے۔

تیسری وجہ: نیز یہ کہ آیت زیر نظر: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ کے الفاظ تمام اہل ایمان کے لیے عام ہیں۔ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شامل ہے اور دیگر صحابہ کو بھی۔ لہذا اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محدود و مقصور کرنا درست نہیں۔ بلکہ شیعہ جن کی تعظیم کرتے ہیں یہ آیت ان کو بھی یعنی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بھی شامل ہے۔ لہذا اس سے معلوم ہو کہ اہل سنت و شیعہ کا اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”چونکہ یہ خصوصیت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔“

ایسا کہنا بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ بیشک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خیر القرون کے لوگ ہیں۔ ان ادوار میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وہ باقی تمام زمانوں میں ایمان لانے والوں سے افضل ہیں۔ اور وہ اس اعتبار سے ہر دور کے لوگوں سے اکثر و افضل ہیں۔

چوتھی وجہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمن محبت پیدا کر دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ [اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا اس لیے اس نے قلوب مومنین میں محبت پیدا کرنے کے وعدہ کو پورا کر دیا ہے] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کے دلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عموماً اور خلفاء راشدین کی محبت اور ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت و الفت بطور خاص پیدا کر دی۔ عام صحابہ..... جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے..... اور تابعین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے محبت و الفت رکھتے تھے۔ یہ خیر القرون کے لوگ تھے۔ [کوئی صحابی ایسا نہ تھا جو ان دونوں حضرات کو برا بھلا کہتا ہو]۔

یہ خصوصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ میں نہیں پائی جاتی؛ اس لیے کہ صحابہ کی ایک جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نالاں اور شاکی رہتی اور انہوں نے حضرت کی شان میں سخت و ست الفاظ کہے تھے اور آپ سے برسر پیکار رہتے تھے ❶۔ جبکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنے والے اور ان پر سب و شتم کرنے والے صرف رافضہ، نصیریہ اور غالیہ اسماعیلیہ ہیں اور یہ بات بھی

❶ یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین اس چپقلش کا ذکر ہو رہا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان مخصوص حالات کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ حاشاء و کلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت علی سے لڑتے بھڑتے یا گالیاں دیتے ہوں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت و رفاقت کے لیے بہترین لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے باہم شیر و شکر کر دیا تھا۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ كُذِّبَتْ الْيَمَانَةُ عَلَىٰ عِلْمِكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَهْدَىٰ ۖ قَالَتْ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصِبَةٌ ۖ فَفِي غَمٍّ ۖ وَنَحْنُ نَحْنُ ۖ﴾ [آل عمران ۱۰۳]

”اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

اور سورت فتح کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے آپس میں شیر و شکر ہونے پر تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مابین جو کچھ واقعات پیش آئے اصل میں وہ ان بلوائیوں کی سازش کا نتیجہ تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود صحابہ کرام بشریے؛ اور ان سے نفوس بشری کی تحت ہونے والی کوتاہیوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے آپس میں سخت و درشت کلام اور باہمی جھگڑوں کو بھی ایک دوسرے کے گناہوں کا کفارہ بنادیں گے اور یہ سب لوگ بھینا جلتی ہیں۔ ایسے واقعات کی وجہ سے کسی بھی صحابی کی شان میں تنقیص کرنا اور دوسرے کی محبت میں غلو کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ [دراوی؛ کشمیری]

معلوم شدہ ہے کہ جو لوگ ان دو حضرات سے محبت رکھتے تھے وہ بغض رکھنے والوں کی نسبت سے افضل اور تعداد میں اکثر تھے۔ جو لوگ ان سے بغض رکھتے تھے وہ اسلام سے بہت زیادہ دور اور تعداد میں بہت ہی کم تھے۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جنہوں نے آپ سے جنگ کی اور آپ سے ناراض ہو گئے تھے؛ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنے والوں کی نسبت بہت ہی افضل تھے۔ بلکہ وہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں وہ بھی ظالم اور بدعتی ہونے کے باوجود ان سے افضل ہیں۔

پس وہ شیعان علی رضی اللہ عنہ جو حضرت سے محبت رکھتے ہیں اور جناب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں؛ وہ علم و دین میں کم تر اور ظلم و جہالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر و عمرو عثمان رضی اللہ عنہما کی جو محبت پیدا کر دی تھی۔ دوسروں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رب اور نبی ہونے کا دعویٰ بھی کیا گیا ہے۔“

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام خوارج کا فر کہتے ہیں؛ مروانیہ آپ سے بغض رکھتے ہیں؛ حالانکہ یہ لوگ ان رافضیوں سے بہت بہتر و افضل ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھتے ہیں اور انہیں گالیاں دیتے ہیں؛ غالیہ کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ [جس طرح خوارج کے کافر کہنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان میں فرق نہیں پڑتا؛ ایسے ہی غالیہ اور اسماعیلیہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب یا نبی ماننے سے بھی آپ کی صحابیت اور بشریت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیرہویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیرہویں دلیل یہ آیت ہے: ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد: ۷)

”بات یہ ہے کہ آپ تو صرف آگاہ کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ہادی ہے۔“

”کتاب الفرووس میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”میں منذر [ڈرانے والا] ہوں اور علی ہادی

رہنما و پیشوا) ہے۔ اے علی! ہدایت پانے والے تجھ سے ہدایت پاتے ہیں۔“ ابو نعیم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے یہ

حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام اور خلیفہ ہونے کی صریح دلیل ہے۔ [بھی کام الرافضی]۔

جواب: اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: شیعہ نے اس روایت کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی؛ لہذا اس سے احتجاج جائز نہیں۔ دلیلی کی

کتاب الفرووس موضوعات کا پلندہ ہے۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی روایت کے کسی کتاب میں مندرج ہونے کا یہ

مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے۔ ایسے ہی ابو نعیم کا کسی روایت کو نقل کر لینا اس کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

دوسری بات: باتفاق محدثین و اہل علم یہ روایت جھوٹی اور من گھڑت ہے۔ اس کی جھٹلانا اور رد کرنا واجب ہے۔

تیسری بات: یہ ان قبیح ترین روایات میں سے ہے جن کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں۔

اس روایت میں یہ قول کہ: آپ نے فرمایا: ”میں منذر [ڈرانے والا] ہوں اور علی ہادی (رہنما و پیشوا) ہے۔ اے علی!

ہدایت پانے والے تھے سے ہدایت پاتے ہیں۔“ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہادی قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ نبی کریم ﷺ کی بجائے ان سے ہدایت پاتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مسلمان اسے زبان پر لانے کے لیے تیار نہیں۔ اس روایت کے ظاہر سے لگتا ہے کہ ڈرانے کا اور ہدایت دینے کا کام ان دونوں حضرات کے مابین تقسیم کر دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ صرف ڈرانے والے ہیں؛ ان سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہدایت ملتی ہے۔ ایسی بات کوئی بھی مسلمان اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا۔

چوتھی وجہ: اللہ تعالیٰ نے نص قرآنی کی بنا پر صرف سرور کائنات ﷺ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۚ صِرَاطِ اللَّهِ﴾ (الشوری: ۵۲)

”بلاشبہ آپ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جو کہ اللہ کی راہ ہے۔“

پھر جس کی یہ صفت اللہ نے بیان کی ہو؛ اسے چھوڑ کر کسی ایسے کو ہادی کیوں مانا جاسکتا ہے جس میں یہ وصف موجود نہ ہو؟ پانچویں وجہ: شیعہ کا قول کہ ”ہدایت یافتہ لوگ آپ (حضرت علی) سے راہ پاتے ہیں۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت محمد ﷺ میں سے جس مسلمان نے بھی ہدایت پائی اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہی پائی۔ یہ واضح جھوٹ ہے اس لیے کہ لا تعداد لوگ سرور کائنات ﷺ سے ہدایت پا کر جنت کے وارث بنے؛ اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک لفظ تک نہیں سنا۔ اکثر لوگ جو ایمان لائے تھے ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کچھ بھی کردار نہیں۔ جب بیرونی بلاد و امصار فتح ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا اور ان سے فیض ہدایت حاصل کیا۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صورت تک بھی نہیں دیکھی؛ اس لیے کہ آپ ان دنوں مدینہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ جمہور اہل اسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی نہیں سنا؛ تو پھر شیعہ کا دعویٰ کیوں کر درست ہو سکتا ہے کہ ہدایت پانے والے آپ سے پاتے ہیں؟

چھٹی وجہ: یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول: ”بیشک آپ ڈرانے والے ہیں؛ اور ہر قوم کو ہدایت دینے والا ہوتا ہے“ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔ اور ایسے ہی جن لوگوں نے یہ تفسیر کی ہے: آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کو ہدایت دینے والے ہیں۔ یہ بھی ضعیف قول ہے۔ اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ: بیشک آپ ڈرانے والے ہیں؛ جیسا کہ آپ سے پہلے ڈرانے والے بھیجے گئے تھے۔ اور ہر امت میں ڈرانے والا ہوتا ہے جو انہیں ہدایت کی راہ دکھاتا ہے؛ یعنی خیر کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝﴾ [فاطر ۲۴]

”اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرسانے والا نہ گزرا ہو۔“

مفسرین کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت جیسے حضرت قتادہ؛ عکرمہ؛ ابو الفحی؛ اور عبدالرحمن بن زید کا یہی قول ہے۔

نیز یہ کہ اس آیت کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کرنا؛ محض باطل ہے۔ اس لیے کہ ارشاد باری ہے: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ [جملہ اقوام عالم کے بارے میں فرمایا گیا ہے] اس کا تقاضا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی ہادی ہو؛ بعد میں آنے والوں کے لیے کوئی ہادی ہو۔ یعنی متعدد لوگ ہدایت کی راہ دکھانے والے ہوں۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اولین و آخرین سب کے لیے ہادی کیسے

بنایا جاسکتا ہے؟

ساتویں وجہ: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کسی سے ہدایت حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ امام و خلیفہ بھی ہو۔ جیسا کہ علماء کرام سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

((أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم)) [رواہ ابن عبد البر و الآجري في الشريعة؛ وهو ضعيف]

”میرے صحابہ کرام ستاروں کی مانند ہیں؛ ان میں جس کی بھی اقتداء کرو گے؛ تم ہدایت پا لو گے۔“

اس میں کہیں بھی امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہذا شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ باطل ہے۔

آٹھویں وجہ: ارشاد ربانی: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ میں لفظ ”ہَادٍ“ نکرہ لایا گیا ہے۔ یہ کسی متعین شخص پر دلالت نہیں کرتا۔ پس اس آیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات کا دعویٰ کرنا باطل ٹھہرا۔ اور حدیث سے استدلال کرنا قرآن سے استدلال کی طرح نہیں ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں پیش کی جانے والی احادیث بھی باطل ہیں۔

نویں وجہ: ارشاد ربانی: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ﴾ میں عموم کا صیغہ ہے۔ اگر اس مراد یہ لی جائے کہ تمام لوگوں کیلئے صرف ایک ہی ہدایت کی راہ دکھانے والا ہے تو سارے لوگ ہادی ہوئے۔ اور یہ نہ کہا جاتا کہ ہر قوم کے لیے ہادی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اقوام [زمانہ و جگہ کے اعتبار سے] مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا گیا کہ تمام اقوام کے لیے ہادی ہیں۔ اور ایسا کہا بھی نہیں جاسکتا۔ بلکہ لفظ ”کل“ کو نکرہ کی طرف مضاف کیا ہے؛ معرفہ کی طرف نہیں کیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

”تمام لوگ جانتے ہیں کہ وہاں پر کچھ اقوام ہیں؛ اور اقوام متعدد ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک قوم کو کوئی ایسا راہ دکھانے والا ہوتا ہے جو کہ دوسری قوم میں نہیں پایا جاتا۔“

اس سے ان لوگوں کا قول باطل ہو گیا جو کہتے ہیں کہ ہادی سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور ایسے ہی ان لوگوں کے قول کا باطل ہونا بھی صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چودھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چودھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَقَفُّوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ﴾ (الصافات: ۲۴)

”انہیں ٹھہراؤ؛ بیشک ان سے سوال کیا جائے گا۔“

ابو نعیم بطریق شعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کر کے اس آیت: ﴿وَقَفُّوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ﴾ کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ: ”لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت و امارت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“

اسی طرح کتاب الفردوس میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ: ”بروز قیامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔“

جب آپ کی ولایت کے بارے میں سوال کیا جانا ہے تو اس سے واجب ہوتا ہے کہ آپ کی ولایت و امامت حقیقت

میں بھی ثابت ہو۔ یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کے لیے ثابت نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں گے۔“ (شیعہ کا بیان ہوا)

جواب: اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ محض دیلمی یا ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے سے روایت قابل حجت نہیں ہو جاتی۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے۔

دوسری بات: اس روایت کے من گھڑت اور جھوٹ ہونے پر علماء کرام کا اتفاق ہے۔

تیسری بات: شیعہ کا یہ جھوٹ آیت ہذا کے سیاق سے معلوم ہو جاتا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَحْشَرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۚ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَاهْذَوْهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۚ وَقَفَّوْهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ ۚ مَا لَكُمْ لَا يَتَنَاصَرُونَ ۚ بَلْ هُمْ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ۝﴾

”اٹکھا کرو ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا۔ پھر انہیں جہنم کی راہ کی طرف لے چلو۔ اور انہیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔ تمہیں کیا ہوا، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ بلکہ آج وہ بالکل فرماں بردار ہیں۔“ [الصافات ۲۲-۲۶]

اس آیت کریمہ میں خطاب کفار قریش سے متعلق ہے جو کہ آخرت کے دن کو جھلاتے تھے۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ اس میں ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ مشرک اور کافر ہوتے ہوئے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھیں گے تو انہیں اس کا کوئی فائدہ پہنچے گا؟ یا پھر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض ہے؛ تو اس بغض کو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے بغض اور کتاب اللہ اور دین الہی سے بغض کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ اللہ کی پناہ! کہ کتاب الہی کو ایسے غلط معنی پہنائے جائیں۔ کوئی یہ کہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ تفسیر کی ہے؛ ایسی بات تو صرف کوئی زندیق اور لحد ہی کہہ سکتا ہے جس نے دین کو کھلوڑ بنالیا ہو اور وہ اسلام پر طعنہ زنی کرنا چاہتا ہو۔ یا پھر وہ انسان جو انتہائی سخت جہالت کا شکار ہو۔ اور اسے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ و زہیر، سعد ابو بکر، عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی محبت کے مابین آخر ایسا کون سا فرق پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو اس کا یہ قول ان لوگوں کے قول کی نسبت زیادہ غلط نہیں ہوگا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیے جانے کے دعویدار ہیں۔ نیز آیت میں بھی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی روشنی میں ان لوگوں کے قول کا راجح ہونا ظاہر ہو۔ بلکہ [اس تفسیر کی روشنی میں] یہ آیت ان دونوں حضرات کے محبت کے ثبوت یا نفی پر برابر دلالت کرتی ہے۔ جب کہ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت واجب ہونے کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔

چوتھی بات: [آیت کریمہ میں وارد لفظ 'مَسْؤُلُون' مطلق ہے؛ اس کی ضمیر کا صلہ کسی بھی چیز کیساتھ منحصر نہیں۔ اور اس کے سیاق میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت پر دلالت کرتی ہو۔ پس اس آیت کو لے کر مدعی کا دعویٰ کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا یہ بہت بڑا جھوٹ و بہتان اور باطل کلام ہے۔

پانچویں بات: اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ لوگوں سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا؛ تو اس کا دعویٰ کسی طرح بھی باطل نہیں کیا جاسکتا؛ مگر اس کے ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے سوال کا دعویٰ بھی فی الفور ہی پوری قوت کے ساتھ باطل ہو جائے گا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پندرھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: "امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پندرھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰)

"اور یقیناً تو انہیں ان کی بات کے ڈھب سے پہچان لے گا۔"

ابونعیم اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ سے بغض علی مراد ہے۔ یہ خصوصیت دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وجہ سے ان سے افضل ٹھہرے؛ تو پھر آپ ہی امام ہوں گے۔" [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

جواب: پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں کہ اہل علم محدثین جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ پر افتراء ہے۔

تیسری بات: اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا؛ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف کسی ایک صحابی کا قول؛ جب کہ باقی صحابہ اس کی مخالفت کر رہے ہوں تو حجت نہیں ہو سکتا۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ حالانکہ بہت سارے صحابہ کرام کے متعلق یہ بھی معلوم ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کیا کرتے تھے۔ ان پر بھی حجت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے قول سے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ کتاب و سنت سے ہوتی ہے۔

چوتھی بات: ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ عام منافقین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت میں مبتلا نہ تھے۔ پھر اس آیت کی ان الفاظ میں تفسیر کرنا ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

پانچویں بات: پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کفر کی دشمنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق سے زیادہ نہ تھے۔ بلکہ کفار و منافقین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے شدید عداوت رکھتے تھے۔ اور جتنی تکلیف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کافروں کو پہنچتی تھی ایسی تکلیف کسی دوسرے سے نہیں پہنچتی تھی۔ بلکہ ہمیں کسی ایک کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا جس سے کفار اتنی

تکلیف پاتے ہوں اور اس سے بغض رکھتے ہوں۔

چھٹی بات: صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”منافق کی علامت انصار سے بغض ہے اور ایمان کی علامت انصار سے محبت ہے۔“^①

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

”ابسا آدمی انصار سے بغض نہیں رکھے گا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔“^②

منافقین کو انصار کے بغض کی وجہ سے اپنے کلام میں کجی کی بنا پر پہچان لیے جانے کی تفسیر زیادہ اولیٰ ہو سکتی ہے۔

اس باب میں سب سے صحیح روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ مجھ سے مومن ہی محبت کرے گا اور مجھ سے بغض منافق ہی

رکھے گا۔“ [صحیح مسلم ج: ۱، ص: ۲۴۲]

یہ حدیث روایت کرنے میں امام مسلم رحمہ اللہ منفرد ہیں؛ آپ نے یہ روایت عدی بن ثابت سے نقل کی ہے؛ وہ زربن حبش سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے اعراض کیا ہے۔ بخلاف انصار کے فضائل کی احادیث کے۔ ان احادیث پر تمام اہل صحاح کا اتفاق ہے۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یقینی طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے؛ کیونکہ بعض لوگوں کو ان روایات میں شک گزرا ہے۔

ساتویں بات: نفاق کی بہت سی علامات ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”منافق کی تین نشانیاں ہیں جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے جب امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب

وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔“ [صحیح بخاری ج: ۱، ص: ۲۵۲۳]

یہ نشانیاں صاف ظاہر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقت کی نشانیاں کسی شخص یا کسی گروہ کی محبت و نفرت کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ان نشانیوں میں سے ہی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اللہ کی رضا کی خاطر محبت کرتا ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مستحق ٹھہرتا ہے؛ اور یہ محبت اس کے ایمان کی نشانی ہے۔ یا جو انسان نصرت رسول اللہ ﷺ کی بنا پر انصار کو چاہتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی علامت ہے۔ بخلاف ازیں جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ و انصار کو انہی اوصاف [یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ] اور نبی کریم ﷺ کی تائید و نصرت کے جرم میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ منافق ہے۔

علاوہ ازیں جو شخص کسی طبعی امر مثلاً رشتہ داری یا کسی دنیوی امر کی بنا پر ان سے محبت رکھتا ہے تو یہ اسی قسم کی محبت ہے جیسے ابوطالب کو نبی ﷺ کے ساتھ تھی۔ ایسی محبت اللہ کے ہاں کچھ بھی کام نہ آئے گی۔ اور ایسے ہی جو شخص انصار؛ یا حضرت

① صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار۔ باب حب الانصار، من الایمان، (حدیث: ۳۷۸۳، ۳۷۸۴)، صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الدلیل علی ان حب الانصار..... (حدیث: ۷۴، ۷۵)۔

② صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی ﷺ..... (حدیث: ۷۸)۔

مسح علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام و علی رضی اللہ عنہما یا کسی بھی نبی کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہوئے محبت کرتا، اور ان کے بارے میں ان کے مرتبہ سے بالاتر اعتقاد رکھتا ہے؛ [اور ان کے بارے میں مبالغہ آمیزی کرنے والے کو بظنر استحسان دیکھتا ہے تو یہ شخص مبالغہ آمیزی و غلو کا ارتکاب کرتا ہے] حقیقت میں یہ کوئی محبت نہیں کر رہا۔ اس لیے کہ اس کی محبت ایسی چیزوں سے ہے جن کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں نصاریٰ نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ تاہم یہ محبت نصاریٰ کے لیے مفید ثابت نہ ہوئی۔ محبت وہی سودمند ہے جو اللہ کے لیے ہو، نہ کہ وہ جس میں کسی کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾

”بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہوئی چاہیے اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔“ [البقرہ ۱۶۵]

منافقت کی نشانیاں اور اسباب رافضیوں سے بڑھ کرامت کے کسی بھی گروہ میں نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ ان میں ایسا غلیظ اور کھلا ہوا نفاق پایا جاتا ہے کہ کسی بھی دوسرے میں اس قسم کا نفاق نہیں پایا جاتا۔ ان کے دین کا شعار ہی ”تقیہ“ ہے یعنی اپنی زبان سے وہ بات کہنا جو دل میں نہیں ہے؛ اصل میں یہ منافقت کی بڑی نشانی ہے۔

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ یہ کہنا بالکل محال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کے علاوہ منافقت کی کوئی نشانی نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آپ سے بغض رکھنا نفاق کی منجملہ نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”مجھ سے بغض منافق ہی رکھے گا۔“ یہ اس کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ جس انسان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمات جلیلہ اور آپ کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان اور جہاد فے سبیل اللہ کا علم ہو؛ اور پھر وہ آپ سے دشمنی رکھے؛ ایسا انسان یقیناً منافق ہے۔

ایسے نفاق کی نشانیوں میں سے انصار رضی اللہ عنہم کے ساتھ بغض رکھنا بھی ہے۔ انصار بہت بڑا عظیم قبیلہ تھا؛ اور مدینہ ان کا شہر تھا۔ یہی انصار وہ لوگ تھے جو ایمان لائے؛ مہاجرین کو پناہ دی؛ ان کے پاس ہجرت کر کے آنے سے اسلام و ایمان کو عزت نصیب ہوئی۔ اہل ایمان کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت و اکرام کا وہ اعزاز حاصل ہوا جو کسی دوسرے شہر والے کو اور نہ ہی اس قبیلہ کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ کو نصیب ہو سکا۔ پس ان سے منافق کے علاوہ کوئی انسان بغض رکھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس قدر منزلت کے باوجود یہ لوگ مہاجرین سے افضل نہیں ہیں؛ مہاجرین کو اللہ تعالیٰ نے ان پر فضیلت سے نوازا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی انسان سے بغض کے منافقت کی نشانی ہونے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ وہ دوسرے تمام لوگوں سے افضل ہے۔ اور جو کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور سوانح جانتا ہے اسے علم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کفار اور منافقین کے دشمن تھے۔ اور آپ اسلام کی عزت افزائی؛ نصرت اور کفار کی رسوائی و ذلت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اثر انداز ہوئے تھے۔ اور اللہ اس کے رسول ﷺ کے دشمن کفار و منافقین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضرت

عمر رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا وہ انسان تھا جو اسلام؛ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت سے بغض رکھتا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول سے اور دین اسلام سے بغض رکھنے کی وجہ سے اس قاتل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا نمازی؛ روزہ دار؛ اور قرآن کی تلاوت کرنے والا انسان تھا؛ اور وہ آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ سے قتل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تینیں اسی محبت کی وجہ سے اس نے آپ کو قتل بھی کیا۔ حالانکہ وہ اپنے اس اعتقاد میں گمراہ اور بدعت پر تھا۔

مقصود یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے کی نسبت زیادہ کھلا ہوا نفاق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رافضی اس امت میں سب سے بڑے منافق ہونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس امت کا فرعون کہتے ہیں۔ اور آپ کے قاتل ملعون ابولولو فیروز مجوسی سے محبت کا دم بھرتے ہیں؛ حالانکہ وہ بہت بڑا کافر اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ [شیعہ اس مجوسی کو اپنا باپ تصور کرتے ہوئے اسے ”بابا“ کہہ کر پکارتے ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سولہویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”سولہویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ﴿۱﴾ أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲﴾﴾ (الواقعة ۱۰-۱۱)

”اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہیں۔ وہ بالکل نزدیکی حاصل کئے ہوئے ہیں۔“

ابو نعیم نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ: اس امت میں سے سابق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔“
فقیر ابن المغازلی الشافعی نے امام مجاہد سے اس آیت ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

یوشع بن نون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت لے گئے۔ حضرت موسیٰ حضرت ہارون کی طرف سبقت لے گئے۔ اور صاحب یس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سبقت لے گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ محمد ﷺ کی طرف سبقت لے گئے۔“
یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکی۔ تو پھر آپ ہی امام ہوں گے۔ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کے کئی ایک جواب ہیں:

پہلی بات: ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ ہم اس کی صحیح سند پیش کرتے ہیں؛ اس لیے کہ بہت ساری ایسی جھوٹی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں مصنفین [نوٹ کے طور پر] روایت کر لیتے ہیں۔

دوسری بات: اس روایت کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف نسبت کرنا بھی باطل ہے۔ اگر بشرط صحت آپ سے یہ روایت ثابت بھی ہو جائے؛ تب بھی حجت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ دوسری روایات میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قوی لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

تیسری بات: بیشک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ﴾
 ”مہاجرین و انصار میں سے اولین سابقین اور وہ لوگ جنہوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے۔“ (التوبة: ۱۰۰)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْغَيْرِ يُرِيدُ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [فاطر ۳۲]

”پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب کا دارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں پسند فرمایا۔ پھر بعض تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے کے ہیں اور بعض ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں۔“

سابقین اولین وہ صحابہ ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ یہ ان لوگوں سے افضل ہیں جنہوں نے فتح کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اس میں وہ صحابہ بھی شامل ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی؛ ان کی تعداد چودہ سو سے زیادہ تھی۔ پھر یہ بات کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے کہ پوری امت میں ایک ہی سابق (حضرت علی) تھے؟

چوتھی بات: شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔“

یہ بالکل غلط بات ہے۔ علماء کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کون اسلام لایا تھا؟ ایک قول یہ ہے کہ حالانکہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے؛ اس لحاظ سے آپ کا ایمان لانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے پہلے تھا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے پہلے ایمان لائے تھے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بالکل چھوٹے تھے۔ اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا بچے کا اسلام لانا شرعاً معتبر بھی ہے یا نہیں؟ لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اسلام باقی سب کی نسبت اکمل و نافع تھا۔ پس اس لحاظ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاتفاق سابق بالایمان ہیں۔ اور دوسرے قول کے مطابق آپ کو علی الاطلاق سبقت حاصل ہے۔ تو پھر بغیر کسی دلیل کے کیسے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان پر سبقت حاصل ہے؟

پانچویں بات: اس آیت میں سابقین اولین کو فضیلت دی گئی ہے۔ اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس کا اسلام جتنا پہلے ہوگا اسے دوسروں پر اتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوگی۔ بس اس میں اتنی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقین کو شرف و فضیلت سے نوازا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ﴾ [الحديد ۱۰]

”تم میں سے جنہوں نے فتح سے پہلے نبی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیا، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔“

جب یہ تمام لوگ اسلام ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے شرف سے مشرف ہیں؛ اور ان دونوں آیات میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو مطلق افضلیت کا تقاضا کرتی ہو؛ تو پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اسلام لانے کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد و قتال میں بھی سبقت رکھتے ہوں۔ [اور ان اوصاف کی وجہ سے انہیں سبقت حاصل ہو]۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو کہ صرف انتالیس افراد کے بعد اسلام لائے تھے؛ وہ صحیح فصوص اور اجماع صحابہ و تابعین کی روشنی میں ان میں سے اکثر لوگوں سے افضل تھے۔ ہمیں کبھی بھی یہ علم حاصل نہیں ہو سکا کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حالانکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لائے تھے۔ اور کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لائے تھے۔

جب انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد کی وجہ سے بھی فضیلت حاصل ہوتی ہے تو پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس باب میں خاص اور یگانہ مقام ہے۔ آپ سے پہلے کسی دوسرے نے نہ ہی زبان سے جہاد کیا اور نہ ہی مال سے۔۔۔ بلکہ آپ جب سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے اس وقت سے حسب امکان اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے اور جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرتے رہے۔ آپ نے کئی ایک ان بے بس غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں اسلام لانے کی وجہ سے تکلیف دی جاتی تھی۔ نیز آپ قتال کا حکم نازل ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد کیا کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ [الفرقان ۵۲]

”اور قرآن کے ذریعے ان سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں۔“

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جہاد بالمال اور جہاد بانفس میں سب سے زیادہ کامل اور لوگوں پر سبقت رکھتے تھے۔ صحیحین میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا؛ جتنا فائدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے۔“ ”میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔“

نبی کریم ﷺ خود خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی صحبت اور آپ کے مال خرچ کرنے کی وجہ سے سب سے زیادہ فائدہ رسول اللہ ﷺ کو پہنچا ہے۔



امامت علی رضی اللہ عنہ کی ستر ہوں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ستر ہوں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمَ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ﴾ (التوبة: ۲۰)

”جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبہ والے ہیں۔“

”رزین بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ”الجمع بین الصحاح الستہ“ میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ حضرت طلحہ بن شیبہ رضی اللہ عنہ کیساتھ ایک دوسرے پر اپنے فخر کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی بھی دوسرے صحابی کے لیے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے آپ سب سے افضل ہوئے اور ساتھ امام اور خلیفہ بھی۔“ [شیعہ کلام ختم ہوا]

جواب: اس کے جواب میں کئی اہم باتیں ہیں:

❖ پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس روایت کی صحت ثابت کرے۔ محدث رزین [کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی جانب سے روایت میں بعض الفاظ بڑھا دیا کرتا ہے۔ اور] اپنی کتاب میں ایسی روایات نقل کر دیتا ہے جو صحاح میں نہیں ہوتی۔

❖ دوسری بات: صحیح حدیث وہ نہیں ہے جسے رزین نے نقل کیا ہے؛ بلکہ صحیح وہ حدیث ہے جس کے راوی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے منبر کے پاس بیٹھا تھا، ایک شخص نے کہا:

”میں اسلام لانے کے بعد صرف حاجیوں کو پانی پلاؤں گا اور کچھ نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں صرف خانہ کعبہ کو آباد کروں گا۔ دوسرا کوئی کام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: جو کچھ تم نے کہا ہے جہاد ان سب سے بہتر ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹ کر کہا: نبی کریم ﷺ کے منبر کے پاس آواز بلند نہ کرو۔ میں نماز جمعہ سے فارغ ہو کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور تمہارے اختلافی مسائل کا حل دریافت کروں گا۔“ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿أَجَعَلْتُمْ سِبْغَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (التوبة: ۱۹-۲۰)

”کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد کرنے والے کو اس شخص کی مانند قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہو۔“❖

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنہوں نے جہاد کو، حاجیوں کو پانی پلانے اور کعبہ کی حفاظت کی نسبت

❖ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الشهادة فی سبیل اللہ (حدیث: ۱۸۷۹)۔

افضل قرار دیا تھا، حق بجانب تھے۔ ان کے مقابلہ میں اس شخص کا قول درست نہیں جس نے ان امور کو افضل تصور کیا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ مسئلہ تنازعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے حریف کی نسبت حق و صداقت کا زیادہ علم تھا۔

جب کہ ایمان و ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے فضیلت ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں ثابت ہے جو ایمان لائے؛ پھر ہجرت اور جہاد کے شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ یہاں پر کوئی ایسی فضیلت بیان نہیں کی گئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہو؛ جس کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہو کہ یہ فضیلت کسی دوسرے کے لیے ثابت نہیں ہے۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے متعدد امور میں حکم ربانی سے ہم آہنگ رہی تھی۔ آپ ایک بات فرماتے اور اس کی تائید میں قرآن کریم نازل ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آپ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلی بناتے۔ پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُصَلًّی﴾ [البقرة ۱۲۵]

”اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو“

[آپ فرماتے ہیں:] اور حجاب کی آیت بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی۔ کیونکہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرنے کا حکم دیں، اس لئے کہ ان سے ہر نیک و بد گفتگو کرتا ہے۔ پس حجاب کی آیت نازل ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں آپ پر نسوانی جوش میں آ کر جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آئیں تو آپ ﷺ تم کو طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بیویاں آپ کو بدلے میں دے گا، جو مسلمان ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿عَسٰی رَبُّہٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبٰدِلَکُنَّ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّوَدَّٰتٍ قٰیِّنٰتٍ تَآٰبِتٰتٍ﴾ [التحریم ۵]

”اگر وہ (پیغمبر) تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد انہیں ان کا رب تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا جو اسلام والیاں توبہ کرنے والیاں، عبادت بجالانے والیاں ہوں گی۔“

تیسری بات: اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ خاص ہے تو اس سے ان کی امامت ثابت نہیں ہوتی اور نہ یہ کہ آپ امت میں سب سے افضل تھے۔ خضر کو ایسے مسائل معلوم تھے جو حضرت موسیٰ کو معلوم نہ تھے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ حضرت موسیٰ سے افضل تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہد ہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿اَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ﴾ [الذمل ۲۲]

”جو بات مجھے معلوم ہے آپ نہیں جانتے۔“

حالانکہ ہد ہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے بڑا عالم نہیں تھا۔

چوتھی بات: ٹھیک ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ مسئلہ جانتے تھے؛ تو پھر یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ دوسرے صحابہ کرام کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس مسئلہ کا خصوصی طور پر آپ کو علم ہونے کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔ اس وجہ سے آپ کی خصوصیت بھی باطل ہوئی۔ بلکہ تو اتر کے ساتھ یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاولیٰ اس آیت کے مصداق تھے:

اس لیے آپ اپنے مال کیساتھ جہاد کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مال دار انسان تھے اور جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا، جتنا فائدہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے“

حضرت علی رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے، خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس مال موجود ہی نہ تھا، بخلاف ازیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ غنی تھے اور انھوں نے اللہ کی راہ میں کثیر مال صرف کیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھارھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کی اٹھارھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ﴾ (المجادلة: ۱۲)

”اے مسلمانو! جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔“

حافظ ابو نعیم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ نے صدقہ کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ گفتگو کرنے کو حرام قرار دیا تھا۔ باقی صحابہ آپ سے کلام کرنے سے قبل صدقہ کرنے میں بخل سے کام لیا کرتے تھے۔ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ صدقہ دیتے تھے۔“ مسلمانوں میں سے کسی اور کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ تفسیر ثعلبی میں ہے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین اوصاف کے حامل تھے اگر مجھ میں ان تین باتوں میں سے ایک بھی ہوتی تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ عزیز تھا:

۱۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی۔

۲۔ غزوہ خیبر میں نبی کریم ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا کرنا۔

۳۔ آیت نبوی۔

”رزین بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ”المجمع بین الصحاح الستہ“ میں روایت کیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”اس آیت پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا اور میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت کا بوجھ ہلکا کر دیا۔“ مذکورہ صدر اقوال سے باقی صحابہ پر علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، لہذا آپ احق بالامامت ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ: ”صحیح بات جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت پر عمل کیا اور پھر یہ جلد ہی

کسی دوسرے کے عمل کرنے سے پہلے منسوخ ہو گئی۔ [یعنی دیگر صحابہ کو اس پر عمل کرنے کا شرف حاصل ہونے کا موقع ہی نہ مل سکا]۔ علاوہ ازیں اس آیت میں صدقہ کو واجب قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب رسول ﷺ سے راز دارانہ طور پر کوئی بات کرنا چاہیں تو صدقہ ادا کریں، جو شخص ایسی بات نہ کرنا چاہتا ہو اس کے لیے صدقہ ادا کرنا ضروری نہیں۔ چونکہ سرگوشی واجب نہ تھی لہذا غیر واجب چیز کو ترک کرنے میں کسی پر کوئی حرج نہیں یا ملامت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص صدقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور اس کی نیت یہ ہو کہ بشرط قدرت وہ نبی کریم ﷺ سے بات چیت کرے گا اور صدقہ دے گا تو اسے اس کی نیت کا اجر و ثواب مل جائے گا۔

جس شخص کو نبی کریم ﷺ سے ایسی خفیہ بات کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہو تو اسے ناقص قرار نہیں دیا جائے گا۔ البتہ جس شخص کو ایسی ضرورت لاحق ہوئی ہو مگر اس نے بخل سے کام لے کر آپ سے خفیہ بات نہ کی تو اس نے ایک مستحب فعل کو ترک کیا۔ خلفاء کے بارے میں ہر گز یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بخل تھے، یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اصحاب ثلاثہ اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بعض ان میں سے موجود نہ ہوں۔ یا اپنی ضروریات میں مشغول ہوں؛ یا انہیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ راز دارانہ بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔

یہ حکم زیادہ دیر تک باقی نہیں رہا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اتنے لمبے عرصہ میں لازمی طور پر لوگوں کو سرگوشی کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے ایک مستحب فعل کو ترک کر دیا تھا؛ تو ہم اس سے پہلے کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ مستحب پر عمل کرنے والا علی الاطلاق دوسروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا:

”تم میں سے آج کون روزہ سے ہے؟“ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہوں۔

فرمایا کہ ”تم میں سے کسی نے جنازہ کو الوداع کہا ہے؟“ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے جنازہ پڑھا ہے۔

پھر آپ نے دریافت کیا: ”کیا تم میں سے کسی نے صدقہ دیا ہے؟“ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے صدقہ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ”جس شخص میں یہ سب باتیں جمع ہو جائیں وہ جتنی شخص ہے۔“^①

صحیحین میں ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

”جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک قسم کی دو چیزیں دے اس کو جنت کے دروازوں سے پکارا جائے گا: اللہ کے بندے! خیر یہاں ہے۔ پس جو شخص نمازیوں میں سے ہوگا وہ نماز کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ اور جو جہاد کرنے والوں سے ہوگا وہ جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو شخص صدقہ کرنے والوں میں سے ہوگا اس کو صدقہ کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو شخص روزہ داروں میں سے ہوگا اس کو روزے کے دروازہ باب الریان سے پکارا جائے گا۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اور جو شخص ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا اس کو پھر کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ اور دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا کوئی شخص ان سب دروازوں سے پکارا جائے گا؟

آپ نے فرمایا: ”اور میں امید رکھتا ہوں کہ اے ابو بکر تم ان ہی میں سے ہو۔“ (صحیح بخاری: ج دوم: ۱۸۸۳)

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”ایک شخص ایک بیل کو ہانکے لیے جا رہا تھا اور اس پر بوجھ لا رکھا تھا۔ بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ”مجھے اس لیے

نہیں پیدا کیا گیا۔ بلکہ میں کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔“

لوگوں نے گھبرا کر کہا: سبحان اللہ! حیرت ہے کہ بیل کس طرح بات چیت کرنے لگ گیا۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”میں

① صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (حدیث: ۱۰۲۸/۱۲)۔

اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔“ حالانکہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وہاں موجود نہ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”ایک چودا اپنی بکریوں میں تھا کہ ایک بھیڑیے نے اس پر حملہ کیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا چودا ہے نے اس بکری کو بھیڑیے سے چھڑا لیا تو بھیڑیے نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا سب کے دن (پھاڑنے والے) بکری کا کون محافظ ہوگا؟ جس دن کہ میرے سوا بکری چرانے والا کوئی نظر نہ آئے گا؟ لوگوں نے یہ واقعہ سن کر سبحان اللہ کہا تو رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: ”میں اور ابوبکر و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما اس پر ایمان لائے ہیں۔“ [صحیح بخاری: ج: ۲، ص: ۸۸۰]

سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے مجھے جس قدر فائدہ پہنچا دوسرے کسی کے مال سے نہیں پہنچا۔“^① یہ روایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خصائص میں انتہائی واضح اور صریح ہے۔ اس میں کوئی بھی دوسرا آپ کا شریک نہیں؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ بخاری و مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”صحبت و رفاقت اور اتفاق مال کے اعتبار سے ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے سب سے بڑے محسن ہیں اور اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کھلی رہے۔“^②

سنن ابی داؤد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

”اے ابوبکر! آپ میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں جائیں گے۔“^③

ترمذی و ابوداؤد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ میرے پاس ان دنوں مال تھا۔ میں نے کہا آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جاؤں گا۔ چنانچہ میں گھر میں گیا اور آدھا مال لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نبی کریم نے دریافت کیا: ”ہاں بچوں کے لیے کیا باقی چھوڑا؟ میں نے کہا: اس کے برابر۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر کا تمام اثاثہ لے آئے۔ آپ نے فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ! گھر میں کیا باقی چھوڑا۔“ عرض کیا:

”اللہ اور اس کے رسول کو باقی چھوڑ آیا ہوں۔“

[پردانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے اللہ د رسول بس]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے کہا اس کے بعد میں کبھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقابلہ نہیں کروں گا۔“^④

صحیح بخاری میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی چادر کا کنارہ اٹھائے ہوئے آئے

① سنن ترمذی، کتاب المناقب۔ (ح: ۳۶۶۱)، سنن ابن ماجہ۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح: ۹۴)

② صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار (ح: ۳۹۰۴) مسلم۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۸۲)

③ سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ، باب فی الخلفاء (حدیث: ۴۶۵۲)، و سندہ ضعیف۔

④ سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاة (ح: ۱۶۷۸)، سنن ترمذی کتاب المناقب، باب (۱۶/۴۳)، (حدیث: ۳۶۷۵)۔

ان کا گھٹنا کھل گیا تھا؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے یہ دوست لڑکر آ رہے ہیں۔“ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آکر سلام کیا اور کہا: ”میرے اور ابن خطاب کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا؛ میں نے بے ساختہ انہیں کچھ کہہ دیا؛ اس کے بعد میں شرمندہ ہوا اور میں نے ان سے معاف کر دینے کی درخواست کی؛ لیکن انہوں نے معافی دینے سے انکار کر دیا۔ لہذا میں آپ کے پاس التجا لایا ہوں۔“

آپ نے تین مرتبہ فرمایا: ”اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! اللہ تمہیں معاف کر دے۔“ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ شرمندہ ہوئے؛ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے؛ اور دریافت کیا: ابو بکر رضی اللہ عنہ یہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ آپ کو سلام کیا۔ آنحضرت ﷺ کا چہرہ متغیر ہونے لگا؛ حتیٰ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے؛ اور دونوں گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کیا کہ: ”میں نے ہی ظلم کیا تھا۔“ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف بھیجا؛ تو تم لوگوں نے کہا جھوٹا ہے۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے مال و جان سے میری خدمت کی۔ پس کیا تم میرے لئے میرے دوست کو چھوڑ دو گے یا نہیں دوسرے (یہی فرمایا)۔ اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے نہیں ستایا۔“

ترمذی میں مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ:

جس قوم میں ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں ان کو چاہیے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کو امام مقرر نہ کریں۔^① حضرت عثمان کا ایک ہزار اونٹ کو جنگ کے لیے تیار کرنا۔^② سرگوشی کے صدقہ سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کے ہاں ایک مہمان آیا۔ گھر میں صرف بچوں کی خوراک تھی۔ بیوی کو کہا، بچوں کو سلا کر دیا گل کر دو اور جو کچھ ہے مہمان کو پیش کر دو۔ بیوی نے یونہی کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (حشر: ۹/۵۹)^③

”وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود سخت ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔“

[یہ نبوی کی نسبت بہت بڑا کام ہے۔]

خلاصہ کلام! اتفاق فی سبیل اللہ؛ اور دوسرے ابواب میں بہت سارے مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ایسے فضائل ثابت ہیں جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں نہیں آئے۔ اس لیے کہ عہد رسالت مآب میں آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا جسے خرچ کر کے یہ مقام حاصل کرتے۔

① سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاة (ج: ۱۶۷۸)، سنن ترمذی کتاب المناقب، باب (۱۶/۴۳)، (حدیث: ۳۶۷۵)

② الترمذی، کتاب المناقب (ج: ۳۶۷۳)، و سندہ ضعیف اس کی سند میں یحییٰ بن میمون راوی ضعیف ہے۔

③ صحیح بخاری۔ کتاب مناقب الانصار۔ باب قول اللہ عز وجل ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ﴾..... (حدیث: ۳۷۹۸)،

صحیح مسلم، کتاب الأشربة۔ باب اکرام الضیف (حدیث: ۲۰۵۴)۔

④ صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر ۸۷۸۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا﴾ (الزخرف ۴۵)

”اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا۔“

ابن عبد البر والذہبی نے روایت کیا ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے سب انبیاء علیہم السلام کو جمع کر کے فرمایا: اے محمد! ان سے پوچھیں کہ تمہاری بعثت کس بات پر عمل میں آئی تھی؟ انھوں نے کہا، اس بات کی شہادت پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں نیز آپ سچے نبی ہیں اور علی آپ کے امام و خلیفہ ہیں۔ اس روایت سے صراحتہً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا اثبات ہوتا ہے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم رافضی سے اس روایت اور اس جیسی دیگر روایات کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: بلاشبہ یہ روایت اور اس کے نظائر و امثال سب کذب ہیں۔ ہمیں اس بات میں کوئی ادنیٰ سا شک و شبہ نہیں کہ یہ روایات انتہائی قبیح قسم کا جھوٹ ہیں۔ لیکن ہم بطور مناظرہ کہتے ہیں کہ: اگر یہ روایت کذب نہ بھی ہوتی، تب بھی اثبات صحت سے قبل استدلال کرنا ناروا تھا۔ کیونکہ جس روایت کی صحت کا علم نہ ہو اس سے استدلال کرنا بالکل جائز نہیں ہے اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ کیونکہ اس کا قول بغیر علم کے ہے: اور بغیر علم کے بات کہنا کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے۔ دوسری وجہ: اس روایت کے موضوع اور من گھڑت ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

تیسری وجہ: اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ یہ روایات ایسا باطل جھوٹ ہیں جن کی تصدیق صرف وہی انسان کر سکتا ہے جسے نہ ہی عقل ہو اور نہ ہی دین۔ بلکہ اس کا کام ہی ایسی روایات گھڑنا اور بیباکی سے جھوٹ بولنا ہو۔ سخت حیرت تو یہ ہے کہ جو چیز اصل ایمان میں داخل نہیں اس کے بارے میں انبیاء سے کیوں کر پوچھا جائے گا؟

اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر ایک شخص نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا اور آپ کی اطاعت کرتا ہو، وہ مر جائے اور اسے علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو پیدا کیا تھا تو عدم علم سے اسکے ایمان کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا: اور نہ ہی یہ بات اس کے جنت میں داخل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اگر یہ حال امت کا ہے تو پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ صحابہ میں سے ایک (حضرت علی) پر ایمان لانا انبیاء کیلئے ناگزیر ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صرف یہ عہد لیا تھا کہ اگر انکی زندگی میں محمد ﷺ مبعوث ہو کر آجائیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا ہوگی: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَضُكُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَضْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾ [آل عمران ۸۱]

”جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت سے دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو

تمہارے پاس کی چیز کوچ بتائے تو تمہارے لئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مذکورنا ضروری ہے۔ فرمایا کہ تم اس کے اقراری ہو اور اس پر میرا ذمہ لے رہے ہو؟ سب نے کہا کہ ہمیں اقرار ہے۔ فرمایا تو اب گواہ رہو اور خود میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔“

حضرت ابن عباس نے ﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ﴾ کی تفسیر میں یہ بات کہی ہے۔^①
انبیاء کرام علیہم السلام سے رسالت و بعثت محمدی کے تفصیلی امور پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو پھر باقی اہل ایمان کو چھوڑ کر کسی ایک صحابی کی موالات کا عہد انبیاء کرام سے کیسے لیا جاسکتا ہے؟
﴿وَأَسْأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ﴾ [الزخرف ۳۵]

”اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا کہ کیا ہم نے سوائے رحمن کے اور معبود مقرر کئے تھے جن کی عبادت کی جائے۔“

اس آیت میں یہ سوال نہیں کیا گیا کہ ان سے پوچھا جائے کہ انہیں کس چیز کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا؟ [بخلاف ازیں آیت میں انبیاء سے یہ بات دریافت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم نے کچھ اور بھی معبود مقرر کیے ہیں جن کی پرستش کی جائے؟]
پانچویں وجہ: اعتراض کرنے والے کا قول کہ: انبیاء کو ان تین باتوں کا حکم دیکر مبعوث کیا گیا تھا؛ اگر اس کی مراد یہ ہو کہ ان تین باتوں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی تو یہ رسولوں پر جھوٹ ہے۔ اور اگر کہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کے اصول یہی تھے تو بھی یہ انبیاء کرام علیہم السلام پر جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ جن اصول دین کو دیکر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کیا تھا؛ ان میں: اللہ تعالیٰ پر ایمان؛ آخرت پر ایمان اور اصول شرائع شامل ہیں۔

ان کے ہاں کسی نبی کے کسی صحابی پر ایمان لانے سے بڑھ کر اہم محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار ہے۔ ان لوگوں پر محمد ﷺ پر اجمالی ایمان رکھنا واجب تھا؛ جیسا کہ ہم پر سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام پر اجمالی ایمان رکھنا واجب ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پالیتا تو اس پر آپ کی شریعت پر ایسے ہی تفصیلی ایمان لانا واجب ہوتا جیسے ہم پر تفصیلی ایمان لانا واجب ہے۔ جب کہ باقی انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں پر تفصیلی ایمان ان امتوں کے لوگوں پر واجب تھا۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جو چیز امت پر واجب ہے اسکے بیان کو چھوڑ دیا جائے اور جس چیز پر ایمان لانا واجب نہیں ہے اسے بیان کیا جائے؟

چھٹی وجہ: لیلۃ الاسراء کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں پیش آیا۔ کہا جاتا ہے کہ: یہ ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے؛ اور کہا گیا ہے کہ: پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں۔ معراج کی رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر چھوٹی تھی۔ اس وقت تک آپ نے ہجرت بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی جہاد کیا؛ اور نہ ہی کوئی دیگر ایسا کام ہوا جس کی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے آپ کا ذکر کیا جاتا۔ حقیقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابوں میں حضرت

① اور یہی تفسیر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، دیکھیں تفسیر ابن جریر ۶۶/۵۔

علی رضی اللہ عنہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے متعلق بشارات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بلکہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ تابوت جس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تصویریں تھیں؛ اور وہ تابوت مصر کے بادشاہ مقوقس کے پاس موجود تھا۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ اور مقوقس ان کے مطابق ہی حکم الہی کو قائم کرتا تھا۔ اور آج تک جو اہل کتاب مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک نے یہ ذکر تک نہیں کیا کہ ان کی کتابوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی کوئی ذکر ملتا ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کے اقرار پر مبعوث کیا گیا تھا؛ حالانکہ انہوں نے نہ ہی اپنی امتوں کے سامنے کچھ ایسا ذکر کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک سے کوئی ایسی بات نقل کی گئی؟۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیسویں دلیل:

[اشکان]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿وَتَجْعَلُاْ اٰذُنْ وَاَعِيْنُ﴾ (الحاقة: ۱۲) ”تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔“

”ثعلبی کی تفسیر میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اے علی! میں نے اللہ سے یہ دعا کی تھی کہ وہ تیرے کانوں کو ایسا بنا دے۔ اسی طرح ثعلبی نے بطریق ابوعبید ذکر کیا ہے: اے علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے قریب ہو جاؤں اور تمہیں علم سکھاؤں۔ تاکہ تم اسے یاد رکھو اور مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿وَتَجْعَلُاْ اٰذُنْ وَاَعِيْنُ﴾ (الحاقة: ۱۲) ”تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔“ پس تم ہی یاد رکھنے والے کان ہو۔“ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد تھے۔ لہذا وہی امام ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

✽ اول: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ابوعبید اور ثعلبی ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جن سے استدلال کرنا بالاجماع جائز نہیں۔

✽ دوم: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

✽ سوم: اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿اِنَّا لَنَاْطِفُ الْمَاءِ حَبْلَكُمْ فِى الْجَارِيَةِ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيْنًا اٰذُنْ وَاَعِيْنُ﴾

[الحاقة ۱۱-۱۲]

”جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھالیا۔ تاکہ اسے تمہارے لئے نصیحت اور یادگار بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔“

جہاں تک زیر نظر آیت کا تعلق اس میں جملہ بنی آدم سے خطاب کیا گیا ہے ایک شخص سے خطاب نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کو کشتی میں سوار کرنا عظیم ترین نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَيُّهُ لَھُمْ اَنَا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۖ وَخَلَقْنَا لَھُمْ مِنْ مِثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ﴾ [یس]

”ان کے لئے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ان کے لئے اسی جہی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔“

بیشک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيْكُمْ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شٰكُوْرٍ﴾ [لقمان ۳۱]

”کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ دریا میں کشتیاں اللہ کے فضل سے چل رہی ہیں اس لئے کہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے، یقیناً اس میں ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔“

بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گوش حق نبیوش حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اور امت کے باقی لوگوں کے کانوں کی مانند تھے۔ تو اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خاص خصوصیت نہ ہوئی۔ یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کان ہی حق سننے والے نہیں ہیں۔ اس بات کو کون تسلیم کر سکتا ہے کہ نبی ﷺ حسن و حسین اور عمار و ابوذر؛ سلیمان الفارسی؛ اور مقداد اور کھل بن حنیف رضی اللہ عنہم جن کی فضیلت پر شیعہ ہمارے موافق ہیں، کیا ان کے کان آواز حق کو سننے والے نہ تھے؟ اگر یہی سننے اور یاد رکھنے والے کان دوسرے لوگوں کے بھی تھے تو پھر یہ کہنا جائز نہ ہوا کہ یہ فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی تھی؟

بتائیے اب تفرد و افضلیت کی کوئی بات رہی؟ اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ ظالم و جاہل شیعہ کے بیان کردہ مقدمات اسی طرح بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اہل بدعت میں سے کسی ایسے گروہ کے متعلق علم نہیں ہو سکتا جن کے دلائل رافضیوں کے دلائل سے بڑھ کر بودے اور کمزور ہوں۔ بخلاف معتزلہ اور دوسرے لوگوں کے۔ اس لیے کہ ان کے پاس ایسے دلائل و براہین ہیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے اہل علم و عقل بعض اوقات شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ شیعہ کے براہین و دلائل بے حقیقت اور بودے ہوتے ہیں، ایسے دلائل کو وہی شخص تسلیم کر سکے گا جو ظالم اور جاہل ہو یا پھر جو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر چکا ہو یا صاحب بدعت و عصیت ہو؛ اور جو چیز بھی اس کی خواہشات کے موافق ہو اسے قبول کرتا ہو خواہ وہ حق ہو یا باطل۔ اسی لیے یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ شیعہ عقل و نقل اور دین و مذہب سے بے گانہ اور حکومت و سلطنت سے عاری ہیں۔ پھر رافضیوں کی علمی تہی دامن کی یہ عالم ہے کہ کسی چیز کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ حالانکہ وہ ایسا ہوتا نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی۔ حالانکہ بسا اوقات وہ صحابہ کرام کے مشترکہ فضائل میں سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت شدہ فضائل عام ہیں جن میں دوسرے صحابہ بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ بخلاف حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے۔ ان دونوں حضرات کے ایسے فضائل اور خصوصیات ہیں جن میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ پھر دوسرا دعویٰ کرتا ہے کہ اس فضیلت کی وجہ سے آپ کی امامت واجب ہوتی ہے۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کسی چیز میں جزوی فضیلت سے نہ ہی مطلق فضیلت لازم آتی ہے اور نہ ہی امامت۔ اور۔

ہی ایسی فضیلتیں امام کے لیے خاص ہوتی ہیں۔ بلکہ امام اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایسے فضائل ثابت ہوتے ہیں۔ فاضل مطلق کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس رافضی نے اپنے دعویٰ کو تین مقدمات پر قائم کیا تھا۔ یہ تینوں باطل ہوئے؛ پھر چوتھا دعویٰ کیا؛ اس میں بھی نزاع ہے۔ لیکن ہم اس میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جو افضل ہو وہی امامت کا مستحق ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں رافضی کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکیسویں دلیل:

[اشکال:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی اکیسویں دلیل آیت قرآنی: ﴿هَلْ أَتَىٰ﴾ ہے۔ مفسر نقابی نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار پڑ گئے۔ تو ان کے نانا اور عام عرب لوگ بیمار پرسی کے لیے آئے۔ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا، ابوالحسن! اپنے بچوں کے لیے نذر مانجے۔ آپ نے تین دن روزہ کی منت مانی۔ اسی طرح ان کی والدہ نے بھی نذر مانی۔ اور فضہ نامی ان کی لونڈی نے بھی ایسے ہی نذر مانی۔ چنانچہ بچے تندرست ہو گئے۔ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین صاع جو قرض لیے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انہیں پیسا اور اس سے پانچ روٹیاں پکائیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک روٹی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی اور گھر آئے۔ آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو ایک مسکین آ کر کھانا طلب کرنے لگا؛ اس نے کہا: السلام علیکم اے اہل بیت محمد! مسکین مسلمانوں میں سے ایک مسکین ہوں؛ مجھے بھی کھانا کھلاؤ؛ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دسترخوانوں سے کھلائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی؛ اور مسکین کو کھانا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ کھانا مسکین کو دے دیا اور شب و روز پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

جب دوسرا روز ہوا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کھانا پکایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کیساتھ نماز پڑھ کر گھر تشریف لائے۔ آپ کے سامنے کھانا لا کر رکھا گیا؛ اتنے میں ایک یتیم آ کر دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور کھانا طلب کرنے لگا اس نے کہا: السلام علیکم اے اہل بیت محمد!“ اے محمد کے گھر والو! میں مہاجرین کی اولاد میں سے یتیم ہوں۔ میرے والد یوم العقبہ کو شہید ہوئے تھے، مجھے کھانا کھلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دسترخوان پر سے کھانا کھلائے گا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی؛ اور اسے کھانا دینے کا حکم دیا۔ تو وہ کھانا اسے دیدیا گیا۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ [اور ان کے اہل خانہ] نے دو دن اور دو راتیں پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

اس طرح جب تیسرا دن ہوا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تیسرا صاع جو کا پیسا، اور اس سے روٹیاں پکائیں؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی اور گھر آئے۔ آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو ایک قیدی آ کر کھانا طلب کرنے لگا؛ اس نے کہا: کیا آپ ہمیں قیدی بناتے ہیں اور پھر ہمیں بھگاتے ہیں؛ اور ہمیں کھانا نہیں کھلاتے۔ میں اسیر محمد ہوں، مجھے کھانا کھلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دسترخوان پر سے کھانا کھلائے گا۔“ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی؛ اور اسے کھانا دینے کا حکم دیا۔ تو وہ کھانا اسے دیدیا گیا۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ [اور ان کے

اہل خانہ [نے تین دن اور تین راتیں پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

چوتھے روز جب آپ نے اپنی نذر پوری کر دی؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور حضرت حسین کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا؛ اور رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ بھوک کی شدت سے ایسے کانپ رہے تھے جیسے چھوٹے چوڑے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو فرمایا: ”اے ابوالحسن! تمہاری اس حالت نے مجھے بہت پریشان کر دیا۔ میرے ساتھ میری بیٹی فاطمہ کے گھر چلو۔“ آپ ان کے پاس چلے گئے۔ اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرہ میں تھیں۔ اور بھوک کی شدت کی وجہ سے آپ کا پیٹ پیٹنے سے لگ رہا تھا۔ اور آپ کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے آپ کو دیکھا تو چلائے: ہائے غوث! اللہ کی قسم! کیا اہل بیت محمد ایسے ہی بھوک سے مرجائیں گے۔ اس وقت جبرائیل نازل ہوئے اور فرمایا: ”اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے اہل بیت کے بارے میں خوشخبری دی ہے۔ آپ نے پوچھا: اے جبریل کیا لیکر آئے ہو؟ تو آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ ”کیا انسان پر ایسا وقت نہیں آیا۔“

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گونا گوں اوصاف کے حامل تھے؛ جو آپ سے پہلے کسی اور کو نہیں ملے۔ اور نہ ہی کوئی آنے والا یہ اوصاف پاسکے گا؛ تو اس لحاظ سے آپ باقی لوگوں سے افضل ہوئے۔ پس یہ ان کے امام ہونے کی دلیل ہے۔“ شیعہ کا بیان ختم ہوا۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

❖ **پہلی بات:** ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی صحت ثابت کرے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم یہ مطالبہ کر چکے ہیں۔ کسی بات کو صرف واحدی، ثعلبی یا ان جیسے لوگوں کا روایت کر لینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ روایت بھی صحیح اور قابل حجت ہے۔ اس پر تمام اہل سنت اور شیعہ کا اتفاق ہے۔ اگر دو فریقین کے مابین احکام و فضائل کے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ پر اختلاف ہو جائے؛ اور ان میں سے ایک کوئی ایسی حدیث پیش کرے جس کی صحت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو، سوائے اس کے کہ ان جیسے مفسرین نے اسے نقل کیا ہے۔ تو یہ اس روایت کے صحیح ہونے کی دلیل نہ ہوگی۔ اور نہ ہی اس سے فریق مخالف پر حجت قائم ہوگی۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

شیعہ کی عادت ہے کہ ایسی روایت پیش کرتے ہیں جو کسی دوسرے نے نقل کی ہو۔ ان میں سے اکثر کو یہ علم نہیں ہوتا کہ کیا یہ روایت صحیح ہے یا ضعیف؟ اور ایسی حکایات اور اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں جن کے متعلق باقی لوگ جانتے ہیں کہ اصل میں یہ پوری کہانی ہی باطل ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ شیعہ کا کام ہی فقط نقل کو نقل کرنا ہے۔ یا لوگوں کے اقوال کو آگے چلانا ہے؛ بھلے اس میں بہت ساری چیزیں سرے سے ہی باطل ہوں۔ بسا اوقات بعض منقولات کی صحت اور ضعف پر کلام کرتے ہیں مگر یہ ان کے ہاں کوئی پکا اصول نہیں اور نہ ہی اس کا التزام کرتے ہیں۔

❖ **دوسری بات:** یہ روایت بہ اتفاق محدثین موضوع ہے۔ جو لوگ اس فن کے امام ہیں وہ اس کے موضوع ہونے میں ذرہ بھر شک و شبہ نہیں کرتے۔ اس باب میں ان ہی لوگوں کی بات مانی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ روایت کسی بھی ایسی

قابل اعتبار مستند کتاب حدیث میں موجود نہیں جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔ یہ روایت نہ ہی صحاح میں منقول ہے نہ ہی مسانید میں؛ نہ ہی جوامع میں اور نہ ہی سنن میں۔ اور نہ ہی مصنفین نے اسے فضائل صحابہ کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ ضعیف روایات بھی نقل کر دیتے ہیں۔ [مگر اس روایت کا نام و نشان تک نہیں ملتا]۔ جیسے کہ امام نسائی کی جمع کردہ کتاب ”خصائص علی“ میں صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایتیں فضائل علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جمع کی گئی ہیں۔ مگر یہ روایت اس میں بھی مذکور نہیں۔ اسی طرح ابو نعیم کی کتاب الخصائص؛ خیمہ بن سلیمان اور امام ترمذی نے اپنی ”الجامع“ میں فضائل علی کی ضعیف احادیث نقل کی ہیں، مگر ان کتب میں سابق الذکر روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا؛ جس سے اس کا موضوع ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ [اصحاب السیر مثلاً ابن اسحاق نے بھی فضائل علی پر مشتمل احادیث ضعیفہ ذکر کی ہیں مگر یہ روایت بیان نہیں کی جو اتفاق اہل نقل موضوع ہے]۔

✽ **تیسری بات :** اس روایت کے جھوٹ ہونے پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ:

یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وفاطہ کا نکاح مدینہ میں ہوا؛ اور غزوہ بدر کے بعد آپ کی رخصتی ہوئی۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اس کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش سن تین اور چار ہجری ہے۔ لوگوں کا اتفاق ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں شادی کی؛ اور آپ کے بچے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ یہ عام اور متواتر علم ہے۔ جسے ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علم سے کوئی ادنیٰ شغف بھی ہو۔

[نیز یہ کہ] سورۃ الدھر باتفاق مفسرین کہی ہے۔ [اس سے سابق الذکر روایت کا کذب ظاہر ہو گیا]۔ کسی ایک مفسر نے بھی یہ نہیں کہا کہ: یہ سورت مدنی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے بابین مشترکہ اصول دین کے بیان کے لحاظ سے بھی یہ سورت مکی سورتوں کے ڈھب پر ہے۔ جیسا کہ ایمان باللہ؛ آخرت پر ایمان؛ پیدائش اور بعثت کا ذکر [اس سورت کے موضوع ہیں]۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ الم تنزل کے ساتھ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں یہ سورت بھی پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس دن آدم کی پیدائش ہوئی؛ اسی دن جنت میں داخل ہوئے؛ اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔ [البخاری ۵/۲ و مسلم ۵۹۹/۲]۔ یہ دونوں سورتیں آسمان و زمین کی پیدائش؛ آدم کی پیدائش اور ایک گروہ کے جنت میں اور دوسرے گروہ کے جہنم میں جانے کے ذکر کو شامل ہیں۔ جب یہ سورت ہی مکہ مکرمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی سے پہلے نازل ہوئی ہے تو پھر واضح ہو گیا کہ یہ کہنا کہ یہ سورت حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے بیمار ہونے کے بعد نازل ہوئی؛ سراسر کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

✽ **چوتھی بات :** اس حدیث کا سیاق اور اس کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ روایت و جالوں نے اپنی طرف سے گھڑی ہوئی ہے۔ ان میں سے پہلا کلمہ ہے کہ: ”فعادہما جدہما و عامۃ العرب۔“

اس لیے کہ عام عرب لوگ مدینہ میں مقیم نہ تھے۔ اور نہ ہی کفار عرب ان کے پاس آتے اور ان کی عیادت کرتے تھے۔

پھر اس روایت میں دوسرا کلمہ ہے کہ: ”فقالوا: یا ابا الحسن! لو نذرت علی ولدیک..... الخ۔“

”اے ابوالحسن اگر آپ اپنے بیٹوں پر نذر مائیں۔“ اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ عرب لوگوں سے دین نہ لیتے بلکہ نبی کریم ﷺ سے لیتے۔ اس لیے کہ اگر نذر ماننا اطاعت کا کام تھا؛ تو رسول اللہ ﷺ اس بات کے زیادہ حق دار تھے کہ آپ

انہیں اس کا حکم دیتے؛ عام عرب لوگ اس کا نہ کہتے۔ اور اگر یہ اطاعت کا کام نہیں تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان عام عرب لوگوں کی بات ماننے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ سے رجوع کیے بغیر عام لوگوں کی بات کیسے مان لی؟۔

✽ **پانچویں بات:** صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے:

”اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ بخیل کا مال ضرور نکل جاتا ہے۔“^①

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

”پیشک نذر ابن آدم کو تقدیر کی طرف ہی لوٹاتی ہے۔ پس وہ نذر پر وہ کچھ دیتا ہے جو کسی دوسری چیز پر نہیں دیتا۔“

نبی کریم ﷺ نذر ماننے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: نذر کسی خیر کو نہیں لاتی؛ بلکہ نذر ابن آدم کو تقدیر کی طرف ہی لوٹاتی ہے۔ اگر حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے اہل خانہ جیسے لوگ اس جیسی حدیث کو نہیں جان سکتے جسے عام مسلمان بھی جانتے ہیں، تو پھر یہ ان کے علم پر قدح و تنقید ہے تو ان کا معصوم ہونا کہاں گیا؟

اگر انہیں اس کا پتہ تھا مگر پھر بھی انہوں نے ایسا کام کیا جس میں نہ ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت؛ اور نہ ہی ان کے لیے کوئی فائدہ۔ بلکہ اس سے منع کیا گیا تھا۔ اور نبی یا تو تحریم کے لیے ہوتی ہے یا پھر تنزیہ کے لیے۔ تو ہر دو طرح سے یہ یا تو ان کے دین پر قدح وارد ہوتی ہے یا پھر عقل اور علم پر۔

اور جو انسان اس قسم کے فضائل نقل کرتا ہے، حقیقت وہ چٹا جاہل ہے۔ وہ مدح کے روپ میں ان کی مذمت بیان کرتا ہے۔ اور انہیں بلند کرنے کے انداز میں نیچے گراتا ہے۔ اور ان کی تعریف کی الفاظ میں مذمت بیان کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایفاء نذر کی تعریف کی ہے، مگر نذر ماننے کو قابل تعریف فعل قرار نہیں دیا۔ جس طرح ظہار (بیوی سے یوں کہنا کہ تو میرے لیے اسی طرح ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) کوئی قابل تعریف فعل نہیں ہے، مگر کوئی شخص جب ظہار کرتا ہے تو اس پر ظہار کا کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کا مرتکب ہو اور کفارہ ادا کر دے تو واجب کی ادائیگی پر یہ ایک ممدوح فعل ہے۔ نہ کہ ظہار کا ارتکاب کرنے پر ممدوح ہے؛ اس لیے کہ ظہار حرام ہے۔ ایسے ہی جب انسان اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور پھر اسے اچھے طریقے سے رخصت کر دے؛ تو طلاق کی وجہ سے واجب ہونے والے فریضہ کی ادائیگی پر وہ ممدوح ٹھہرے گا۔ بذات خود طلاق کوئی اچھی چیز نہیں ہے، بلکہ مکروہ امور میں سے ہے۔

ایسے ہی جو انسان خرید و فروخت کرے اپنے ذمہ کی ادائیگی کرے تو اس عقد خرید و فروخت کی وجہ سے اس پر جو کچھ واجب ہوا تھا اس کی ادائیگی پر وہ قابل تعریف ٹھہریگا۔ صرف عقد پر اس کی کوئی تعریف نہیں ہوگی۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

✽ **چھٹی بات:** حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کوئی لونڈی فضہ نامی نہیں تھی۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کے اقارب میں سے کسی کے پاس کوئی لونڈی نہیں تھی۔ بلکہ مدینہ بھر میں اس نام کی کوئی کینز نہ تھی۔ اور اہل علم میں سے جن لوگوں نے چھوٹے بڑے ہر قسم کے احوال جمع کیے ہیں؛ ان میں سے کسی ایک نے ایسی کسی لونڈی کا ذکر تک نہیں کیا۔

① صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور۔ باب الوفاء بالنذر، (حدیث: ۶۶۹۳)، صحیح مسلم، کتاب النذر۔

باب النہی عن النذر (حدیث: ۱۶۳۹)۔

یہ فضہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ”ابن عقب“ ایک فرضی نام وضع کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا استاد تھا؛ اور اسے ایک سیب دیا گیا تھا جس میں مستقبل میں پیش آنے والے حوادث کا علم تھا۔ حالانکہ اس نام کا کوئی آدمی نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس طرح کی جھوٹی کہانیاں گھڑی گئی جنہیں جاہل لوگوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اہل علم کا اجماع ہے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا کوئی استاذ و مدرس نہیں تھا۔ اور صحابہ کرام میں ابن عقب نامی کوئی آدمی نہیں تھا۔

جو جنگی مرثیے ابن عقب کی طرف منسوب ہیں انہیں بہت بعد کے بعض جہال [و دجال] روافض نے نظم کیا ہے۔ جو کہ صلاح الدین ایوبی اور نور الدین کے زمانے کے لوگ تھے۔ جس وقت شام کا بہت بڑا حصہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھا؛ اور مصر بنو عبید کے بقایا محمد بن قرامطی شیعہ کے زیر دست تھا۔ ان مرثیوں میں وہ کچھ بیان کیا ہے جو اس وقت کے حساب سے مناسب تھا؛ ایسی نظم کوئی عام آدمی بھی لکھ سکتا ہے۔

یہی حال اس فضہ نامی لوٹڈی کا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے ایک خادم طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

((سوئے وقت سو مرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ خادم سے بہتر ہے۔))

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب سے میں نے نبی کریم ﷺ سے یہ سنا ہے تب سے یہ وظیفہ ترک نہیں کیا۔ آپ سے پوچھا گیا: صفین کی رات بھی؟ آپ نے فرمایا: صفین کی رات بھی نہیں چھوڑا۔ ((صحیح بخاری: ج ۱: ص ۱۳۴۵۔))

اس روایت کے صحیح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمہ کوئی خادم نہیں دیا گیا۔ اگر اس کے بعد کہیں سے کوئی خادم آ گیا ہو تو ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر فضہ نام کی کوئی باندی نہیں تھی۔

✽ **ساتویں بات:** صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ ایک انصاری گھرانے نے اپنے مہمان کو رات کے کھانے میں ترجیح دی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بھوکا سلا دیا اور خود میاں بیوی بھی بھوکے پیٹ سو گئے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر ۹]۔

”بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کتنی ہی سخت حاجت ہو۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ [الإنسان ۸]۔

”اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین یتیم اور قیدیوں کو۔“

یہ آیت اس دوسری آیت کی طرح ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ﴾ [البقرة ۱۷۷]۔

”اور وہ دیتا ہے مال اللہ کی محبت میں قریبی رشتہ داروں کو یتیموں کو اور مسکین کو۔“

صحیح بخاری میں ہے کہ: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا صدقہ اجر کے اعتبار سے زیادہ بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر تو صدقہ کرے اس حال میں کہ تندرست ہے، بخیل ہے اور فقر سے ڈرتا ہے اور مال داری کی امید کرتا ہے اور نہ توقف کرتا کہ اتنا کہ جان حلق تک آ جائے اور تو کہے کہ اتنا مال فلاں شخص کے لئے ہے

اور اتنا مال فلاں شخص کو دے دیا جائے حالانکہ اب تو وہ مال فلاں کا ہو ہی چکا ہے۔“^①

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ [آل عمران ۹۲]

”جب تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے ہرگز بھلائی نہ پائے۔“

پس جس چیز کو انسان پسند کرتا ہے اس جس کے تحت صدقہ کرنے کی کوئی انواع و اقسام ہیں۔ مگر اپنی انتہائی سخت ضرورت کے باوجود اپنے پر دوسرے کو ترجیح دینا، یہ صرف محبت میں صدقہ کرنے سے زیادہ افضل اور اجر و ثواب میں بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک صدقہ کرنے والا محبت کرنے والا اور ذاتی ضرورت پر ترجیح دینے والا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ہر صدقہ دینے والے کو خود انتہائی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی پسندیدہ چیز میں سے کچھ صدقہ بھی کرے اور کچھ اپنی ضرورت کے لیے بچا کر بھی رکھ لے۔ حالانکہ اس کی محبت انتہائی سخت ضرورت کو نہیں پہنچتی ہوتی۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے اس رات میں مہمان کو ترجیح دینے پر انصاری گھرانے کی ان الفاظ میں مدح کی ہے؛ تو پھر اس قصہ میں اہل بیت کا جو ایثار نقل کیا گیا ہے یہ انصاری کے ایثار سے بہت بڑھ کر ہے؛ اگر ایسا کرنا ہر حال میں قابل مدح ہے تو مناسب تھا کہ اس پر بہت زیادہ مدح کی جاتی اور اگر یہ فعل قابل مدح و تعریف نہیں تو پھر اسے مناقب میں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔
آٹھویں بات: یہ ایسا قصہ ہے کہ اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ شرعی حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ تین شب و روز تک بچوں کو کھانا نہ کھانا خلاف شرع ہے۔

[اور ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ پہلے اپنے اہل و عیال کو کھلاؤ۔] ^②

تین دن تک انہیں مسلسل بھوکا رکھنے سے بدنی و عقلی کمزوری کے ساتھ صحت کی خرابی اور دین میں فساد کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ اس انصاری کے قصہ کی طرح ہرگز نہیں ہے جس میں انہوں نے بچوں کو صرف ایک رات کے لیے بھوکا سلا یا تھا۔ اس لیے کہ بچے اتنا تو برداشت کر سکتے ہیں؛ مگر تین دن اور تین رات تک ایسا نہیں کر سکتے۔

نویں بات: پھر اس یتیم بچے کا قصہ جس کا یہ قول ہے کہ: ”میرے والد یوم العقبہ شہید ہو گئے تھے۔“ صاف اور کھلا ہوا جھوٹ ہے، اس لیے کہ عقبہ کی رات صرف نبی کریم ﷺ کی بیعت کی گئی تھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس رات انصار نے بیعت کی تھی۔ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک جہاد کا حکم نازل ہی نہیں ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت تو جھوٹی ہے، یہ معاملہ اپنی جگہ پر؛ مگر اس قصہ کو نقل کرنے والا نبی کریم ﷺ کے احوال سے انتہائی بیگانہ اور جاہل انسان ہے۔ [اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ عقبہ کی رات کیا ہوا تھا] اس کے بجائے اگر یوں کہہ دیتا کہ ”احد کے دن میرے والد شہید ہو گئے تھے“ تو پھر بھی کوئی بات بنتی تھی۔

دسویں بات: نبی کریم ﷺ خود شہداء کے یتیم بچوں کی کفالت فرمایا کرتے تھے۔ اسی لیے جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خادم مانگا تو آپ نے فرمایا: ”میں شہدائے بدر کے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں نہیں دے سکتا۔“

اب اگر کوئی یہ کہے کہ وہ شہداء مجاہدین کے یتیموں میں سے تھا؛ اور نبی کریم ﷺ اس کی کفالت نہیں کیا کرتے تھے تو

① البخاری، کتاب الدعوات (ح: ۶۳۱۸)، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء باب التسییح..... (ح: ۲۷۲۷)۔

② صحیح بخاری، کتاب الزکاة، باب لا صدقة الا عن ظہر غنی (حدیث: ۱۴۲۶، ۱۴۲۷)۔

یہ انتہائی بڑا جھوٹ اور دروغ گوئی ہوگی۔

❁ **گیارہویں بات :** مدینہ میں قیدی بھیک نہیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ مسلمان ہر طرح ان کی ضروریات کی کفالت کیا کرتے تھے۔ لہذا یہ کہنا کہ ایک قیدی مدینہ میں بھیک مانگا کرتا تھا، صحابہ کرام پر جھوٹ اور ان کی شان میں قرح ہے۔ قیدیوں کی بڑی تعداد بدر کے دن آئی تھی۔ یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد تو قیدی انتہائی کم تعداد میں ہوا کرتے تھے۔

❁ **بارہویں بات :** اگر مان لیا جائے کہ یہ قصہ صحیح ہے۔ اور اس کا شمار فضائل میں ہوتا ہے۔ تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس قصہ والا لوگوں میں سب سے افضل ہو۔ اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر آپ ہی امام ہوں۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سب لوگوں کی نسبت غرباء کو زیادہ کھانا کھلایا کرتے تھے۔^❶ یہاں تک نبی کریم ﷺ نے ان کی شان میں فرمایا تھا: ”آپ کی سیرت و صورت میرے جیسی ہے۔“^❷

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مساکین اور فقراء کے ساتھ لطف و احسان کے سلسلہ میں کوئی شخص حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کے نقش قدم پر نہیں چلا۔^❸ اس کے علاوہ بھی آپ کے فضائل ہیں، تاہم ان فضائل کی بنا پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ یا دوسرے صحابہ کی نسبت افضل نہیں تھے۔ چہ جائے کہ ان فضائل کی بنا پر کوئی ان کے لیے امامت کا دعویٰ کرنے لگے۔

❁ **تیرہویں بات :** یہ بات بھی جانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ عام طور سے معروف اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب تھا۔ بیشک بھوکے کو کھانا کھانا بھی صدقات کی جنس میں سے ہے۔ قیامت تک کوئی بھی انسان صدقہ کر سکتا ہے۔ بلکہ تمام امت کے لوگ بھوکوں اور مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ بھلے بعض لوگ اس سے تقرب الی اللہ نہ بھی چاہتے ہوں۔ جب کہ مسلمانوں کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا﴾ [الإنسان ۹]

”ہم تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری۔“

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انفاق انتہائی رشک کے قابل ہے۔ آپ اسلام کے ابتدائی دور میں اہل ایمان غلاموں کو آزاد کرانے، قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ کفار آپ کو اس پر اذیت دیتے، اور آپ کے قتل کے درپے رہتے۔ آپ نے اپنے مال سے سات غلام خرید کر آزاد کیے جنہیں اللہ کی راہ میں عذاب دیا جاتا تھا۔ انہی میں سے ایک بلال بھی ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں، اور آپ نے ہمارے سردار کو آزاد کیا ہے۔“ اس سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہوا کرتے تھے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۷۰۸)

❷ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان..... (حدیث: ۲۶۹۹) مطولاً۔

❸ سنن ترمذی، باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (ج: ۳۷۶۴)، ومستدرک حاکم (۳/۲۱۱) بمعناہ۔

اہل ایمان محتاجین اور اسلام کی نصرت کے لیے آپ کا انفاق فی سبیل اللہ ایک علیحدہ باب ہے۔ آپ اس وقت اس راہ میں خرچ کرتے تھے جب تمام روئے ارض کے باسی اسلام کے دشمن تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انفاق جیسا انفاق آج کل ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”میرے صحابہ کو برانہ کہو مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔“^①

اس طرح کا انفاق آپ کے ساتھ ہی خاص ہے۔ باقی رہ گیا مطلق طور پر بھوکوں کو کھانا کھلانا؛ یہ مشترکہ قدر ہے؛ قیامت تک اس پر عمل کیا جانا ممکن ہے۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بائیسویں دلیل

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بائیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (الزمر: ۳۳)

”اور جو سچے دین کو لائے اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ پارسا ہیں۔“

ابو نعیم مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ﴾ اس سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور ﴿وَصَدَّقَ بِهِ﴾ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور فقیہ شافعی نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ: ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ﴾ سچائی لانے والے حضرت محمد ﷺ ہیں اور سچائی کی تصدیق کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم خصوصیت ہے لہذا آپ امام و خلیفہ ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

[جواب]: ہم اس کا جواب کئی طرح سے دے سکتے ہیں:

✽ پہلی بات: یہ تفسیر نبی کریم ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ضمن میں صرف اکیلے حضرت مجاہد کا قول اگر ثابت ہو جائے تو بھی ایسی حجت نہیں کہ تمام مسلمانوں پر اس کی اتباع واجب ہو۔ حالانکہ مجاہد سے یہ روایت ثابت ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔ اس لیے کہ مجاہد سے نقل کردہ روایات میں جھوٹ کی کثرت ہے۔ [آپ سے نقل کرنے والا جھوٹ بولتا ہے۔]

مجاہد کا قول ہے کہ صدق سے قرآن مراد ہے۔ اور ”صَدَّقَ بِهِ“ سے مراد وہ مؤمن ہے جو اس پر عمل کرے۔ اس لحاظ سے یہ حکم عام ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ اور دوسرے مفسرین نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ اہل قرآن ہیں جنہیں قیامت کے دن پیش کیا جائے گا۔ اور وہ [اللہ تعالیٰ سے قرآن کے بارے میں] کہیں گے: یہی وہ چیز ہے جو آپ نے ہمیں دی تھی اور ہم اس پر عمل کرتے رہے۔

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ، ”لو كنت متخذًا خليلاً“ (ح: ۳۶۷۳)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب تحريم سب الصحابة (ح: ۲۵۴۱)۔

ابوسعید الانشج نے روایت کیا ہے؛ فرمایا: ہم سے ادیس نے بیان کیا؛ وہ لیث اور وہ مجاہد - رحمہ اللہ - سے یہی تفسیر روایت کرتے ہیں۔ نیز [دوسری سند سے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں] ہم سے محاربلی نے بیان کیا؛ وہ جویر سے وہ ضحاک سے نقل کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: ”صَدَّقَ بِهِ“ سے مراد تمام مؤمن ہیں۔

مفسر ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں: وہ فرماتے ہیں: ”صَدَّقَ بِهِ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

❁ دوسری بات: شیعہ کا قول جمہور مفسرین کے ہاں مشہور تفسیر کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ: اس آیت میں: ”جَاءَ بِالصِّدْقِ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ”صَدَّقَ بِهِ“ سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

ابن جریر طبری، اور دیگر مفسرین نے اپنی اسناد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ آپ فرماتے ہیں: ”جَاءَ بِالصِّدْقِ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ”صَدَّقَ بِهِ“ سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ بات بعض مفسرین نے ابوبکر بن عبد العزیز بن جعفر الفقیہ؛ جو کہ حضرت ابوبکر الخلال رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں؛ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ”یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔

معرض نے کہا: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ سن کر ابوبکر الفقیہ نے کہا: ”اس آیت سے آگے تلاوت کیجیے، ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ سے لے کر آگے تک: ﴿فَكَفَّرَ اللَّهُ أَسْمَاءَ الَّتِي عَمِلُوا﴾ (الزمر ۳۵) ”تا کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے برے عملوں کو دور کر دے۔“

[اس نے جب یہ آیت پڑھی تو ابوبکر الفقیہ نے کہا: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ تمہارے نزدیک معصوم ہیں، پھر ان سے کون سے گناہ دور کیے جائیں گے]۔ معرض لا جواب ہو گیا۔

❁ تیسری بات: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ عام اور مطلق ہیں ان میں نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص ہے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی؛ بلکہ جو بھی اس کے عموم میں شامل ہوں وہ اس حکم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اس امت میں سے اس آیت کے حکم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں؛ لیکن پھر بھی یہ آیت ان کے ساتھ خاص نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ۚ وَالَّذِينَ جَاءُوا بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [الزمر ۳۲-۳۳]

”پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلادیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ پر جھوٹ بولنے والوں اور حق بات جھٹلانے والوں کی مذمت کی ہے۔ اور یہ ایک عام حکم

ہے۔ رافضی سب سے بڑے اہل بدعت ہیں جو اس مذموم وصف میں داخل ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر سب سے زیادہ بہتان گھڑنے والے ہیں۔ اور جب سچ بات ان تک پہنچتی ہے تو اسے سب سے زیادہ جھٹلانے والے ہوتے ہیں۔ اور سچائی کی تصدیق کرنے میں سب سے زیادہ دور رہنے والوں میں سے ہیں۔

خالص اہل سنت اس آیت کے مصداق ہونے کے سب سے بڑے حق دار ہیں۔ اس لیے کہ وہ سچ بولتے ہیں؛ اور جب کہیں سے بھی حق بات انہیں مل جاتی ہے تو اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی تمام تر خواہشات حق کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچائی کا پیغام لانے والے اور اس کی تصدیق کرنے والے کی مدح و توصیف بیان کی ہے۔ یہ تعریف نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ہے اور آپ پر ایمان لانے والے ہر انسان کے لیے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

وہ جو کہ سچ کا پیغام لے کر آیا اور وہ خاص کہ جس نے اس کی تصدیق کی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دو علیحدہ علیحدہ اقسام نہیں بنائیں۔ بلکہ ان دونوں کو ایک ہی قسم بتایا ہے۔ اس لیے کہ اس سے مراد سچائی کی تعریف کرنا ہے، بھلے وہ پیغام لانے کے اعتبار سے ہو یا اس کی تصدیق کرنے کے اعتبار سے۔ یہ دونوں اوصاف کے اعتبار سے قابل تعریف ہے۔

﴿جاء بالصدق﴾ اسم جنس ہے۔ جو کہ ہر قسم کی سچائی کو شامل ہے۔ قرآن اس سچائی میں داخل ہونے میں پہلے درجہ پر ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ: اور اس جنس سچائی کی تصدیق کی۔ اس لیے کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تصدیق کرنے والا ایسی چیز کی تصدیق کرتا ہے جو اصل میں سچائی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلاں انسان حق بات کہتا ہے، اور حق بات سنتا ہے، اور اسے قبول کرتا ہے؛ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کے لیے حق کہنے اور دوسروں سے حق بات قبول کرنے کے ساتھ موصوف ہے۔ اور اس میں وہ وصف پائے جاتے ہیں عدل کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود اس پر عمل کرتا ہے۔ اگرچہ بہت سارے عدل جس کا وہ حکم دیتا ہے؛ وہ حقیقت میں وہ چیز نہیں ہوتی جس پر وہ عمل کرتا ہے۔

رافضی اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے رسول پر اور صحابہ کرام اور ذوی القربیٰ رضی اللہ عنہم پر سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والے اور حق بات کو جھٹلانے والے ہیں۔ وہ ایسے سچ کو جھٹلاتے ہیں جو منقول صحیح اور منقول صریح کی روشنی میں ثابت اور معلوم شدہ ہے۔ اس آیت کریمہ میں وارد ہونے والی مدح ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شامل ہے جن پر رافضی اپنی طرف سے بہتان گھڑتے اور ظلم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس حق کا پیغام پہنچا؛ انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ روئے زمین پر اس آیت کے سب سے بڑے مصداق صحابہ کرام ہیں؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان ہی صحابہ میں سے ایک فرد ہیں۔ اس میں رافضیوں کی مذمت ہے؛ اور یہ آیت خود ان کے خلاف حجت ہے۔ اس آیت میں خلفاء ثلاثہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں۔ یہ آیت ہر حال میں رافضیوں کے خلاف حجت ہے ان کے حق میں حجت نہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی تیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ﴾ (الانفال: ۶۲)

”اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔“

ابونعیم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عرش پر لکھا ہے: ”اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے علی سے ان کی تائید کی۔“ یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے جو کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہو سکی۔ لہذا آپ ہی امام تھے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

[جواب:]

پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں؟ کسی روایت کے صرف ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے وہ قابل حجت نہیں ٹھہرتی؛ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ ابونعیم کی مشہور کتاب ”فضائل الصحابہ“ ہے۔ اس میں سے کچھ چیزیں اس نے اپنی کتاب ”الحلیہ“ کے شروع میں بیان کی ہیں۔ اگر شیعہ ان کتابوں کی ہر روایت کو قابل حجت سمجھتے ہیں تو پھر ان میں حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل میں ایسی روایات بیان کی گئی ہیں جن سے شیعیت کی پوری عمارت زمین بوس ہو سکتی ہے؛ اور ارکان شیعیت منہدم ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی ہر روایت کو حجت نہیں سمجھتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روایات ان کے ہاں ناقابل اعتماد ہیں۔ جب کہ ہم اہل سنت روایات کے مسئلہ میں۔ خواہ وہ ابونعیم کی روایت ہو یا پھر کسی دوسرے کی۔ اہل علم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان اسناد کی جانچ پرکھ کرتے ہیں جن کے راویوں کے احوال کی معرفت سے روایت کا سچ یا جھوٹ واضح ہو سکے۔ کیا اس کے سارے راوی ثقہ ہیں یا نہیں؟ پھر ہم حدیث کے دوسرے شواہد تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کسی دوسرے کے فضائل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو چیز ثابت ہوتی ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں؛ اور جو جھوٹ ہوتی ہے؛ ہم اسے رد کر دیتے ہیں۔ ہم سچ بات لے کر آتے ہیں اور سچائی کی تصدیق کرتے ہیں۔ نہ ہی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ ہی سچے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ ائمہ اہل سنت کے ہاں یہ قاعدہ معروف ہے۔

پس جو کوئی اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان گھڑے؛ اور حق بات کو جھٹلائے؛ تو ہم پر واجب ہوتا ہے کہ ہم اسے جھٹلائیں؛ اور اس کی حق بات کی نفی کو رد کریں۔ جیسا کہ ہم سیلہ کذاب اور دوسرے جھوٹے لوگوں اور انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں کو جھٹلاتے ہیں؛ اور رسولوں پر ایمان لانے والوں اور ان کی تصدیق کرنے والوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

دوسری بات: محدثین اور اہل علم کا۔ شیعہ مصنف کی پیش کردہ۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ مذکورہ بالا روایت اور اس کے علاوہ دیگر جن روایات کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ روایات موضوع ہیں؛ ان کے بارے میں ہمارا دونوں موقف یہی ہے کہ یہ روایات من گھڑت ہیں۔

ہم اس الذی قسم اٹھاتے ہیں جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ ہم یقینی طور پر بغیر کسی شک و شبہ کے یہ جانتے ہیں اور ہمارے پاس اس کا واضح علم موجود ہے جس کو شیعہ ہمارے دلوں سے زائل نہیں کر سکتے؛ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہتان باعہا گیا ہے، یہی حال اس طرح کی دوسری روایات کا بھی ہے۔ جو شخص علم الآثار سے بے گانہ ہے وہ ہمارے زمرہ میں داخل

نہیں۔ ہم ضعیف اقوال و آثار کو اسی طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح ایک ماہر نقاد قسم اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سکہ کھوٹا ہے۔ اور جس کسی کو سکوں کی کوئی پہچان نہ ہو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

تیسری بات: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي آيَدَكَ بِتَصْرِفِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ﴾ [الأنفال: ۶۲-۶۳]

”اگر وہ تجھ سے دغا بازی کرنا چاہیں گے تو اللہ تجھے کافی ہے، اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔ ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے، زمین میں جو کچھ ہے تو اگر سارا کا سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا۔ یہ تو اللہ ہی بنے ان میں الفت ڈال دی ہے۔“

یہ آیت اس بات پر نص قاطع کی حیثیت رکھتی ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں الفت ڈال دی گئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان اہل ایمان میں سے ایک تھے۔ آپ کے بہت سارے دل نہیں تھے کہ ان میں الفت ڈالی گئی ہوتی۔ مومنوں کی جمع ہے۔ یہ صریح نص ہے؛ اس میں یہ احتمال تک نہیں ہے کہ اس سے مراد کوئی ایک متعین شخص ہوگا۔ تو پھر یہ کہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں؟

چوتھی بات: شیعہ سے کہا جائے گا کہ: یہ ایک بدیہی بات تو اتر کے ساتھ معلوم ہے کہ دین اسلام کا قیام صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اعانت کا رہا۔ پشک حضرت علی رضی اللہ عنہ شروع میں اسلام لائے؛ اس وقت اسلام بہت کمزور تھا؛ اگر لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور ہجرت و نصرت نہ ہوتی تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تائید سے کچھ بھی نہ بنتا۔ لوگ نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے؛ اور نہ ہی آپ کی وجہ سے ہجرت و نصرت کی تھی۔ اور نہ ہی مکہ یا مدینہ میں دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کی کوئی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر تھی۔ اور نہ ہی کسی نے یہ نقل کیا ہے کہ سابقین اولین میں سے کسی ایک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا ہو؛ نہ ہی مہاجرین میں سے اور نہ ہی انصار میں سے۔ بلکہ صحابہ کرام سے کسی بھی [قابل ذکر] انسان نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول نہیں کیا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یمن میں مبعوث کیا تو پھر جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت تھی انہوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہاں پر جن لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا؛ وہ صحابہ نہیں ہیں۔ جب کہ بڑے بڑے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اسلام لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہی مشرکین کو دعوت دیتے تھے اور نہ ہی ان سے مناظرہ کرتے تھے؛ جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں دعوت دیتے اور ان سے مناظرے کرتے۔ اور مشرکین آپ سے ایسے نہیں ڈرتے تھے جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے ڈرتے تھے۔

بلکہ حدیث کی تمام کتب؛ صحاح؛ مسانید؛ اور مغازی میں ثابت ہے؛ اور لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر جب مسلمان منہ پھیر کر بھاگ گئے تو اس وقت؛ تو ابوسفیان نے ایک بلند جگہ پر چڑھ کر پکارا:

”اے مسلمانو! کیا محمد زندہ ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خاموش رہو؛ جواب نہ دو۔

پھر کہنے لگا: اچھا ابوقافہ کے بیٹے ابوبکر زندہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: چپ رہو جواب مت دو۔

پھر کہا: اچھا خطاب کے بیٹے عمر زندہ ہیں؟ پھر کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سب مارے گئے؛ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا؛ اور کہنے لگے: اودثن خدا! تو جھوٹا ہے اللہ نے تجھے ذلیل کرنے کے لئے ان کو قائم رکھا ہے۔ ابوسفیان نے نعرہ لگایا: اے ہبل! تو بلند اور اونچا ہے؛ ہماری مدد کر۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم بھی جواب دو؛ پوچھا: کیا جواب دیں؟ فرمایا: کہو اللہ بلند و بالا اور بزرگ ہے۔“

ابوسفیان نے کہا: ہمارا مددگار عزی ہے اور تمہارے پاس کوئی عزی نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس کو جواب دو۔ پوچھا: کیا جواب دیں؟ فرمایا: کہو: ”اللہ ہمارا مددگار ہے، تمہارا مددگار کوئی نہیں۔“

ابوسفیان نے کہا: بدر کا بدلہ ہو گیا لڑائی ڈول کی طرح ہے ہار جیت رہتی ہے۔ کہا تم کو میدان میں بہت سی لاشیں ملیں گی

جن کے ناک کان کٹے ہوں گے میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا اور نہ مجھے اس کا افوس ہے۔ [البخاری: ج: دوم، ص: ۱۲۳۶]

یہ اس وقت میں مشرکین کے لشکر کا قائد ہے؛ یہ صرف نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ اگر ان لوگوں کو ان تین حضرات کے علاوہ کسی اور کا خوف ہوتا؛ جیسے حضرت عثمان و علی اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم؛ یا رسول اللہ ﷺ کی تائید ان لوگوں سے ہوئی ہوتی جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے ہوئی ہے؛ تو پھر ضرور ان کے بارے میں بھی ایسے ہی سوال کرتے جیسے ان حضرات کے بارے میں سوال کیا تھا۔ کیونکہ سوال کرنے کا مقتضی اپنی جگہ پر باقی ہوتا۔ اور سوال کرنے میں کوئی مانع بھی موجود نہیں تھا۔ اس لیے کہ قدرت اور واعی کی موجودگی میں جب صارف بھی منہی ہو تو پھر فعل کا بجالانا واجب ہو جاتا ہے۔

✽ پانچویں وجہ: اسلام کی نشر و اشاعت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں تھا؛ مگر جتنا اثر آپ کا تھا اتنا ہی آپ جیسے دوسرے صحابہ کرام کا بھی اثر و کردار تھا۔ جب کہ بعض صحابہ کے اثرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثرات سے بہت زیادہ اور بلیغ تھے۔ جن لوگوں کو صحیح تاریخ سیرت سے معرفت ہے؛ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

ہاں جو لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں؛ اور اہل طریقت کے راستے پر چلتے ہیں تو [پھر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ] جھوٹ کا دروازہ کھلا ہے۔ یہ جھوٹ ایسے نبی ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ﴾ [العنکبوت ۲۸]

”اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا؟ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا جب حق اس کے پاس آ جائے وہ اسے جھٹلائے۔“

مجموعی طور پر وہ مغازی جن میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ قتال کی نوبت پیش آئی ان کی تعداد نو ہے۔ اور تمام غزوات کی مجموعی تعداد ستائیس ہے۔ جب کہ سرایا کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد ستر (۷۰) تک پہنچتی ہے۔

اتنے غزوات اور سرایا میں مجموعی طور پر قتل کیے جانے والے کفار کی کل تعداد ایک ہزار سے کچھ کم و بیش بنتی ہے۔ حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے ان کا وصال یا بیسواں حصہ کفار کو بھی قتل نہیں کیا۔ جب کہ اکثر سرایا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں جایا کرتے تھے۔

جب کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کی فتوحات میں بھی آپ نے بہت کم ہی حصہ لیا ہے۔ نہ آپ نہ عثمان؛ نہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم؛ ہاں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف نکلتے تو آپ بھی ان کے ساتھ نکلا کرتے تھے۔ البتہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتح میں حصہ لیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح میں حصہ لیا تھا؛ اور حضرت ابو عبیدہ نے شام کا علاقہ فتح کیا تھا۔

تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تائید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک شخص کے ساتھ کی گئی تھی؛ جب کہ حقیقت حال یہ ہے۔ تو پھر اہل ایمان سابقین اولین اور مہاجرین وانصار کے ذریعہ ملنے والی تائید کہاں گئی؟ اور وہ تائید کہاں گئی جن لوگوں نے بول کے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھوں پر بیعت رضوان کی تھی؟

بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ جب کہ احد کے موقع پر سات سو کے قریب تھے۔ خندق کے موقع پر ہزار سے زیادہ تھے؛ بیعت رضوان کے دن چودہ سو کے لگ بھگ تھے۔ یہی صحابہ کرام تھے جنہوں نے خیبر فتح کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کے قریب صحابہ کرام تھے؛ غزوہ حنین میں بارہ ہزار تھے؛ دس ہزار کا مدنی لشکر اور دو ہزار آزاد کردہ اہل مکہ [طلاق]۔ جب کہ تبوک کے موقع پر یہ شمار ممکن نہ رہا؛ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تیس ہزار سے زیادہ صحابہ تھے۔ جب کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ان کو شمار کرنا ممکن نہ رہا۔ آپ کے زمانے میں ہی بہت سارے لوگ ایسے تھے جو ایمان لائے اور نبی کریم ﷺ کے دیدار سے شرفیاب ہوئے؛ اور ان کا شمار بھی صحابہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زندگی میں ہی ان لوگوں کے ذریعہ یمن اور دوسری جگہوں میں آپ کی مدد فرمائی۔ یہ تمام لوگ وہ اہل ایمان تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تائید کی۔ بلکہ قیامت تک جو بھی ایمان لائے گا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا وہ اس حکم میں داخل شمار ہوگا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوبیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوبیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الانفال: ۶۳)

”اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو جو تیری پیروی کر رہے ہیں۔“

ابو نعیم کا قول ہے کہ: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ فضیلت صحابہ میں سے کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی لہذا وہی امام برحق ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات: بیشک یہ قول حجت نہیں ہے۔

تیسری بات: یہ کلام اور اس کے رسول ﷺ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الانفال: ۶۳)

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے، اور ان اہل ایمان کے لیے بھی کافی ہے جو آپ پر ایمان لائے

ہیں۔ وہ اکیلا اللہ ہی آپ کے لیے بھی کافی ہے اور آپ کے ماننے والے اہل ایمان کے لیے بھی کافی ہے۔ عرب اپنے کلام

میں ایسے ہی جملے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے: فَحَسْبُكَ وَزَيْدٌ أَدْرَهُمْ .

آپ کے لیے اور زید کے لیے ایک درہم ہی کافی ہے۔ اور جیسے شاعر کا قول ہے:
فَحَسْبُكَ وَالضُّحَاكَ سَيْفٌ مُهْنَدٌ

”تمہارے اور ضحاک کے لیے صرف شمشیر برآں کافی ہے۔“ یعنی آپ کے لیے اور ضحاک کے لیے کافی ہے۔

[اس کی وجہ یہ ہے کہ ”حَسْبُ“ مصدر ہے۔ مضاف ہونے کی صورت میں مستحسن یہ ہے کہ اعادہ جار کے ساتھ اس پر عطف ڈالا جائے۔ اعادہ جار کے بغیر شاذ و نادر ہی اس پر عطف ڈالا جاتا ہے۔] بعض لوگوں نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اے نبی! اللہ تعالیٰ اور مومن آپ کے لیے کافی ہیں۔ اس صورت میں ﴿مَنْ اتَّبَعَكَ﴾ رفعی حالت میں ہوگا اور اس کا عطف لفظ اللہ پر ہوگا۔

یہ اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس سے کفر لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ صرف اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کے لیے کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (آل عمران: ۱۷۳)

”وہ لوگ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے میں لشکر جمع کر لئے ہیں۔ تم ان سے خوف کھا تو

اس بات نے انہیں ایمان میں اور بڑھا دیا اور کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔“

یعنی صرف اکیلا اللہ تعالیٰ ہم سب کے لیے کافی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: آپ فرماتے ہیں: ”یہ کلمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا“ اور محمد ﷺ نے اس وقت کہا جب لوگ آپ سے [ڈرانے کے لیے] کہنے لگے: بیشک لشکر تمہارے لیے جمع ہو گئے ہیں ان سے ڈرو؛ تو ان کا ایمان مزید بڑھ گیا اور کہنے لگے: ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔“ ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔“

تمام انبیاء کرام علیہم السلام یہی کہتے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ اور ان میں سے کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا کہ کوئی اور بھی اللہ کے علاوہ ان کے لیے کفایت کرتا۔ جب یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مؤمنین کے لیے کفایت کر جائیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مؤمنین رسول اللہ ﷺ کے لیے کفایت کر جائیں؟

مؤمنین اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ پس ان کے لیے کفایت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قوت مؤمنین سے ہو اور مؤمنین کی قوت و کفایت رسول اللہ ﷺ سے ہو۔ اس لیے کہ اس سے دور لازم آتا ہے۔ بلکہ تمام تر قوتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی قوت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وہی اللہ وحدہ لا شریک ہی جو تمام تر قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے وہی رسول اللہ ﷺ کی قوت کا بھی پیدا کرنے والا ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو پتہ چلا کہ رافضی جہالت پر جہالت مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایسے اندھیروں کا شکار ہو گئے کہ یہ اندھیرے آپس میں اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اس طرح وہ گمان کرنے لگے کہ: اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آپ کی اتباع کرنے والے مؤمنین آپ کے لیے کافی ہیں اور پھر آپ کے متبعین مؤمنین میں سے صرف ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی مؤمن مانتے ہیں۔ ان کی یہ جہالت پہلی جہالت سے بھی زیادہ بڑھ کر اور واضح ہے۔ اس لیے کہ پہلی جہالت تو بعض لوگوں پر مشتبہ ہو سکتی ہے؛ مگر یہ جہالت کسی بھی عاقل پر مخفی نہیں رہ سکتی۔ [[اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ﴿مَنِ اتَّبَعَكَ﴾ بھٹاغل ہے اور اللہ پر معطوف ہے تو بھی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نزول آیت کے وقت آپ کی پیروی کرنے والے بے شمار مومن موجود تھے۔ کوئی دانش مند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جہاد کفار میں نبی کریم کے لیے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کافی تھے]]

اس لیے کہ تمام مخلوق میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ رضی اللہ عنہ کے لیے کافی نہیں تھے۔ خدا نخواستہ آپ کی اعانت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا اگر دیگر صحابہ موجود نہ ہوتے تو اسلام کا بول بالا نہ ہوتا۔ [[مکہ میں نبی کریم رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ چند صحابہ موجود تھے۔ تاہم دین کا بول بالا نہ ہو سکا، بلکہ دین کو غلبہ اسی وقت حاصل ہوا جب آپ نے مدینہ میں ہجرت فرمائی]] غور کیجیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے لشکر جرار موجود تھا۔ تاہم آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے شام کا ملک چھین نہ سکے۔ بلکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ بھلے یہ غلبہ قوت و قتال کے لحاظ سے ہو یا تدابیر اور چالوں کے لحاظ سے۔ اس لیے کہ جنگ دھوکہ دہی کا نام ہے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام کے غالب آنے کے بعد اور اپنے پیروکاروں کی اکثریت کی باوجود خود اپنی ذات کے کام نہ آ سکے؛ تو پھر رسول اللہ رضی اللہ عنہ میں کیسے کام آ سکتے تھے جب تمام دنیا والے آپ کے دشمن تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس لیے غالب نہیں آئے کہ آپ کا لشکر آپ کی اتباع نہیں کرتا تھا؛ بلکہ وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کا شکار رہتے تھے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: جب آپ کے ساتھ مسلمان ہونے کے باوجود آپ کی اطاعت نہیں کر رہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کافر لوگ آپ کی اطاعت کریں جالاںکہ نہ ہی وہ آپ کو مانتے ہیں اور نہ ہی نبی کریم رضی اللہ عنہ کو۔

شیعہ کے جہل و ظلم کا اندازہ لگائیے کہ یہ دو متضاد باتوں کو جمع کر دیتے ہیں۔ ایک جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قدرت و شجاعت کے اعتبار سے اکمل البشر قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ نبی کریم رضی اللہ عنہ ان کے محتاج تھے۔ دین اسلام کی توسیع و اشاعت بھی روافض کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رہنمائی پر ہی ممکن تھی۔ ایسا کفر کہتے ہیں اور آپ کو دین محمدی کے قائم کرنے میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں تو دوسری جانب یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ظہور اسلام کے بعد عجز و نیاز کا زندہ پیکر بن گئے تھے۔ اور آپ نے تقیہ کر رکھا تھا یہ بات کس قدر عجوبہ روزگار ہے کہ جو شخص اسلام کی کمزوری اور قلت افراد کے زمانہ میں مشرکین بلکہ جن و انس سب پر غالب تھا، لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ تو وہ ایک باغی گروہ کے مقابلہ میں کیوں کر عاجز آ گئے اور اس کو زیر نہ کر سکے۔ [اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تنہا مشرکین کو زیر نہیں کر سکتے

تھے؛ جب تک کہ آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ کرام موجود نہ ہوتے۔

یہ بات یقینی طور پر بھی لوگ جانتے ہیں کہ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد حق کے سب سے بڑے اتباع کار تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا نازل کردہ دین محمد قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ کفار کو مغلوب کیا؛ اور لوگ مسلمان ہوئے۔ تو پھر یہ ایک چھوٹے سے گروہ کو مغلوب کیوں نہ کر سکے جنہوں نے سرکشی اور بغاوت کی تھی۔ حالانکہ ان کی تعداد بھی بعثت محمدی کے وقت موجود کفار کی تعداد سے بہت کم تھی۔ ان کی شان و شوکت بھی بہت کم تھی؛ اور ان کی نسبت یہ لوگ حق کے بھی زیادہ قریب تھے؟

جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جھگڑا کرنے والے کفار تعداد میں بہت زیادہ اور حق سے بہت ہی دور تھے۔ اس وقت میں اہل حجاز، اہل شام، اہل یمن؛ اہل مصر اہل عراق؛ اہل خراسان اور اہل مغرب تمام کے تمام کفار تھے۔ ان میں مشرکین بھی تھے اہل کتاب بھی؛ مجوسی بھی تھے اور صابی بھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو اس وقت جزیرہ عرب پر اسلام غالب ہو چکا تھا۔ اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیے جانے کا واقعہ پیش آیا اس وقت تک اسلام مصر؛ شام؛ عراق؛ خراسان اور مغرب تک غالب آچکا تھا۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت دشمنان تعداد میں بہت کم اور قوت کے لحاظ سے بہت کمزور رہ گئے تھے۔ اور دشمنی بھی اس وقت کی نسبت بہت کم تھی جس وقت میں آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت یہ لوگ بالکل ہی کم اور کمزور ہو گئے تھے۔ اور پہلے کی نسبت دشمنی میں بھی کمی آگئی تھی۔ وہ حق جس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ برسرِ پیکار تھے؛ وہ اس حق کا ایک جزء تھا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ قتال و جہاد کرتے تھے۔ پس جو کوئی اس حق کو جھٹلائے جو محمد ﷺ لیکر آئے ہیں؛ اور اس پر قتال کرے؛ یقیناً وہ انسان اس حق کو بھی جھٹلانے والا ہے جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حالت میں حق کی نصرت اور باطل سے دفاع میں عاجز آگئے تھے؛ تو پھر جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے تو اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت تو آپ بالکل ہی عاجز اور کمزور ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت دشمنان بھی تعداد میں بہت زیادہ اور قوت و شوکت سے لیس تھے۔

روافض کے اس فعل کی نظیر نصاریٰ کا یہ طرز عمل ہے کہ وہ ایک طرف حضرت عیسیٰ کو الہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں آپ ہر چیز کے رب ہیں اور ہر چیز پر قادر ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ان کے دشمنوں نے ان کی تذلیل کی ان کے سر پر کانٹے رکھے اور انھیں سولی پر چڑھایا۔ حضرت مسیح داویلا کرتے رہے، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ نہ ہی وہ حضرت مسیح کے لیے قدرت قاہرہ کے ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکے اور نہ ہی اس کمزوری کے ثابت کرنے میں۔ اگر وہ کہیں کہ حضرت مسیح کو یہ تکلیف اللہ کی مرضی سے دی جا رہی تھی۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ تو اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔ اگر آپ کو قتل کرنا اور پھانسی دینا یہ ایک طاعت و عبادت تھی تو پھر جو یہود یہ کام کر رہے تھے وہ عبادت بجالا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے تھے۔ بنا بریں وہ مدح و ستائش کے مستحق تھے نہ کہ مذمت کے۔ یہ عظیم ترین کفر و جہالت

ہے۔ عام شیوخ و فقراء بھی اسی قسم کے تضاد میں مبتلا ہیں، ایک طرف وہ بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے اور دوسری طرف ضعف و عجز کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”تین آدمی ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کریں گے اور نہ ہی انہیں پاک و صاف کریں گے اور ابو معاویہ فرماتے ہیں کہ اور نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور مفلس تکبر کرنے والا۔“ ایک روایت میں عیال دار متکبر کے الفاظ ہیں: ^①

ایک مفلس و فلاش آدمی کے اظہار فخر و غرور کا طرز و انداز یہ ہے کہ جب وہ کبر و غرور پر اترے تو اپنے آپ کو اللہ کا جانشین قرار دے اور یہ کہے کہ میرے سوا کوئی رب ہے نہ رسول۔ اس کا انجام یہ ہو کہ وہ بھیک مانگنے پر اتر آئے اور لوگوں سے روٹی کے ٹکڑے طلب کرتا پھرے؛ یا ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف مدد طلب کرتا پھرے؛ اور ایک لقمہ تک کا محتاج ہو؛ ایک لفظ زبان پر لانے سے ڈرتا ہو۔ تو پھر کہاں یہ فقر و ذلت اور رسوائی اور کہاں وہ رب ہونے کا دعویٰ جو کہ عزت و غلبہ اور تو نگری کو متضمن ہے۔ یہ ان مشرکین کا حال ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِينٍ﴾

”اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھرے اڑ جائیں گے۔“ [الحج ۳۱]

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (العنكبوت: ۳۱)

”جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنایا ان کی مثال ایک مکڑی جیسی ہے جس نے ایک گھر بنایا ہوا اور سب سے کمزور ترین گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے، اے کاش! کہ انہیں معلوم ہوتا۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانٌ﴾ [العمران ۱۵۱]

”عنقریب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔“

عیسائیوں میں شرک واضح طور پر پایا جاتا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا

① سنن نسائی۔ کتاب الزکاة، باب الفقیر المختال (ح: ۲۵۷۶) وصحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب بیان غلط تحریم اسباب الازار (ح: ۱۰۷)۔

إِنَّمَا وَاحِدًا لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿التوبة ۳۱﴾

”انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

یہی حال ان کی مشابہت اختیار کرنے والے نساک اور غالی شیعہ کا بھی ہے۔ ان میں انتہائی درجہ کا شرک اور غلو پایا جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے نصاریٰ میں شرک اور غلو پایا جاتا ہے۔ جب کہ یہودیوں میں تکبر پایا جاتا ہے۔ متکبر آخر کار ہمیشہ ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَتَقَفُوا إِلَّا يَحْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَ حَبِلَ مِنَ النَّاسِ وَ بَاءُ وَ بَغْضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ يَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ (آل عمران: ۱۱۲)

”ان پر ذلت و رسوائی چھا گئی تھی وہ جہاں بھی ہوں مگر یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں ہوں یا لوگوں کی پناہ میں آجائیں۔ وہ مورد غضب الہی ہوئے اور ان پر مسکینی چھا گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آیات الہی کے ساتھ کفر کرتے انبیاء کو بلاوجہ تہ تیغ کرتے اللہ کے نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔“

پس روافض میں ایک وجہ سے یہود کی مشابہت پائی جاتی ہے اور ایک وجہ سے نصاریٰ کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں شرک، غلو اور باطل کی تصدیق میں نصاریٰ کی مشابہت پائی جاتی ہے؛ جب کہ دوسری طرف بزدلی، تکبر، حسد اور حق کی تکذیب کرنے میں یہودیوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہی حال رافضیوں کے علاوہ دوسرے گمراہ اہل بدعت فرقوں کا ہے۔ ان میں گمراہی بھی پائی جاتی ہے اور سرکشی و بغاوت بھی، اور دوسری جانب شرک و تکبر بھی ان میں موجود ہوتا ہے۔

لیکن رافضی اس میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ سب سے بڑھ چڑھ کر اللہ کے گھروں کو ویران کرنے والے ہیں۔ ان کے ہاں مسجدوں میں نماز جمعہ اور باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ باجماعت نماز کا اجتماع اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین اجتماع ہوتا ہے۔

ایسے ہی رافضی کفار اور مشرکین اعداء دین سے جہاد بھی نہیں کرتے۔ بلکہ آپ اکثر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرتے ہیں، اور ان سے مدد لیتے ہیں۔ اہل ایمان اولیاء اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں مشرکین اور اہل کتاب سے دوستیاں پالتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے بہتر لوگوں مہاجرین و انصار اور تابعین کرام رضی اللہ عنہم سے دشمنی و عداوت رکھتے ہیں۔ اور مخلوق میں سب سے بڑے کفار اسماعیلیہ اور نصیریہ اور طہدین سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔ اگرچہ انہیں کافر بھی کہتے ہیں۔ مگر ان کے دل اور ان کے بدن مہاجرین و انصار اور تابعین کرام رضی اللہ عنہم جیسے سچے مسلمانوں اور جمہور اہل اسلام کی نسبت ان کافروں کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔

اہل ہوی و اہل بدعت فرقوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے؛ حتیٰ کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو علم کلام، فقہ، حدیث اور

تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ مگر ان میں اس کا ایک شعبہ پایا جاتا ہے۔
مگر رافضیوں میں تمام بدعتی فرقوں سے بڑھ کر گمراہی و سرکشی اور جہالت پائی جاتی ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پچیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پچیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ (المائدة: ۵۴)

”اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو اس سے محبت کرتے ہوں گے اور اللہ ان سے محبت کرتا ہوگا۔“

نشابی کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ سے افضل تھے۔ لہذا وہی امام و خلیفہ ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: اس کا جواب کئی لحاظ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: ہم کہتے ہیں کہ یہ شابھی پر افتراء ہے، شابھی اس آیت کی تفسیر میں لکھتا ہے: ”علی بن ابی طالب و قوادہ و حسن و مجتہدین

کا قول ہے کہ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء مراد ہیں۔ مجاہد رضی اللہ عنہ نے اس سے اہل یمن مراد لیا ہے۔“

انہوں نے حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ والی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے؛ کہ اس سے مراد اہل یمن ہیں۔ اور حدیث

میں آتا ہے: ”تمہارے پاس اہل یمن آئیں گے۔“ [رواہ البخاری؛ کتاب المغازی]

نشابی نے تو یہ نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء مراد لیتے ہیں۔

جب کہ باقی ائمہ تفسیر میں سے امام طبری رضی اللہ عنہ نے شنی سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے عبد اللہ بن ہاشم نے

بیان کیا؛ وہ سیف بن عمر سے؛ وہ ابی روق سے؛ وہ ضحاک سے؛ وہ ابویوب سے اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس آیت:

﴿يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ يَزِيدَ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ﴾ ”اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے مرتد

ہو جائے گا“ کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کو مومنین کا علم تھا؛ اور یہ برے معانی منافقین کی

مذمت میں ہیں؛ اللہ تعالیٰ کو ان کے بارے میں معلوم تھا کہ یہ اپنے دین سے پھر جائیں گے؛ اس لیے فرمایا: ﴿مَنْ يَزِيدَ

مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ﴾ یعنی اگر تم اپنے دین سے پھر جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا؛ جو

مرتدین کے ٹھکانوں پر آدھمکیں گے؛ [وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ] ﴿بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ ”اللہ تعالیٰ ان سے محبت

کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔“ یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء و اصحاب ہیں۔“

نیز امام طبری نے اپنی سند سے یہی قول ضحاک؛ قوادہ؛ حسن اور ابن جریر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے؛ ان کے کہنا ہے

کہ: قوم سے مراد انصار ہیں۔ اور کچھ دوسرے لوگوں نے کہا ہے: ”قوم سے مراد اہل یمن ہیں۔“

اور بعض لوگوں نے اس آخری معنی کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قوم کے

لوگ ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں: ”اگر اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ حدیث ثابت نہ ہوتی تو میں

بھی وہی بات کہتا جو دوسرے لوگوں نے کہی ہے کہ اس سے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء ہیں۔“

نیز آپ فرماتے ہیں: ”جب اہل ارتداد اپنے دین سے پھر گئے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لے آیا۔“ [تفسیر الطبری ۱۰/ ۴۱۱]

❁ دوسری بات: شیعہ مصنف کے پاس اپنے دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں۔ پس اس کو مان لینا کوئی ضروری نہیں۔
❁ تیسری بات: یہ قول مشہور و معروف تفسیر کے منافی ہے۔ مشہور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کرام ہیں۔ جنہوں نے آپ کے ساتھ اہل ارتداد سے جنگیں لڑیں۔ یہ تفسیر لوگوں کے ہاں معروف ہے؛ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن شیعہ کذاب یہ چاہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں وارد ہونے والی آیات و احادیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے قالب میں ڈھال دیں؛ لیکن یہ بری اور بدیتی پڑتی تدبیریں خود ان کے گلے کا طوق بنیں گی: [ان شاء اللہ]۔

میرے ایک قابل اعتماد ساتھی نے مجھے بتایا کہ میں ایک شیخ کے پاس گیا؛ جسے میں بھی جانتا ہوں؛ اس شیخ میں دین و زہد تھا اور اس کے احوال معروف تھے؛ اس میں شیعیت کا عنصر پایا جاتا تھا۔ [میرا دوست] کہتا ہے: اس (شیخ) کے پاس ایک کتاب تھی؛ جس کی وہ بہت زیادہ تعظیم کرتا تھا؛ اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس میں رازداری کی باتیں درج ہیں؛ اور اس نے یہ کتاب خلفاء کے خزانوں سے حاصل کی ہے۔ اس نے کتاب کی مدح سرائی میں خوب مبالغہ کیا؛ جب وہ کتاب سامنے لا کر رکھی گئی تو اس میں بخاری و مسلم کی وہ روایات تھیں جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل میں ہیں؛ اور انہیں رخ موڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں شمار کیا گیا تھا۔

شائد کہ یہ کتاب بنو عبید کے خزانوں میں سے حاصل کی گئی ہو؛ اس لیے کہ ان کے قریبی لوگ لحد اور زندقہ تھے جو اسلامی تھائق کو موڑ توڑ کر رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے وین کے نقض پر ایسی احادیث گھڑی ہیں جن کے بارے میں صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جاہل لوگ انہیں دیکھ کر گمان کرتے ہیں یہ روایات بھی بخاری و مسلم سے لی گئی ہیں۔ جب کہ وہ لوگوں میں جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے غلط بات کو رواج وے رہے ہیں۔

انہیں اس بات کا علم نہیں کہ جب ہم کہتے ہیں: بخاری و مسلم [نے یہ روایت ذکر کی ہے] تو ہمارے پاس ایسی نشانیاں موجود ہیں جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ صرف بخاری اور مسلم کے روایت کر لینے سے وہ صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ بلکہ بخاری و مسلم کی روایات ان کے علاوہ اتنے علماء نے روایت کی ہیں جن کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی روایت کرنے میں یہ دونوں امام منفرد نہیں ہیں؛ بلکہ ان سے پہلے اور ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی لوگوں کی جماعتوں نے انہیں روایت کیا ہے۔ اگر امام بخاری و مسلم نہ بھی پیدا ہوتے تب بھی اللہ کے دین میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اور یہ احادیث اپنی اسانید کے ساتھ موجود تھیں؛ جس سے مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو یہ بالکل اس قول کی طرح ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں: قرأت سبجہ میں یوں ہے۔ قرآن تو اتر کے ساتھ منقول ہے۔ ان ساتوں قراء کے ساتھ اس میں سے کوئی بھی چیز خاص نہیں ہے۔ ایسے ہی حدیث کی تصحیح کا مسئلہ بھی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس بارے میں بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ وہ جمہور روایات جن

کو ان دونوں حضرات نے صحیح کہا ہے؛ وہ ان سے پہلے ائمہ حدیث کے صحیح اور قابل قبول تھیں۔ اور ایسے ہی ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد بھی اس فن کے ائمہ نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا: اور ان کی تصحیح پر موافقت کا اظہار کیا؛ سوائے چند ایک مواقع کے؛ جو کہ تقریباً بیس احادیث ہیں؛ ان میں سے بھی زیادہ مسلم شریف میں ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ان حضرات کی روایت کردہ احادیث کو ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی اس فن کے ماہرین نے جانچ پرکھ کے میزان سے گزرا ہے؛ اور ان پر تنقید و بحث کی ہے۔ اور ان احادیث کو اتنی خلقت نے روایت کیا ہے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ پس یہ ائمہ نہ حدیث کے روایت کرنے میں منفرد ہیں؛ اور نہ ہی اس کو صحیح کہنے میں۔

خلاصہ کلام! اللہ تعالیٰ ہی اس دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے؛ فرمانِ الہی ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

”بیشک ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے؛ اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

چوتھی بات: لوگوں میں تواتر کے ساتھ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مرتدین کے ساتھ قتال کرنے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے ہی مسیلہ کذاب اور اس کے اتباع کا قبیلہ بنو حنیفہ اور اہل یمامہ سے جنگ کی تھی؛ مسیلہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اور آپ نے ہی طلحہ اسدی سے جنگ کی جس نے نجد کے علاقہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ بنو تمیم؛ بنو اسد اور بنو غطفان نے اس کی اطاعت گزاری شروع کر دی تھی۔ ایسے ہی سباع نامی ایک عورت نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؛ پھر اس نے مسیلہ کذاب کے ساتھ شادی کر لی؛ یوں جھوٹا اور جھوٹی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

مرتدین سے جنگ کرنے والے ہی وہ لوگ تھے جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے تھے۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

ایسے ہی وہ تمام لوگ جنہوں نے اہل روم و فارس سے قتال کیا؛ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے رفقاء اور اہل یمین اور دوسرے لوگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”اس کی قوم کے لوگ ہیں۔“ [تفسیر الطبری ۱۰/۴۱۱]

یہ بات تواتر کے ساتھ مشہور اور یقینی طور پر معلوم شدہ ہے کہ جو لوگ فتنہ ارتداد کے وقت دین اسلام پر ثابت قدم رہے؛

اور جنہوں نے کفار و مرتدین سے قتال کیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں شامل ہیں: [فرمانِ الہی ہے:]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ [آل عمران ۵۴]

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کرو گے جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔“

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے؛ لیکن آپ میں یہ صفت حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے زیادہ نہیں پائی جاتی۔ اور نہ ہی آپ کا کفار و مرتدین کے ساتھ جہاد ان حضرات کے جہاد سے بڑھ کر تھا؛ اور نہ ہی آپ کی وجہ سے دین کے لیے کوئی ایسی مصلحت حاصل ہوئی جو ان تینوں خلفاء کے ذریعہ حاصل ہونے والی مصلحت سے بڑھ کر ہو۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی کوششیں قابل صد شکر گزاری ہیں۔ ان کے نیک اعمال کے اچھے اثرات اسلام میں موجود ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں ان اعمال پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ حضرات خلفاء راشدین اور ائمہ رشد و ہدایت ہیں۔ جو حق کے مطابق چلتے تھے اور عدل و انصاف سے کام لیتے تھے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ائمہ اہل سنت والجماعت جن کی وجہ سے دین و دنیا میں بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا؛ ان کو کافرو فاسق اور ظالم کہے؛ اور پھر ایسے انسان کی طرف آئے؛ جس کی وجہ سے دین و دنیا کا کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں ہوا جیسا ان سابقہ تین حضرات سے ہوا ہے؛ اور اس صحابی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنائے؛ یا رسول اللہ ﷺ کا شریک بنائے؛ یا ایسا امام معصوم قرار دے؛ [اور یہ کہے کہ]؛ ایمان والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو اسے امام معصوم اور منصوص علیہ ماننے ہوں گے؛ اور جو اس دائرے سے خارج ہو؛ اسے کافر کہیں۔ اور جن کفار اور مرتدین سے ان خلفاء نے قتال کیا تھا؛ انہیں مسلمان قرار دے؛ اور جو اہل ایمان پانچ نمازیں پڑھتے؛ رمضان کے روزے رکھتے؛ بیت اللہ کا حج کرتے؛ اور قرآن پر ایمان رکھتے تھے؛ انہیں ان منافقین و مرتدین سے جنگ لڑنے کی وجہ سے کافر قرار دے۔ یہ کام صرف وہی انسان کر سکتا ہے جو انتہائی جھوٹا؛ کذاب؛ جاہل اور ظالم ہو؛ اور دین اسلام میں الحاد و کفر و فحشاء دینا چاہتا ہو۔ یہ ایسا انسان ہی ہو سکتا ہے جس کا نہ ہی کوئی دین و ایمان ہو اور نہ ہی علم و عقل۔

علماء کرام رحمہم اللہ ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ: رافضیت کی بنیاد رکھنے والا زندیق اور طحطا تھا۔ جس کا مقصد دین کو خراب کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رافضیت کو زنادقہ؛ لحدین؛ غالیہ معطلہ نصیریہ اور اسماعیلیہ [اور ان جیسے دوسرے کافر فرقوں] کی پناہ گاہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہ پہلی سوچ اور آخری کام تھا۔ رافضیت کا موجد دین اسلام میں فساد پیدا کرنا اور اس کی رسیوں کو توڑنا؛ اور اس کو جڑوں سے اکھاڑنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس کے دل کے وہ بھید ظاہر ہو گئے جنہیں وہ چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کا دین پورا رہے بھلے کافروں کو یہ بات ناگوار ہی کیوں نہ گزرتی ہو۔ یہ باتیں عبد اللہ بن سہاء اور اس کے تبعین کے بارے میں مشہور ہیں۔ اسی نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام منصوص ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور آپ کے بارے میں معصوم ہونے کا قول ایجاد کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ امامی شیعہ حقیقت میں مرتدین کے پیروکار اور طحطا کے غلام اور منافقین کے وارث ہیں۔ اگرچہ یہ خود بڑے لحد [و منافق] اور مرتد نہ بھی ہوں۔

پانچویں بات: ان سے کہا جائے گا: تصور کیجیے یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ تو پھر بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے؛ جب کہ اس کے الفاظ میں تصریح موجود ہے کہ وہ لوگ جماعت ہیں؛ [کوئی فرد واحد نہیں] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کافر مان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أُولَئِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرا لے کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔“

”کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے“ کے الفاظ تک صاف صراحت موجود ہے کہ یہ حضرات کوئی ایک آدمی نہیں؛ اس لیے کہ عرب لغت میں ایک آدمی کو کسی بھی صورت میں حقیقتاً مجازاً قوم نہیں کہا جاتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ: اس سے مراد آپ کے شیعہ ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: جب آیت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہیں؛ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جن لوگوں نے کفار و مرتدین کے ساتھ جنگیں لڑیں وہ اس آیت کی تفسیر میں داخل ہونے کے اس انسان کی نسبت بڑے حق دار ہیں جس نے اہل قبلہ کے علاوہ کسی سے بھی قتال نہ کیا ہو۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اہل یمن جنہوں نے حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر جہاد کیا؛ وہ ان رافضیوں کی نسبت اس آیت میں داخل ہونے کے زیادہ حق دار ہیں؛ جو [رافضی] یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے دوستی رکھتے ہیں؛ اور سابقین اولین اہل اسلام سے دشمنی کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑنے والوں میں بہت سارے لوگ اہل یمن تھے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: جن لوگوں نے آپ سے جنگ کی؛ ان میں بھی بہت سارے لوگ اہل یمن تھے۔ دونوں لشکر میں اہل یمن اور قبیلہ قضیہ کے بہت زیادہ لوگ موجود تھے۔ یمن کے اکثر لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ جیسے ذی الکلاع کے لوگ؛ ذی عمرو؛ ذی رعیان؛ اور دوسرے لوگ جنہیں ”الذوین“ کہا جاتا ہے۔

چھٹی بات: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ ”اللہ تعالیٰ بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا“ یہ لفظ مطلق ہے؛ اس میں کسی کو بھی متعین نہیں کیا گیا۔ یہ لفظ ان تمام لوگوں کو شامل ہوگا جو ان صفات سے بہرہ ور ہو گئے؛ بھلے وہ کوئی بھی ہوں۔ یہ الفاظ نہ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہیں اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ جب کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں تو ان کا شمار کسی کے خصائص میں سے نہیں ہوگا۔ تو اس سے یہ نظریہ باطل ہو گیا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ ان اوصاف میں شریک ہیں آپ ان سے افضل ہوئے؛ کجا کہ اس سے امامت کو واجب سمجھا جائے۔

بلکہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ قیامت تک کوئی بھی انسان اس دین سے مرتد نہیں ہوگا؛ مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایسی قوم کو لے آئیں گے جو اس سے محبت کرتی ہوگی؛ اور وہ ان سے محبت کرتا ہوگا؛ اس قوم کے لوگ اہل ایمان پر بڑے نرم اور کفار

پر بڑے سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں مرتدین سے جہاد کریں گے۔

ارتداد کبھی اصل اسلام سے ہوتا ہے؛ جیسے غالیہ نصیریہ اور اسماعیلیہ کی حالت ہے؛ اہل سنت اور شیعہ کا ان کے مرتد [اور کافر] ہونے پر اتفاق ہے۔ اور جیسے العباسیہ۔

اور کبھی ارتداد دین کے بعض امور سے ہوتا ہے؛ جیسا کہ اہل بدعت رافضہ اور دوسرے لوگوں کا حال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو کھڑا کر دے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا؛ اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ لوگ دین سے پھر جانے والوں؛ یا دین کے کچھ حصے کو ترک کر دینے والوں سے جہاد کریں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کھڑا کیا ہے جو ہر زمانے میں مرتد رافضیوں کے خلاف برسر پیکار رہے ہیں۔ اور انہیں کسی کا کوئی بھی خوف نہیں ہوگا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ اس کی راہ میں کسی بھی خوف و ملامت کے بغیر جہاد کرتے ہیں۔ آمین۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھبیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھبیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ وَالشَّهَادَةُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الحديد: ۱۹)

”اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔“

امام احمد بن حنبل ابن ابی لیلیٰ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”صدیق تین ہیں: حبیب بن موسیٰ نجار، موسیٰ آل یاسین، جس نے کہا تھا: ”اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی بات

مان لو۔“ حزقیل بن موسیٰ آل فرعون؛ جس نے کہا تھا: ”کیا تم کسی آدمی کو اس وجہ سے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا

رب اللہ ہے۔“ اور تیسرا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور یہ تینوں میں سے افضل ہیں۔“

ایسی ہی روایت ابن مغازلی شافعی نے اور کتاب ”الفرعوس“ کے مصنف نے بھی روایت کی ہے۔ یہ ایسی فضیلت ہے

جو آپ کی امامت پر دلالت کرتی ہے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]:

پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے۔ اس لیے کہ امام احمد کی تمام مرویات

صحیح نہیں ہیں۔ کسی روایت کے آپ کی کتاب ”الفضائل“ کی طرف منسوب ہونے سے اس کی صحت ثابت نہیں

ہو جاتی؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ”الفضائل“ کی ہر روایت کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ [اس

کتاب میں] آپ وہی روایات نقل کرتے ہیں جو لوگ روایت کر رہے ہوں؛ بھلے ان کی صحت ثابت نہ ہو۔ بلکہ ”المسند“

میں بھی جمع کردہ آپ کی ہر روایت کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ آپ کی مسند کی احادیث لوگ دوسرے معروف راویوں

سے نقل کرتے ہیں؛ جب تک کہ ان میں کوئی ایسی قدر کی علامت ظاہر نہ ہو۔ اس لیے کہ بعض احادیث میں ایسی

علت موجود ہے جس کی وجہ سے وہ حدیث ضعیف ہی نہیں بلکہ باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی اکثر احادیث صحیح اور قابل حجت ہیں۔ اور سنن ابی داؤد کی احادیث سے زیادہ عمدہ ہیں۔ جب کہ ”الفصائل“ میں جمع کردہ احادیث کا معاملہ ایسے نہیں ہے۔

محدث کے ہاں کبھی حدیث میں غلطی ثابت ہوتی ہے؛ یا راوی کے علم کے بغیر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حدیث میں جھوٹ کے آثار کا پتہ چل جاتا ہے۔

اہل کوفہ کے ہاں سچ اور جھوٹ آپس میں مل گیا تھا۔ متاخرین پر بسا اوقات ان میں سے کسی ایک کی غلطی یا اس کا جھوٹ مخفی رہ جاتا ہے۔ لیکن کسی دوسری دلیل سے اس کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ یہ روایت امام احمد نے اپنی ”المسند“ میں ذکر کی ہے نہ ”الفصائل“ میں۔ بلکہ القطعی نے محمد بن یونس القرشی سے روایت کرتے ہوئے اس کا اضافہ کیا ہے؛ وہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛ اور پھر مذکورہ حدیث بیان کی۔

القطعی نے اسے ایک دوسری سند سے بھی نقل کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہماری طرف عبد اللہ بن غنم کوئی نے لکھا کہ ہم نے حسن بن عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ نایبنا سے سنا اس نے عمرو بن جمیع سے سنا۔

عمرو بن جمیع ناقابل اعتماد انسان ہے؛ اس کی روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ محدث ابن عدی رحمہ اللہ عمرو بن جمیع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ وضاع ہے [اپنی طرف سے روایات گھڑتا رہتا ہے]۔

یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انتہائی خبیث اور جھوٹا ہے۔

امام نسائی اور دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: متروک الحدیث ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جھوٹی روایات کو ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے روایت کرتا ہے۔ اور منکر احادیث کو

مشہور لوگوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس کی روایت کو لکھنا حلال نہیں ہے؛ صرف عبرت کے لیے لکھا جائے تو ٹھیک ہے۔

❀ دوسری بات: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔

❀ تیسری بات: علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کچھ اور لوگ بھی صدیق کے لقب سے ملقب تھے؛ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کہا جاتا تھا؛ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صدیق صرف تین ہیں؟

بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کوہ احد پر چڑھے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی

تھے۔ پہاڑ کا نپا تو آپ نے فرمایا: ”احد (کے پہاڑ) ٹھہر! تجھ پر تو صرف ایک نبی ہے ایک صدیق اور دو شہید۔“❶

اسے امام احمد نے یحییٰ بن سعید؛ انہوں نے قتادہ سے؛ اور انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ احد کے پہاڑ پر زلزلہ آگیا۔ [مسند ۱۱۲/۳]

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذًا خليلاً“ (ح: ۳۶۷۵)،

صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل طلحة والزبير رحمہ اللہ (حدیث: ۲۴۱۷)۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ؛ بیشک جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔“^①

چوتھی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو بھی صدیقہ کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صدیق صرف تین ہی ہیں؟

پانچویں بات: قائل کا یہ کہنا کہ: ”صدیق صرف تین ہیں“ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی صدیق نہیں تو پھر یہ سراسر جھوٹ اور کتاب و سنت اور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ اور اس اگر سے مراد یہ ہو کہ اپنی صدیقیت میں یہ تین لوگ کامل تھے؛ تب بھی یہ خطا ہے۔ اس لیے کہ ہماری امت سب امتوں میں سے بہترین امت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے پیدا کیا ہے؛ تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے محمد ﷺ کی تصدیق کرنے والوں سے افضل کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے مؤمن کو صدیق نہیں کہا؛ اور نہ ہی آل یاسین کے فرد کو صدیق کہا ہے؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کی تھی۔ لیکن محمد ﷺ کی تصدیق کرنے والے ان سے زیادہ افضل ہیں۔

قرآن کریم میں بعض انبیاء کو بھی صدیق کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں فرمایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (مریم: ۴۱)

”اس کتاب میں ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کر، بیشک وہ بڑی سچائی والے پیغمبر تھے۔“

[اور حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:]

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (مریم: ۵۶)

”اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کر، وہ بھی نیک کردار پیغمبر تھے۔“

[اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:] ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ [یوسف: ۲۶]

”یوسف! اے دوست۔“

چھٹی بات: عام لوگوں کے حق میں فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ﴾ (الحديد: ۱۹)

”جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیق ہیں۔“

یہ آیت اس امر کی مقتضی ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ صدیق ہے۔

ساتویں بات: اگر صدیق ہی امامت کا مستحق ہو سکتا ہے؛ تو پھر اس مقام کے سب سے زیادہ حق دار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

① صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب قبح الکذب وحسن الصدق، (حدیث: ۲۶۰۷ / ۱۰۵)، واللفظ له۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول الله تعالى ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ﴾ (حدیث: ۶۰۹۴)۔

تھے۔ اس لیے کہ بہت سارے دلائل کی روشنی میں خواص و عوام میں تواتر کے ساتھ یہ نام آپ کے لیے ثابت ہے۔ یہاں تک اسلام کے دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ پس اس لیے امامت و خلافت کے سب سے زیادہ مستحق آپ ہی ہوئے۔ اور اگر صدیق ہونے سے امامت و خلافت لازم نہیں آتی تو پھر رافضی کی دلیل باطل ٹھہری۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ستائیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ستائیسویں دلیل درج ذیل آیت ہے:

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾ (البقرہ: ۲۷۴)

”جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن میں چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں۔“

ابو نعیم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ: ”یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے پاس چار درہم تھے۔ ایک درہم رات کے وقت خرچ کیا ایک دن کے وقت ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ ایسی روایت ثعلبی نے بھی ذکر کی ہے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس فضیلت میں منفرد ہیں، لہذا امام بھی وہی ہیں۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی باتیں ہیں:

❖ پہلی بات: ہم اس نقل کا ثبوت طلب کرتے ہیں؛ اس لیے کہ ثعلبی اور ابو نعیم کی روایات اس [واقعہ] کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔

❖ دوسری بات: ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ روایت صریح کذب ہے۔ اس کی کوئی بھی صحیح سند ثابت نہیں۔

❖ تیسری بات: یہ آیت ہر خرچ کرنے والے کے بارے میں عام ہے جو رات اور دن کو؛ اور علانیہ اور چھپے سے خرچ کریں۔ جو بھی اس پر عمل کرے؛ وہ اس کے حکم میں داخل ہوگا؛ خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں یا پھر کوئی دوسرا۔ یہ بات متمنع ہے کہ اس میں شخص واحد کے علاوہ کوئی دوسرا انسان داخل نہ ہو سکتا ہو۔

❖ چوتھی بات: مصنف نے جو دلیل ذکر کی ہے؛ وہ آیت کے مدلول سے متناقض ہے۔ اس لیے کہ آیت ان دو زمانوں میں خرچ کرنے کا بیان کر رہی ہے جن سے کوئی بھی وقت خالی نہیں ہو سکتا؛ اور ان دو حالتوں کا بیان کر رہے ہیں کہ کوئی بھی فعل ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی کام کے کرنے کے لیے کوئی زمانہ ہونا چاہیے؛ اور زمانہ یا تو رات ہے؛ اور یا پھر دن ہے۔ جب کوئی انسان رات کو خرچ کرتا ہے؛ تو یقیناً وہ خفیہ طور پر خرچ کرنے والا ہے؛ اور جب دن کو خرچ کرتا ہے تو علانیہ خرچ کرنے والا ہے؛ اس لیے کہ سر اور علانیہ خرچ کرنے اور شب و روز کرنے میں تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ جو شخص ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتا ہے وہ شب و روز بھی خرچ کرتا ہے۔ اور جو شب و روز بھی خرچ کرتا ہے وہ سر اور علانیہ بھی خرچ کرتا ہے۔

پس جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد ایک درہم خفیہ طور پر اور ایک درہم علانیہ طور پر اور ایک درہم رات کو اور ایک درہم دن کو خرچ کرنا مراد ہے؛ وہ بڑا جاہل انسان ہے۔ اس لیے کہ خرچ کرنے والا کبھی رات کو بھی علانیہ خرچ کر سکتا ہے؛ اور کبھی دن کو بھی چھپا کر خرچ کر سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک درہم کو دو نصف درہم میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔ لہذا یہ ضروری

نہیں کہ آپ کے پاس چار درہم ہوں؛ خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں یا کوئی دوسرا ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾ (البقرہ: ۲۷۳)

”جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن میں چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں۔“

یہاں پر [النہار سراً] میں حرف عطف واؤ نہیں لایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رافضی قرآنی اندازِ دلالت سے بالکل جاہل ہے۔ اور رافضیوں میں اس قسم کی جہالت کا پایا جانا کوئی اچھوتی بات نہیں ہے۔

اس آیت کے معانی سے جاہل انسان اس وہم کا شکار ہو گیا کہ جو خفیہ طور پر اور اعلانیہ خرچ کرتا ہے وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہے جو دن و رات میں خرچ کرتا ہے؛ اس لیے وہ کہتا ہے کہ: یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کے پاس چار درہم ہوں۔ بلکہ سراً و علانیہ دونوں لیل و نہار (شب و روز) میں بھی داخل ہیں خواہ سراً و علانیہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہوں یا حال ہونے کی وجہ سے۔

پانچویں بات: اگر مان لیا جائے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ اور آپ نے ایسا کیا بھی تھا؛ تو کیا چار درہم کے چار احوال میں خرچ کرنے کے علاوہ اللہ کی راہ میں کوئی خرچہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عمل تو ایسا ہے کہ ہر شخص کے لیے خرچ کرنے کا دروازہ کھلا ہے اور تاقیامت کوئی ممانعت نہیں۔ اور اس پر عمل کرنے والے بلکہ اس سے کئی گنا بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اعداد و شمار ممکن نہیں؛ اور ان میں سے ہر ایک میں خیر و بھلائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس میں نہ ہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی اس سے فضیلت اور امامت ثابت ہوتی ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھائیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھائیسویں دلیل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وہ روایت ہے جو انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ”اے ایمان والو“ آیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے رئیس و امیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اصحاب رسول کو معتبور کیا ہے، مگر علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہمیشہ مدحیہ انداز میں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں۔ لہذا آپ ہی امام ہوئے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: ہم شیعہ سے زیر تبصرہ روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ روایت امام احمد نے نقل نہیں کی، اور اگر بالفرض امام صاحب نے ”الفضائل“ وغیرہ میں نقل بھی کی ہو تو صرف نقل کرنے سے روایت کی صحت و صداقت ثابت نہیں ہوتی؛ تو پھر کیسے کوئی بات کہہ سکتے ہیں جب کہ آپ نے یہ روایت نہ ہی مسند میں نقل کی ہے اور نہ ہی الفضائل میں۔ بلکہ یہ روایت ”فضائل صحابہ“ میں القطعی کے اضافات میں سے ہے۔ اس کی سند یہ ہے:

عن ابراهيم بن شريك الكوفي؛ حدثنا ذكرى بن يحيى الكسائي حدثنا عيسى عن علي بن بذيمة عن عكرمة عن ابن عباس۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ ایسی سند قابل حجت نہیں ہو سکتی۔ [در اصل یہ ابن عباس پر افتراء ہے]۔ اس روایت کی سند میں زکریا بن یحییٰ الکسائی نامی راوی ہے۔ اس کے متعلق یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”انہائی برا آدمی تھا؛ اپنی طرف سے حدیثیں گھڑا کرتا تھا؛ اس بات کا مستحق تھا کہ اس کے لیے کنواں کھود کر اس میں گرا دیا جائے۔“

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”متروک الحدیث ہے۔“

ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”صحابہ کرام پر طعنہ زنی کے لیے روایات گھڑا کرتا تھا۔“

❖ دوسری بات: یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔ بخلاف ازیں ابن عباس سے بتواتر منقول ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے تھے۔ ابن عباس نے کئی دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معتبوب کیا اور ان کی مخالفت کی۔ کئی امور میں آپ پر تنقید کیا کرتے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان زنادہ مکونذ رآتش کیا تھا جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب ماننا شروع کر دیا تھا؛ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر علی رضی اللہ عنہ کی جگہ میں ہوتا تو زنادہ کو جلانے کی بجائے ان کو قتل کر دیتا، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ”کسی کو عذاب الہی میں مبتلا نہ کرو۔“^❶

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جو کوئی اپنے دین کو بدل ڈالے؛ اسے قتل کر دو۔“ [صحیح بخاری]

جب اس بات کی خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: ”ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے افسوس ہے۔“

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے؛ جب آپ کے پاس کتاب وسنت سے دلیل موجود نہ ہوتی تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اتباع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخالفت کی ایک مثال ہے۔

کئی ایک علماء؛ جن میں زیر ابن بکار رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام آپ کے جواب کا بھی ذکر کیا ہے کہ: جب آپ بصرہ کا مال لے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں سخت قسم کا خط لکھا۔ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو جواب دیا؛ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ”جو کچھ میں نے کیا ہے؛ وہ اس سے بہت کم ہے جو تم نے کیا ہے؛ تم نے اپنی امارت میں مسلمانوں کا خون ناحق بہایا ہے۔“

❖ تیسری بات: علاوہ ازیں صرف ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ میں مدح کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ اس لیے کہ کئی ایک مواقع پر اللہ تعالیٰ یہی الفاظ استعمال کرتے ہوئے اہل ایمان کو معتبوب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿

”اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔“

❶ صحیح بخاری، کتاب استنباط المرتدین، باب حکم المرتد (حدیث: ۶۹۲۲)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ﴾ (الستة: ١)

یہ صحاح ستہ میں ثابت شدہ بات ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی۔ جب آپ نے مشرکین مکہ کو خط لکھا۔^①

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ اس عورت کو پکڑ لائیں جس کے پاس یہ خط موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی غلطی سے بری ہیں۔ تو پھر آپ اس میں مخاطب ان لوگوں کا سردار کیسے کہا جاسکتا ہے جن کی غلطی پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ملامت کی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا إِنَّمَا أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتُ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿١٠٠﴾

”اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں؛ تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو.....“

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مال غنیمت کے ساتھ ایک آدمی کو پایا؛ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں؛ ان لوگوں نے اس کی بات کو سچا نہ مانا؛ اور اس سے مال غنیمت چھین لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ بات کو واضح اور ثابت ہو جانے دیا کریں۔ اور انہیں دنیاوی مال کی وجہ سے کبھی بھی اسلام کے مدعی کی تکذیب کرنے سے منع کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی غلطی سے بری ہیں۔ تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آپ ان کے سردار ہیں۔ اس کے امثال و نظائر بہت ہیں۔

چوتھی بات: اس قسم کے الفاظ میں سب اہل ایمان شامل ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی اس خطاب کا سبب ہو سکتا ہے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ اسکو بھی ایسے ہی شامل ہوتا ہے جیسے اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کو شامل ہوتا ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر اہل ایمان کے مابین فرق کیا جاسکے۔

✽ پانچویں بات: بعض لوگوں کا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ کہنا کہ: آپ اس آیت کے سردار ہے؛ یا اس آیت کے امیر ہیں یا اس طرح کے دیگر کلمات کہنا؛ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہو کہ وہ صحابی اس آیت کا پہلا مخاطب ہے تو پھر یہ ایک دوسری بات ہے۔ اس لیے کہ آیت میں خطاب تمام مخاطبین کو یکساں طور پر شامل

❶ صحيح بخارى، كتاب المغازى، باب غزوة الفتح (حديث: ٤٢٧٤)، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن أبى بلتعة، رَوَاهُ (حديث: ٢٤٩٤).

ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض کو بعض پر شمول خطاب کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ: آپ [یعنی حضرت علیؓ] نے سب سے پہلے اس آیت پر عمل کیا ہے۔ تو پھر بھی معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن پر حضرت علیؓ سے پہلے دوسرے لوگوں نے عمل کیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن پر حضرت علیؓ کو عمل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کا دوسرے لوگوں کو شامل ہونا؛ یا کسی دوسرے کا اس پر عمل کرنا آپ کے ساتھ مشروط ہے۔ جیسا کہ جمعہ میں امام ہوتا ہے۔ تو پھر بھی بات ایسے نہیں ہے۔ اس لیے کہ خطاب کے بعض افراد کو شامل ہونے میں دوسرے لوگوں کو شامل ہونے کی شرط نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی لوگوں پر آیت کے مطابق عمل کرنا کے وجوب دوسرے لوگوں پر واجب ہونے کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ ان لوگوں میں سب سے افضل ہیں جو آیت سے مراد ہیں؛ تو اس کی بنیاد اس پر ہو سکتی ہے کہ آپ سب لوگوں سے افضل ہیں۔ اگر آپ افضل ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس آیت سے استدلال کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور اگر ایسا کچھ ثابت نہ ہو؛ تو پھر اس آیت سے استدلال کرنا جائز نہیں رہتا۔ پس دونوں لحاظ سے اس آیت سے استدلال کرنا باطل ٹھہرا۔

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ: حضرت ابن عباسؓ حضرت علیؓ کو افضل سمجھتے تھے؛ حالانکہ یہ بات بھی حضرت ابن عباسؓ پر جھوٹ ہے؛ اور آپ سے معلوم شدہ باتوں کے خلاف ہے۔ پھر اگر مان لیا جائے کہ آپ نے ایسا کچھ کہا تھا تو پھر بھی جب جمہور صحابہ کرامؓ اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو پھر کسی ایک صحابی کا قول حجت نہیں ہو سکتا۔ چھٹی بات: شیعہ کا یہ قول کہ: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صحابہ کو معتب کیا اور حضرت علیؓ کی ہمیشہ مدح فرمائی؛ صریح کذب ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں حضرت ابوبکرؓ کو کہیں بھی معتب نہیں کیا گیا؛ اور نہ ہی حضرت ابوبکرؓ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو کبھی کوئی تکلیف پہنچی۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ میں فرمایا تھا: ارے لوگو! ابوبکرؓ کا حق پہنچاؤ، اس نے مجھے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی۔^①

احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کی نصرت فرمایا کرتے تھے۔ اور لوگوں کے آپ کے ساتھ تعارض اور اختلاف کرنے سے باز رکھا کرتے تھے۔ اور یہ بات کسی نے بھی نقل نہیں کی کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی کوئی تکلیف پہنچائی ہو۔ جیسا کہ بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ خطبہ آپ کے اس خطبہ کے بالکل برعکس ہے جو آپ نے اس وقت دیا جب حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔^② ایسا خطبہ آپ نے ابوبکرؓ کے بارے میں کبھی نہیں دیا تھا۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے ابوبکرؓ کے ساتھ بڑے بڑے عام کاموں میں حصہ لیا

① مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر (۱۲۹/۶)۔

② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب ذکر اصهار النبی ﷺ (حدیث: ۳۷۲۹، ۵۲۳۰)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل فاطمةؓ (حدیث: ۲۴۴۹)۔

کرتے تھے، جیسے ولایت؛ جنگ اور بخشیش کے سلسلہ میں مشاورت وغیرہ دیگر امور۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے کاموں میں مداخلت نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ آپ کے وزیر کی حیثیت رکھتے تھے [اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بچوں کی طرح صغیر لسن تھے]۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا؛ بنی تمیم کے بارے میں مشورہ کیا کہ ان پر کس کو متولی بنایا جائے؟ اور ان کے علاوہ دیگر امور جن میں مشاورت کی ضرورت ہوتی تھی؛ آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور فرمایا: ”مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اٹھائیں گے۔ میں نبی کریم ﷺ سے اکثر سنا کرتا تھا۔“ میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے۔ میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے، میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما گئے۔“ [سبق تخریجہ]

نبی کریم ﷺ اپنے ذاتی امور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ واقعہ افک کے بارے میں جب آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ان کی رائے پوچھی۔ اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے بھی آپ نے مشورہ کیا۔ یہ آپ کے ذاتی امور تھے۔ اس لیے کہ جب آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایسی خبر پہنچی جس کی وجہ سے آپ شک میں مبتلا ہو گئے کہ کیا آپ کو طلاق دیدیں یا اپنے نکاح میں باقی رکھیں؟ تو کبھی آپ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے سوال کرتے تاکہ اندر کی کوئی خبر مل سکے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مشورہ لیا کہ کیا انہیں رد کے رکھیں یا طلاق دے دیں؟

تو انھوں نے کہا: ”آپ پر کوئی تنگی نہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا عورتیں اور بھی بہت ہیں۔ لونڈی سے پوچھیے وہ آپ کی تصدیق کرے گی۔“ [نبی کریم ﷺ نے جب اس ضمن میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو انھوں نے کہا: ”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی بیوی ہیں ہمیں ان کے متعلق بھلائی ہی کا علم ہے۔“] [سبق تخریجہ]

چنانچہ قرآن کریم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں آباد رکھیں جیسا کہ محبوب رسول حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا۔ اس واقعہ میں علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو ٹھکرا کر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ [حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے یقیناً بڑا ہے۔]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس مشورہ میں شریک ہوا کرتے تھے اور آپ کی ازدواجی مطہرات سے بات چیت کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”اے عمر! تم نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی بیویوں کے مابین ہر چیز میں دخل دینا شروع کر دیا ہے۔“

اور وہ کلی اور عام امور جو تمام مسلمانوں کو شامل ہوا کرتے تھے؛ جب ان کے بارے میں کوئی خاص دجی نہ ہوتی تو آپ ﷺ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیا کرتے؛ اگرچہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس مشورہ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ مگر شوری میں اصل کردار ان دو حضرات کا ہوا کرتا تھا۔ اور بیشتر اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت میں قرآن نازل ہوا کرتا؛ اور کبھی آپ کے خلاف حق واضح ہوتا تو آپ اپنی رائے رجوع کر لیتے۔

جب کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ علم نہیں ہو سکا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کی کسی بات پر انکار کیا ہو۔ اور نہ ہی

آپ پر کسی چیز کو مقدم رکھا کرتے۔ سوائے اس کے بنی تمیم پر متولی مقرر کرنے کے مسئلہ ان دونوں حضرات میں اختلاف ہوا؛ حتیٰ کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ﴾ [الحجرات ۲]

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو۔“

اس واقعہ میں نبی کریم ﷺ کے لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا والے واقعہ سے بڑھ کر اذیت نہیں ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُذَوِّا رَسُولَ اللَّهِ﴾ [الأحزاب ۵۳]

”اور تمہارے لیے ہرگز یہ مناسب نہیں کہ تم رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف دو۔“

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ [النساء ۴۳]

”اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔“

یہ اس وقت ہوا جب نشر کی حالت میں نماز پڑھی اور اس کی قرأت میں خلط ملط ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر دستک دے کر دریافت فرمایا:

”کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھ رہے؟“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں جب چاہتا ہے جگا دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ یہ سن کر

افسوس کے عالم میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چل دیئے، زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْفَرُ شَيْءٍ جَدًّا﴾

”انسان جھگڑا کرنے میں سب چیزوں سے بڑھا ہوا ہے۔“ [اس کی تخریج گزر چکی ہے۔]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اثبوتیں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اثبوتیں دلیل یہ آیت ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [الأحزاب ۵۶]

”بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور

خوب سلام (بھی) بھیجتے رہا کرو۔“

صحیح بخاری میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ہم اہل بیت پر صلوة

کیسے بھیجیں؟ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ہم سلام کیسے بھیجیں؟ فرمایا، یوں کہو: ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی

مُحَمَّدٍ وَعَلَىٰ آلِ مُحَمَّدٍ“^① ”اے اللہ درود بھیج محمد ﷺ اور محمد کی آل پر۔“ صحیح مسلم میں ہے ہم نے عرض کیا:

① صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء؛ (ح: ۳۳۷۰)، مسلم۔ کتاب الصلاة، (ح: ۴۰۶)۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمیں آپ پر سلام بھیجنا تو معلوم ہو گیا؛ اب ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو:

((اللہم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی آل ابراہیم و آل ابراہیم))۔

”اے اللہ درود بھیج محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا ابراہیم پر آل ابراہیم پر“ اور بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سب آل محمد میں افضل ہیں لہذا آپ اولیٰ بالامامت ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صحیح اور متفق علیہ ہے۔ اور بیشک حضرت علی آل محمد میں سے ہیں جو اس درود میں شامل ہیں: ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ“۔ مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جمع بنی ہاشم اس میں داخل ہیں۔ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد نیز حارث بن عبدالمطلب اور اس کی اولاد؛ اور نبی ﷺ کی بیٹیاں سیدہ رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما جو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں؛ اور آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا؛۔ علاوہ ازیں آپ کی ازواج مطہرات بھی آل میں شامل ہیں۔ جیسا کہ بخاری و مسلم میں ہے:

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اَزْوَاجِهِ وَّ ذُرِّيَّتِهِ“۔ [بخاری، (ح: ۳۳۶۹)، مسلم، (ح: ۴۰۷)]

”اے اللہ رحمتیں نازل فرما محمد ﷺ پر اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔“

بلکہ قیامت تک آنے والے اہل بیت اس میں شامل ہیں۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب اور عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔

[مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ علی آل عام ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ اس میں عقیل بن ابی طالب اور ابوسفیان بن حارث بھی شامل ہیں]۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ حضرات کے صلوٰۃ و سلام میں داخل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نہ داخل ہونے والوں کی نسبت افضل ہیں اور نہ یہ کہ وہ امامت کے اہل ہیں۔ امامت کے ساتھ مختص ہونا ایک جداگانہ بات ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمار، مقداد اور ابوذر رضی اللہ عنہم کی فضیلت اہل سنت اور شیعہ کے نزدیک ایک طے شدہ بات ہے۔ حالانکہ صلوٰۃ علی آل میں وہ شامل نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت عقیل و عباس اور ان کی اولاد آل میں داخل ہے، حالانکہ سابق الذکر با اتفاق اہل سنت و شیعہ متاخر الذکر کی نسبت افضل ہیں۔ علاوہ ازیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج بھی اس میں داخل ہیں۔ حالانکہ خواتین امامت و خلافت کی صلاحیت سے محروم ہیں اور با اتفاق اہل سنت و شیعہ باقی لوگوں سے افضل بھی نہیں۔

بنابر یہ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں بھی پائی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی۔ نیز یہ کہ جو لوگ اس سے متصف ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں افضل نہیں ہیں جو اس صفت سے موصوف نہیں۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے جس میں مجھے مبعوث کیا گیا؛ پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے۔“ [بخاری]

تیسرے قرن کے بہترین لوگ تابعین ہیں۔

جملہ کی جملہ پر فضیلت سے افراد کی افراد پر فضیلت لازم نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں تیسرے اور چوتھے قرن میں

بہت سارے ایسے لوگ موجود تھے جو ان بعض حضرات سے افضل تھے جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ پایا تھا؛ جیسے اشتر نخعی؛ اور اس کے امثال قتضہ و فساد چانے والے لوگ؛ اور مختار بن ابوعبید اور اس کے امثال جھوٹے بہتان تراش؛ حجاج بن یوسف اور اس کے امثال ظالم اور اہل شرفقتہ۔

مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اہل بیت سے افضل نہیں ہیں۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ اہل بیت میں داخل ہیں؛ اور آپ تمام لوگوں سے افضل ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

”کیا تم نہیں جانتے کہ ہم اہل بیت ہیں، ہم صدقہ نہیں کھاتے۔“ [البخاری ۷۴/۴، مسلم ۷۵۱/۲]

یہ کلام منکمل اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں سب کو شامل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اہل بیت میں سے افضل تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا آپ سے افضل نہ ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بنی ہاشم دوسرے لوگوں کی نسبت افضل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان ہی میں سے ہیں۔ جب بات ان سے باہر ہو جائے تو پھر اس سے لازم نہیں آتا کہ جو اہل بیت میں سے آپ کے بعد افضل ہو وہ باقی تمام لوگوں میں سے بھی افضل ہو۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿۱﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ﴿۲﴾﴾ (الرحمن: ۲۰-۱۹)

”اس نے دو دریا جاری کر دیئے جو ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے (جس سے) وہ آگے نہیں بڑھتے۔“

غلابی اور ابو نعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ مراد ہیں۔ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾ یعنی نبی ﷺ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ لؤلؤ اور مرجان سے حضرت حسن و حسین مراد ہیں۔ یہ فضیلت صحابہ میں سے اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی، لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اولیٰ بالامامت ہوں گے۔ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: جو ابانگزارش ہے کہ یہ تفسیر قرآن نہیں بلکہ تحریف و ہدیان ہے جسے ملاحظہ اور باطنی قرامطہ نے وضع کیا ہے۔ بلکہ یہ قول بہت سے قرامطہ کے قول سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے۔ تفسیر کا یہ طریقہ ان طہرین کا طریقہ ہے جو کہ قرآن پر طعنہ زنی کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے بارے میں ایسی باتیں کہنا سب سے بڑی قدح و تشنیع کا موجب ہیں۔ حقیقت میں یہ رافضیوں کا الحاد ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

۱۔ ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ﴾ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۲۔ ﴿وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيَّ حَكِيمٌ﴾ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۳۔ ﴿الشَّجَرَةُ الْمُنْعُونَةُ﴾ اس سے مراد بنو امیہ ہیں۔

اس طرح کی دیگر من گھڑت تفسیریں اور باتیں جو کوئی بھی ایسا انسان نہیں کہہ سکتا جسے اللہ تعالیٰ کے وقار کا کچھ ذرا بھر بھی خیال ہو۔ اور نہ ہی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی انسان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

یہ وہ تفسیری اقوال ہیں جو غلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیے ہیں۔ جنہیں اس نے مجہول راویوں والی اسناد سے نقل کیا ہے؛ جن کا کوئی تعارف ہی نہیں۔ [نیز اس کی اسناد میں جھوٹے راویوں کی بھرمار ہے]۔ مثال کے طور پر راوی کہتا ہے: مجھے سفیان ثوری نے خبر دی۔ حالانکہ سفیان ثوری کے بارے میں ایسا کہنا جھوٹ ہے۔ وہ کہتے ہیں: مجھے غلبی نے خبر دی؛ وہ کہتا ہے: مجھے حسن بن محمد دینوری نے خبر دی؛ وہ کہتا ہے: ہم سے موسیٰ بن محمد بن علی بن عبد اللہ نے بیان کیا؛ وہ کہتا ہے: میرے والد نے ابو محمد بن حسن بن علویہ القطان پر اس کی کتاب پڑھ کر سنائی اور میں سن رہا تھا؛ وہ کہتا ہے: ہم سے ہمارے بعض ساتھیوں نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے مصر کے ایک آدمی نے بیان کیا؛ اسے طسم کہا جاتا ہے؛ وہ کہتا ہے: ہم سے ابو حذیفہ نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا کہ:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ مراد ہیں۔ ﴿يَبْسُجَانِ﴾ یعنی نبی ﷺ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللَّوْلُو وَالْمَرْجَانُ﴾ لؤلؤ اور مرجان سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

اس سند میں ایک سے بڑھ کر ایک اندھیر ہے۔ ایسی اسناد سے بھی کوئی دلیل ثابت ہو سکتی ہے؟ [شیعہ مصنف کا یہ بیان از سر تا پا دروغ ہے اور حضرت ابن عباس نے یہ بات یقیناً نہیں کہی۔]

جس چیز سے اس دعویٰ کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے اس میں کئی امور ہیں:

- ❖ پہلی وجہ: سورت الرحمن مفسرین کے اجماع کے مطابق مکی سورت ہے؛ حضرت حسن اور حسین مدینہ میں پیدا ہوئے۔
- ❖ دوسری وجہ: ان [والدین حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما] کے نام بحرین رکھنا؛ اور بچوں کے اولاد لؤلؤ اور مرجان رکھنا اور نکاح کو مرجع کہنا لغت عرب ان معانی کی متحمل نہیں ہو سکتی جو بیان کیے گئے ہیں۔ نہ ہی حقیقتاً اور نہ ہی مجازاً۔ بلکہ جیسے اس شیعہ مصنف نے اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پر جھوٹ بولا ہے ایسے ہی اس عرب لغت پر بھی دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔
- ❖ تیسری وجہ: ان میں کوئی ایسی چیز زائد نہیں ہے جو سارے بنی آدم میں نہ ہو۔ اس لیے کہ ہر وہ انسان جو کسی عورت سے شادی کرتا ہے اور پھر اس سے دو بچے پیدا ہو جائیں تو وہ بھی اسی جنس سے شمار ہوں گے۔ اس طرح کا ذکر کرنے میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے اللہ تعالیٰ کی قدرت و نشانیوں میں عظمت والا سمجھا جائے۔ جو چیز باقی سارے بنی آدم میں بھی پائی جاتی ہے؛ اس کو یہاں پر خاص کرنے کے لیے کوئی سبب نہیں پایا جا رہا۔ اگر میاں بیوی اور دو بچوں کی وجہ ہی فضیلت کا سبب ہے تو پھر حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب و حضرت اسحاق علیہ السلام سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ معزز اور بزرگ کون ہے؟

”آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو سب سے زیادہ خدا کا خوف رکھتا ہو۔ لوگوں نے کہا: ”ہم یہ بات نہیں پوچھتے آپ ﷺ

نے فرمایا: ”سب سے زیادہ معزز یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ ہیں۔“ [صحیح بخاری: ج: ۵۸۸]

❖ چوتھی وجہ: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ﴾ کے الفاظ سورہ فرقان میں بھی مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هَذَا عَذَبٌ فَرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أجاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا﴾ (الفرقان: ۵۳)

”یہ ہے میٹھا اور مزیدار اور یہ ہے کھاری کڑواں دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے۔“

اگر مرج البحرین سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ تو پھر اس سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما دونوں میں سے ایک کی مذمت لازم آتی ہے۔ یہ بات اہل سنت والہل تشیع کے اجماع سے باطل ہے۔

پانچویں وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ ﴿يَبْنِيهَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾ سے وہ کیا مراد لیتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا؟ علاوہ ازیں ”يَبْنِيَانِ“ کے لفظ سے مستفاد ہوتا ہے کہ برزخ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے مانع ہے۔ اگر اس سے مراد یہی دونوں ہیں تو پھر برزخ سے مراد نبی کریم ﷺ ہوں گے۔ جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے۔ یا پھر اگر کوئی دوسرا مراد لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ مدح نہیں بلکہ مذمت ہے۔

چھٹی وجہ: ائمہ تفسیر کا اس ذکر کردہ تفسیر کے خلاف پراجماع ہے۔ جیسا کہ ابن جریر وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَمَنْ عِنْدَكَ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ (الرعد: ۳۳) ”اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“

ابو نعیم سے روایت کیا گیا ہے کہ: ابن الحنفیہ کہتے ہیں کہ اس سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مراد ہے۔ ثعلبی حضرت

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: ”علم الکتاب کس کے پاس ہے؟“

فرمایا علی رضی اللہ عنہ کے پاس۔ روایت یہ دلالت کرتی ہے کہ آپ افضل ہیں؛ لہذا آپ ہی امام ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان غلط ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

۱۔ پہلی وجہ: ہم شیعہ سے عبداللہ بن سلام اور محمد بن حنفیہ سے روایت کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری وجہ: نیز یہ کہ علماء کی مخالفت کے باوصف یہ روایت کیوں کر حجت ہو سکتی ہے؟ جب کہ جمہور علماء کرام رضی اللہ عنہ ان دونوں کی [اس تفسیر میں] مخالفت کر رہے ہیں۔

۳۔ تیسری وجہ: ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت دروغ اور بے بنیاد بات ہے، اور ان دونوں حضرات پر جھوٹ بولا گیا ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ: یہ تفسیر قطعی طور پر باطل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَكَ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ [الرعد: ۴۳]

”آپ جواب دیجئے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ گواہی دینے والا کافی ہے اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“

اگر اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کفار کے خلاف اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے استشہاد کر رہے تھے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر آپ کی رسالت کی شہادت دیتے بھی تو یہ کفار کے حق

میں حجت نہ ہوتی اور نہ وہ اس دلیل کے سامنے گردن جھکانے کے لیے تیار تھے۔ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ علی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ ہی نے سکھایا ہے یا وہ آپ ہی زبان سے بول رہے ہیں اور اس طرح آپ خود ہی اپنے حق میں شاہد بن گئے۔ کفار یہ بھی کہتے کہ علی نے آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ محل شاہد یہ ہے کہ اگر گواہی دینے والا جس چیز کی گواہی دے رہا ہے وہ اس باب میں تہمت سے بری نہ ہو تو اس کی گواہی کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی اس سے مشہود علیہ پر کوئی حجت قائم ہوگی۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب گواہی دینے والے کے لیے مشہود علیہ کے علاوہ علم کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔ [تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اس تہمت کا کیا جواب تھا؟]

اس کے برعکس اگر نبی کریم ﷺ کے دعویٰ کی صداقت پر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما گواہی دیتے تو یہ زیادہ نفع بخش ہوتی۔ اس لیے کہ یہ لوگ تہمت سے بہت دور تھے۔ اور اس لیے ان کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اس وقت جو امر دیتے تھے۔ شاید انہوں نے اہل کتاب یا کافروں وغیرہ سے کچھ خبریں سن رکھی ہوں جن کا محمد ﷺ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے، اس لیے کہ آپ چھوٹی عمر کے تھے۔ اس لیے فریق مخالف کہہ سکتا تھا کہ آپ بھی وہی کچھ گواہی دے رہے ہیں جو آپ نے محمد ﷺ سے سیکھا ہے۔

البتہ اگر اہل علم، اہل کتاب اپنے انبیاء علیہم السلام کی متواتر روایات کی بنا پر شہادت دیں تو ان کی شہادت نبی کریم ﷺ کے حق میں نفع بخش ہوگی۔ یہ شہادت اسی طرح ہے جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام بذات خود شہادت دیں اس لیے کہ جو بات انبیاء علیہم السلام سے بتواتر منقول ہو وہ ان کی ذاتی شہادت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ وحی کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کی بنا پر اہم سابقہ کے حق میں شہادت دیں گے، جیسا کہ سورۃ بقرہ [۱۲۳] میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾

”ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں۔“

اس جاہل شیعہ نے جس چیز کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت گردانا، اس کی وجہ سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کی ہستی پر بھی قدح وارد ہوئی جن کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل ایمان میں سے شمار ہونے لگے تھے۔ ایسا کلام کسی زندیق سے ہی صادر ہو سکتا ہے یا پھر کسی انتہائی درجہ کے جاہل انسان سے۔

”اگر تم کچھ نہیں جانتے تو یہ بھی مصیبت ہے۔ اور اگر جانتے ہو تو پھر مصیبت اس سے بھی بڑی ہے۔“

۵۔ پانچویں وجہ: علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے کے متعدد مقامات پر اہل کتاب کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَى مِثْلِهِ﴾

آپ کہہ دیجئے! اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اسے نہ مانا ہو اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس جیسی کی

گواہی بھی دے چکا ہو۔ [الأحقاف ۱۰]

اس رافضی سے پوچھا جائے گا کہ: کیا تم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی اسرائیل میں سے شمار کرتے ہو؟ نیز اللہ کا فرمان ہے:

﴿فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا ۖ فَمِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يُقْرَأُ وَكَانَ يُكْتَبُ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (یونس: ۹۴)

”اگر آپ کو قرآن کے بارے میں کوئی شبہ لاحق ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیجیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔“

اس سے پوچھا جائے کہ: کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے تھے؟

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجُلًا نُوحِيَ إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ الدِّارِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

”آپ سے پہلے بھی ہم مردوں کو ہی بھیجتے رہے، جن کی جانب وحی اتارا کرتے تھے پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔“

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی وہ اہل ذکر ہیں جن سے پوچھنے کا کہا گیا ہے یا آپ ان رجال میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے

مبعوث کیا تھا؟

۶۔ چھٹی وجہ: فرض کیجیے شاید سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ افضل الصحابہ ہیں۔

جیسا کہ اہل کتاب بھی اس کی گواہی دیتے ہیں: گواہی دینے والوں میں حضرت عبد اللہ بن سلام، سلمان و کعب الاحبار وغیرہ لوگ شامل تھے، حالانکہ یہ باقی صحابہ سابقین اولین، مہاجرین و انصار جیسے حضرات ابو بکر و عمر و عثمان اور علی و جعفر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے افضل نہ تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ (التحريم: ۸)

”جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ایمان داروں کو جو ان کے ساتھ ہیں رسوا نہ کرے گا۔“

ابو نعیم نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جو شخص سب سے پہلے جنتی لباس پہنے گا وہ حضرت

ابراہیم ہیں کیوں کہ آپ خلیل ہیں؛ اور محمد ﷺ اس لیے کہ آپ اللہ کے برگزیدہ ہیں؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے

درمیان جنت کی سیر کریں گے۔“ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَ

الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ اور فرمایا: اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ آپ دوسروں سے

افضل ہیں؛ لہذا آپ ہی امام ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

✽ پہلی بات: ہم اس روایت کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں خصوصاً ایسی روایت کے لیے کہ جس کی کوئی اصل ہی نہیں۔

✽ دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین و علماء کرام جھوٹ ہے۔

✽ تیسری بات: یہ دعویٰ قطعی طور پر باطل ہے۔ اس لیے کہ اس کا تقاضا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی

کریم ﷺ سے افضل ہوں۔ اس لیے کہ آپ وسط ہیں؛ اور دونوں نبی دونوں جو ان میں سے افضل ہستی

ابراہیم علیہ السلام اور محمد ﷺ ہیں۔ جو کوئی ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دے؛ وہ یہود و نصاریٰ سے بڑا کافر ہے۔

چوتھی بات: صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”قیامت والے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام لباس پہنیں گے۔“ [صحیح بخاری: ۴/۱۳۹، مسلم ۴/۲۱۹۴]
اس روایت میں کہیں پر بھی محمد ﷺ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر تک بھی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہننے میں تقدیم حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مطلق طور پر حضرت محمد ﷺ سے افضل ہیں۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”قیامت کے دن سب لوگ بیہوش ہو جائیں گے۔ اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کا پایہ پکڑے ہوئے ہیں۔ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آجائیں گے یا آپ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے مستثنیٰ رکھا تھا۔“ [صحیح بخاری: ج ۶۳۳]
پس پہلے ہوش میں آنے کی وجہ سے یا پھر مطلق طور پر بیہوش نہ ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ موسیٰ علیہ السلام محمد ﷺ سے افضل ہیں۔

پانچویں بات: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَوْمَ لَا يُغْزَىٰ اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورَنَا وَافْضِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [التحریم ۸]

”جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ایمان داروں کو جو ان کے ساتھ ہیں رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا۔ یہ دعائیں کرتے ہوں گے اے ہمارے رب ہمیں کامل نور عطا فرما اور ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرُكُمُ الْيَوْمَ جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلِيلِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ [الحديد ۲۱]

”جس دن تو دیکھے گا کہ ایماندار مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا آج تمہیں ان جنتوں کی خوشخبری ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جن میں ہمیشہ کی رہائش ہے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔“

یہ نص ان تمام مؤمنین کے بارے میں عام ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوں گے۔ سیاق کلام اس کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس بارے میں مروی آثار بھی اس کے عموم پر دلالت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”ہر مؤمن کو قیامت کے دن نور دیا جائے گا۔ منافق کا نور بروز قیامت بجھا دیا جائے گا۔ جب مؤمنین منافقین کا نور بجھتے ہوئے دیکھیں گے تو انہیں اپنے بارے میں ڈر محسوس ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے: ”یا اللہ! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کرو۔“

اس روایت میں عموم قطعی اور یقینی ہے۔ اس لیے کہ اس سے کوئی ایک شخص مراد نہیں ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اگر کوئی کہنے والا یوں کہے کہ:

”ہر وہ بات جسے شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے قرار دیتے ہیں، اس سے مراد ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ہیں؛ تو پھر ان دونوں گروہوں کے درمیان محض دعویٰ اور جھوٹ کے علاوہ کون سا فرق ہوگا؟

بلکہ ایسا ممکن ہے کہ جو لوگ اسے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے خاص کرتے ہیں، ان کا شبہ رافضیوں کے شبہ سے بڑھ کر ہو جو اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس آیت میں ایسے ہی داخل ہوں گے جیسے پہلے تین اصحاب۔ بلکہ وہ تینوں اس آیت کے مصداق ہونے کے زیادہ حق دار ہیں۔ تو پھر اس آیت سے نہ ہی افضلیت ثابت ہوئی اور نہ ہی امامت۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تینتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تینتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ (البینہ: ۷)

”پیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہ لوگ بہترین خلایق ہیں۔“

ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اس آیت میں تم اور تمہارے شیعہ کا ذکر کیا گیا ہے، جو بروز قیامت شاداں و فرحاں آئیں گے اور تمہارے دشمن غصہ سے بھرے ہوئے ہوں گے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خیر البریہ (مخلوقات میں سے بہتر) ہوئے تو امام بھی وہی ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

❖ پہلی بات: ہم شیعہ سے اس کی صحت کے اثبات کا مطالبہ کرتے اور پورے جزم و وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔ لیکن مدعی سے سند کی صحت پیش کرنے کے مطالبہ کا انکار صرف معاند اور سرکش ہی کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام گروہوں کا اتفاق ہے کہ ابونعیم کے روایت کر لینے سے کوئی روایت حجت و اور قابل استدلال نہیں ہو جاتی [جب تک کہ اس کی صحت ثابت نہ ہو جائے]۔

❖ دوسری بات: یہ روایت ایسا جھوٹ ہے جو کہ کسی بھی اہل علم اور محدث پر مخفی نہیں۔ اہل علم کا اس روایت کے جھوٹا ہونے پر اتفاق ہے۔

❖ تیسری بات: علاوہ ازیں یہ ان لوگوں کے قول سے متصادم ہے جو کہتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ”پیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے“ سے خارجی و نامحی لوگ مراد ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت

علیؑ سے دوستی لگانے والا کافر ہے وہ اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَخُكُمْ مِمَّا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (المائدة: ۳۴)

”جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔“

وہ کہتے ہیں جو شخص اللہ کے دین میں اشخاص و رجال کو حکم بناتا ہے وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے بغیر فیصلہ کرتا ہے، لہذا وہ

کافر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فِئْتَانَةٌ مِنْهُمْ﴾ (المائدة: ۵۱)

”تم میں سے جو کفار کے ساتھ دوستی لگائے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔“

ان کا قول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا نبی کریم ﷺ کی درج ذیل حدیث کے مطابق مرتد ہو چکے

تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”بہت سے آدمیوں کو میرے حوض سے دور کر دیا جائے گا، جس طرح اجنبی اونٹ کو دور کر دیا جاتا ہے، میں کہوں گا بار

خدایا! یہ میرے صحابی ہیں یہ میرے صحابی ہیں اس کے جواب میں کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے

بعد کون سی باتیں ایجاد کر لی تھیں۔ اور جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ مرتد ہی چلے آئے ہیں۔“^①

خوارج و نواصب کہتے ہیں: یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خون اور اموال میں اللہ کے حکم سے ہٹ کر فیصلہ

کئے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

”میرے بعد کافر نہ ہو جاؤ کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو۔“^②

ان کا کہنا ہے:

جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا وہ پھر پلٹ کر کافر ہو چکے تھے۔

اگرچہ خوارج کے یہ دلائل باطل ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ روافض کے براہین و دلائل ان سے بڑھ کر

لغو و بے بنیاد ہیں۔ خوارج روافض کی نسبت بڑے عقلمند، سچے، اور حق کے پیروکار ہوتے ہیں۔ وہ سچائی کا بہت اہتمام کرتے

ہیں، جھوٹ نہیں بولتے۔ ظاہر و باطن میں دین دار ہوتے ہیں۔ لیکن گمراہ اور جاہل ہیں، دین سے نکل چکے ہیں۔ اسلام سے

ایسے نکل گئے ہیں جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ جب کہ روافض کی یہ حالت ہے کہ ان پر جہالت، گمراہی اور جھوٹ کا غلبہ

ہے۔ ان کے بہت سارے ائمہ اور عوام الناس زندگی اور لحد ہیں۔ انہیں علم اور دین سے کوئی غرض نہیں؛ بلکہ ان کی حالت تو

بالکل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے عین مطابق ہے:

﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْهُدَى﴾ [النجم ۲۳]

① صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الحوض (حدیث: ۶۵۷۶-۶۵۸۶)، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبینا ﷺ (حدیث: ۲۲۹۰-۲۲۹۷)۔

② صحیح بخاری۔ کتاب العلم، باب الانصات للعلماء (حدیث: ۱۲۱، ۷۰۸۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان معنی قول النبی ﷺ ”لا ترجعوا بعدی کفاراً“ (حدیث: ۶۵)۔

”یہ لوگ صرف انکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔“

مروانیہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی؛ اگرچہ وہ آپ کو کافر تو نہیں کہتے؛ لیکن ان کے دلائل رافضیوں کے دلائل کی نسبت بہت زیادہ مضبوط ہیں۔ مشہور ادیب جاحظ نے مروانیہ کے لیے ایک کتاب تحریر کی تھی اس میں ایسے دلائل پیش کیے ہیں جن کو رافضہ کبھی بھی توڑ نہیں سکتے، رافضیوں کی بات تو چھوڑیے زید یہ بھی ان دلائل پر رد نہیں کر سکتے۔ البتہ اہل سنت والجماعت [اللہ انہیں تاقیامت سلامت رکھے] چونکہ معتدل اور متوسط لوگ ہیں [وہ ان دلائل کا تار و پود بکھیر سکتے ہیں]؛ یہی وجہ ہے کہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں [مروانیہ اور خوارج کے خلاف] حق بات کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن اہل سنت والجماعت ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن سے چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اہل سنت والجماعت یا کسی بھی دوسرے کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ مدح میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص ہو اور؛ یا صرف دوسروں پر قدح وارد کرتی ہو؛ یہ بات بالکل محال اور ممتنع ہے۔ انتہائی محال قسم کا جھوٹ بولنے کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میدان مناظرہ و مجادلہ میں مقبول حق کے ساتھ ایسا ممکن نہیں۔

چوتھی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿لَإِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ [البینۃ ۷] ”پیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔“

یہ عام خطاب ہے؛ جو کہ اس انسان کو شامل ہے جو ان صفات سے موصوف ہو۔ تو پھر اس کو شیعہ کے ساتھ خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟

اگر شیعہ کہیں کہ: [اس لیے کہ] ان کے سوا جتنے بھی لوگ ہیں؛ وہ کافر ہیں۔

تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر دوسرے لوگوں کا کفر کسی دلیل سے ثابت ہوتا تو تمہیں اتنے لمبے پاؤں بٹنیے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر ایسا ثابت نہیں ہو سکتا تو پھر تمہیں تمہاری دلیل کسی کام نہ آئی۔ اس لیے کہ نقل کے اعتبار سے یہ ثابت نہیں ہے۔ اور اگر کسی دوسری علیحدہ و جدا گانہ دلیل سے ایسا ثابت بھی ہو جائے تو وہ اس آیت سے ثابت تصور نہیں ہوگا۔ پھر اس پر اعتماد کیا جائے گا۔

پانچویں بات: یہ بات تو اتر کے ساتھ معلوم ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما شیعان علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر دوسرے لوگوں سے محبت اور دوستی رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ خوارج کے ساتھ بیٹھتے اور انہیں فتویٰ دیا کرتے تھے؛ اور ان سے مناظرہ بھی کیا کرتے تھے۔ اگر آپ کا اعتقاد یہ ہوتا کہ پیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے؛ یہ صرف شیعہ ہی ہیں؛ اور ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں؛ سب کافر ہیں۔ تو پھر آپ کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔ اور ایسے ہی بنو امیہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ اور سلوک ایک کھلی ہوئی دلیل ہے کہ آپ انہیں کافر نہیں سمجھتے تھے۔

اگر شیعہ کہیں کہ: ہم شیعہ کے علاوہ باقی لوگوں کو کافر تو نہیں کہتے؛ لیکن ہم کہتے ہیں: شیعہ خیر البریہ ہیں۔

[جواب:] یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ پیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی خیر البریہ ہیں۔ اگر تم یہ

کہتے ہو کہ شیعہ کے علاوہ کوئی دوسرا اس آیت کے حکم میں داخل نہیں؛ پھر وہی صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو تم کہو کہ وہ کافر ہیں۔ یا پھر کہو کہ وہ فاسق ہیں۔ اس لیے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے؛ اگرچہ ان کا نام اہل ایمان میں داخل ہے۔ مگر نہ جو کوئی اہل ایمان میں سے ہو، اور وہ فاسق بھی نہ ہو تو وہ ان لوگوں میں شامل ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔“

اگر تم کہو کہ: وہ فاسق ہیں۔ تو جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر ان کا فسق ثابت ہو جائے تو پھر تمہارے لیے حجت کافی ہو گئی۔ اور اگر ان کا فسق ثابت نہیں؛ تو پھر تمہیں اس استدلال سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم تمام گروہوں میں سے جس کے بارے میں بھی فاسق ہونے کا کہو گے تو وہ ثابت کریں گے کہ آپ کئی ایک وجوہ کے اعتبار سے فسق میں ان سے کئی درجے آگے ہو۔ پھر تمہارے پاس اپنے دفاع میں کوئی ایک بھی صحیح دلیل موجود نہ ہوگی۔

فسق تمہارے بہت زیادہ جھوٹ بولنے؛ فحاشی کا ارتکاب کرنے اور ظلم و ستم کرنے کی وجہ سے تم پر غالب ہے۔ تمہارے مخالفین خوارج اور دوسرے لوگوں کی نسبت تم میں بہت زیادہ فسق پایا جاتا ہے۔ بنو امیہ میں شیعہ کی نسبت جھوٹ؛ فحاشی اور ظلم بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شیعہ میں زہد؛ صداقت اور دینداری پائی جاتی ہے؛ یہی حال سارے فرقوں کا ہے۔ اور اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا تو خوارج کی یہی خوبی کافی تھی کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں خبر دی تھی:

”تم میں سے کوئی ایک ان کی نماز کے مقابلہ میں اپنی نماز کو اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزہ کو حقیر سمجھے گا۔“

[یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔ [تو پھر روافض کو خوارج سے کیا نسبت؟]

چھٹی بات: اللہ تعالیٰ نے اس [تمہاری مذکورہ بالا استدلال والی آیت] سے پہلے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾

”بیشک جو لوگ اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرکین سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔“

پھر اس کے بعد فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾

”بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہ لوگ بہترین خلائق ہیں۔“

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ مشرکین اور کفار اہل کتاب سے ہٹ کر کوئی دوسرے لوگ ہیں۔ قرآن میں بہت سارے مقامات پر ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام مقامات عام ہیں۔ تو پھر اس طرح کی باقی آیات کو چھوڑ صرف خاص طور پر اس آیت سے استدلال کرنے کی کیا وجہ ہے؟

روافض یا ان کے علاوہ دوسرے اہل ہوی اور کافر لوگوں کا اور ان کے علاوہ بہت سارے گمراہ فرقوں جیسے خوارج اور

معتزلہ کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کر رہے ہیں۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ہے:

﴿هُوَ قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِيًّا تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنَّكُمْ

كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

﴿هُم يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة ۱۱۱-۱۱۲]

”یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔ سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔“

پس یہ حکم عام ہے؛ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی رضا کے لیے عمل کرے گا [وہ اس آیت کے حکم میں داخل ہوگا] عمل صالح وہی ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو۔ اور اسلام اپنے ارادہ و قصد میں اخلاص اور اپنے آپ کو اللہ کے لیے کر لینے کا نام ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امام علی کی چوتھویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا﴾ (الفرقان: ۵۴)

”وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سرسالی رشتوں والا کر دیا۔“

غالبی ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی ﷺ نے سیدہ فاطمہ کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ ”وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سرسالی رشتوں والا کر دیا۔“ چونکہ یہ فضیلت کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام و خلیفہ ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان شتم ہوا]۔

[جواب]:

✽ پہلی بات: ہم شیعہ سے اس کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

✽ دوسری بات: ہم بغیر کسی شک و شبہ کے کہتے ہیں یہ ابن سیرین پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔

✽ تیسری بات: صرف ابن سیرین کا قول حجت نہیں ہو سکتا؛ اس لیے کہ دوسرے علماء نے اس کی مخالفت کی ہے۔

✽ چوتھی بات: یہ آیت سورت فرقان کی ہے۔ سورہ فرقان کی ہے۔ یہ آیات باتفاق علماء مکہ میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے عرصہ دراز قبل نازل ہو چکی تھی۔ تو پھر اس سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟

✽ پانچویں بات: آیت کے الفاظ ہر سرسالی اور نسبی رشتہ میں عام ہیں، اس میں کسی ایک فرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سرسالی تعلق کو بھی شامل ہے جس طرح کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دو بار اور حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ کی شادی کو بھی بالاولیٰ شامل ہے۔

علاوہ ازیں یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے نبی کریم ﷺ کے ساتھ رشتہ مصاہرت پر بھی مشتمل ہے۔ نیز نبی کریم ﷺ کی دو بیٹیاں ام کلثوم اور رقیہ رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئی تھیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کر دی۔ پس سرسالی رشتہ ان چاروں کے ساتھ ثابت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تو یہاں تک

فرمادیا تھا: ”اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں وہ بھی عثمان کو دیدیتا۔“ [رواہ احمد فی الفضائل ۱/ ۴۸۱]۔

جب آپ کا رشتہ مصاہرت چاروں خلفاء کے ساتھ ثابت ہو گیا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت منٹنی ہو گئی۔ تو پھر کہا کہ اس سے افضلیت یا امامت کا وجوب ثابت ہوتا ہو۔

جھٹی وجہ: فرض کیجیے! اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سسرالی تعلق ہے۔ تو صرف سسرالی رشتہ ہونے کی بنا پر نہ ہی افضلیت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی امامت۔ اس پر شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ سسرالی تعلق تو ان چاروں کے لیے ثابت ہے؛ اور یہ کہ ان میں سے بعض دوسروں سے افضل ہیں۔ اگر سسرالیت کے فضیلت ثابت ہوتی تو تناقض لازم آتا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پینتیسویں دلیل:

[اشکان]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پینتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّالِحِينَ﴾ (التوبة: ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور پچھوں کے ساتھ رہو۔“

اس آیت میں ان لوگوں کی معیت و رفاقت کو واجب قرار دیا گیا ہے جن کا صادق ہونا واضح ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک معصوم ہی صحیح معنی میں صادق ہو سکتا ہے؛ اس لیے کہ دوسروں سے جھوٹ کا صادر ہونا جائز ہے۔ اور معصوم خلفائے اربعہ میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ ابونعیم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔“ [شیخہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

پہلی بات: صدیق: صادق سے صیغہ مبالغہ ہے۔ پس ہر صادق صدیق نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کثیر دلائل کی بنا پر صدیق تھے، لہذا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کے اولین مصداق ہیں۔ بنا بریں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت و رفاقت ہمارے لیے ضروری ہوئی؛ اس لیے کہ باقی صحابہ کرام نے آپ کے حق میں تنازل کر لیا تھا؛ اور اس کے ساتھ ہی آپ کی خلافت کا بھی اقرار کرتے تھے۔ اب یہ منہج ہے کہ ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا اقرار کریں۔ یہ آیت ان کے مطلوب کے نقیض پر دلالت کرتی ہے۔

دوسری بات: ان سے کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو صدیق تھے؛ یا نہیں تھے۔ اگر آپ صدیق نہیں تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق ہیں۔ تو پھر صادق اور صدیق کے ساتھ ہونا اس سے زیادہ اولیٰ ہے جو صرف صادق ہو صدیق نہ ہو۔ اور اگر آپ صدیق تھے تو پھر حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما بھی صدیق تھے۔ پس جب خلفائے اربعہ کو صدیق قرار دیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہے گی۔ اور نہ ہی صداقت آپ کے ساتھ خاص رہی۔ تو پھر تین کو چھوڑ کر ایک کا ساتھ دینا متعین نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ٹکراؤ کی صورت پیش آئے تو پھر تین کا ساتھ دینا ایک کی نسبت زیادہ اولیٰ

ہے۔ اس لیے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے؛ اور پھر خصوصاً وہ صدق میں بھی زیادہ کامل ہیں۔

تیسری بات: حقیقت میں یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت کعب بن مالک غزوہ تبوک میں شرکت نہ کر سکے؛ اور آپ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے سچ کہہ دیا کہ ان کا کوئی عذر نہیں تھا۔ اور راست بیانی کی وجہ سے ان کی توبہ قبولیت سے مشرف ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کوئی جھوٹا عذر پیش کر دیں۔ جیسا کہ منافقین نے جھوٹ بول کر اپنا عذر پیش کیا تھا۔ یہ واقعہ صحاح ستہ؛ سنن اور مسانید و تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔^①

یہ معلوم ہو گیا کہ اس قصہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ میرے استقبال کے لیے کھڑے ہو کر دوڑے۔ اور مجھ سے معافہ کیا۔ اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے کوئی دوسرا میرے استقبال کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔“ حضرت رضی اللہ عنہ کعب کبھی بھی اس واقعہ کو نہیں بھولتے تھے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب اس آیت کو صرف اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محمول کرنا باطل ہوا۔

چوتھی بات: یہ آیت اس قصہ کے متعلق نازل ہوئی۔ لیکن کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ معصوم ہیں۔ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد سچے لوگ ہیں، اس کے لیے معصوم ہونے کی شرط نہیں لگائی۔ پانچویں بات: علاوہ ازیں آیت کے الفاظ ہیں: ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ نہ کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِ﴾ جمع کا صیغہ ہے؛ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہوتے تو واحد کا صیغہ چاہیے تھا۔

چھٹی بات: آیت ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ راست باز لوگوں کی طرح راست گفتاری کے عادی بنو۔ جھوٹوں کی رفاقت اختیار نہ کرو۔ فرمان الہی ہے: ﴿وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ (البقرة: ۴۳) ”تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کیساتھ۔“ اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالضَّالِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ [النساء ۶۹]

”اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔“

اور ایسے ہی ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ وَسَوْفَ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ [النساء ۱۴۶]

”تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عقیقہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو بہت بڑا اجر دے گا۔“

اس سے مراد یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہر چیز میں صادقین (سچے لوگوں) کا ساتھ دو؛ اگرچہ اس کا تعلق صداقت سے نہ بھی ہو۔ مگر یہ دوسرا معنی باطل ہے۔ اس لیے کہ کسی انسان پر واجب نہیں ہے کہ وہ مباح چیزوں میں کسی کا ساتھ دے۔ جیسے کھانا

① صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث کعب بن مالک (حدیث: ۴۴۱۸)، صحیح مسلم، کتاب التوبہ۔ باب حدیث توبہ کعب بن مالک..... (حدیث: ۲۷۶۹)۔

پنا؛ لباس وغیرہ کے معاملات۔ جب پہلی بات ہی صحیح ہے تو اس میں کسی متعین شخص کا کوئی حکم نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سچ بولو اور جھوٹ سے بچ کر رہو۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ؛ بیشک جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔“ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

ایسی آیات میں معیت سے یہ مراد نہیں لیا گیا کہ ہر بات میں ان کا انداز اختیار کر دیں یہاں تک کہ مباحات و ملبوسات میں بھی ان کی رفاقت کے دائرہ سے باہر نہ نکلے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ﴿كُنْ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ”ایمان والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔“ ﴿كُنْ مَعَ الْآبِرَارِ﴾ ”نیکی کاروں کے ساتھ ہو جاؤ۔“ یعنی اس وصف میں ان کے شریک و ہمیں بن جاؤ۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ پر ہر چیز میں ان کی اتباع واجب ہو گئی ہے۔

ساتویں بات: اس سے کہا جائیگا: جب اس سے مراد یہ ہے کہ مطلق طور پر بچوں کیساتھ ہو جاؤ؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ سچائی تمام نیکیوں کی طرف راہ دکھاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ”تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے۔“ پس اس صورت میں یہ وصف ہر اس انسان کے لیے ثابت ہوگا جو ان صفات سے موصوف ہو۔

آٹھویں بات: ان سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم صادقین کا ساتھ دیں۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جن کا سچا ہونا تمہیں معلوم ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾ [الطلاق ۲]

”اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کرلو؛ اور اللہ کی رضامندی کے لئے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔“

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جن کو تم جانتے ہو کہ وہ تم میں سے عدل والے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ [النساء ۵۸]

”اللہ تعالیٰ تمہیں تاکید کرتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ۔“

یہ نہیں فرمایا کہ تم جنہیں جانتے ہو کہ وہ امانت کے اہل ہیں۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء ۵۸]

”جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل اور انصاف سے فیصلہ کرو۔“

اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کو تم عدل سمجھتے ہو۔ لیکن اس حکم کو وصف کے ساتھ معلق کیا ہے۔

ہم پر واجب ہوتا ہے کہ حسب امکان صدق و عدالت اور اہل امانت اور عدل کی معرفت میں اجتہاد کریں۔ ہمیں اس بارے میں علم الغیب کا مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو بھی انصاف کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ آپ نے فرمایا:

”تم اپنا جھگڑا میرے پاس لاتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو دوسرے سے عمدہ طریقے سے بیان

کرنے والا ہوا اور میں اس کیلئے فیصلہ کر دوں۔ اس بات پر جو میں نے اس سے سنی پھر میں جس کے لیے اس کے بھائی کا حق دلا دوں تو اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لیے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“

[صحیح مسلم ج: دوم، ص: ۱۹۸]

✽ نویں بات: تصور کیجیے: اس سے مراد وہ لوگ ہوں؛ جن کے سچا ہونے کا علم ہو۔ لیکن یہ علم بھی اس علم کی طرح ہوگا جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنْ عَلِمْتُمْ هُنَّ مُؤْمِنَاتٌ﴾ [الممتحنۃ: ۱۰] ”اگر تم انہیں مؤمنات جان لو۔“ ایمان سچائی سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔ جب یہاں پر علم کی شرط رکھی گئی ہے؛ تو پھر جیسے یہاں پر یہ بات کہنا متنع ہے کہ معصوم کے علاوہ کسی کو یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا؛ ایسے ہی یہ بات کہنا بھی جائز نہیں کہ امام معصوم کے علاوہ کسی کا سچا ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔

✽ دسویں بات: تصور کیجیے: اس سے مراد: صدق کا علم ہمیں حاصل ہو گیا؛ لیکن یہ کہا جائے گا کہ: بیشک ابو بکر و عمر اور عثمان اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم جن کی صداقت معلوم ہے؛ اور جو عدا جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے؛ اگر ان سے خطا یا بعض گناہوں کا سرزد ہونا جائز ہو سکتا ہے؛ جب کہ جھوٹ تو بلا ریب بہت بری چیز ہے؛ اس لیے کہ علماء کرام رضی اللہ عنہم کے ایک قول کے مطابق صرف ایک جھوٹ بولنے کی وجہ سے گواہی رد کی جاسکتی ہے؛ اور امام احمد سے بھی دو روایتوں میں سے ایک یہی ہے۔ اس بارے میں ایک مرسل حدیث بھی روایت کی گئی ہے۔ تو ہم یقینی طور پر اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی جان بوجھ کر کسی حال میں بھی رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اور ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ہم جھوٹ کا منفی ہونا صرف اس کے بارے میں جان سکتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں یقینی طور پر علم ہو کہ معصوم مطلق ہے۔ بلکہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اگر آپ پر کھیں گے تو پتہ چلے گا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ اگرچہ اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہوں؛ اور بعض دوسرے گناہ بھی سرزد ہوتے ہوں۔ اور ہم یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جو کوئی معصوم نہیں وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بات خلاف واقع ہے۔ اس لیے کہ عدا جھوٹ صرف وہی انسان بول سکتا ہے جو لوگوں میں سب سے زیادہ برا ہو۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو جان بوجھ کر رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولتا ہو۔

اہل علم حضرات جیسے: مالک؛ شعبہ؛ یحییٰ بن سعید؛ ثوری؛ شافعی؛ اور احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم جیسے لوگ یقینی طور پر جان بوجھ کر کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے؛ نہ ہی نبی کریم ﷺ پر اور نہ ہی کسی دوسرے پر۔ تو پھر ابن عمر؛ ابن عباس اور ابوسعید رضی اللہ عنہم جیسے لوگوں کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟

✽ گیارھویں بات: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس سے مراد معصوم ہی ہے؛ تو پھر بھی ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عصمت کی نفی پر اجماع کو تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ بیشک بہت سارے وہ لوگ جو کہ رافضہ سے درجہا بہتر ہیں؛ وہ اپنے شیوخ کے متعلق بھی اسی قسم کے دعوے کرتے ہیں؛ اگرچہ انہوں نے اس عبارت میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے۔ ہم ان کی عصمت کو بھی باقی لوگوں سے عصمت کی نفی کے ساتھ

تسلیم نہیں کرتے۔ اگر عصمت ہوگی تو سب کے لیے اور اگر اس کی نفی کی جائے گی تو سب سے نفی کی جائے گی۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿وَأَرْكَعُوا مَعَ الرَّائِضِينَ﴾ (البقرة: ۴۳) ”تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ آیت سرور کائنات ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیوں کہ ان دونوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور رکوع کیا تھا۔ یہ آپ کی فضیلت کی دلیل ہے؛ اور آپ کی امامت پر بھی دلالت کرتی ہے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی امور پر مشتمل ہے:

✽ پہلی بات: ہم اس کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اس نے اس روایت کی صحت پر کوئی دلیل ذکر کی ہے۔

✽ دوسری بات: اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔

✽ تیسری بات: مزید براں یہ آیت سورت بقرہ میں ہے جو مدنی ہے؛ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق میں بنی اسرائیل سے متعلق خطاب ہے، خواہ یہ خطاب براہ راست صرف بنی اسرائیل سے ہو یا بنی اسرائیل اور مسلمانوں دونوں سے ہو۔ یہ آیت ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ نزول آیت کے وقت تک رکوع کرنے والے بے شمار لوگ ہو گئے تھے۔ یہ شروع اسلام میں نازل ہونے والی سورت نہیں جو ہم کہہ سکیں کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے پہلے رکوع کیا اور پہلے نماز پڑھی۔

✽ چوتھی بات: ﴿مَعَ الرَّائِضِينَ﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں مراد ہوتے تو یہ لفظ ﴿مَعَ الرَّائِضِينَ﴾ تشبیہ کے وزن پر ہوتے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ جمع کے صیغہ سے صرف تشبیہ مراد نہیں لیا جاسکتا۔ بلکہ اس سے مراد تین یا اس سے زیادہ یا پھر دو سے زیادہ مراد ہونگے۔ جمع بول کر تشبیہ مراد لینا اجماع کے خلاف ہے۔

✽ پانچویں بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا: ﴿اقْنِصِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾ ”اے مریم تم اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“

حضرت مریم رضی اللہ عنہا اسلام سے پہلے گزر چکی ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ اسلام سے پہلے بھی رکوع کرنے والے تھے؛ جب کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کہیں بھی نہیں تھے۔ تو پھر اسلام کے شروع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ رکوع کرنے والے کیوں نہیں ہو سکتے۔ جب کہ تشبیہ کا صیغہ ایک ہی ہے۔

✽ چھٹی بات: یہ آیت مطلق ہے؛ کسی متعین شخص کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ مؤمن مرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد باجماعت نماز ادا کرنا ہے۔ اس لیے کہ رکوع کے حاصل کیے بغیر رکعت نہیں پائی جاسکتی۔

ساتویں بات: نیز یہ کہ اگر نبی ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رکوع کرنا مراد ہوتا تو یہ حکم دونوں کی وفات کے ساتھ ختم ہوتا۔ پھر کسی کو یہ حکم نہ دیا جاتا کہ وہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرے۔

آٹھویں بات: شیعہ کا یہ کہنا کہ: سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ بلکہ اکثر علماء اس کے خلاف کہتے ہیں۔ علماء کرام کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے نماز ادا کی تھی۔

نویں بات: اگرچہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم ہے؛ لیکن اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس نے آپ کے ساتھ مل کر رکوع کیا وہ امام بن جائے گا۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ امام نہیں بن گئے تھے، بلکہ آپ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سینتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصب امامت پر فائز ہونے کی سینتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَجَعَلْنَا لِيُوزِيرًا مِّنْ أَهْلِي﴾ (طہ: ۲۹) ”اور میرے گھر والوں میں سے میرا وزیر بنا دے۔“

ابو نعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مکہ میں میرا اور علی کا ہاتھ پکڑا اور چار رکعت نماز ادا کی۔ پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی: ”اے اللہ! حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے بھی تجھ سے دعا کی تھی اور میں تیرا نبی محمد بھی تجھ سے دعا کرتا ہوں: ”اے میرے رب! میرے لیے میرا سیدہ کھول دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر بنا دے۔ میرے کنبہ میں سے علی رضی اللہ عنہ کو میرا وزیر مقرر کر دے اس کے ساتھ میری کمر کو مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے ایک پکارنے والے کو سنا وہ پکارتا تھا: ”اے احمد! آپ کی دعا قبول ہوئی۔“ یہ روایت اپنے باب میں نص صریح ہے۔“ (شیعہ کا بیان ختم ہوا)۔

[جواب]: پہلی بات: ہم اس حدیث کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں: محدثین کے نزدیک بالاتفاق اس حدیث کا موضوع ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ بلکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر بدترین جھوٹ ہے۔

تیسری بات: پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے؛ تو پہلے کا ایک عرصہ تو وہ بیدار ہی نہیں ہوئے تھے۔ ابن عباس کی پیدائش اس وقت ہوئی جب بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہجرت سے قبل مکہ میں ایک شیر خوار بچہ سے زیادہ نہ تھے۔ ابھی آپ اس قابل نہیں تھے کہ وضوء کرتے اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے۔ [پھر وہ اس واقعہ میں کیوں کر شریک ہو سکتے ہیں؟]۔

نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو ابن عباس ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ ہجرت کے وقت آپ کی زیادہ سے زیادہ عمر پانچ سال سے بھی کم تھی۔ ایسے بچے کو نہ ہی وضوء کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھنے کا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے کا حکم دو۔ اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے سزا دو۔ اور ان کے بستر علیحدہ علیحدہ کر دو۔“ [سنن ابی داؤد ۱/۱۹۳]۔

جو بچہ اس عمر کا ہو؛ وہ نماز کی سمجھ نہیں رکھتا؛ اور نہ ہی تلقین کے بغیر اس طرح کی وعاء حفظ کر سکتا ہے۔ صرف ایک بار سن لینے کی وجہ سے ایسی چیزیں حفظ نہیں ہو جاتی۔

چوتھی بات: انہوں نے اس سے پہلے اس آیت: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ [البائنة ۵۵]

” (مسلمانوں) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اس کا رسول ہے۔“ کی تفسیر میں نماز میں انگوٹھی صدقہ کرنے کا واقعہ پیش کیا تھا؛ اس روایت میں بھی یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ وعاء فرمائی۔ اور یہاں پر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ وعاء مکہ میں اس واقعہ سے کئی سال پہلے کی تھی۔ اس لیے کہ پہلی وعاء سورت مائدہ کی تفسیر میں ہے۔ جو کہ مدینہ میں نازل ہونے والی آخری سورت ہے۔ جب کہ پھلا واقعہ مکہ مکرمہ کا ہے۔ جب آپ نے یہ وعاء مکہ میں کی تھی اور اسے شرف قبولیت بھی مل گیا تھا تو پھر اتنے سالوں بعد دوبارہ مدینہ طیبہ میں یہی وعاء کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

پانچویں بات: قبل ازیں ہم اس دعویٰ کے بطلان پر دلائل دے چکے ہیں۔ بلاشبہ یہ کلام کئی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا گیا ہے۔ لیکن یہاں پر انہوں نے کچھ چیزیں ایسی زیادہ کی ہیں جو پھلے گزری ہوئی دعا میں نہیں تھیں۔ یہاں پر انہوں نے وعاء میں یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں: ”اے میرے کام میں شریک کر دو۔“ یہ صراحت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کیساتھ اس کام میں شریک تھے۔ جیسے ہارون حضرت موسیٰ کیساتھ شریک تھے، یہ ان لوگوں کا قول ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی مانتے ہیں۔ یہ صریح کفر ہے؛ یہ امامیہ کا قول نہیں؛ بلکہ غالیہ کا قول ہے۔ کسی معاملہ میں شریک وہ نہیں ہوتا جو کہ بعد میں خلیفہ بنے۔ اس لیے کہ شیعہ آپ کے لیے نبی کریم ﷺ کے بعد امامت کے وعیدار ہیں۔ جب کہ اس کا مطلب آپ کے ساتھ زندگی میں آپ کے امور میں شراکت ہے۔ امامیہ اگرچہ نبوت میں آپ کے ساتھ کسی کی شراکت کا کہنے والوں کو کافر کہتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اہل سنت والجماعت کی مخالفت؛ اولیاء اللہ سے بغض و عداوت اور ان کے بارے میں کافر اور مرتد ہونے کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے؛ انہی لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کفر و گمراہی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے اصل دین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہ ان ہی گمراہوں اور کفار کے مقال و رجال میں اضافہ کرتے ہیں۔ گویا وہ اس مثل کے مصداق ہیں: ”رَمَتْ نِسِي بَدَائِئِهَا وَانْسَلَتْ“۔ ”وہ اپنی بیماری مجھ پر پھینک کر کھسک گئی۔“

اس رافضی کذاب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ: ”یہ روایت اس باب میں نص کا درجہ رکھتی ہے۔“

تو اس رافضی شیطان سے پوچھا جائے گا: اے احمق انسان! کیا یہ نص اس بات پر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ کے امور میں آپ کی زندگی میں شریک تھے؛ جیسے ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شریک تھے؛ کیا تم اس نص کے بموجب یہی عقیدہ رکھتے ہو؟ یا پھر تم بھی جھوٹی روایات اور باطل حکایات کا سہارا لیکر کوئی نئی چیز گڑھ رہے ہو؟

اہل منطق کی اصطلاح میں اسے تحصیل حاصل کہتے ہیں؛ جو کہ عام انسان کے حق میں بھی ممنوع ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ حق میں اسے کیسے تصور کیا جاسکتا ہے۔ [رداوی کشمیری]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اڑتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اڑتیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ (الحجر: ۴۷)

”وہ بھائی بھائی بنے ہوئے ایک دوسرے کے آسنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔“

مسند احمد میں حضرت زید بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے کہ میں مسجد نبوی میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں انھوں نے نبی کریم ﷺ کی مواخات کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میری روح چلی گئی؛ اور میری کمر لوث گئی؛ جب آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ بیشک یہ مجھ پر اللہ کی ناراضگی کے سبب سے ہے۔ اور آپ کے لیے آخرت میں عزت و کرامت ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ نبی بنا کر مبعوث کیا! میں نے تجھے (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو) اپنے لیے منتخب کیا ہے آپ کو مجھ سے وہی تعلق ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا، البتہ میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جائے گا۔“

آپ میرے بھائی اور وارث ہیں آپ جنت کے محل میں میرے ہم راہ ہوں گے۔ اور وہاں میری بیٹی فاطمہ بھی ہوگی۔ تم میرے بھائی اور میرے دوست ہو، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ آپ کی وجہ سے محبت کرنے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے۔ مواخات مناسبت اور محاسنت کو چاہتی ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے مواخات (بھائی چارہ) کے لیے مختص کیا تھا۔ لہذا آپ ہی امام ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مسند احمد میں ذکر نہیں کی گئی۔ اور نہ ہی امام احمد نے اسے روایت کیا ہے۔ نہ ہی مسند میں اور نہ ہی الفصائل میں۔ اور نہ ہی آپ کے بیٹے نے یہ روایت نقل کی ہے۔ رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ یہ روایت مسند احمد میں ہے امام احمد بن حنبل پر ایک کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔

بلکہ یہ القطعی کے اضافات سے ہے جس میں باتفاق اہل علم جھوٹ اور موضوعات کی بھرمار ہے۔ القطعی نے اپنی سند سے زید بن ابی اوفیٰ سے روایت کیا ہے۔

نیز اس رافضی نے اس روایت کے پورے الفاظ بھی ذکر نہیں کئے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں جو رافضی نے قصداً حذف کر دیے ہیں۔ جب آپ نے فرمایا: ”آپ میرے بھائی اور وارث ہیں“ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ سے ورثہ پاؤں گا؟ آپ نے فرمایا: ”وہی ورثہ جو انبیاء سابقین دوسروں کو دیا کرتے تھے۔ آپ سے پوچھا گیا: پہلے کے انبیاء دوسروں کو کیا ورثہ دیتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا: ”کتاب اللہ اور سنت رسول۔“

یہ اسناد ظلم و جہالت پر مشتمل ہے۔ اس کے روایت کرنے میں عبدالمومن بن عباد راوی ہے جو کہ مجروحین میں سے ایک ہے۔ ابوحاتم نے اسے یزید بن معن سے روایت کرنے میں ضعیف قرار دیا ہے۔ اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ یزید بن معن کون ہے۔ شامکہ کہ جس نے عبد اللہ بن شریحیل کی زبان پر اسے روات کو ایجاد کر لیا ہو وہ کوئی مجہول ہو۔ جو کہ قریش میں سے ایک آدمی سے روایت کرتا ہے؛ اور وہ یزید بن ابی اونی سے روایت کرتا ہے۔

❖ دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین و اہل علم کذب ہے۔

❖ تیسری بات: مہاجرین و مہاجرین اور انصار و انصار کے مابین مواخات کی تمام روایات جھوٹ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مواخات قائم نہیں کی تھی؛ اور نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عمر رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا تھا۔ یہ مواخات آپ ﷺ نے مہاجرین کے درمیان قائم نہیں کی تھی، بلکہ مہاجر و انصار کے درمیان تھی۔ جیسا کہ آپ نے عبد الرحمن بن عوف اور سعد بن ربیع کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ اور حضرت سلیمان الفارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ ایسے ہی حضرت علی اور حضرت کہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔

مواخات کا واقعہ بنی نجار کے محلے میں پیش آیا تھا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ مسجد نبوی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جیسے بعض جاہل لوگ موضوع روایت میں بیان کرتے ہیں۔ بلکہ یہ واقعہ بنی نجار کے محلے میں ان میں سے ایک آدمی کے گھر پر پیش آیا تھا۔ یہی وہ مواخات ہے جس کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ خبر دے رہے ہیں۔ عاصم بن سلیمان الاحول کہتے ہیں: میں نے انس سے کہا: میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”اسلام میں کوئی حلف [اتحاد] نہیں ہے۔“ تو حضرت انس نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ نے ہمارے گھر میں قریش اور

انصار کے درمیان اتحاد [یعنی بھائی چارہ] قائم کیا تھا۔“ [رواہ البخاری ۱۹۶/۳، ومسلم ۱۹۶۰/۴]

❖ چوتھی بات: اس روایت کے یہ الفاظ آپ میرے بھائی اور میرے وارث ہیں۔ درست نہیں۔ اہل سنت اور شیعہ کے قول کے مطابق یہ الفاظ باطل ہیں۔ کیونکہ اگر اس سے مالی وراثت مراد لی جائے تو ان کا یہ قول باطل ٹھہرے گا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی وارث ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ چچا زاد بھائی ہونے کی صورت میں کیوں کر وارث ہو سکتے تھے؟ پھر یہ کہ جب نبی کریم ﷺ کے چچا زاد اور بھی موجود تھے تو ان میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کس طرح وارث قرار پاسکتے تھے؟ جب کہ یہ سارے ایک ہی درجہ میں ہیں۔ اور اگر علمی وراثت یا امامت و خلافت مراد ہے تو شیعہ کا احتجاج آیت کریمہ: ﴿وَرَبُّكَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ﴾ (النمل ۱۶) ”اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔“ اور آیت: ﴿يَرْثُ يُثْنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ (مريمہ: ۶) ”جو میرا وارث اور آل یعقوب کا وارث بنے۔“ سے باطل ٹھہرا۔

جب لفظ وراثت میں دونوں چیزوں کا احتمال موجود ہے؛ تو ممکن ہے کہ ان انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی ایسے ہی وراثت ملی ہو جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے وراثت ملی۔

اہل سنت والجماعت یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جو علمی ورثہ عطا کیا تھا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کا یہ فیض سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے عام تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ

نے نبی کریم ﷺ سے سن کر ستر سورتیں یاد کی تھیں۔^① یہ امر بھی قابل غور ہے کہ علم مال کی طرح کسی فرد بشر کے ساتھ مختص نہیں ہوتا بلکہ ایک کے حصہ میں جو ورثہ آتا ہے، دوسرا بھی اس سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ دونوں میں تزام و تصادم کا کوئی امکان نہیں۔ مال کا معاملہ اس سے یک سر مختلف ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مال کی ایک ہی چیز دو آدمی برابر لے لیں۔

✽ پانچویں بات: نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی بھائی کہا ہے۔ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کہا: ”آپ میرے بھائی اور مولیٰ ہیں۔“^② جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا تھا تو اسے مخاطب کر کے کہا: ”میں آپ کا بھائی ضرور ہوں مگر تمہاری بیٹی میرے لیے حلال ہے۔“^③

روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر کے بارے میں فرمایا: ”اسلامی برادری سب سے بہتر ہے۔“^④ احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: ”میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔“ صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟“ فرمایا: نہیں، تم میرے صحابہ ہو، میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔ وہ بلا دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے۔“^⑤

مراد یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ایک بھائی چارے سے بھی بڑھ کر مخصوص چیز ہے یعنی محبت۔ اور ان کے لیے صحبت کے بغیر بھائی چارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰) ”یشک سب مومن بھائی بھائی ہیں۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا تقاطعوا؛ ولا تدابروا، ولا تباغضوا، ولا تحاسدوا، وكونوا عباد الله إخواناً))۔ متفق علیہ۔

”آپس میں قطع رحمی نہ کرو۔ اور نہ ہی آپس میں حسد کرو، اور نہ ہی بغض رکھو، اور نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرو، اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔“^⑥

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہوتا ہے۔“^⑦

① صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب رسول الله ﷺ (ح: ۵۰۰۰)، صحیح مسلم،

کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عبد الله بن مسعود و امه رضی اللہ عنہما (حدیث: ۲۴۶۲)

② صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان..... (حدیث: ۲۶۹۹)، مطولاً۔

③ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب تزویج الصغار من الکبار (حدیث: ۵۰۸۱)، یہ مکالمہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین ہے۔ واللہ اعلم۔

④ صحیح بخاری، کتاب الصلاة، باب الخوخة والممر فی المسجد (حدیث: ۴۶۷، ۳۶۵۷)۔

⑤ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب استحباب اطالة الغرة (حدیث: ۲۴۹)۔

⑥ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ينهى عن التحاسد والتدابیر (حدیث: ۶۰۶۴)، صحیح مسلم، کتاب

البر والصلة باب تحريم الظن (حدیث: ۲۵۶۳)

⑦ صحیح بخاری باب لا یظلم المسلم المسلم..... (ح: ۲۴۴۲)، صحیح مسلم، باب تحريم الظلم (ح: ۲۵۸۰)۔

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((والذي نفسي بيده! لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه من الخير ما يحب لنفسه)).

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب

تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی خیر نہ پسند کرے جسے وہ اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہے۔“ [بخاری ۱۳]

مطلق مواخات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بھائی چارہ قائم کرنے والوں میں کامل تماثل و تشابہ پایا جاتا ہے۔ بنا بریں اگر

یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ نبی کریم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سب سے افضل ہوں گے اور امام بھی۔“

جب یہ بات صحیح ثابت ہوگئی؛ تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مواخات والی حدیث اگر صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا مقتضی امامت اور افضلیت ہوتا ہے؟ حالانکہ مواخات مشترکہ ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے کئی سندوں کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

”اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا؛ مگر تمہارا یہ ساتھی اللہ کا گہرا دوست

ہے۔ مسجد نبوی کی طرف کھٹنے والی سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کھلی رہے۔ صحبت و رفاقت اور

انفاق مال کے اعتبار سے ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔“^①

حدیث صحیح میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا:

”اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سے کون آپ کو عزیز تر ہے؟ فرمایا: ”عائشہ رضی اللہ عنہا۔“

پھر پوچھا گیا: مردوں میں سے کون عزیز تر ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا باپ یعنی حضرت ”ابوبکر رضی اللہ عنہ۔“

صحیحین میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

”بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی ﷺ بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔“

یہ وہ احادیث ہیں جن کی صحت اور قبولیت پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی ان احادیث پر تنقید نہیں کی۔ اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے چہیتے اور تمام لوگوں میں سے اونچی شان کے مالک تھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مواخات کا درجہ اس سے کم ہے؛ تو بھی ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر اس کا مرتبہ اس سے اعلیٰ ہے؛ تو یہ صحیح احادیث اس قسم کی مواخات کو جھٹلا رہی ہیں۔ ہمیں اس تعارض کے بغیر بھی اس مواخات کی روایت کے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ صحیح احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر محبوب تھے۔ اور باقی لوگوں کی نسبت آپ کا مقام و مرتبہ بھی زیادہ تھا؛ اس کے شواہد بہت زیادہ ہیں۔

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذًا خليلاً“ (ح ۳۶۵۸)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۳۸۲، ۶/۲۳۸۳)۔

اسی سے زیادہ افراد نے تو اتر کیساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے [کوفہ کے منبر پر تقریر کرتے ہوئے] فرمایا:

”امت محمدی میں نبی کریم ﷺ کے بعد سب سے افضل ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ۔“^①

یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاہانِ شان تھی کیونکہ آپ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق کا باقی صحابہ سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ اور اسلام میں ان کی قدر و منزلت اور دین میں حسنِ تأثیر سے خوب شناسا تھے؛ یہاں تک کہ آپ تمنا فرمایا کرتے تھے کہ:

”وہ اللہ سے اس حال میں ملیں کہ ان کے اعمال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ہوں۔“ رضی اللہ عنہما۔

امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”[یہ دونوں انبیاء و مرسلین کے علاوہ] جنت کے تمام ادھیڑ عمر لوگوں کے سردار ہیں۔ اے علی! تم انہیں اس کی خبر نہ دینا۔“^②

اگر ان صحیح احادیث کا مقابلہ پرندے والی روایت؛ یا مؤاخات والی روایت سے کیا جائے تو بلا شک و شبہ یہ احادیث باتفاقِ مسلمین ان کی نسبت صحیح تر ہوں گی۔ تو پھر جب ان کے ساتھ دوسری صحیح احادیث بھی ملا دی جائیں جن کے صحیح ہونے میں کسی کو بھی شک نہیں؛ تو ان کا کیا کہنا۔ کثرت کے ساتھ متعدد دلائل کی روشنی میں ان کا علم رکھنے والے کے لیے لازمی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں سے سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو محبوب؛ اور عمر و عثمان و علی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت سے افضل تھے۔ جو بھی انسان رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کے احوال کی معرفت رکھتا ہو اسے ضرور اس بات کا اعتراف رہے گا۔ مذکورہ صدر نصوص احادیث صحیحہ کے بارے میں وہی شخص شک و شبہ کا شکار ہو سکتا ہے جسے صحیح اور ضعیف میں کوئی تمیز نہ ہو؛ [یا جو جاہل ہو یا جس پر بدعت کا غلبہ ہو]۔ وہ یا تو تمام احادیث کی تصدیق کرتا ہے یا پھر تمام احادیث میں توقف کرتا ہے۔

جب کہ محدثین اور فقہاء بہت اچھی طرح سے [یہ بات] جانتے ہیں؛ ان کو کبھی چھوڑیے؛ اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کا ہر ایک سچا عالم و عابد اور زاہد حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقدیم دینے میں یک زبان ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”صحابہ و تابعین میں سے کسی نے بھی حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو افضل الصحابہ قرار دینے میں اختلاف نہیں کیا۔“^③

ایسے ہی دیگر علماء اسلام نے بھی اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ جیسا کہ حضرت امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، امام احمد اور ان کے اصحاب، ثوری اور ان کے اصحاب، لیث اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور ان کے اصحاب، اسحاق اور ان کے اصحاب، داؤد اور ان کے اصحاب اور ابن جریر اور ان کے اصحاب؛ ابو ثور اور ان کے اصحاب اور دیگر تمام مشہور ائمہ سلف و خلف رحمہم سب یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اگر کسی نے اختلاف کیا بھی ہوگا تو کوئی ایسا ہوگا جس کے قول کی دو کئی کی اہمیت نہ ہوگی؛ اور نہ ہی کوئی اس کی بات سنتا و مانتا ہوگا۔

ہمیں اس بارے میں اہل فتویٰ میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف معلوم نہیں ہو سکا۔ سوائے حسن بن صالح بن حنی کے:

① صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث: ۳۶۶۲)، صحیح مسلم، حوالہ سابق، (حدیث: ۲۳۸۴)۔

② [جامع ترمذی: جلد دوم، ص: ۱۶۳]؛ یہ حدیث اس سند سے حسنِ غریب ہے۔

③ مناقب الشافعی للبیہقی ۴۳۴/۱۔

ان کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آپ پر جموت باندھا گیا ہے۔ اگر یہ بات صحیح بھی ثابت ہو جائے؛ تب بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے نقل کردہ اجماع پر کوئی قدح وارد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ حسن بن صالح نہ ہی صحابہ میں سے تھے اور نہ ہی تابعین میں سے۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگر حسن بن صالح نے ایسی کوئی بات کہی بھی ہوگی تو لاکھوں ائمہ میں سے کسی ایک کا غلطی کر جانا کوئی اچھوتی بات نہیں ہے۔

روافض میں کوئی ایسا عالم نہیں ہے جو علوم اسلامیہ میں سے کسی چیز میں امام ہو نہ ہی علم حدیث میں نہ فقہ میں؛ نہ تفسیر میں؛ نہ ہی قرآن میں۔ بلکہ رافضیوں کے مشائخ یا تو بالکل جاہل ہوتے ہیں یا پھر زندگی ہوتے ہیں جیسے اہل کتاب کے مشائخ۔ سابقین اولین ائمہ اہل سنت والحدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تقدیم دینے پر متفق ہیں۔ ان کا یہ اجماع و اتفاق کسی رغبت یا لالچ کی وجہ سے یا کسی خوف و ڈر کی بنا پر نہ تھا۔ حالانکہ ان حضرات کی آراء و افکار اور مقاصد و علوم مختلف تھے؛ اور دوسرے علم مسائل میں ان کے مابین کثرت کے ساتھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود صحابہ اور تابعین میں ائمہ اس نظریہ و عقیدہ پر متفق ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت امام مالک بن انس؛ اور ابن ابی ذئب؛ اور عبدالعزیز بن المہاشون اور دوسرے علماء مدینہ طیبہ کا اس پر اتفاق ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے مشائخ و اساتذہ سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی افضلیت پر اجماع نقل کیا اور فرمایا کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ابن جریج؛ سعد بن سالم؛ مسلم بن خالد زنجی؛ ابن عیینہ اور علماء مکہ رحمہم کی بھی یہی رائے ہے۔ علاوہ ازیں امام ابوحنیفہ؛ ثوری؛ شریک بن عبداللہ؛ ابن ابی لیلی؛ اور دیگر علماء بصرہ اور شیعہ کے مرکز کوفہ کے علماء رحمہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ امام ثوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

”جو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا ہے؛ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہوگا۔“ [سنن ابی داؤد ۴۸۸۸]

مزید برآں حماد بن زید؛ حماد بن سلمہ؛ سعید بن ابی عروبہ؛ اور ان کے امثال علماء بصرہ؛ اوزاعی؛ سعید بن عبدالعزیز جیسے علماء شام؛ اور مصری علماء میں سے عمر بن حارث و لیث بن سعد و ابن وہب؛ پھر ان کے بعد عبداللہ بن مبارک؛ وکیع ابن الجراح؛ عبدالرحمن بن مہدی؛ ابو یوسف؛ محمد بن الحسن؛ اور امام شافعی؛ احمد بن حنبل؛ اسحاق بن ابراہیم؛ ابی عبیدہ؛ امام بخاری؛ ابو داؤد؛ ابراہیم الحربی؛ اور فضیل بن عیاض؛ ابوسلیمان الدارانی؛ معروف الکفری؛ سری السقطی؛ جنید؛ سمیل بن عبداللہ التستری؛ اور لاتعداد علماء رحمہم جن کی صحیح تعداد اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا؛ اسلام میں جن کی سچائیوں کے چرچے ہیں؛ یہ تمام حضرات حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم و فضیلت کا دھوکہ اور قطعی عقیدہ رکھتے تھے۔ اور ان دونوں اصحاب کو ائمہ ہر حق مانتے تھے۔ ان حضرات کی نبی کریم ﷺ کی متابعت اور سنت پر عمل کی مشکورانہ کوششیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو پتہ تھا کہ نبی کریم ﷺ بھی حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو تقدیم بخشنے تھے۔ اور محبت و ثناء اور مشاورت میں ان کو فضیلت دیتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی فضیلت کے کئی اسباب تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتالیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتالیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

”اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔ تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض پیغمبر تھے۔“

کتاب الفردوس میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین کے لقب سے کب ملقب کیا تھا تو ان کی فضیلت کا انکار نہ کرتے۔ آپ اس وقت اس لقب سے نوازے گئے تھے۔ جب آدم کی تخلیق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾
”فرشتوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہارا رب ہوں۔ محمد تمہارے نبی ہیں اور علی تمہارے امیر ہیں۔ یہ روایت اظہارِ مدعا میں بالکل صریح ہے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا۔]

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

❖ **پہلی وجہ:** اس روایت کی صحیح سند پیش کرو۔ تمام محدثین کا اجماع ہے کہ صرف صاحب فردوس کا کسی روایت کو ذکر کر لینا حدیث کے صحیح ہونے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ابن شیر وید الدیلمی الہمدانی نے اپنی اس کتاب میں بہت ساری صحیح احادیث صحیح بھی نقل کی ہیں، حسن بھی اور موضوع بھی۔ یہ انسان اگر چہ اہل علم میں سے اور دیندار آدمی تھا۔ اور ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو جان بوجھ کر جھوٹ گھڑ لیتے ہیں۔ لیکن اس نے وہ روایات نقل کر لی ہیں جو لوگوں کی کتابوں میں موجود تھیں۔ کتابوں میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو اس نے بھی ویسے ہی کیا جیسے بہت سارے دوسرے لوگ احادیث جمع کرتے وقت کیا کرتے ہیں۔ یا تو سند کے ساتھ روایت ذکر کرتے ہیں یا پھر سند کو حذف کر دیتے ہیں۔

❖ **دوسری وجہ:** یہ روایت سب محدثین کے نزدیک جھوٹی ہے۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

❖ **تیسری وجہ:** قرآن کریم کی ذکر کردہ آیت میں صرف یہ الفاظ ہیں: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى﴾ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ کہنے لگے: کیوں نہیں؟“ [ضرور آپ ہمارے رب ہیں]۔ اس میں نہ ہی کسی نبی کا ذکر ہے، اور نہ ہی کسی امیر کا۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں ہے:

﴿أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ﴾

”یابہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا ہی نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ایک نسل تھے۔“
اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت صرف خاص طور پر میثاق توحید پر مشتمل ہے۔ اس میں میثاق نبوت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا،
باقی امور تو الگ رہے۔

❖ **چوتھی وجہ:** اس بارے میں احادیث بڑی معروف ہیں۔ جو کہ مسند سنن، موطا اور کتب تفسیر وغیرہ میں منقول
ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی گئی۔ اگر اس بات کی کوئی حقیقت ہوتی تو پھر سارے لوگ اس کے بیان کرنے
کو ترک نہ کرتے؛ بلکہ کوئی نہ کوئی ضرور اسے ذکر کرتا۔ بلکہ ایک ایسا مصنف اسے ذکر کر رہا ہے جس کی سچائی کا کوئی پتہ
ہی نہیں؛ بلکہ اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے۔

❖ **پانچویں وجہ:** علاوہ ازیں چونکہ یہ عہد سب لوگوں سے لیا گیا تھا۔ لہذا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ
جلہ انبیاء از نوح تا محمد ﷺ کے بھی امیر ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ ایک احقانہ بات ہے۔ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہ السلام
حضرت علی رضی اللہ کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے، ان کے امیر کیوں کر قرار پاسکتے تھے؟ زیادہ سے زیادہ حضرت
علی رضی اللہ اپنے اہل زمانہ کے امیر ہو سکتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ پہلے لوگوں کے بھی امیر تھے اور ان
لوگوں کے بھی جو آپ کے بعد پیدا ہوئے تو کوئی شخص بھانگی ہوش و حواس اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اسے ایسی
بے ڈھنگ باتیں کرتے ہوئے کوئی حیا آتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ احمق رافضی عقلاء یہود سے بھی گزرا ہے
جن کے متعلق قرآن نے فرمایا تھا:

﴿مَعْلُ الَّذِينَ حُولُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْجَمَارِ يَحْمِلُ أَشْقَارًا﴾ (الجمعة ۵)

”جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو
بہت سی کتابیں لادے ہو۔“

عام لوگ اپنے اس کلام میں معذور ہیں کہ: رافضی یہودیوں کا گدھا ہے۔ اس لیے کہ ایک یہود کے اہل خرد و دانش سے
یہ بات پوشیدہ نہیں کہ شیعہ کے یہ دلائل عقلاً و شرعاً بے کار ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی نے کہا ہے: ان پر ان کے نیچے
سے چھت گر گئی۔ [کیا چھت بھی کبھی نیچے سے گرتی ہے؟] ایسے لوگوں کو نہ ہی عقل کام آتی ہے اور نہ ہی قرآن۔ یہی حال ان
کے اس عقیدہ کا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تمام اولاد آدم کے امیر ہیں۔ آپ تو حضرت آدم علیہ السلام کی موت کے ہزاروں سال بعد
پیدا ہوئے۔ اور آپ کا گزرے ہوئے انبیاء کرام علیہ السلام پر امیر ہونا؛ جو کہ آپ سے مقام و مرتبہ اور زمانے کے لحاظ سے متقدم
ہیں؛ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے طلحہ صوفی ابن عربی الطائی اور اس کے امثال کا یہ قول ہے کہ:

”انبیاء کرام معرفت الہی کا علم خاتم الاولیاء (ابن عربی اپنی کتاب ”القصص“ میں لکھتے ہیں کہ میں خاتم الاولیاء ہوں)

کے سینے سے اخذ کیا کرتے تھے جو محمد ﷺ سے چھ سو سال کی مدت بعد پیدا ہوا تھا۔“

ابن عربی کے ہم نوا اولیاء کے بارے میں اسی طرح غلو سے کام لیتے ہیں، جیسے شیعہ اماموں کے بارے میں۔ یہ دونوں
دعوے جھوٹ، غلو، شرک اور باطل پروپیگنڈے کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔ اور یہ دعوے کتاب و سنت اور اجماع سلف امت

سے نکراتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت ہے کہ شیعہ مصنف ایسے دلائل کو ”صریح فی الباب“ قرار دیتا ہے۔ بھلا ایسے دلائل کو کوئی عقلمند شخص تسلیم کر سکتا ہے؟ یا ایسی باتوں سے کوئی بھی وائش مند انسان دلیل اخذ کر سکتا ہے؟ چہ جائے کہ اس کو بنیاد بنا کر امت کے بہترین لوگوں کو فاسق و فاجر قرار دیا جائے۔ اور انہیں کافر و جاہل اور گمراہ کہا جائے؟

اگرچہ ایسے دعووں کی بنیاد پر یہ سرکش عالم اولیاء اللہ پر ظلم و تعدی نہ بھی کرتا ہو؛ اور اہل ارض کے سادات کو برا بھلا نہ بھی کہتا ہو؛ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے معزز و مکرم مخلوق پر اور دین پر قدح نہ بھی کرتا ہو؛ اور کافروں کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ بھی کرتا ہو تب بھی کیا یہ کم جرم ہے کہ ایسی باتوں سے وہ عام سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور اہل اسلام کے متعلق شکوک و شبہات ڈال رہا ہے۔ ہمیں ایسے اسرار کے حقائق معلوم کرنے اور ایسے رازوں سے پردہ اٹھانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اس انسان اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے لیے کافی ہے۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چالیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چالیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاكَ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (التحریم: ۴)

”پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک ایماندار اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔“

مفسرین کا اجماع ہے کہ ”صالح المؤمنین“ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ ابو نعیم حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ آیت پڑھتے سنا: ﴿وَإِنْ تَطَهَّرَ عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاكَ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ﴾، آپ نے فرمایا۔ نیک ایماندار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل ہیں لہذا آپ ہی امام ہوں گے۔“ اس معنی میں اور بھی بہت ساری آیات وارد ہوئی ہیں۔ ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اختصار کے پیش نظر ہے۔ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

❖ **جواب: پہلی بات:** اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضمن میں اس اجماع کا دعویٰ افتراء پر مبنی ہے کہ ”تمام مفسرین کا ایماندار سے مؤمن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مراد ہونے پر اتفاق ہے“ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ نہ ہی اس تفسیر پر کوئی اجماع ہے اور نہ ہی کسی مفسر یا محدث نے ایسا کوئی اجماع نقل کیا ہے۔ ہم شیعہ سے اس منقول کی صحیح سند کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اجماع کس نے نقل کیا ہے؟

❖ **دوسری بات:** حقیقت یہ ہے کہ اس روایت پر اجماع تو کجا کتب تفسیر میں اس کے برعکس مذکور ہے، چنانچہ مجاہد اور دیگر علماء اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔ جیسے ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ۔ [اس کے علاوہ بھی اس کی کئی ایک تفاسیر ہیں:

- ۱۔ اس سے مراد ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ کھول نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔
- ۲۔ اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔
- ۳۔ اس سے مراد نیکو کار مومنین ہیں۔ یہ ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔
- ۴۔ بعض علماء اس سے انبیاء مراد لیتے ہیں۔ یہ قتادہ؛ زیاد بن علاء اور سفیان رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔
- ۵۔ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ یہ حکایت ماوردی رضی اللہ عنہ نے نقل کی ہے، اور اس قول کے کہنے والے کا نام نہیں لیا، شاید اس کا کہنے والا کوئی شیعہ ہوگا۔

❖ **تیسری بات:** اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ حدیث یقیناً کذب ہے۔ مصنف نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ صرف ابو نعیم کی روایت کر لینا حدیث کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

❖ **چوتھی بات:** مزید براں ”وصالح المومنین“ کے الفاظ عام ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”فلاں گھر والے میرے دوست نہیں ہیں۔ میرا دوست صرف اللہ تعالیٰ اور نیکو کار مومن ہیں۔“ ❶

❖ **پانچویں بات:** نیز یہ کہ مذکورہ صدر آیت میں نیک نہاد اہل ایمان کو رسول اللہ کا ”مولیٰ“ قرار دیا گیا ہے۔ جیسے یہ خبر بھی دی ہے کہ اللہ بھی ان کا مولیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ مولیٰ سے مولیٰ مراد ہے۔ لہذا جو شخص بھی نیک دل مومن ہو گا وہ نبی کریم ﷺ کا قطعی طور پر مولیٰ (دوست) ہو گا، اگر وہ آپ سے دوستی نہ لگاتا ہو تو وہ صالح مومنین میں سے نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی کبھی کوئی مومن دوستی تو رکھتا ہے؛ مگر وہ کامل نیکو کار نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اس کی دوستی کامل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جو کوئی کامل ایمان والا نیک انسان ہوتا ہے اس کی دوستی بھی کامل و مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان دار انسان اس چیز سے محبت کرتا ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ محبت کرتے ہیں۔ اور اس چیز سے بغض رکھتا ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ بغض رکھتے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کا حکم دیتا ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، اور ہر اس چیز سے منع کرتا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے۔ دوستی کا تقاضا یہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

”عبداللہ بہترین نیک انسان تھا اگر یہ رات کو نماز [تہجد] بھی پڑھتا۔“ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تہجد کی نماز کبھی بھی نہیں چھوڑی۔“ [البخاری ۹/۴۰؛ مسلم ۴/۱۹۲۸]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

”یہ تمہارے نیکو کار مردوں میں سے ہے، اس کے ساتھ بہترین خیر خواہی کا سلوک کیا کرو۔“ [مسلم ۴/۱۸۸۴]

❶ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب قبل الرحمہ ببلالہا (ح: ۵۹۹۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاة المومنین (ح: ۲۱۵۰)۔

❖ شیعہ کا یہ قول کہ ”وَالْآيَاتُ فِي هَذَا الْمَعْنَى كَثِيرَةٌ“ ”اس معنی میں بہت ساری آیات ہیں۔“

جواب : ہم کہتے ہیں کہ شیعہ کے دلائل اسی طرح متروک روایات، کمزور اور بودے ہوں گے جس طرح ان کے ذکر کردہ دلائل بے کار ہیں۔ جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے، وہ ان کے ہاں مذہب کے دلائل کا خلاصہ ہے۔ آخر جھوٹ کی کیا کمی ہے؟ یہ دروازہ تو کبھی بند نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے والے لوگ [نواصب اور مروانیہ] بھی جو ان سے بن سکتا تھا، وہ اس طرح کے جھوٹ گھڑ لیتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر پھینک مارتا ہے اور د. مغلوب ہو کر دب جاتا ہے۔ اور جھوٹ بولنے والوں کے لیے ان کے جھوٹ پر ہلاکت اور تباہی ہے۔

[اشکال:] شیعہ کا قول: [اس آیت سے] مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔“

[جواب:] اگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ اس سے مراد ابو بکر یا عمر یا عثمان رضی اللہ عنہم ہیں؛ تو ان کے قول کی نسبت یہ قول تفسیر سے کچھ دور نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ قول ان کے قول پر رائج ہوگا۔ خصوصی طور پر کئی ایک مواقع پر۔ اگر شیعہ اعتراض کریں کہ: ہمارے قول کے برعکس اس طرح کی تفسیر کسی نے نہیں کی؟ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے: پہلی وجہ: [آپ کی تفسیر بھی] ممنوع ہے۔ بلکہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی گزرے ہیں جو اس آیت سے اور اس طرح کی بعض دوسری آیات سے خاص ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مراد لیتے ہیں۔

❖ دوسری وجہ: کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو خاص کر دیا گیا ہے۔ جب کہ کسی دوسرے کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی اور کو اس آیت کی تفسیر کے ساتھ خاص کر دیں۔ تو یہ دونوں دلائل ایک ہی جنس سے ہوں گے۔ یہ بات شیعہ کی دلیل کے فاسد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ اس طرح کی بات پہلے کسی نے نہ بھی کہی ہو۔ اس لیے کہ جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اس جیسے جھوٹ کے ساتھ مقابلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ تو اس دلیل کا توڑ اس جیسی ہی دلیل سے ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس صورت میں واجب ہوتا ہے یا تو دونوں کی تصدیق کی جائے یا پھر دونوں کی تکذیب کی جائے۔

قاسم بن زکریا کی حکایت مشہور ہے؛ وہ عباد بن یعقوب اسدی رافضی کے پاس گیا۔ [وہ کہتا ہے] اس [رافضی] نے مجھ سے کہا: ”دریا کس نے کھودا؟“

میں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ نے۔“

اس نے کہا: ”تم سچ کہتے ہو، مگر یہ بتاؤ دریا کس نے کھودا؟“

میں نے کہا: پھر آپ ہی ارشاد فرمائیں۔“

عباد نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھودا تھا۔“

پھر اس نے پوچھا: ”دریا کو کس نے جاری کیا؟“

میں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ نے۔“

تم سچ کہتے ہو، مگر یہ بتاؤ دریا کس نے جاری کیا تھا؟“

میں نے کہا: آپ ہی فرمائیں۔

عباد نے کہا: ”حسین نے جاری کیا۔“

[[عباد نابینا تھا۔ جب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو؛ میں نے اس کے پاس ایک تلوار اور ڈھال دیکھی تو پوچھا یہ کس کی ہے؟ عباد کہنے لگا: میں نے مہدی کے ساتھ لڑنے کے لیے یہ تلوار رکھی ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر فارغ ہوا اور]] جب جانے کے ارادہ سے کھڑا ہوتا چاہا تو اس نے پھر پوچھا: ”دریا کس نے کھودا؟“

میں نے کہا: ”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے۔“ پھر اس نے پوچھا اس میں پانی کس نے جاری کیا: میں نے کہا: یزید نے۔

اس پر وہ بہت غصہ ہوا اور کھڑا ہو گیا۔^①

قاسم کی غرض یہ تھی کہ وہ بھی اس پر ایسی ہی بات سے رد کرے جیسے بات وہ کہہ رہا ہے۔ جب کہ تم اس بات کو ناپسند کرتے ہو اور اس کو رد کرتے ہو؛ پس جس دلیل سے یہ قول رد ہوگا، اس سے آپ کی دلیل بھی رد ہو جائے گی۔

ایسے ہی یہی حال رافضیوں اور قرامطہ کی ان تاویلات کا ہے جو لوگوں کی زبان پر ہیں؛ جیسے ان کا یہ قول:

﴿فَقَاتِلُوا أَيَّمَةَ الْكُفْرِ﴾ [التوبة ۱۲]

”پس کفر کے ائمہ کو قتل کرو۔“

[اس سے مراد] طلحہ وزبیر؛ ابو بکر و عمر اور معاویہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خوارج کا قول ہے جو کہتے ہیں: اس سے مراد حضرت علی، حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں باطل ہیں۔ یہاں پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جھوٹی دلیل کے مقابلہ میں ایسی ہی جھوٹی دلیل لے آتے ہیں۔ اور جس دلیل سے اس قسم کی تفسیر کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے وہ دونوں کے لیے عام ہے۔ اس سے ان تمام دلائل کا باطل ہونا ثابت ہوا۔



① [[حافظ ذہبی فرماتے ہیں یہ حکایت صحیح ہے، اسے ابن مظفر نے قاسم سے روایت کیا ہے۔ محمد بن جریر کہتے ہیں، میں نے عباد بن یعقوب کو یہ کہتے سنا۔ جو نماز میں ہر روز اعداد اہل بیت پر تمنا نہ بھیجے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا]]۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر احادیث نبویہ سے استدلال

[سلسلہ اشکالات]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”تیسرے باب میں ان احادیث نبویہ سے استدلال کیا جائے گا جو کہ مستند ہیں؛ اور نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی ہیں۔ ان دلائل کی تعداد بارہ ہے:

۱۔ پہلی حدیث: ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جو سب لوگوں نے بیان کی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ: ﴿وَآذِنُوا عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے“ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے تمام بنی عبد المطلب کو ابو طالب کے گھر میں جمع کیا۔ [ان میں دو عورتیں اور] چالیس مرد تھے۔ آپ نے ان کے لیے بھیڑ کی ایک ٹانگ ایک مٹھی بھر جو کے ساتھ پکانے اور ایک صاع دودھ تیار کرنے کا حکم دیا۔ [کا کھانا پکایا گیا]۔ ان میں سے ایک آدمی ایک وقت میں ایک بکرا کھا سکتا تھا؛ اور اسی مجلس میں ایک مشک پانی کی بھی پی سکتا تھا [یہ کھاؤ پیو آدمی تھے]۔ ان تمام لوگوں نے یہ تھوڑا سا کھانے کھایا اور اس سے سیر ہو گئے۔ اور انھیں پتہ نہ چل سکا کہ انھوں نے کیا کھایا ہے؛ آپ کی اس اعجاز نمائی سے ان پر واضح ہو گیا کہ آپ سچے نبی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے بنی عبد المطلب! یوں تو مجھے اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہے، مگر خاص طور سے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور فرمایا ہے: ﴿وَآذِنُوا عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔“

میں تمہیں دو ہلکے پھلکے کلمات کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ جن کا زبان پر جاری کرنا بڑا آسان ہے اور جو میزان اعمال میں بڑے بوجھل ہوں گے۔ تم ان دونوں کلمات کی برکت سے عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے اور جملہ اقوام عالم تمہارے زیر نگیں ہو جائیں گی۔ ان کلمات کی بنا پر تم جنت میں جاؤ گے اور جہنم سے رہائی پاؤ گے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ۔“

جو شخص میری اس دعوت کو قبول کرے گا اور میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی میرا وصی میرا وزیر اور میرے بعد میرا خلیفہ اور وارث ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر باقی لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ جب کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں اس مسئلہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بیٹھ جاؤ۔“ آپ نے اس قوم میں پھر یہی اعلان دہرایا؛ مگر تمام لوگ خاموش رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں دوبارہ کھڑا ہو گیا؛ اور وہی پہلے والی بات دھرائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جائیے۔ آپ نے پھر تیسری بار لوگوں میں یہی اعلان کیا۔ مگر لوگ خاموش رہے۔ ان میں سے کسی ایک نے اپنی زبان سے ایک کلمہ تک نہ کہا۔ میں کھڑا ہو گیا اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں اس مسئلہ میں آپ کی مدد

کردوں گا۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جائیے! تم ہی میرے بھائی اور میرے وزیر ہو، اور میرے وحی اور وارث ہو۔ لوگ کھڑے ہو گئے اور وہ ابو طالب سے کہہ رہے تھے: تمہیں مبارک ہو کہ آج تم اپنے پیچھے کے دین میں داخل ہو گئے؛ اور اس نے تمہارے بیٹے کو تم پر امیر بنادیا۔“

[جوابات]: اس [اشکال] کا جواب کئی نکات پر مشتمل ہے:

اول: ہم شیعہ سے مذکورہ بالا روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیعہ مصنف کا دعویٰ کرنا کہ یہ روایت تمام اہل علم نے روایت کی ہے؛ صریح اور کھلا ہوا کذب اور دروغ گوئی ہے۔ اہل اسلام حدیث نقل کرنے میں جن کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں؛ ان میں اس طرح کی کوئی روایت موجود نہیں۔ یہ روایت نہ ہی صحاح میں ہے اور نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مغازی میں؛ اور نہ ہی ان تفسیر کی کتابوں میں جن میں سند ذکر کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے؛ اور نہ مسانید میں۔ ہاں اگر بعض ان کتابوں میں ہو جن میں [بغیر کسی تیز کے] صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات جمع کر دی جاتی ہیں؛ جیسے ثعلبی؛ واحدی؛ اور بغوی وغیرہ؛ تو یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ بلکہ ابن جریر اور ابن حاتم رحمہ اللہ بھی اگر کوئی روایت نقل کریں تو صرف ان کے نقل کرنے سے روایت قابل جہت نہیں ہو جاتی؛ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ جب یہ بات معلوم ہے کہ روایات میں صحیح بھی ہوتی ہیں اور ضعیف بھی؛ تو پھر یہ بیان کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ روایت صحیح احادیث میں سے ہے؛ ضعیف میں سے نہیں۔

دوم: ہم اس روایت کو قبول کرنے کے لیے دو شرطوں کے ساتھ راضی ہیں:

- ❖ پہلی شرط: یہ روایت ایسی سند کے ساتھ ذکر کی جائے جو اہل علم کے ہاں اختلافی مسائل میں قابل جہت ہو۔
- ❖ دوسری شرط: یا پھر کسی ایسے محدث کا قول ہو جن کی تصحیح پر لوگ اعتماد کرتے ہوں۔

اس لیے کہ اگر دو فقیہ فروع میں سے کسی ایک فروع میں باہم جھگڑ پڑیں؛ تو مناظرہ میں جہت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایسی صحیح حدیث پیش نہ کر دے جس سے جہت قائم ہو سکتی ہو۔ یہ وہ اس قول کو صحیح قرار دے جو اس کی طرف لوٹایا جا رہا ہے۔

اس کے برعکس اگر اس روایت کی سند ہی معلوم نہ ہو۔ اور ائمہ محدثین سے اس حدیث کا منقول ہونا ثابت ہی نہ ہو؛ تو پھر یہ حدیث کیسے معلوم کی جاسکتی ہے؟ پھر خاص کر ان اصولی مسائل میں [اس روایت پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے] جن میں جمہور امت اور سلف صالحین پر طعن کیا جاتا ہو؟ اور ان کے ذریعہ سے ملت کے قواعد کو منہدم کرنے تک کا وسیلہ اختیار کیا جاتا ہو۔ [غور کیجیے] ایسی روایت جس کی سند ثابت نہ ہو؛ ائمہ و محدثین نے اسے نقل نہ کیا ہو؛ اور کسی ایک عالم نے بھی اسے صحیح نہ کہا ہو تو پھر ایسی روایت کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

سوم: یہ روایت اہل علم اور محدثین کے نزدیک من گھڑت اور جھوٹ ہے۔ کوئی بھی محدث ایسا نہیں ہے جسے حدیث کے بارے میں علم ہو اور وہ اس روایت کے من گھڑت ہونے کو نہ جانتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس روایت کو کسی بھی اہل علم نے ایسی کسی کتاب میں روایت نہیں کیا جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔ اس لیے کہ ادنیٰ علم رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس روایت کو ابن جریر اور بغوی نے اپنی اپنی اسناد سے نقل تو کیا ہے؛ مگر اس کی سند میں

عبدالغفار بن قاسم بن قہد؛ ابو مریم الکوفی نامی ایک راوی ہے؛ اسکی روایت کے مردود ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔
سماک بن حرب اور ابوداؤد رحمہما نے اسے جھوٹا کہا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل اعتماد انسان ہے۔ عام طور پر اس کی روایات باطل پر مشتمل ہوتی ہیں۔
یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل ذکر انسان ہے۔

علی المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اپنی طرف سے احادیث گھڑا کرتا تھا۔

امام نسائی اور ابوحاتم رحمہما فرماتے ہیں: اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی [متروک الحدیث ہے]۔

ابن حبان البستی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبدالغفار بن قاسم اتنی شراب پیا کرتا تھا کہ مست ہو جاتا [یعنی نشہ میں سرشار رہتا تھا]؛ اور اس کے ساتھ ہی احادیث میں اپنی طرف سے تبدیلیاں کیا کرتا تھا۔ اس کی روایات سے استدلال کرنا جائز نہیں۔ اسے امام احمد اور یحییٰ بن معین نے ترک کیا ہے۔“

اس روایت کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن عبدالقدوس ہے۔ یہ راوی بھی ناقابل اعتماد ہے۔

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل اعتماد ہے؛ یہ خبیث انسان رافضی تھا۔

امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کچھ بھی نہیں ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ضعیف راوی ہے۔“

ثعلبی کی ذکر کردہ سند اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اس سند میں ایسے راوی بھی پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں سرے سے کوئی خبر ہی نہیں۔ اور ضعیف راویوں کے علاوہ ایسے راوی بھی ہیں جن پر جھوٹ بولنے کی تہمت ہے۔
[اب غور کیجیے: شیعہ کا یہ قول کس حد تک صحیح ہے کہ ”یہ روایت سب لوگوں نے بیان کی ہے“۔ بخلاف ازیں یہ موضوع دامن گھڑت روایت ہے]۔

چہارم: بنی عبدالمطلب کی تعداد نزول آیت کے وقت چالیس نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ آیت بعثت کے ابتدائی ایام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ نیز آپ ﷺ کی زندگی میں بھی وہ [بنو عبدالمطلب] اس تعداد کو نہ پہنچ سکے۔ علماء کرام کا اتفاق ہے کہ بنو عبدالمطلب کی تمام اولاد صرف ان چار حضرات: عباس و ابوطالب و حارث و ابولہب میں سے تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے چچاؤں میں سے نبوت کا زمانہ صرف چار نے پایا۔ عباس؛ حمزہ؛ ابوطالب؛ ابولہب۔ ان میں سے دو ایمان لائے یعنی حضرت عباس اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما؛ اور دو اس نعمت سے محروم رہے۔ ان میں سے ایک ابوطالب؛ جس نے رسول اللہ ﷺ کی مدد و نصرت کی۔ جب کہ دوسرے نے آپ سے دشمنی کی؛ اور آپ کے خلاف دشمنوں کی مدد کرتا رہا؛ یعنی ابولہب۔

آپ کے چچا اور چچا زادوں کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

ابوطالب کے چار بیٹے تھے۔ علی، جعفر، عقیل، طالب۔ آخر الذکر نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ جب کہ حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہما نے شروع کے ایام میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور جعفر رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی؛ جہاں سے آپ غزوہ خیبر کے موقع پر واپس تشریف لائے۔ جب کہ عقیل باقی بنی ہاشم کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے مال و اسباب

پر قابض ہو گئے تھے۔ ان کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حجتہ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کیا کل آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”کیا عقیل نے ہمارے لیے [کوئی] گھر چھوڑا بھی ہے؟“ ❶

جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کبھی بچے ابھی شیر خوار تھے [یا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے]۔ اس لیے اس وقت میں مکہ مکرمہ میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ اور اگر مان لیجیے کہ یہ لوگ موجود بھی تھے تو تب بھی یہ حضرات عبداللہ، عبید اللہ اور فضل تھے۔ اس لیے کہ شہم بن عباس کی پیدائش بعد میں ہوئی ہے۔ ان بھائیوں میں سب سے بڑے حضرت فضل رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ان ہی کے نام پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کنیت بھی رکھی گئی تھی۔ جب کہ عبداللہ کی پیدائش شعب ابی طالب میں اس آیت کے نزول کے بعد ہوئی ہے: ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔“

ہجرت کے وقت ان کی عمر بمشکل تین یا چار سال تھی۔ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاں صرف فضل، عبداللہ اور عبید اللہ پیدا ہوئے تھے۔ باقی ساری نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

جب کہ حارث اور ابولہب کے بیٹوں کی تعداد کم تھی۔ حارث کے دو بیٹے تھے: ابوسفیان، ربیعہ۔ ان دونوں نے بہت بعد میں اسلام قبول کیا۔ ان کا شمار فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

ایسے ہی ابولہب کے بیٹوں نے بھی فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔ ابولہب کے بھی تین بیٹے تھے۔ ان میں سے دو نے اسلام قبول کیا تھا؛ عتبہ اور مغیث نے۔ جب کہ عتبہ پر رسول اللہ ﷺ نے بددعا کی تھی کہ اسے کتنا کھا جائے۔ تو اسے بلاد شام میں ”زرقاء“ کے علاقہ میں ایک درندے نے پھاڑ ڈالا تھا۔

یہ تمام بنو عبدالمطلب کی تفصیل ہے جو کہ اس وقت میں میں سے کچھ زیادہ تھے۔ تو پھر چالیس کیسے ہو گئے؟

پنجم: شیعہ کا یہ قول کہ ”بنو ہاشم بڑے بیٹے تھے“ ان میں سے ایک آدمی پورا بکرا کھا جاتا اور کسی کا پورا مشکیزہ پی جاتا۔“ یہ ان لوگوں پر صاف جھوٹ ہے۔ بنو ہاشم بسیار خوری کے مرض کا شکار نہ تھے بلکہ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو پورا بکرا کھا لیتا ہو اور ایک مشکیزہ [دودھ یا لسی] پی لیتا ہو۔

ششم: [اس روایت کے الفاظ رکیک ہیں، جن کی بنا پر دل اس کے باطل ہونے کی شہادت دیتا ہے]۔ اس میں مذکور ہے کہ آپ نے پوری جماعت [چالیس آدمیوں] کو یہ پیش کش کی تھی کہ جو کوئی میری اس دعوت کو قبول کرے گا اور اس کی دعوت و تبلیغ میں میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی اور میرا وزیر، میرا وصی اور میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا۔ [فرض کیجیے کہ اگر وہ سب آدمی اس دعوت کو قبول کر لیتے تو ان میں سے خلیفہ کون قرار پاتا؟]

یہ روایت نبی کریم ﷺ پر محض ایک جھوٹ بانڈھا گیا ہے۔ ایسی روایات کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اور نہ ہی صرف کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے اور مددگار بننے سے کوئی خلیفہ بننے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ

تمام وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے اس کلمہ کا اقرار کیا اور پھر اس کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر قربانیاں دیں۔ اور اس کی خاطر اپنی جانوں اور اموال کا نذرانہ پیش کیا۔ اپنا گھربار چھوڑا؛ اپنے سگے بھائیوں [اور رشتہ داروں] سے دشمنی مول لی؛ اور جدائی و ہجر کے صدموں پر صبر کیا۔ غلبہ و عزت کے بعد اس کلمہ کی خاطر ذلت برداشت کی۔ مالدار ہونے کے باوجود تنگ دستی اور غربت کو برداشت کیا۔ وسعتوں کے بعد تنگی و پریشانی کو قبول کیا۔ اس بارے میں ان حضرات کرام کے واقعات بڑے ہی مشہور و معروف ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان میں سے کوئی آپ کا خلیفہ بننے کا وعیدار نہ ہوا۔

نیز یہ بھی ہے کہ فرض کیجیے: اگر وہ سب آدمی یا ان کی ایک بڑی اکثریت اس دعوت کو قبول کر لیتے تو ان میں سے خلیفہ کون قرار پاتا؟ کیا بغیر کسی سبب [و موجب] کے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کیا جاسکتا تھا؟ یا پھر ان تمام کو ایک ہی وقت میں خلفاء مقرر کر دیا جاتا؟ اس لیے کہ وصیت و خلافت اور بھائی چارگی اور مدد تو ایک انتہائی آسان کام کے ساتھ مشروط کی گئی ہے یعنی شہادتین کا اقرار کرنا؛ اور اس کلمہ کی بنیاد پر نصرت و تعاون کرنا۔

کوئی بھی مؤمن ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ پر: اس کے رسول پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ مگر اس کا اس کلمہ طیبہ میں وافر حصہ موجود ہوتا ہے؛ اور جس کے لیے کلمہ طیبہ میں کوئی حصہ نہیں وہ منافق ہے۔ [جب معاملہ ایسے ہی ہے] تو پھر اس قسم کے کلام کو نبی کریم ﷺ کی طرف کیوں کر منسوب کیا جاسکتا ہے؟

ہفتم: حضرت حمزہؓ: عبیدہ بن حارث اور جعفر رضی اللہ عنہما نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح اسلام قبول کیا تھا؛ انہوں نے شہادتین کا اقرار کیا اور اس کلمہ طیبہ کی نشر و اشاعت میں معاون و مددگار بنے۔ ان کا شمار بھی ان سابقین اولین میں ہوتا ہے جو شروع شروع میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ بلکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس وقت اسلام لائے جب اہل ایمان کی تعداد چالیس کو بھی نہیں پہنچ پائی تھی۔ اس وقت نبی کریم ﷺ دار ارقم بن ارقم میں بیٹھا کرتے تھے۔ اور وہیں پر اپنے صحابہ کرام کے ساتھ جمع ہوتے۔ نبی کریم ﷺ اور سارے بنو عبدالمطلب ایک ہی گھر میں جمع نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ابولہب نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ دشمنی کیا کرتا تھا۔ جب شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کا محاصرہ کیا گیا تو ابولہب ان گلوں کے ساتھ اس گھاٹی میں داخل نہیں ہوا تھا۔

ہشتم: یہ کہ بخاری و مسلم میں اس آیت کی شان نزول کچھ اور بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

”جب آیت کریمہ ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے قریش کو جمع کر کے ان سے اجتماعی اور انفرادی طور پر بات چیت کی۔ آپ نے فرمایا:

”اے بنی کعب بن لوئی! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو مرہ بن کعب! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنی عبد شمس! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو عبد مناف! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو ہاشم! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنی عبدالمطلب! اپنی جان دوزخ سے بچالو۔

اے فاطمہ بنت محمد! اپنی جان دوزخ سے بچالے۔ میں تم سے عذاب الہی کو روک نہیں سکوں گا تاہم قرابت داری کا حق ادا کرتا رہوں گا۔^①

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب زیر تبصرہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا:

”اے گروہ قریش! اپنے آپ کو عذاب الہی سے بچالو میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اے میری پھوپھی صفیہ! میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اور اے میری بیٹی فاطمہ! تم میرا مال جتنا چاہو لے لو، میں تمہیں عذاب الہی سے نہیں چھڑا سکوں گا۔“^②

امام مسلم نے یہ روایت قیسہ بن مخارق و زہیر و عائشہ سے نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔“^③

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دوسری حدیث یہ ہے کہ جب آیت کریمہ ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (المائدہ: ۶۷) ”اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، اسے آگے پہنچا دیجیے۔“ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے غدیر خم کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے مجمع عام میں اعلان فرمایا: ”اے لوگو! کیا میں تمہیں تمہاری جانوں کی نسبت زیادہ قریب نہیں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! ضرور آپ ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں! آپ نے فرمایا: ”جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے، اس سے دوستی رکھ اور جو علی سے عداوت رکھتا ہو اس سے عداوت رکھ، جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اسے تنہا چھوڑ دے تو بھی اسے تنہا چھوڑ دے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بڑی خوشی کی بات ہے آپ (حضرت علی) میرے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کے مولیٰ ہیں۔“

سابقہ تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر مولیٰ سے مراد تصرف میں اولویت [یعنی اولیت] رکھنے والا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا تھا: کیا میں تمہیں تمہاری جانوں کی نسبت زیادہ قریب نہیں؟“

① صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، (حدیث: ۴۷۷۱)، صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب فی قولہ تعالیٰ ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (حدیث: ۲۰۴)، واللفظ لہ ② البخاری، کتاب الوصایا، باب ہل یدخل النساء والولد فی الاقارب (ج: ۲۷۵۳)، مسلم، حوالہ سابق (ج: ۲۰۶)۔ ③ [مسلم، حوالہ سابق (ج: ۲۰۵)۔

جواب: ہم قبل ازیں اس کا جواب دے چکے ہیں؛ اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ روایت محض جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت کریمہ ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ حجۃ الوداع سے بہت عرصہ پہلے نازل ہوئی ہے۔ جب کہ غدیر خم کا واقعہ حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے ۱۸ ذوالحجہ کو پیش آیا۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ تقریباً اڑھائی ماہ کا عرصہ حیات رہے۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ سورت مائدہ کی آخر میں نازل ہونے والی آیت: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَدَيِّنْتُكُمْ عَلَىٰ نَفْسِكُمْ نِعْمَتِي﴾ ہے۔ یہ آیت نوزوالحجہ کو عرفات کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس وقت نبی کریم ﷺ میدان عرفات میں وقوف کئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ صحاح اور سنن میں یہ روایت ثابت ہے۔ اور تمام اہل علم مفسرین و محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔ غدیر خم کا واقعہ اس آیت کے نزول کے نو دن بعد مدینہ واپس جاتے ہوئے راستہ میں پیش آیا۔ تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت اس مذکورہ بالا آیت ﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ اس کے بعد نازل ہوئی؟ اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت [اس آیت ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾] سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ بلکہ یہ مدینہ طیبہ میں شروع شروع کے ایام میں نازل ہونے والی آیات میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ یہ سورت مائدہ کی آیت ہے جس میں شراب کے حرام ہونے کا بھی حکم ہے۔ اور شراب کی حرمت غزوہ احد کے بعد ہوئی ہے۔ ایسے ہی اس سورت میں اہل کتاب کے مابین حکم اور فیصلہ کرنے کا بیان ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ ”اگر وہ آپ کے پاس حاضر ہوں تو ان کے مابین فیصلہ کیجیے؛ یا پھر ان سے منہ موڑ لیجیے۔“ [المائدہ ۴۲]

یہ آیت یا تو اس وقت نازل ہوئی جب دو یہودیوں کو [زنا کے جرم میں] رجم کیا گیا تھا؛ یا پھر بنو قریظہ اور بنو نضیر میں خون کے جھگڑے کے بارے میں نازل ہوئی۔

یہودیوں کے رجم کا واقعہ مدینہ طیبہ کے شروع شروع کے ایام میں پیش آیا۔ ایسے ہی بنی نضیر اور بنو قریظہ کا واقعہ بھی شروع ایام مدینہ کا ہے۔ اس لیے کہ بنو نضیر کو غزوہ خندق سے قبل جلا وطن کر دیا گیا تھا؛ اور بنو قریظہ کو غزوہ خندق کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اور اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ غزوہ خندق کا واقعہ صلح حدیبیہ اور غزوہ خیبر سے پہلے پیش آیا تھا۔ یہ تمام تر واقعات فتح مکہ اور غزوہ حنین سے پہلے کے ہیں۔ اور غزوہ حنین اور فتح مکہ حجۃ الوداع سے پہلے ہے؛ اور حجۃ الوداع غدیر خم سے پہلے ہے۔ پس اب جو کوئی انسان کہے کہ سورت مائدہ کی کوئی آیت غدیر خم کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ایسا انسان باتفاق اہل علم جھوٹا اور دروغ گو ہے۔

ایسے ہی اس آیت کے سیاق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ①

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدہ ۶۷]

① صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب زیادة الایمان ونقصانه (حدیث: ۴۵)، صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی تفسیر آیات متفرقة، (حدیث: ۳۰۱۷)۔

”اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔“

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تبلیغ رسالت پر لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی ہے؛ تاکہ آپ دشمنوں کے خطرات سے پر امن ہو کر اپنا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی جاتی تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو محافظین ہٹا لیے گئے۔ [الترمذی ۴/۱۷۳]

یہ واقعہ یقینی طور پر فریضہ تبلیغ کے مکمل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تبلیغ کا فریضہ مکمل ہو گیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تھا:

”اے لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچا دیا؟ کیا میں نے رسالت کا حق ادا کر دیا؟ تو سب لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا: ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا: اے اللہ! اس پر گواہ رہنا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں؛ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ ان میں سے ایک چیز ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب۔ اے لوگو! تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا پس تم اس کا کیا جواب دو گے؟ لوگوں نے عرض کیا: ”ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا“ اور اس کی امانت ادا کر دی اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔“ پس رسول اللہ ﷺ اپنی انگشت شہادت کو کبھی آسمان کی طرف اٹھاتے اور پھر کبھی زمین کی طرف موڑ لیتے اور فرماتے: ”اے اللہ گواہ رہنا؛ اے اللہ گواہ رہنا۔“

یہ الفاظ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہیں۔ [مسلم ۲/۸۹۰]

نیز آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ”پس چاہیے کہ حاضرین غائبین تک یہ پیغام پہنچائیں۔ پس بہت سارے وہ لوگ جن تک پیغام پہنچایا جاتا ہے وہ سننے والے سے زیادہ یاد کرنے والے ہوتے ہیں۔“ [البخاری ۲/۱۷۶]

پس اس سے ظاہر ہوا کہ جس عصمت و حفاظت کی ضمانت آیت کریمہ میں ہے وہ اس دعوت و تبلیغ کے وقت موجود تھی۔ تو پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے بعد نازل ہوئی ہو۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے اس سے پہلے اپنی تبلیغ کو مکمل کر دیا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو کسی بشر کی جانب سے کسی طرح کا خوف و اندیشہ باقی نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے آپ کو عصمت و حفاظت کی ضرورت ہو۔ بلکہ فتح مکہ کے بعد اہل مکہ؛ اہل مدینہ اور ان کے ارد گرد کے لوگ اور [باقی گروہ] مسلمان ہو کر آپ کی اطاعت میں داخل ہو چکے تھے؛ ان میں کوئی ایک بھی کافر باقی نہیں بچا تھا۔ منافق انتہائی ذلت و رسوائی کا شکار اور اپنے نفاق کو چھپائے ہوئے تھے [انہیں کھل کر بات کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی]۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس میں جنگ و جدال اور مقابلہ کی ہمت باقی ہو۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک سے رسول اللہ ﷺ کو کسی قسم کا کوئی خوف و اندیشہ باقی تھا۔ تو اس حالت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ

[المائدة ۶۷]

”اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔“

اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ جو کچھ یوم غدیر خم کے موقع پر پیش آیا وہ ان امور میں سے نہیں تھا جن کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہو۔ جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تبلیغ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا تھا ان کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واپس مدینہ نہیں چلی۔ بلکہ اہل مکہ مکہ میں ہی رہ گئے؛ اہل طائف طائف واپس چلے گئے؛ اہل یمن یمن چلے گئے؛ قریب کے دیہاتوں کے لوگ اپنے دیہاتوں کو واپس چلے گئے۔ آپ کے ساتھ وہی لوگ چلے جن کا تعلق مدینہ سے تھا یا پھر مدینہ کے قرب و جوار کے دیہاتوں کے رہنے والے تھے۔

اگر واقعی ایسے ہی ہوتا کہ جو کچھ غدیر خم کے موقع پر پیش آیا؛ رسول اللہ ﷺ اس کی تبلیغ کے لیے مامور تھے؛ جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دعوت تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا؛ تو آپ اس اصول موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان امور کی تبلیغ بھی ضرور کرتے جیسے دوسرے امور کی تبلیغ کی تھی۔ جب آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر امامت یا اس سے متعلقہ امور کا سرے سے ذکر تک ہی نہیں کیا؛ اور نہ ہی کسی ایک عالم نے کسی صحیح یا ضعیف سند سے حجۃ الوداع کے موقع پر امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر کے بارے میں کچھ ذکر کیا؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے نقل کردہ خطبہ میں بھی امامت کا کہیں بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ وہ عام مجمع تھا جس میں آپ ﷺ کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ان امور میں سے نہیں تھا جن کی تبلیغ کا عام حکم ہو۔ بلکہ اس حوالے سے حدیث موات اور حدیث ثقلین کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں؛ اس لیے کہ ان میں کہیں بھی امامت کا ذکر نہیں ہے۔

وہ حدیث جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غدیر خم کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

”میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں؛ ایک ہے کتاب اللہ۔ پھر آپ نے کتاب اللہ کا ذکر کیا اور اس کی خوب ترغیب دلائی؛ پھر آپ نے فرمایا: ”(دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، (آپ نے یہ کلمات تین بار ارشاد فرمائے)۔“

یہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ کے تفردات میں سے ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت نہیں کیا۔ سنن ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں: ”یہ دونوں اس وقت تک جدا نہیں ہو سکتے جب یہ میرے پاس حوض پر وارد نہ ہو جائیں۔“^①

ان الفاظ کی زیادتی پر کئی ایک نقاد دحفاطہ محدثین نے طعن و تنقید کی ہے۔ اور انہوں نے یہ فرمایا ہے: ”یہ الفاظ حدیث کے نہیں ہیں۔“ لیکن جو لوگ اس روایت کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: اس سے مراد مجموعہ اہل بیت ہیں جو کہ تمام بنی ہاشم پر مشتمل ہیں؛ ان تمام لوگوں کا گمراہی پر جمع ہونا محال ہے۔ اہل سنت والجماعت میں سے ایک جماعت کا یہی قول

① مسلم ۴/ ۱۸۷۳، الترمذی ۵/ ۳۲۸۔

ہے۔ قاضی ابوالعلیٰ رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کا یہی جواب دیا ہے۔

مسلم کی روایت کردہ حدیث میں اگر یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد بھی فرمائے ہوں؛ تو بھی اس میں صرف کتاب اللہ کی اتباع کی وصیت ہے، تو یہ ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں وصیت میں اس سے پہلے جیمہ الوداع کے موقع پر گزر چکی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے اہل بیت کی اتباع کرنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن آپ نے یہ ضرور ارشاد فرمایا: ((اذکرکم اللہ فی اہل بیتی))۔

”میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔“

اس یاد دہانی کا تقاضا ہے کہ اس سے پہلے اہل بیت کے جو حقوق بیان کئے جا چکے ہیں، انہیں ادا کیا جائے، اور ان پر کسی بھی قسم کا ظلم کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ اس کا بیان غدیر خم سے پہلے ہو چکا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کیا غدیر خم کے موقع پر شریعت کا کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا، نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور نہ ہی کسی دوسرے کے حق میں۔ نہ ہی آپ کی امامت کے بارے میں اور نہ ہی کسی دوسری چیز کے بارے میں۔

رہ گئی حدیث موالات؛ تو امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل رحمہما نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من كنت مولاه فهذا علي مولاه۔“ ”جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔“^①

روایت کے یہ زیادہ الفاظ ”اللهم! اوال من والاہ و عا د من عا داہ۔“ بلاشبہ جھوٹ ہیں۔ اثرم نے سنن میں امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ عباس نے امام احمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ حسین الا شقر^② نے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”آپ کو مجھ سے اظہار بیزاری کرنے پر مجبور کیا جائے گا، مگر آپ مجھ سے بیزار نہ ہونا۔“

اور دوسری مذکورہ صدر روایت: ”اللهم! اوال من والاہ و عا د من عا داہ۔“ یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ نے ان حدیثوں کو تسلیم نہ کیا اور فرمایا کہ: ”ان دونوں روایات کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں۔“

ایسے ہی یہ روایت کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”أنت أولى بكل مؤمن و مؤمنة۔“ ”آپ ہر مؤمن مرد اور مؤمن عورت کے لیے اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔“ محض جھوٹی روایت ہے۔

رہ گئی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من كنت مولاه فهذا علي مولاه۔“ ”جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔“

یہ روایت صحاح میں سے نہیں۔ لیکن یہ ان روایات میں سے ہے جو بعض علماء نے نقل کی ہے؛ مگر اس کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے۔ امام بخاری اور امام ابراہیم الحاربی اور دوسرے اہل علم محدثین رحمہم سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس روایت پر تنقید کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ اس حدیث کو حسن کا

① سنن الترمذی ۲۹۷/۵ والفسند ۱/۴۶ اور دوسرے مقامات پر۔

② اس کا نام حسین بن حسن اشقر کوئی ہے اس کا ترجمہ میزان الاعتدال (۲۳۹/۱) پر مذکور ہے بخاری فرماتے ہیں: ”فی نظر“ ابوذر کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے، ابو حاتم کہتے ہیں یہ ضعیف راوی ہے جو زجانی فرماتے ہیں یہ صحابہ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ یہ ۲۰۸ھ میں فوت ہوا۔“

درجہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ ابو العباس بن عقدہ نے اس حدیث کی اسناد پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فضائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیثیں صحیح ہیں:

- ۱۔ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو کہ حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے بس یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔^①
- ۲۔ غزوہ خیبر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ کل میں ایک شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوگا اور جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں گے۔^②

اور یہ صفت جو کہ ہر مومن اور مسلمان کے لیے واجب اور باعث فضیلت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عہد ہے کہ:

- ۳۔ ”صرف مومن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کریں گے اور صرف منافق آپ سے بغض رکھیں گے۔“^③

آخر الذکر حدیث انصار مدینہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی انسان انصار سے بغض نہیں رکھے گا۔“^④

باقی رہی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”من كنت مولاه فهذا علي مولاه۔“ ”جس کا میں مولا ہوں

علی بھی اس کا مولا ہے۔“ تو یہ صحیح نہیں ہے: اس کی کوئی بھی سند ثقہ راویوں پر مشتمل نہیں۔ اس کے علاوہ روافض جو احادیث

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے بارے میں بیان کرتے ہیں وہ سب موضوع ہیں، جیسا کہ علم حدیث سے معمولی

واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ محدث ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ صدر قول میں حدیث ”أنت مني و أنا منك“ نیز ”حدیث

مباہلہ“ اور حدیث ”الکساء“ ذکر نہیں کیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ احادیث بھی ضعیف ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث صحیحہ سے وہ حدیثیں مرادی ہیں جن میں صرف علی رضی اللہ عنہ کی مدح

و ستائش کی گئی ہے اور کسی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب کہ ان روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا

ہے۔ آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ: ”تم شکل و صورت میں اور اخلاق میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو۔“

اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے آپ نے فرمایا تھا: ”أنت أخونا و مولانا۔“ ”آپ ہمارے بھائی اور ہمارے سردار ہیں۔“

جب کہ حدیث مباہلہ اور حدیث کساء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کا بھی ذکر ہے

اس لیے ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ بھی ہم ایک مرکب جواب دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: ”اگر یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”غدرِ خم کے مقام پر“

① البخاری، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ (ج: ۶، ۳۷۰)، مسلم، باب من فضائل علی بن ابی طالب (ج: ۴، ۲۴۰۴)۔

② صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث: ۳۷۰۱)، صحیح مسلم۔ حوالہ سابق (حدیث: ۲۴۰۹)۔

③ صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی رضی اللہ عنہ (حدیث: ۷۸)۔

④ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الانصار من الایمان (حدیث: ۱۷)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۷۴، ۷۵)۔

ارشاد فرمائے بھی تھے: تو ان پر کوئی کلام نہیں ہو سکتا: اس لیے کہ اس سے تو آپ کی مراد آپ کے بعد امامت و خلافت ہرگز نہ تھی۔ اس لیے کہ ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ ایسی اہم بات بڑے واضح انداز میں بیان کرنا چاہیے تھی نہ کہ مجمل و مبہم الفاظ میں۔ اس لیے کہ ان الفاظ میں کہیں بھی کوئی ایسی دلیل نہیں پائی جاتی جس سے مراد خلافت لی جاسکتی ہو۔ [مولیٰ کا لفظ عربی زبان میں ولی کا مترادف ہے]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ (المائدہ: ۵۵)

”بیشک تمہارا دوست اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَإِنْ تَظْهَرَا عَلَیْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِیلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِیرٌ﴾

”اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں۔“ [التحریم ۴]

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ سب مومنین کے دوست ہیں۔ اور یہ مومن آپ ﷺ کے دوست ہیں۔ جیسا کہ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے اور اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔ اور اہل ایمان آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

موالات (دوستی لگانا) معادات (دشمن رکھنا) کی ضد ہے۔ یہ جانیں سے استوار کی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوستی لگانے والے دونوں فریق مرتبہ و مقام کے لحاظ سے برابر ہوں۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک فریق عالی منصب ہو اور اس کا دوسرے سے دوستی لگانا اس کے فضل و احسان پر مبنی ہو۔ اس کے مقابلہ میں ایک فریق فروتر درجہ رکھتا ہو اور اس کا فریق اعلیٰ سے دوستی لگانا اطاعت و عبادت کا درجہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے محبت رکھتا ہے اور اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ موالات کا معنی دوستی لگانا ہے جو کہ دشمنی کرنے، دھوکہ بازی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کی ضد ہے۔ کفار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہیں رکھتے۔ بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّی وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِیَاءَ﴾ [الممتحنہ ۱]

”میرے اور اپنے دشمن کو اپنا دوست مت بناؤ۔“

اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر بدلہ سے نوازتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [البقرہ ۲۷۹]

”اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

بیشک اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے اور وہ انہیں کفر و گمراہی کے اندھیروں سے اسلام کی روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ بنا بریں اللہ و رسول ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مولیٰ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ سب مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں،

گویا مولیٰ کا لفظ اندریں صورت موالات سے ہوگا جو معادات کی ضد ہے۔ مومن جو اللہ و رسول کے ساتھ موالات قائم کرتے ہیں، وہ بھی معادات کی ضد ہے۔ دوستی لگانے کا یہ حکم سب مومنوں کے لیے ہے۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک بلند پایہ مومن ہیں اور وہ باقی مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ [اور اہل ایمان ان سے دوستی رکھتے ہیں]۔

اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باطنی ایمان کا اثبات و اقرار ہے۔ اور اس بات کی گواہی موجود ہے کہ آپ ظاہری و باطنی طور پر دوستی کے مستحق ہیں۔ بنا بریں اس حدیث میں آپ رضی اللہ عنہ کے دشمنان خوارج و نواصب کی تردید پائی جاتی ہے۔ حدیث میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی دوسرا مومنوں کا کوئی دوست ہی نہیں۔ اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سارے دوست ہیں۔ جن میں نیک و کار اہل ایمان شامل ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بدرجہ اولیٰ شامل ہیں۔ اور تمام اہل ایمان آپ سے محبت رکھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”قبیلہ مسلم و غفار و جہینہ و مزنیہ اور قریش و انصار یہ سب میرے دوست ہیں۔ اللہ و رسول کے سوا ان کا کوئی دوست نہیں۔“^① فی الجملہ ولی؛ مولیٰ اور والی کے مابین فرق پایا جاتا ہے۔ پس وہ ولایت جس کا معنی دوستی کا ہے [اور جس کا الٹ دشمنی ہوتی ہے] وہ ایک علیحدہ چیز ہوتی ہے؛ جب کہ وہ ولایت جس کا معنی حکومت و امارت ہے وہ ایک علیحدہ چیز ہے۔

اس حدیث میں وارد ولایت پہلے معنی یعنی دوستی کے مفہوم میں ہے؛ دوسرا معنی مراد نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ: ”من كنت واليه فعلي واليه“۔ ”جس کا میں والی ہوں علی بھی اس کا والی ہے۔“ رسول اللہ اکرم ﷺ کے فرمان مبارک: ”من كنت مولاه فهذا علي مولاه“۔ ”جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے“ سے یہی مراد ہے۔ اس مولیٰ سے والی مراد لینا باطل ہے۔ اس لیے کہ ولایت دونوں اطراف سے ثابت ہوتی ہے؛ جیسے کہ مؤمنین اللہ تعالیٰ کے ولی اور اس کے دوست ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور دوست ہے۔

رہا مسئلہ اپنے نفوس سے بڑھ کر عزیز ہونا تو یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے ثابت ہے۔ اور آپ ﷺ کا ہر اہل ایمان کے لیے اس کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب ہونا یہ نبوت کے خصائص میں سے ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد کسی کو بذریعہ نص خلیفہ متعین کیا تھا؛ تو اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ خلیفہ اہل ایمان کو ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہو۔ یہ بات کسی ایک نے بھی نہیں کہی۔ اور نہ ہی کسی ایک سے منقول ہے۔ اور اس کا معنی بھی یقینی طور پر باطل ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہونا آپ ﷺ کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی ثابت ہے۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کی بات ہے۔ آپ کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے جائز نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی حیات مبارک میں خلیفہ بنتے۔ تو اس وقت آپ ہر مومن کے لیے اس کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب و مقدم نہیں تھے۔ اور اگر مولیٰ

① صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب قریش (حدیث: ۳۵۰۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل غفار و اسلم.....“ (حدیث: ۲۵۲۰)۔

کے لفظ سے مراد خلافت لی جائے تو اس وقت آپ کسی ایک مومن پر بھی خلیفہ نہیں تھے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ان الفاظ سے خلافت مراد نہیں ہے۔ اپنی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہونا ایسا وصف ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی ثابت ہے؛ جس کے لیے موت کے بعد تک کا کوئی انتظار نہیں کیا گیا۔ جب کہ خلافت کا معاملہ اس سے مختلف ہے؛ نبی کریم ﷺ کی وفات تک کوئی بھی خلیفہ نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا حدیث سے جو معنی شیعہ مراد لیتے ہیں وہ کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں اور موت کے بعد بھی قیامت تک کے لیے اہل ایمان کے لیے ان کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب و قریب ہیں۔ جب آپ کی حیات مبارک میں ہی کوئی انسان بعض امور پر نائب بنایا جائے یا تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی انسان بعض امور میں آپ کی حیات مبارک میں ہی خلیفہ یا نائب بن جائے اور اسے اجماع اور نص کی روشنی میں خلیفہ تسلیم کر لیا جائے۔ تو وہ اس خلافت کا [آپ کے بعد بھی] زیادہ حق دار ہوگا اور اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر مقدم ہوگا تو پھر کوئی دوسرا انسان اس کو چھوڑ کر اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہوگا۔ خصوصاً آپ کی حیات مبارک میں۔

رہ گیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کا ہر اہل ایمان کا ولی اور دوست ہونا؛ یہ ایسا وصف ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ یا دیگر صحابہ کرام کے لیے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں بھی ثابت ہے؛ اور وفات کے بعد بھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آج بھی ہر مومن کے دوست اور محبوب ہیں؛ جب کہ آج آپ کسی پر بھی والی یا حاکم نہیں ہیں۔ یہی حال باقی تمام اہل ایمان کا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں میں بھی اور موت کے بعد بھی اہل ایمان کے دوست ہیں۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری حدیث

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں تیسری حدیث یہ ہے:

”أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي۔“

”تم میرے لیے بلحاظ منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ؛ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ مرتبہ عطا کیا تھا کہ وہ تمام مراتب میں بغیر کسی استثنیٰ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے۔ اور اگر ان کے بعد زندہ رہتے تو ان کے خلیفہ ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سے نقص لازم آتا ہے۔ اور نیز اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں اور آپ کی غیوبت کے مختصر بے عرصہ میں آپ کے قائم مقام رہ چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کی صورت میں جب آپ کی غیوبت طوالت اختیار کر لیتی تو آپ کا خلیفہ ہونا زیادہ قرین عقل و قیاس تھا۔“

[جواب]: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ مذکورہ بالا حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ غزوہ

تبوک کو جاتے وقت ارشاد فرمائے تھے۔^۱ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی آپ کسی غزوہ پر یا عمرہ پر یا حج پر مدینہ سے باہر جاتے؛ تو مدینہ میں کسی صحابی کو اپنا نائب مقرر کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے:

- ۱۔ غزوہ ذی امر پر جاتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔
- ۲۔ غزوہ بنی قیقاع میں حضرت بشیر بن عبدالمعز رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔
- ۳۔ جب قریش کے ساتھ غزوہ پیش آیا اور آپ مقام قرع تک پہنچے تو ابن ام مکتوم کو نائب مقرر فرمایا۔ جیسا کہ محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے۔

جملہ طور پر یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اس وقت تک آپ مدینہ سے باہر تشریف نہیں لے جایا کرتے تھے جب تک کسی کو اپنا نائب مقرر نہ فرمادیتے۔ مسلمان مؤرخین نے ان حضرات کے نام ذکر کئے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے نائب مقرر کیا تھا۔ مدینہ حبیبہ سے آپ ﷺ آٹے دہاد غرہ کا سڑکا یک ایک باد غرہ حدیبیہ اور دہاد سری باد غرہ حقیقہ اور حہادہ الوداع کا سفر اس کے علاوہ تقریباً بیس سے زیادہ مغازی کے سفر۔ ان میں سے ہر ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے کسی نہ کسی کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اس وقت مدینہ میں بہت سارے لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن پر آپ کسی کو اپنا نائب مقرر فرماتے۔ لیکن غزوہ تبوک کو جاتے وقت کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ آپ ﷺ کا آخری غزوہ ہے۔ اور کسی اور غزوہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کی اتنی بڑی جمعیت آپ کے ساتھ شریک سفر نہیں ہوئی جتنی بڑی جمعیت اس غزوہ میں تھی۔ اس غزوہ میں صرف بچے اور خواتین ہی پیچھے رہ گئے تھے؛ یا پھر وہ لوگ تھے جو اپنی معذوری کی وجہ سے غزوہ پر نہیں جاسکے۔ یا پھر منافق۔ تین صحابہ بھی آپ کے ہمراہ نہ جاسکے تھے؛ جن کی توبہ قبول کر لی گئی۔ [فتح مکہ اور حجتہ الوداع کو جاتے وقت بھی آپ نے اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ مگر غزوہ تبوک کے موقع پر مدینہ میں مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے یہ استخلاف اپنی نوعیت میں نرالا تھا؛ اور باقی استخلاف کی طرح نہیں تھا جیسا کہ ہر بار مدینہ سے باہر جاتے ہوئے مقرر فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ استخلاف بقیہ استخلافات کی نسبت کمزور تھا۔ اس لیے کہ مدینہ میں ہر بار ایسے لوگ موجود ہوا کرتے تھے جو کہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت بہت افضل ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اس سے قبل کا استخلاف ان لوگوں سے افضل لوگوں پر ہوا کرتا تھا جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی طرف روتے ہوئے آئے اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منافقین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن و تنقید کرتے ہوئے یہ خراڑائی تھی کہ: ”محمد ﷺ علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں اس لیے ان کو جہاد میں ہمراہ نہیں لے جا رہے۔“

نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ میں نے آپ کو امین سمجھ کر اپنا نائب مقرر کیا ہے؛ بغض کی بنا پر نہیں۔ اس لیے کہ نائب بنائے جانے سے شان میں کوئی کمی نہیں آتی؛ اور نہ ہی اس میں کسی کے لیے کوئی حسد و بغض ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا رہے ہیں تو پھر یہ فعل نقص کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة تبوک (حدیث: ۴۴۱۶)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۴۰۴)۔

عدم موجودگی میں حضرت ہارون کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اسی طرح میں بھی تمہیں نائب مقرر کر رہا ہوں۔ اس طرح نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا۔ آپ نے یہ تسلی دی کہ کسی کو نائب بنایا جانا اس کے امین اور صاحب مرتبت ہونے کی دلیل ہے۔ اس میں کسی کی اہانت یا خیانت نہیں۔ اس لیے کہ نائب نبی کریم ﷺ کی عدم موجودگی میں تمام امور پر امین و نگہبان ہوگا؛ چونکہ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں نکل چکے تھے۔

بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیتے ہیں جن سے زیادہ مدد حاصل ہو سکتی ہو۔ یا پھر جن کی ہمراہی کا فائدہ زیادہ ہو۔ جن کے مشورہ کی ضرورت زیادہ ہو اور جن کی زبان اور ہاتھ اور نگوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہو۔

پس پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کسی بڑی سیاست کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے ان ساری باتوں کی چنداں حاجت نہیں تھی۔ اس وجہ سے بعض لوگوں نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نقص اور کمی شام کیا؛ اور آپ کو آپ کی منزلت سے کم جانا۔ اس لیے کہ ان اہم ترین موقع پر رسول اللہ ﷺ آپ کو اپنے ساتھ لیکر نہیں گئے جن میں سعی و اجتہاد کی بہت زیادہ ضرورت تھی؛ بلکہ آپ کو ان مواقع پر چھوڑ دیا جن پر کسی بڑی سعی و اجتہاد کی ضرورت نہ تھی۔

نبی کریم ﷺ نے واضح فرمادیا کہ آپ کو بطور نائب بنا کر پیچھے چھوڑنے سے آپ کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس لیے کہ اگر ایسا کرنا نقص یا عیب ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استخلاف حضرت ہارون علیہ السلام کی خلافت و نیابت کی مانند نہ تھا۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مناجات باری تعالیٰ کے لیے کوہ طور پر گئے تھے تو آپ اکیلے گئے تھے اور اپنی عدم موجودگی میں ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اور پورا لشکر حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس وقت مدینہ کا نائب مقرر کیا گیا تھا جب کہ تمام اہل اسلام کا لشکر نبی کریم ﷺ کی رفاقت میں جنگ کے لیے جا رہے تھے۔ اور مدینہ میں سوائے خواتین، بچوں اور معذوروں کے علاوہ صرف وہ لوگ باقی رہ گئے تھے جو نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔

کسی کا یہ کہنا کہ: ”یہ چیز فلاں چیز کی منزلت پر ہے۔“ یا یہ کہنا کہ: ”فلاں چیز فلاں دوسری چیز کی مانند ہے۔“ تو کسی چیز کی دوسری چیز سے تشبیہ سیاق کی دلالت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں ہر لحاظ سے اور ہر چیز میں مساوی ہیں۔ [باقی رہا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے الفاظ تھے: ”أَنْتَ مِمْسِي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى“ تو یاد رہے کہ ایسے الفاظ میں تشبیہ ہر لحاظ سے مقصود نہیں ہوتی اور یہ مطلب نہیں؛ کہ ”مُخْبِرٌ اور مُخْبِرٌ یہ دونوں بالکل مساوی ہیں۔“]

[حدیث استخلاف کی توضیح:]

کیا آپ دیکھتے نہیں ہے کہ صحیحین میں بدر کے قیدیوں والی روایت موجود ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو آپ فدیہ لیکر رہا کر دینے کا مشورہ دیا۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو آپ نے ان سب کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا۔ اس روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ابھی تمہیں

تمہارے دونوں ساتھیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔

اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آپ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [ابراہیم ۳۶]

”پس جو کوئی میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے اور جو کوئی میری نافرمانی کرے بیشک تو بخشنے والا مہربان ہے۔“

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿إِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [الباقۃ ۱۸۸]

”اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو معاف فرما دے تو تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔“

اور اے عمر رضی اللہ عنہ! آپ کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ ذَيَّارًا﴾ [نوح ۲۶]

”کہا اے میرے پالنے والے! تو روئے زمین پر کسی کا فرکورہنے سہنے والا نہ چھوڑ۔“^①

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ [یونس]

”اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے سو یہ ایمان نہ لانے پائیں

یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔“

نبی کریم ﷺ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فرمانا کہ آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فرمانا کہ آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال۔ یہ بات اس سے بہت بڑھ کر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ میری نسبت سے آپ کی وہی منزلت ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے حضرت ہارون علیہ السلام کی منزلت۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام یقیناً حضرت ہارون علیہ السلام کی نسبت بڑے مقام و مرتبہ والے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ اس حدیث میں ان دونوں صحابہ کرام حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ان چار جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ تشبیہ و تنقیہ دی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تشبیہ ہر لحاظ سے ہے۔ بلکہ سیاق کلام کی دلالت کے اعتبار سے مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لطافت طبع اور نرم مزاجی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے طبعی تشدد میں حضرت نوح علیہ السلام کی مانند تھے۔

ایسے ہی یہاں پر [حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ صرف اس اعتبار سے دی گئی ہے] جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ہارون موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام قرار پائے تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی عدم موجودگی میں آپ کے نائب و خلیفہ تھے۔

① مسند احمد (۱/۳۸۳-۳۸۴)، مستدرک حاکم (۳/۲۱-۲۲)، و اسنادہ ضعیف۔ ابو عبیدہ کا اپنے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنا نہیں ہے۔

یہ استخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں ہے اور نہ ہی آپ کے دیگر استخلافات کی مانند ہے؛ چہ جائے کہ آپ کے بقیہ استخلافات سے افضل ہو۔ کئی بار غزوات میں آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی گنا زیادہ افضل و بڑھ کر تھے۔ ایسی صورت میں وہ لوگ جو دیگر مواقع پر خلیفہ بنائے گئے، ان کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقدیم یا افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسی نیابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا موجب ہو۔

آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر مدینہ طیبہ میں مختلف لوگوں کو اپنا نائب بنایا۔ آپ کے مقرر کردہ نائبین اس طرح تھے جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے؛ یہ اسی استخلاف کی جنس سے ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا تھا۔ بلکہ باقی استخلافات اس لیے اس سے افضل تھے کہ عام استخلافات میں غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت زیادہ اور افضل لوگ ہوا کرتے تھے۔ اور اس وقت میں مدینہ میں کسی کو نائب بنانے کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اس لیے کہ مدینہ پر دشمن کی یورش [حملہ] کا خوف ہوا کرتا تھا۔

تبوک والے سال تمام حجاز کے عرب مسلمان ہو چکے تھے۔ مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا؛ اسلام کو غلبہ اور قوت حاصل ہو چکی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ ملک شام کے اہل کتاب کے ساتھ جہاد کیا جائے۔ اس وقت مدینہ میں دشمن سے مقابلہ کرنے والے مجاہدین کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کسی ایک مجاہد کو بھی باقی نہ چھوڑا تھا۔ جیسا کہ باقی تمام غزوات آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ کچھ مجاہدین کو مدینہ میں باقی چھوڑا کرتے تھے؛ اس بار آپ نے تمام مجاہدین کو اپنے ساتھ لے لیا تھا کسی ایک کو بھی مدینہ میں باقی نہیں چھوڑا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص بالذکر لقب کے مفہوم سے ظاہر ہو رہی ہے۔ لقب دو قسم کا ہوتا ہے:

۱۔ وہ لقب جو جنس کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ وہ لقب جو علم کا قائم مقام ہوتا ہے۔ مثلاً زید؛ وأنت۔ یہ مفہوم نہایت کمزور ہے۔

اسی لیے تمام فقہاء اور علمائے اصول کا نظریہ یہ ہے کہ اس روایت سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر جب یہ کہا جائے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تو اس سے باقی رسولوں کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر سیاق کلام میں کوئی ایسی چیز ہو جس کا تقاضا تخصیص کا ہو تو پھر صحیح مذہب کے مطابق ایسی روایت سے استدلال کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿فَقَهَّمْنَهَا سُلَيْمٰنَ﴾ [انبیاء ۷۹]

”اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کو خوب سمجھ عطا کی۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾ [مطففين ۱۵]

”ہرگز نہیں، بیشک اس دن وہ اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔“

ہاں جب تخصیص کی متخصی سبب کی بنیاد پر ہو تو اتفاق الناس ایسی روایت سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔ یہ روایت بھی اسی ضمن کی روایات میں سے ایک ہے۔ اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تھے کہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جتنے لوگوں کو خلیفہ یا نائب بنایا گیا تھا؛ ان میں سے کسی ایک کے بھی ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ نائب بنائے جانے سے ان کی شان میں کوئی کمی واقع ہوگی؛ تو [نہ ہی انہوں نے کوئی اعتراض کیا] اور [نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ دوسرے لوگوں کو اس طرح کی کوئی بات بتائیں۔ پس جب یہاں پر بطور خاص آپ کا تذکرہ کرنے کی وجہ وہ سبب ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جملہ بطور خاص آپ کے لیے ذکر کیا جائے۔ پس اس حدیث میں کہیں بھی اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ کوئی دوسرا آپ کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام کی منزلت پر نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر؛ جسے شراب پینے کے جرم میں مارا جا رہا تھا؛ لعنت کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

”اس پر لعنت مت کرو؛ اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔“ [تخریج گزر چکی ہے]

یہ حدیث اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ آپ نے اس کا تذکرہ بوجہ ضرورت کے کیا تاکہ اس پر لعنت کرنے سے روکا جائے۔

ایسے ہی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے رہنے دو! اس لیے کہ اس نے غزوہ بدر میں شرکت کی ہے۔“ [تخریج گزر چکی ہے۔]

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا بدر میں شریک نہیں ہوا؛ بلکہ اس کا تذکرہ اس وجہ سے کیا کہ اس کی غلطی سے درگزر کر لیا جائے۔

ایسے جب رسول اللہ ﷺ نے عشرہ مبشرہ کا نام لیکر انہیں جنت کی ضمانت دی؛ تو اس سے کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا جنت میں داخل نہیں ہوگا؛ پس اس موقع کا تقاضا یہی تھا اس لیے آپ نے خصوصی تذکرہ فرمایا۔

ایسے ہی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کے لیے فرمایا:

”اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت کر؛ اور جو کوئی ان دونوں سے محبت کرے“

اس سے بھی محبت کر۔“ [تخریج گزر چکی ہے]

اس سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کرتے تھے؛ بلکہ دوسرے لوگوں میں ایسے لوگ بھی تھے؛ جن سے رسول اللہ ﷺ ان دونوں سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔

ایسے ہی جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

”جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔“ [تخریج گزر چکی ہے]

تو اس حدیث کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ باقی کبھی لوگ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اسی طرح جب آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی؛ تو یہ اس بات میں مانع نہیں ہے کہ آپ کی امت میں کوئی دوسرا بھی ان دونوں انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت رکھتا ہو۔ اور ایسے ہی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی تو اس سے کہیں بھی یہ ممانعت ثابت نہیں ہوتی کہ امت میں کوئی دوسرا ان دونوں انبیاء کرام علیہم السلام کے مشابہ نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ کی امت میں سے جو لوگ انبیاء کرام سے مشابہت رکھتے ہیں ان میں سے یہ دو حضرات افضل ترین لوگ ہیں؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اختصاص میں کمال اصل تشبیہ میں مشارکت سے مانع نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی جب آپ ﷺ نے حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ”آپ صاحب لیں کی طرح ہیں۔“ ایسے ہی آپ نے قبیلہ اشعری کے بارے میں فرمایا: ”وہ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔“ یہ صرف اس قبیلہ کے ساتھ ہی خاص نہیں؛ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔“

اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”آپ ہمارے بھائی اور ہمارے مولا [دوست] ہیں۔“ یہ بات صرف حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص نہیں تھی؛ بلکہ آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایسے ہی فرمایا تھا۔

جملہ طور پر اس باب میں امثال اور تشبیہات بہت زیادہ ہیں۔ ان سے کہیں بھی ہر لحاظ سے تداخل کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا اعتبار سیاق کلام کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا تقاضا مشبہ کے لیے تشبیہ میں تخصیص کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں کسی دوسرے کی شراکت بھی ممکن ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرة ۲۶۱]

”جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سے سو دانے ہوں۔“

نیز فرمان الہی ہے: ﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ﴾ [إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ] ﴿يَسْ ۱۳﴾
”اور آپ ان کے سامنے ایک مثال (یعنی ایک) بستی والوں کی مثال (اس وقت کا) بیان کیجئے [جبکہ اس بستی میں (کئی) رسول آئے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ﴾ [آل عمران]
”یہ کفار جو خرچ کریں اس کی مثال یہ ہے ایک تند ہوا چلی جس میں پالا تھا۔“
یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن میں بیالیس مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

اب کہنے والے کا یہ دعویٰ کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبوت کے سوا باقی ہر بات میں ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ محض باطل کلام ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی ”أَمَّا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى“ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ اور آپ کا دل خوش کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ان کو پیچھے چھوڑ کر جانے سے ان کے درجہ میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ تو آپ کے لیے آپ ﷺ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

آپ کا یہ فرمان کہ: ”بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى“ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام جیسا مرتبہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ بالکل وہی مرتبہ جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا وہ کسی بھی دوسرے کے لیے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کے لیے اس کے مشابہ مقام و مرتبہ ہو سکتا ہے۔ یہ قول ایسے ہی جیسے مثال کے بیان میں ہوتا ہے اور جیسا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا: ”اس کی مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔“ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا: ”اس کی مثال حضرت موسیٰ اور نوح علیہ السلام کی ہے۔“

اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ آپ نے یہ جملے تبوک والے سال ارشاد فرمائے۔ پھر تبوک سے واپسی پر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر جع بنا کر بھیجا؛ اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے پیچھے بھیجا؛ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: امیر بن کر آئے ہو یا مامور؟ تو انہوں نے کہا: نہیں بلکہ مامور بن کر آیا ہوں۔“ اس وقت تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی آپ پر امیر تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ بالکل ایسے ہی تھے جیسے کوئی مامور اپنے امیر کیساتھ ہوتا ہے۔ [اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل حضرت ہارون علیہ السلام کے مشابہ ہوتے تو ۹ھ میں [سفر حج میں] نبی کریم رضی اللہ عنہ ان پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر نہ کرتے]۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھتے اور ان کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے مشاعرہ مقدسہ میں لوگوں میں اعلان کرتے جاتے:

”لوگو! سن لو۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کریگا اور نہ ہی کوئی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے گا۔“^۱

سرور کائنات رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے کفار کے عہد واپس کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ عربوں کے ہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے اور توڑنے کے لیے معاہدہ کرنے والا سردار اور بڑا خود جایا کرتا تھا یا اپنے کنبہ کا کوئی آدمی بھیجا کرتا تھا۔ تو پھر ایسے نہیں ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے اہل بیت کے علاوہ کسی اور کی زبانی وہ اس عہد کی واپسی کو قبول کر لیتے۔

اس کی وضاحت اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ اگر آپ رضی اللہ عنہ کا خیال یہ ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ کے بعد خلیفہ ہوں تو پھر یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا کہ اس میں دو افراد سرگوشی کر لیتے۔ اور نہ ہی پھر اس میں تاخیر کی جاتی حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ روتے ہوئے اور شکایت کرتے ہوئے رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ بلکہ پھر یہ ایسا حکم تھا جس کا بیان کرنا اور ایسے کھلے الفاظ میں لوگوں تک پہنچانا واجب تھا جس سے مقصود حاصل ہو سکے۔

پھر رافضیوں کی جہالت کی انتہا یہ ہے کہ ان کے کلام میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث بغیر کسی شک و شبہ کے دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کلمات صرف غزوہ تبوک کے موقع پر کہے تھے۔ [اگر آپ نے اس سے پہلے بھی کبھی یہ ارشاد فرمایا ہوتا] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوتا تو آپ کا دل بالکل مطمئن ہوتا کہ آپ رسول اللہ رضی اللہ عنہ

۱ صحیح بخاری ج ۳ ص ۳۶۲۔ پوری روایت یوں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے امیر حج ہونے کے دن بزمہ موزنین بھیجا تا کہ ہم منیٰ میں یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کرے، حمید بن عبد الرحمن (جو ابو ہریرہ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں) کہتے ہیں: رسول اللہ رضی اللہ عنہ نے ابوبکر کے پیچھے علی کو بھیجا تھا اور ان کو حکم دیا کہ وہ سورت رات کا اعلان کریں، علی نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ میں لوگوں میں اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہو کر) کعبہ کا طواف کرے۔

کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ہارون علیہ السلام کی منزلت پر ہیں۔ تو پھر آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس روتے ہوئے حاضر نہ ہوتے۔ اور آپ یہ بالکل نہ فرماتے کہ: آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنا رہے ہیں؟ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مطلق طور پر تو کبھی بھی آپ پر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ بناتے۔ ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ آپ مدینہ میں موجود ہوتے مگر رسول اللہ ﷺ کسی دوسرے کو یہاں پر خلیفہ مقرر کرتے۔ جیسا کہ خیبر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں موجود تھے؛ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ اور یہاں پر امیر کوئی دوسرا صحابی تھا۔ پھر آپ خیبر میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملے؛ اور جب آپ تشریف لے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جھنڈا عطا کیا؛ اس سے پہلے یہ جھنڈا کسی اور کے سپرد تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔“ [تخریج گزیر بھی ہے۔]

❦ شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی موجودگی میں اور بہت تھوڑے وقت کی غیبت میں آپ کے خلیفہ تھے۔ لہذا علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد اور لمبی مدت کی غیبت میں بھی آپ کے قائم مقام ہونے کے زیادہ حق دار ہیں۔“

جواب: نبی کریم ﷺ نے ان کی موجودگی کے باوجود اپنی غیبت میں کئی بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے کئی لوگوں کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ ان کی نیابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیابت سے کہیں بڑھ کر اور عظیم الشان تھی۔ اور جن لوگوں پر انہیں نائب بنایا گیا وہ لوگ بھی ان سے افضل تھے جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ غزوہ تبوک کے بعد حجة الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو مدینہ میں نائب بنایا گیا تھا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنانے سے آپ خلافت کے ان لوگوں سے زیادہ حقدار نہیں بن جاتے جنہیں کئی دوسرے مواقع پر مدینہ طیبہ میں نائب بنایا گیا تھا۔ مدینہ میں آپ کی سب سے بڑی اور آخری نیابت حجة الوداع کے موقع پر تھی۔ اس وقت جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے۔ اور حج میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔ لیکن حجة الوداع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نائب تو نہیں تھے کوئی دوسرے صحابی تھے۔

اگر نائب کا خلیفہ بنا ہی اصل ہے؛ تو پھر جس انسان کو حجة الوداع کے آخری موقع پر نائب بنایا گیا تھا؛ اسے خلیفہ بنا چاہیے۔ وہ اپنے سے پہلے تائبین کی نسبت خلیفہ بننے کا زیادہ حق دار ہے۔

خلاصہ کلام! مدینہ پر نائب بنایا جانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ افضلیت اور امامت پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ آپ کے علاوہ بھی کئی دوسرے لوگوں کو مدینہ میں نائب بنایا گیا۔ لیکن رافضیوں کی جہالت کی حد یہ ہے کہ وہ فضائل جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کے مابین مشترک ہیں انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خصائص شمار کرتے ہیں۔ اگرچہ کوئی دوسرا ان فضائل میں آپ سے زیادہ کامل ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ انہوں نے نصوص اور وقائع میں کیا ہے۔

عیسائیوں نے بھی تو ایسے ہی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے تھے؛ عیسائی انہیں صرف آپ کے ساتھ ہی خاص شمار کرنے لگے؛ حالانکہ ان معجزات میں دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام بھی شریک ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

کو جو معجزات عطا ہوئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات سے بڑھ کر تھے۔ اور پھر کوئی ایسا سبب بھی نہیں پایا جاتا جو ان معجزات کو ابراہیم و موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ بطور خاص واجب کرتا ہو۔ نہ ہی حلول اور نہ ہی اتحاد ایسی کوئی بھی چیز نہیں۔ بلکہ اگر یہ ساری چیزیں ممکن ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام [انبیاء کرام] میں حلول اور اتحاد ممکن ہے۔ اور اگر اس کی تفسیر کی ممکن بات سے کی جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول اور اس پر ایمان؛ اور پھر اس ایمان سے حاصل ہونے والے انوار اور دیگر امور۔ تو یہ مشترک قدر اور ممکن بات ہے۔

یہی معاملہ شیعہ کے ساتھ ہے۔ جو معاملات حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کے مابین مشترک اور ان سب کو شامل ہیں، انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسی پر عصمت، امامت اور افضلیت کو مرتب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں ممنوع و منتفی ہیں۔

جس انسان کو سیرت رسول اللہ ﷺ؛ احوال صحابہ رضی اللہ عنہم؛ معانی القرآن والحديث کی معرفت ہو؛ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ یہاں پر کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ کی امامت یا افضلیت کا وجوب ثابت ہوتا ہو۔ بلکہ یہ مشترک فضائل ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والا فائدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان و ولایت کا ثبوت ہے؛ اور ان ناصبی لوگوں پر رد ہے جو آپ کو گالی دیتے؛ فاسق کہتے؛ اور کافر قرار دیتے ہیں۔ اور آپ کی شان میں ایسے ہی نازیبا کلمات کہتے ہیں جو رافضی خلفاء ثلاثہ کی شان میں کہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے ثابت ہونے میں نواصب پر ویسے ہی رد ہے جیسے خلفاء ثلاثہ کے فضائل کے اثبات میں روافض پر رد ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر روافض اور خوارج دونوں ہی تنقید کرتے ہیں۔ جب کہ شیعان عثمان آپ کے امام برحق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر جرح کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی بدعت میں شیعان علی سے بہتر ہیں جو آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر جرح کرتے ہیں۔ جب کہ زید یہ جو کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دوستی رکھتے ہیں، اس معاملہ میں اضطراب کا شکار ہیں۔

پس اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا جانشینی کی ایک قسم ہے۔ ہر حکمران کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ انسان جو زندگی میں امت کے بعض امور پر جانشین بننے کے قابل ہو؛ وہ موت کے بعد بھی خلیفہ بننے کی صلاحیت کا مالک ہو۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا؛ مگر یہ لوگ آپ کے بعد خلیفہ بننے کے قابل نہیں تھے جیسے بشیر بن عبدالمعز وغیرہ۔

نیز اس لیے بھی کہ آپ کی زندگی میں لوگوں کے حقوق کی ادائیگی آپ سے مطلوب ہے۔ جیسے کہ یہ چیز حکمرانوں سے مطلوب ہوتی ہے۔ جب کہ موت کے بعد آپ سے کوئی بھی ایسی چیز مطلوب نہیں۔ اس لیے کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا فریضہ پورا کر دیا؛ اور امانت کا حق ادا کر دیا؛ امت کی خیر خواہی کی؛ اور اس وقت تک اللہ کی بندگی کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کو اللہ کا پیغام آچانچا۔ آپ کی زندگی دشمنوں سے جہاد کرنا؛ مال فتنے تقسیم کرنا؛ شرعی حدود کا قیام؛ عمال کا تعین آپ پر واجب تھا؛ اور ان کے علاوہ دوسرے امور جو کہ آپ کے بعد کے حکمرانوں پر واجب تھے۔ مگر موت کے بعد تو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی آپ

پر واجب نہیں تھی۔

پس اپنی زندگی میں نائب مقرر ایسا نہیں ہے جیسے موت کے بعد کے لیے نائب مقرر کرنا ہے۔ اس لیے کہ انسان جب کسی کو اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر بھلائی کا حکم دینے کے لیے اپنا نائب مقرر کرتا ہے؛ تو اس نائب کی حیثیت محض ایک ایجنٹ [وکیل] کی ہوتی ہے؛ یہ صرف وہی کچھ کریگا موکل نے جس کا حکم دیا ہے۔ اور اگر کوئی اپنی مرنے کے بعد اپنی اولاد پر کسی کو اپنا نائب مقرر کریگا تو اس کی حیثیت مستقل نائب [دولی] کی ہوگی۔ یہ ان لوگوں کی مصلحت کے مطابق ہی ایسے کام کرے گا جن کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ اس کی حیثیت محض میت کے ایجنٹ کی نہیں ہوگی۔

یہی حال حکمرانوں کا بھی ہے۔ جب ان میں سے کوئی ایک کسی کو اپنا نائب مقرر کریگا تو وہ نائب بعض متعین امور میں ویسے ہی کریگا جیسے اس کو حکم ملے گا۔ ہاں اگر اسے موت کے بعد نائب مقرر کیا جائے تو وہ اپنی ولایت میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہی تصرف کرے گا۔ اس تصرف کی نسبت اسی کی طرف ہوگی میت کی طرف نہیں ہوگی۔ بخلاف اس کے کہ اگر اس کی زندگی میں اس کے حکم سے کوئی کام کرے تو اس کی نسبت نائب بنانے والے پر ہوگی۔ تو دونوں باتوں کے درمیان کتنا بڑا فرق موجود ہے۔

کسی بھی عقلمند نے یہ بات نہیں کہی کہ اگر کسی شخص نے بعض امور پر کسی کو اپنا نائب مقرر کیا؛ اور یہ نیابت مکمل بھی ہوگئی تو پھر بھی وہ انسان اس اصل خلیفہ کی موت کے بعد اس کا جانشین قرار پائے گا۔ لیکن کیا کریں کہ رافضی معقول و منقول میں ہر لحاظ سے لوگوں میں سے سب سے بڑے اور پرلے درجے کے جاہل ہیں۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی حدیث:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی دلیل یہ حدیث ہے کہ: ”نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، حالانکہ آپ کی غیبت کا زمانہ نہایت محدود تھا۔ لہذا واجب ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی دوسرا بالا جماع اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ نیز اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنی نیابت سے معزول نہیں کیا تھا۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے بعد بھی اس منصب پر فائز ہوں گے۔ جب مدینہ میں آپ کے نائب ہوں گے تو دیگر بلاد و امصار میں بھی یقیناً بالا جماع آپ کے خلیفہ ٹھہریں گے۔“

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ: ”شیعہ کے دیگر دلائل کی طرح یہ دلیل بھی نہایت بودی اور تار عنکبوت کی طرح بے

جان ہے، اور اس کے متعدد جوابات ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے ایک قول کے مطابق نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا؛ جیسا کہ اس سے پہلے تفصیلی بیان گزر چکا۔ اور اگر رافضی کہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ پھر فرقہ راوندیہ کا قول بھی صحیح ہونا چاہیے۔ جو کہتے ہیں کہ: آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ جو شخص بھی کما حقہ نقلی دلائل سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ اگر احادیث صحیحہ سے آپ کی

موت کے بعد کسی کا استخلاف ثابت ہوتا ہے تو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استخلاف ہے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا۔ بلکہ آپ نے اپنے بعد کسی کو بھی دو ٹوک الفاظ میں اپنا جانشین نہیں مقرر کیا تھا۔ پس اس صورت میں کہا جائے گا کہ: اگر آپ نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ [تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام کا تقرر آپ نے امت کی رائے عامہ پر چھوڑ دیا تھا کہ جس کو چاہیں مقرر کر لیں]۔

اور اگر مان لیا جائے کہ آپ رضی اللہ عنہ پر اپنا جانشین مقرر کرنا واجب تھا تو پھر آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اس لیے کہ تمام اہل علم محدثین اور اصحاب السیر کا اتفاق ہے کہ صحیح اور ثابت احادیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے جانشین یا خلیفہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ ان میں سے جو بھی احادیث نیابت کے تقرر پر دلالت کرتی ہیں تو ان سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ہی ثابت ہوتی ہے۔ ثبوت و صحت حدیث کا علم رکھنے والا ہر انسان یہ بات جانتا ہے۔

دوسرا جواب: آپ لوگ تو قیاس کو تسلیم نہیں کرتے؛ جب کہ یہاں پر قیاس سے دلیل لے رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے مرنے کے بعد کی خلافت کو زندگی میں دوران غیبت میں خلافت پر قیاس کیا ہے۔ جب کہ ہم دو اقوال میں سے جب کسی ایک قول کو فرض کر لیتے ہیں؛ تو ہم کہتے ہیں: ”ان دونوں کے مابین فرق وہی ہے جس پر ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے عہد میں دوسرے استخلاف پر اور بعد از وفات شخص متعین کے انتخاب سے توقف میں آگاہ و تنبیہ کر چکے ہیں۔ نبی کریم رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں خود یا بذریعہ اپنے نائبین کے اس امت پر شاہد اور اس کی سیاست پر مامور تھے۔ [یعنی زندگی میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا تو یہ ایک قسم کی نیابت ہے اس کے لیے ہر امام کے عزم و قصد کا ہونا ضروری ہے] اور موت کے بعد آپ خلیفہ بنانے کے مکلف ہی نہیں رہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ (المائدة: ۱۱۷)

”اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔“

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا خلیفہ ان پر شاہد تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کو بھی اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ ایسے ہی نبی کریم رضی اللہ عنہ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں بھی ایسے ہی کہوں گا جیسے اللہ کے نیک بندے نے کہا تھا:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ (المائدة: ۱۱۷)

”اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔“

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ [ال عمران ۱۴۴]

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے؛ کیا اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ

بگائے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔“

رسول اللہ ﷺ سے وفات کے بعد تکلیف ختم ہو گئی تھی۔ اور آپ اگر اپنی زندگی میں بھی کسی کو خلیفہ مقرر کرتے تو آپ پر یہ واجب نہیں تھا کہ وہ خلیفہ معصوم ہو۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کرتا کہ آپ کسی کو اپنا نائب بنا کر کہیں روانہ فرماتے؛ اور پھر اس انسان کا جھوٹ سامنے آجاتا تو آپ اسے معزول کر دیتے۔ جیسا کہ آپ نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو عامل مقرر کیا تھا۔ ایسے ہی آپ اگر اپنی موت کے بعد بھی کسی کو خلیفہ مقرر کرتے تو یہ واجب نہیں تھا کہ وہ معصوم ہو۔ اس لیے کہ آپ موت کے بعد ان پر نگہبان نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کے افعال پر رد کرنے کے مکلف ہیں۔ بخلاف اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنے کے۔

تیسرا جواب: یہ کہ اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا ہر ولی امر پر واجب ہوتا ہے؛ خواہ وہ رسول ہو یا امام ہو۔ اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ جو کام خود اس انجام نہ دے سکے، ان میں کسی کو اپنا نائب مقرر کر دے۔ پس نظام کا قائم رہنا ہر صورت میں ضروری ہے؛ خواہ وہ یہ خدمت خود انجام دے یا پھر کسی کو اپنا نائب مقرر کرے۔ پس جس کام کو ولی امر خود انجام دے اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خود اس کی دیکھ بھال و اصلاح کرے؛ اور جو کام اس کی پہنچ سے دور ہے تو اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے ان امور کو پایہ تکمیل تک پہنچائے جو اس کی براہ راست پہنچ سے دور ہیں۔ جیسے کہ دور کے لوگوں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر؛ ان کے حقوق کی ادائیگی؛ ان میں حدود شریعت کا قیام۔ اور ان کے مابین حکم و فیصلہ میں عدل کا قیام۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ اپنی زندگی ان تمام لوگوں کیساتھ کیا کرتے تھے جو براہ راست آپ کی پہنچ سے دور ہوا کرتے تھے۔ آپ سرایا پر امیر مقرر فرمایا کرتے؛ جو انہیں نمازیں پڑھایا کرتے؛ اور ان لوگوں کے ساتھ جہاد کرتے؛ اور ان کی سیاست کی دیکھ بھال کرتے۔ اور ایسے ہی آپ شہروں پر اپنے عمال مقرر فرمایا کرتے۔ جیسا کہ آپ نے عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر امیر مقرر فرمایا۔ ایسے ہی آپ کے امراء میں خالد بن سعید بن عاص؛ ابان بن سعید بن العاص؛ ابوسفیان بن حرب؛ معاذ؛ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے نام آتے ہیں۔ انہیں عرب کی بستیوں پر، نجران پر، اور یمن پر عامل مقرر کیا گیا تھا۔ یہ لوگ وہاں پر ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے جن پر زکوٰۃ فرض ہو چکی؛ اور پھر ان لوگوں میں اس کو تقسیم کر دیتے جن کے لیے یہ مال زکوٰۃ لینا حلال ہوتا۔ ایسے ہی دوسرے لوگوں کو بھی آپ نے عمال مقرر فرمایا تھا۔

ایسے ہی آپ ﷺ حدود قائم کرنے میں بھی اپنا نائب مقرر فرمایا کرتے تھے؛ جیسا کہ آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ”اے انس! اس انسان کی عورت کے پاس جاؤ، اگر وہ زنا کا اقرار کر لے تو اسے رجم کر دینا۔“

آپ اس عورت کے پاس چلے گئے، اس نے زنا کا اعتراف کر لیا، اور آپ نے اسے رجم کر دیا۔ [مسلم]

ایسے ہی آپ حج میں بھی نائب مقرر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے غزوہ تبوک کے بعد بنو بکر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنایا؛ اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی جملہ رعیت میں سے تھے۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے؛ اور آپ کے احکام کی پیروی کرتے تھے؛ یہ سب باتیں غزوہ تبوک کے بعد ہوئیں۔

ایسے ہی آپ نے کئی بار مدینہ میں اپنے جانشین مقرر فرمائے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ جب بھی کسی غزوہ میں نکلتے تو اپنا

نائب مقرر کرتے؛ اور جب بھی حج یا عمرہ کے لیے نکلے تو اپنا جانشین مقرر کرتے۔ ایسے ہی غزوہ بدر، غزوہ بنی مطلق، غزوہ خیبر، غزوہ فتح مکہ، اور غزوہ حدیبیہ، عمرہ قضاء اور حجۃ الوداع کے علاوہ دیگر مواقع پر اپنے جانشین مقرر فرمائے۔

اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا ولی امر پر واجب ہوتا ہے؛ بھلے وہ نبی نہ ہو۔ حالانکہ موت کے بعد اس پر اپنا جانشین مقرر کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ زندگی میں جانشین مقرر کرنا تو انتہائی لازمی و ضروری ہے؛ اس کے بغیر واجبات کی ادائیگی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب کے وفات کے بعد ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ آپ نے امت میں تبلیغ کا فریضہ ادا کر دیا۔ اب امت پر واجب ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں؛ اور آپ کی وفات کے بعد کسی ایسے کو متعین کریں جسے وہ اپنا امیر بنائیں۔ اور جیسا کہ تمام فرض کفایہ میں ہوتا ہے کہ کسی ایک واحد متعین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنے سے وفات کے بعد نائب مقرر کرنے کا وجوب لازم نہیں آتا۔

چوتھا جواب: ولایت کی مختلف اقسام میں اپنی زندگی میں جانشین مقرر کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے دور کے لوگوں پر اپنے جانشین مقرر کئے جو کہ ان میں واجب قائم کرتے تھے۔ ایسے ہی آپ نے حج میں اپنا جانشین مقرر کیا؛ اور لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے اور اموال فے کی حفاظت؛ اقامت حدود اور غزوات میں اپنے جانشین مقرر کئے۔

اہل عقل کا اتفاق ہے کہ یہ جانشین مقرر موت کے بعد واجب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر جزئی معاملہ پر موت کے بعد جانشین مقرر کرنا ممکن نہیں؛ اس لیے کہ لوگوں کو ایک کے بعد ایک جانشین کی حاجت ہوتی ہے۔ اس صورت میں کسی کو متعین کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ اپنے بعد کسی کو متعین کیا گیا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے احوال بدل جاتے ہیں؛ اور اسے معزول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی زندگی میں جن لوگوں کو متعین کیا کرتے تھے؛ ان میں سے کسی ایک کے متعلق شکایت وصول ہوتی تو آپ اسے معزول کر دیتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے ولید بن عقبہ کو معزول کیا؛ اور فتح مکہ والے سال سعد بن عبادہ کو معزول کیا؛ اور ان کی جگہ ان کے بیٹے قیس کو ولایت سوہنی۔ اور ایک قوم کے ایسے امام کو معزول کیا جس نے قبلہ کی طرف تھوک دیا تھا۔

ایک بار آپ نے ایک آدمی کو کوئی ذمہ داری سوہنی؛ لیکن اس نے اپنے واجبات ادا نہیں کئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم اس بات سے عاجز آگئے ہو کہ جو انسان میرے احکام پورے نہ کرتا ہو؛ اسے معزول کر کے کسی ایسے کو ذمہ داری سوہنی دو جو میرے احکام کو پورا کرے۔“ اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے واجبات پورے نہ کرنے والے کو معزول کرنا ان ہی لوگوں کے سپرد کر دیا۔ تو پھر شروع سے ہی ایسے امیر مقرر کرنا جو واجبات ادا کر سکے کیسے آپ عوام کے سپرد نہیں کر سکتے تھے۔

جب آپ ﷺ کی زندگی میں یہ سنت تھی کہ جب آپ کسی ایسے کو والی مقرر کیا جاتا جو واجبات ادا نہ کر سکتا تو اسے معزول کر دیا جاتا؛ یا پھر آپ اسے معزول کرنے کا حکم دیتے۔ تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ آپ اگر اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر فرماتے؛ مگر وہ واجبات ادا نہ کر پاتا؛ اس لیے اسے معزول کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس صورت میں اگر امت خود ہی کسی کو جانشین مقرر کرے؛ اور معزول کرے یہ اس بات سے بہت آسان ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کو امیر متعین

کریں؛ اور امت اسے معزول کر دے۔ اس سے جانشین کو متعین نہ کرنے کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ لہذا ہم کہتے ہیں:

پانچواں جواب: آپ ﷺ کا اپنی موت کے بعد کسی کو جانشین مقرر نہ کرنا؛ مقرر کرنے سے زیادہ بہتر تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے جو بھی انتخاب کیا، وہ افضل ترین امور کا ہی انتخاب تھا۔ ایسے ہی اب بھی آپ کا جانشین افضل ہی مقرر ہوگا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے: یا تو یہ کہا جائے کہ: ”آپ پر واجب تھا کہ اپنی زندگی میں صرف معصوم کو ہی اپنا جانشین بنائیں۔ جب کہ آپ کے بعض جانشینوں سے نامناسب کام بھی ہو گئے جس پر آپ نے سخت انکار کیا۔ اور ان میں سے بعض کو معزول بھی کیا۔ جیسا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو جذیمہ کے قتال کے لیے بھیجا اور آپ نے ان لوگوں کو قتل کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو نصف دیت ادا کی؛ ان کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا؛ انہوں نے کتے کے برتن تک کا تاوان ادا کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور فرمایا: ”یا اللہ! میں برأت کا اظہار کرتا ہوں اس کام سے جو خالد نے کیا۔“

حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے مابین جھگڑا ہو گیا؛ یہاں تک کہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی۔ تو آپ نے فرمایا:

”لا تسبوا أصحابی فلو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذہبا ما بلغ مد أحدہم ولا نصیفہ۔“

”میرے صحابہ کو برا نہ کہو اس لئے کہ اگر کوئی تم میں سے احد پہاڑ کے برابر بھی (ثواب کو) نہیں پہنچ سکتا۔“ [البخاری: ج ۸۸۷]

مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا۔

آپ ﷺ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو ایک قوم میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل مقرر کیا، آپ واپس آئے اور عرض کی: وہ لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کر رہے، بلکہ وہ جنگ کے لیے تیار ہیں۔ آپ چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے خلاف فوج بھیجی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ [الحجرات ۶]

”اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو۔“

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر [انصاری لشکر پر] حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو والی بنایا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت سعد نے یوں کہا ہے: ”آج کا دن خوزیز جنگ کا دن ہے؛ آج حرمیں پامال کرنے کا دن ہے۔“

تو آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ ان کے بیٹے قیس کو والی بنایا؛ اور نشانی کے طور پر اپنا عمامہ شریف ارسال فرمایا؛ تاکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو جائے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے معزول کیا ہے۔

آپ ﷺ کے پاس آپ کے بعض نائبین کی شکایات پہنچائی جاتی تھیں۔ تو آپ اسی چیز کا حکم دیتے جو حکم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہوتا۔ جیسا کہ اہل قباء نے آپ کے پاس شکایت کی کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ نے نماز عشاء میں سورت بقرہ کی تلاوت کی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے معاذ! کیا تم

فَنَنْتَهِرُ بِنَا جَابِتَہُ؟ آپ سبح اسم ربك الاعلى اور واللیل إذا یغشی اور ان جیسی سورتیں پڑھا کرو۔
صحیح بخاری میں ہے: ”ایک آدمی نے آپ سے عرض کی: ”فلاں انسان، ہمیں نماز فجر بہت لمبی پڑھاتا ہے، اس لیے میں نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں۔“ تو آپ نے فرمایا:

((إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ؛ فَإِنَّ مِنْ وَرَائِهِ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ - وَإِذَا

صَلَّى لِنَفْسِهِ فَلْيَطْوِلْ مَا شَاءَ)). [صحیح مسلم: کتاب الصلاة، ح ۱۰۴۳]

”جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیونکہ اس کے پیچھے لوگوں میں کمزور بیمار اور حاجت مند اور بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور جب اپنے لئے نماز پڑھے تو پھر جتنا مرضی لمبا کر لے۔“

جس امام نے مسجد میں قبلہ رخ تھوکا تھا اور آپ ﷺ نے اسے معزول کر دیا؛ اور فرمایا: ”پیشک تم نے اللہ اور اس کے

رسول کو اذیت دی ہے۔“ [سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب كراهية البزاق في المسجد ۱/۱۸۹]

اور آپ کے جانشینوں میں سے کسی ایک کو جب کسی مسئلہ میں کوئی مشکل درپیش آتی تو وہ آپ کے پاس کسی آدمی کو بھیج کر اس کا حل دریافت کر لیا کرتے تھے۔

سورسول اللہ ﷺ اپنے جانشینوں کو ان باتوں کی تعلیم دیا کرتے جن کا انہیں علم نہ ہوتا۔ اور اگر کسی سے غلطی ہو جاتی تو اس کی اصلاح کرتے۔ اور اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرتے تو انہیں معزول کر دیا جاتا۔ ان تمام باتوں پر پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ معصوم نہ تھے۔ پس معلوم ہوا کہ آپ پر واجب نہیں تھا کہ معصوم کو ہی ولایت تفویض کرتے۔ نیز یہ ایسی چیز جس کا مکلف بنایا جانا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کو بھی معصوم پیدا ہی نہیں کیا۔ اگر آپ کو اس بات کا مکلف ٹھہرایا جاتا کہ صرف معصوم کو ہی اپنا جانشین مقرر کریں تو یہ ایسی تکلیف ہوتی جو آپ کے مقدور سے باہر ہے۔ اور اس طرح مقصود ولایت فوت ہو جاتا؛ اور لوگوں کی دنیا اور دین میں خرابی پیدا ہو جاتی۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کے لیے اپنی زندگی میں جائز ہی نہیں بلکہ واجب تھا کہ ایسے لوگوں کو اپنا جانشین مقرر کریں جو کہ معصوم نہیں؛ ایسے ہی اگر اپنی موت کے بعد کسی کو جانشین مقرر کریں تو ان کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ ہی موت کے بعد آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ انہیں تعلیم دیں یا ان کی اصلاح کریں؛ جیسا کہ آپ اپنی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ تو اس لیے آپ کا اپنا جانشین مقرر نہ کرنا جانشین مقرر کرنے سے زیادہ بہتر تھا۔

آپ ﷺ نے امت تک اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پہنچا دیئے۔ اور امت کو ان چیزوں کی تعلیم دیدی جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے۔ پس وہی خود ایسے انسان کو اپنے اوپر خلیفہ مقرر کر لیں گے جو ان میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام قائم کرے۔ اور وہ لوگ اس خلیفہ کے ساتھ قیام شریعت کے امور میں مدد کریں گے۔ اور کسی کے لیے ان امور کو قائم کرنا اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس جو کوئی علم کی بات اس [خلیفہ] سے رہ گئی ہو تو جاننے والے اسے تعلیم دیں گے؛ اور جہاں پر ان کی مدد کی ضرورت ہوگی تو مدد کریں گے۔ اور جو کوئی حق سے روگردانی کرے، اسے حسب امکان اپنے قول و عمل سے واپس حق پر لائیں گے۔ چنانچہ ان کی کسی بات کا حساب رسول اللہ ﷺ پر نہیں ہوگا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی طرف

سے امت کی کوئی جواب دہی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنی موت کے بعد جانشین مقرر نہ کرنا جانشین مقرر کرنے سے زیادہ بہتر اور آپ کے حق میں زیادہ اکل ہے۔ پس جو کوئی موت کے بعد جانشین مقرر کرنے کو زندگی میں جانشین مقرر کرنے پر قیاس کرتا ہے؛ وہ لوگوں میں سب سے بڑا جاہل انسان ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا بھی علم ہو کہ امت میں کوئی ایک خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔ اور آپ کو یہ علم تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے؛ تو پھر آپ کے لیے اس کے حقدار ہونے کی طرف اشارہ و رہنمائی کرنا؛ حالانکہ آپ جانتے تھے کہ امت آپ کے بعد ان کو ہی جانشین مقرر کرے گی؛ یہ خود آپ کے جانشین مقرر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے تاکہ امت خود ہی اس واجب کو پورا کرے۔ اور اس کا ثواب بھی امت کے لیے زیادہ ہوگا کیونکہ اس سے مقصود رسالت حاصل ہو رہا ہے۔

ایسے ہی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ علم تھا کہ امت میں اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا کوئی دوسرا نہیں؛ اور آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر میں انہیں اپنا جانشین مقرر نہیں کروں گا تو ان کی سختی کی وجہ سے شاید لوگ آپ کو خلیفہ نہ بنائیں؛ تو آپ نے خود ہی انہیں اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ آپ کا یہ اقدام امت کے حق میں بہت بہتر تھا۔

نبی کریم ﷺ کو علم تھا کہ آپ کی امت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ مقرر کرے گی؛ تو اس علم نے آپ کو متعین خلیفہ مقرر کرنے سے بے نیاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اشارہ بھی کر دیا کہ اس امت میں خلافت کے سب سے زیادہ حق دار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہیں تھا کہ اگر انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا تو امت آپ کو خلیفہ بنائے گی [لہذا آپ نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیا]۔ پس جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے کیا؛ وہ آپ کے علم و فضل کے شایان شان تھا۔ اور جو کچھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا؛ وہ آپ کے لائق تھا؛ اس لیے کہ جس چیز کا علم رسول اللہ ﷺ کو تھا؛ اس کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا۔

چھٹا جواب: ان سے کہا جائے گا: تصور کیجیے! جانشین مقرر کرنا واجب تھا؛ تو پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا؛ جیسا کہ تعین اختلاف والوں کا کہنا ہے۔ اور اس پر دیگر اقوال بھی دلالت کرتے ہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی امارت سے معزول نہیں کیا تھا۔“^①

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ایک غلط بات ہے۔ اس لیے کہ جو نبی کریم ﷺ مدینہ واپس وارد ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے واپس آنے سے خود بخود ہی معزول ہو گئے۔ جس طرح آپ کے دیگر نائبین آپ کی تشریف آوری سے از خود اس منصب سے الگ ہو جایا کرتے تھے جس پر آپ ان کو اپنی عدم موجودگی میں مقرر فرمایا کرتے تھے۔ [آپ نے اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کفار سے اظہار براءت کرنے کے لیے بھیجا تھا]۔ نیز آپ کو یمن میں عامل مقرر کیا [تھا جہاں سے] آپ حجۃ الوداع کے موقع پر [واپس آ کر] رسول اللہ ﷺ سے ملے؛ اس وقت مدینہ پر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ تھا۔

① سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے امارت مدینہ سے معزول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ غزوہ تبوک سے واپس آنے کے بعد نبی کریم ﷺ مدینہ میں سیدنا علی کے محکوم ہوں گے۔ ممکن ہے شیعہ مصنف الوہیت علی کا قائل ہو اور اس کے نزدیک سرور کائنات کا سیدنا علی کے زیر فرمان ہونا چنداں قابل اعتراض نہ ہو جیسا کہ اس کے پیش رو ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا قول ہے۔

کیا آپ یہی سمجھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے اور رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے؛ مگر پھر بھی مدینہ میں خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے؟ [اُس چہ بول بھی است؟]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی بات کوئی ایسا جاہل ہی کہہ سکتا ہے جسے نبی کریم ﷺ کے احوال کا کچھ پتہ نہ ہو۔ گویا کہ اس کا خیال یہ ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ برابر مدینہ میں خلیفہ رہے یہاں تک نبی کریم ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ مگر انہیں اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے سن ۹ھ میں آپ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کیساتھ بھیجا تاکہ اہل مکہ کے عہد انہیں واپس کریں۔ اس وقت آپ پر امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کیساتھ واپس آنے کے بعد آپ کو یمن روانہ فرمایا۔ آپ کے علاوہ حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو بھی یمن بھیجا تھا۔

پھر جب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع والے سال حج کیا؛ تو اس وقت مدینہ پر اپنا جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو بنایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس مکہ میں آ کر آپ سے ملے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے سو اونٹوں کی قربانی دی؛ جن میں سے ستر سو اونٹ خود رسول اللہ ﷺ نے نحر کئے؛ جب تینتیس اونٹوں کی قربانی کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذمہ واری تفویض فرمائی۔

یہ تمام باتیں اہل علم کے ہاں معلوم شدہ اور متفق علیہ ہیں۔ اور متواتر اسناد کیساتھ ایسے منقول ہیں گویا کہ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ ساری چیزیں دیکھ رہے ہوں۔ اور جس انسان کو رسول اللہ ﷺ کے احوال کے بارے میں علم نہ ہو؛ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے بنیادی اور اصولی مسائل میں گفتگو کرے۔

خلیفہ اسی وقت خلیفہ ہو سکتا ہے جب تک مستخلف [جس کی جگہ خلیفہ بنایا جانا ہو] غائب نہ ہو؛ یا اس کا انتقال نہ ہو چکا ہو۔ جب نبی کریم ﷺ خود مدینہ طیبہ میں موجود تھے تو پھر وہاں پر آپ کے جانشین کا ہونا بھی ممنوع ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے علاوہ دیگر مواقع پر اپنی عدم موجودگی میں جتنے بھی لوگوں کو مدینہ پر اپنا جانشین مقرر کیا؛ آپس کے واپس آتے ہی ان کی جانشینی ختم ہو گئی۔ یہی حال تمام ولایۃ الامور کا ہوتا ہے؛ جب وہ اپنی عدم موجودگی میں اپنے شہر پر کسی کو جانشین مقرر کرتے ہیں تو جب بھی جانشین مقرر کرنے والا خود واپس آ جائے تو اس کی جانشینی کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوں کہنا درست نہیں ہے کہ: ”یشک فلاں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا جانشین بنایا۔“ سو بلا شک و شبہ اللہ تعالیٰ زندہ و قائم؛ اور اپنے بندوں کے امور کا مدبر ہے۔ وہ موت؛ فنید اور غائب ہونے سے مبرا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ”یا خلیفۃ اللہ!“ تو آپ نے فرمایا: ”میں خلیفۃ اللہ نہیں ہوں؛ بلکہ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔“

ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ بندے کا خلیفہ ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اللہم أنت الصاحب فی السفر و الخلیفۃ فی الأهل۔“

”اے اللہ! تو ہی سفر کا ساتھی ہے اور گھر والوں میں خلیفہ ہے۔“

اور حدیث دجال میں آتا ہے: ”واللہ خلیفتی علی کل مسلم۔“

”اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر میرا خلیفہ ہے۔“ پس ہر وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خلیفہ کہا ہے، وہ اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین و خلیفہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ [یونس ۱۳]

”پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو جانشین کیا۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ كُنَّا أَزْجَلًا جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ [الاعراف ۶۹]

”پھر یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا۔“

اور ارشاد الہی ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [النور ۵۵]

”وعدہ کر لیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور نیک کام کئے، وہ انہیں ضرور حاکم کر دے گا جیسے ان لوگوں کو حاکم کیا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے۔“

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة ۳۰]

”اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

یعنی اس مخلوق کا جانشین بنانے والا ہوں جو تم سے پہلے زمین پر تھے؛ جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ رہ گیا فرقہ اتحادیہ کا نظریہ؛ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو یہ محض جہالت اور گمراہی ہے۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں حدیث

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں پانچویں حدیث وہ ہے جو جمہور علماء نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ”آپ میرے بھائی، میرے وصی، میرے خلیفہ اور میرے بعد میرے قرض کو ادا کرنے والے ہیں۔“ یہ روایت اس باب میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔“ [اچھی کلام اراضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا گیا ہے:

پہلا جواب: یہ ہے کہ ہم شیعہ سے اس روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ حدیث ان کتب میں موجود نہیں ہے کہ جن کی طرف حدیث کو منسوب کرنا ہی حجت ہو۔ اور نہ ہی ائمہ حدیث میں سے کسی ایک نے اسے صحیح کہا ہے۔

❁ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”جمہور علماء نے یہ روایت ذکر کی ہے۔“ [یہ مبالغہ پر مبنی ہے: اس لیے کہ]۔ اگر شیعہ مصنف کی اس سے مراد وہ علماء حدیث ہیں جن کا اپنی کتب میں روایت کرنا حجت سمجھا جاتا ہے؛ جیسے امام بخاری؛ مسلم وغیرہ؛ اور انہوں نے اس روایت کو صحیح کہا ہے؛ تو یہ محض ایک جھوٹ اور گھٹا ہوا افتراء ہے۔ اور اگر وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ابو نعیم نے ”الفضائل“ میں اور مغازی یا خطیب خوارزمی اور ان جیسے دوسرے لوگوں نے اسے روایت کیا ہے؛ یا اسے فضائل کی کتابوں میں روایت کیا گیا ہے۔ تو محض [ان کے روایت کرنے سے] یہ روایت باقی اہل علم فروعی مسائل میں بھی حجت نہیں [ہو سکتی] تو پھر امامت کے مسئلہ میں کیسے حجت ہو سکتی ہے؟ جس کی وجہ سے تم نے قیامت کھڑی کر رکھی ہے۔ پس اس کا باطل ہونا واضح ہے۔]

❁ دوسرا جواب: تمام اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ اس سے پہلے ابن حزم رحمہ اللہ کی وضاحت گزر چکی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں: ان ساری من گھڑی روایات کو ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علم حدیث اور راویوں کے احوال کے ساتھ کوئی ادنیٰ شغف بھی ہو۔ آپ نے یہ بات بالکل سچ ارشاد فرمائی ہے۔ اس لیے کہ جس انسان کو صحیح اور ضعیف حدیث کی ادنیٰ سی معرفت بھی ہو وہ جانتا ہے کہ مذکورہ بالا اور اس کی مانند دوسری روایات ضعیف ہیں۔ بلکہ اکثر جھوٹ اور من گھڑت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کوئی روایت کسی ایسے محدث نے اپنی ان کتابوں میں روایت نہیں کی جنہیں حجت سمجھا جاتا ہے۔ ایسی روایات ان لوگوں نے نقل کی ہیں جو اپنی کتابوں میں موثقی اور پتلی [صحیح اور ضعیف] ہر قسم کی روایات جمع کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں اہل علم جانتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ باتیں جھوٹ ہیں۔ جیسے کتب تفاسیر میں سے: تفسیر ثعلبی؛ تفسیر واحدی اور ان جیسی دیگر تفاسیر۔ اور فضائل کی کتابوں میں سے جو ہر قسم کی روایات جمع کرتا ہے ان میں خصوصی طور پر خطیب خوارزمی قابل ذکر ہے۔ جھوٹی روایات ذکر کرنے میں خطیب صاحب لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خطیب صاحب اور مغازی کو علوم حدیث میں مہارت نہیں ہے [اسی وجہ سے وہ ہر قسم کی روایات جمع کرتے رہتے ہیں]۔

محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کتاب الموضوعات میں یہ روایت ابو حاتم بستی سے نقل کی ہے؛ وہ کہتا ہے: ہم سے محمد بن اہل بن ایوب نے حدیث بیان کی اور کہا: ہم سے عمار بن رجا نے بیان کیا اور کہا: ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے حدیث بیان کی اور کہا: ہم سے مطرب بن میمون نے روایت بیان کی وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”بیٹک علی بن ابی طالب میرا بھائی، میرا وزیر، میرے کنبہ میں جانشین؛ میرے بعد بہترین انسان جسے میں چھوڑے جا رہا ہوں؛ میرے بعد میرے قرض کو ادا کرنے والا اور میرے وعدوں کو پورا کرنے والا ہے۔“

[ابن جوزی فرماتے ہیں:] یہ روایت موضوع ہے۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”مطرب بن میمون نامی راوی ثقہ لوگوں کے نام لیکر موضوعات روایت کرتا ہے، اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔“

ابن عدی کے واسطے سے بھی یہ روایت اسی طرح بیان کی گئی ہے۔ اس روایت کا مدار مطرب نامی راوی پر ہے، اس میں ”خلیفی و وصیی“ کے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ ”خلیفی فی اہلی“ کے الفاظ ہیں۔

اسی طرح کے الفاظ میں یہ روایت احمد بن عدی سے بھی روایت کی گئی ہے۔ اس کی سند کا مدار عبید اللہ بن موسیٰ کی مطر بن میمون سے روایت پر ہے۔ خود عبید اللہ بن موسیٰ صدوق [سچا] ہے؛ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا؛ مگر یہ شیعیت میں معروف ہے۔ یہ اپنی شیعیت کی وجہ سے غیر ثقہ لوگوں سے بھی ایسی روایات نقل کرتا تھا جو اس کی خواہشات نفس کے مطابق ہوں۔“

جیسا کہ اس نے مطر بن میمون سے یہ روایت نقل کی ہے۔ حالانکہ یہ محض جھوٹ ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس روایت کے جھوٹ ہونے کا علم بھی ہو؛ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے نفس کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے؛ اس کے جھوٹ سچ پر تحقیق ہی نہ کی ہو۔ اگر وہ اس کی تحقیق کرتا تو اس پر اس روایت کا جھوٹ ہونا واضح ہو جاتا۔ اس کے باوجود جن لوگوں نے اسے روایت کیا ہے ان کے الفاظ میں: ”خليفة من بعدی“ میرے بعد خلیفہ ہوگا؛ کے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ وہاں پر یہ الفاظ ہیں: ”وخلیفتي في أهلي۔“ ”میرے اہل خانہ میں میرا جانشین ہوگا۔“ یہ ایک خاص استخلاف ہے۔

جب کہ دوسرے الفاظ جو کہ ابن عدی نے روایت کئے ہیں وہ یوں ہیں: آپ فرماتے ہیں:

”حدثنا ابن ابی سفیان، حدثنا عدی ابن سهل، حدثنا عبید اللہ بن موسیٰ، حدثنا مطر عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: علي أخى وصاحبي وابن عمي، خير من أترك من بعدی؛ يقضي ديني و ينجز موعدی۔“

”بیشک علی میرا بھائی اور میرا دوست اور میرے چچا کا بیٹا ہے۔ میرے بعد ان لوگوں میں سے بہترین انسان جنہیں میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ میرا قرض ادا کرے گا اور میرے وعدے پورے کرے گا۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطر نامی راوی انتہائی جھوٹا ہے۔ اس کے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے کے باوجود اہل کوفہ میں سے کسی ایک نے بھی اس سے حدیث روایت نہیں کی۔ نہ ہی اس سے نجی بن سعید القطان نے روایت کیا ہے؛ نہ ہی وکیع نے؛ نہ ہی ابو معاویہ نے؛ نہ ہی ابو نعیم نے؛ نہ ہی نجی بن آدم اور ان کے امثال دوسرے محدثین نے۔ حالانکہ اس وقت کوفہ میں کثرت کے ساتھ شیعہ موجود تھے۔ اور وہاں کے بہت سارے عوام ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اور ان کی احادیث اصحاب کتب ستہ نے روایت کی ہیں۔ یہاں تک کہ ترمذی اور ابن ماجہ ضعفاء تک سے روایت کرتے ہیں؛ مگر انہوں نے اس انسان سے روایت نقل نہیں کی۔ بیشک یہ روایت عبید اللہ بن موسیٰ نے اپنی خواہش نفس کی وجہ سے اس لیے نقل کی ہے کہ وہ شیعیت کی طرف میلان ظاہر کرتا تھا۔ اور اس طرح کے لوگوں سے ایسی روایات نقل کر لیا کرتا تھا بھلے وہ جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ جیسے محدث نے عبید اللہ بن موسیٰ سے روایت نقل نہیں کی؛ بخلاف عبدالرزاق کے۔ امام احمد فرماتے ہیں: ”بیشک عبید اللہ اپنے پاس موجود چیز کا اظہار کر لیا کرتا تھا بخلاف عبدالرزاق کے۔“

ایسے ہی جو روایات اس مطر نامی راوی نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہیں ان میں سے وہ روایات بھی ہیں جو ابو بکر خطیب نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہیں؛ ان میں عبید اللہ بن موسیٰ کی روایت بھی ہے جسے وہ مطر سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت کرتا ہے آپ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا؛ تو فرمایا: ”میں اور یہ [یعنی علی] بروز قیامت اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہوں گے۔“

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ حدیث موضوع ہے۔“ اس انشاء کا سہرا مطر کے سر ہے؛ اس کے بارے میں ابو حاتم فرماتے ہیں: ”نقد راویوں کی طرف من گھڑت روایات منسوب کرتا ہے۔“ اس سے روایت نقل کرنا حلال نہیں۔

تیسری وجہ: رسول اللہ ﷺ کا قرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہیں ادا کیا۔ بلکہ صحیح روایت میں ہے: ”بیشک رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ کی درع تیس وسق جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ یہ غلہ آپ نے اپنے اہل خانہ کے لیے خریدا تھا۔“

یہ قرض اس گروی سے پورا کیا گیا جو آپ نے اس کے پاس رہن میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ پر کوئی قرض نہیں تھا۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میرے ورثہ ایک دینار یا درہم بھی تقسیم نہیں کریں گے۔ جو کچھ میں اپنے بعد چھوڑ دوں، وہ میری ازواج کا خرچہ ہے اور جو کچھ میرے عمال کمالائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔“

اگر آپ پر کوئی قرض ہوتا تو اسے آپ کے چھوڑے ہوئے ترکہ سے پورا کر دیا جاتا۔ اس لیے کہ قرض کی ادائیگی صدقہ پر مقدم ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی حدیث:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں چھٹی روایت حدیث مواخت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مہلبہ والے دن اور جب نبی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور آپ کو دیکھ اور جان رہے تھے، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کسی شخص کے درمیان بھائی چارہ قائم نہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ابو الحسن کہاں گئے؟“ لوگوں نے کہا: ”روتے اور آنسو بہاتے ہوئے چلے گئے۔“ [آپ نے فرمایا: ”اے بلال! جاؤ اور انہیں میرے پاس بلا لاؤ۔ آپ ان کے پاس چلے گئے۔ جب آپ ان کے گھر میں داخل ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔] سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رونے کی وجہ پوچھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخت قائم کی ہے اور کسی کو میرا بھائی نہیں بنایا۔“ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کو سوائیں کرے گا، ہو سکتا ہے نبی کریم ﷺ آپ کو اپنا بھائی بنانا چاہتے ہوں۔“ حضرت بلال نے کہا: اے علی! رسول اللہ ﷺ آپ کو بارہے ہیں؛ تشریف لائیے۔ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بلانے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا: اے ابو الحسن! تمہیں کس چیز نے رلا دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو رونے کا سبب بتایا تو یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”بیشک میں نے تجھے اپنے لیے خاص کیا ہے۔ کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو نبی کا

بھائی قرار پائے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور منبر کے پاس آ کر کہا: ”علی میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ ان کو مجھ سے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ آگاہ ہو جاؤ! جس کا میں مولیٰ ہوں علی اس کا مولیٰ ہے۔“ جب آپ واپس پلٹے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے گئے اور فرمایا: ”اے ابولحسن! خوشخبری ہو! آپ میرے اور ہر مسلم کے مولیٰ ہو گئے ہیں۔“ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مواخات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل الصحابہ ہیں۔ لہذا آپ ہی امام و خلیفہ ہوں گے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب:] پہلا جواب: سب سے پہلے ہم اس روایت کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ مصنف نے اس روایت کو کسی بھی کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ جیسا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق روایات کو منسوب کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی عادت ایسی کتابوں کی طرف منسوب کرنا ہے جن سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ یہاں پر اس نے اپنے اسلاف رافضی شیوخ کی عادت کے مطابق ارسال سے کام لیا ہے؛ جو جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹ کو بغیر کسی سند کے نقل کرتے ہیں۔

ابن مبارک رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

”اسناد دین کا حصہ ہیں۔ اگر اسناد نہ ہو تو جو کوئی اپنی مرضی سے جو کچھ چاہتا کہتا پھرتا۔ اور اگر اس سے سوال کیا جاتا تو وہ حیران و سرگرداں رک جاتا۔“

دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں: یہ روایت محدثین کے ہاں صریح جھوٹ ہے۔ حدیث کا ادنیٰ علم رکھنے والا بھی اس کے جھوٹ ہونے میں ذرا بھر بھی شک نہیں کرتا۔ اور اس حدیث کو گھڑنے والا انتہائی بڑا جاہل ہے اس نے ایسا جھوٹ بولا ہے جو صاف صاف اور کھلا ہوا ظاہر ہے۔ حدیث کی ادنیٰ معرفت رکھنے والا بھی اس کے جھوٹ ہونے کو جانتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

تیسرا جواب: مواخات علی رضی اللہ عنہ کی تمام احادیث موضوع اور من گھڑت ہیں۔ نہ ہی نبی کریم ﷺ نے کسی کو اپنا بھائی بنایا اور نہ ہی مواخات مہاجرین کے مابین تھی۔ نہ ہی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھائی بنایا؛ اور نہ ہی انصار کے مابین بھائی چارہ قائم کیا۔ لیکن ایسا ضرور ہوا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین مواخات کا رشتہ آغاز ہجرت میں استوار کیا تھا۔ جب کہ مباہلہ کا واقعہ سن 9 یا 10 ہجری میں اس وقت پیش آیا جب نجران کا وفد حاضر خدمت ہوا۔

چوتھا جواب: اس حدیث کے جھوٹ ہونے کے دلائل صاف واضح ہیں۔ ان میں سے ایک: شیعہ مصنف کہتا ہے کہ: ”جب مباہلہ کا دن تھا؛ تو آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین بھائی چارہ قائم کیا۔“ مباہلہ کا واقعہ وفد نجران کی آمد کے موقع پر ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران کی آیات نازل فرمائیں۔ یہ سن نو ہجری کے آخر یا دس ہجری کے شروع کا واقعہ ہے۔ لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ اس سے پہلے پیش نہیں آیا۔ دراصل نبی کریم ﷺ کا نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں دعوت مباہلہ دی گئی تھی۔ انھوں نے مشورہ کی مہلت طلب کی۔ جب خلوت میں مشورہ کیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں اور جو قوم نبی سے مباہلہ کرتی ہے

بر باد ہو جاتی ہے۔“ چنانچہ اہل کتاب میں یہ سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے جزیہ دینا تسلیم کیا اور چلے گئے۔“^①
لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مہابلہ کے دن کوئی مواخات نہیں ہوئی۔

❁ پانچواں جواب: مہاجرین و انصار کے مابین مواخات کا واقعہ پہلی سن ہجری میں دار بنی النجار میں پیش آیا تھا۔ مہابلہ اور مواخات کے مابین کئی سال کا فاصلہ ہے۔

❁ چھٹا جواب: نبی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین مواخات قائم کی تھی۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں ہی مہاجر تھے۔ ان کے مابین مواخات نہیں قائم ہوئی تھی۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھائی چارہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین نہیں تھا۔ یہ بات صحیحین کی روایت کے موافق ہے کہ مواخات مہاجرین و انصار کے مابین تھی؛ مہاجرین و مہاجرین کے مابین نہیں تھی۔

❁ ساتواں جواب: ”أما ترضى أن تكون مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى۔“

”کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ وہی منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ۔“
یہ جملہ آپ نے ایک ہی بار غزوہ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس مجلس کے علاوہ آپ نے کسی بھی دوسرے موقع پر آپ نے اصلاً یہ جملہ ارشاد ہی نہیں فرمایا۔ اس پر تمام محدثین اہل علم کا اتفاق ہے۔ جب کہ ان کی روایت کردہ حدیث مولانا کے الفاظ بھی غدیرم کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور مجلس میں آپ نے یہ جملہ ارشاد ہی نہیں فرمائے۔

❁ آٹھواں جواب: اس سے پہلے حدیث مواخات کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اس حدیث میں علی الاطلاق عموم ہے جس سے نہ ہی کسی افضلیت کا تقاضا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امامت کا۔ اور جو فضیلت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت ہے اس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
”اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔“^②

اور نبی کریم ﷺ کا یہ خبر دینا کہ: مردوں میں حضرت ”ابوبکر رضی اللہ عنہ“ آپ کو عزیز تر ہیں۔“
اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گواہی دینا کہ: ”نبی کریم ﷺ بھی ہم سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔“
اور ان کے علاوہ دیگر وہ روایات ہیں جن سے دلائل کی روشنی میں نقلی طور پر حدیث مواخات سے ان لوگوں کے استدلال کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

❁ نواں جواب: بعض لوگوں کا یہ خیال کر لینا کہ مواخات کا رشتہ مہاجرین کے مابین قائم ہوا تھا؛ کیونکہ اس طرح کی بعض

① سیرۃ ابن ہشام (ص: ۲۷۱-۲۷۷)، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قصۃ اہل نجران (حدیث: ۴۳۸۰)۔

② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذاً خليلاً“ (ح: ۳۶۵۸)،

صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (حدیث: ۲۳۸۲، ۲۳۸۳/۶)۔

روایات نقل کی گئی ہیں۔ مگر یہ بات دونوں یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ اور اس طرح کی جتنی بھی روایات ہیں وہ سب باطل ہیں۔ یہ ان لوگوں کی روایات ہیں جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں یا پھر ان لوگوں نے انہیں نقل کیا ہے جن سے نقل کرنے میں خطا واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصحاب صحاح [ستہ] نے اس طرح کی کوئی روایت نقل نہیں کی۔

صحیح احادیث سے ثابت شدہ بات ہے کہ مؤاخات کا رشتہ مہاجرین و انصار کے مابین قائم ہوا تھا۔ یہ بات کبھی جانتے ہیں کہ اگر مہاجرین کا ان کے آپس میں اور انصار کا ان کے مابین رشتہ مؤاخات قائم کیا ہوتا تو اسے نقل کرنے اور اتنی اہمیت دینے کی کوئی وجہ یا سبب نہ ہوتا۔ اور جہاں دوسرے امور ذکر کئے جاتے ہیں وہاں احادیث مؤاخات میں اس کا ذکر بھی کیا گیا ہوتا۔ حالانکہ اس بارے میں کوئی ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے، اور نہ ہی اصحاب صحاح ستہ نے ایسی کوئی روایت نقل کی ہے۔ یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جسے صحیح احادیث اور سیرت کی متواتر روایات؛ رسول اللہ ﷺ کے احوال؛ مؤاخات کے اسباب و فوائد اور مقصود کا علم ہوتا ہے۔ وہ اس مؤاخات کی رو سے ایک دوسرے کے وارث بھی بنتے تھے۔ سونہی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین مؤاخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔ جیسا کہ آپ نے حضرت سعد بن ربیع اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما؛ اور حضرت سلیمان فارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے مابین مؤاخات قائم کی تھی تاکہ مہاجرین و انصار کے مابین ایک صلہ قائم ہو جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِيمَا كَتَبَ اللَّهُ﴾ [الأنفال ۷۵]

”اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔“

یہ وہی حلف و مؤاخات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتَوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ﴾ [النساء ۳۳]

”اور جن لوگوں کو تمہارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انہیں ان کا حصہ دو۔“

فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ: کیا یہ آیت محکم ہے؟ اور اس کے موجب سے نسب نہ ہونے پر میراث دی جائے گی یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے بھی دو روایات ہیں۔ پہلا مذہب امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اور دوسرا مذہب امام شافعی اور امام مالک رحمہما کا ہے۔

[حدیث الراہیہ سے اثبات امامت:]

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں حدیث]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”اس ضمن میں ساتویں حدیث جسے جمہور نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ جب آپ نے اُنتیس (۲۹) راتوں تک خیبر کا محاصرہ کیا؛ اس وقت تک علمبردار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر آپ کو آنکھوں کی بیماری لاحق ہو گئی جس

کی وجہ سے آپ جنگ سے عاجز آ گئے۔ اس وقت مرحب جنگ کے لیے چیلنج کرتا ہوا نکلا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلایا؛ اور فرمایا: یہ جھنڈا لے لو! اور حملہ کرو! ابوبکر نے جھنڈا لیا اور مہاجرین کے ایک گروہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے۔ مگر کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ شکست خوردہ واپس لوٹے۔ اس کے اگلے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے نکلے۔ آپ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ واپس لوٹے اور اپنے ساتھیوں کو بھی خبر دی [یعنی انہیں بھی بزدل بنا کر واپس لے آئے]۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میرے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لایا جائے۔ آپ کو بتایا گیا: ”آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔“ پھر آپ نے فرمایا: ”اسے لا کر مجھے دکھاؤ؛ مجھے ایسا شخص دکھاؤ جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرے اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو بھاگنے والا نہیں۔“ اس وقت لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لیکر آئے۔ آپ نے اپنا لعاب دہن اپنی ہتھیلی پر لے کر آپ کی آنکھوں میں اور سر پر لگایا۔ اس سے آپ تندرست ہو گئے۔ سو آپ نے انہیں علم عطا کیا؛ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں پر فتح عطا کی؛ اور مرحب قتل ہوا۔ نبی کریم ﷺ کا آپ کے لیے یہ اوصاف بیان کرنا دوسروں سے ان اوصاف کے منفي ہونے کی دلیل ہے۔ یہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہے؛ پس آپ ہی امام ہوں گے۔“

[جوابات:] پہلا جواب: اس روایت کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ: ”اس روایت کو جمہور نے روایت کیا ہے۔“ تو ہم کہتے ہیں کہ: ثقہ علماء نے یہ روایت ان الفاظ میں نقل نہیں کی۔ بلکہ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خبر میں موجود نہ تھے؛ بلکہ آپ غائب تھے۔ آپ اس غزوہ سے اس لیے پیچھے رہ گئے تھے کہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ پھر آپ پر نبی کریم ﷺ سے پیچھے رہنا گراں گزرا؛ لہذا آپ نبی کریم ﷺ سے جا ملے۔ آپ کے خیر پہنچنے سے قبل رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”کل میں یہ جھنڈا ایسے انسان کو دوں گا جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرنے والا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر فتح عطا کرے گا۔“

اس سے قبل یہ جھنڈا نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس۔ اور نہ ہی ان دونوں میں سے کوئی ایک جھنڈے کے قریب تک گیا۔ یہی وجہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”میں نے اس دن کے علاوہ کبھی بھی امیر بننا پسند نہیں کیا۔ اور تمام لوگوں نے اس حالت میں رات گزاری کہ ان میں سے ہر ایک اس امید پر تھا کہ شاید یہ جھنڈا اسے ہی مل جائے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا؛ تو آپ کو بتایا گیا: کہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے تو آپ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں ڈالا؛ جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا دیدی اور آپ ﷺ نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔“

اس موقع پر نبی کریم ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور خاص جھنڈا عطا کرنا آپ کی تکلیف کے باوجود تشریف آوری پر جہاں تھی۔ نبی کریم ﷺ کو آپ کے بارے میں علم تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں پر حاضر نہیں تھے۔ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ بھی ہے۔ اس حدیث میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے شان میں کوئی تنقیص ہرگز نہیں۔

دوسرا جواب: رسول اللہ ﷺ کا یہ خبر دینا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں؛ اور اللہ اور اس

کا رسول ان سے محبت کرتے ہیں۔“ اس میں نواصب پر رو ہے۔ لیکن اس میں رافضیوں کی کوئی دلیل نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مرتد ہو گئے تھے۔ اور نہ ہی ان کے لیے اس دلیل سے استدلال کرنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ خوارج انہیں یہ جواب دیتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تو ان لوگوں میں سے تھے جو مرتد ہو گئے تھے۔ جیسا کہ جب جرگہ داروں نے فیصلہ کیا تو خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ”آپ اسلام سے ارتداد کا ارتکاب کر چکے ہیں؛ لہذا دوبارہ اسلام قبول کیجیے۔“

✽ امام ابوالحسن اشعری رضی اللہ عنہ اپنی کتاب ”المقالات“ میں لکھتے ہیں: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کفر پر سب خوارج کا اجماع منفقہ ہو چکا ہے۔“

✽ اس حدیث سے اہل سنت والجماعت کے لیے کئی دلائل کے ساتھ خوارج کے خلاف استدلال کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ دلائل باقی تینوں خلفاء کے ایمان کے بارے میں بھی مشترک ہیں۔ جب کہ رافضی باقی خلفاء کے ایمان پر تنقید کرتے ہیں۔ پس روافض کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خوارج کے خلاف دلیل قائم کر سکیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حالت ایمان میں فوت ہوئے تھے۔ بلکہ رافضی جو بھی ایسی دلیل ذکر کریں گے جس میں قدر ہو؛ اس سے خود ان کے اصل کا بطلان ثابت ہو گا۔ کیونکہ ان کی اصل ہی فاسد ہے۔

✽ اس وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی خصوصیت کو بیان نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ دوسرے صحابہ بھی اللہ اور اس کے رسول کو چاہتے تھے؛ اور اللہ اور اس کا رسول بھی انہیں چاہتے تھے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے لیے بطور تعین گواہی موجود ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے دس بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنت کی خوشخبری سنائی۔ اور حضرت قیس بن ثابت کے لیے جنتی ہونے کی گواہی دی؛ اور عبد اللہ الجہم کے لیے گواہی دی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے؛ حالانکہ انہیں کئی بار شراب نوشی پر سزا مل چکی تھی۔

✽ رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ: ”اس سے باقی لوگوں سے اس وصف کا انتفاء ثابت ہوتا ہے۔“ اس میں دو جواب ہیں۔

✽ پہلا جواب: اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”کل میں یہ جھنڈا ایسے انسان کو دوں گا جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر فتح عطا کریگا۔“ سو یہ مجموعہ [صفات] آپ کے ساتھ خاص ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔ جب یہ متعین فتح آپ کے ہاتھوں پر تھی؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ دوسروں سے بھی افضل اور امامت کے لیے مختص ہوں۔

✽ دوسرا جواب: یہ کہا جائے کہ: اس بات کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کسی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں یہ مال کسی فقیر آدمی یا نیک آدمی کو دوں گا۔ یا آج کے دن میں کسی مریض کو یا نیک انسان کو بلاؤں گا۔ یا میں اپنا جھنڈا کسی بہادر آدمی کو دوں گا۔ یہ اس طرح کے دیگر کلمات کہے۔ تو ان الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی کہ جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی دوسرے میں یہ صفات نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان

صفات کا حامل ایک یہ انسان بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک نے اگر کہا ہو کہ وہ ایک ہزار درہم کسی نیک آدمی پر یا فقیر پر صدقہ کرونگا۔ پھر اس نے اپنی یہ نذر پوری کر دی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس آدمی کے علاوہ کوئی دوسرا نیک یا فقیر نہیں۔ اور ایسے ہی اگر یوں کہا جائے کہ یہ مال اس آدمی کو وید اس نے میری طرف سے حج کیا ہے۔ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی دوسرے نے اس کی طرف سے حج نہ کیا ہو۔

تیسرا جواب: اگر یہ بات مان لی جائے کہ اس وقت میں آپ ہی افضل تھے؛ تو اس میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ بعد کے کسی دوسرے وقت میں کوئی دوسرا آپ سے افضل نہ ہو۔

چوتھا جواب: اگر آپ کی افضلیت کو مان بھی لیا جائے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ آپ ہی امام منصوص علیہ ہیں۔ بلکہ بہت سارے شیعہ زید یہ؛ اور متاخرین معتزلہ اور دوسرے لوگ آپ کی افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں؛ مگر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مفضول کی ولایت جائز ہے۔ یہ بات بہت سارے ان دوسرے لوگوں کے ہاں بھی جائز جو خلفاء اربعہ میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دینے میں توقف اختیار کرتے ہیں؛ اور وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ یہ ایک ظنی مسئلہ ہے؛ اس میں کسی ایک متعین کی فضیلت پر کوئی دلیل قطعی موجود نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس انسان کو صحیح سنت کی معلومات نہ ہوں؛ وہ اس مسئلہ میں شک کا شکار ہو جائے گا۔

جب کہ باقی تمام مشہور ائمہ کا اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔ یہ اجماع کئی لوگوں نے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب ”مناقب الشافعی“ میں اپنی سند کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے باقی تمام صحابہ سے افضل ہونے میں صحابہ کرام اور تابعین رحمہم اللہ میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے۔“

امام مالک رحمہ اللہ نے نافع سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں صحابہ کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دیا کرتے تھے؛ ہم کہا کرتے تھے: رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بہترین انسان ابوبکر اور ان کے بعد عمر ہیں۔ رضی اللہ عنہما۔ اس بارے میں امام بخاری کا کلام گزر چکا ہے۔

اور وہ شیعہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وقت گزارا؛ ان کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ یہی عقیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی (۸۰) سے زیادہ اسناد سے نقل ہے۔ یہ ایسی قطعی اور یقینی بات ہے جو کسی بھی ایسے انسان پر مخفی نہیں جو رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کے احوال کی معرفت رکھتا ہے۔

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حدیث طبر]

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں حدیث]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”تمام جمہور نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک پرندہ لایا گیا، تو آپ نے دعا کی: ”اے اللہ! اس پرندے کا گوشت کھانے کے لیے کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیج جو مجھے اور تجھے سب لوگوں میں سے عزیز تر ہو۔ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے؛ اور دروازے پر دستک دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول

اللہ ﷺ کسی ضرورت میں مشغول ہیں۔ پس وہ آدمی واپس چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر پہلے کی طرح دعا کی؛ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ حضرت انس نے پھر کہا: کیا میں نے نہیں کہا کہ: آپ کسی ضرورت میں مشغول ہیں۔ وہ آدمی پھر واپس پلٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے پھر پہلے کی طرح دعا کی؛ وہ آدمی پھر واپس آیا اور پہلے دو بار کی نسبت بہت سخت دستک دی۔ اس دستک کو رسول اللہ ﷺ نے سن لیا اور فرمایا: اسے اندر آنے کی اجازت دو۔ جب آپ اندر تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اتنی دیر کیوں لگادی؟ تو انہوں نے عرض کیا: میں ایک بار آیا تو مجھے انس نے واپس کر دیا؛ پھر دوسری بار آیا تو انس نے واپس کر دیا۔ پھر میں تیسری بار آیا تو انس نے واپس کر دیا۔ آپ نے پوچھا: اے انس! تم نے ایسے کیوں کیا؟ تو انہوں نے عرض کی: میں یہ امید کرتا تھا کہ یہ دعا انصار کے کسی فرد کے لیے ہو۔ تو آپ نے فرمایا: اے انس! کیا انصار میں علی سے بہتر بھی کوئی ہے؟ یا انصار میں علی سے افضل بھی کوئی ہے۔ جب آپ اللہ کے ہاں سب سے محبوب مخلوق تھے تو اس سے واجب ہوا کہ آپ ہی امام بھی ہوں۔“

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے:

پہلا جواب: ہم اس حدیث کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا کہ تمام جہور نے اس روایت کو نقل کیا ہے؛ جہور پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ اسے نہ ہی اصحاب صحاح نے روایت کیا اور نہ ہی محدثین نے اسے صحیح کہا۔ لیکن یہ بعض لوگوں کی نقل کردہ مرویات میں سے ہے۔ جیسا کہ اس جیسی دوسری روایات بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں نقل کی گئی ہیں۔ بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بھی بہت ساری روایات نقل کی گئی ہیں۔ اور اس باب میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن محدثین کرام نے ان میں سے کسی ایک کو بھی صحیح نہیں کہا۔

دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں: یہ حدیث سب محدثین: اہل علم و معرفت کے نزدیک جھوٹی اور موضوع ہے۔ ابو موسیٰ المدنی کہتے ہیں: کئی معتبر محدثین نے اس [پرندہ والی] روایت کی اسناد جمع کی ہیں۔ جیسے کہ حاکم نیشاپوری؛ ابو نعیم؛ ابن مردودہ اور دوسرے محدثین کرام رضی اللہ عنہم۔

مشہور محدث امام حاکم سے ”حدیث الطیر“ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ”یہ حدیث صحیح نہیں۔“^①

حالانکہ حاکم تشیع کی جانب منسوب ہے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرو تو آپ نے فرمایا: ”ایسی کوئی روایت میرے دل میں نہیں آتی؛ یا میری زبان پر جاری نہیں ہوتی۔ اس بات پر

① تفصیل کے لیے دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ للذہبی (۱۰۳۲/۳-۱۰۳۳)۔ ترجمۃ للامام الحاکم، البداية النہایۃ لابن کثیر (۳۸۷/۷)، یہ روایت سنن ترمذی (۳۷۲۹)، کتاب المناقب، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ (۳۸۰۵) میں مختصراً مروی ہے: اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ”نبی کریم ﷺ کے پاس ایک پرندہ تھا؛ تو آپ نے فرمایا: ”اے اللہ! میرے پاس مخلوق میں اپنے نزدیک سب سے محبوب انسان کو لے آ؛ تاکہ وہ میرے ساتھ یہ پرندہ کھائے“ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے آپ کے ساتھ اسے کھائی۔ امام ترمذی اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے؛ سدی سے اسے ہم صرف اس سند کے ساتھ جانتے ہیں۔ یہ حدیث ایک اور سند سے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جسے امام شوکانی رحمہ اللہ نے فوائد مجموعہ میں ص ۳۸۲ پر بھی نقل کیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”المختصر“ میں کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی کئی اسناد ہیں؛ جو کہ تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ اسے ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوعات میں درج کیا ہے۔ جب کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے مستدرک حاکم میں نقل کرتے ہوئے صحیح کہا ہے۔ جس پر بہت سارے اہل علم نے اعتراض کیا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں جانا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ میرا اعلام النبلاء میں امام حاکم رحمہ اللہ کے حالات زندگی میں دیکھ لے۔ نیز دیکھیے: تحفۃ الاحوذی (۳۲۸/۳)۔

آپ کو مارا بھی گیا، مگر آپ نے فضائل معاویہ رضی اللہ عنہ میں کوئی حدیث بیان نہ کی۔ حالانکہ آپ وہی امام حاکم ہیں جنہوں نے اپنی کتاب اربعین میں صرف ضعیف ہی نہیں بلکہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع احادیث تک جمع کی ہیں۔ جیسا کہ آپ وعدہ توڑنے والے اور بیعت توڑنے والے کو قتل کرنے کی روایت۔ مگر ان کی شیعیت اور ان جیسے دوسرے ائمہ حدیث جیسے امام نسائی، ابن عبد البر اور ان کے امثال کی شیعیت اس درجہ تک نہیں پہنچتی کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیں۔ علماء حدیث میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہو۔ بلکہ ان میں شیعیت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ باقی ان ائمہ متقدمین پر زبان درازی کرنا ان کے محاسن بیان کرنے سے اعراض اور من گھڑت روایات کا بیان ان کے ہاں نہیں تھا۔ علماء حدیث نے انہیں اس چیز سے بچالیا تھا۔ اور انہوں نے وہ قواعد مقرر کر دیئے تھے جس سے ان صحیح احادیث کی پہچان حاصل ہو سکتی تھی جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں۔

بعض معمولی درجہ کے محدثین نے جو اس قسم کی روایات کو رد کیا ہے، جیسا کہ ابن عقدہ وغیرہ؛ تو ان لوگوں کا مقصود یہ تھا کہ فضائل علی رضی اللہ عنہ میں جھوٹی احادیث تک کو جمع کر لیا جائے۔ اور موضوع احادیث کے زور پر ان صحیح احادیث کو رد نہیں کیا جاسکتا جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں، اور محدثین کے ہاں تو اتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہ احادیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی احادیث سے زیادہ کثرت کے ساتھ ہیں؛ واضح اور دلالت میں صریح ہیں؛ سند کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ”انہوں نے فضائل علی میں ان احادیث کو صحیح قرار دیا ہے جنہیں دوسرے محدثین نے صحیح نہیں کہا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے، آپ سے اس قسم کی جھوٹ بات کا صدور ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان سے وہ روایات نقل کی گئی ہیں جو دوسرے محدثین سے نقل نہیں کی گئیں۔“ لیکن آپ کے اس کلام میں کچھ اشکالات ہیں جن کے بیان کا موقع محل یہ نہیں ہے۔

تیسرا جواب: پرندے کا گوشت کھانے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کا سب سے محبوب انسان حاضر ہو اور وہ اس میں سے کچھ کھائے۔ اس لیے شریعت ہر نیک اور بدکردار کو کھانا کھلانے کا حکم دیتی ہے۔ اس میں کھانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ قربت کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت پوشیدہ ہے۔ تو پھر یہاں کون سی ایسی بڑی بات ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ یہ کام اللہ کا سب سے محبوب انسان ہی کر سکتا ہے۔

چوتھا جواب: اس حدیث میں رافضی مذہب کے مطابق تناقض پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ: رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مخلوق میں سب سے بڑھ کر محبوب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ کے بعد خلیفہ بھی بنایا ہے۔ جب کہ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو پتہ نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام مخلوق میں سب سے بڑھ کر محبوب ہیں۔

پانچواں جواب: یہاں پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ نبی کریم ﷺ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب مخلوقات کی نسبت عزیز تر ہیں۔

۲۔ آپ کو اس بات کا علم نہ تھا۔

بصورت اول آپ کے لیے ممکن تھا کہ آپ کسی کو بھیج کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا لیتے، پھر آپ نے انہیں کیوں نہیں بلایا؟ جیسے کہ آپ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو بوقت ضرورت بلایا کرتے تھے۔ یا پھر آپ نے دعائیں یوں کیوں نہ فرمایا کہ: ”اے اللہ! علی رضی اللہ عنہ کو حاضر کر دے، بیشک وہ تیرے ہاں مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔“ اگر آپ ایسے صاف اور صریح الفاظ میں علی رضی اللہ عنہ کا نام لے کر دعا کر دیتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک بھی باطل امید پر نہ رہتے، اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آمد پر دروازہ بند کر دیتے۔

اور اگر رسول اللہ ﷺ یہ بات نہیں جانتے تھے، تو رافضیوں کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم تھا۔ نیز یہ کہ اس روایت کے الفاظ ہیں:

”أَحَبُّ خَلْقِكَ إِلَيْكَ وَالْيَـ“

”جو تجھے اور مجھے تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو۔“

حیرانی کی بات ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سب مخلوقات سے نبی کریم ﷺ کو عزیز تر تھے تو آپ کو یہ بات کیوں کر معلوم نہ تھی؟ چھٹا جواب: کتب صحاح ستہ میں جو احادیث صحیح اور ثابت ہیں، اور جن کے صحیح ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے، اور انہیں علماء کرام میں قبول عام حاصل ہے، وہ تمام احادیث اس روایت کے خلاف ہیں۔ تو پھر ان کا مقابلہ اس موضوع اور جھوٹی حدیث سے کیوں کر کیا جاسکتا ہے جسے کسی ایک نے بھی صحیح نہیں کہا۔

اس روایت کے ناقابل اعتماد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بخاری و مسلم اور دوسری کتب میں وارد فضائل صحابہ کرام کی روایات ہیں۔ بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اگر روئے زمین پر رہنے والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔“^۱

یہ حدیث مشہور ہی نہیں بلکہ اہل علم کے ہاں متواتر ہے۔ صحاح ستہ میں مختلف طرق سے مروی ہے اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابن مسعود^۲، ابن عباس^۳، ابوسعید^۴، ابن زبیر رضی اللہ عنہم، جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔

اور یہ حدیث اس باب میں ایک صریح ثبوت ہے اہل ارض میں سے نبی کریم ﷺ کے ہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر محبوب کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے کہ ”خلۃ“ یا ”خلیل“ کا لفظ محبت کے کمال [ومعراج] کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اہل دنیا میں سے کسی کے لیے ممکن ہوتی تو پھر اس کے مستحق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لیے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے لیے لوگوں میں سب سے بڑھ کر محبوب تھے۔

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذًا خليلاً“

(ح: ۳۱۵۶)، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ، (ح: ۲۳۸۲)

② صحیح مسلم (۲۳۸۳)

③ صحیح بخاری (۳۶۵۶)

④ صحیح بخاری (۳۶۵۴)، صحیح مسلم (۲۳۸۲)

حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا کہ سب لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا: ”عائشہ۔“ عرض کیا گیا ”مردوں میں سے کون؟“ فرمایا: ”ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ۔“^①

سفینہ بنی ساعدہ کے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کے ہجوم میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

”آپ ہم میں سب سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کو عزیز تر ہیں۔“^②

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی تھی۔

نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہے۔ پس ابو بکر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سب سے محبوب تھے اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو بھی آپ سے بہت زیادہ پیار تھا۔

ہاں بالکل معاملہ ایسے ہی تھا۔ اس لیے کہ آپ ان سب میں اللہ سے زیادہ ڈرنے والے اور عزت والے تھے۔ اور مخلوق میں اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز و مکرم اور کتاب و سنت کا تقویٰ رکھنے والے تھے۔ سب سے بڑے متقی تھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو متقی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَسَيَجْزِيهَا آلَاتُكَ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۖ وَمَا لَاحِدٌ عِنْدَكَ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا إِلَّا أُبْغِيَاعًا وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ (اللیل: ۱۷-۲۱)

”اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے۔ جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہو جائے گا۔“

ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ آیات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔^③

ہم ائمہ تفسیر کے اس قول کی صحت دلیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: ”الانفسی“ سے مراد کبھی ایک نوع ہوتی ہے اور کبھی شخص واحد بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ جب اس سے مراد نوع ہو تو پوری جماعت بھی مقصود ہو سکتی ہے۔ اگر یہ کہیں کہ ان میں صرف ایک شخص ہی اتنی ہو سکتا ہے تو یہ قول باطل ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض افراد بعض سے زیادہ متقی ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے اقوال کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ متقی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جب کہ شیعہ کہتے ہیں: نہیں؛ بلکہ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اور کچھ لوگوں سے اس کے علاوہ بھی تفاسیر منقول ہیں۔ جس انسان کو اس بارے میں پختہ علم ہو، یا شک کی صورت میں بھی، تو وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں برابری تھی۔ اگر کوئی ایسی بات کہے گا تو وہ تمام گروہوں کے اجماع کی مخالفت کرے گا۔ پس یہ بات متعین ہو گئی کہ یہ لوگ تقویٰ میں برابر نہیں [بلکہ ان کے مراتب میں فرق ہے]۔

① صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۳۶۶۲)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۲۳۸۴)

② صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۳۶۶۸)۔

③ مستدرک حاکم (۲/۵۲۵)، تفسیر درمنثور (۶/۶۰۵)۔

اگر اس سے فرد معین مراد لیں تو پھر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوں گے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ اس لیے کہ لفظ ”اتقی“ اسم جنس ہے جو اس جنس میں شامل تمام افراد کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد پہلی قسم یعنی جماعت ہوگی۔ یا پھر اس سے کوئی ایسا متعین شخص مراد ہو جو ان دو حضرات کے علاوہ ہو؛ تو یہ چیز بھی اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا مصداق ٹھہرانا اس لیے صحیح نہیں کہ اس میں یہ آیت بھی ہے:

﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۖ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ (اللیل: ۱۸-۲۱)

”جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہو جائے گا۔“

یہ وصف کئی وجوہات کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں موجود نہ تھا۔

پہلی وجہ: چونکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور علی رضی اللہ عنہ مکہ میں تنگ دست اور عیال محمدی میں شامل تھے۔ آپ کے پاس کوئی مال نہیں جسے آپ خرچ کرتے۔ جب مکہ میں قحط پڑا تھا تو نبی کریم ﷺ نے ان کو اپنے کنبہ میں شامل کر لیا تھا۔ دوسری وجہ: اس آیت میں کہا گیا ہے: ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ﴾ ”اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔“

بنابریں نبی ﷺ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دو احسان تھے:

۱۔ [دنیوی احسان]۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنے عیال کے ساتھ ملا لیا تھا۔ بخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ اس لیے کہ آپ پر کوئی دنیوی احسان نہیں تھا؛ سوائے دینی نعمت کے۔ اور اس پر جزاء نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے کہ دین کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؛ کوئی بھی انسان اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کے حضرت ابوبکر صدیق پر دینی احسانات ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہر دو طرح کے احسانات ہیں: ۱۔ دنیوی [جن کا بدلہ دیا جاسکتا ہے]۔ اور ۲۔ اخروی و دینی احسان [جن کا بدلہ ممکن نہیں]۔ پہلا احسان قابل جزاء ہے۔ جب کہ دوسرے احسان کا صلہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں ذکر کردہ وصف ”اتقی“ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں موجود تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں نہیں۔ بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے زیادہ متقی تھے۔ مگر مذکورہ وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہم سر نہ تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کیا؛ تو پھر اس میں انعام کرنے والے کے لیے تو کوئی جزاء نہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ کسی انسان نے اپنے ساتھ بھلائی کرنے والے کو اجرت دی؛ اور پھر اس کے بعد کوئی چیز اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھی دیدی؛ تو یہ بھی ایسی ہی چیز ہے جس کی جزاء کسی ایک کے پاس نہیں ہے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: ”تصور کیجیے! معاملہ بالکل ایسے ہی ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ خرچ بھی کرتے تو آپ اسی جگہ پر خرچ کرتے جہاں پر خرچ کرنے کا حکم انہیں بارگاہ رسالت سے ملتا۔ اور نبی کریم ﷺ کے پاس اس نعمت کی جزاء دینے کی گنجائش موجود تھی۔ تو آپ کا خرچ کرنا مجازات سے ایسے خالی نہیں ہو سکتا جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ مجازات سے خالی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے بڑھ کر متقی ہیں، مگر اس مذکورہ وصف میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زیادہ کامل تھے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ میں یہ بات واضح ہے مخلوق میں سے کسی ایک کے پاس بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں۔ یہ وصف اسی انسان کا ہو سکتا ہے جو لوگوں کو ان کے احسانات پر بدلہ دیتا ہو، اور مخلوق میں سے کسی ایک کا کوئی احسان اس پر باقی نہ رہا ہو۔ یہ وصف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یوں پوری طرح سے منطبق ہوتا ہے کہ مہاجرین میں سے کوئی دوسرا انسان آپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ بیشک مہاجرین۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام۔ میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں تھا جو اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد لوگوں کے ساتھ اپنی جان و مال سے اس قدر احسان کرنے والا ہو جس قدر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ احسان کیا کرتے تھے۔ آپ لوگوں میں مألوف و محبوب تھے؛ لوگوں کی خیر خواہی میں ان کیساتھ مدد کیا کرتے۔ جیسا کہ مکہ سے آپ کی ہجرت کے وقت اس علاقہ کے سردار ابن دغنے نے کہا تھا: ”اے ابوبکر! آپ جیسے لوگوں کو نہ ہی نکالا جاسکتا ہے، اور نہ ہی وہ خود نکل سکتے ہیں۔ بیشک آپ کمزوروں کی مدد کرتے ہیں؛ مہمان نوازی کرتے ہیں؛ ضرورت مند کی مدد کرتے ہیں اور حق کے کاموں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔“

صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ”تو لات کی شرمگاہ چوسے! کیا ہم بھاگ جائیں گے اور رسول اللہ ﷺ کو یوں ہی اکیلا چھوڑ دیں گے؟ تو اس نے جواب میں کہا: اگر تمہارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا جس کا میں بدلہ نہیں دے سکا؛ تو میں ضرور تمہیں اس کا جواب دیتا۔“

اسلام سے قبل اور اس کے بعد کسی ایک بھی ایسے انسان کے بارے میں بھی علم نہیں ہو سکا جس کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کوئی احسان ہو۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے آپ ہی اس بات کے حق دار تھے کہ ان الفاظ میں آپ کی مدح سرائی کی جائے:

﴿وَمَا لَاحِدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى﴾

”اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔“

آپ اس آیت کے مقصود میں داخل ہونے میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ ﷺ کے دنیاوی احسانات ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے: ”اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو آپ کسی کو نہیں کہتے تھے کہ یہ اٹھا کر مجھے دیدو۔ اور آپ فرمایا کرتے تھے:

”مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں کبھی بھی لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہ کروں۔“

مسند احمد اور سنن ترمذی اور سنن ابوداؤد میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت میرے پاس مال موجود تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا: آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبقت لے جاؤں گا۔ پس

میں اپنے گھر کا آدھا مال لیکر حاضر ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا: اتنا ہی مال اپنے گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا سارا مال لیکر حاضر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اپنے گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔“ پس میں نے کہا: میں کبھی بھی آپ پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔“

ہاں! ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا مال پیش کر دیا، مگر اس کے باوجود آپ کسی سے لیکر نہیں کھاتے تھے۔ نہ ہی صدقہ کا مال اور نہ ہی صلہ رحمی کا؛ نہ ہی نذر و نیاز [نہ ہی نذرانہ]۔ بلکہ آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔ جب لوگوں نے آپ کو حکمران بنادیا تو آپ تجارت چھوڑ کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ تو آپ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ مال اللہ اور اس کے رسول کے حصہ [خمس] سے کھایا کرتے تھے؛ کسی مخلوق کے مال سے کبھی کچھ نہیں کھایا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کبھی بھی مال غنیمت میں سے کوئی چیز بطور خاص نہیں دیا کرتے تھے؛ بلکہ جیسے عام مسلمان مجاہد کو غزوات میں حصہ ملتا ایسے ہی آپ کو بھی ملا کرتا تھا۔ بلکہ آپ سے مال لیکر اسے لوگوں پر خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے استعمال تو کیا مگر کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کوئی چیز بطور خاص دی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے عطیہ دیا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال فتنے میں سے دیا؛ اور ایسے ہی نئے مسلمانوں اور مؤلفۃ القلوب کو اور آزاد کردہ لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اہل نجد کو بھی دیا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ جیسا کہ غزوہ حنین اور بعض دوسرے مواقع پر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میں کچھ لوگوں کو دیتا اور کچھ لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ جس انسان کو میں کچھ نہیں دیتا وہ میرے نزدیک ان لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب ہے جنہیں میں کچھ دیتا ہوں۔ اور میں ان لوگوں کو دیتا ہوں جن کے دلوں میں کچھ ملال یا کمزوری ہے۔ اور جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے تو نگری اور خیر رکھی ہے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتا ہوں۔“

جب آپ کو یہ اطلاع ملی کہ انصار عطیات کے بارے میں کچھ چمی گویاں کر رہے ہیں، تو آپ نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا؛ تو انہوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے جو لوگ صاحب الرائے انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا؛ ہاں کچھ نوجوان چھوڑوں سے ایسی باتیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا: اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو معاف فرمائے، آپ قریش کو دے رہے ہیں اور ہمیں خالی چھوڑ رہے ہیں جب کہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میں کفر سے نئے مسلمان ہونے والوں کو ان کی تالیف قلبی کے لیے دیتا ہوں۔ کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ لوگ مال لے کر واپس جائیں اور تم اپنے گھروں کو رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لیکر جاؤ۔ اللہ کی قسم! جو چیز لے کر تم واپس جاؤ گے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو وہ لوگ لیکر واپس اپنے گھروں کو جائیں گے۔“

اس پر وہ بھی کہنے لگے: ”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! ہم اس پر راضی ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم لوگ میرے بعد بہت زیادہ تو نگری دیکھو گے؛ تو تم صبر کرنا یہاں تک کہ اللہ اس کے رسول سے حوض پر ملاقات کرو۔“ انصار نے عرض کیا: ”تو پھر ہم صبر کریں گے۔“ [صحیح مسلم: ۲۴۲۹]

نیز آیت کریمہ:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۖ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۖ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَكَ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۖ﴾ (اللیل: ۲۱-۱۷)

”اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے۔ جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب عالی مقام کی رضا جوئی کے لئے (یہ کرتا ہے)۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضا مند ہو جائے گا۔“

اس میں مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ: یہ ”اتقی“ عطیات دینے میں صرف ان لوگوں پر انحصار نہیں کرتا جن کا ان پر کوئی احسان ہے؛ اس لیے کہ لوگوں کا آپس میں ایسا کرنا تو عدلاً واجب ہے جو کہ خرید و فروخت اور اجرت کی منزلت پر ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایسا کرنا ہر ایک پر واجب ہے۔ اور اگر کسی انسان کا کوئی قابل معاوضہ [بدلہ] احسان نہ ہو تو پھر اس قسم کے معاوضہ [برابری کے سلوک] کی ضرورت نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں عطاء خالص اللہ کی رضا کے لیے ہوگی۔ بخلاف اس شخص کے جس پر کسی کا کوئی احسان ہو تو وہ بدلہ چکانے کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کا سلوک کرے۔ لیکن جس شخص پر کسی کا کوئی ایسا احسان نہیں ہے جس کا اسے بدلہ دیا جائے تو جب یہ شخص اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو یہ صرف اپنے تزکیہ نفس کے لیے ہوگا۔ اس لیے کہ یہ انسان ہمیشہ لوگوں کو ان کے معاملات میں پورا پورا بدلہ دیتا ہے؛ ان کی مدد کرتا اور انہیں جزاء سے نوازتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اسے مال عطا کرتا ہے تو وہ اسے تزکیہ کے لیے خرچ کرتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ دے رہا ہو۔

نیز اس آیت میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ: یہ فضیلت اس انسان کی ہے جو معاوضات میں سے واجبات کی ادائیگی کے بعد خرچ کر رہا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرہ: ۲۱۹]

”آپ سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں، تو آپ کہہ دیجئے حاجت سے زیادہ چیز۔“

پس جس پر قرض یا دوسرے فرائض ہوں پہلے وہ ادا کرے گا وہ صدقہ کو ان واجبات پر مقدم نہیں کریگا۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو کیا اس کا صدقہ واپس کر دیا جائے گا؟ اس مسئلہ میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے ہاں دو قول معروف ہیں۔

اس آیت سے وہ لوگ استدلال کرتے ہیں جو صدقہ واپس کرنے کا کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کی تعریف کی ہے جو اپنا مال تزکیہ نفس کے لیے خرچ کرتا ہے اور اس پر کسی کا قابل معاوضہ [یا بدلہ] احسان نہیں ہوتا۔ اگر اس پر کسی انسان کا احسان تو ضروری ہے زکوٰۃ کا مال نکالنے سے پہلے بدلہ چکانے سے پہلے اس مال کو تزکیہ کے لیے خرچ کر دیا تو اس کا یہ فعل قابل تعریف نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا یہ عمل مردود ہوگا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ہے: ”جس کسی نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو اس کا وہ کام مردود ہوگا۔“
تیسری بات: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”مجھے اور کسی کے مال سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے حاصل ہوا۔“^①

نیز فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت و رفاقت اور صرف مال کے احسانات مجھ پر سب سے زیادہ ہیں۔“^②

بغلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے: نبی کریم ﷺ نے ان کے کسی قسم کا انفاق فی سبیل اللہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اور یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شروع اسلام کے ایام میں سات ایسے لوگوں کو خرید کر آزاد کیا تھا جن کو اسلام لانے [اور ایمان قبول کرنے] کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔^③ آپ نے یہ کام صرف اللہ رب ذوالجلال کی رضامندی کے حصول کے لیے کیا تھا۔ آپ کا یہ کارنامہ جناب ابوطالب کے کردار کی طرح نہیں تھا جنہوں نے صرف قرابت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی حمایت کی۔ ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی یا اس کی خوشنودی کا حصول نہیں تھا۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ”الاتقی“ اسم جنس ہے اس میں امت کے سبھی اعلیٰ تقویٰ رکھنے والے شامل ہیں؛ اور ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ کرام جلیل القدر اور خیر القرون کے لوگ ہیں۔ وہی اس امت کے سب سے بڑے متقی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور امت کے اہل تقویٰ کے سرخیل یا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے سرخیل ہیں؛ یا کوئی تیسرا انسان ہے۔ کسی تیسرے انسان کا ہونا بالاجماع منافی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ بھی اس قسم میں شامل ہیں۔

اس لیے کہ جب آپ کو مال حاصل ہو گیا تھا تو آپ تزکیہ و طہارت کے حصول کیلئے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شروع اسلام کے ایام میں اس وقت خرچ کیا کرتے تھے جب اس کی بہت سخت ضرورت تھی۔ پس آپ اس وصف اتقی میں دوسرے لوگوں سے بڑھ کر کامل و اکمل ہوئے۔

مزید برآں یہ کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایسے مواقع پر آگے بڑھاتے تھے جہاں کسی دوسرے کی شراکت ممکن نہیں ہو کرتی تھی؛ جیسے نماز اور حج میں اپنا نائب بنانا؛ سفر ہجرت میں اپنی ہمراہی کے لیے صرف ان کا انتخاب کرنا؛ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ کا تقریر کرنا؛ آپ کو تقریر کی اجازت ملنا؛ نیز فتویٰ دینا اور رسول اللہ ﷺ کا اس پر رضامندی کا اظہار کرنا؛ اور ان کے علاوہ دیگر اتنے خصائص ہیں جن کا یہاں پر بیان طوالت کا موجب ہوگا۔

جو انسان ان اوصاف میں اکمل ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا اور محبوب ہوگا۔ یہ بات بے شمار دلائل کی روشنی میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام صدیقیت میں تمام صحابہ کرام سے بڑھ کر عزت والے اور مقدم تھے۔ اور آپ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین ہستی ہیں۔ اور جو ان اوصاف میں کامل ہو وہی افضل ہوگا۔

نیز یہ کہ صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

① الترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب ۱۵/۳۴، (ح: ۳۶۶۱)، سنن ابن ماجہ۔ المقدمة۔ باب فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح: ۹۴)۔ ② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ ”سدوا الابواب الا باب ابی بکر“ (ح: ۳۶۵۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۸۲)۔ ③ مستدرک حاکم (۲/۲۸۴)، سیرۃ ابن ہشام (ص: ۱۴۷)۔

”نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت کے افضل ترین لوگ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“

یہ بات اتنی مشہور ہے کہ حد تو اتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور آپ نے ایسے انسان کو کوڑے لگانے کی وعید سنائی تھی جو افتراء پر دازی کرتے ہوئے آپ کو ان حضرات پر فضیلت دے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے سنی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ بات دو ٹوک طور پر اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جب آپ کو اس کا علم حاصل ہو چکا ہو۔

مزید برآں یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تقدیم دینے پر اجماع ہے، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان دونوں سے افضل ہیں۔ کئی دوسرے مواقع پر یہ مسئلہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ جس کا کچھ حصہ یہاں بھی گزر چکا ہے۔ لیکن یہاں پر اس کا ذکر پرندہ والی حدیث کے جھوٹ کو طشت از باہم کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نویں حدیث (سلام امارت)]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں نویں حدیث وہ ہے جسے جمہور علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ نے صحابہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر المؤمنین ہونے کی وجہ سلام بھیجنے کا حکم دیا اور فرمایا: آپ سید المسلمین امام المتقین اور پانچ کلینے گروہ کے قائد ہیں؛ اور فرمایا: آپ میرے بعد ہر مؤمن کے ولی ہیں۔ نیز آپ کے حق میں یہ بھی فرمایا کہ: ”یشک علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں“ اور آپ ہر مؤمن مرد و عورت کو اس کی جان سے بڑھ کر محبوب و مقدم ہیں۔ پس ان نصوص کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ و امام ہوں گے۔ یہ روایت اس باب میں واضح ہیں۔“ [ابھی کلام اراغی]

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہات سے دیا گیا ہے:

پہلا جواب: ہم شیعہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد بیان کریں اور اس کی صحت ثابت کریں۔ شیعہ مصنف نے اپنی عادت کے مطابق اس روایت کو کسی بھی کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”اسے جمہور نے روایت کیا ہے۔“ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت حدیث کتب صحاح اور قابل اعتماد مسانید و سنن اور دوسری معتد کتب میں موجود نہیں۔ اگرچہ اسے بعض اندھیری رات کے مسافروں نے روایت بھی کیا ہے؛ تو اس جیسی اور بھی روایات انہوں نے جمع کی ہیں۔ اس جیسی روایات با اتفاق مسلمین حجت نہیں ہو سکتیں کہ لوگوں پر ان کی اتباع واجب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر جھوٹ بولنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات نہیں کہہ سکتے جو ہم جانتے نہ ہوں۔ نبی کریم ﷺ سے تو اتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

((من کذب علی متعمداً فلیتوبوا مقعدہ من النار))۔

”جو انسان مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے“ اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں بنا لے۔“

دوسرا جواب: اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر وہ انسان جسے علم

حدیث کی معمولی سی بھی معرفت ہو وہ جانتا ہے کہ یہ روایت محض جھوٹ ہے؛ اہل علم محدثین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی قابل اعتماد سے روایت نہیں کیا۔ اور نہ ہی صحاح ستہ؛ سنن؛ اور قابل اعتماد مسانید میں اس کا کوئی وجود ہے۔

تیسرا جواب: [اسکی اسناد میں متہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں]۔ بلکہ علماء حدیث اس سے بڑھ کر اسے موضوع قرار دیتے ہیں اور اسے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس حکایت کا روایت کرنے والا بڑا جھوٹا انسان ہے۔ اور نبی کریم ﷺ جھوٹ سے منزہ اور بری ہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی شخص سید المسلمین اور امام المتقین نہیں ہو سکتا؛ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

”اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے سردار ہوں گے۔“

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”مذکورہ روایت میں ایسے الفاظ موجود نہیں جو اس تاویل پر دلالت کرتے ہوں کہ علی رضی اللہ عنہ میرے بعد امام المسلمین ہوں گے۔ بلکہ روایت اس تاویل کیخلاف ہے۔ اس لیے کہ خیر المسلمین و المتقین وقائد غر المحجلین“ قرن اول کے مسلمان تھے۔ اس دور میں تو نبی کریم ﷺ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا ان کا قائد و سید اور امام و سردار نہیں تھا۔ تو پھر آپ کیسے ایسی چیز کی خبر دے سکتے ہیں جو ابھی تک موجود نہ ہو۔ اور پھر اس خبر کو بھی ایسے ہی تشنبہ چھوڑ دیا جائے حالانکہ وضاحت کے ساتھ اس کے بیان کی بہت ہی سخت ضرورت بھی ہو۔

اور نبی کریم ﷺ ہی بروز قیامت مسلمانوں کے قائد ہوں گے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کن لوگوں کی قیادت کریں گے؟ نیز یہ کہ جب سب مسلمان شیعہ کی نگاہ میں کافر و فاسق ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کس کی قیادت کریں گے؟ صحیح احادیث میں ثابت نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

((وَدِدْتُ أَنَا قَدْرَ إِيْنَا إِيْنَا)) . قالوا: أولسنا إِيْنَا يا رسول الله؟ . قال: ((أنتم أصحابي؛ وإِيْنَا الذين لم يأتوا بعد)) . فقالوا: كيف تعرف من لم يأت بعد من أميتك يا رسول الله؟ . فقال: ((أرأيت لو أن رجلا له خيل غر محجل بين ظهري خيل دهم بهم لا يعرف خيله؟)) . قالوا: بلى يا رسول الله! . قال: ((فإنهم يأتون غر محجلين من الوضوء؛ وأنا فرطهم على الحوض؛ ألا ليذاذن رجال عن حوضي؛ كما يذاذ البعير الضال أناديهم ألا هلم . فيقال: إنهم قد بدلوا بعدك فأقول سحقا سحقا))

”میں چاہتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: ”تم میرے صحابہ ہو، میرے بھائی ابھی تک نہیں آئے۔“ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ اپنی امت کے ان لوگوں کو کیسے پہچانیں گے جو ابھی تک نہیں آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بھلا تم دیکھو اگر کسی شخص کی سفید پیشانی والے سفید پاؤں والے گھوڑے سیاہ گھوڑوں میں مل جائیں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو ان میں سے پہچان نہ لے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”وہ لوگ جب آئیں گے تو وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے چہرے؛ ہاتھ اور پاؤں چمکدار اور روشن ہوں گے اور میں ان

سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا۔ اور سنو بعض لوگ میرے حوض سے اس طرح دور کئے جائیں گے جس طرح بھٹکا ہوا اونٹ دور کر دیا جاتا ہے؛ میں ان کو پکاروں گا ادھر آؤ تو مجھ سے کہا جائیگا کہ: انہوں نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد دین کو بدل دیا تھا تب میں کہوں گا دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔“^①

مذکورہ صدر حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص وضو کرتے وقت اپنا منہ اور ہاتھ پاؤں دھوتا ہے وہ بروز قیامت ان لوگوں میں سے ہوگا جن کے ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ان جہور مسلمانوں کے آگے آگے ہوں گے۔ اس کے مصداق شیعہ کے سوا آپ کی جمہور امت ہے، چونکہ شیعہ وضوء کرتے وقت پاؤں نہیں دھوتے۔ لہذا ان کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔ اس لیے سرور کائنات ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بروز قیامت ان کی قیادت بھی نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی انہیں سفید پاؤں والوں کے ساتھ چلایا جائے گا۔ اس لیے کہ [حدیث میں مذکور] جملہ [سفید نشان] پاؤں کی پشت میں ہوتا ہے۔ پاؤں میں یہ نشان ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہاتھ میں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”ایڑیوں اور پاؤں کی اندرونی جانبوں کو آگ کی وجہ سے بڑی تکلیف کا سامنا ہوگا۔“^②

[حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وضو کرتے وقت پاؤں کا جو حصہ خشک رہے وہ آگ میں جلے گا۔] یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ٹھل گھوڑا وہی ہوتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں پر سفیدی کا نشان ہو ورنہ اسے ٹھل نہیں کہتے۔ ثابت ہوا کہ مسح پاؤں اور ہاتھ کی سفیدی والے کو کہتے ہیں۔ بنابرین جو شخص اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک نہیں دھوتا۔ بروز قیامت اس کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔ پس سفید نشان والوں کے قائد بھی ان لوگوں سے برأت کا اظہار کریں گے؛ بھلے یہ کوئی بھی لوگ ہوں۔

نیز جس حقیقت واقعی سے اس روایت کا جھوٹ واضح ہوتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کا امام؛ سردار اور قائد قرار دینا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ اعلانیہ اور واضح طور پر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیا کرتے تھے اس کی حد یہ ہے کہ خاص وعام [اہل ایمان ہی نہیں] بلکہ مشرکین بھی اس سے آگاہ تھے۔

احد کے موقع پر ابوسفیان نے تین مرتبہ کہا کہ: کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اس کا جواب دینے سے منع کر دیا تھا۔ پھر ابوسفیان نے تین مرتبہ کہا کہ: ”کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟“ (یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ)۔ اور پھر تین مرتبہ کہا کہ: کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ اور پھر اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ: ”یہ تو سب مارے گئے۔“ جس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو نہ روک سکے اور کہا کہ: ”اے اللہ کے دشمن اللہ کی قسم! جن لوگوں کا تو نے نام لیا ہے وہ سب زندہ ہیں۔ اور جس بات سے تم رنجیدہ ہو وہ برقرار ہے۔“

① مسلم۔ کتاب الطہارۃ، باب استحباب اطالۃ الغرۃ (ح: ۲۴۹) سنن نسائی (۱۵۰)، سنن ابن ماجہ (۴۳۰۶)۔

② مسند احمد (۱/ ۱۹۱)، موقوفاً و مرفوعاً۔ صحیح ابن خزيمة (۱۶۳)، مرفوعاً و علقہ الترمذی فی کتاب الطہارۃ، باب ماجاء ”وَبَلَّ لَا عَقَابَ مِنَ النَّارِ“ (تحت الحديث: ۴۱)۔

یہ کفار کا سالار اعلیٰ ہے؛ اس انتہائی خطرناک موقع پر صرف نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہی پوچھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کو علم ہے اور ہر خاص و عام جانتا ہے کہ یہی تین شخصیات اس سارے معاملے کا بنیادی کردار ہیں اور یہ معاملہ ان ہی کی وجہ سے قائم ہے۔ اس سے یہ بھی دلیل سامنے آتی ہے کہ کفار کے ہاں بھی یہ بات صاف ظاہر تھی کہ آپ ﷺ کے وزیر یہی دو شخص ہو سکتے ہیں۔ اور اس معاملہ [یعنی دعوت اسلام کی تبلیغ] کو یہی حضرات اس کی آخری حدود تک لیکر جاسکتے ہیں۔ اور باقی تمام لوگوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اور اسلام کی نشر و اشاعت میں ان حضرات کی وہ خدمات ہیں جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ اتنی بات مسلمان تو کجا، کفار تک بھی جانتے تھے۔ اس طرح کی احادیث بھی بہت زیادہ کثرت کے ساتھ اور تو اتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

”جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نقش لوگوں کے سامنے لائی گئی تو جنازہ اٹھانے سے لوگوں نے اس کو گھیر لیا؛ وہ آپ کے حق میں دعا کرنے اور آپ کی مدح و ستائش کرنے لگے۔ میں بھی ان لوگوں میں موجود تھا؛ مجھے کوئی خیال ہی نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں رحمت کی دعا کی اور فرمایا تو نے اپنے پیچھے کسی آدمی کو نہیں چھوڑا کہ جس کے اعمال کو لے کر میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہونا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہو۔ ہاں اللہ کی قسم! میرا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں ساتھیوں (نبی کریم ﷺ اور ابوبکر) کے ساتھ ملا دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر سرور کائنات کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے۔“ مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں ساتھیوں کی ملاقات نصیب کرے گا۔“^①

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت و فضیلت کسی سے پوشیدہ نہ تھی یہی وجہ ہے کہ متقدمین شیعہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا؛ وہ آپ کے ساتھ انتہائی الفت و محبت رکھنے کے باوجود حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ان سے افضل قرار دیا کرتے تھے۔ سوائے چند ایک ملحدین کے کوئی آپ کو شیخین پر فضیلت نہیں دیتا تھا، البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں افضل تصور کرتے تھے۔

[شیعہ کا اشکال]: اسی طرح شیعہ کا یہ قول: ”هُوَ وَلِيُّ كُلِّ مَوْمِنٍ بَعْدِي۔“

[جواب]: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے دوست ہیں۔“ نبی کریم ﷺ پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ بلکہ نبی ﷺ

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد (حدیث: ۴۳: ۴۰) امام بخاری اور دوسرے محدثین نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ حدیث ذکر کی ہے [صحیح بخاری: ج 293]۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ابوسفیان نے صرف تینوں حضرات کے بارے میں سوال کیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ کفار صرف انہی تینوں کو اہمیت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے دوسروں کو نہیں۔

② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۶۸۵، ۳۶۷۷)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۳۸۹)۔
عبدالرزاق کا قول ہے کہ: ”میرے لیے یہی جرم کافی ہے کہ میں علی سے محبت کا دعویٰ کروں اور ان کے اس قول کی خلاف ورزی کروں کہ نبی ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“ اور اگر میں تیسرے خلیفہ کا نام لینا چاہوں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لوں گا۔“

جب بقیہ حیات تھے اور بعد از وفات ہر مومن کے دوست ہیں، اسی طرح ہر مومن زندگی میں اور بعد از وفات آپ کا دوست ہے۔ خلاصہ یہ کہ ولایت جو عداوت کی ضد ہے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ رہ گئی ولایت جو امارت کے معنی میں آتی ہے؛ اگر یہ مراد ہوتی تو آپ یوں فرماتے: ”هُوَ وَالِیُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدَیْ“ حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے امیر ہیں۔“

جیسا کہ نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف وارد ہوا ہے کہ جب والی اور ولی جمع ہو جائیں تو اس صورت میں نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کسے امام بنایا جائے گا؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: والی [امیر] کو امام بنایا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: میت کے ولی کو امام بنایا جائے گا۔

اور قائل کا یہ قول کہ: ”هُوَ وَلِیُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدَیْ“ حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے دوست ہیں۔“ یہ ایسا کلام ہے جس کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے مراد مولات [دوستی کے معنی میں] ہے تو پھر میرے بعد کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس سے مراد امارت ہے تو پھر آپ کو یوں فرمانا چاہیے تھا کہ: ”هُوَ وَالِیُّ عَلٰی كُلِّ مُؤْمِنٍ“ میرے بعد ہر مومن پر امیر ہوں گے۔“

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق: ”أَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ“ ”تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں“ بالکل صحیح ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں ثابت ہے۔ آپ نے یہ کلمات اس وقت فیصلہ کرتے ہوئے فرمائے جب آپ کے سامنے حضرت جعفر، حضرت زید بن حارثہ اور آپ رضی اللہ عنہم حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی کی تربیت کے بارے میں جھگڑا کرتے ہوئے پیش ہوئے۔ آپ نے اس کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں کیا؛ اور یہ خالہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ آپ نے فرمایا: ”خالہ ماں کی منزلت پر ہوتی ہے۔“

اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تم اخلاق میں اور شکل و صورت میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”أَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ“ ”تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں“ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ”أَنْتَ أَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا“ ”تم ہمارے بھائی اور ہمارے دوست ہو۔“^①

صحیحین میں آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: قبیلہ اشعری [حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ والوں] کی یہ عادت تھی کہ جب جنگ کے موقع پر زادراہ ختم ہو جاتا تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کو جمع کرتے پھر تقسیم کر لیا کرتے تھے یہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”هُمْ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُمْ“^② ”وہ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔“

جیسے نبی کریم ﷺ نے اشعریین کے لیے فرمایا: ”هُمْ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُمْ“، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”أَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ“ ”تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔“ حضرت جُلَیْبِیْب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة احد (حدیث: ۴۰۴۳)

② صحیح بخاری، کتاب الشریک، باب الشریکة فی الطعام والنہد (حدیث: ۲۴۸۶)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل الاشعریین، (حدیث: ۲۵۰۰)۔

”هَذَا مِنِّي وَآتَا مِنِّي“^① ”یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔“

مندرجہ بالا بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ان الفاظ سے مدح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ الفاظ نہ ہی امامت پر دلالت کرتے ہیں، اور نہ ہی جن اصحاب کے بارے میں یہ کلمات کہے گئے ہیں وہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہو سکتے ہیں۔

فصل:

حدیث غدیر خم

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں حدیث]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دسویں حدیث جو کہ جمہور علماء نے ذکر کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ”میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے، یعنی اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔“ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”میرے اہل بیت کشتی نوح کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ ڈوب گیا۔“

چونکہ یہ حدیث اہل بیت کے اقوال کے ساتھ تمسک کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل بیت کے سردار تھے، لہذا سب پر ان کی اطاعت واجب ہوگی اور وہی امام ہوں گے۔“ [انہی کلام اراغی]

جواب: اس کے جواب کے کئی پہلو ہیں:

① پہلا جواب: صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں:

”نبی کریم ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان تم نانی چشمہ کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اما بعد: ”اے لوگو! بیشک میں بھی بشر ہوں؛ ممکن ہے کہ میرے پاس میرے رب کا پیامبر آجائے اور میں اپنے رب کی دعوت قبول کر لوں؛ اور بیشک میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اس میں ہدایت اور نور ہے؛ کتاب اللہ کو تھام لو اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو۔“ آپ نے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی ترغیب دی؛ اور اس پر ابھارا۔ پھر فرمایا:

”اور میرے اہل بیت؛ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔“^②

① صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جلیبب ﷺ (حدیث: ۲۴۷۲)۔

② صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب ﷺ (حدیث: ۲۴۰۸)۔

پھر آپ نے فرمایا (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں، حضرت حصین نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے زید! آپ کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ کے اہل بیت میں سے ہیں، اور وہ سب اہل بیت میں سے ہیں کہ جن پر آپ کے بعد صدقہ (زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ) حرام ہے، حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان، حضرت عقیل کا خاندان، آل جعفر، آل عباس، حضرت عباس نے عرض کیا ان سب پر صدقہ وغیرہ حرام ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں! ان سب پر صدقہ، زکوٰۃ وغیرہ حرام ہے۔

یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کا حکم دیا، اور اس کیساتھ چٹے رہنے والے کو گمراہ نہ ہونے کی ضمانت دی؛ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں اسی طرح کے الفاظ آئے ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ نے خطبہ حجۃ الوداع نقل کیا ہے۔ اس خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اور میں تم میں ایک چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے۔ وہ ہے: اللہ کی کتاب۔ [قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا] اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے؟ انہوں نے کہا کہ: ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اللہ کے احکام کی تبلیغ کر دی؛ اپنا فرض ادا کر دیا؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیر خواہی کی۔“

”یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت والی انگلی کو آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے اور لوگوں کی طرف منہ موڑتے ہوئے فرمایا: ”اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ کلمات کہے۔“

اور آپ کے یہ الفاظ: ”وَعَتَرْتَنِي (اہل بیتی) وَأَنْتَهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ۔“

”اور میرے اہل بیت؛ اور بیشک یہ دونوں اس وقت جدا نہ ہوں گے یہاں تک حوض پر میرے پاس پہنچ جائیں۔“

یہ الفاظ ترمذی کی روایت میں پائے جاتے ہیں۔^① ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ضعیف کہا۔ ایسے ہی آپ کے علاوہ بھی بہت سارے اہل علم محدثین نے ان الفاظ کو ضعیف کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے: یہ الفاظ صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ اور بعض لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ: تمام اہل بیت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہ ہوں گے۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں؛ جیسا کہ قاضی ابویعلیٰ سے بھی منقول ہے۔^②

لیکن الحمد للہ کہ اہل بیت رافضی مذہب کی کسی ایک بات پر بھی کبھی متفق نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ ان کے مذہب اور ان کی من گھڑت شریعت سے بالکل بری ہیں۔

رافضی کا کہنا کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میرے اہل بیت کشتی نوح کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے

نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ ڈوب گیا۔“

اس حدیث کی کوئی صحیح سند نہیں اور نہ ہی حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں موجود ہے۔^③

① سنن ترمذی، کتاب المناقب۔ باب مناقب اہل بیت النبی ﷺ (حدیث: ۳۷۸۶)

② سنن ترمذی، حوالہ سابق (حدیث: ۳۷۸۸) عن ابی سعید و زید بن ارقم رضی اللہ عنہما۔

اس روایت کے نقل کرنے میں زید بن حسن انماطی مقفرد ہوا ہے۔ محدث ابو حاتم نے انماطی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ ترمذی نے ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں تم میں وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے ایک چیز دوسری سے بڑھ کر ہے۔ اللہ کی کتاب جو اللہ کی رسی ہے اور آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔ غور کرو کہ تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

③ مستدرک حاکم (۳/۳۳۳) طبرانی فی الکبیر (۲۶۳۲) والصحیر (۱۳۹/۱)، وسندہ ضعیف۔ اس کی سند میں مفصل بن صالح لضعیف راوی ہے۔

اگرچہ اسے بعض رات کے لکڑہاروں نے روایت بھی کیا ہو جو کہ من گھڑت اور ضعیف روایات کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کا روایت کرنا النان کے مذہب کے بودے پنے کی نشانی ہے۔

❁ دوسرا جواب [الزامی]: رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل بیت کے بارے میں فرمایا: ”میرے اہل بیت اور کتاب اللہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ میرے پاس حوض پر آجائیں۔ آپ صادق و صدوق ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ”لَنْ يَتَفَرَّقَا“ اس بات پر ولالت کرتا ہے کہ اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔ قاضی نے المعتمد میں ذکر کیا ہے کہ عشرت سے سب بنو ہاشم؛ مثلاً اولاد علی؛ واولاد عباس واولاد حارث بن عبدالمطلب اور تمام بنی ابوطالب مراد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف اکیلے ہی عترت نہیں ہیں۔ اور اہل بیت کے سردار نبی ﷺ تھے۔

❁ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل بیت کے علماء جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [اہل بیت میں سے فقیہ تر تھے اور بعض مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا کرتے تھے] حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے فتاویٰ کو کسی پر واجب نہیں ٹھہرایا کرتے تھے۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ہر فتویٰ کو لوگوں پر مسلط کیا کرتے تھے۔ اور نہ ہی ائمہ سلف۔ بنی ہاشم اور دوسرے اہل بیت۔ میں سے کسی ایک سے یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہر قول میں ان کی اطاعت کو واجب کہتے ہوں۔

❁ تیسرا جواب: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اہل بیت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت یا امامت و خلافت پر اجماع منعقد نہیں کیا تھا۔ بلکہ ائمہ اہل بیت جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو امامت و افضلیت میں آپ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہی حال تمام بنی ہاشم؛ عباسیہ، جعفریہ اور اکثر علویہ کا تھا۔ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی امامت کا اقرار کرتے تھے۔ اور ان میں سے کئی ایک ایسے بھی ہیں جو امام مالک، ابو حنیفہ شافعی اور احمد رحمہم کے ساتھی رہے ہیں۔ ان کی تعداد ان لوگوں سے بہت زیادہ ہے جنہوں نے امامیہ مذہب اختیار و ایجاد کیا۔

بنی ہاشم کے تمام علماء اہل بیت تابعین اور تبع تابعین جیسے حضرت حسن و حسین نیز علی بن حسین اور دوسرے حضرات بلا شک و شبہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کا دم بھرتے تھے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیا کرتے تھے۔ [حضرت زید بن علی ان کے بیٹے امام باقر اور پوتے جعفر صادق سب یہی عقیدہ رکھتے تھے] ان سے بتواتر نقل ہو کر یہ عقیدہ ہم تک پہنچا ہے۔ امام حافظ ابوالحسن دارقطنی رحمہ اللہ نے اس ضمن میں ایک کتاب ”ثناء الصحابہ علی القرابہ“ و ثناء القرابہ علی الصحابہ“ نامی تصنیف کی ہے۔ جس میں اس کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

ایسے ہی محدثین کرام رحمہم میں سے جن لوگوں نے بھی عقیدہ پر کتابیں تحریر کی ہیں جیسے ”السنۃ“ از عبد اللہ بن احمد؛ ”السنۃ“ از ابوبکر الخلال؛ ”السنۃ“ از ابن بطہ؛ ”السنۃ“ از علامہ آجری؛ ان کے علاوہ علامہ لاکائی؛ بیہقی؛ ابن زور الہروی؛ طلمنکی؛ ابن حفص بن شاہین؛ اور ان سے کئی زیادہ کتابیں جن کی طرف نسبت کیا جانا حجت رکھتا ہے جیسے کتاب ”فضائل الصحابہ“ از امام احمد بن حنبل؛ اور ابو نعیم؛ تفسیر ثعلبی وغیرہ؛ ان کتابوں میں اصحاب ثلاثہ کے اتنے زیادہ فضائل بیان ہوئے ہیں جو ان پر قائم حجتوں سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ اگر رافضی کے ذکر کردہ و لائل حجت ہیں تو باقی دلائل بھی اس پر اور اس

کے لیے حجت ہونے چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اسے ان کتابوں سے استدلال نہ کرنا چاہیے۔
 چوتھا جواب: یہ اعتراض اپنے سے قوی اولہ کے معارض ہے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں پوری امت کا اجماع بلا نزاع حجت ہے۔ اہل بیت امت کا ایک حصہ ہیں۔ امت کے اجماع سے اہل بیت کے اجماع کا ثابت ہونا لازم آتا ہے۔ اور اہل بیت کا اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل الصحابہ تھے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی بیان آئے گا۔ وہ گروہ جس کا اجماع حجت ہے؛ اس میں سے افضل ترین شخص کی اطاعت مطلق طور پر واجب ہے؛ اور اگر وہ [قابل اطاعت انسان] امام نہیں بن سکا [اور اس نے اپنی جگہ اپنے سے افضل کی بیعت کی] تو ثابت ہوا کہ پھر واجب الاطاعت امام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر شیعہ کا استدلال باطل ٹھہرا۔ اس لیے کہ اس قول کی بنیاد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پوری امت میں وہی نسبت حاصل ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت میں حاصل ہے۔

فصل:

[محبت علی رضی اللہ عنہ کا وجوب]

[امامت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں حدیث]:

[اشکان]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں گیارہویں روایت وہ ہے جو جمہور نے آپ کی محبت اور موالات کے وجوب پر نقل کی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ”جس نے ان دونوں سے اور ان دونوں کے والد سے اور ان دونوں کی والدہ سے محبت رکھی؛ وہ قیامت والے دن جنت میں میرے درجہ میں ہوگا۔“

اور ابن خالویہ رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص یا قوت کی ثننی کو پکڑنا چاہتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا پھر اسے عالم وجود میں آنے کا حکم دیا اور وہ ظہور پذیر ہوگئی تو اسے چاہیے کہ وہ میرے بعد علی رضی اللہ عنہ سے دوستی لگالے۔“

ابو سعید سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تمہاری محبت علامت ایمان ہے اور تمہارا بغض نفاق کا موجب ہے۔ تیرے محبت سب سے پہلے جنت میں جائیں گے اور تجھ سے عداوت رکھنے والے سب سے پہلے جہنم واصل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قابل بنایا ہے۔ سو آپ مجھ سے ہیں اور میں آپ سے ہوں۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔“

حضرت شقیق بن سلمہ حضرت عبداللہ سے روایت کرتے ہیں: انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ اور یہ فرما رہے تھے: ”یہ میرا دوست ہے“ اور میں اس کا دوست ہوں“ میں اس سے دشمنی کا اعلان کرتا ہوں جو اس سے دشمنی رکھے؛ اور جو اس سے صلح کرے“ اس سے صلح کا اعلان کرتا ہوں۔“

اور خطیب خوارزمی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”ابھی ابھی جبریل میرے پاس ایک سبز ورقہ لیکر آئے؛ جس میں سفید خط کے ساتھ لکھا ہوا تھا: ”یشک میں نے اپنی مخلوق پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو فرض کر دیا ہے؛ آپ ان کو میری طرف سے یہ پیغام پہنچادیں۔“

اس باب میں احادیث کثرت تعداد کی وجہ سے شمار سے باہر ہیں، ان کی اسناد کثرت کے ساتھ ہیں۔ اور یہ احادیث آپ کی افضلیت پر اور امامت کے استحقاق پر دلالت کرتی ہیں۔“ [ابھی کلام رافضی]

[جواب]: اس کے جواب کے کئی پہلو ہیں:

پہلا جواب: ہم ان سے ان روایات کی صحیح اسناد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہائے افسوس! انہیں یہ اسناد کہاں سے میسر ہوگئی؟

دوسرا جواب: ”شیعہ کا یہ کہنا کہ: امام احمد نے روایت کیا ہے۔“ ہم کہتے ہیں کہ: صرف امام احمد رضی اللہ عنہ کی کتاب مسند احمد اور فضائل صحابہ مشہور ہیں۔ فضائل صحابہ میں آپ نے وہ احادیث نقل کی ہیں جو مسند میں نہیں لائے۔ ان میں ضعیف روایات بھی ہیں؛ اس لیے یہ روایات مسند میں نقل کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اس لیے کہ یہ روایات یا تو مرسل تھیں یا پھر مرسل نہیں تھیں مگر بہت ہی ضعیف تھیں۔ پھر اس کتاب میں آپ کے بیٹے عبداللہ نے بھی کچھ روایات زیادہ کی ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے کے شاگرد قطعی نے بھی اس میں کچھ روایات اپنے شیوخ سے زیادہ کی ہیں۔ اہل معرفت محدثین کا اتفاق ہے کہ اس میں موضوع احادیث بھی موجود ہیں۔

پس یہ رافضی اور اس کے امثال دوسرے شیوخ الرافضہ جہالت کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ اس کتاب سے روایت کرتے ہوئے یہ تمیز نہیں کر پاتے کہ عبداللہ اور قطعی کی روایات کونسی ہیں؟ وہ ان کو بھی امام احمد رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ امام احمد اور قطعی کے شیوخ کے مابین تمیز بھی نہیں کر پاتے۔ پھر ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مسند میں جو بھی روایت ہے وہ امام احمد کی ہی روایت ہے۔ میں نے ان کی بہت ساری کتابوں میں دیکھا ہے کہ ایسے روایات امام احمد رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو امام احمد نے کبھی بھی سنی ہی نہ ہوں گی۔ جیسا کہ ابن بطریق اور ”الطرائف“ کے مصنف کے علاوہ دوسروں نے بھی کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی جہالت ہے۔ یہ ان کے من گھڑت جھوٹوں کے علاوہ ہے؛ ان کے جھوٹ تو بے شمار اور لاتعداد ہیں۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ تو امام احمد رضی اللہ عنہ کے کسی روایت کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے؛ اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ بلکہ امام احمد رضی اللہ عنہ نے ایسی بہت ساری روایات ایسی نقل کی ہیں جن کے جمع کرنے مقصد لوگوں کو ان کی پہچان کروانا اور ضعف بتانا ہوتا ہے۔ آپ کے کلام اور جوابات میں یہ بات اتنی وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس میں مزید کسی تفصیل یا بیان کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس عظیم الشان اصل کے باب میں۔ مگر یہ روایت ہرگز امام احمد رضی اللہ عنہ نے ذکر نہیں کی، بلکہ القطعی نے کتاب الفضائل میں اس کا اضافہ کیا ہے۔ اس نے یہ روایت نصر بن علی الجہضمی سے؛ اس علی بن جعفر سے؛ اس نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے نقل کیا۔ دوسری حدیث کو امام ابن جوزی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ”الموضوعات“ میں موضوع قرار دیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایت من گھڑت اور جھوٹ ہے۔“

جب کہ اہل علم محدثین کا اتفاق ہے کہ ابن خالویہ کی روایت سے بھی حدیث کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہی حال خطیب خوارزمی کی روایات کا ہے۔ اس کی روایات من گھڑت جھوٹ ہوتے ہیں۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ سب سے برے اور ناروا جھوٹ اسی کے ہوتے ہیں۔

❖ دوسری وجہ: ابن خالویہ کی روایات کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے پر اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔ وہ علم ضروری کے طور پر یہ بات جانتے ہیں اور دو ٹوک یقین کے ساتھ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھرا گیا ہے۔ حدیث کی وہ قابل اعتماد کتب جیسے: صحاح، مسانید اور سنن اور معجمات اور اس طرح کی دوسری کتب جن پر علماء حدیث کا اعتماد و اتفاق ہے، ان میں اس روایت کا نام و نشان تک بھی نہیں۔

❖ تیسری وجہ: جو انسان اس روایت کے الفاظ پر غور کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ کہ [نبی کریم ﷺ نے فرمایا]: ”جو شخص یاقوت کی ٹہنی کو پکڑنا چاہتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا پھر اسے عالم وجود میں آنے کا حکم دیا اور وہ ظہور پذیر ہو گئی۔“ یہ خرافات قسم کا کلام ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے یہ بات سن لی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اور پھر اس سے کہا: ہو جا، تو وہ ظہور پذیر ہو گیا۔ تو اس یاقوت والی بات کو خلق آدم پر قیاس کر لیا۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا، اور پھر کہا گیا: ”ہو جا۔“ تو آپ [زندہ شکل میں] پیدا ہو گئے [ظہور پذیر ہو گئے]۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونک دی تھی۔ جب کہ یہ ٹہنی صرف پیدا کرنے سے ہی مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی ایسا حال نہیں تھا جس کے لیے کہا جاتا کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتی۔ اور اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یاقوت کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ بلکہ بہت ساری روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے صرف تین چیزیں پیدا کی ہیں: ۱۔ آدم ۲۔ قلم ۳۔ جنت عدن۔ پھر باقی ساری مخلوق سے فرمایا: ”ہو جا“ تو وہ ہو گئی۔ اس میں یاقوت کا کہیں پر کوئی تذکرہ نہیں۔ پھر یاقوت کے اسماک میں کون سی ایسی چیز ہے جس پر اتنے بڑے انعام کا وعدہ کیا جا رہا ہو؟

[اشکال]: شیعہ مصنف نے نبی کریم ﷺ کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”تجھ سے بغض رکھنے والے سب سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ یہ صریح جھوٹ ہے، کوئی مسلمان یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خوارج و نواصب فرعون و ابوجہل بن ہشام، ابولہب اور ان کے امثال دوسرے مشرکین سے پہلے دوزخ میں جائیں گے؟ اور ایسے ہی یہ قول کہ: ”تیرے محب سب سے پہلے جنت میں جائیں گے اور تجھ سے عداوت رکھنے والے سب سے پہلے جہنم واصل ہوں گے۔“

[جواب]: کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ انبیاء کرام اور مرسلین علیہم السلام کے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کا سبب اللہ اور اس کے رسول اور دوسرے تمام انبیاء و مرسلین کی محبت کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہے۔ جب کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اور کیا نیک بختی اور بد بختی میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو چھوڑ کر صرف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا اتنا ہی کردار نہیں ہے جتنا حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما کی محبت کا ہے؟ اگر کوئی انسان یوں کہے کہ: جو کوئی حضرت عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما سے محبت کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو کوئی انسان ان سے بغض رکھے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا؛ تو اس کا یہ کلام بھی شیعہ کے کلام کی جنس سے ہی ہوگا۔

[یا کوئی مسلم یہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے کہ غالی اسماعیلیہ جھوٹے روافض اور فاسق امامیہ حب علی کی بنا پر انبیاء کرام سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے؟ یہ بات تو اسی طرح ہے جیسے کوئی ناصبی کہے جو شخص یزید و حجاج سے محبت رکھتا ہو یا خارجی کہے جو ابن ملجم کو چاہتا ہو وہ جنت میں جائے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔]

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارہویں حدیث]

[اشکان]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”خطیب خوارزمی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ناپسند کرتا ہو وہ کافر ہے اور اللہ و رسول کے خلاف جنگ آزمائی کر رہا ہے۔ اور جو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ میں شک کرتا ہو وہ بھی کافر ہے۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”میں اور علی رضی اللہ عنہ بروز قیامت اپنی امت پر حجت ہوں گے۔“

معاویہ رضی اللہ عنہ بن حیدہ القشیری کہتے ہیں کہ: ”میں نے نبی کریم ﷺ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہتے سنا کہ جو شخص آپ سے عداوت رکھتے ہوئے مر جائے تو پرواہ نہ کریں کہ وہ یہودی مرا ہے یا نصرانی۔“ [اسی کلام الراضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی پہلو ہیں:

اولاً:..... ہم شیعہ سے ان روایات کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ بر سبیل تنزل کے۔ اس لیے کہ خطیب خوارزمی کا کسی روایت کو نقل کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کلام کا رسول اللہ ﷺ کافر مودہ ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ یہ تو اس صورت میں ہے اگر کسی کو یہ علم نہ ہو کہ اس کی جمع کردہ کتاب میں کتنی ہی جھوٹی اور من گھڑت روایات ہیں۔ کیوں کہ اس کی تصانیف موضوعات کا پلندہ ہیں۔ جن کو دیکھ کر ایک حدیث دان شخص حیرت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ”سبحانک هذا بہتان عظیم۔“

ثانیاً:..... ہر وہ انسان جسے حدیث سے شغف ہو وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ روایات رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ہیں۔ ثالثاً:..... وہ حقیقت شناس شخص جو واقعات سے آگاہ ہو اور آثار و اقوال میں مہارت رکھتا ہو اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس قسم کی احادیث کذاب راویوں نے عصر صحابہ و تابعین کے اختتام کے بعد وضع کر لی تھیں۔ ان روایات میں صحابہ و تابعین کا ذکر کہاں ہے؟ اور کس کتاب میں انہوں نے یہ روایت کیا ہے؟ پس یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایات خیر القرون کے بعد اپنی طرف سے گھڑ کر [ان کی طرف منسوب کر] لی گئی ہیں۔

راہاً..... ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ان موضوع روایات کی نسبت اس بات کا قطعی و حتمی علم حاصل ہے کہ مہاجرین و انصار اللہ و رسول کو چاہتے تھے اور رسول ﷺ ان کو چاہتے تھے۔ ہم بہ اذعان و ايقان جانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ با اتفاق صحابہ آپ کے بعد امام قرار پائے تھے، پھر ہم ان یقینی اور متواتر روایات کو چھوڑ کر شیعہ کی ان روایات کا ذبہ کی بنا پر کس طرح جھٹلا سکتے ہیں جو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انہیں خبر واحد قرار دیا جاسکے۔ خصوصاً جب کہ ہمیں ان روایات کے کاذب ہونے کا بخوبی علم بھی ہے۔ بلکہ اہل علم محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ روایات نبی کریم ﷺ پر سب سے بڑا جھوٹ ہیں۔ اس لیے کہ یہ روایات کسی معتمد کتاب میں باسناد صحیح موجود نہیں۔ بلکہ تمام محدثین انہیں جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے چلے آئے ہیں۔

[شیعہ مرویات ناقابل اعتماد:]

خاصاً:..... اس پر مزید یہ کہ قرآن کریم جگہ جگہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار سے رضا مندی کا اظہار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [التوبة ۱۰۰]

”اور جو مہاجرین اور انصار سابق ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلْ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ [الحديد ۱۰]

”تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح ۲۹]

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھ گارکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔“

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح: ۱۸]

”اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔“

نیز فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾

(الحشر: ۸)

”ان متکدست مہاجرین کے لیے جن کو اپنے گھریار سے نکالا گیا وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں۔“

اور اس قسم کی دیگر آیات قرآنہ۔ پس جو چیز ہمیں قرآنی دلائل کی روشنی میں یقینی طور پر معلوم ہے، اسے ہم ان جھوٹی روایات کی وجہ سے کیسے رد کر سکتے ہیں کہ جن روایات کا گھڑنے والا نہ ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے وقار و عزت کا خیال رکھتا ہے۔

ساداً..... ظاہر ہے کہ ان نصوص قطعیہ کو شیعہ کی جھوٹی روایات کی بنا پر کیوں کر ترک کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ شیعہ کی بعض مرویات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح وارد ہوتی ہے اور ان سے وجوباً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والے تھے۔ ان روایات کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کا مجروح ہونا لازم آتا ہے۔

[یعنی] جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ادعاء خلافت کی مخالفت کی تھی؛ وہ اس حدیث کی روشنی میں کافر ٹھہرے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان نصوص کے موجب عمل نہیں کیا۔ مثلاً نواصب؛ [جنہیں شیعہ کافر قرار دیتے ہیں جبکہ] حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو مسلم اور اہل ایمان تصور کرتے تھے۔

خارج جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا؛ وہ آپ کے بدترین دشمن تھے، مگر اس کے باوجود آپ نے ان پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ بلکہ آپ نے ان کو لونڈی غلام بنانے سے روکا اور ان کے مالوں کو حرام قرار دیا تھا۔ بلکہ آپ ان سے قتال کرنے سے پہلے ان سے یوں فرمایا کرتے تھے: ”تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم تمہیں اپنی مساجد میں آنے سے نہ ردکیں۔ اور ہمارے مال فتنے میں تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اور جب ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تو انھوں نے فرمایا: ”اگر میں زندہ رہا تو جیسے چاہوں گا اپنے خون کا فیصلہ کروں گا۔“ آپ نے ابن ملجم کو اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے کی وجہ سے فوری مرتد قرار دے کر قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ [اگر وہ مرتد ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے ان الفور قتل کرنے کا حکم صادر کرتے]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بتواتر نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے اہل جمل کا تعاقب کرنے سے منع کیا تھا۔ نیز اس بات سے بھی روکا تھا کہ ان کے زخموں کو قتل کیا جائے یا ان کا مال لوٹا جائے؛ یا ان کے بچوں کو جنگی قیدی بنایا جائے۔ اگر شیعہ کی ذکر کردہ روایات؛ جن کی روشنی میں یہ لوگ کافر تھے؛ ان کو ترک کرنے سے اگر کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اولین شخص تھے جنھوں نے ان احادیث کو جھٹلایا اور ان کے مقتضایہ پر عمل نہ کیا؛ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کافر ہوئے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کا جنازہ پڑھا تھا جنھوں نے جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔

آپ فرمایا کرتے تھے: ”ہمارے بھائیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی تلوار نے ان کو پاک کر دیا۔“

اگر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک کافر ہوتے تو آپ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھتے؛ اور نہ ہی انہیں اپنے بھائی قرار دیتے اور نہ ہی ان کے قتل کیے جانے کو ان کے گناہوں کی طہارت قرار دیتے۔

بالجملہ ہم اضطرابی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت سے یہ بات جانتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو کافر قرار نہیں دیتے تھے جو آپ کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ بلکہ نہ ہی جمہور مسلمین نہ ہی خلفاء ثلاثہ اور نہ ہی حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے ان میں سے کسی ایک کو کافر قرار دیا۔ اور نہ ہی علی بن حسین نے اور نہ ہی ابو جعفر نے ایسا کیا۔ اگر یہ لوگ کافر تھے تو ان نصوص کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ ایسے کریں جیسے خوارج نے کیا تھا کہ اگر خود ان کے قتال سے عاجز آگئے ہیں تو دارالاسلام کو چھوڑ کر کہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ اور اہل دارالاسلام پر کفر اور ارتداد کا حکم لگا دیتے۔ جیسا کہ بہت سارے رافضی شیوخ کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر واجب ہوتا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جب کفار ایمان نہیں لارہے تو پھر اپنے اور اپنے شیعہ کے لیے دارالارتداد و کفر کو چھوڑ کر ایک اور دار قائم کر لیتے۔ اور ان سے ایسے جدا ہو جاتے جیسے مسلمان مسلمانہ کذاب اور اس کے ساتھیوں سے جدا ہو گئے تھے۔

یہ اللہ کے نبی (محمد رسول اللہ ﷺ) ہیں۔ آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ میں انتہائی کمزور تھے۔ مگر اس کے باوجود کفار سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور کفار سے ایسے جدا اور ممتاز رہتے تھے کہ مسلمان اور کافر کی پہچان ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی ان لوگوں میں سے کتنے ہی ایسے تھے جنہوں نے کمزور ہونے کے باوجود حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اور وہ وہاں پر نصاریٰ سے جدا رہتے تھے۔ اور عیسائیوں کے سامنے اپنے دین کا اظہار کیا کرتے تھے۔

یہ دارالاسلام ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں سے بھرا ہوا ہے؛ مگر اس کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں سے جدا رہتے ہیں اور اپنے دین و مذہب کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک کرنے والا ہر انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے نزدیک کافر ہوتا؛ اور ان کے نزدیک صرف وہی شخص مؤمن ہوتا جو آپ کے رسول اللہ ﷺ کے بعد امام معصوم ہونے کا عقیدہ رکھنے والا ہوتا؛ اور جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے نزدیک مرتد ہوتا؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے دین کو بدل ڈالا؛ اور کافروں اور مؤمنوں کے درمیان کوئی فرق نہ کیا اور نہ ہی مرتدین اور مسلمانوں کے مابین کوئی تمیز کی۔

مان لیجیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے قتال کرنے سے عاجز آگئے تھے تو انہیں اپنے حلقہ اطاعت میں داخل نہ کر سکتے تھے؛ تو آپ کم از کم ان سے جدا گانہ حیثیت ثابت کرنے سے تو عاجز نہیں تھے۔ آپ خوارج سے بڑھ کر عاجز تو نہیں تھے جو کہ آپ کے لشکر میں بہت ہی کم تعداد میں تھے؛ مگر خوارج نے جماعت مسلمین کے دار کو چھوڑ کر اپنے لیے علیحدہ دار بنالیا تھا؛ وہ ان سے جدا ہو گئے اور ان پر کفر کا حکم لگایا۔ وہ صرف اپنے ساتھیوں کو ہی مؤمن قرار دیتے تھے۔

اور پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے کیونکر یہ حلال ہوتا کہ وہ مسلمانوں کی زمام کار ایسے مرتد کے سپرد کر دیتے جو یہود و نصاریٰ سے بھی برا ہو؟ جیسا کہ ان لوگوں کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعویٰ ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے ایمان پر رکھنے والا کوئی انسان ایسی حرکت کر سکتا ہے؟ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ آپ کوفہ میں ہی رہتے؛ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے جنگ نہ کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے آپ سے اپنی مراد طلب کی تھی۔ اگر آپ اپنے باپ کی جگہ پر

رہتے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے جنگ ہرگز نہ کرتے۔ [ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا حضرت حسن کے نزدیک کافر ہوتے تو آپ بخوشی ان کے حق میں سلطنت و حکومت سے دست بردار نہ ہوتے۔ خصوصاً جب کہ آپ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور لشکر جبار آپ کی پشت پناہی کے لیے بھی موجود تھا]۔ اور پھر نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کا کیا بنے گا جو آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

”بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان مصالحت کرائے گا۔“^①

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت۔ بشمول حضرت حسن رضی اللہ عنہ۔ یہ کہتے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اہل ایمان اور مرتدین کے درمیان صلح کرائی ہے؛ تو پھر معاملہ ویسے ہی ہوتا جیسے رافضی کہتے ہیں؛ اور یہ حدیث خود شان حسنی اور شان نبوی پر بہت بڑی جرح ہوتی۔ [اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مسلم قرار دیا ہے، مگر شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء مؤمن تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اعوان و انصار مرتد تھے۔ بنا بریں یہ مصالحت مؤمنین و مرتدین کے مابین وقوع پذیر ہوئی تھی]۔

پس اس سے ظاہر ہوا کہ اہل بیت پر سب سے بڑا طعن اور جرح کرنے والے خود رافضی ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اہل بیت سے دشمنی رکھتے ہیں؛ اور اہل بیت کی طرف ایسے برائیاں منسوب کرتے ہیں جن کا ارتکاب کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ رافضیوں کی جہالت و حماقت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

پھر طرفہ مناشہ یہ کہ: ایک طرف شیعہ کا دعویٰ ہے کہ امام معصوم بندوں پر الہی لطف و کرم کا آئینہ دار ہوتا ہے، تا کہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور ان پر رحم کیا جائے۔ مگر ان کے بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ امام علی رضی اللہ عنہ کے وجود سے بڑھ کر اہل زمین پر الہی عذاب کا مظہر کوئی اور نہیں رہا۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین بقول شیعہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے۔ اور جو لوگ آپ کے ہم نوا تھے وہ ہر طرح سے ذلیل و خوار اور مقہور رہے ہیں۔ جن کے پاس نہ ہی کوئی طاقت تھی اور نہ ان کی بات کی کوئی قدر و اہمیت تھی۔ [تو پھر اس امام کا فائدہ کیا ہوا؟]

اس کے دوش بدوش شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: امام کو پیدا کرنا مصلحت اور مہربانی ہے۔ بندوں کے حق میں مفید و سودمند کام انجام دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ اور امام کے بغیر دین و دنیا کی کوئی مصلحت پوری نہیں ہو سکتی۔ تو رافضیوں کے قول کے مطابق یہ کون سی صلاح ہے؟

پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: بیشک اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ ایسے امور سرانجام دے جو بندوں کے لیے ان کے دین و دنیا کی مصلحت میں ہوں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوارج کو شیعہ پر مسلط کرتا ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کر کے آپ کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں۔ انہیں وہاں پر اپنے دشمن کے خلاف جنگ کیلئے غلبہ اور استحکام نصیب ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ [اہل بیت اور] شیعہ کے ائمہ معصومین یہود و نصاریٰ اور دوسرے اہل ذمہ سے بڑھ کر خائف و ہراساں ہو جاتے ہیں۔]

① صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۷۰۴)۔

اور ڈر کے مارے ذمیوں کی طرح تقیہ کر لیتے ہیں] بلکہ اہل ذمہ تو بعض اوقات اپنے مذہب کا اظہار اعلان بھی کرتے ہیں؛ جب کہ یہ ائمہ جن کے بارے میں شیعہ کا دعویٰ ہے کہ یہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی جنت اور شہروں پر اس کا لطف و کرم ہیں۔ ان کے بغیر کوئی ہدایت نہیں مل سکتی۔ اور ان کی اطاعت کے بغیر کوئی نجات نہیں؛ اور ان کی اتباع کے بغیر کوئی سعادت نہیں۔ ان کا آخری امام ساڑھے چار سو سال [اب گیارہ سو سال] سے غائب ہے؛ کوئی بھی اپنے دینی یا دنیاوی امور میں اس سے کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکا۔ اور اس کے لیے دین کا اتنا اظہار کرنا بھی ممکن نہیں ہے جتنا یہود و نصاریٰ کے لیے ممکن ہے۔ [اس لیے ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ لطف و مصلحت کیا ہوئی جو شیعہ کے نزدیک اللہ پر واجب ہے؟]

یہی وجہ ہے کہ اہل علم ہمیشہ سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ: رافضیت زنادقہ اور طردین کی ایجاد ہے جو چاہتے ہیں کہ دین اسلام کو خراب کریں؛ مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے: ﴿وَيَأْتِيهِ اللَّهُ الْإِلَهَ أَنْ يُثَبِّتَهُ نُورًا وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ [توبہ: ۳۲] "اور اللہ تعالیٰ انکار کرتے ہیں مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔"

[ائمہ سے متعلق شیعہ کے بلند بانگ دعوے]:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تمام باتوں کا انجام کار جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی تکفیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطنی مذہب کی دعوت ان اصولوں پر قائم ہے۔

[شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ ائمہ اللہ کے بندوں پر اس کی جنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہدایت انہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور ان کی اطاعت کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ آخری امام ہنوز پردہ غیب میں ہے اور کسی نے بھی ان سے دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ رض زنادقہ کا اختراع کردہ ہے، یہی وجہ ہے کہ فرقہ باطنیہ والے اسب سے پہلے اپنے دام میں پھنسنے والوں کو شیعیت کی دعوت دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص اس کا قائل ہو جاتا ہے تو پھر وہ یوں کہنے لگتے ہیں کہ علی دیگر خلفاء کی طرح تھے، چنانچہ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جرح و قدح کا نشانہ بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب اس میں پختہ ہو جاتا ہے تو پھر باطنیہ اسے رسول پر اعتراضات وارد کرنا سکھاتے ہیں یہاں تک کہ وہ منکر رسول ہو جاتا ہے پھر اسے باری تعالیٰ کی ہستی کا منکر بناتے ہیں خلاصہ یہ کہ تد ربحا وہ پوری شریعت کا منکر ہو جاتا ہے۔ ان کی کتاب کی یہی ترتیب ہے۔ اس کتاب کا نام "البلاغ الاکبر" ہے اور اسے "الناموس الاعظم" بھی کہتے ہیں۔ اس کے مصنف نے یہ کتاب قمر مطی کو بھیجی تھی جس نے بحرین سے خروج کیا تھا؛ اور پھر مکہ پر غلبہ پا کر وہاں حجاج کرام کا قتل عام کیا؛ اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے؛ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا؛ اور فرائض کو ساقط فرادیا۔ ان لوگوں کے عقائد و اخلاقیات علماء کرام میں بڑے معروف ہیں۔

پھر نبی کریم ﷺ کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جاسکتی ہے کہ آپ یہ فرمادیں کہ: "جو کوئی علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہوئے مر جائے؛ وہ یہودی مرے یا عیسائی؛ اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب کہ حال یہ ہے کہ تمام خوارج آپ کی تکفیر کرتے اور آپ سے بغض رکھتے ہیں۔ جب کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ انہیں اہل قبلہ میں شمار کرتے تھے۔ اور ان پر یہود و نصاریٰ کے حکم سے ہٹ کر حکم لگایا کرتے تھے۔ اور آپ کا یہی معاملہ بنو امیہ اور ان کے تابعین میں سے ان لوگوں کے ساتھ تھا جو آپ سے بغض رکھتے تھے۔ تو پھر ان لوگوں کو یہود و نصاریٰ کی طرح کیسے قرار دیا جاسکتا ہے

جو نمازیں پڑھتے ہوں؛ رمضان کے روزے رکھتے ہوں؛ بیت اللہ کا حج کرتے ہوں؛ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں؟ اس کی آخری حد یہ ہو سکتی ہے کہ اس انسان پر یا تو آپ کا امام ہونا مخفی رہا یا پھر اس نے معرفت حاصل ہونے کے بعد بھی آپ کی نافرمانی کی۔ ہر صاحب عقل و خرد اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ جمہور اہل اسلام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عداوت ہے نہ کسی اور سے۔ انھیں نبی کریم ﷺ کی تکذیب اور آپ کے احکام کی خلاف ورزی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ نظر بریں اگر مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ نبی کریم ﷺ نے تصریحاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا ہے تو اس کی تصدیق کرنے میں انھیں پس و پیش کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے اس حکم کا پتہ نہ چل سکا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو دین کی کسی بات کا علم نہ ہو وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کیوں کر ہو سکتا ہے؟

یہاں پر تکفیر میں کلام کرنا مقصود نہیں؛ بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ: یہ وہ جھوٹی احادیث ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے؛ اور یہ روایات دین اسلام کے متناقض ہے۔ اور ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی مخالفت کرنے والوں کی تکفیر لازم آتی ہے۔ یہ باتیں کوئی ایسا انسان بھی نہیں کہہ سکتا جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ چہ جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کچھ فرمایا ہو۔ العیاذ باللہ؛ ایسی باتوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا بھی آپ کی ذات پر بہت بڑی قدر اور طعن کا موجب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسی ملحد اور رزندیق کا فعل ہو سکتا ہے جو دین اسلام میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنا چاہتا ہو۔ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو جو اس کے رسول پر جھوٹ گھڑ لاتے ہیں۔ شیعہ کی روایات موضوعہ کی نسبت نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی قابل غور ہے:

آپ فرماتے ہیں: ”جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔“ ❶

[البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص نص رسول کو اللہ و رسول ﷺ کی مخالفت کے غلط خیال سے چھالے وہ یقیناً جہنمی ہے۔]

[قبول احادیث کا وجوب:]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”جب امامیہ نے دیکھا کہ ہمارے مخالفین ایسی احادیث روایت کر رہے ہیں تو ہم نے اپنے ثقہ راویوں سے نقل کر کے اہل سنت کی ذکر کردہ روایات سے کئی گنا زیادہ احادیث بیان کی ہیں۔ ہم پر واجب ہوتا ہے کہ ان کی طرف رجوع کریں۔ اور ان سے ہٹنا ہم پر حرام ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ”اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے وہ راوی جن کی تم توثیق کرتے ہو وہ حد سے زیادہ ان راویوں کی جنس سے ہی ہو سکتے ہیں جو جمہور سے روایات نقل کرتے ہیں۔ لیکن [ایسا ہرگز نہیں]؛ اہل علم اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ یہ راوی جھوٹے کذاب تھے؛ اور تم ان سے بڑے کذاب اور پرلے درجہ کے جاہل ہو۔ تم پر ان حدیث کے موجب عمل کرنا اور ان کے مطابق فیصلے دینا حرام ہے۔ اس اعتراض پر کئی طرح سے کلام کیا جاسکتا ہے:

❶ صحیح بخاری، کتاب العلم۔ باب اثم من کذب علی النبی ﷺ (ج: ۱۰۷، ۱۰۸)، صحیح مسلم۔ المقدمة۔ باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ (ج: ۲، ۳)۔

پہلی وجہ: آپ کو یہ علم کیسے حاصل ہو گیا کہ قدیم زمانے میں جن لوگوں نے یہ روایات نقل کی ہے؛ وہ ثقہ راوی ہیں۔ کیونکہ آپ نے تو ان لوگوں کو نہیں پایا اور نہ ہی ان کے احوال جانتے ہو۔ اور نہ ہی تمہارے پاس کوئی ایسی قابل اعتماد کتابیں ہیں جن پر اعتماد کرتے ہوئے تم ضعیف اور ثقہ کے مابین فرق کر سکو۔ اور نہ ہی تمہارے ہاں اسناد ہیں جن کی بنا پر تم راویوں کی معرفت حاصل کر سکو۔ بلکہ تمہارا بہت سارا وہ علم جو کہ تمہارے سامنے موجود ہے وہ یہود و نصاریٰ کے ہاں موجود علم سے بھی برا ہے۔ بلکہ یہود کے ہاں تو ہلال اور شمس کی وضع کردہ کتابیں موجود ہیں، مگر شیعہ کے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ جمہور پر رد کر سکیں۔

جب کہ تمہارا یہ عالم ہے کہ جمہور اہل سنت والجماعت ہمیشہ تمہارے راویوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں، جس سے شدید تر تنقید کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ تمہیں ان کے احوال کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ پھر تو اتر کے ساتھ اس بات کا علم بھی حاصل ہے جس کا جھٹلانا کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ تمہارے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے لیکر آج تک جھوٹ کی کثرت ہے۔

تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ محدثین خوارج سے بغض رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں نبی کریم ﷺ سے منقول بہت ساری صحیح احادیث بھی روایت کرتے ہیں۔ جن میں سے بعض احادیث امام بخاری نے نقل کی ہیں۔ دس روایات امام مسلم نے نقل کی ہیں۔ اور محدثین اس چیز کو دین کا حصہ سمجھتے ہیں جو نبی کریم ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو۔ مگر اس کے باوجود خوارج کے ساتھ ان کا بغض انہیں اس بات پر نہیں ابھار سکا کہ یہ لوگ خوارج پر جھوٹ لگائیں۔ بلکہ انہوں نے خوارج کو آزمایا تو انہیں سچا پایا۔ جب کہ تمہارا یہ حال ہے کہ محدثین، فقہاء، عام مسلمان، تاجر، عوام الناس؛ اور لشکری وغیرہ جن لوگوں نے بھی تمہارے ساتھ میل جول رکھا؛ اور تمہیں جدید یا قدیم دور میں آزمایا؛ اس نے تمہارے گروہ کو تمام گروہوں سے بڑا جھوٹا اور کذاب گروہ پایا۔ اگر ان میں کوئی ایک سچا ہو بھی تو دوسرے فرقوں میں ان سے زیادہ سچے موجود ہوتے ہیں۔ اگر دوسرے فرقوں میں کوئی ایک جھوٹا ہو تو شیعہ میں سب سے زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بات کسی بھی عقلمند منصف پر مخفی نہیں ہے۔ ہاں جو کوئی اپنے خواہش نفس کی پیروی کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے دلوں کو اندھا کر دیا ہوتا ہے۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے انہیں کوئی راہ ہدایت پر لانے والا رہبر نہیں ملتا۔

یہ باتیں جو ہم نے ذکر کی ہیں؛ قدیم و جدید میں اہل علم کے ہاں معروف رہی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سلسلہ میں بعض اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ یہاں تک کہ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”دین اہل حدیث [محدثین] کے ہاں ہے؛ جھوٹ رافضیوں کے ہاں ہے؛ کلام معتزلہ کے ہاں ہے؛ حیلہ اصحاب فلاں اہل رائے کے ہاں ہیں۔ اور سوائے تدبیر آل ابی فلاں کے ہاں ہے۔“

اور یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے کہ انہوں نے فرمایا ہے۔ اس لیے کہ دین وہ چیز ہے جسے دیکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ آپ کی سنتوں اور احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والے محدثین ہیں۔ جب کہ علم کلام میں سب سے زیادہ مشہور گروہ معتزلہ کا ہے۔ اسی لیے خواص کے ہاں معتزلہ بدعات میں بڑے مشہور تھے۔ جب کہ رافضی اپنی بدعات

میں خواص و عوام کے مابین بہت مشہور و معروف ہیں؛ یہاں تک کہ اکثر عوام الناس انہیں متضاد اقوال کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے اقوال رسول اللہ ﷺ کی لائی تعلیمات سے متناقض ہیں؛ خواص و عوام کو اس کا علم ہے۔ یہ خود اپنے عمل سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہونے کی ایک بڑی دلیل ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گروہ جنہیں رسول اللہ ﷺ کے دین سے کوئی زیادہ شناسائی نہیں جیسے دوسرے لوگوں کو معرفت حاصل ہے؛ اگر ان لوگوں سے بھی رافضی کہتے ہیں کہ: ہم مسلمان ہیں؛ تو وہ کہتے ہیں: نہیں تم کوئی دوسری جنس ہو؛ [تمہارا اسلام سے کوئی تعلق نہیں]۔ یہی وجہ ہے کہ رافضی لوگ دین سے دشمنی رکھنے والے ہر گروہ سے دوستی رکھتے ہیں؛ جیسے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین؛ مشرک ترک۔

جب کہ ان اولیاء اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں جو اہل دین میں سے بہترین لوگ اور اہل تقویٰ کے سردار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس دین کی تبلیغ کی؛ اسے قائم کیا اور اس کی نصرت کی۔ یہی وجہ ہے کہ کافرتا تاریخوں کے بلاد اسلام میں داخل ہونے کا سبب بڑا سبب رافضی ہی تھے۔ عباسی وزیر ابن علقمی اور اس جیسے دوسرے لوگ جیسے نصیر طوسی کے مسلمانوں کے خلاف کفار سے اتحاد کو خواص و عوام بھی جانتے ہیں۔ ایسے ہی ان میں جو لوگ شام میں تھے؛ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مشرکین کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی۔ جسے تمام لوگ جانتے ہیں۔

ایسے ہی جب مسلمانوں کا لشکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا؛ اور غازان اسلامی ممالک پر حملہ آور تھا؛ تو ان لوگوں نے نصرانی کافروں اور دوسرے مسلمان دشمنوں کا ساتھ دیا۔ اور مسلمانوں کے بچوں اور اموال کو ان کے ہاتھوں بچ ڈالا۔ اور خوب کھل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ ان میں سے بعض نے تو صلیبیوں کا جھنڈا بھی اٹھایا ہوا تھا۔ قدیم دور میں بیت المقدس پر نصاریٰ کے قبضہ کا ایک بڑا سبب شیعہ تھے۔ یہاں تک مسلمانوں نے بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کر لیا۔

اور رافضی مذہب انہوں نے ہی اختیار کیا ہے جو لوگوں میں سب سے بڑے منافق تھے؛ جیسے: نصیریہ؛ اسماعیلیہ اور دیگر گروہ۔ یہ ایسے لوگ تھے جو باطنی طور پر سب سے بڑے کافر؛ یہود و نصاریٰ سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول کے دشمن تھے۔

یہ اور اس جیسے دیگر امور جو کہ ظاہر و معروف ہیں؛ جنہیں عام و خاص بھی جانتے ہیں۔ ان کے موجب اور ان کی دین سے مفارقت اور کفار و منافقین کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ان کو مسلمانوں سے جدا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے احوال کو دیکھنے والا یہ سمجھ جائے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے علیحدہ ایک جنس ہیں۔ اس لیے کہ باریب وہ مسلمان جو قدیم و جدید دور میں اسلام کو قائم کرتے چلے آئے ہیں وہ جمہور مسلمان ہیں۔ جب کہ رافضیوں نے تو ہمیشہ دین اسلام کو مٹانے اور اس کی رسی کو توڑنے اور اس کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ اور جس قدر ان میں اگر دین کا کچھ حصہ باقی ہے وہ جمہور مسلمانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان میں قرآن کی تلاوت کرنے والے بہت کم ہیں۔ اور ان میں سے جو لوگ اچھی طرح قرآن پڑھنا جانتے ہیں انہوں نے اہل سنت والجماعت سے اس کی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہی حال حدیث میں بھی ہے؛ حدیث کی معرفت و تصدیق اور اخذ و قبول میں اہل سنت کا قول ہی معتبر ہے۔ ایسے ہی فقہ و عبادت؛ زہد و جہاد اور قتال میں بھی لوگ حقیقت میں اہل سنت والجماعت کے لشکر میں شامل ہیں۔ اور اہل سنت والجماعت ہی وہ لوگ ہیں جن کے علماء و مجاہدین عباد و زہاد کے

ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی علما اور علما حفاظت فرمائی ہے۔

رافضی دین اسلام سے پرلے درجے کے جاہل لوگ ہیں۔ اور انسان کے لیے ان کے پاس کوئی خاص چیز نہیں ہے سوائے اس چیز کے جس سے دشمن خوش ہو اور اہل اسلام کو تکلیف پہنچائے۔ اسلام میں ان لوگوں کے کیل و نہار انتہائی سیاہ ہیں۔ ان کے عیوب اور بھلائیوں کو سب سے زیادہ جاننے والے اہل سنت ہیں۔ آپ ہمیشہ ان سے کچھ دیگر اچھے امور بھی دیکھتے رہیں گے جن سے ان کی پہچان حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ﴾ [المائدہ ۱۳]

”اور آپ ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتے رہیں گے، سوائے ان کے تھوڑے سے لوگوں کے۔“

اگر میں ان کی بعض ایسی باتیں نقل کرنی شروع کر دوں جو میں نے خود دیکھی ہیں اور جو ثقہ لوگوں سے نقل کی ہیں؛ اور جو کچھ ان کی کتابوں میں پڑھا ہے؛ تو اس کے لیے ایک بہت بڑی کتاب چاہیے۔

یہ لوگ انتہائی درجہ کی جہالت اور کم عقلی کا شکار ہیں۔ ایسی باتوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے نفرت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ لوگ حق پر ہیں تو پھر بھی ایسے کام کرتے ہیں جن میں ان کے لیے کوئی منفعت نہیں۔ مثال کے طور پر مرغی کے پر نوچنا؛ گویا کہ وہ اس سے انتقام لے رہے ہوں۔ [وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ] وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بال نوچ رہے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ اور ایسے ہی زین کے نیچے رکھے ہوئے تھڑے کو درمیان سے پھاڑ ڈالنا؛ اور یہ کہنا کہ ہم نے عمر رضی اللہ عنہ کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ تو کیا مسلمان فرقوں میں سے کسی ایک نے اپنے مخالفین کے ساتھ ایسا کیا ہے؟

اگر ایسا کرنا مشروع ہوتا تو ابو جہل اور اس جیسے دوسرے لوگ اس کے زیادہ حق دار تھے۔ اور جیسا کہ ان لوگوں کا عشرہ مبشرہ کے بغض کی وجہ سے دس کے عدد سے بغض و نفرت رکھنا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کئی مقامات پر دس کا ذکر بطور مدح کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيْلٍ عَشْرٍ﴾ [الفجر]

”اور قسم ہے فجر کے وقت کی اور دس راتوں کی۔“

نیز فرمایا: ﴿وَأَتَمَّمْنَا بِعَشْرِ﴾ [الاعراف ۱۲۲]

”اور ہم نے مزید دس راتوں سے اسے پورا کر دیا۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرة ۱۹۲]

”اور وہ ہیں گنتی کے پورے دس۔“

جب کہ نو کے عدد کو بطور مذمت کے ذکر کیا ہے؛ فرمان الہی ہے:

﴿وَتَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةٌ رَّهْطٌ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ﴾ [النمل ۴۸]

”اور شہر میں نو گروہ تھے جو کہ فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔“

تو کیا کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے نو کے عدد کو زبان پر لانے کو ناپسند کیا ہے۔ جب کہ شیعہ کا یہ حال ہے کہ وہ دس کے بجائے نو کے لفظ کو ترجیح کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اور ایسے ہی شیعہ کا ان اسماء [ناموں] کو ناپسند کرنا جو ان کے ناپسندیدہ لوگوں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ موجود تھے جن کے نام اسلام دشمنوں کے ناموں پر تھے۔ جیسا کہ ولید؛ جسے قرآن نے وحید کے لقب سے ذکر کیا ہے؛ اس کا بیٹا بہترین مسلمانوں میں سے تھا؛ اس کا نام بھی ولید رضی اللہ عنہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں قنوت نازلہ پڑھ کر اس کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے: ”اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات عطا فرما۔“ [متفق علیہ]

اور جیسا کہ ابی بن خلف جسے رسول اللہ ﷺ نے قتل کیا تھا۔ جبکہ مسلمانوں میں اس نام کے کئی افراد موجود تھے جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ اور جیسا کہ عمرو بن عبدود العامری؛ اور صحابہ میں بھی اس نام کے لوگ تھے جیسے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے کسی ایک کا نام بھی اس وجہ سے تبدیل نہیں کیا کہ اس نام کا کوئی کافر بھی موجود ہے۔

✽ اور اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ جن لوگوں سے شیعہ نفرت رکھتے ہیں وہ کافر ہیں؛ پھر بھی ان کا ان ناموں سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنا جہالت کی انتہا ہے؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ ان صحابہ کو ان ہی ناموں سے پکارا کرتے تھے۔
✽ ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”اہل علم و دین میں سے جن لوگوں نے بھی جمہور کا تجربہ کیا ہے؛ وہ جانتے ہیں کہ جمہور کبھی بھی جھوٹ پر راضی نہیں ہوتے؛ بھلے وہ ان کی اغراض کے موافق ہی کیوں نہ ہو۔ خلفاء ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل میں کتنی ہی روایات ایسی ہیں جن کی اسناد شیعہ کی روایات سے زیادہ بہتر ہیں۔ مثال کے طور پر ابو نعیم اور ثعلبی؛ ابوبکر نقاش اور اہوازی اور ابن عساکر کی روایات؛ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی مرویات۔ مگر علماء حدیث ان میں سے کسی ایک روایت کو بھی ایسے ہی قبول نہیں کر لیتے۔ بلکہ ان کے ہاں جب کسی روایت کا راوی مجہول ہوتا ہے؛ تو اس کی روایت میں توقف اختیار کرتے ہیں۔ جب کہ رافضی گروہ کی حالت یہ ہے کہ جو روایت بھی ان کی خواہشات کے اور رائے کے مطابق ہو اسے قبول کر لیتے ہیں؛ اور اس میں سے صحیح یا غلط کسی بھی چیز کا رد نہیں کرتے۔

✽ جب جمہور کے ہاں وہ صحیح اور معروف احادیث موجود ہیں جن کی صحت و صداقت کا ہر مسلمان کو علم ہے۔ اور آپ بھی یہ بات جانتے ہیں کہ ان احادیث کو قبولیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ احادیث متواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں؛ جو کہ علم ضروری کا فائدہ دیتی ہیں؛ اور دل سے ان کا انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ اور یہ ان دلائل کے متناقص ہیں جن کو روایت کرنے والا مجہول لوگوں کا ایک گروہ ہے؛ یا پھر وہ لوگ ہیں جو جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں خواہ وہ تم میں سے ہوں یا جمہور میں سے۔ تو پھر کیا یہ بات ممکن ہے کہ جس چیز کو لوگ ضرورت کے تحت جانتے ہوں؛ اور جو ایسے ثقہ راویوں کی صحیح اسناد سے ثابت ہو جن کی سچائی اور علم کی پختگی معروف ہے؛ ان کی روایات کو رد کر دیا جائے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان روایات کو ان روایات سے رد کیا جائے جو کہ من گھڑت ہیں اور جن کی کوئی نہ ہی زمام ہے نہ لگام؟ اور اگر کوئی انسان یہ روایت کرے کہ نمازیں پانچ سے زیادہ واجب ہیں اور دو ماہ کے روزے واجب ہیں اور مسلمانوں پر دو بار بیت اللہ کا حج کرنا واجب ہے۔ پس جس طرح سے ان روایات کا رد کیا جائے گا؛ اسی طرح سے ان دوسری روایات کا رد بھی کیا جائے گا۔ اس رد میں ہم نے ان طرق کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جن سے ان لوگوں کا جھوٹ واضح ہو جاتا ہے جو محدثین کے طریقہ سے

ہٹ کر روایات نقل کرتے ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کا جھوٹ بھی طشت از بام کیا ہے۔ کبھی قرآن سے، کبھی علم متواتر سے اور کبھی لوگوں کے اجماع سے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ وہ روایات جو قرآن و متواتر احادیث اور اجماع کے خلاف ہوں، اور عقل کے بھی مخالف ہوں ان کا باطل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ ان جملہ طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جن سے ان روایات کا علم ہوتا ہے جو اہل سنت والجماعت کے مذہب کی مخالفت میں گھڑی گئی ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی روایات میں تین چیزوں میں سے کسی ایک پر انحصار کرتے ہیں:

- ۱۔ یا تو وہ کسی جھوٹے سے روایت نقل کرتے ہیں۔
 - ۲۔ یا پھر ان کی دلیل مجمل اور متشابہ ہوتی ہے۔
 - ۳۔ یا پھر فاسد قیاس ہوتا ہے۔
- یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو فاسد دلائل سے حجت پکڑتے ہیں اور پھر اسے شریعت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ بنیادی چیزیں یا تو نص ہے، یا پھر قیاس۔ نص کے لیے صحیح سند اور دلالت متن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے نص رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ اور لازمی طور پر اپنے مطلوب پر دلالت کرتی ہو۔ جب کے ان لوگوں کے باطل دلائل یا تو سنی سنائی جھوٹی باتیں ہیں۔ یا پھر اگر روایت صحیح بھی ہو تو وہ اپنے مقصود پر دلالت نہیں کرتی۔ یا پھر فاسد قیاس ہوتا ہے۔ رافضہ اور دوسرے اہل باطل کے ہاں جنس کے علاوہ کوئی بھی دوسری دلیل سمعی موجود نہیں۔
- جب ہم کہتے ہیں: ”نقل کرتے ہوئے“ تو اس میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ دونوں شامل ہوتے ہیں؛ اور اہل اجماع کا کلام بھی ان لوگوں کے ہاں شامل ہوتا ہے جو اسے حجت مانتے ہیں۔ بلاشبہ رافضی اجماع کو حجت ہی نہیں مانتے۔ ایسے ہی افعال و اقرار اور خاموشی بھی اسی طریقہ پر ہے۔



فصل:

احوال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے امامت پر استدلال

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”منہج چہارم: وہ دلائل جو کہ آپ کی امامت پر دلالت کرتے ہیں، اور وہ آپ کے

احوال سے مستنبط ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔“

[پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احوال سے آپ کی امامت پر استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے:] ”آپ بہت بڑے عابد و زاہد اور حد درجہ عالم و شجاع تھے۔ شیعہ مصنف نے اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چند خوارق عادات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور آپ کے کئی فضائل کا ذکر بھی کیا ہے، جن پر رد و گزر چکا ہے۔

چنانچہ شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”آپ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بڑے زاہد تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ بات بالکل ممتنع ہے۔ جو لوگ حضرات صحابہ کے احوال جانتے ہیں، انہیں علم ہے کہ نبی

کریم ﷺ کے بعد سب سے بڑے زاہد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بڑے مالدار اور راجہ تھے، اور آپ نے اپنا تمام تجارتی سرمایہ اللہ کی راہ میں دے دیا تھا۔

جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے تو فروخت کے لیے چادریں اپنے کندھے پر ڈالے بازار جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی؛ آپ اپنے بازو پر چادریں رکھے جا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟

تو آپ نے فرمایا: ”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنے بچوں کے لیے رزق کمانا چھوڑ دوں؟“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی خبر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور مہاجرین صحابہ کو دی۔ انھوں نے آپ کا وظیفہ مقرر کیا۔ آپ نے حضرت عمرو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما سے قسم لی کہ کیا ان کے لیے یہ مال لینا حلال ہے؟ [تو انہوں نے حلف اٹھا کر بتایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دو درہم یومیہ لینے کے مجاز ہیں۔^①

پھر آپ نے اپنا مال بیت المال میں چھوڑ دیا۔ پھر جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ: ”ان کا مسلمانوں کے بیت المال سے لیا ہوا مال بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔“

بعد میں جب اس کی تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ ایک مشک تھی جس کی قیمت پانچ درہم بھی نہیں بنتی تھی۔ اور ایک حبش لوطی تھی جو کہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور ایک حبشی غلام تھا اور ایک اونٹ۔ آپ نے یہ سامان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عیال سے یہ مال بھی واپس لے لیا جائے گا؟

① ابوداؤد نے مسند صحیح بشام بن عروہ سے روایت کیا ہے کہ میرے والد نے بتایا جب ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ (طبقات ابن سعد ۱/۳: ۱۷۲، تاریخ الاسلام للذہبی، عہد الخلفاء، ص: ۱۰۷) عروہ کہتے ہیں مجھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو انھوں نے کوئی درہم و دینار پیچھے نہیں چھوڑا تھا۔ (طبقات ابن سعد ۱/۳: ۱۹۵) اسامہ بن زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تجارت میں مشہور تھے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ ان میں سے آپ غلام آزاد کرتے اور مسلمانوں کی امداد کیا کرتے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو ان میں سے کل پانچ ہزار درہم بچے تھے۔ آپ یہ سرمایہ نیک کاموں پر صرف کیا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد ۱/۳: ۱۷۲)، من طریق الواقدی۔

نہیں رب کعبہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں بھی بڑی تکالیف اٹھائی ہیں۔ اب ان چیزوں کی قیمت میں ادا کر دوں گا [اور یہ مال ابوبکر کے گھر واپس بھیج دیا جائے]۔

بعض علماء کرام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ تو بڑے زاہد تھے؛ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے بڑے زاہد تھے۔ اس لیے کہ اسلام کے شروع میں آپ کا بہت بڑا مال اور بڑی وسیع تجارت تھی؛ جسے آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا؛ اور خلافت کے دوران آپ کی یہ حالت تھی۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس جو بیت المال کا مال باقی بچ گیا تھا وہ بھی آپ نے واپس کر دیا۔ ابن زنجویہ [ان کا نام حمید بن محمد ہے یہ بڑے ثقہ راوی اور حافظ حدیث تھے۔ ۲۳۷ھ میں وفات پائی] فرماتے ہیں:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ آغاز اسلام میں تنگ دست تھے۔ آپ پر خرچ کیا جاتا تھا؛ آپ کسی پر خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر آپ نے مال سے فائدہ اٹھایا؛ زرعی اراضی، مکانات اور بھجور کے باغات اور اوقاف خرید لیے تھے۔ وفات کے وقت آپ کے ہاں چار بیویاں اور انیس لونڈیاں تھیں۔“

یہ تمام چیزیں آپ کے لیے مباح تھیں۔ واللہ الحمد۔ اور جو مال آپ نے چھوڑا تھا اسے بیت المال میں واپس کرنے کا حکم بھی نہیں دیا۔ آپ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد کوئی سونا اور چاندی نہیں چھوڑا۔ سوائے سات سو درہم کے جو کہ آپ کے عطایا میں سے باقی بچ گئے ہیں۔“

اسود بن عامر کہتے ہیں: ہم سے شریک نخعی نے حدیث بیان کی؛ اس نے عاصم بن کلیب سے نقل کیا؛ آپ حضرت محمد بن کعب القرظی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”میں عہد رسالت میں بھوک کی شدت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ رہتا تھا۔ اور آج میری ثروت کا یہ عالم ہے کہ میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار تک پہنچتی ہے۔“ [رواہ احمد عن حجاج عن شریک]

ابراہیم بن سعید جو ہری روایت کرتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میرے مال کی زکوٰۃ چار ہزار دینار تک پہنچتی ہے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیشک بہت بڑے زاہد تھے؛ مگر ان کے زہد کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زہد سے نسبت ہی کیا ہے؟ علامہ ابن جزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”کہنے والے کہتے ہیں کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت بڑے زاہد تھے۔“ یہ کسی جاہل نے جھوٹ بولا ہے۔ زہد کے معنی ہیں: انسان کا دل شہرت و مال؛ لذات و عیش اور خدم و حشم کی خواہش سے رو گردانی کرنا اور اسکے سوا زہد کا اور کوئی مطلب نہیں۔ زہد کا معنی اسی انسان پر صادق آتا ہے جسکے اندر یہ اوصاف موجود ہوں۔

مال کی محبت سے بیگانگی کے بارے میں اگر بات ہو تو ہر انسان جسے صحیح روایت کی ذرا بھر بھی اطلاع ہو تو وہ جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے مال دار تھے۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ: ”آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے؛ جو سب کے سب اللہ کی راہ میں خرچ کیے۔ اور اللہ کی رضا کے لیے ان مساکین اور کمزور مسلمانوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کے جرم میں سزا دی جاتی تھی۔ آپ نے کوئی ایسا سخت کوش غلام آزاد نہیں کیا جو آپ کی حفاظت کرے؛ بلکہ وہ لوگ آزاد کئے جو کمزور تھے اور انہیں اللہ کی راہ میں تکلیف دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب نبی کریم ﷺ نے ہجرت کی تو اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس صرف چھ ہزار درہم باقی بچ گئے تھے۔ وہ سب آپ نے اپنے ساتھ رکھ لیے [تاکہ

سفر میں کام آئیں گے۔ ان میں سے ایک درہم بھی اپنے بچوں کے لیے نہیں چھوڑا۔ اور پھر یہ سارے درہم اللہ کی راہ میں خرچ کر ڈالے۔ اور ان میں سے ایک درہم بھی آپ کے پاس باقی نہیں بچا۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس صرف ایک جبہ باقی بچ گیا تھا۔ جب آپ کہیں پر پڑاؤ ڈالنے تو اسے اپنے لئے بطور بستر بچھالیتے؛ اور جب اٹھ جاتے تو اسے اپنے جسم پر پہن لیتے۔ جب کہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مال بھی جمع کیا اور بڑی بڑی جائیدادیں بھی خریدیں۔ کئی لوگوں کی یہ جائیدادیں ضائع بھی ہو گئیں؛ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اللہ کی رضا کو ترجیح دی اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور وہ لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کئے جانے والے مال کی نسبت اپنے پاس بچ جانے والے مال سے زیادہ بے رغبت تھے۔ پھر جب آپ خلافت پر متمکن ہوئے تو نہ ہی آپ نے کوئی لونڈی رکھی اور نہ ہی مال کو وسعت دی۔ اور اللہ کے مال [بیت المال] میں سے جو کچھ اپنے نفس اور اولاد پر خرچ کیا تھا مرتے وقت اس کا شمار کیا؛ تو اس سے آپ کے حق کا کچھ حصہ ہی پورا ہو سکتا تھا۔ مگر پھر بھی آپ نے حکم دیا کہ آپ کو جو حصہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد اور غزوات کے مال غنیمت اور دیگر تقسیم میں سے ملا ہے اس سے یہ مال نکال کر بیت المال میں واپس جمع کر دیا جائے۔

مال و دولت اور لذات سے یہ وہ حقیقی زہد تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی کوئی ایک اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا صحابی۔ ہاں مہاجرین [اور سابقین] اولین میں سے حضرت ابوذر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما اس کے کسی قدر قریب ہیں؛ اس لیے کہ وہ اسی راہ پر چلتے رہے جس پر نبی کریم ﷺ کے دور میں گامزن تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد زہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ تھا پھر حضرت ابو عبیدہ اور ابوذر کا۔ مال و دولت سے زہد کے باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بلند مقام پر فائز تھے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مالِ حلال کو وسعت دی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی چار بیویاں تھیں اور انہیں لونڈیاں۔ خدام اور غلام ان کے علاوہ تھے۔ اور وفات کے وقت آپ کی اولاد بچوں اور بچیوں کی تعداد چوبیس تھی۔ اور ان کے لیے اتنی تعداد میں باغات اور زمینیں چھوڑیں جن کی وجہ سے ان کا شمار خاندان کے دولت مند اور خوش حال ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ یہ بات اتنی مشہور ہے کہ تاریخ و حقائق کا ادنیٰ علم رکھنے والا انسان بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کی جملہ جاگیروں میں سے بیع کی جاگیر بھی تھی۔ [امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:] ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اراضی میں سے ایک بیع کی جاگیر تھی، جو کہ آپ نے صدقہ کر دی تھی؛ جہاں سے باقی غلہ کے علاوہ ایک ہزار و سق کھجور کی آمدنی ہوتی تھی۔“

جب کہ بچوں اور خدام و حشم کی طرف آپ کا میلان بھی اتنا ظاہر ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ اور یہ اس قدر مشہور بات ہے کہ کسی ادنیٰ علم رکھنے والے کو بھی اس سے مجال انکار نہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اقارب میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ شامل تھے جو کہ سابقین اولین و مہاجرین [اور عشرہ مبشرہ] میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کو فضائل اسلام کے ہر باب میں فضیلت حاصل تھی۔ اور آپ کے بیٹوں میں عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جیسے ہونہار بھی تھے۔ جن کو نبی کریم ﷺ سے صحبت؛ ہجرت اور سابق اسلام ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ آپ کی فضیلت صاف ظاہر ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے ان میں سے کسی کو بھی کسی علاقہ کا عامل مقرر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ آپ کے عہد خلافت میں یمن اپنی پوری وسعت اور کثرت

مال کے ساتھ؛ مکہ و مدینہ و خیبر و بحرین و حضرموت و عمان و طائف و یمامہ اور حجاز کے تمام علاقے آپ کے زیر تسلط تھے۔ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کو عامل مقرر کرتے تو وہ اس کے اہل بھی تھے۔ لیکن آپ کے دل میں محبت کا خوف تھا؛ کہیں وہ ذرا بھر بھی خواہشات کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ کے نقش قدم پر چلے اور اپنے قبیلہ بنی عدی میں سے کسی کو بھی اتنے وسیع اور بڑے ملک میں کسی عہدہ پر مقرر نہیں کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام و مصر اور عراق سے لے کر فارس کی تمام شاہی اور خراسان تک تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ آپ نے اپنے قبیلہ کے نعمان بن عدی کو میان کا عامل مقرر کیا تھا مگر جلد ہی اسے اس منصب سے معزول کر دیا۔

حالانکہ بنی عدی میں اتنے مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے کہ قریش کی کسی دوسری شاخ میں اتنے مہاجر نہیں تھے۔ اس لیے کہ بنی عدی میں سے کوئی ایک بھی مکہ میں باقی نہیں بچا تھا؛ سارے لوگ مدینہ ہجرت کر گئے تھے۔ ان میں سعید بن زید بھی تھے جو کہ سابقین اولین اور مہاجرین صحابہ میں سے تھے۔ اور ابوجہم بن حذیفہ و خارجہ بن حذیفہ و معمر بن عبد اللہ اور ان کے بیٹے اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے لوگ موجود تھے۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے بعد اپنے بیٹے کو منصب خلافت پر فائز نہیں کیا تھا؛ حالانکہ اس کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو یہ منصب عطا کیا؛ حالانکہ آپ کا شمار فاضل صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل تصور کرتے تھے؛ اور آپ ایسے تھے بھی۔ اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں خلیفہ مقرر کر دیتے تو کسی شخص کو بھی اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ تاہم آپ نے اس سے احتراز کیا۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صلہ رحمی]:

بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو عہدہ ہائے جلیلہ تفویض کیے تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا، عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو یمن کا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں قثم و معبد کو مکہ و مدینہ کا حاکم بنایا۔ اپنے بھانجے جعدہ بن ہبیرہ [ام ہانی بنت ابی طالب کے بیٹے ہیں] کو خراسان اور اپنے لے پالک اور بیٹے کے بھائی محمد بن ابی بکر کو حاکم مصر مقرر کیا تھا۔ آپ نے اپنے بعد اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اظہار خوشنودی کیا تھا۔^①

ہم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اہلیت و صلاحیت اور استحقاق خلافت کا انکار نہیں کرتے۔ اور نہ ہی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے استحقاق خلافت کا انکار کرتے ہیں۔ تو پھر کونہ کی امارت کیا چیز ہے؟ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ: زہد یہ بھی تھا کہ عبد اللہ بن عمر اور عبد الرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہم کی طرح؛ جن پر لوگ متفق بھی تھے؛ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے بھی اسی طرح کا زہد ہوتا۔ اور جس طرح طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو عامل مقرر نہیں کیا گیا تھا؛ [ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اقارب کو بھی

① یہ شیعہ کا دعویٰ ہے۔ شیعہ کا مذہب و مسلک ائمہ کے بارے میں ای برہنی ہے۔ بخلاف ازیں مسند احمد (۱/۱۳۰)، حدیث نمبر: ۱۰۷۸، میں بروایت عبد اللہ بن مسعود منقول ہے کہ میں نے سیدنا علی سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ مجھے قتل کیا جائے گا۔ لوگوں نے کہا: ”پھر ہم پر خلیفہ مقرر فرمائیے۔“ فرمایا: ”میں تم میں سے کسی کو بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں جیسے نبی کریم ﷺ تشریف لے گئے تھے۔ اسی طرح مسند احمد (۱/۱۰۶)، حدیث: ۱۲۳۹، میں تحریر ہے۔ البدایہ و النہایہ (۵/۲۵۰-۲۵۱) پر شقیق بن سلمہ تابعی نیز کتاب مذکور (۴/۳۲۳) پر ثعلبہ بن یزید رافضی سے اسی طرح مروی ہے۔ نیز ملاحظہ فرمائیے۔ السنن الکبریٰ بیہقی (۸/۱۴۹)۔

عہدے تفویض نہ کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ دنیا اور اس کی ہر قسم کی لذات سے ہر طرح سے بے نیاز و زاہد تھے۔ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ سے بڑھ کر زاہد اور تارک دنیا تھے۔ ان کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مباحات سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کو تین طلاقیں دے رکھی تھیں۔ آپ جو کالیا کھاتے؛ اور اسے ختم کیا کرتے تھے تاکہ آپ کے بیٹے اس میں سالن نہ ڈال دیں۔ آپ کھر درا اور چھوٹا لباس پہنتے تھے۔ آپ کے کوٹ کو پیوند لگے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے بیٹوں کو اس پیوند کی وجہ سے حیاء آتی تھی۔ آپ کی تلوار کی پٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔ یہی حال آپ کے نعلین کا بھی تھا۔

خطیب خوارزمی نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے:

”اے علی! اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی زینت سے مزین کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر اپنے نزدیک محبوب زینت سے کسی دوسرے انسان کو مزین نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے زہد سے نوازا ہے؛ دنیا کو تمہاری نگاہ میں [بے وقعت اور] مبغوض کر دیا ہے۔ آپ کے لیے فقراء کو محبوب بنادیا گیا اور تم ان کے اپنے تبعین پر راضی ہو گئے۔ اور وہ تجھے اپنا امام ماننے پر رضا مندی ظاہر کرتے ہیں۔ اے علی! اس شخص کے لیے بشارت ہو جو تجھ سے محبت رکھے اور تیرے بارے میں سچی بات کہے۔ اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو تجھ سے بغض رکھے اور تجھ پر جھوٹ باندھے۔“

نوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ میں عصر کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے سامنے کھانا دودھ پڑا ہے جس میں سے کھٹی بو آ رہی تھی۔ آپ کے ہاتھ میں روٹی تھی جس پر جو کے چھلکے لگے تھے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا تھا۔ کبھی آپ اسے اپنے ہاتھ سے توڑتے اور اگر ایسا نہ کر سکتے تو اپنے گھٹنے سے توڑتے اور پھر اس دودھ میں ڈال دیتے۔ آپ نے فرمایا: ”آگے آؤ اور ہمارے ساتھ یہ کھانا کھاؤ۔ میں نے کہا: میں روزہ سے ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے: ”جس انسان کو روزہ اس کے پسندیدہ کھانے سے روک دے اللہ تعالیٰ اسے جنت سے کھانا کھلائے گا اور پانی پلائے گا۔“

آپ کہتے ہیں: میں نے آپ کی ایک لونڈی سے کہا جو کہ وہاں قریب کھڑی تھی: اے فضلہ! تمہارے لیے ہلاکت ہو! کیا تم اس شیخ کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتیں؟ کیا آپ ان کے لیے آٹا چھان نہیں لیتیں؟ تو اس نے جواب دیا: ”آپ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم آپ کے لیے آٹا نہ چھانیں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا: تم نے لونڈی سے کیا کہا؟ تو میں نے آپ کو وہ بات بتادی۔ آپ فرمانے لگے: ”میرے ماں باپ اس ہستی پر قربان ہوں جس کے لیے کبھی آٹا نہیں چھانا گیا؛ اور نہ ہی کبھی تین دن تک گندم کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلالیا۔“

ایسے ہی آپ نے ایک دن دو موٹی قمیصیں خریدیں؛ تو آپ نے اپنے غلام قنبر کو ان میں سے ایک قمیص چن لینے کا اختیار دیا۔ اس نے ایک قمیص اٹھالی اور دوسری آپ نے پہن لی۔ آپ نے دیکھا کہ اس کے بازو آپ کی انگلیوں سے آگے تک لمبے ہیں تو آپ نے بازو کاٹ کر چھوٹے کر دیئے۔“

ضرار بن ضمہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کیجیے۔ میں نے کہا: مجھے اس سے معاف رکھیے۔ انہوں نے دوبارہ کہا: آپ کو لازمی ایسا کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہے تو سنو! حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے دور اندیش اور عالی ہمت اور طاقتور تھے۔ آپ فیصلہ کن بات کہتے اور عدل و انصاف کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتے تھے۔ آپ کے پہلوؤں سے علم پھوٹتا اور آپ کی ذات سے حکمت کے چشمے اچلتے تھے۔ دنیا کی سرسبزی و شادابی سے نفرت کرتے۔ رات اور اس کی وحشت انھیں عزیز تھی۔ آپ زیادہ روتے اور اکثر سوچ بچار میں مصروف رہا کرتے تھے۔ موٹے جھوٹے لباس کو پسند کرتے اور خشک کھانا کھایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ اس طرح بے تکلف ہوا کرتے تھے جیسے ہم میں سے کوئی شخص ہو۔ جب ہم آپ سے کوئی سوال کرتے تو اس کا جواب دیتے؛ اور جب ہم دعوت دیتے تو اسے قبول کرتے۔ اور اللہ کی قسم! آپ کے ہمارے قریب اور ہمیں اپنے قریب کرنے کے باوجود ہم آپ کی ہیبت و جلال کے باوجود آپ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ آپ اہل دین کی تعظیم کرتے اور مسکینوں کو اپنے قریب کرتے۔ قوی باطل میں طمع نہ کر سکتا اور کمزور آپ کے ہاں عدل سے مایوس نہ ہوتا۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ فرما رہے تھے: ”اے دنیا! میرے علاوہ کسی دوسرے کو دھوکہ دینا۔ کیا تم میرے سامنے پیش ہونا چاہتی ہو یا میرا شوق رکھتی ہو۔ ہائے ہلاکت ہو! میں نے تجھے تین بار طلاق باندہ دیدی ہے۔ میں تمہاری طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ تیری عمر بہت کم ہے اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے؛ اور تیری زندگی بڑی حقیر ہے۔ آہ! سامان سفر کی کمی اور سفر کی دوری؛ اور راستے کی وحشت! حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے اور فرمایا اللہ تعالیٰ ابو الحسن پر رحم فرمائے، اللہ کی قسم! وہ ایسے ہی تھے۔“

پھر پوچھا ضرار! حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تمہیں کس قدر صدمہ ہوا؟
ضرار نے کہا: ”اتنا ہی غم جتنا اس شخص کو ہوتا ہے جو اپنی گود میں اپنے بچے کو زنج کر دے نہ تو اس کے آنسو خشک ہوتے ہیں اور نہ غم ہلکا ہوتا ہے۔“ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زہد و تقویٰ:

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زہد میں کوئی کلام نہیں۔ تاہم یہ کہنا کہ آپ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زہد تھے؛ شیعہ کے پیش کردہ دلائل میں اس کے ثبوت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ بلکہ رافضی نے زہد علی میں جو دلائل پیش کیے ہیں [وہ جھوٹ کا طومار ہیں] ان میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو اس حق بات پر دلالت کرے جو حضرت میں موجود تھی۔ شیعہ کی روایات یا تو جھوٹ کا پلندہ ہیں یا پھر ان میں مدح علی سے متعلق کوئی بات موجود نہیں۔

دنیا کو طلاق دینے والی روایت کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

”اے زرد اور گوری چٹی دنیا! میں نے تجھے طلاق دے دی اب جا کر کسی اور کو مبتلائے فریب کر، میں تجھے دوبارہ اپنے گھر میں آباد نہیں کروں گا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ان لوگوں سے زہد تر ہیں جنہوں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ ہمارے نبی ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے انبیاء سے بھی یہ الفاظ منقول نہیں ہیں؛ حالانکہ یہ لوگ بلا ریب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے زہد تھے۔ اس لیے کہ جب کوئی انسان زہد اختیار کرے تو اس پر واجب نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زبان سے بھی کہے کہ: میں نے زہد اختیار کر لیا ہے۔“ اور زہد کے ہر دعویٰ کے لیے ضروری بھی نہیں کہ وہ زہد ہی ہو۔ اور نہ ہی اس کلام کا نہ ہونا زہد کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور نہ ہی ان الفاظ کا وجود زہد کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ [ایسے الفاظ کہنے کی نسبت خاموش رہنا مناسب تر اور دلیل اخلاص ہے]۔ اس لیے کہ ان الفاظ میں شیعہ کے دعویٰ پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

[اشکال]: ”شیعہ کا یہ قول کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ سالن کے بغیر بھوکے روٹی کھایا کرتے تھے۔“

[جواب]: ”اس میں مذکورہ دعویٰ پر کوئی دلیل بھی نہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

۱۔ پہلی وجہ: یہ صاف جھوٹ ہے۔

۲۔ دوسری وجہ: اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ نبی کریم ﷺ امام الزہاد تھے، اس کے باوصف آپ کو جوں جاتا کھالیا کرتے تھے؛ اور جو چیز موجود نہ ہوتی آپ اس کی تلاش نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے بکرے اور مرغ کا گوشت کھایا۔ آپ شیریں کھانے اور شہد کو پسند فرمایا کرتے تھے، پھل کھایا کرتے تھے۔ موجود کھانے کو واپس نہ کرتے، اگر کوئی چیز نہ ملتی تو تکلف نہ کرتے۔ جب کھانا پیش کیا جاتا تو اگر ضرورت ہوتی کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے، غیر موجود کی طلب میں تکلف نہ فرماتے۔ بعض اوقات بھوک کی شدت سے شکم پر پتھر بھی باندھ لیا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات دو دو مہینے گزر جاتے مگر آپ کے گھر میں آگ تک نہ جلتی۔“

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مسجد نبوی میں کچھ لوگ جمع تھے۔ ان میں سے ایک صحابی کہنے لگے، میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، دوسرے نے کہا، میں قیام میں مشغول رہوں گا اور آرام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی نہیں کروں گا۔ چوتھے نے کہا میں گوشت کھانا ترک کر دوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ باتیں سن کر فرمایا: ”میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔“ ①

① دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الاطعمۃ و کتاب الاشربة نیز صحیح مسلم، کتاب الاشربة، وغیرہ۔

② البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح (حدیث: ۵۰۶۲)، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح، (حدیث: ۱۴۰۱)۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان کہاں تک صحیح ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی سنت سے منحرف ہو گئے تھے؟ اور یہ انحراف آپ کے مناقب میں بھی شمار ہونے لگا۔ نبی کریم ﷺ کی سنت سے بے رغبتی کرنے میں مدح کا کون سا پہلو ہے؟ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں تھے؛ اس وقت بھی آپ بغیر سالن کے جو کی خشک روٹی ہی کھایا کرتے تھے؛ گندم کی روٹی یا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب کہ متواتر نقول اس کے خلاف ہیں۔ پھر کیا دیگر صحابہ کرام میں سے بھی کسی ایک نے ایسے کیا ہے؟ یا ان میں سے کسی ایک نے ایسا کرنے کو مستحب کہا ہے؟ [بخلاف ازیں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ کی ذکر کردہ یہ بات غلط ہے۔]

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کی پٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔“

[جواب]: یہ بھی صاف جھوٹ ہے، اور اس میں مدح کا کوئی پہلو بھی نہیں ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نعلین مبارک چڑے کی؛ اور تلوار کا نیام چاندی کا بنا ہوا تھا؛ جس پر سونے کی زرکاری ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو خوش حالی و فارغ البالی سے نوازا تھا۔ تلوار کے لیے چڑے کی پٹی بنانے میں کیا مضائقہ تھا۔ خصوصاً جب کہ حجاز میں چڑے کی فراوانی ہے، یہ بات قابل تعریف تب ہوتی اگر چڑا نایاب ہوتا۔

جیسے حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب مختلف بلاد و امصار کو اس قوم نے فتح کیا تو ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے گھوڑوں کی باگ ڈور رسیوں سے بنی ہوتی تھی اور جن کی رکائیں پٹھوں سے تیار کی جاتی تھیں۔“

حدیث عمار ایک موضوع روایت ہے؛ جب کہ سوید بن غفلہ کی روایت بھی نبی کریم ﷺ تک مرفوع نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کپڑے خریدے۔“

[جواب]: یہ حدیث معروف ہے۔ ایسے ہی ضرار بن ضمرہ والی روایت بھی نقل کی گئی ہے۔ ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی کوئی ایک ایسی چیز نہیں ہے جس سے آپ کا حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زاہد ہونا ثابت ہوتا ہو۔ بلکہ جو انسان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی منقول سیرت کا جانکار آپ کے زہد و عدل؛ ولایت اپنے اقارب کی دوری؛ اور اپنے بیٹے کا حصہ ان کے ہم مثلوں سے کم رکھنے؛ اور آپ کے خشک و سوکھی روٹی کھانے کے بارے میں بھی جانتا ہے اسے پتہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ ہستی تھے جنہوں نے قیصر و کسری کے خزانے تقسیم کیے۔ جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ تقسیم کرتے تھے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا ایک جزو تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ پر اسی ہزار درہم قرض تھا۔ یہ معلومات رکھنے والا جانتا ہے کہ کئی وجوہات کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے زاہد تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے زاہد تھے۔



فصل:

حضرت علی رضی اللہ عنہ عدیم المثال تھے

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”خلاصہ کلام! حضرت علی رضی اللہ عنہ زہد میں عدیم المثال تھے، نہ ہی کوئی آپ کے مقام کو پاسکا اور نہ ہی کوئی آپ سے سبقت حاصل کر سکا؛ جب آپ ہی سب سے بڑے زاہد تھے تو آپ ہی خلیفہ ہوں گے؛ اس لیے کہ مفضل کو تقدیم دینا ممتنع ہے۔“ [اسی کلام الراضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ”یہ دونوں احتمال باطل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زاہد نہ تھے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو کوئی زاہد تر ہو وہ امام و خلیفہ بننے کا زیادہ حق دار ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل خانہ کے پاس اتنا مال اور غلام تھے جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس نہیں تھا۔ عبد اللہ بن احمد نے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہم سے علی بن حکیم نے بیان کیا، ان سے شریک نے حدیث بیان کی: وہ عاصم بن کلیب سے روایت کرتے ہیں: آپ حضرت محمد بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا: ”میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا؛ اور اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے پتھر باندھا کرتا تھا۔ اور آج میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار تک پہنچتی ہے۔“ [سبق تخریجہ]۔

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے؛ لیکن اس روایت کے مقابلہ میں بہتر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ عراق میں بھی جو کی سوکھی روٹی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس روایت کی تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مال سے بہت زیادہ تھا۔ اگر صرف اسی چیز میں مقابلہ کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو کیا دیتے اور اہل بیت کو کیا دیتے تھے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ تمام قریش سے زیادہ حضرات اہل بیت کو دیا کرتے تھے۔ آپ بنی عدی یا بنی تیم یا قریش کی کسی دوسری شاخ میں اتنا مال تقسیم نہیں کرتے تھے جتنا اہل بیت نبوت میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بس صرف یہی ایک بات بھی اس دلیل کے لیے کافی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وسیع مال موجود تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوقاف مشہور تھے۔ کیا جس انسان کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہو وہ وقف کر سکتا ہے؟ [نیز یہ کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت بہت سے غلام لونڈیاں اور کثیر جائداد چھوڑی تھی۔ البتہ نقدی صرف سات سو درہم تھی]۔ دوسری طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ فتح خیبر کے موقع پر مال غنیمت سے جو حصہ ملا تھا وہ اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔ [آپ کی کوئی زرعی اراضی نہیں تھی۔ جب شہادت پائی تو اس وقت اسی ہزار کے مقروض تھے۔] اس کے علاوہ آپ کی کوئی زمین یا جائداد نہیں تھی۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زمین و جائداد بیابان میں بھی تھی۔



فصل :

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

دوم: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے بڑھ کر عبادت گزار تھے۔ دن بھر روزہ رکھتے اور راتوں کو قیام کیا کرتے تھے۔ نماز تہجد اور دن کے نوافل لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھے تھے۔ آپ سارا وقت عبادت و وظائف میں بسر کیا کرتے تھے۔ شب و روز میں آپ ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے۔ آپ نے انتہائی ٹھنڈی راتوں میں بھی کبھی بھی قیام اللیل ترک نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے حالت جنگ میں آپ کو دیکھا کہ سورج کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: زوال کا انتظار کر رہا ہوں تاکہ نماز پڑھ لوں۔ میں نے کہا: اس وقت میں نماز؟ تو آپ نے فرمایا: ”ہم تو نماز کی وجہ سے ان سے قتال کرتے ہیں۔ سو آپ ان سخت اوقات و حالات میں بھی پہلے وقت میں نماز پڑھنے سے غافل نہیں ہوئے۔“ اور جب آپ اپنے جسم سے تیر وغیرہ نکالنا چاہتے تو اسے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ نماز شروع کرتے؛ پھر آپ باقی تمام چیزوں سے غافل ہو کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اور آپ کو کسی قسم کی تکلیف کا کوئی احساس نہ ہوتا۔ آپ نے نماز اور زکوٰۃ کو جمع کیا۔ آپ نے حالت رکوع میں صدقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں قرآن نازل کیا جو قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔ اور آپ نے تین دن تک اپنی اور اپنے بچوں کی روزی صدقہ میں دی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ ”کیا انسان پر ایسا وقت گزرا ہے۔“ [الدھر ۱] آپ نے دن اور رات میں؛ خفیہ اور علانیہ طور پر صدقہ کیا۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کی تو اس سے پہلے صدقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں قرآن نازل کیا۔ اور آپ نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے، آپ مزدوری کر کے جو کچھ کماتے وہ شعب ابی طالب میں نبی ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے۔ جب آپ لوگوں میں سب سے بڑے عابد تھے؛ تو آپ ہی افضل ہوئے؛ لہذا آپ ہی امام بھی ہوں گے۔“ [ابھی کلام اراغی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اس کلام میں اتنی من گھڑت اور جھوٹی باتیں ہیں جو صرف اس انسان پر مخفی رہ سکتی ہیں جو ان لوگوں کے احوال سے پرلے درجے کا جاہل ہو۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اور اس میں مدح کا کوئی پہلو بھی نہیں؛ اور نہ ہی اس طرح کی عام جھوٹی کہانیوں میں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”آپ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کرتے تھے۔“ یہ محض جھوٹ اور آپ پر الزام ہے۔ اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کا فرمان گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”لیکن میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں؛ جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔“ ①

① البخاری، کتاب الصوم۔ باب حق الجسم (ح: ۱۹۷۵) مسلم کتاب الصیام، باب النهی عن صوم (ح: ۱۱۵۹)۔

بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے دروازے پر دستک دے کر مجھ سے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کیا تم دونوں بیدار نہیں ہوتے اور نماز نہیں پڑھ رہے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب وہ جگانا چاہتا ہے تو ہمیں جگا دیتا ہے۔ ”یہ سن کر آپ ازراہ افسوس اپنی ران پر ہاتھ مارتے اور یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ ”انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔“^①

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رات کو سویا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جگایا؛ اور آپ کے اسلوب کلام کو پسند نہیں فرمایا تھا؛ اور آپ یہ کہتے ہوئے واپس چلے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ ”انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔“

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ ”لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رات کی نمازیں اور دن کے نوافل سیکھے۔“
[جواب]: اگر شیعہ کی مراد یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے یہ باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ تمام صحابہ نے کچھ نہ کچھ لوگوں کو تعلیم دی ہے۔ [لوگ ہمیشہ اپنے اکابر سے اچھی باتیں سیکھتے چلے آئے ہیں] اور اگر شیعہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اکثر [یا سب] لوگوں نے یہ آداب آپ سے سیکھے تو یہ بڑا کمروہ [اور ٹھنڈا] جھوٹ ہے۔ [اس لیے کہ صحابہ نے یہ باتیں نبی کریم ﷺ سے سیکھی تھیں، جہاں تک تابعین کا تعلق ہے] ان میں سے اکثر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تک نہ تھا۔ [ان سے آداب عبادت سیکھنا تو درکنار]۔ مگر وہ راتوں کے شب بیدار دن کو نمازیں پڑھنے والے تھے۔ اکثر بلاد اسلامیہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح ہوئے۔ جیسے شام، مغرب، خراسان [وغیرہ]۔ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا بھی نہیں تھا، کچھ سیکھنا تو درکنار رہا۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں صحابہ کرام کا یہی حال تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ان چیزوں کی تعلیم پائی۔ اس قسم کے دعویٰ صرف اہل کوفہ کے متعلق ممکن ہے۔ اور ان کے بارے میں بھی سبھی جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تعلیم پائی تھی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ آمد سے قبل لوگوں میں علم و عمل کے لحاظ سے سب سے کامل لوگ تھے۔ یہی حال باقی صحابہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کا ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سب وقت ادعیہ ماثورہ پڑھتے ہوئے گزرتا تھا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ادعیہ زیادہ تر موضوع ہیں۔^②

ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اور صحابہ کرام کی شان اس سے بہت بلند تھی کہ وہ اس قسم کی دعائیں پڑھا کرتے۔ ان میں سے کسی دعا کی کوئی سند ہی نہیں۔ سب سے افضل دعائیں وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ سے منقول اور ثابت ہیں۔ اور اس امت کے اولین و آخرین میں سے بہترین لوگ یہی دعائیں کیا کرتے تھے۔

① صحیح مسلم۔ کتاب صلاة المسافرين باب الحث علی صلاة اللیل (حدیث: ۷۷۵)۔

② محمد باقر امجدانی (۱۰۳۷-۱۱۱۰) نے ادعیہ ماثورہ پر مشتمل ایک کتاب ”زاد المعاد“ نامی ۱۱۰۷ھ میں شاہ حسین صفوی کیلئے تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب خلاف دین اکاذیب کا مجموعہ ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن اور رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔“

[جواب]: یہ ایسا باطل جھوٹ ہے جس میں مدح کا کوئی پہلو نہیں۔ بیشک شب و روز میں نبی کریم ﷺ کی جموی فرض و نفل نماز چالیس رکعت تھی۔ ایک امیر امت جو لوگوں کے امور متنازعہ فیصلے کرتا اور ان کے سیاسی مصالح میں مشغول رہتا ہو وہ ایک ہزار رکعت ادا کرنے پر اسی صورت میں قادر ہو سکتا ہے جب وہ کوئے کی طرح ٹھونگے مارنے والی نماز ادا کرتا ہو۔ یہ منافقین کی نماز ہے؛ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن ایسی بے کار نماز سے پاک ہے۔

جہاں تک صفین کی راتوں میں ذکر کا تعلق ہے تو صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”وہ اذکار جو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے سکھائے تھے؛ جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کی زبانی سنے ہیں؛ کبھی انہیں ترک نہیں کیا۔“ آپ سے پوچھا گیا: ”صفین کی راتوں میں بھی؟ تو آپ نے فرمایا: ”صفین کی راتوں میں بھی انہیں ترک نہیں کیا؛ سحر کے وقت مجھے یاد آگیا تو میں نے وہ اذکار پڑھ لیے تھے۔“ [مسند احمد: ۱۸۳۸]

جہاں تک آپ کے جسم سے لوہا نکالنے کی بات ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ کبھی آپ کو ایسے لوہا لگا ہو؛ کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کے دوران زکوٰۃ ادا کر دی تھی۔“ [یعنی نماز اور زکوٰۃ کو جمع کیا]۔

[جواب]: یہ بھی صریح جھوٹ ہے، جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا؛ نیز اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا کرنا مستحب ہوتا تو اسے مسلمانوں کے لیے مشروع کیا ہوتا۔ اور اگر مسلمان نماز میں صدقہ دینے کو مستحب سمجھ رہے ہوتے تو وہ ضرور ایسا کرتے۔ جب مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اس چیز کو مستحب نہیں سمجھا تو پتہ چلا کہ شرعاً نماز میں ایسی حرکت کرنا ناروا [مکروہ] ہے۔

یہی حال نذر ماننے اور چار درہم صدقہ کرنے والے قصہ کا ہے؛ یہ تمام جھوٹ ہے۔ نیز اس میں مدح کا کوئی پہلو نہیں۔

شیعہ مصنف کہتا ہے کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے تھے۔“

یہ صریح کذب ہے اور اسے ایک جاہل شخص ہی تسلیم کر سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار تو کیا ایک سو غلام بھی آزاد نہیں کیے تھے۔ بلکہ اپنی کمائی سے آپ اس کا عشر عشر بھی انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کوئی فن نہیں جانتے تھے کہ آپ کمائی کرتے ہوں۔ آپ زیادہ تر یا تو جہاد میں مشغول رہتے تھے یا بعض دوسرے امور میں۔ آپ کوئی تجارت بھی نہیں کرتے تھے۔ صنعت و حرفت سے نا آشنا تھے، پھر ایک ہزار غلام آزاد کرنا آپ کے لیے کیوں ممکن تھا؟

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ”علی رضی اللہ عنہ مزدوری کر کے شعب ابی طالب میں نبی کریم ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے۔“

[جواب]: یہ کئی وجوہات کی بنا پر صریح کذب ہے۔

پہلی وجہ: اس لیے کہ بنو ہاشم شعب ابی طالب سے باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ وہاں اندر ایسا کوئی شخص نہ تھا جو اجرت دے کر ان سے کام لیتا۔

دوسری وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب بھی گھائی میں موجود تھے؛ وہ ان پر خرچ کیا کرتے تھے۔

تیسری وجہ: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بڑی مال و اراخاتون تھیں، وہ اپنا مال خرچ کرتی تھیں۔

چوتھی وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے کبھی بھی مکہ میں مزدوری نہیں کی۔ مزید برآں شعب ابی طالب کی محصوری کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے؛ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی؛ یا تو ابھی بالغ ہوئے تھے؛ یا پھر حد بلوغت کو بھی نہیں پہنچے تھے [اور آپ کسی مزدوری کے قابل نہ تھے] بلکہ وہاں آپ پر خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ خرچ یا تو نبی کریم ﷺ کیا کرتے تھے یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد محترم۔ اس وقت آپ اس مرحلہ میں بھی نہیں پہنچے تھے کہ اپنے آپ پر خرچ کرتے تو پھر کسی دوسرے پر کیسے خرچ کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ نقل متواتر سے ثابت ہے کہ شعب ابی طالب میں حصار کا واقعہ ابو طالب کی زندگی میں پیش آیا تھا۔ اور ابو طالب کا انتقال رسول اللہ ﷺ کے طائف جانے سے پہلے ہوا تھا۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موت کے واقعات قریب قریب کے اوقات کے ہیں۔ جب کہ شعب ابی طالب میں دخول شروع اسلام کا واقعہ ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی پیدائش شعب ابی طالب میں حصار کے دوران ہوئی۔ اور نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو ابھی ابن عباس بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد چالیس سال تک زندہ رہے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ بعث نبوی ہجرت سے تیرہ سال پہلے ہوئی تھی۔ بوقت وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ سے زیادہ عمر تیسھ سال تھی۔ پس اسلام کے وقت آپ کی حد سے زیادہ عمر دس سال ہو سکتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ أعلم الناس تھے:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ أعلم الناس تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اہل سنت والجماعت اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اہل سنت والجماعت کے علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ”أعلم الناس“ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ ”کئی علماء کرام نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔ اس مسئلہ میں اپنی جگہ پر بڑے وسیع اور مضبوط دلائل ہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شخص فیصلہ صادر کرتا نہ فتویٰ دیتا اور نہ وعظ کہہ سکتا تھا۔ جب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی دینی معاملہ میں شبہ ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شبہ کا ازالہ کیا۔ جب نبی کریم ﷺ کی وفات لوگوں پر مشتبہ ہو گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کا یہ شبہ دور کیا تھا۔ پھر انھیں آپ کی تدفین میں شبہ لاحق ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا ازالہ کیا۔ پھر ناعین زکوٰۃ سے خبر دینا ہونے کے بارے میں تنازع پٹا ہوا تو آپ نے نص کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس کی حقیقت واضح کی۔ پھر [عمرہ کے لیے مسجد الحرام داخلے کے بارے میں شبہ ہوا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ أَمِينِينَ﴾ (الفتح: ۲۷)

”اگر اللہ نے چاہا تو تم خانہ کعبہ میں کامل امن و امان سے داخل ہو گے۔“ [تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شبہ کو رفع کیا۔]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کی تشریح کی تھی کہ: ”اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اختیار دیا تھا کہ دنیا و آخرت میں سے جسے چاہو پسند کر لے۔“^①

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو بتایا کہ کمالہ کسے کہتے ہیں؛ پھر اس بارے میں کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔^② حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے بھی آپ سے [روایت حدیث میں] استفادہ کیا تھا۔ جیسا کہ سنن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرماتے ہیں: ”جب میں نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو جتنا فائدہ اللہ تعالیٰ چاہتے مجھے پہنچاتے؛ اور جب کوئی اور دوسرا شخص مجھے حدیث سنتا تو میں اس سے حلف لیتا؛ جب وہ حلف اٹھاتا تو میں اس کی تصدیق کرتا؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور انھوں نے سچ کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص بھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر وضوء کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا اور اللہ سے اپنے گناہ کی مغفرت طلب کرتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے۔“^③

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کوئی ایک فتویٰ بھی ایسا منقول نہیں جو نص کے خلاف ہو۔ جبکہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسے فتاویٰ منقول ہیں جو نصوص کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ نے حضرت علی بن ابی طالب اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف پر ایک مجلد کتاب لکھی ہے۔ اور امام محمد بن نصر المروزی نے ان اختلافات پر ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ صحابہ کرام کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کیساتھ دادا کی میراث میں اختلاف ہوا ہے؛ مگر حق بات وہی ہے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ ایک مستقل کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس میں ہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قول کے صحیح ہونے کی دس وجوہات بیان کی ہیں۔ جب کہ جمہور صحابہ میں سے دس سے زائد حضرات اس مسئلہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں۔ جن لوگوں سے اختلاف نقل کیا گیا ہے؛ ان میں حضرت زید اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما شامل ہیں اور ان کے اقوال بھی اضطراب کا شکار ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق بات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

[فضائل شیخین:]

بہت سے علماء نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے۔ ان اجماع نقل کرنے والوں میں شافعیہ کے ایک بڑے امام منصور بن عبد الجبار سمعانی مروزی کا نام بھی شامل ہے۔ آپ اپنی کتاب ”تقویم الاولیاء“ میں کہتے ہیں: ”علماء اہل سنت کا اجماع ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے۔“ اور ایسے ہوتا بھی کیوں نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں فتویٰ دیتے؛ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے؛ برائی سے

- ① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ، سدوا الابواب الا باب ابی بکر (ح: ۳۶۵۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ح: ۲۳۸۲)
- ② مصنف عبد الرزاق، (۱۹۱۹۰، ۱۹۱۹۱)، سنن الدارمی (۳/ ۳۶۵-۳۶۶)، سنن کبریٰ بیہقی (۶/ ۲۲۴)
- ③ سنن ابی داؤد۔ کتاب الوتر۔ باب فی الاستغفار (ح: ۱۵۲۱)، سنن ترمذی کتاب الصلاة، باب ما جاء فی الصلاة عند التوبة (ح: ۴۰۶)، سنن ابن ماجہ۔ کتاب اقامة الصلوات، باب ما جاء فی صلاة کفارة (ح: ۱۳۹۵)۔

منع کرتے؛ خطبہ ارشاد فرمایا کرتے۔ آپ ایسا اس وقت کیا کرتے جب آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے۔ اور جب آپ نے ہجرت کی۔ اور حنین کے موقع پر اور دیگر مغازی میں بھی ایسا ہوا۔ نبی کریم ﷺ خاموش رہے اور آپ کے فرمودات کو برقرار رکھا۔ یہ مرتبہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

نبی کریم ﷺ اہل فقہ ورائے سے مشورہ کرتے وقت شوری میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو دوسروں پر مقدم رکھا کرتے تھے۔ یہی وہ دو شخصیات تھیں جو علمی مسائل میں گفتگو کیا کرتے تھے؛ اور آنحضرت ﷺ ان دونوں کو باقی تمام صحابہ پر مقدم کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق اور دیگر امور میں مشورہ۔ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں فرمایا:

”جب تم دونوں کسی بات پر متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کیا کروں گا۔“ [مسند احمد (۴/۲۲۷)]

سنن میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو۔“ ❶

یہ مقام ان دو حضرات کے علاوہ کسی کو نہ مل سکا۔ بلکہ آپ نے فرمایا:

”تم میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے۔“ [تخریج ذریعہ]۔

اس میں خلفاء اربعہ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؛ اور ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اقتداء کے ساتھ بطور خصوص ذکر

کیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اقوال و افعال کی سنت میں متقدمی کا مرتبہ تبع کے مرتبہ سے اوپر ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ دوران سفر بہت سے مسلمان تھے۔۔۔۔۔ ایک لمبی حدیث ہے؛ جس میں آپ نے فرمایا۔ ”اگر لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کریں گے تو راہ راست پر قائم رہیں گے۔“ [مسلم ۴۷۲/۱]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ وہ کتاب اللہ سے فتویٰ دیا کرتے؛ جب وہاں کوئی بات نہ ملتی تو سنت میں حل تلاش کرتے؛ اگر وہاں بھی کوئی نص نہ پاتے تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ معاملہ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ نہیں کیا کرتے تھے۔ ابن عباس حبر امت تھے؛ اور اپنے زمانہ کے صحابہ میں سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ ترجیحاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی:

”اے اللہ! اسے دین کا فہم عطا کر اور قرآن کی تفسیر سکھا دے۔“ ❷

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو باقی تمام صحابہ میں خصوصیت حاصل تھی۔ ان میں بھی زیادہ خصوصیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اس لیے کہ آپ عام طور پر رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھ کر علوم دین اور مصالح مسلمین کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ابوبکر ابن ابی شیبہ نے روایت کیا؛ آپ فرماتے ہیں: ہم سے ابو معاویہ نے حدیث بیان کی؛ ان سے اعمش نے اور ان سے ابراہیم نے؛ ان سے حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ نے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ”نبی کریم ﷺ

❶ سنن ترمذی، کتاب المناقب باب (۱۶/۳۵) (حدیث: ۳۶۶۲)، سنن ابن ماجہ۔ المقدمة۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۹۷)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب المساجد۔ باب قضاء الصلاة الفائتة (ح: ۶۸۱)، مطولاً۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختلف امور کے سلسلہ میں بات چیت کیا کرتے تھے، میں بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔
صحیحین میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اصحاب صفہ غریب لوگ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

”جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو ان میں سے لے جائے۔ اور اگر چار کا ہو تو پانچواں اور چھٹا ان میں سے لے جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمی لے گئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس لے گئے۔“

حضرت عبدالرحمن کہتے ہیں: ”..... ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں کھانا کھایا اور وہیں عشاء کی نماز ادا کی اس کے بعد بھی اتنی دیر ٹھہرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ لگی گئی۔ اس کے بعد اپنے گھر میں آئے ان سے ان کی بی بی نے کہا کہ تمہیں تمہارے مہمانوں سے کس نے روک لیا؟ یا یہ کہ تمہارے مہمان انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بولے: کیا تم نے انہیں کھانا نہیں کھلایا؟ انہوں نے کہا: آپ کے آنے تک ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا: کھانا ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا مگر انہوں نے نہ مانا.....“ [صحیح بخاری: حدیث نمبر 575]

ایک روایت میں آپ فرماتے ہیں: ”میرے والد رات کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ”ہجرت کے موقع پر میرے باجی کے سوا آپ ﷺ کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔“ اور جنگ بدر میں سائبان کے نیچے نبی کریم ﷺ کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔“

[نبی کریم ﷺ نے مرض الموت میں] فرمایا:

”میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور فاقہ کشی کا ممنون ہوں۔ اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں۔“ [بخاری (ح: 3654) مسلم، (ح: 2382)]

یہ سب سے صحیح ترین اور مشہور حدیث ہے جسے کئی صحیح اسناد سے صحاح ستہ میں روایت کیا گیا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ”میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا، اسی دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے کا کنارہ پکڑے ہوئے آئے اور اپنے دونوں زانوں ننگے کر دیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگو! تمہارا ساتھی کسی سے جھگڑ پڑا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلام کے بعد عرض کیا: میرے اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تنازع تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لیا، پھر مجھے ندامت کا احساس ہوا تو میں نے کہا: ”معاف کر دیجیے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، میں اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تمہیں معاف فرمائے۔“

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نادام ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کو آئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نہ پا کر وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذکر دوبار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے میری ہمدردی کی۔ اب کیا تم میرے رفیق کو میرے لیے رہنے دو گے یا نہیں؟“ آپ نے دومرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے رنج نہ پہنچایا۔“ [بخاری، (ح: 3661)]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ خیر کے کام میں سبقت لے گئے تھے۔

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ ابوسفیان نے احد کے دن رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں سوال کیا تھا؛ اس کے لیے وہ خود اور دیگر تمام لوگ جانتے تھے کہ یہی لوگ اسلام کے اصل سردار ہیں؛ اور اسلام ان لوگوں کے ساتھ قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے منصب و مقام کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ”ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو درجہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں حاصل تھا، وہ آپ کی وفات کے بعد بھی اسی مرتبہ پر قائم رہیں۔“ یہ سن کر ہارون نے دوبار کہا: ”اے مالک! آپ نے مجھے تشفی بخش جواب دیا۔“

صحبت میں کثرت کے ساتھ اختصاص؛ کمال مودت و الفت و محبت؛ علم اور دین میں مشارکت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ دوسروں لوگوں سے بڑھ کر اس معاملہ کے حق دار تھے۔ جو کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال سے واقف ہے؛ اس کے لیے یہ بات کھلی ہوئی اور واضح ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ علم و فقہ کے حصول میں اس طرح سے قائم تھے کہ دوسرے لوگ اس سے عاجز آگئے تھے؛ آپ باقی لوگوں کے لیے مسائل کی وضاحت کرتے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی ایسا قول منقول نہیں جو خلاف نص ہو۔ یہ بات علم میں آپ کے تجر و مہارت کی نشانی ہے [اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی علمی فوقیت کا اظہار ہوتا ہے]۔ جب کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کئی اقوال نصوص کے خلاف منقول ہیں اس لیے کہ ان لوگوں تک یہ نصوص [شرعی دلائل] نہ پہنچ پائی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نصوص [شرعی دلائل] سے موافقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موافقات سے زیادہ ہیں۔ یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علمی مسائل؛ ان میں علماء کے اقوال اور شرعی ادلہ اور ان کے مراتب کی معرفت ہو۔ اس کی مثال بیوہ کی عدت کو لیجیے۔ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہی نص کے موافق ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ ایسے ہی حرام کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کا قول نصوص [شرعی دلائل] کے زیادہ موافق ہے۔ اور ایسے ہی وہ عورت جسے اس کے شوہر نے طلاق کا اختیار دے رکھا ہو؛ اور ایسے ہی وہ عورت جس کا مہر اس کے سپرد کر دیا گیا؛ اور غلیہ؛ بریہ؛ بامین؛ اور طلاق البتہ؛ اور دوسرے بہت سارے فقہی مسائل کا یہی حال ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اُمم سابقہ میں ملہم موجود تھے، اگر میری امت میں کوئی ملہم من اللہ ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔“

بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے خواب میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں دودھ تھا، وہ میں نے پی لیا، یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا، پھر جو بیچ گیا میں نے وہ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا: ”پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟“ فرمایا: ”دودھ سے علم مراد ہے۔“

ترمذی کی ایک روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر میں مبعوث نہ کیا گیا ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے۔“

صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، (ح: ۳۶۸۹)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، (ح: ۲۳۹۸)، عن عائشة رضی اللہ عنہا۔
 ① صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۳۶۸۱)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۲۳۹۱)

ترمذی میں ہی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔“ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔^①

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے نمازیں پڑھانے کے لیے، جو کہ اسلام کا اصلی ستون ہے؛ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا۔ اور نبی کریم ﷺ کے حج کرنے سے پہلے مناسک حج ادا کرانے کے لیے بھی آپ کو ہی امیر بنایا گیا؛ اور مکہ میں منادی کرائی گئی کہ: اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے۔

پھر آپ کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو آپ نے پوچھا: کیا امیر بن کر آئے ہو یا مامور بن کر؟
تو عرض کی: مامور بن کر۔ پس اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر کیا۔
آپ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات سننے اور حکم ماننے کا حکم دیا تھا۔ یہ اس غزوہ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں جانشین مقرر کیا گیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مرتب کردہ کتاب صدقات سب سے آخری اور صحیح ترین کتاب ہے؛ اسی لیے فقہاء کا اس پر عمل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں تھیں؛ وہ متقدم اور منسوخ تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ناسخ و منسوخ میں بھی دوسروں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں نبی کریم ﷺ کے علم سے زیادہ واقف تھے۔“^②

ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی بھی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا فیصلہ کر دیا؛ اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ آپ کے زمانہ میں کسی ایک بھی ایسے مسئلہ کا علم نہیں ہو سکا جس میں اختلاف ہوا ہو اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ جھگڑا اور اختلاف ختم نہ ہوا ہو۔ مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ کی وفات پر آپ کی تدفین؛ میراث؛ لشکر اسامہ کی روانگی؛ مانعین زکوٰۃ سے جنگ؛ اور ان کے علاوہ دوسرے کئی بڑے مسائل بھی ہیں۔
آپ رضی اللہ عنہ صحیح معنوں میں لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے سچے خلیفہ تھے۔ انہیں تعلیم دیتے؛ ان کی اصلاح کرتے؛ انہیں آئینہ بنادیتے؛ اور مسائل کو ایسے دلائل سے واضح کرتے کہ شبہ اٹھ جاتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔

آپ کے بعد کوئی دوسرا ایسا نہیں آیا جو علم و کمال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علم و کمال کو پہنچ سکتا ہو۔ پس وہ لوگ بعض مسائل میں اختلاف کیا کرتے تھے؛ جیسا کہ دادا اور بھائی کی میراث میں؛ حرام میں؛ تین طلاق کے مسئلہ میں؛ محدۃ الحج میں اختلاف؛ طلاق بائین والی عورت کے نان و نفقہ اور رہائش کے بارے میں اختلاف۔ اور ان کے علاوہ دیگر ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن میں عہد ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اختلاف نہیں ہوا تھا۔ جب کہ حضرت عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کے بہت سارے اقوال میں مخالفت کیا کرتے تھے۔ لیکن کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دیا ہو؛ یا فیصلہ کیا

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب (۱۷/۵۲)، (حدیث: ۳۶۸۶)

② صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”سدوا الابواب الا باب ابی بکر“ (ح: ۳۶۵۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ح: ۲۳۸۲)۔

اور لوگوں نے اس میں آپ کی مخالفت کی ہو۔ یہ آپ کے سب سے بڑے عالم ہونے کی نشانی ہے۔
 آپ رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام بنے اور آپ نے صحیح معنوں میں اسلام کو قائم کیا؛ اور کسی چیز میں خلل نہیں ڈالا؛
 بلکہ لوگوں کو اسی دروازہ سے واپس اسلام میں داخل کیا جس سے وہ نکل گئے تھے؛ حالانکہ اس وقت بہت بڑی تعداد میں آپ
 کے مخالفین موجود تھے جو کہ مرتد ہو چکے تھے۔ بہت سارے رسوائی چاہنے والے تھے۔ مگر آپ کی وجہ سے ان لوگوں کا دین و
 ایمان مکمل ہوا؛ اس باب میں کوئی دوسرا آپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔

لوگ آپ کو خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا خطاب دیا کرتے تھے۔ پھر آپ کی موت سے یہ اتصال لفظی منقطع ہو گیا۔ ابو القاسم
 سیہلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس وقت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے اسرار لفظی اور معنوی طور پر ظاہر ہوئے:
 ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْوَفَنَّ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰]
 ”جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اس لیے کہ لوگوں نے آپ کو خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا خطاب دیا تھا جو کہ آپ کی موت کے ساتھ ہی منقطع ہو گیا۔
 مزید برآں یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بعض سنتوں کی تعلیم پائی۔ جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے
 حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اس کی وضاحت اس چیز سے ہوتی ہے کہ وہ علمائے کوفہ جنہوں نے حضرت عمرو علی رضی اللہ عنہ
 کی صحبت پائی؛ جسے: علقمہ؛ الاسود؛ شریح وغیرہم؛ یہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر ترجیح دیا
 کرتے تھے۔ جبکہ مکہ و مدینہ اور بصرہ کے تابعین کے ہاں تو یہ بات اتنی زیادہ ظاہر و مشہور تھی کہ اس کے ذکر کی ضرورت ہی
 نہیں۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علم کوفہ میں آپ کی مدت خلافت کے قیام کے لحاظ سے ظاہر ہوا۔ وہ تمام شیعیان علی رضی اللہ عنہ جو
 آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے؛ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ آپ کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر علم و
 عمل؛ فقہ اور دین میں سے کسی ایک چیز میں بھی ترجیح دیتا ہو۔ بلکہ وہ تمام شیعہ جو آپ کے ساتھ ملکر شریک جنگ تھے؛ ان کا
 عام مسلمانوں کے ساتھ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت و تقدیم پر اتفاق تھا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو آپ کی بات بھی
 نہیں مانتے تھے؛ بلکہ آپ کو برا بھلا کہتے؛ حقیر جاننے اور مذمت کرتے تھے۔ اس وقت یہ قلیل تعداد چند ایک حقیر قسم کے
 ادبаш تھے جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

یہ تین قسم کے لوگ تھے: ان میں سے ایک گروہ وہ تھا جنہوں نے آپ کی شان میں غلو کیا؛ اور آپ کے رب ہونے کا
 دعویٰ کرنے لگے۔ ان لوگوں کو آپ نے آگ میں جلا ڈالا تھا۔

ان میں سے ایک دوسرا گروہ ایسا بھی تھا جنہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کا اظہار کیا؛ ان کا سرغنہ عبد اللہ بن
 سباء تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے؛ مگر وہ مدائن کی طرف بھاگ گیا۔

ایک گروہ آپ کی فضیلت کا قائل تھا؛ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

”جس شخص کے متعلق مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر حد قذف قائم کروں گا۔“^①

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقریباً اسی مختلف طرق سے مروی ہے کہ انھوں نے کوفہ میں اپنے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

”لوگو آگاہ ہو جاؤ! اس امت میں نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل ہستیوں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔“

امام بخاری اور دوسرے محدثین نے ہمدان کے کچھ لوگوں سے روایت کیا ہے؛ جو کہ آپ کے خواص سمجھے جاتے تھے؛ جن کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

”اگر میں جنت کا دربان ہوتا تو ہمدانیوں سے کہتا: سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔“

ان لوگوں نے محمد بن حنفیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا بیٹا! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں؟ میں نے کہا: ”نہیں“ فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ میں نے عرض کیا ان کے بعد کون؟ فرمایا: عمر۔ میں نے کہا: پھر اسکے بعد آپ ہیں؟ فرمایا: بیشک تمہارا باپ تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہے۔“^۱

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد بن كثير؛ حدثنا سفيان الثوري، حدثنا جامع بن شداد، حدثنا أبو يعلى منذر الثوري، عن محمد ابن الحنفية، قال: قلت لأبي: يا أبت من خير الناس بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فقال: يا بني! أو ما تعرف؟ فقلت: لا، فقال: أبو بكر، قلت: ثم من؟ قال: ثم عمر))

”محمد بن حنفیہ فرماتے ہیں کہ: ”میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے میرے اباجی! نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا بیٹا! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں؟ میں نے کہا: ”نہیں“ فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ“ میں نے عرض کیا: ان کے بعد کون؟ فرمایا: ”عمر رضی اللہ عنہ۔“

یہ باتیں آپ اپنے بیٹے سے کہہ رہے ہیں جس سے کوئی تقیہ بھی نہیں کر رہے۔ اور اپنے خواص لوگوں کو بتا رہے ہیں۔ اور اس انسان کو سزا دینے کا اعلان کرتے ہیں جو آپ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہے؛ آپ کی نظر میں وہ تہمت باز ہے۔ جب کہ متواضع کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو آپ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہو اس لیے کہ وہ حق بات کہہ رہا ہے؛ اور نہ ہی اسے مفتری [تہمت باز] کہنا جائز ہوتا۔“

جو کوئی بھی آپ سے افضل تھا؛ خواہ وہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہو یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے؛ وہ آپ سے بڑا عالم بھی ہے۔ اس لیے کہ فضیلت کی اصل بنیاد علم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر ۹]

”فرمادیجیے: کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔“

اس مسئلہ پر دلائل بھی بہت زیادہ ہیں اور علماء کرام کا کلام بھی بہت زیادہ ہے۔

۱ البخاری، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذاً خليلاً“ (ح: ۳۶۷۱)۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑے قاضی؟]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”أَفْضَاكُمُ عَلِيٌّ“۔

”سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں۔“ اور فیصلہ کرنا علم خصومات و دین کو مستلزم ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں حدیث: ”أَفْضَاكُمُ عَلِيٌّ“ ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی اسناد معلوم نہیں تاکہ اس

سے احتجاج کیا جاسکے، اس سے یہ حدیث صحیح تر ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حلال و حرام کے بہت بڑے عالم ہیں۔^①

حلال و حرام کا علم دین اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے؛ یہ علم حلال و حرام سے زیادہ علم قضاء کو شامل ہے۔ شیعہ کی ذکر کردہ حدیث سنن مشہورہ اور معروف مسانید میں سے کسی ایک میں بھی صحیح یا ضعیف سند کے ساتھ مندرج ہی نہیں۔ یہ جس اسناد کے ساتھ مروی ہے اس میں مہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ”عَلِيٌّ أَفْضَانَا“ علی صحابہ میں ایک بڑے قاضی تھے۔“

یشک قضاء فصل خصومات کو کہتے ہیں۔ یہ ظاہر کے اعتبار سے ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ حقیقت حال کے برعکس صادر کیا جاتا ہے، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”تم میرے پاس فصل خصومات کے لیے آتے ہو۔ اس بات کا احتمال ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنا نقطہ نظر زیادہ

وضاحت سے بیان کر سکتا ہو اور میں جس طرح سنوں اس اعتبار سے اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دوں۔ پس یاد رکھو

جس شخص کے لیے میں نے اس کے مسلمان بھائی کے حق میں سے کچھ فیصلہ کر دیا؛ تو وہ اسے نہ لے۔ یشک میں نے

اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔“^②

اس حدیث میں سالار رسل ﷺ نے واضح کیا کہ آپ کے فیصلہ کر دینے سے حلال چیز حرام ہو جاتی ہے نہ حرام چیز

حلال ٹھہرتی ہے۔ حلال و حرام کا علم ظاہر و باطن دونوں کو شامل ہے۔ جو حلال و حرام کا بڑا عالم ہو وہ دین کا بڑا عالم ہے۔

مزید برآں یہ کہ قضا کی دو اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ دو فریق جھگڑ رہے ہوں ان میں فیصلہ کیا جائے۔

یعنی ایک انسان کسی چیز کا دعویٰ کر رہا ہے اور دوسرا اس کا منکر ہے؛ تو ان دونوں کے مابین فیصلہ ثبوت کے اعتبار سے ہوگا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ: اس میں کسی کو انکار نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کے حق کا اعتراف کر رہے ہیں؛ لیکن ان کو علم نہیں کہ

دوسرے کا کیا استحقاق ہے۔ مثلاً وراثت میں جھگڑا؛ یا زوجین کا آپس میں حقوق کا جھگڑا یا دو شریک کاروں کا باہمی معاملہ۔

پس یہ علم بھی علم حلال و حرام کا ایک باب ہے۔ جب انہیں کوئی ایسا آدمی فتویٰ دیدے جس کی بات پر دونوں فریق راضی

ہوں تو یہ ان کے لیے کافی ہے۔ پھر ان کے درمیان فیصلہ کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ فیصلہ کرنے والے کی ضرورت اس وقت

پڑتی ہے جب وہ اس کا انکار کر رہے ہوں۔ غالب طور پر یہ فتنہ و فحور کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی نسیان کی وجہ سے بھی۔

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زید بن ثابت ؓ (حدیث: ۳۷۹۰، ۳۷۹۱)، سنن ابن ماجہ، المقدمة۔ باب فضائل خباب ؓ (حدیث: ۱۵۴)۔

② صحیح بخاری، کتاب الشهادات باب من اقام البینة بعد الیمین (حدیث: ۲۶۸)، صحیح مسلم، کتاب الأفضیة، باب بیان ان حکم الحاکم لا یمیر الباطن، (حدیث: ۱۷۱۳)۔

پس جن لوگوں کا قضاء کے ساتھ تعلق نہیں ہے؛ انہیں اس علم کی ضرورت بھی نہیں؛ سوائے چند نیک افراد کے۔ جب کہ حلال و حرام کے علم کی ضرورت تمام لوگوں کو ہوتی ہے خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فیصلہ کرنے کے لیے قاضی بنایا تو ایک سال تک آپ کے پاس دو آدمی بھی اپنا جھگڑا لے کر نہیں آئے۔ اگر اس قسم کے نبی کریم ﷺ کے تمام فیصلوں کو جمع و شمار کیا تو ان کی تعداد دس تک بھی نہیں پہنچتی۔ تو پھر اس کی اُس حلال و حرام کے سامنے کیا اہمیت ہے جو دین اسلام کی اصل بنیاد ہے۔ جب کہ خود نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

”حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حلال و حرام کے بہت بڑے عالم ہیں۔“ [اس کی تخریج گزر چکی ہے۔]

اس کی سند صحیح تر اور دلالت میں صاف واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری روایت سے یہ استدلال کرنے والا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے؛ جاہل انسان ہے۔ تو پھر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے عالم تھے۔ حالانکہ وہ حدیث جس میں حضرت معاذ اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے بعض علماء اسے ضعیف کہتے ہیں اور بعض اسے حسن کہتے ہیں۔ اور جس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے وہ سرے سے ضعیف اور باطل ہے۔

[حدیث ”أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ“ کی حیثیت:]

شیعہ کی پیش کردہ حدیث ”أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا“ حد درجہ ضعیف اور اوہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اسے ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ تاہم یہ موضوعات میں شمار کی جاتی ہے۔^①

ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اس کے جملہ طرق موضوع ہیں۔“ اس کا متن خواہ اس کے موضوع ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ جب آپ ﷺ کی ذات علم کا شہر ہوئی اور اس کا دروازہ صرف ایک (حضرت علی رضی اللہ عنہ) ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے اقوال و ارشادات کے مبلغ صرف علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اس سے دین اسلام کا فساد لازم آتا ہے۔ لہذا اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ سے علم پہنچانے کے لیے صرف ایک شخصیت کا ہونا جائز اور کافی نہیں؛ بلکہ آپ کے اقوال و ارشادات کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے اتنے کثیر التعداد لوگ ہونے چاہئیں کہ جن سے غائب لوگوں تک خبر متواتر حاصل ہو۔ اس لیے کہ خبر واحد سے قرآن کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور کبھی خبر واحد اکثر لوگوں سے منشی یا مخفی ہوتی ہے۔ پس انہیں وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو قرآن اور احادیث [وسنن] متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ علی رضی اللہ عنہ اگرچہ واحد ہیں، مگر معصوم ہیں، اس لیے آپ کی خبر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ شیعہ پہلے آپ کا معصوم ہونا ثابت کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معصومیت ان کے قول ہی سے ثابت نہیں ہو جائے گی؛ اس دعویٰ سے پہلے عصمت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کرنے سے دور لازم آتا ہے۔

① سنن ترمذی کتاب المناقب، باب (۷۳/۲۰)، (حدیث: ۳۷۲۳)، بلفظ ”انا دار الحکمة و علی بابها“ و سندہ ضعیف، شریک قاضی راوی مدلس ہے۔ مستدرک حاکم (۱۲۶/۳، ۱۲۷) باسناد آخر ضعیف۔

اور اجماع سے بھی آپ کا معصوم ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ آپ کی معصومیت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ اگرچہ امامیہ کے ہاں اجماع اس لیے حجت ہے کہ اس میں امام معصوم کی رائے بھی شامل ہے۔ مگر بات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ صرف اس دعویٰ کرنے سے کام نہیں بنے گا؛ اس پر معصوم ہونے کے لیے ثبوت بھی چاہیے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر دعویٰ عصمت حق ہوتا تو امام معصوم کے خبر دینے کے علاوہ بھی کسی ذریعہ سے اس کا علم ہونا ضروری تھا۔

پھر یہ بھی ہے کہ اگر اس شہر علم کا آپ کے علاوہ کوئی دروازہ نہ بھی ہو تو تب بھی اس سے نہ ہی عصمت ثابت ہوگی اور نہ ہی باقی امور دین۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت کسی زندیق نے گھڑی ہے؛ جسے جاہل لوگ مدح خیال کرتے ہیں؛ حالانکہ اس سے اسلام میں قدح لازم آتی ہے؛ اس لیے کہ دین اسلام صرف ایک فرد واحد سے نہیں پھیلا۔

پھر یہ بات متواتر حقائق کے بھی خلاف ہے۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ سے کتاب و سنت کا جو علم اکناف عالم پر محیط اسلامی شہروں میں پھیلا تھا اور اس سے سب کمرۂ ارضی معور ہو چکا تھا؛ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بڑا کردار ہے۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ کے احوال تو صاف ظاہر ہیں [کسی بیان کی ضرورت نہیں]۔ یہی حال بصرہ اور شام کا بھی ہے۔ ان شہروں کے علماء کی نبی کریم ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منفرد روایات حد درجہ قلیل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کی غالب روایات اہل کوفہ کے ہاں ہیں۔

اور اہل کوفہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسند خلافت پر متمکن ہونے سے بھی پہلے قرآن و سنت جانتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو بہت بعد میں آئے۔

[پھر یہ بات کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نبی کریم ﷺ کے علم کا واحد دروازہ تھے]۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فقہاء مدینہ [میں اجلہ تابعین وہ تھے] جنہوں خلافت فاروقی میں اکتساب علم کیا۔ [جو خلافت عثمانی سے بھی پہلے کے تربیت یافتہ تھے نہ کہ علوی خلافت کے]۔ ایسے ہی [حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو جو تعلیم دی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعلیمات سے بہت بڑھ کر تھی؛ اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ عرصہ یمن میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یمن کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات سے بڑھ کر ہیں۔ حضرت شریح اور دوسرے اکابر تابعین نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ دار کوفہ ہوئے تو [وہاں جلیل القدر تابعین کی خاصی تعداد موجود تھی۔ مثلاً] شرح وہاں کے قاضی تھے؛ انہوں نے اور عبیدہ سلیمانی [اور دوسرے فقہاء جیسے علقمہ، مسروق اور ان کے نظائر و امثال] نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پر تربیت حاصل کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے کوفہ اور دوسرے شہروں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پھیل چکے تھے۔

امام محمد بن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”رَدْفُضْ میں سے بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ علم الناس تھے“ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ کسی صحابی کے علم کا پتہ دو باتوں میں سے کسی ایک بات سے چلتا ہے؛ ان کے علاوہ کوئی تیسری بات نہیں؛ پہلی بات: اس کے قتادی و روایات کی تعداد کس قدر ہے۔

دوسری بات: نبی کریم ﷺ نے کس حد تک اسے مختلف کاموں پر مامور کیا۔“

یہ بات انتہائی محال اور باطل ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی ایسے انسان کو ذمہ داری سونپیں جسے کوئی علم ہی نہ ہو۔ یہ [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی] وسعت علم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب ہم اس بات کو جانچ پرکھ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی پوری بیماری کے دوران نمازوں کا امام مقرر کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابی بن کعب اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ یہ غزوہ تبوک کو جاتے وقت جب آپ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کرنے سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ مدینہ میں اس وقت صرف [معذر لوگ اور] بچے اور عورتیں تھیں۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کرنے سے یہ بات ضرورت کے تحت وجوباً معلوم اور واضح ہوتی ہے کہ آپ دیگر صحابہ کی نسبت نماز کے مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور نماز وین اسلام کا رکن رکین ہے۔ مزید برآں کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ و صدقات کی وصولی پر بھی مقرر فرمایا تھا؛ تو یہ بھی ضرورت کے تحت وجوباً معلوم ہو گیا کہ آپ کو زکوٰۃ و صدقات کے احکام کا بھی علم تھا۔ جیسے کہ آپ کے علاوہ دوسرے کافی تعداد میں صحابہ اس علم سے بہرہ ور تھے۔ ان صحابہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا علم زیادہ ہی ہو سکتا ہے کم نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے لوگوں کو بھی زکوٰۃ کی وصولی پر عامل مقرر کیا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ صرف اسی انسان کو ذمہ داری تفویض کرتے تھے جسے اپنی ذمہ داری سے متعلق شرعی مسائل کا علم ہوتا تھا۔ زکوٰۃ نماز کے بعد اسلام کا ایک اور بزار کن ہے۔

ہمارے اس دعوٰی پر کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ کے مسائل کا پورا پورا علم تھا؛ دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں وارد صحیح احادیث جن کے خلاف کرنا جائز نہیں، وہ حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایات ہیں۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سند سے منقول روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور ان میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں جملہ طور پر فقہاء نے ترک کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ پچیس اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ ہے۔

علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر کیا تھا۔ اس سے ضرورت کے تحت وجوباً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حج کے مسائل کو دیگر صحابہ کی نسبت بہتر طور پر اور زیادہ جانتے تھے۔ حج بھی اسلام کا ایک رکن ہے۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لشکر کا سپہ سالار بھی بنایا تھا۔ اس سے صحت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ دیگر تمام سالار مجاہدین کی طرح جہاد کے احکام و مسائل سے بھی آگاہ تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ ذمہ داری صرف اہل علم کو تفویض فرمایا کرتے تھے۔ اور اس ضمن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پایہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا دیگر سالاران لشکر سے کسی طرح بھی فروتر نہ تھا۔ جب علمی مسائل صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کے احکام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تفوق ثابت ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد کے مسائل جاننے میں آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہ تھے تو اس سے آپ کا علمی پایہ واضح ہو جاتا ہے۔

[خلفاء اربعہ کے مسائل و فتاویٰ میں موازنہ]:

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں؛ نشست و برخاست گفت و شنید و قیام میں نبی کریم ﷺ کی صحبت و رفاقت میں رہا کرتے تھے۔ اور اس طرح نبی کریم ﷺ کے فتاویٰ و احکام سے بذات خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ آگاہ تھے۔ تو صحت کے ساتھ بطور ضرورت معلوم ہوا کہ آپ احکام و مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔ علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسروں پر فائق نہ ہوں یا کم از کم اس میں دوسروں کے برابر نہ ہوں۔ اس سے روافض کا یہ دعویٰ باطل ثابت ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے بڑے عالم تھے۔ ولہ الحمد۔

[نیوش پر گوش علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَتَجِيهًا اَذُنَّ وَاَعِيَةً﴾ (الحاقة ۱۲)

”اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ حدیث اہل علم کے ہاں بالاتفاق موضوع ہے۔ اور یہ بات بھی اضطراری طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہر گز یہ نہیں ہے کہ صرف ایک کان کے علاوہ کوئی دوسرا اسے یاد نہ رکھے؛ اور نہ ہی اس سے کسی متعین شخص کے کان مراد ہیں۔ یہاں پر مقصود صرف نوع ہے۔ اس میں ہر یاد رکھنے والا کان شامل و داخل ہے۔

[فطانت علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت ذہین و فطین اور علم کے بہت بڑے حریص تھے؛ آپ نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رہے؛ دن رات میں ہر وقت آپ کی صحبت میں رہتے۔ بچپن سے لے کر تا وفات نبی کریم ﷺ

کی سب سے زیادہ کامل صحبت کا شرف حاصل ہوا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ بات کیسے ثابت ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ ذہین اور ان سے

زیادہ شائق علم تھے؟ اور آپ نے ان دونوں حضرات سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے استفادہ کیا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اُمم سابقہ میں ملکہم موجود تھے، اگر میری امت میں کوئی ملہم من اللہ ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔“

ملہم یا محدث وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف الہام ہو؛ یہ بشری تعلیم سے زائد ایک قسم ہے۔

[بخاری و مسلم کی متعدد احادیث سے بھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے علم و فضل پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً متفق علیہ روایت

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”مجھے خواب میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں دودھ تھا، وہ میں نے پی لیا، یہاں تک کہ

سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا، پھر جو چاہا میں نے وہ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا: ”پھر آپ نے

اس کی کیا تعمیر فرمائی؟ فرمایا: ”دودھ سے علم مراد ہے۔“

ایسی کوئی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نہیں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے قیصیں پہن رکھی ہیں، بعض کی قیصیں سینہ تک پہنچتی ہے اور بعض کی اس سے نیچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب پیش کیے گئے تو وہ قیص کا دامن کھینچتے ہوئے

گزرے۔ لوگوں نے پوچھا: ”پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر کی؟“ فرمایا۔ قیص سے دین مراد ہے۔“^①

یہ دونوں احادیث صحیح ہیں جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے علم و دین کی شہادت دیتی ہیں۔ ایسی کوئی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے منقول نہیں ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

”علم کے نو حصے رخصت ہو گئے اور ایک حصہ باقی رہا، جس میں سب لوگ شریک ہیں۔“^②

اور اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام صحابہ سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا التزام کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ آتا ہے۔ آپ دیگر تمام صحابہ کی بہ نسبت بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ زیادہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بیٹھا کرتے۔ [اور مسلمانوں کے معاملات میں مشاورت کرتے]۔

صحیحین میں ہے: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

”جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نعش کو چار پائی پر رکھا گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک جماعت نے اس کا احاطہ کر لیا اور آپ کے لیے دعائے خیر کرنے اور توصیہ کلمات کہنے لگے۔ اتنے میں ایک شخص نے اچانک آ کر میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رحم کی دعا فرمائی اور کہا: ”اے عمر! تو نے اپنے پیچھے کوئی آدمی نہیں چھوڑا جس کے اعمال کو لے کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا مجھے تجھ سے عزیز تر ہو۔“ ہاں اللہ کی قسم! میرا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں ساتھیوں (نبی کریم ﷺ اور ابوبکر) کے ساتھ ملا دیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر سرور کائنات ﷺ کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے؛ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے۔“ مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں ساتھیوں کی ملاقات نصیب کرے گا۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کو بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

اور جن مسائل میں حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اختلاف ہوا ہے؛ اکثر طور پر ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہی رائج ہوا کرتا تھا۔ مثلاً حاملہ عورت کا خاندن فوت ہو جائے اس کی عدت کا مسئلہ (عدت و وفات اور وضع حمل میں سے جس کی مدت بعید تر ہو)؛ اور حرام کا مسئلہ۔ جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اہل مدینہ کا مذہب اہل عراق کے مذہب کی نسبت زیادہ رائج ہے۔

① صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اہل الایمان فی الاعمال (ح: ۲۳)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۹۰)۔ ② اسد الغابۃ (۴/ ۱۶۶)۔

یہ روایت بھی صحیح ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۳۶۷۷-۳۶۸۵) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۸۹)۔

اہل مدینہ غالب طور پر حضرت عمر اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کی اتباع کرتے ہیں جبکہ اہل عراق حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع کرتے ہیں۔ صورت حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو بات بھی کہتے تو اس میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو فتویٰ ان لوگوں کیساتھ تھا؛ وہ ان کے انفرادی فتویٰ سے زیادہ قوی ہے۔ جیسا قاضی عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے آپ سے کہا تھا:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفقہ رائے آپ کے انفرادی قول سے ہمیں زیادہ عزیز ہے۔“ [تخریج گزریچکی ہے]

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے لیے دروازہ کھول دیتے تو ہم اندر داخل ہو جاتے۔ ہم آپ کو اہل و نرم پاتے۔ آپ کے پاس ایک مسئلہ پیش ہوا کہ: ایک آدمی اپنے والدین اور بیوی اور اس کے والدین کو چھوڑ کر مر گیا ہے (اس کی میراث کا کیا حکم ہے؟)۔ تو آپ نے فرمایا: ”لِلْأَمِّ ثَلَاثُ الْبَاقِي“۔ ”ماں کے لیے باقی کا تیسرا حصہ ہے۔“ پھر حضرت عثمان و علی و ابن مسعود و زید رضی اللہ عنہم نے بھی [اس مسئلہ میں] آپ کی اتباع کی۔“

مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تابعین میں سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ کے فقہ کی اصل بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان سے اس بارے میں سوال کیا کرتے تھے۔

ترمذی میں [یہی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی] ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔“ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ [سبق تخریجہ]۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اہل کوفہ اور صحابہ ابن مسعود، جیسے کہ علقمہ، الاسود، شریک، والحارث بن قیس، وعبیدہ السلمانی، و مسروق، و زہر بن حبیش، ابی وائل، اور ان کے علاوہ دیگر بہت سارے علما ایسے تھے جو عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عمر کے علم کو حضرت علی کے علم پر فضیلت دیتے تھے۔ اور ہمیشہ حضرت علی کے قول کے برعکس حضرت عمر اور عبد اللہ بن مسعود کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

فصل:

[بچپن کا علم]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”بچپن میں جو علم حاصل کیا جائے وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم دوسروں کے علوم سے بڑھ کر ہوں گے۔ نیز اس لیے کہ آپ کے استاد (نبی) ہر لحاظ سے کامل تھے اور شاگرد (علی) میں قبول علم کی استعداد موجود تھی۔“ [ابھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ رافضی کے حدیث سے جاہل ہونے کی نشانی ہے۔ یہ ایک عامیانہ کلام ہے، اور حدیث رسول نہیں ہے۔ اس حکایت کے عین برخلاف اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تائید فرمائی تھی: انہوں نے امور ایمان کتاب و سنت کا علم [بڑی عمر میں] سیکھا تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کی تحصیل آسان کر دی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال ہے۔ ابھی وحی تمکیل پذیر نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر تیس سال کو پہنچ گئی۔ آپ نے قرآن بڑی عمر میں یاد کیا تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ آیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پورا قرآن یاد تھا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

✽ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی بھی نبی کو چالیس سال کی عمر سے پہلے مبعوث نہیں کیا۔ [یہ علمی و عقلی چٹنگلی کا دور ہوتا ہے]۔

✽ دوسری طرف نبی کریم ﷺ کی تعلیم سب کے لیے عام ہوا کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے آپ نے کسی کو خاص نہیں کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھیے انھوں نے صرف تین سال کے عرصہ میں وہ کچھ یاد کر لیا تھا جو دوسرے صحابہ طویل عرصہ میں بھی یاد نہ کر سکے تھے۔ اور آپ دوسرے تمام صحابہ کی نسبت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ زیادہ بیٹھا کرتے تھے۔

فصل:

[علوم علی رضی اللہ عنہ سے استفادہ]

[اشکان]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم سے استفادہ کیا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ کوفہ جو کہ آپ کا گڑھ تھا وہاں کے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایمان، قرآن، تفسیر، فقہ اور سنت سیکھے۔ جب [روایت حدیث میں] کہا جائے کہ: ابو عبد الرحمن نے انہیں پر پڑھا، اس کا معنی ہے کہ انہیں حدیث پیش کی [اور سکھائی]۔ حضرت ابو عبد الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے قرآن حفظ کر لیا تھا۔^۱

یہ ابو عبد الرحمن اور دوسرے علماء اہل کوفہ جیسے کہ علقمہ، الاسود، شریک، والحارث، بن قیس، النعمی، وزیر بن حبیش، عاصم بن ابی نجود رضی اللہ عنہ۔ جس پر قرآن پڑھا گیا۔ ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سیکھا۔ یہ لوگ مدینہ جاتے تو حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے علم سیکھا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان لوگوں نے ایسے اکتساب علم نہیں کیا جیسے حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے کیا تھا۔

✽ شرح محمد بن اسحاق آپ کے دور کے قاضی تھے جنہوں نے یمن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا کرتے تھے، آپ کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ یہی حال قاضی عبیدہ سلمانی کا بھی تھا؛ وہ فرمایا کرتے تھے: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ آپ کی اجتماعی رائے آپ کی انفرادی رائے سے زیادہ محبوب ہے۔“

✽ اہل مکہ و مدینہ نے بھی آپ سے علم حاصل نہیں کیا۔ یہی حال اہل شام اور بصرہ کا ہے۔ یہ پانچ بڑے شہر دونوں حجاز؛ دو عراقی شہر اور شام یہیں سے علوم نبوت پھوٹا ہے۔ ایمان و قرآن اور شریعت کے علوم یہاں سے نکلے ہیں۔ ان شہروں کے باسیوں نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اکتساب فیض نہیں کیا۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان شہروں میں ایسے لوگ بھیج دیئے تھے جو انہیں قرآن و سنت کی تعلیم دیتے۔ اہل شام کے پاس معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ اور اہل عراق کی طرف حضرت عبداللہ بن مسعود اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کو روانہ کیا۔

۱ ابو عبد الرحمن بن حبیب بن ربیعہ السلی الکوفی القاری۔ ابن سعد نے طبقات ۱۷۲/۶ میں لکھا ہے: آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سے روایات نقل کی ہیں۔ سن بہتر ہجری میں نوے سال کی عمر میں کوفہ میں انتقال ہوا۔ آپ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم نحو]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ علم نحو کے واضع تھے۔ آپ نے ابوالاسود سے کہا تھا۔ کلام کی تین قسمیں ہیں۔ اسم، فعل، حرف۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود کو اعراب کے اقسام بھی بتائے تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”علم نحو، علوم نبوت میں شمار نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک استنباطی علم ہے۔ جو کہ قوانین زبان کی حفاظت کا ایک وسیلہ ہے۔ اس زبان میں قرآن نازل ہوا۔ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں لوگ اعراب پڑھنے میں غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں عجمی لوگ بود و باش رکھتے تھے جو اکثر اعراب میں غلطیاں کیا کرتے تھے اس لیے آپ نے علم نحو کی ضرورت محسوس کی۔ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود سے کہا تھا: اُنْصَحْ هَذَا النَّحْوُ“ (اسی طریقہ پر چلیے)۔ بنا بریں اس علم نحو کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جس طرح دوسرے لوگوں (حجاج بن یوسف ثقفی) نے ضرورت کے پیش نظر نقطہ خط نیز مد و ہذ وغیرہ علامات ایجاد کیں؛ اور اس طرح کے دیگر علوم بنا بر ضرورت ایجاد کئے۔ پھر اہل کوفہ و بصرہ نے علم نحو کی آبیاری کی۔ اور غلیل نے علم عروض وضع کیا۔

فصل:

[فقہاء کی مراجعت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”فقہ میں سب فقہاء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“ [ابھی کلام ارفضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”یہ صاف جھوٹ ہے، ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء میں سے کوئی بھی فقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا۔ جہاں تک امام مالک رحمہ اللہ کا تعلق ہے آپ اہل مدینہ سے اخذ کرتے ہیں اور اہل مدینہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے احتجاج نہیں کرتے، بلکہ وہ فقہاء سبعہ کے اکتساب فیض کرتے تھے جیسے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ و زید و ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے امثال۔ [ان کے اقوال اہل مدینہ کے ہاں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔]

امام شافعی رحمہ اللہ نے آغاز کار میں اہل مکہ مثلاً اصحاب ابن جریج رحمہ اللہ؛ سعید بن سالم القداح؛ مسلم بن خالد الزنجی وغیرہ سے استفادہ کیا۔ اور ابن جریج رحمہ اللہ اصحاب ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے عطاء رحمہ اللہ اور دوسرے اصحاب سے اخذ و استفادہ کیا کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ مجتہد مطلق تھے۔ اور جب آپ صحابہ کرام میں سے کسی کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تو وہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے اقوال ہوا کرتے تھے؛ نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق۔ بلکہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت ساری باتوں پر رد کیا کرتے تھے۔

پھر امام شافعی رحمہ اللہ نے مدینہ پہنچ کر امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور بعد میں اہل عراق کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔ پھر مذہب محدثین کی تعلیم پائی اور اسے ہی اپنے لیے اختیار کر لیا۔ جب کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے

استاذ خاص ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ ہیں۔ نخعی رحمہ اللہ کے تربیت یافتہ تھے اور علقمہ رحمہ اللہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساختہ پر داختہ تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مکہ میں عطاء [ابن ابی رباح] رحمہ اللہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ محدثین کے مسلک پر گامزن تھے۔ آپ نے [سفیان] ابن عیینہ سے تعلیم پائی۔ ابن عیینہ عمرو بن دینار کے شاگرد تھے۔ وہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پروردہ و تربیت یافتہ تھے۔ نیز آپ نے ہشام بن بشیر سے بھی اکتساب فیض کیا تھا۔ ہشام کا شمار حسن بصری اور ابراہیم نخعی کے اصحاب میں ہوتا ہے۔ نیز آپ کے اساتذہ میں سے عبدالرحمن بن مہدی، وکیع بن جراح، اور ان کے امثال بھی ہیں؛ رحمہم اللہ۔ امام شافعی رحمہ اللہ کیساتھ بھی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے بھی اکتساب علم کیا؛ اور ان کے قول کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی محدث احنف بن راہویہ اور ابو عییدہ رحمہم اللہ بھی اسی شاہ راہ پر گامزن رہے۔

یہی حال امام لیث اور اوزاعی رحمہم اللہ کا بھی ہے؛ ان کی فقہ و علوم اہل مدینہ سے ماخوذ تھے اہل کوفہ سے نہیں۔

فصل:

[امام مالک اور علوم علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”مالکیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے استفادہ کیا۔“ [ابن کثیر، الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ صریح جھوٹ ہے۔^۱ یہ موطا امام مالک موجود ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے معدودے روایات نقل کی گئی ہیں۔ اس میں زیادہ غیر اہل بیت راویوں کی مرویات پائی جاتی ہیں۔ اس میں حضرت جعفر سے صرف نو احادیث منقول ہیں۔ اور امام مالک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے امام جعفر کے علاوہ کسی سے بھی حدیث روایت نہیں کی۔ اسی طرح کتب حدیث و سنن و مسانید میں زیادہ تر غیر اہل بیت راویوں کی مرویات پائی جاتی ہیں۔

فصل:

[امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور جعفر صادق رحمہ اللہ کی شاگردی]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جعفر صادق رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی تھی۔“

[جواب]: یہ ایسا صاف جھوٹ ہے جسے ادنیٰ علم رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں حضرات معاصر تھے۔ امام جعفر رحمہ اللہ نے [امام صاحب رحمہ اللہ سے دو سال پہلے] ایک سواڑتالیس ہجری میں وفات پائی۔ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک سو پچاس ہجری میں وفات پائی۔ [البتہ ان کا سن ولادت ایک ہی ہے]۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے

۱ اہل بیت کی مرویات میں چونکہ جھوٹ کا عمل دخل ہو گیا تھا، اس لیے روایت حدیث میں عدالت و ضبط کا لحاظ رکھنے والے محدثین اہل بیت علماء سے روایات اخذ کرنے میں احتیاط کیا کرتے تھے۔ اہل بیت کے متعصب شیعہ اپنے علماء سے جھوٹی روایات بیان کرنے میں عام طور سے بدنام تھے۔ جو احادیث اس عیب سے پاک ہوں ان کے ذکر و بیان میں محدثین کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے اہل بیت کے کوائف و احوال معلوم کرنے کا خواہاں ہوں۔ علم حدیث کے علماء وائمہ کے عدل و انصاف سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ جس کا عنوان ہے۔ ”تسامح اہل السنة فی الروایة عن یخالفونہم فی العقیدة“ (مجلة الازھر، مجلد: ۲۴، ص: ۳۰۶ - ۳۱۲)

جعفر صادق علیہ السلام کے والد کی زندگی میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت جعفر اور ان کے والد سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا تھا۔ البتہ ان سے زیادہ معمر لوگوں سے آپ نے استفادہ کیا تھا۔ مثلاً عطاء بن ابی رباح، اور ان کے شیخ حماد بن ابی سلیمان اور جعفر بن محمد؛ جو کہ مدینہ میں تھے۔

فصل:

[امام شافعی رحمہ اللہ اور محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی شاگردی]

[اشکال]: شیخہ مصنف کا یہ قول کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ سے استفادہ کیا تھا۔“

[جواب]: یہ غلط ہے، ایسا بالکل نہیں؛ بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ محمد بن حسن رحمہ اللہ کی صحبت میں رہے؛ ان کے طرز فکر و نظر کو جانچا۔ ان سے مناظرے کیے [اور ان کی تردید میں کتابیں لکھیں]۔ آپ پہلے انسان تھے جنہوں نے محمد بن حسن کے ساتھ کھل کر اختلاف کیا۔ اس لیے کہ محمد بن حسن رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ اور اہل مدینہ پر رو کیا تھا اور الحجۃ علی اہل المدینہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی [محمد بن حسن رحمہ اللہ نے سب سے پہلے اپنے مخالفین پر رو دکھا۔ سو امام شافعی رحمہ اللہ نے ان کی باتوں کو اچھی طرح دیکھا۔ اور جو چیز آپ کے سامنے حق تھی کہ اہل مدینہ کا مذہب حق پر ہے، آپ نے اس کی نصرت کی۔ آپ اکثر طور پر اہل حجاز اور محدثین کے مذہب کی تائید کیا کرتے تھے۔ پھر عیسیٰ بن ابان نے امام شافعی رحمہ اللہ کے رد پر ایک کتاب لکھی؛ اور ابن سرتج نے عیسیٰ بن ابان پر رو دکھا۔

ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے تعلیم نہیں پائی۔ لیکن آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ جس طرح کہ امام شافعی رحمہ اللہ محمد بن حسن رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے استفادہ بھی کیا ہے۔

امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ اصول میں متفق تھے۔ یہ اتفاق محمد بن حسن رحمہ اللہ کے ساتھ اتفاق سے زیادہ تھا۔ امام شافعی احمد بن حنبل رحمہما اللہ سے دس سال سے زیادہ بڑے تھے۔ امام شافعی پہلی بار ۱۸۰ھ کے کچھ عرصہ بعد امام ابو یوسف کی موت کے بعد اور محمد بن حسن کی زندگی میں بغداد تشریف لائے۔ پھر دوسری بار ۱۹۰ھ کے بعد تشریف لائے۔ اس بار آمد کے موقع پر امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ سے ملاقات ہوئی۔

بہر کیف ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک نے بھی امام جعفر رحمہ اللہ سے مسائل و اصول اخذ نہیں کیے تھے۔ مانا کہ انھوں نے امام جعفر رحمہ اللہ سے چند روایات نقل کی ہیں تو اس سے کئی گنا روایات انھوں نے غیر اہل بیت راویوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ اور امام جعفر رحمہما اللہ کی مرویات کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں؛ نہ ہی قوت حدیث کے اعتبار سے اور نہ ہی کثرت تعداد کے اعتبار سے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو بعض احادیث میں اس وقت شک گزرا جب انہیں یہ بات پتہ چلی کہ یحییٰ بن سعید القطان کو ان روایات میں کلام ہے؛ پھر آپ نے وہ احادیث اپنی کتاب ”صحیح بخاری“ میں نقل نہیں کیں۔

یہ حقیقت ہے کہ امام جعفر صادق پر جس قدر بہتان طرازی کی گئی ہے اور کسی پر نہیں کی گئی۔ تاہم ان کا دامن ان اتہامات سے پاک ہے۔^① چنانچہ شیعہ نے یہ علوم امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیے ہیں:

(۱) علم البطاقہ۔ (۲) علم الہفت۔ (۳) الجداول۔ (۴) اختلاج الاعضاء۔ (۵) علم الحفر۔ (۶) منافع القرآن۔ (۷) الرعود والبروق۔ (۸) احکام النجوم۔ (۹) القرع۔ (۱۰) استقسام بالازلام۔ (۱۱) ملائم۔ کلام علی الحوادث؛ اور تفسیر قرآن میں کئی قسم کے اشارات؛ اور خواب میں سورت پڑھنے کی تعبیر۔ یہ تمام کتابیں آپ کی طرف جھوٹ سے منسوب کی گئی ہیں۔

امام جعفر الصادق نے اپنے والد اور دوسرے لوگوں سے اکتساب فیض کیا تھا؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ آپ کے والد نے علی بن الحسین سے علم حاصل کیا تھا۔ علی بن حسین نے اپنے والد حسین سے اور ان سے زیادہ دوسرے علماء کرام سے اکتساب فیض کیا تھا۔ اس لیے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ سن ۶۱ھ میں شہید کر دیے گئے تھے؛ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جھوٹے تھے۔ جب آپ واپس مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے علماء کرام سے علم حاصل کیا۔ نیز آپ نے امہات المؤمنین حضرت عائشہ؛ ام سلمہ؛ صفیہ؛ اور حضرت ابن عباس؛ مسور بن مخرمہ؛ اور ابورافع مولی النبی؛ رضی اللہ عنہ؛ مروان بن الحکم اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ ایسے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد کے علاوہ دوسرے صحابہ اور تابعین تک سے علم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ آپ کا علم و دین تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

علماء کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی بہت تعریف کی ہے اور بڑے مناقب بیان کیے ہیں۔

امام زہری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”میں نے علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے افضل مدینہ میں کسی کو نہیں پایا۔“

یحییٰ بن سعید انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مدینہ میں سب سے افضل ہاشمی میں نے آپ کو ہی دیکھا ہے۔“

حماد بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مدینہ میں میں نے سب سے افضل ہاشمی آپ کو ہی پایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: اے لوگو! ہم سے اسلام کی محبت کرو۔ تم ہم سے محبت کا مسلسل دعویٰ کرتے رہے یہاں تک کہ تمہاری محبت ہمارے لیے عار ہو گئی۔“ یہ کلام محمد بن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔ [۵/۱۲۱۲]۔

ابن سعد لکھتے ہیں: [علماء نے] کہا ہے: ”علی بن حسین رضی اللہ عنہ ثقہ اور مامون تھے؛ کثرت احادیث والے رفیع الشان اور عالی منزلت کے انسان تھے۔ آپ نے شبیبہ بن نعمان سے روایت نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: علی بن حسین رضی اللہ عنہ بخل کیا کرتے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ چپکے سے اہل مدینہ کے ایک سو گھرانوں کی کفالت کیا کرتے تھے۔“

① امام جعفر صادق کے بارے میں شیعہ نے جو جھوٹ تصنیف کیے ہیں، ان میں سے معملہ خیز جھوٹ وہ ہے جسے شیعہ کے فخر العلماء محمد بن محمد نعمان المفید نے اپنی کتاب ”الارشاد فی تاریخ حجاج علی العباد“ مطبوعہ ایران، ص ۱۰۳، پر جعفر بن محمد کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ”امام جعفر صادق نے فرمایا: میرے پاس سیدنا موسیٰ کی تختیاں ہیں، جن پر تورات مکتوب تھی۔ میرے پاس عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان بھی ہے۔ نیز میرے پاس وہ طشتی بھی ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام قربانی دیا کرتے تھے۔“ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ امام جعفر فی الواقع صادق تھے، مگر شیعہ آپ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین ان کی روایات پر اعتماد نہیں کرتے۔ ہمارے دوست سید محمد بن عقیل امام بخاری پر طعن کرتے ہیں کہ وہ اہل بیت سے بہت تھوڑی روایات نقل کرتے ہیں کیا صاحب ممدوح یہ چاہتے ہیں کہ امام بخاری اس بات پر مہر تصدیق ثبت کریں کہ عصائے موسیٰ اور قربانی کی طشتی فی الواقع امام جعفر کے پاس موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ ایسے عقائد سے بچائے۔“

فصل:

[حضرت امام مالک رحمہ اللہ اور کلام رافضی]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امام مالک سے منقول ہے کہ انھوں نے ربیعہ سے پڑھا۔ ربیعہ نے عکرمہ سے عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن عباس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے۔ ربیعہ نے عکرمہ سے کچھ نہیں پڑھا تھا؛ بلکہ امام مالک نے اپنی کتاب میں عکرمہ سے ایک دو روایات کے علاوہ کوئی بھی روایت نقل نہیں کی۔ اور نہ ہی اپنی کتاب میں عکرمہ کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ بات پتہ چلی تھی کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ کو عکرمہ پر کچھ کلام تھا؛ اس لیے آپ نے ان سے روایت نقل کرنا ترک کر دیا تھا۔ ایسے ہی امام مسلم نے بھی ان سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عکرمہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ اور ان کے امثال فقہاء اہل مدینہ کے شاگرد ہیں۔ سعید رحمہ اللہ نے حضرت عمر، زید بن ثابت اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا تھا۔ اور قضایا میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال تلاش کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ سے سوال کیا کرتے تھے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک کے اصول امام ربیعہ کی سند سے سعید ابن مسیب سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے لیے ہیں۔ خلیفہ رشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے کہا تھا: ”آپ نے موطا میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بہت زیادہ روایات لی ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بہت کم ہیں۔“ تو آپ نے جواب میں فرمایا: ”اے امیر المؤمنین آپ ان دونوں میں سے زیادہ صاحب ورع تھے۔“ [یعنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما]۔

یہ موطا پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے متعلق اس قسم کی من گھڑت روایات کھلا ہوا جھوٹ ہیں۔

[ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کی شاگردی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔“

[جواب]: یہ بات بھی غلط ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت کم روایات نقل کی ہیں۔ ان کی اکثر روایات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اکثر امور میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس زنادقہ کی ایک جماعت لائی گئی۔ آپ نے انہیں جلادیا۔ جب یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: ”اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں کبھی بھی انہیں نہ جلاتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے عذاب دینے سے منع فرمایا ہے۔ میں انہیں صرف قتل کر دیتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”جو اپنے دین کو بدل ڈالے“ اسے قتل کر ڈالو۔“ جب اس بات کی خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: ”ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے افسوس ہے۔“ [تو بخارہ ج 1]

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم کلام]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ علم الکلام کی اصل و اساس ہیں۔ آپ کے خطبات سے لوگوں نے علم الکلام حاصل کیا۔ لہذا لوگ اس فن میں آپ کے شاگرد ہیں۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے؛ علاوہ ازیں اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس علم الکلام سے پاک رکھا تھا جو کہ کتاب و سنت کی تصریحات کے منافی ہے۔ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو حدوث اجسام سے حدوث عالم پر استدلال کرتا ہو۔ نیز حدوث اجسام کو اعراض اور حرکت و سکون کی دلیل سے ثابت کرتا اور کہتا ہو کہ اجسام اس کو مستلزم ہیں۔ اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اور جس سے پہلے کوئی حوادث نہ گزر ہوں وہ خود حادث ہے۔ اور اس پر ان حوادث کی بنیاد رکھتے ہیں جن کی کوئی انتہاء ہی نہیں۔ بخلاف ازیں پہلی مرتبہ اس کا اظہار پہلی صدی کے بعد جعد بن درہم اور جهم بن صفوان کی طرف سے ہوا۔ پھر عمرو بن عبید اور [واصل بن عطاء] ابوہذیل العلاف اور ان کے امثال نے اس میں حصہ لیا۔ عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء ان دونوں نے جب انفاذ و عید میں علم کلام کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو انسان جہنم میں داخل ہو گیا تو پھر وہ وہاں سے کبھی بھی نہیں نکلے گا۔ اور تقدیر کا انکار کرنے لگے۔ ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پاک رکھا تھا۔

جو خطبات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہیں، ان میں معتزلہ کے اصول خمسہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو بھی باتیں منقول ہیں، وہ سب آپ پر جھوٹ ہیں۔ متقدمین معتزلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعظیم نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ جنگ جمل کے لڑنے والوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے:

”فریقین میں سے ایک فاسق ہے، مگر متعین طور پر یہ نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔“ یا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ یا پھر حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما۔ اور جب ان میں سے کوئی ایک گواہی دے تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ جب کہ اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی کے بارے میں ان کے دو قول ہیں۔ یہ قول عمرو بن عبید اور ان جیسے دوسرے معتزلہ کے ہاں معروف ہے۔^①

متاخرین شیعہ کے برعکس متقدمین شیعہ ہاشمی اور دوسرے لوگ؛ صفات الہی اور مسئلہ تقدیر کے قائل تھے۔ متاخرین شیعہ نے صراحت کے ساتھ تقسیم کے عقیدہ کا اظہار کیا تھا؛ اور اس بارے میں ان سے انتہائی برے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ جب

① ابن طاہر بغدادی اپنی کتاب ”اصول الدین“ ص ۲۹۰ میں فرماتے ہیں: واصل بن عطاء عمرو بن عبید اور نظام اور اکثر قدر یہ کہتے ہیں کہ: ہم انفرادی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب سے محبت کرتے ہیں؛ اور طلحہ و زبیر اور ان کے تبعین سے بھی انفرادی طور پر دلاء کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ انکی جماعت کا ایک آدمی گواہی دے تو اس کی گواہی مان لیں گے، اور ایسے ہی طلحہ و زبیر کے ساتھ بھی اگر ان کی جماعت کا کوئی آدمی گواہی دے تو ہم مان لیں گے۔ لیکن اگر طلحہ اور علی رضی اللہ عنہما اکیلے یا گلے کی ایک بانی پر بھی گواہی دیں تو تب بھی اسے نہیں مانیں گے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک فاسق ہے۔ فاسق دائمی جہنمی ہوتا ہے، وہ نہ ہی مومن ہے اور نہ ہی کافر۔ دیکھیں: مقالات اسلامیین ۱/ ۲۴۵۔

کہ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے یہ عقیدہ اہل بیت سے اخذ کیا ہے۔^❶

امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ تو انہوں نے فرمایا: ”وہ نہ ہی خالق ہے اور نہ ہی مخلوق؛ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔“

رہا رافضی کا یہ قول کہ: ”واصل بن عطاء نے ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ سے علم حاصل کیا تھا۔“

[اس کا جواب یہ ہے کہ:] اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن بن محمد بن الحنفیہ^❷ نے معتزلہ کے قول کے برعکس ”ارجاء“ کے مسئلہ پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ کئی اہل علم نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس معتزلی مذہب سے متناقض ہے؛ جس کا اظہار واصل بن عطاء کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: اس نے ابو ہاشم سے علم حاصل کیا تھا۔

اس ابو ہاشم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس پر انکار کیا گیا؛ نہ ہی اس کے بھائیوں نے اس پر موافقت کی اور نہ ہی اہل بیت نے۔ اور نہ ہی اس نے اپنے والد سے علم حاصل کیا تھا۔

خواہ کچھ بھی ہو، وہ کتاب جو حسن کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ اس کتاب کے متناقض ہے جو ابو ہاشم کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس نے اس کتاب سے رجوع کر لیا تھا۔ اور یہ بات متنع ہے کہ ان دونوں نے یہ متناقض علوم اپنے والد محمد بن الحنفیہ سے حاصل کیے ہوں۔ محمد کی طرف ان دو میں سے ایک کتاب کی نسب زیادہ مناسب ہے۔ پس اس سے قطعی طور پر یہ باطل ثابت ہو گیا محمد بن حنفیہ ایک ہی وقت میں دو مختلف عقائد کے قائل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ بات دونوں اور قطعی یقینی ہے کہ محمد مرجعہ کے عقیدہ سے برأت کے ساتھ ساتھ معتزلہ کے عقیدہ سے بھی اس سے بڑھ کر بری ہیں۔ اور ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ مرجعہ اور معتزلہ سے اس سے بڑھ کر بری ہیں۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تفسیر]

[اشکال:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”علم تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے شاگرد تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے ”بسم اللہ“ کی ”با“ کی تفسیر پوری رات بھر میں بیان کی۔“

[جواب:] پہلی بات: ہم کہتے ہیں: یہ صاف جھوٹ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے ثبوت کی سند کہاں ہے؟ منقولات سے استدلال کرنے والے پر واجب ہوتا ہے کہ وہ کم از کم اس سند کا ذکر کرے جس سے منقول کی صحت کا علم

❶ علامہ اشعری نے اپنی کتاب ”مقالات الاسلامیین“ ۱/۱۰۶ میں مسئلہ تقسیم میں روافض کے عقائد ذکر کئے ہیں اور انہیں چھ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ان کے بارے میں کہا ہے: ”توحید میں یہ لوگ معتزلہ اور خوارج کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے متاخرین شیعہ کا عقیدہ ہے۔ جب کہ ان کے اولین تشیبہ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ جب کہ اعمال العباد کے بارے میں ایک گروہ ہشام بن حکم کا عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کی افعال ایک طرح سے اختیاری ہیں اور ایک طرح سے اضطراری۔ اور دوسرا گروہ جہمہ کا عقیدہ رکھتا ہے کہ: اعمال میں کوئی جبر نہیں؛ اور نہ ہی تقویض ہے جیسے کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ جب کہ تیسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں ہیں۔ یہ لوگ معتزلی بھی ہیں اور امامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔“

❷ حسن بن محمد بن حنفیہ نے سب سے پہلے مسئلہ ارجاء پر کتاب لکھ کر قدریہ وغیرہ کا رد کیا ہے۔

ہو سکے۔ وگرنہ کتابوں میں منقولات میں سے جو کچھ خالی ذکر کیا گیا ہوتا ہے، اس سے استدلال کرنا جائز نہیں؛ کیونکہ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ ایسی روایات میں بہت ساری جھوٹی روایات بھی ہیں۔

دوسری بات: محدثین کرام جانتے ہیں کہ یہ روایت جھوٹ ہے؛ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول یہ اثر آپ پر جھوٹ ہے۔ اس کی کوئی معروف سند نہیں۔ اس قسم کی حکایات بلا اسناد ہی ذکر کی جاتی ہیں۔ اور ان کو روایت کرنے والے بھی مجہولات کے دلدادہ لوگ ہوتے ہیں؛ جو ایسا کلام کرتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اور پھر اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول کیا جاتا ہے۔ یہ بھی اسی جنس سے ہے۔ [اس قسم کی روایات بیان کرنا جاہل صوفیاء کا کام ہے۔ جیسے صوفیاء روایت کرتے ہیں کہ:] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہما صدیق باقیں کیا کرتے تھے اور میں ان کے پاس یوں بیٹھا رہتا جیسے کوئی جشی ہو۔ اس روایت کے حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

تفسیری اقوال آپ نے حضرت ابن مسعود اور صحابہ و تابعین کی ایک کثیر جماعت سے اخذ کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ تفسیری اقوال کسی کتاب میں موجود نہیں۔ آپ سے بہت کم تفسیری اقوال نقل کیے گئے ہیں، ابوعبدالرحمن سلمی حقائق التفسیر میں جو اقوال جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ بالکل جھوٹ ہیں؛ جیسا کہ دوسرے لوگوں نے بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ پر جھوٹ بولا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تصوف]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”علم طریقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ تمام صوفیہ خرقہ کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔“

[جواب]: پہلا جواب: ہم کہتے ہیں: تمام اہل معرفت اور حقائق ایمان کے جانکار جو کہ امت میں سچائی و امانت کے ساتھ مشہور ہیں؛ وہ تمام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقدیم پر متفق ہیں۔ اور یہ کہ آپ اس امت میں حقائق ایمان اور احوال عرفان کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ تو پھر وہ ان حقائق سے۔ جنہیں شیعہ بھی افضل امور میں سے مانتے ہیں۔ کتنے دور ہیں جو آپ کی طرف لوگوں کے منسوب کردہ ایک لباس کی وجہ سے آپ کو تقدیم [اور فضیلت] دیتے ہیں۔

صحیحین میں مروی ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صَوْرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ))

”بیشک اللہ تعالیٰ نہ ہی تمہاری صورتوں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی تمہارے اموال کو دیکھتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔“

دوسری بات: خرقہ جات کی تعداد بہت ہے، مگر مشہور دو خرقے ہیں:

۱۔ ایک خرقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے۔

۲۔ دوسرے خرقہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے۔

جو خرقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے اس کی دو اسناد ہیں ایک اویس قرنی تک اور دوسری سند ابومسلم خولانی تک

پہنچتی ہے۔

جس خرقہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے اس کی اسناد حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے۔ متاخرین اسے معروف کرنی رضی اللہ عنہ تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنید سری سقطی کی صحبت میں رہے ہیں۔ اور سری سقطی بلا ریب معروف کرنی کی صحبت میں رہے ہیں۔ اس سے آگے سند کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ کہنے لگتے ہیں کہ معروف کرنی رضی اللہ عنہ علی بن موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے تھے۔ یہ بات قطعی طور پر باطل ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ معروف کرنی کے حالات نقل کرنے والے مصنفین اس کی کوئی متصل سند ذکر نہیں کرتے۔

صوفیاء کا قول ہے کہ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ باتفاق اہل معرفت باطل ہے۔ کیونکہ اہل علم کا اجتماع ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہم نشینی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ نے احف بن قیس، قیس بن عباد اور دوسرے لوگوں سے استفادہ کیا تھا۔ اہل صحیح نے ایسے ہی روایت کیا ہے۔

باقی رہی یہ روایت کہ علی جب بصرہ میں داخل ہوئے تھے تو وہاں جتنے افسانہ گو تھے سب کو نکال دیا صرف حسن کو رہنے دیا۔ تو اس کے صریح جھوٹ ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک قصہ گو پایا جو قصہ بیان کر رہا تھا۔ ابو حاتم نے اپنی کتاب ”الناخ والمنسوخ“ میں نقل کیا ہے:

”حدثنا الفضل ابن دكين، حدثنا سفيان، عن ابي حصين، عن ابي عبد الرحمن السلمي قال: انتهی عليّ إلى قاص و هو يقص؛ فقال: أعلمت الناس والمنسوخ؟ قال: لا. قال: هلك وأهلكت..“

”حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک قصہ گو کے پاس پہنچے جو کہ قصہ بیان کر رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: کیا تم ناخ اور منسوخ بھی جانتے ہو؟ کہنے لگا نہیں۔ فرمایا: خود بھی ہلاک ہوئے اور لوگوں کو بھی ہلاک کر دیا۔

[حسن بصری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تحصیل علم کا آغاز کیا تھا، حالانکہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا تھا]۔ ابن الجوزی نے حسن بصری کے فضائل و مناقب کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اور ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد المقدسی نے بھی ایک کتاب ان لوگوں کے بارے میں لکھی ہے جن کی صحابہ کرام سے ملاقات ہوئی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق اخبار تاریخ البخاری، اور اسانید خرقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس بھی اس کی کچھ اسناد غائب ہیں تو میں نے ان کو بیان کر دیا تا کہ حق اور باطل واضح ہو جائے۔

صحابہ کرام میں سے ہر ایک سے؛ جو کہ مختلف شہروں میں جا کر آباد ہو گئے تھے؛ لوگوں نے دین و ایمان اخذ کیا۔ مشرق و مغرب کے اکثر مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی استفادہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ آپ مدینہ میں سکونت پذیر تھے۔

اسلامی شہروں کے عباد و زعماد نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علوم حاصل کئے جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ پھر ان بیانات کی روشنی میں یہ بات کہنا کس حد تک درست ہے کہ اہل زہد و تصوف کا طریقہ دیگر صحابہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ماخوذ

ہے؟ زہد کے بارے میں متعدد کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ چند کتب کے نام ملاحظہ ہوں۔

۱۔ امام احمد کی کتاب الزہد ۲۔ ابن المبارک کی کتاب الزہد

۳۔ کتاب الزہد و کج بن جراح ۴۔ کتاب الزہد ہناد بن السری

اور وہ کتابیں جن میں زہاد و عباد کے حالات و واقعات ہیں ان میں:

۶۔ صفۃ الصفوۃ۔ اور دیگر کتابیں۔

۵۔ حلیۃ الاولیاء

مذکورہ بالا کتب میں مہاجرین و انصار صحابہ نیز تابعین کے بہت سارے اقوال مذکور ہیں۔ ان کتب میں زہد سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو اقوال و احوال مذکور ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما و معاذ و ابن مسعود و ابی بن کعب و ابو ذر و ابوامامہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے زیادہ نہیں ہیں۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فصاحت و بلاغت]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ فصاحت کا سرچشمہ تھے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ: ”آپ کا کلام مخلوقات کے کلام سے بہتر اور کلام خالق سے کم تر تھا۔ خطباء نے آپ سے ہی خطابت سیکھی تھی۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ میں بہت بڑے خطیب تھے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما و ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ بھی فن خطابت میں مہارت رکھتے تھے؛ آپ خطیب رسالت کے لقب سے معروف تھے۔ جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے شعراء تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے رو برو اور آپ کی عدم موجودگی دونوں حالات میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ جب موسم حج میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کیساتھ ہوتے؛ اور تقریر کیا کرتے۔ آپ اپنے خطاب میں لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کی دعوت دیا کرتے تھے؛ اور نبی کریم ﷺ خاموش رہ کر سنتے اور اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تائید فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا کلام رسول اللہ ﷺ کے کلام سے پہلے تمہید اور مقدمہ کے ہوا کرتا تھا؛ جس میں رسول اللہ ﷺ کی مدد [اور لوگوں میں آپ کا تعارف] مقصود ہوتا تھا۔ نہ کہ آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے پہلے سبقت لیتے۔

جس طرح حضرت شماس بن قیس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی طرف خطبہ دیا کرتے؛ اسی لئے آپ کو خطیب رسول کا لقب ملا۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں میں بڑے خطیب تھے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے بڑے خطیب تھے جیسا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اعتراف تھا۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر ایسا مبلغ خطبہ دیا تھا؛ جس سے مسلمانوں کے دل اسلام پر ثابت رہے۔ حالانکہ اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کی وفات کی وجہ سے لوگوں میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔ اس لیے کہ یہ مصیبت ہی اتنی بڑی تھی جس نے انہیں گھیر لیا تھا۔

جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر لوگوں میں خطبہ دینا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ آپ ہی اللہ کے رسول ہیں؛ یہاں تک کہ بعد میں معلوم ہو گیا کہ بیٹھی ہوئی ہستی رسول اللہ ﷺ ہیں۔

آپ رسول اللہ ﷺ کے وفود کی ملاقات کے لیے نکلتے؛ اور ان سے خطاب کرتے؛ اور رسول اللہ ﷺ کی عدم موجودگی میں بھی خطاب کیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی تو آپ نے اس وقت بھی ایک خطبہ دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن بڑا بلوغ خطبہ دیا تھا جس سے تمام حاضرین کو فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے سقیفہ کے دن بڑا عمدہ خطبہ تیار کیا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب گفتگو کی تو وہ مجھ سے زیادہ حلیم اور باوقار ثابت ہوئے۔ اللہ کی قسم! آپ نے میرے تیار کردہ خطبہ کا ایک بھی پسندیدہ جملہ باقی نہ چھوڑا بلکہ وہ فی البدیہہ کہہ سنایا اور اس سے کچھ بہتر ہی کہا ہوگا۔^①

حضرت زیادہ بن ابی لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ خطیب تھے۔ لوگوں نے حضرت زیادہ کے خطبات لکھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خطیب تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لوگوں میں سب سے بڑی خطیب تھیں۔ یہاں تک کہ اخف بن قیس نے کہا ہے کہ: ”میں نے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے خطبات سنے؛ لیکن میں مخلوق میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کا مسکت اور دل اندوز خطاب نہیں سنا۔“^②

اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی عربوں میں بہت سارے خطباء اور فصحاء تھے۔ ان میں سے اکثر تعداد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی خطاب نہیں سیکھی۔ نہ انھوں نے اس باب میں ان سے کچھ استفادہ کیا تھا۔ پھر کسی کی یہ بات کہ ”آپ فصاحت کا منبع تھے“ جھوٹ کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی نہ ہوتا تو بھی آپ لوگوں میں سب سے بڑے خطیب تھے؛ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک لفظ تک نہیں سیکھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوح البلاغہ کے اکثر خطبے من گھڑت ہیں^③ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام نہیں ہو سکتے۔ بلکہ آپ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان و منزلت اور قدر اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اس قسم کا کلام کریں۔ مگر شیعہ نے مدح گوئی کے نقطہ خیال سے ان کو وضع کیا تھا حالانکہ ان میں صداقت و مدح دونوں کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔

[اشکال:] شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام کلام مخلوق سے بالا ہے۔“

[جواب:] یہ قول نبی کریم ﷺ کی گستاخی پر مشتمل ہے اور بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہر کلام سے

بلند و بالا ہے۔ اور یہ دونوں کلام مخلوق ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ابن سبعین نے کہا تھا: یہ کلام ایک لحاظ سے انسانی کلام سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کلام کو کلام الہی کے مماثل قرار دیا جائے، ظاہر ہے کہ ایک مسلم اس طرح

① صحیح بخاری، کتاب الحدود۔ باب رجم الحبلی فی الزنا (حدیث: ۶۸۳۰)۔

② مستدرک حاکم (۱۱/۴)

③ ان خطبات کا جامع محمد بن حسین رضی اللہ عنہ المتوفی ۴۰۶ھ ہے۔ یہ قطعی بات ہے کہ رضی نے اپنے بھائی علی بن حسین رضی اللہ عنہ المتوفی ۳۲۶ھ کے اشتراک سے ان خطبات میں اضافہ کیا تھا۔ خصوصاً وہ جملے جو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی گستاخی سے متعلق ہیں وہ یقیناً بے اصل اور من گھڑت ہیں۔

نہیں کہہ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں جو باتیں صحیح ہیں، وہ دوسروں کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر صاحب نوح البلاغہ کی ستم ظریفی پر ہے کہ اس نے بہت سارے دوسرے لوگوں کے کلام کو آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بعض باتیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں وہ درست ہیں۔ نوح البلاغہ میں مندرج بعض باتیں بجائے خود صحیح ہیں؛ مگر دراصل وہ آپ کی فرمودہ نہیں ہیں، بلکہ دوسروں کا کلام ہے۔ مشہور ادیب جاحظ کی کتاب ”البيان والتبيين“ میں کثرت سے دوسرے ادباء کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ مگر صاحب نوح البلاغہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نوح البلاغہ کے خطبات اگر فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمودہ ہوتے تو نوح البلاغہ کے مصنف سے پہلے ان کا با اسناد یا بے اسناد پایا جانا ضروری تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کا نوح البلاغہ کے مصنف سے قبل کہیں یہ نہیں ملتا۔ اس سے ان خطبات کا جھوٹا ہونا واضح ہوتا ہے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آسمانی راستہ کا علم]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے گم ہو جانے سے پہلے جو پوچھنا چاہو، پوچھ لو، مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں پوچھو مجھے زمین کے راستوں سے ان کا زیادہ علم ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً یہ بات مدینہ میں نہیں کہا کرتے تھے جہاں ان کی طرح اور بھی مہاجر و انصار اہل علم صحابہ موجود تھے جنہوں نے ویسے ہی علم حاصل کیا تھا جیسے آپ نے علم حاصل کیا تھا۔ اور ویسے ہی معرفت حاصل کی جس طرح آپ نے معرفت حاصل کی تھی۔ بلکہ آپ نے یہ الفاظ اس وقت فرمائے جب آپ عراق چلے گئے۔ وہاں بہت سارے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے جو دین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ آپ میں ان لوگوں کے درمیان اقامت گزیر تھے جو علم دین سے بے بہرہ تھے، آپ وہاں ایک امام کی حیثیت رکھتے تھے جس پر رعایا کی تعلیم و تربیت اور فتویٰ دینا واجب ہوتا ہے۔ آپ یہ بات ان لوگوں سے اس لیے فرمایا کرتے تھے کہ: لوگ علم حاصل کریں، اور فتویٰ پوچھیں۔ جس طرح وہ صحابہ کرام جو بہت بعد تک زندہ رہے؛ اور لوگ ان کے علوم کی طرف محتاج ہوئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے وہ احادیث روایت کی ہیں جو خلفاء اربعہ یا دوسرے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت نہیں کیں۔ اس لیے کہ پہلے کے لوگ ان کو نقل کرنے سے مستغنی تھے۔ اس لیے کہ اس دور میں تمام لوگوں نے ایک ہی مصدر سے تعلیم پائی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر؛ ابن عباس؛ عائشہ؛ انس و جابر؛ ابو سعید رضی اللہ عنہم اور اس طرح کے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وہ روایات نقل کی گئی ہیں وہ جو حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے منقول نہیں ہیں۔ جب کہ حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما ان بقیہ صحابہ کرام سے زیادہ بڑے عالم تھے۔ لیکن لوگوں کو ان کے علوم کی ضرورت محسوس ہوئی؛ اور اس لیے بھی کہ ان کی تاریخ وفات متاخر ہے۔ انہیں ان تابعین نے پایا جو ان سے پہلے لوگوں کو نہیں پاسکے تھے۔ پس انہیں سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور وہ لوگ یہ سمجھے کہ انہیں سمجھائیں اور حدیث بیان کریں۔

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا: ”مجھ سے پوچھ لو۔“ یہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتا۔ یہ بات ابن مسعود معاذ ابی بن کعب

ابودرداءؓ اور سلمانؓ اور ان کے امثال رضی اللہ عنہم نے ارشاد نہیں فرمائی کیا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ ایسی بات ارشاد فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے نہ تھے جو بلا وجہ سوال کرتے پھریں۔ پس حضرت معاذؓ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور ان سے کم مرتبہ کے صحابہ بھی کبھی سوال ایسے سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ ہاں جب آپؐ سے کسی بارے میں فتویٰ پوچھا جاتا تو جس طرح دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جواب دیا کرتے تھے ایسے آپؐ بھی جواب دیا کرتے تھے۔

[باقی رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب] یہ قول کہ: "أَنَا أَعْلَمُ بِطَرُقِ السَّمَاءِ"

[جواب]: یہ ایک باطل بات ہے جو کہ کوئی عاقل انسان نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ ہی صحابہ و تابعین میں سے کوئی ایک اپنے بدن کیساتھ آسمانوں پر چڑھا ہے۔ [اور نہ ہی کسی نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا]۔

[اگر فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ "أَنَا أَعْلَمُ بِطَرُقِ السَّمَاءِ" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں جانتا ہوں کہ آسمان والے کن اور اونوائی پر عمل کر کے تقرب حاصل کرتے ہیں۔ نیز یہ معنی کہ میں عبادت کرنے کے طریقے اور جنت و ملائکہ سے بخوبی آگاہ ہوں، جب کہ زمین پر مجھے ان چیزوں کا علم حاصل نہیں۔ یہ مراد نہیں کہ آپؐ بجمہ غمیری آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ کوئی مسلم یہ بات نہیں کہتا۔ یہ روایت موضوع ہے اور اس کے اسناد کا کچھ پتہ نہیں۔ ایسی روایات ان عالی شیعہ کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں جو ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نبوت پر احتجاج کرتے ہیں اس سے بڑھ کر بہت سے عوام اور عابد و زاہد اپنے شیوخ کے بارے میں بھی اس قسم کے اعتقادات رکھتے ہیں]۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ مرجع صحابہ؟]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: "صحابہ مشکل ترین دینی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے فیصلے مسترد کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔"

[جواب]: ہم کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشکل ترین یا واضح کسی طرح کے بھی مسائل میں کبھی صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے تھے اور نہ ہی کسی دوسرے فرد واحد کی طرف رجوع کرتے۔ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کرتے تھے؛ آپؓ حضرت علیؓ، عثمانؓ، ابن عوفؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ اور ابو موسیٰؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کیلئے عمر ہونے کے باوجود ان سے بھی مشورہ فرماتے۔ اور سوال کرنے والے کبھی حضرت علیؓ سے سوال کرتے تو کبھی ابی بن کعبؓ سے اور کبھی حضرت عمرؓ سے۔ رضی اللہ عنہم۔

حضرت ابن عباسؓ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ سوال کئے گئے، اور آپؓ نے جس قدر مشکل مسائل حل کیے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ طویل عرصہ میں بھی اس قدر مسائل کی گرہ کشائی نہ کر سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے؛ بلکہ بلا شک و شبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپؓ سے بڑے عالم تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل کے پوچھنے کی ضرورت ان لوگوں کو پیش آئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پاسکے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ آپؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم سے استفادہ کیا ہو؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپؓ کے علوم سے استفادہ کیا ہے؛ جیسا کہ حدیث نماز تو بہ کا مسئلہ اور دیگر مسائل۔

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رد]:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے فیصلے مسترد کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔“

[جواب]: بشرطیکہ اس قول کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق نے صرف ایک مسئلہ میں یہ فرمایا تھا کہ اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔“ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قسم کے الفاظ ان لوگوں کے حق میں بھی کہہ دیا کرتے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فروتر درجہ کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ جس عورت نے مہر کے مسئلہ میں آپ سے تکرار کی تھی اس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا: ”مرد نے غلطی کھائی اور عورت کی بات صحیح نکلی۔“^۱

اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں علم و دین کے الہام کی خبر دی تھی؛ ایسی خبر حضرت عثمان علی؛ طلحہ زبیر رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے بھی حق میں وارد نہیں ہوئی۔

سنن ترمذی میں حضرت ابن عمر سے روایت ہے: بیشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ۔“

”بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل و زبان پر حق کو جاری کر دیا ہے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”لوگوں کو کوئی بھی مسئلہ ایسا پیش نہیں آیا جس کے بارے میں لوگوں نے بھی کوئی بات کی ہو اور حضرت عمر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہو مگر قرآن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔“

سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ذر سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:“

بیشک اللہ تعالیٰ نے حق عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے اور آپ وہی حق بولتے ہیں۔“

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”أَتَمُّ سَابِقَةٍ جُتِمَ سَابِقَةٍ مِنْكُمْ فِي رَجُلٍ مِنْكُمْ هُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ“

امت میں ایسا کوئی شخص ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔“ [سبق تخریجہ]

ابن وہب محدثان کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ملہمون؛ یعنی جن کی طرف الہام کیا جاتا ہو۔ صحیحین میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اے ابن خطاب! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب بھی شیطان تمہیں کسی وادی میں ملتا ہے تو وہ تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسری وادی میں بھاگ جاتا ہے۔“ [ایسا حضرت عمر کی حق گوئی و حق شناسی کی وجہ سے تھا]۔

[بہر حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم ہونے کے باوجود عدل و انصاف کی بنیاد پر یہی توقع ہے کہ حق کسی کے بھی ساتھ ہو آپ اس کی طرف جوع کرنے والے تھے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہیں]

تفسیر ابن کثیر ۲/ ۲۱۲۔ مسند احمد برقم ۲۸۵۔ اس کی سند جید اور قوی ہے۔ تیز دیکھیں: سنن الترمذی؛ ابن ماجہ اور ابو داؤد اور سنن کبری۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ سب لوگوں سے زیادہ شجاع تھے۔ آپ کی تلوار سے اسلام کے قواعد و ارکان ایمان میں پختگی آئی۔ آپ کبھی بھی کسی بھی موقع پر پسپا نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی کبھی اپنے کسی قربت دار کو تلوار سے قتل کیا۔ اور تلوار ہی سے آپ نے نبی ﷺ سے تکالیف کو دور کیا۔ آپ دوسرے لوگوں کی طرح جنگ سے کبھی نہیں بھاگے تھے۔ جب آپ ﷺ کی بستر پر رات گزاری تو اپنی جان پر کھیل کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرمائی۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی چادر لپیٹ کر سو گئے۔ مشرکین نے آپ کو ہی محمد ﷺ گمان کیا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے پر تمام مشرکین کا اتفاق ہو گیا تھا؛ اور انہوں نے مسلح ہو کر آپ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ [نماز] فجر کا انتظار کر رہے تھے تاکہ آپ کو کھلے عام قتل کریں۔ اور آپ کا خون قبائل میں بٹ جائے۔ اور بن ہاشم دیکھ لیں کہ قاتلین میں ہر قبیلہ کے لوگ موجود ہیں؛ اور ان کے لیے اتنی بڑی تعداد کے قتل میں شریک ہونے کی وجہ سے خون کا بدلہ لینا ممکن نہ رہے۔ اور ہر قبیلہ اپنے افراد کی حفاظت کے لیے مستعد رہے۔ یہ [تدبیر] رسول اللہ ﷺ کے خون کی حفاظت کا سبب بن گئی۔ سلامتی پوری ہوئی۔ اس غرض نے ان کو ایک ملت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے صبح کی اور انہوں نے آپ کی یہ بہادری دیکھی تو انہیں اپنے آپ پر غصہ آیا؛ اور آپ کو پہچان لینے کے بعد وہ لوگ بکھر گئے۔ وہ اس حالت میں پلٹے کہ ان کے تمام حیلے ناکام ہو چکے تھے اور ان کی تدبیریں ٹوٹ چکی تھیں۔“ [ابھی کلام الرافضی]

[جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بہادر ترین صحابہ میں سے تھے۔ جن کی شجاعت سے اللہ تعالیٰ نے نصرت اسلام کی خدمت لی ہے۔ آپ کا شمار مہاجرین و انصار کے بڑے بزرگ سابقین اولین میں سے ہوتا ہے۔ آپ ان لوگوں کے سردار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؛ اور اپنی تلوار سے کئی کفار کو قتل کیا۔ مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں، بلکہ متعدد صحابہ اس میں آپ کے سہم و شریک تھے۔ اس وجہ سے دوسرے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آپ کی فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ تو پھر چہ جائے کہ باقی خلفاء راشدین پر آپ کی فضیلت ثابت ہو جائے؛ خلیفہ کیلئے متعین ہونا تو دور کی بات ہے۔

[اشکال]: ”شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے۔“

[جواب]: یہ بات جھوٹ ہے۔ بلکہ نبی ﷺ اشجع الناس [تمام لوگوں سے بہادر] تھے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت سب سے زیادہ بخشنے والے اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ایک روز اہل مدینہ گھبرا کر جدر سے آواز آرہی تھی ادھر کو چل پڑے، کیا دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ ابو طلحہ کے گھوڑے پر سوار تلوار گلے میں ڈالے اس طرف سے واپس آتے ہوئے ملے؛ آپ پہلے ہی اس آواز کی سمت چل پڑے تھے۔ آپ فرما رہے تھے ”مت گھبراؤ“ [صحیح بخاری (ج: ۲۹۰۸)؛ مسلم (ج: ۲۳۰۷)]

امام بخاری فرماتے ہیں: آپ واقعہ کی خبر لیکر واپس آرہے تھے کہ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔
مسند میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

”جب سخت خطرہ کا موقع ہوتا تو آپ سب سے آگے آگے دشمن کے قریب تر ہوا کرتے تھے۔“ [مسند احمد (۱/۸۶)]
شجاعت [بہادری] کی تفسیر دو چیزوں سے کی جاسکتی ہے:

- ۱۔ قوت قلب اور خطرات میں ثابت قدم رہنے کا نام۔
 - ۲۔ جسمانی طور پر سخت جنگ و قتال کرنا، بہت سارے لوگوں کو قتل کرنا؛ تاکہ ایک عظیم مقل سجادیا جائے۔
- پہلی چیز شجاعت ہے۔ جب کہ دوسری چیز جسمانی قوت پر دلالت کرتی ہے۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ جس کا بدن قوی ہو اس کا دل بھی قوی ہے یا اس کے برعکس معاملہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ کوئی انسان بہت سخت جنگ و جدال کرتا ہے اور بہت سارے لوگوں کو قتل کرتا ہے؛ لیکن یہ اس وقت جب کوئی اسے حفاظت فراہم کرنے والا ہو۔ اور اگر اسے خوف محسوس ہو جائے تو پھر اس پر بزدلی چھا جاتی ہے۔ اور اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور آپ کسی ایسے انسان کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو ثابت القلب ہو، مگر اس نے اپنے ہاتھ سے بہت سارے لوگوں کو قتل نہ کیا ہو۔ ایسا انسان خوف کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والا اور انتہائی خطرناک موڑ پر پیش قدمی کرنے والا ہوتا ہے۔ جنگی سالاروں اور قیادت میں اور ہر اول دستہ کے لوگوں میں اس خصلت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پیش قدمی کرنے والا جب بہادر اور ثابت القلب ہو؛ تو وہ آگے ہی بڑھتا رہتا ہے؛ پیچھے نہیں ہٹتا۔ پس اس کے ساتھی بھی جنگ و قتال کرتے ہیں۔ اور اگر بزدل اور کمزور ڈرپوک ہو تو وہ پسپا ہو جاتا ہے آگے نہیں بڑھ سکتا، اور نہ ہی ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ بھلے اس کا بدن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ [شدید گرفت اور جنگی مہارت بھی شجاعت میں داخل ہے۔]

نبی کریم ﷺ کی شجاعت ہر لحاظ سے کامل تھی وہ شجاعت جو میدان جنگ میں سالار لشکر سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس انتہائی شجاعت کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے ابی بن خلف کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ اسے غزوہ احد میں قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے یا بعد آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔ [سیرۃ ابن ہشام (ص: ۳۸۹)]

حالانکہ آپ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ آپ تمام صحابہ سے زیادہ بہادر تھے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ حنین میں منتشر ہو گئے تھے۔ مگر آپ فخر پر سوار ہو کر بدستور دشمن کی طرف بڑھے جارہے تھے۔ آپ کی خچر نہ بھاگتی تھی اور نہ ہی پیچھے ہٹتی تھی۔ اور اس کیساتھ ساتھ آپ فرماتے جارہے تھے:

”أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبٌ..... أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ.“

”میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں..... میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔“^①

پس آپ اپنا نام لے کر آگے بڑھ رہے تھے جب کہ صحابہ کرام ہکھر چکے تھے۔ اور دشمن مسلسل آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

① صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْيَبْتُمْكُمْ كُنْتُمْ كُفَرًا﴾
(ح: ۴۳۱۵-۴۳۱۷)۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوہ حنین (حدیث: ۱۷۷۶)۔

اور آپ اپنی خچر پر سوار دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے؛ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کی خچر کی لگام تھامی ہوئی تھی۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگ رسول اللہ ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے اس لیے کہ آپ ان سب سے زیادہ بہادر تھے؛ اگرچہ لوگوں میں ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے آپ ﷺ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا۔
جب امام میں قلبی شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ دلیر و بہادر تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ علیؑ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر بہادر تھے۔ جو انسان بھی صحابہ کرام کے حالات و واقعات جانتا ہے اسے ان باتوں کا علم ہے۔

اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آغاز اسلام ہی سے ان خطرات میں گھرے رہے جن میں نبی ﷺ مبتلا تھے۔ مگر کبھی بزدلی دکھائی نہ بے قراری کا اظہار کیا اور نہ ہی پیچھے ہٹے۔ بلکہ خطرات و مہالک میں کود کر اپنی جان پر کھیل کر نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے۔ مشرکین سے مال و جان اور زبان سے جہاد میں حصہ لیتے۔ یہ تمام باتیں گزر چکی ہیں۔
جنگ بدر میں سائبان کے نیچے نبی کریم ﷺ کے ہم راہ تھے؛ حالانکہ سب یہ بات جانتے تھے کہ مشرکین کا اصل ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ مگر آپ بالکل ثابت قلب تھے؛ نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت کر رہے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے لگے تو آپ فرما رہے تھے:

”اللھم أنجز لی ما وعدتني؛ اللھم إن تهلك هذه العصابة لا تعبد؛ اللھم اللھم۔“
”اے اللہ! جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اس کو پورا کر۔ اے اللہ! اگر یہ مختصری جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا؛ اے اللہ! اے اللہ!.....“ [صحیح مسلم (ج: ۱۷۶۳)]

ابوبکر رضی اللہ عنہ برابر کہتے جا رہے تھے: ”اے اللہ کے رسول! آپ کی یہ دعا کافی ہے، اللہ تعالیٰ آپ سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے۔ اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یقین کامل؛ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور عزم و ثبات؛ شجاعت و بہادری پر روشنی پڑتی ہے؛ اور قدرتی بہادری پر ایمانی شجاعت و بہادری زیادہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی حالت آپ سے زیادہ کامل تھی؛ اور آپ کا مقام ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام سے اعلیٰ تھا۔ اور معاملہ ایسے نہیں جیسا کہ بعض جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام رسول اللہ ﷺ کے مقام سے اعلیٰ ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ اس موقع پر دعا کرنے سے نبی کریم ﷺ کی شان میں کوئی قدر و حرمان نہیں ہوتی۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے اس بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس میں ابن عقیل اور دوسرے لوگوں نے بھی بحث کی ہے۔ [اس موقع پر دعا کرنا] یہ آپ کے کمال اور جامعیت کی دلیل ہے۔ آپ ہر مقام پر عظمت و رفعت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں۔
یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سب سے بہادر تھے۔

[وفات رسول ﷺ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے کارنامے]:

جب سالارِ رسل ﷺ نے رحلت فرمائی تو مسلمانوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہر شخص اپنی جگہ بے چین تھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا؛ عقلیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ ہر طرف اضطراب ہی اضطراب تھا۔ کوئی آپ کی موت کا انکار کر رہا تھا۔ اور

کوئی اپنی جگہ پر بیٹھ کر رہ گیا تھا۔ اور کوئی اوسان باختہ ہو چکا تھا اسے کسی گزرنے والے یا سلام کرنے والے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا اور اس کی بچی بندھ گئی تھی۔ گویا کہ قیامت تھی۔ قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔ اکثر بدو عرب دین اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اس مشکل ترین وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق صبر و یقین کی دولت سے بہرہ ور ہو کر کامل استقلال اور ثابت قلبی و بہادری کے ساتھ کھڑے ہو گئے؛ نہ آپ نے گریہ کیا؛ نہ ہی گھبرائے؛ آپ نے اور صحابہ کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اپنے پاس موجود نعمتوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا:

”جو شخص محمد (ﷺ) کا پرستار تھا، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ وفات پا چکے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا، اسے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اسے موت نہیں آئے گی۔“ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (آل عمران ۱۴۴)

”اور محمد (ﷺ) تو صرف ایک رسول ہیں، آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر گئے، اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل کیے جائیں تو کیا تم دین اسلام سے منحرف ہو جاؤ گے اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے گا تو اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

لوگوں نے جب یہ آیت سنی تو یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سے پہلے کبھی یہ سنی ہی نہ تھی۔ پھر کوئی بھی ایسا نہیں رہ گیا تھا جو اس آیت کی تلاوت نہ کر رہا ہو۔ پھر آپ نے ایک خطبہ کے ذریعہ ان کی ڈھارس بندھائی اور ان میں جرات و جلدات کے جذبات پیدا کیے۔^①

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ہمیں خطاب کیا تو ہم لومڑی کی طرح بزول تھے، آپ کی مسلسل حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔“

نیز جمش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ حالانکہ لوگوں نے اس لشکر کو روکنے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر جلد مرتدین کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ لوگ ان کے ساتھ جنگ کی بجائے نرمی سے کام لینے اور انتظار کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

پھر اس کے بعد آپ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ چھیڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی اگر کوئی صحابی کسی مسئلہ سے لاعلم ہوتا تو آپ اسے تعلیم دیتے، اور جب کوئی کمزوری دکھاتا تو آپ اسے آشیر باد کے ذریعہ طاقتور بناتے۔ اگر لوگ تھک جاتے تو آپ انہیں ترغیب دلاتے۔ پس آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے دین، علم اور وقت کو تقویت بخشی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انتہائی شجاعت اور کمال قوت کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کرتے تھے: ”اے خلیفہ رسول! لوگوں سے الفت و محبت کا سلوک کیجیے۔“ تو آپ فرماتے: کس بات پر ان کے ساتھ الفت کا سلوک کروں؟ کیا اپنی طرف سے گھڑے ہوئے دین پر؟ یا بے ڈھب شعروں پر؟ یہ باب بہت وسیع ہے۔ [یہاں انکی گنجائش نہیں]۔

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته (حدیث: ۴۴۵۳، ۴۴۵۴)۔

امام سے مطلوب شجاعت نبی کریم ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کامل کسی میں نہ تھی۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ آتا ہے۔ جہاں تک قتل اور کفار کو تہ تیغ کرنے کا تعلق ہے، بلاشبہ اس ضمن میں دیگر صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گئے تھے۔ اگر ہر قتل کرنے والا ہی بہادر ہوتا ہے تو پھر دوسرے بہت سارے ایسے صحابہ بھی ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا؛ تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ بہادر ہوں گے۔ [جو شخص سیر و مغازی کے احوال و واقعات بہ امعان نظر پڑھتا ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے مبارزت طلبی کر کے سو کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جن کے خون میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے وہ اس پر مزید ہیں۔^①

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جو کفار و اصل جہنم ہوئے ان کا شمار تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ غزوہ موہہ میں ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔^②

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت کئی گنا زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اندر طبعی شجاعت کے ساتھ ساتھ دینی شجاعت بھی کمال درجہ کی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ پر یقین کی قوت اور مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی نصرت پر ثقہ اعتماد۔ یہ شجاعت تو ہر قوت قلب والے کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہ قوت ایمان و یقین کے زیادہ ہونے سے بڑھ جاتی ہے اور اس کے کم ہونے سے کم ہو جاتی ہے۔ جس انسان کو یقین ہو کہ وہ دشمن پر غالب آئے گا تو وہ یقیناً ایسی پیش قدمی کرتا ہے جو عام پیش قدمی کی طرح نہیں ہوتی۔ یہ بات مسلمانوں کی اپنے دشمن کے خلاف پیش قدمی اور ان کی شجاعت کے بڑے اسباب میں سے ایک تھی۔ وہ بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی خبر پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ آخر کار ان لوگوں کو کامیابی ملے گی اور اللہ تعالیٰ انکے ہاتھوں پر دنیا کے شہروں کو فتح کرے گا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شجاعت کی ایک اور مثال جسے صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا وہ سخت ترین بات کون سی تھی جو مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی؟ انہوں نے فرمایا میں نے عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اس نے اپنی چادر آپ کی گردن مبارک میں ڈال کر آپ کا گلا بہت زور سے گھونٹا شروع کیا اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے اور آ کر اس کو آپ سے ہٹایا اور کہا:

﴿أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ [غافر: ۲۸]

”کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے ”میرا رب اللہ ہے“ حالانکہ یقیناً وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔“ [صحیح بخاری: ج ۸۹۲]

① مصنف عبد الرزاق، (۹۴۶۹)، طبرانی (۱۱۷۸، ۱۱۷۹)، مستدرک حاکم (۲۹۱/۳)

② صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ مویہ من ارض الشام (حدیث: ۴۲۶۵)

فصل:

[حقیقت شجاعت]

اس چیز کا جاننا ضروری ہے کہ دین میں شجاعت کی فضیلت و اہمیت جہاد نے سبیل اللہ کی وجہ سے ہے۔ وگرنہ وہ بہادری و شجاعت جس سے جہاد نے سبیل اللہ کا کام نہ لیا جائے؛ وہ یا تو خود انسان پر وبال ہے جب وہ اس بہادری سے شیطان کی اطاعت میں مدد لے گا۔ اور یا پھر اگر اسے اللہ تعالیٰ کی قربت و اطاعت کے کاموں میں نہ صرف کرے تو اس کے لیے غیر نفع بخش ہے۔ پس حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت خالد اور ابودجانہؓ اور براء بن مالکؓ (رضی اللہ عنہم) بڑے بہادر مجاہد صحابہ کرام میں سے تھے۔ اور یہ بہادری ان کے فضائل میں شمار ہونے لگی۔ اس لیے کہ انہوں نے اس بہادری سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں مدد لی؛ اور اس وجہ سے وہ اس حمد و ثناء کے مستحق ٹھہرے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مجاہدین کی ثنائیاں کی ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ جہاد کی ایک قسم ہاتھ سے قتال کرنا ہے۔ اور دوسری قسم دلیل و بیان اور دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ شِئْنَا لَکَفَعْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۚ فَلَا تُطِيعُ الْکٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا کَبِيْرًا ۝۱﴾
 ”اور اگر ہم چاہتے تو ضرور ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ پس تو کافروں کا کہنا مت مان اور اس کے ساتھ

ان سے جہاد کر، بہت بڑا جہاد۔“ [الفرقان ۵۱، ۵۲]

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کفار کو قرآن سنا کر ان کے ساتھ بڑا جہاد کیا جائے۔ یہ مکی سورت کی آیات ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ اس وقت تک ابھی قتال کرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی اس کی اجازت دی گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ جہاد علم و قلب اور بیان و دعوت کے ساتھ تھا قتال نہیں تھا۔ اس لیے کہ قتال میں رائے اور تدبیر کے ساتھ شجاعت قلب اور زور بازو کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوت بدن کی نسب سے شجاعت قلب اور رائے و تدبیر کی عام مجاہد سے بڑھ کر قائمہ اور سالار میں بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ سو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جسمانی قتال کے علاوہ بھی جہاد کی جملہ اقسام میں دوسرے صحابہ کرام پر مقدم تھے۔ [بلاشبہ اس جہاد میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی شرکت کی تھی، اگرچہ وہ اس ضمن میں ان مجاہدین تک نہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ مرتبہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اطراف ملک میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیر کے بعض قلعے یقیناً فتح کیے تھے۔]

امام ابن حزم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”شیعہ کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جہاد و قتال، کفار پر ضرب و کرب میں دیگر صحابہ پر فائق تھے۔ اور جہاد افضل الاعمال ہے۔“ یہ غلط بات ہے۔ اس لیے کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ جہاد کی پہلی قسم دین اسلام کی طرف زبان کے ساتھ دعوت دینا ہے [یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے]۔

۲۔ جہاد کی دوسری قسم یہ ہے کہ لڑائی کے وقت رائے و تدبیر سے کام لیا جائے۔

۳۔ تیسری قسم کا جہاد جہاد بالید [ہاتھ کا جہاد] ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی قسم اول [یعنی دعوت الی اللہ] میں نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ہم پلہ نہیں۔ اکابر صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر بیعت اسلام کی تھی۔ یہ افضل اعمال میں سے ہے۔ اس میدان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اتنا بڑا کردار نہیں۔ باقی رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو جس دن آپ اسلام لائے اس دن اور اس وقت سے اسلام زور پکڑ گیا؛ اور اعلانہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہونے لگی۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ [حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہم معزز ہو گئے۔" ۱]

خلاصہ کلام! حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جہاد کی ان دونوں اقسام میں عدیم النظیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس میں بڑا حصہ نہیں تھا۔ دوسری قسم کا جہاد جس میں رائے و مشورہ سے کام لیا جاتا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص ہے۔ تیسری قسم کا جہاد: طعن و ضرب و مبارزت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دلیل و برہان ضروری کے بیان کے بعد اس کا درجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں کوئی مسلمان شک نہیں کر سکتا کہ ہر فضیلت و خوبی آپ کے ساتھ مخصوص تھی۔ مگر سرور کائنات کا اکثر جہاد پہلی دو اقسام سے تعلق رکھتا تھا۔ جس میں دعوت الی اللہ تہذیب و ارادہ شامل ہیں۔ تیسری قسم یعنی مبارزت اور مار و قتال میں آپ نے بہت کم حصہ لیا۔ مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بزدل تھے۔ بلکہ آپ تمام روئے زمین کے باشندوں سے بہادر و طاقتور تھے؛ جسمانی لحاظ سے بھی اور قلبی لحاظ سے بھی۔ آپ کی بسالت سب سے اعلیٰ و کامل تھی۔ لیکن آپ اعمال میں سے افضل سے افضل تر کو زیادہ ترجیح دیتے؛ اسے مقدم رکھتے اور اس میں مشغول رہتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بدر کے موقع پر۔ اور دیگر مواقع پر۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہیں کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ آپ کی ہمراہی ترجیح دیتے تھے؛ اور آپ کی رائے طلب کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو خصوصی انس بھی تھا۔ پھر بسا اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سعادت میں آپ کے شریک ہوتے۔ اس منزلت میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے سارے صحابہ سے منفرد ہیں۔ مگر نادر طور پر۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی اس قسم یعنی ضرب و کرب اور مبارزت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد شمشیر زن نہ تھے۔ بلکہ دیگر صحابہ اس میں برابر آپ کے سہم و شریک تھے۔ مثلاً ان صحابہ کرام میں: حضرت طلحہ، زبیر، سعد رضی اللہ عنہم، اور شروع اسلام میں شہید ہونے والے حضرت حمزہ، عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب، مصعب بن عمیر، سعد بن معاذ اور سہل بن خذافہ یعنی ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) بڑے مجاہد تھے۔ بلاشبہ اس جہاد میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی بھرپور شرکت کی تھی، اگرچہ وہ اس ضمن میں ان مجاہدین تک نہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عموماً میدان جنگ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ مرتبہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اطراف ملک میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنی فزارہ اور دیگر قبائل کی طرف امیر لشکر بنا کر بھیجا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی کئی قبائل کی طرف قائد بنا کر روانہ فرمایا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف خیبر کے بعض قلعوں کی طرف بھیجا تھا جو کہ آپ نے یقیناً فتح کیے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ جہاد کی بھی سب سے افضل انواع میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھرپور حصہ حاصل تھا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جہاد میں مقام و مرتبہ ان حضرات سے کم ہے اور اس میں بھی دوسرے لوگ آپ کے برابر کے سہم و شریک ہیں۔

۱ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب (ح: ۳۶۸۴)۔

فصل:

[شمشیر علی رضی اللہ عنہ اور ارکان اسلام کی مضبوطی]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ شمشیر علی رضی اللہ عنہ سے قواعد اسلام و ارکان ایمان مضبوط ہوئے۔ [انہی کلام اربعہ]

[جواب]: ”یہ صاف اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ [اسلامی غزوات سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کذب سے آشنا ہے]۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی تلوار بھی دوسری بیش تعداد تلواروں کا ایک حصہ تھی۔ اور قواعد اسلام کی پختگی کے اسباب میں سے ایک سبب تھی۔ لیکن بہت سے مواقع ایسے ہیں جن سے اسلام کو تقویت ملی مگر ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا کوئی خصوصی کردار نہ تھا۔ جس طرح بدر میں بہت سی تلواres آپ کی تلوار کے علاوہ اور بھی تھیں۔

ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ: نبی کریم ﷺ کے وہ غزوات جن میں قتال کی نوبت آئی تھی کل نو تھے۔ سرور کائنات کی وفات کے بعد فارس و روم کی خطرناک لڑائیوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مطلقاً حصہ نہیں لیا تھا۔ عہد رسالت کی لڑائیوں میں جو غلبہ حاصل کیا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کامیابی نہ تھی بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کی کامیابی کے تابع اور آپ کے فیض کی رہین منت تھی۔

وہ بڑی لڑائیاں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد امارت میں حصہ لیا وہ تین ہیں: جمل و صفین اور نہروان کی لڑائیاں۔ جمل اور نہروان میں آپ نے جو غلبہ حاصل کیا تھا اس کی وجہ مخالفین کی نسبت ان کے لشکر کی کثرت تعداد تھی۔ اس کے باوصف آپ نے اہل شام کے خلاف کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی بلکہ فریقین برابر غالب آرہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو شہید کر دیا گیا اور آپ اس حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سدھار گئے کہ آپ کا لشکر روز بروز کمزور تر ہوتا جا رہا تھا؛ اور آپ کے مخالفین قوت پکڑتے جا رہے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں آپ کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی؛ وہ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ اہل ایمان کی نصرت و مدد تھی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]
 ”بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“

یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے حضرات جیسے ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو حاصل ہونے والی نصرت کا تھا۔ حقیقت میں یہ اللہ کی طرف سے اپنے رسول ﷺ کی وہ نصرت تھی جس کا وعدہ اس نے اپنی کتاب میں کیا تھا۔

فصل:

[عدم فرار علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ سے کبھی فرار اختیار نہیں کیا تھا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ بھی اس وصف

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر شریک ہیں۔ یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی فرار نہیں ہوئے بالکل اسی دعویٰ کی طرح ہے کہ یہ حضرات بھی کبھی فرار نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو کبھی شکست ہوئی ہے۔ اور اگر اس قسم کی کوئی معمولی چیز وقوع میں آئی بھی ہے تو وہ پوشیدہ ہے اور نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچی۔ اس بات کا احتمال ہے کہ احد و حنین میں ایسی لغزش حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی سرزد ہوئی ہو مگر ہم اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔ مسلمانوں کو دوبار پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ ایک بار احد کے موقع پر اور دوسری بار حنین میں۔ اور یہ بات منقول نہیں ہے کہ ان مذکورہ بالا صحابہ کرام میں سے کوئی ایک پسپا ہوا ہو۔ بلکہ سیرت اور مغازی کی کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما غزوہ احد و حنین میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ فرار ہونے والوں کے ساتھ فرار نہیں ہوئے تھے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ حضرات حنین کے موقع پر فرار ہو گئے تھے تو اس کا جھوٹ صاف ظاہر اور ہر ایک کو معلوم ہے۔ احد کے موقع پر پسپا ہونے والوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شامل تھے: [اس لغزش کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ جو کچھ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ آپ حنین کے موقع پر جھنڈا لیکر فرار ہو گئے تھے؛ محض جھوٹ ہے جو ان لوگوں نے گھڑ لیا ہے جنہیں افتراء پر دازی کی عادت اور لت پڑی ہوئی ہے۔

❦ شیعہ مصنف کا دعویٰ کہ: ”آپ نے اپنی تلوار سے کبھی کسی قریبی رشتہ دار کو قتل نہیں کیا۔“

جواب: اس کے سچ یا جھوٹ ہونے کے ثبوت معلوم نہیں ہو سکے۔ اور اس مسئلہ میں ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد روایت بھی موجود نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت زبیرؓ براء بن مالکؓ ابو دجانہؓ اور ابو طلحہؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسا دعویٰ کرے کہ انہوں نے کبھی اپنے کسی خونی رشتہ دار کو قتل نہیں کیا۔ یہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دعویٰ جیسا دعویٰ ہے۔ بلکہ یہ مثال حضرت خالد اور براء بن مالک رضی اللہ عنہما پر زیادہ صادق آتی ہے۔

اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا: ”آپ مشرکین پر اللہ کی تلواروں میں سے ایک لنگتی ہوئی تلوار ہیں۔“ پس اگر یہ کہا جائے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تلوار بنایا ہو وہ کبھی اپنے کسی قریبی خونی رشتہ دار کو قتل نہیں کرے گا تو یہ بات سچائی کے زیادہ قریب ہوگی۔ حالانکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہے کہ آپ نے جنگوں میں کس کثرت سے لوگوں کو قتل کیا۔ اور آپ ہمیشہ کامیاب ہی ہوتے رہے۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی مشکلات کا ازالہ کیا۔“

[جواب]: یہ بھی ایک کھلا ہوا جھوٹ [اور دعویٰ بلا دلیل] اور سابقہ من گھڑت اقوال کی طرح کا ایک خود ساختہ قول

ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی ایک تکلیف کو بھی دور نہیں کیا تھا۔ بلکہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی نبی کریم ﷺ کی کسی تکلیف کو دور نہیں کیا۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے مجاہد تھے۔ اس کے برعکس نبی

کریم ﷺ ان لوگوں کی تکلیف اور پریشانیوں کو دور کیا کرتے تھے۔

البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت آپ کا دفاع کیا تھا جب مشرکین نے مکہ میں آپ کو پینا اور قتل کرنا چاہا تھا۔ آپ ان سے کہہ رہے تھے: ﴿اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾ (غافر: ۲۸) ”کیا تم اس لیے ایک شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔“ مشرکین نے اس جرم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پینا تھا۔^①

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلوم نہیں کہ کبھی انہوں نے ایسا کیا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ مشرکین نے تلواریں لیکر نبی کریم ﷺ کا گھیراؤ کر لیا ہو تو ابوبکر یا علی رضی اللہ عنہ نے آکر آپ کو بچایا ہو۔ ایسا کہیں بھی معلوم نہیں ہوا۔ نہ ہی اہل علم نے کوئی ایسا واقعہ نقل کیا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حقیقت ہے۔ مگر یہ رافضی مصنف اور اس طرح کے دوسرے شیعہ مصنفین کا سیرت و مغازی کے بارے میں مبلغ علم ان جھوٹے اور کذاب راویوں کی روایات تک محدود ہے۔ غالباً شیعہ مصنف کا ماخذ قصہ کہانی کی کتابیں ہیں جو افسانہ گو قسم کے لوگوں نے تصنیف کی ہیں۔ ”تتقلاط الانوار“ کا مصنف بکری کذاب اور اسکے امثال۔ سیرۃ البطال، عصترہ بن شداد نے ہارون اور اس کے وزیر کی کہانی، اور بطلال اور دلہمہ، عیار اور احمد الدنف، اور الزینق مصری وہ کتابیں جن میں انہوں نے مختلف کہانیاں گھڑی ہیں۔ ا۔ جو کہ سکول کے طالب علم پڑھائی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کرایہ پر لے کر پڑھتے ہیں اور ان بے ہودہ کہانیوں کو پڑھ کر وہ رات بھر نہیں سکتے۔

بعض جھوٹوں نے رسول اللہ ﷺ کے مغازی کے بارے میں بھی اس قسم کی جھوٹی کہانیاں گھڑی ہیں۔ اور وہ لوگ ان کی تصدیق کرنے لگ گئے جو انتہائی جاہل تھے اور جنہیں سیرت کے بارے میں اہل علم کی روایت کردہ صحیح احادیث کا علم نہ تھا۔ جب کہ اہل علم ان کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ صاف جھوٹ ہے۔

شیعہ مصنف نے جو آپ ﷺ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رات گزارنے کا ذکر کیا ہے، ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہاں پر اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خوف والی کوئی بات نہیں تھی۔

اہل ایمان کی جانب سے نبی کریم ﷺ کے دفاع کا جو سب سے مشہور واقعہ و معرکہ ہے وہ احد کے دن کا ہے۔ جس دن مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے۔ تو دشمن نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔ امیہ بن خلف آپ کو قتل کرنے کی کوشش میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ اس موقع پر مشرکین نے نبی کریم ﷺ کا چہرہ زخمی کر دیا؛ آپ کے سر پر خود تھا جس پر وار کیا گیا؛ آپ کے سامنے کے دو ابرو والے دودانت ٹوٹ گئے۔ اس وقت جو صحابہ کرام آپ کے ارد گرد باقی رہ گئے تھے وہ بھرپور دفاع کرنے لگے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تیر چلاتے جا رہے تھے اور نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے:

”میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔“ [بخاری ۴/۳۹]

حضرت طلحہ نے غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کی حفاظت کی تھی۔^② اسی دوران آپ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔^③

① صحیح بخاری، کتاب التفسیر۔ سورۃ المؤمن (حدیث: ۴۸۱۵، ۳۶۷۸)،

② صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ﴿اِذْ هَمَّتْ طَافَتَانِ مِنْكُمْ﴾ (حدیث: ۴۰۶۳)

③ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۴۰۶۴)، صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد۔ باب غزوۃ النساء مع الرجال (حدیث: ۱۸۱۱)، اس میں ہے کہ یہ کہنے والا ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ واللہ اعلم۔

آپ کے ارد گرد مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کا دفاع کرتے ہوئے مقام شہادت پر سرفراز ہو گئی۔
 [حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ کے دفاع کے لیے آپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ یہ بات غلط ہے کہ مشرکین نے احد میں نبی کریم ﷺ کو گھیر لیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلوار کے ساتھ چھڑایا تھا۔]
 حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم احد کے موقع پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی تلوار دھونے کو کہا، اور فرمایا: ”اے دھونا، اس پر کوئی مذمت نہیں ہے۔“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تم نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو فلاں فلاں نے بھی اچھا کام کیا ہے۔“ اور آپ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کے نام گنوائے۔ [سیرۃ ابن ہشام ۱۰۶/۳، البدایہ والنہایہ ۴/۲۷۷]

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مقتولین بدر]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ بدر کے موقع پر، جو کہ پہلا غزوہ ہے، اور مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آنے کے اٹھارہ ماہ بعد پیش آیا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر صرف ستائیس برس کی تھی آپ نے تنہا چھتیس آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ جس قدر کفار کو غزوہ بدر میں قتل کیا گیا تھا یہ تعداد اس کے نصف سے بھی زیادہ ہے، اس کے علاوہ آپ دیگر کفار کے قتل میں بھی شریک ہوئے تھے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: با اتفاق اہل علم و عارفین اہل سیرت و معازی یہ صریح جھوٹ اور من گھڑت بہتان ہے۔ یہ بات کسی بھی ایسے راوی نے نقل نہیں کی جس کی روایت پر اعتماد کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ جھوٹے اور جاہل لوگوں کی خود ساختہ بات ہے۔ بلکہ روایات صحیحہ سے بہت سے [بہت سے ایسے] کفار کا بدر میں قتل کیا جانا ثابت ہے جن [کے قتل] میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرکت نہیں کی تھی۔ مثلاً ابوجہل و عقبہ و عتبہ بن ربیعہ [یا شیبہ بن ربیعہ] و ابی بن خلف وغیرہ۔

یہ واقعہ ایسے ہے کہ جب مشرکین کی طرف سے تین آدمی: عتبہ، شیبہ اور ولید نکلے اور انہوں نے مبارزت طلب کی تو ان کے مقابلہ میں تین انصاری نکلے۔ انہوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ تو انہوں نے نام لیکر اپنا تعارف کروایا۔ تو مشرکین نے کہا: آپ عزت والے ہم پہلے لوگ ہیں، مگر ہم اپنے چچا زادوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقارب کو نکلنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا: اے حمزہ! کھڑے ہو جاؤ۔ اے عبیدہ! کھڑے ہو جاؤ۔ اے علی! کھڑے ہو جاؤ۔“

اس وقت مشرکین میں سب سے چھوٹا ولید تھا اور مسلمانوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ؛ تو ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے فریق مخالف کو قتل کیا؛ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے فریق مخالف عتبہ کو۔ جب کہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان کے دشمن نے زخمی کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے جا کر کی ان کی مدد کی اور تیسرے کافر کو بھی قتل کر دیا۔ نقل کیا گیا ہے کہ جنگ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دس؛ یا اس سے بھی کم یا اس سے کچھ زیادہ کافروں کو قتل کیا تھا۔

جو کچھ ابن ہشام اور اس سے پہلے موسیٰ بن عقبہ اور اموی نے ذکر کیا ہے؛ ان تمام نے زیادہ سے زیادہ آپ کے ہاتھوں سے گیارہ کفار کا قتل ہونا بتایا ہے۔ جب کہ چھ کفار کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کا قتل کرنے والا کون تھا۔ تین کفار کے قتل میں آپ نے شراکت کی ہے۔ اہل صدق و امانت نے یہی نقل کیا ہے۔

[غزوہٴ احد اور شیعہ کی افتراء پر دازی]:

[الزام]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”احد کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا سب لوگ بھاگ گئے تھے، بعد ازاں چند صحابہ لوٹ آئے سب سے پہلے عاصم بن ثابت و ابو دجانہ و سہل بن حلیف رضی اللہ عنہم آئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین دن کے بعد آئے، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”آپ نے بہت دیر لگا دی۔“ فرشتوں نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ثبات و استقلال پر تعجب کا اظہار کیا تو جبرائیل نے آسمان پر چڑھتے ہوئے کہا: ”تلوار ہے تو ذوالفقار اور جوان ہے تو علی۔“

اس جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اکثر مشرکین کو قتل کیا تھا اور آپ کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ قیس بن سعد نے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: ”میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ”احد کے دن مجھے سولہ زخم پہنچے۔ ان میں سے چار زخم کھا کر میں زمین پر گر گیا تھا۔ تو میرے پاس ایک خوبصورت چہرہ والا خوبصورت زلفوں والا اور پاکیزہ خوشبو والا ایک آدمی آیا۔ اس نے مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اور پھر کہا: آگے بڑھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں قتال کرو۔ یہ دونوں تم سے راضی ہیں۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس واقعہ کی خبر دی۔ تو آپ نے فرمایا: اے علی! کیا تم اسے نہیں جانتے؟ میں نے کہا نہیں؛ لیکن وحیہ کلی سے مشابہت رکھتا تھا۔“ آپ نے پھر فرمایا: ”اے علی! اللہ تیری آنکھوں کو کھنڈی کر دے! وہ جبرائیل امین تھے۔“ [اسی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ بھی ان بڑی جھوٹی روایات میں سے ہے جو صرف ان لوگوں کو جھپتی ہیں جنہیں اسلام کی کوئی معرفت نہیں۔ [شیعہ مصنف شرم و حیا کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر ایسے اکاذیب نقل کرتا چلا آ رہا ہے جن کو چوپائے تو تسلیم کر سکتے ہیں، مگر ایک سلیم العقل انسان کبھی ماننے کے لیے تیار نہیں]۔ گویا کہ وہ یہ باتیں ایسے لوگوں کو بتا رہا ہے جنہیں غزوات کے واقعات کے بارے میں کچھ بھی علم ہی نہ ہو۔

جیسا کہ وہ کہتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے غزوہٴ احد میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔“ اس سے کہا جائے گا کہ: جھوٹ کی اصل بنیادی آفت جہالت ہوتی ہے۔ کیا اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی؟ شروع میں تو مسلمانوں نے دشمن کو پسپا کیا تھا؛ مگر جبل الرماۃ پر متعین دستہ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ہر حال میں اپنی جگہ پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کی تھی؛ اور فرمایا تھا: خواہ انہیں فتح ہو یا شکست مگر یہ لوگ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ پس جب مشرکین پسپا ہوئے تو بعض لوگ چیخ کر آواز لگانے لگے: لوگو! مال غنیمت! انہیں ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے منع کیا [کہ پہاڑ چھوڑ کر نیچے نہ اتریں؛ مگر انہوں نے اس پر توجہ نہ دی اور پہاڑ چھوڑ کر نیچے اتر گئے] دشمن نے پلٹ کر اس پہاڑی درے سے حملہ کر دیا۔ اس وقت مشرکین کے رہنما وقاد خالد بن ولید [جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے] تھے۔ انہوں نے پشت کی طرف سے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اس وقت شیطان نے چیخ لگائی کہ: ”محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں۔“^①

① نبی کریم ﷺ کا سرمبارک زخمی ہو گیا اور اگلے دانت ٹوٹ گئے۔ خود آپ کے سر میں دھنس گیا اور اس کی کڑیاں آپ کے [..... حاشیہ جاری ہے]

اس دن تقریباً ستر مسلمان شہید ہوئے؛ اس دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف بارہ افراد ثابت قدم رہے جن میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی شریک تھے۔^①

ابوسفیان نے ان لوگوں کے احوال جاننے کے لیے کہا: ”کیاتم میں محمد ہیں؟ کیا تم میں محمد ہیں؟“ یہ الفاظ پہلے گزر چکے ہیں؛ اور یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ یہ دن سخت آزمائش و ابتلاء و فتنہ کا دن تھا۔ اس دن دشمن کامیاب لوٹا تھا؛ اور راستہ میں انہوں نے دوبارہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا؛ مگر اس سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ ان کا پیچھا کرتے ہوئے چل پڑے۔ [بڑا تفصیلی واقعہ ہے] کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (آل عمران: ۱۷۲)

”وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا، اس کے بعد کہ انھیں زخم پہنچا۔“

[اس موقع پر] اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے والوں میں حضرت ابوبکر حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتی تھیں یہ آیت تمہارے باپ اور دادا کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (آل عمران: ۱۷۲)

غزوہ احد میں مشرکین کے صرف چند آدمی قتل کیے گئے تھے۔ اس دن مشرکین نے نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی کوششوں میں سردھڑکی بازی لگا دی تھی۔ اس دن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آپ کے دفاع میں ثابت قدم تیر چلاتے جا رہے تھے اور نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے: ”میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔“ [البخاری ۳۹/۴] صحیحین میں ہے حضرت سعد بن ابی وقاص فرمایا کرتے تھے: ”اُحد کے دن رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے اپنے ماں اور باپ کو جمع کیا۔“ حضرت سعد مستجاب الدعاء اور پختہ تیر انداز تھے۔

ان [ثابت قدم رہنے والوں] میں حضرت ابوطحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو انتہائی سخت جنگجو اور تیر انداز تھے۔ اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تھے؛ جو اپنے ہاتھ پر وار روک کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرما رہے تھے۔ اور آپ کا یہ ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے دو ذریعے پہن رکھی تھیں؛ نبی کریم ﷺ کے ارد گرد بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے شہادت پائی۔

ابن الحنفی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”سیرت“ میں ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے؛ ان میں ابودجانہ تھے؛ جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی؛ آپ کی پیٹھ پر دشمن کی طرف سے تیر لگتے؛ مگر آپ رسول اللہ ﷺ پر جھک کر آپ کو بچا رہے تھے۔ آپ کو تیروں کے کئی زخم آئے۔ حضرت

[سابقہ حاشیہ] سر مبارک میں پھنس گئیں۔ اسی حالت میں آپ فرمانے لگے: ”وہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے نبی کے ساتھ یہ سلوک کیا۔“ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ ”اس امر میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔“ [البخاری۔ کتاب المغازی باب ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾...﴾ [تعلیقاً قبل ح (۴۰۶۹)، صحیح مسلم، کتاب الجہاد باب غزوہ احد، (ح: ۱۷۹۱)۔] ① سیرۃ ابن ہشام (ص: ۳۸۸)۔ نبی کریم ﷺ کے ارد گرد بہت سے صحابہ نے شہادت پائی۔ رئیس المشرکین نے کہا: ”مہل کی ہے! آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔“ [البخاری۔ کتاب المغازی۔ باب غزوہ احد، (ح: ۴۰۴۳)۔] یہ غلط ہے کہ علی غزوہ احد میں زخمی ہوئے تھے۔ اور جبریل نے آپ کو اٹھایا تھا۔ ہم رافضی معنف سے پوچھتے ہیں کہ اس کی اسناد کہاں ہے اور اس کا ماخذ موضوعات کی کون سی کتاب ہے؟

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے کھڑے تیر چلا رہے تھے؛ رسول اللہ ﷺ خود تیر اٹھا کر انہیں دیتے اور فرماتے جاتے: ”میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔“

یہاں تک کہ آپ انہیں ایسا تیر بھی تھا دیتے جس کا پھل نہ ہوتا۔ اور فرماتے: ”یہ تیر بھی چلاؤ۔“

جب دشمنوں نے آپ پر بلہ بول دیا تو آپ نے فرمایا: ”کون ہے جو ہمارے لیے اپنی جان قربان کرے گا؟“

یہ سن کر حضرت زیاد بن سکن انصاری رضی اللہ عنہ پانچ انصاری صحابہ کے ایک گروہ کے ساتھ کھڑے ہوئے؛ بعض نے ان کا نام عمارہ بن زید بن سکن بتایا ہے؛ یہ ایک ایک کر کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر لڑتے؛ اور شہید ہوتے جاتے۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں زیاد یا عمارہ رضی اللہ عنہ آئے؛ اور انہیں زخموں نے بہت بری طرح چور کر دیا تھا؛ مگر آپ ثابت قدم رہے یہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت لوٹ کر آگئی؛ اور آپ کی حفاظت میں لڑنے لگی۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ کو اپنے قریب کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے ان کے سر کو اپنے قدم مبارک پر رکھ کر سہارا دیا۔ اور ان کا انتقال اس حال میں ہوا کہ ان کے گال رسول اللہ ﷺ کے پاؤں پر تھے۔ [مختصر السیرۃ لابن ہشام ۱۸۷/۳]

[آپ فرماتے ہیں:] ہم سے عاصم بن عمر بن قتادہ نے حدیث بیان کی؛ بیشک رسول اللہ ﷺ نے اپنی کمان سے احد کے دن تیر چلائے؛ یہاں تک کہ وہ کمان ٹوٹ گئی۔ پھر وہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے لے لی؛ جو کہ پھر آپ ہی کے پاس رہی۔ اس دن حضرت قتادہ بن نعمان کی آنکھ نکل گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے گالوں پر لٹک رہی تھی۔ عاصم بن عمر فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ آنکھ واپس اپنی جگہ پر رکھ دی؛ تو وہ دوسری آنکھ سے بھی خوبصورت لگتی تھی۔“

حضرت علی اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم بھی اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ جنگ و قتال میں مصروف تھے؛ ان میں سے کوئی ایک بھی اس وقت نبی کریم ﷺ کے دفاع کے مقام پر موجود نہیں تھا؛ اس موقع پر آپ ﷺ کی پیشانی پر زخم آئے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی تو زخمی نہیں ہوئی۔

❦ ”شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”احد کے دن مجھے سولہ زخم پہنچے۔ ان میں سے چار زخم کھا کر میں زمین پر گر گیا تھا۔“

❦ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس طرح کی کوئی روایت اہل علم کے ہاں ان کی معروف کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اس روایت کی سند کہاں ہے؟ اور اہل علم میں سے کس نے اسے صحیح کہا ہے؟ اور جن قابل اعتماد کتابوں سے روایات نقل کی جاتی ہیں ان میں سے کس کتاب میں یہ روایت موجود ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس موقع پر خود رسول اللہ ﷺ اور بہت سارے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخمی ہوئے تھے۔

❦ ابن اسحق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب رسول اللہ ﷺ غار کے منہ پر پہنچ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے اور مہر اس نامی چشمہ سے پانی لے کر آئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کو پلا سکیں۔ لیکن اس پانی سے کچھ بو آ رہی تھی؛ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے نہیں پیا۔ پھر اس پانی سے آپ کا خون دھویا گیا۔ اور آپ کے سر کے زخم دھوئے گئے۔ اسی حالت میں آپ فرمانے لگے: ”اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوا جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا۔“

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین دن کے بعد آئے۔“ یہ ایک اور جھوٹ ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”جبرائیل نے آسمان پر چڑھتے ہوئے کہا تھا: ”لَا سَيْفَ إِلَّا ذُو الْفَقَارِ لَا فَتَى إِلَّا عَلِيٌّ.“

شیعہ کے اس قول کے جھوٹ ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے؛ اس لیے کہ ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا نام نہیں ہے، بلکہ ابو جہل کی تلوار کا نام تھا۔ مسلمانوں نے جنگ بدر میں یہ تلوار مال غنیمت میں پائی تھی۔ امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ نے ابو جہل کی ذوالفقار نامی تلوار بدر کے دن نفل (وہ حصہ جو امیر لشکر باقی مجاہدین کی نسبت زائد وصول کرتا ہے) کے طور پر خود لے لی تھی۔ اسی تلوار کے بارے میں آپ نے احد کے روز خواب دیکھا تھا کہ اس میں دندائے پڑ گئے ہیں۔“^①

اس کی تعبیر آپ نے مسلمانوں کی شکست سے فرمائی۔ نیز فرمایا کہ میں نے دیکھا میں اپنے پیچھے ایک مینڈھے کو سوار کیے ہوں، اس سے میں نے سالار لشکر مراد لیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک مستحکم قلعہ میں ہوں، میں نے اس کی تعبیر مدینہ سے کی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک تیل کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ اللہ کی قسم! تیل اچھا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ دہرائے۔

[مسند احمد (۱/۲۷۱)]

[غزوہ احزاب اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ احزاب میں؛ اسے غزوہ خندق بھی کہا جاتا ہے؛ جب نبی کریم ﷺ خندق کھودنے سے فارغ ہو گئے؛ تو قریش ابوسفیان کی قیادت میں؛ کنانہ اور اہل تہامہ کے دس ہزار کے لشکر کفار نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایسے ہی غطفان اور ان کے تابعین بھی اہل نجد بھی چڑھ آئے تھے؛ مدینہ کی بالائی اور زریں جانب سے دشمن اند پڑے تھے بالکل جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نقشہ کھینچا ہے: ﴿إِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ﴾

”جب وہ تم پر تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آ گئے۔“

آپ ﷺ تین ہزار صحابہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے اور خندق کو اپنے اور کفار کے درمیان حائل کر دیا۔ مشرکین نے یہود کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ یہودیوں سے معاہدہ اور کفار کی کثرت کے پیش نظر ان لوگوں کی طمع اور بڑھ گئی۔ کفار میں سے عمرو بن عبدود اور عکرمہ بن ابی جہل نے خندق کے ایک تنگ شکاف میں سے داخل ہو کر مقابلہ کے لیے لاکارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”یہ عمرو ہے“ علی رضی اللہ عنہ چپ رہے۔

پھر عمرو نے دوسری اور تیسری مرتبہ لاکارا۔ جب ہر بار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو چوتھی بار نبی کریم ﷺ نے اجازت دے دی۔

جب عمرو بن عبدود سے سامنا ہوا تو اس نے کہا: ”اے میرے سچے اتھم واپس چلے جاؤ میں تمھارے خون سے اپنی تلوار کو

① مسند احمد (۱/۲۷۱)، الترمذی، کتاب السیر، باب فی النفل (حدیث: ۱۵۶۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب السلاح (حدیث: ۲۸۰۸)۔

رنگین نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ جب میں مشرکین سے ٹکراؤں گا تو قریش میں سے جو بھی انسان دو میں سے ایک بات قبول کر لے گا؛ میں اس کی وہ بات مان لوں گا۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ عمرو نے کہا: ”مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

پھر آپ نے فرمایا: میں تمہیں مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔“

عمرو نے کہا: میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”لیکن میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

اس پر عمرو کو تپ چڑھ گئی [یعنی وہ گرم ہو گیا اور غصہ میں آ گیا]۔ اس نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگائی اور داؤ کھیلنے لگا۔ آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قتل کر دیا؛ اور عکرمہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔ پھر باقی مشرکین اور یہود بھی شکست کھا کر بھاگ گئے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”علی رضی اللہ عنہ کا عمرو بن عبدود کو قتل کرنا جن وانس کی عبادت سے افضل ہے۔“^۱

[جواب]: ہم کہتے ہیں: پہلی بات: اس واقعہ کی سند اور صحت کہاں ہے؟

دوسری بات: اس نے غزوہ کے واقعہ میں چند در چند جھوٹ جمع کر دیئے ہیں۔

پہلا جھوٹ کہ: قریش و کنانہ اور اہل تہامہ دس ہزار کی تعداد میں تھے۔ جب کہ احزاب کی تمام جماعتیں: قریش، کنانہ، اہل نجد، تمیم، اسد، غطفان اور یہود سب ملا کر دس ہزار کے قریب تھے۔

احزاب تین قسم کے لوگ تھے: ۱۔ قریش اور ان کے حلیف۔ یہ اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کے لوگ تھے۔

۲۔ اہل نجد: تمیم، غطفان اور ان کے ساتھ شامل باقی کے لوگ۔ ۳۔ یہود بنی قریظہ۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”جب علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قتل کر دیا تو باقی مشرکین اور یہود بھاگ نکلے۔“

[جواب]: یہ ساف ٹھنڈا جھوٹ ہے؛ کفار بھاگے نہیں تھے، بلکہ انھوں نے یہود کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا محاصرہ

جاری رکھا تھا۔ یہاں تک کہ عجم بن مسعود غطفانی رضی اللہ عنہ نے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آندھی اور فرشتے بھیج کر کفار کو منتشر کر دیا اور وہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَ تَكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝ إِذْ جَاءَ وَكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝ (....) إِلَى (....) وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْطِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝ (الاحزاب: ۲۵)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم پر کئی لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر آندھی

بیچ دی اور ایسے لشکر جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے خوب دیکھنے والا تھا۔ جب وہ تم پر تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آ گئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں گمان کرتے تھے، کئی طرح کے گمان۔ اس موقع پر ایمان والے آزمائے گئے اور ہلائے گئے، سخت ہلایا جانا اور جب منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکا دینے کیلئے وعدہ کیا تھا۔ (..... آگے تک) اور اللہ تعالیٰ نے کفار کو غصہ کی حالت میں لوٹا دیا اور وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ اور اللہ مومنوں کو لڑائی سے کافی ہو گیا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے۔“

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو لڑائی کے ذریعہ واپس نہیں لوٹایا تھا [اور نہ مسلمانوں نے انھیں شکست دی تھی]۔ یہ بات اہل علم محدثین و مفسرین، مؤرخین اور سیرت نگاروں کے ہاں تواتر کے ساتھ معروف و معلوم ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عبدود کی لڑائی اور عمرو کے قتل ہو جانے سے مشرکین شکست کھا گئے۔ شیعہ نے جو روایت بیان کی ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”علی رضی اللہ عنہ کا عمرو بن عبدود کو قتل کرنا جن وانس کی عبادت سے افضل ہے۔“

یہ الفاظ یقیناً جھوٹ ہیں۔ [رسول اللہ ﷺ کی ذات ایسی مباغذ آمیزی سے پاک ہے]۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام میں سے کسی ایک نے بھی یہ روایت اپنی ان قابل اعتماد کتابوں میں نقل نہیں کی جن سے احادیث روایت کی جاتی ہیں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی صحیح سند معروف ہے اور نہ ہی ضعیف۔ اس جھوٹ کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ بھلا ایک آدمی کا قتل جن وانس کی عبادت سے افضل کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ انسانوں کی عبادت میں تو انبیاء کرام علیہم السلام کی عبادت بھی داخل ہے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر [نبی کریم ﷺ کو اذیت پہنچانے والے] ایسے کفار بھی قتل ہوئے جن کا قتل ہونا عمرو بن عبدود کے قتل سے بڑھ کر تھا۔ اس لیے کہ اس عمرو سے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو اتنی تکلیف نہیں پہنچی جتنی دوسرے قریشی سرداروں سے پہنچی تھی؛ یعنی وہ صنادید قریش جو کہ بدر کے موقع پر قتل ہوئے تھے؛ مثلاً ابوجہل؛ عقبہ بن ابی معیط؛ شیبہ بن ربیعہ؛ نضر ابن حارث؛ اور دیگر ان کے امثال جن کے بارے میں قرآن بھی نازل ہوا۔ جب کہ اس عمرو کے بارے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی اس کی نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان سے کوئی انفرادی دشمنی معروف تھی۔

اس پر طرہ یہ کہ کسی [بھی صحیح] روایت میں مذکور نہیں کہ عمرو بن عبدود نے غزوہ بدر یا احد میں حصہ لیا ہو۔ اور نہ ہی ان کے علاوہ دیگر مغازی و سرائی جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ پیش آئے تھے؛ ان میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ اس کا قصہ صرف غزوہ خندق میں مشہور ہوا ہے۔ حالانکہ یہ قصہ صحاح ستہ اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔ جیسا کہ بدر کے موقع پر تین افراد کی مبارزت طلبی کا ذکر روایت کیا گیا ہے کہ حضرت حمزہ عبیہ اور علی رضی اللہ عنہ، شیبہ اور ولید کے مقابلہ میں نکلے تھے۔ احادیث و تفسیر کی کتابیں ان مشرکین کے تذکرہ سے بھری پڑی ہیں جو نبی کریم ﷺ کو ایذا دیا کرتے تھے؛ مثلاً ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط؛ نضر بن الحارث؛ وغیرہ اور سرداران کفار جیسے: ولید بن مغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی

کسی بھی گروہ میں عمرو بن عبدود کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ جنگ میں پیش پیش رہنے والوں میں سے تھا۔ تو پھر اس کو قتل کرنا جن وانس کی عبادت سے کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ یہ خبر تو اتر کیساتھ منقول ہے کہ اس کے قتل سے مشرکین شکست کھا کر نہیں بھاگے تھے؛ بلکہ وہ اپنی جگہ پر محاصرہ کئے رہے جیسا کہ اس سے پہلے تھے۔

فصل:

[غزوہ بنی نضیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ بنی نضیر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس یہودی کو قتل کر دیا تھا جس نے نبی کریم ﷺ کے دانتوں پر پتھر مارا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مزید دس یہودیوں کو قتل کر دیا، باقی یہودی بھاگ نکلے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ”اس غزوہ یا دیگر غزوات کے بارے میں جو کوئی بات نقل کی جاتی ہو تو سب سے پہلے اس کے لیے سند کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ انسان اگر یہ چاہے کہ مولیٰ کی ایک جڑ پر بغیر کسی سند کے دلیل پیش کرے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ تو پھر اصولی مسائل میں ان سے استدلال کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

دوسری بات: ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: یہ قصہ بالکل واضح جھوٹ ہے۔ سورہ حشر بالاتفاق بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی؛ یہ لوگ یہودی تھے۔ یہ واقعہ غزوہ خندق واحد سے قبل پیش آیا تھا۔^①

اس میں نہ ہی مصاف کا ذکر ہے اور نہ ہی شکست کا۔ اور نہ ہی کسی نے نبی کریم ﷺ کے دانتوں پر پتھر مارا۔ پتھر مارنے کا واقعہ غزوہ احدا کا ہے۔ جب کہ مسلمانوں نے بنی نضیر کا بہت سخت محاصرہ کر کے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَبَنَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُغْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾ [الحشر ۵]
 ”جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے۔“

وہ قتال کے لیے اس وقت تک نہیں نکلتے تھے جب تک ان میں سے کوئی ایک شکست کھا کر بھاگ نہ جاتا۔ وہ پشت کی جانب پر واقع ایک قلعہ سے جنگ لڑ رہے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نقشہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَا يُفَاتِلُونَكُمْ جَبِيْعًا إِلَّا فِي قُرَىٰ مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ تَحْسَبُهُمْ جَبِيْعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾ [الحشر ۱۴]

”وہ اکٹھے ہو کر تم سے نہیں لڑیں گے مگر قلعہ بند بستوں میں، یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کی لڑائی آپس میں بہت سخت ہے۔ تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔“

① منہاج کے معتدترین نسخہ میں اور اس کے اختصارات میں یوں ہی آیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ غزوہ بنی نضیر غزوہ احدا کے بعد اور غزوہ خندق سے پہلے کے درمیانی عرصہ میں پیش آیا تھا۔ دیکھیں: سیرت ابن ہشام؛ الر حیق المختوم و کتب السیرۃ المعتبۃ۔ [آغا دلدار]

پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں جلاوطن کر دیا تھا، ان میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا.....إِلَى..... فَأَعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾ [الحشر ۲]

”وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا پہلے اکٹھے ہی میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تم نے گمان نہ کیا تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ یقیناً ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچانے والے ہیں۔ تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انہوں نے گمان نہیں کیا تھا.....، پس عبرت حاصل کرو اسے آنکھوں والو!“

ابن اسحاق رضی اللہ عنہ نے ان کے نقض عہد کا ذکر کیا ہے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو اس وقت قتل کرنا چاہتے تھے جب آپؐ حسب معاہدہ عمرو بن امیہ کے ہاتھوں قتل ہونے والے دو مقتولین کی دیت ادا کرنے میں تعاون کیلئے ان کے پاس گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے طرف نکلنے اور ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ مدینہ پر آپؐ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ ابن ہشام نے ایسے ہی ذکر کیا ہے۔ اسی دوران حرمت شراب نازل ہوئی۔ ابن اسحاق رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں: بنی نضیر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے کھجور کے درخت کاٹنے اور انہیں آگ لگانے کا حکم دیا۔ انہوں نے آواز لگائی: اے محمد! آپؐ تو فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے؛ اور فساد ہی انسان پر اس کے فساد کو عیب شمار کرتے تھے؛ تو پھر آپؐ کو کیا ہو گیا کہ آپؐ کھجوریں کاٹنے اور انہیں جلاتے ہیں؟“

آپؐ فرماتے ہیں: بنی عوف بن خزرج میں سے ایک جماعت نے کچھ لوگ بنی نضیر کے پاس بھیجے تھے اور ان سے کہا تھا: تم ہر گز ہتھیار نہ ڈالنا؛ بلکہ آپؐ قلعہ بند اور ثابت قدم رہو۔ ہم تمہیں ہرگز مسلمانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جنگ کریں گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے۔ اور اگر تم یہاں سے نکلے تو ہم بھی تمہارے ساتھ یہاں سے نکلیں گے۔ یہ لوگ اپنی نصرت کا انتظار کرنے لگے۔ مگر بنی عوف نے کچھ بھی نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ آخر کار انہوں نے خود یہ پیش کش کی کہ انہیں قتل نہ کیا جائے؛ بلکہ اس بات پر مصالحت ہو گئی کہ ان کو جلا وطن کر دیا جائے گا۔ اور انہیں وہ سامان ساتھ لیکر جانے کی اجازت ہوگی جو ان کے اونٹ اٹھائیں؛ سوائے حلقات کے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اپنا وہ تمام سامان ساتھ لے لیا جو ان کے اونٹ اٹھا سکتے تھے۔ جنگی ساز و سامان کے سوا اپنا تمام سامان اونٹوں پر لاد کر لے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی آدمی اپنے ہاتھ سے اپنے مکان کو گراتا اور اس کا لمبہ بھی اونٹوں پر لاد کر لے جاتا۔ یہ یہودی خیبر و شام کی طرف نکل گئے۔ ❶

❶ سیرۃ ابن ہشام (ص: ۴۶۰-۴۶۱)، طبقات ابن سعد (۲/۶۹)، مصنف عبد الرزاق (۵/۳۶۸-۳۶۹)، دلائل النبوة (۳/۴۰۴-۴۰۵)۔

فصل:

[غزوہ سلسلہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ سلسلہ میں ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ کفار مدینہ میں آپ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کون شخص جو میرا جھنڈا لیکر چلے گا؟“ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔“

نانچہ آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سات سو صحابہ کی معیت میں جھنڈا دے کر روانہ کیا۔ جب آپ دشمنوں کی طرف پہنچے تو انھوں نے کہا: اپنے ساتھی کے پاس لوٹ جائیے، ہماری تعداد بہت ہے۔ آپ واپس چلے گئے۔ دوسرے روز آپ نے فرمایا: کون شخص جو میرا جھنڈا لے کر چلے گا؟“ چنانچہ آپ نے جھنڈا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھما دیا، ان کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں یہ موجود ہوں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دے کر رخصت کیا۔ آپ ان لوگوں کی طرف روانہ ہوئے؛ صبح کی نماز کے بعد آپ وہاں پر پہنچے۔ آپ نے دشمن کے چھ سات آدمی ہلاک کر دیے۔ اور باقی بھاگ گئے اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین کے فعل کی قسم اٹھاتے ہوئے یہ آیت کریمہ نازل کی: ﴿وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا﴾ (العادیات: ۱) ”اور قسم ہے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی! [بھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: جاہل ترین انسان بھی آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کی سند بیان کیجیے تاکہ اس واقعہ کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے۔ جب کہ اہل علم آپ سے یہ کہہ سکتے ہیں: [ایسا کوئی غزوہ سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوا]۔ یہ غزوہ اور جو کچھ تم نے اس کی حکایات بیان کی ہیں۔ اسی قسم کا جھوٹ ہے جو طریقہ بیان کرتے ہیں۔ جو کہ کثرت کے ساتھ افسانہ گوئی میں جھوٹ بولتے ہیں جیسے عترة اور بطلال کے لائینی افسانے لوگوں میں مشہور ہیں۔ اگرچہ عترة کے کچھ مختصر واقعات ہیں بھی۔ اور ایسے ہی بطلال کی کچھ سوانح حیات موجود ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو بنو امیہ کی حکومت میں اہل روم کے ساتھ غزوات میں پیش آئے۔ لیکن ان کے ساتھ جھوٹوں نے اتنے واقعات ملا لیے کہ ان کی کئی جلد تیار کر لیں۔ اور ایسے ہی خطرات کی حکایات احمد و نف زہیق مصری جو کہ ایسی حکایات بیان کرتے ہیں جنہیں وہ اپنی طرف گھڑ کر ہارون اور جعفر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس ان غزوات کی کہانیاں بھی اسی جنس کی کہانیوں سے ہیں۔ مندرجہ ذیل علماء نے سیر و مغازی کے فن میں بڑی مہارت حاصل کی تھی، مگر ان میں سے کسی نے بھی یہ واقعہ بیان نہیں کیا:

مغازی کے مشہور علماء کے اسماء یہ ہیں: عروہ، زہری، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر سندھی، لیث بن سعد، ابو اسحاق فزاری، ولید بن مسلم، واقدی، یونس بن کبیر، ابن عابد اور ان کے نظائر و امثال وغیرہ۔ نہ ہی ان کا ذکر حدیث میں ہے اور نہ ہی اس بارے میں قرآن نازل ہوا ہے۔

خلاصہ کلام! رسول اللہ ﷺ کے مغازی؛ خصوصاً جن میں قتال کی نوبت پیش آئی؛ بہت ہی مشہور و معروف ہیں۔ اور اہل علم کے ہاں ان کے احوال کو تو اتر کے ساتھ ضبط بھی کیا گیا ہے؛ اور تفسیر و حدیث، فقہ و سیرت اور مغازی کی کتابوں میں ان

کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کو نقل کرنے کے دواعی و اسباب موجود تھے۔ یہ بات عادت و شریعت میں متنع ہے کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی ایسا غزوہ ہوا ہو؛ جس میں اتنا بڑا واقعہ پیش آیا ہو مگر پھر بھی اہل علم میں سے کوئی ایک بھی اسے نقل نہ کرے۔ بالکل اسی طرح متنع ہے جیسے کوئی دن اور رات میں پانچ نمازوں سے زیادہ کو فرض قرار دیدے۔ یا سال میں ایک ماہ سے زیادہ کے روزوں کو فرض قرار دے؛ جب کہ ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ اور جیسا کہ یہ بات متنع ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل فارس کے ساتھ عراق میں غزوات کئے ہوں یا پھر آپ یمن گئے ہوں۔ کسی ایک نے بھی یہ بات نقل نہیں کی۔ اس طرح کی کئی دیگر باتیں بھی ہیں جو اگر روپذیر ہوئی ہوتیں تو انہیں نقل کرنے کے اسباب موجود تھے۔

مذکورہ صدر سورت کریمہ ﴿الْعَادِيَات﴾ کے نزول کے متعلق دو قول ہیں۔

❁ ایک قول یہ ہے کہ: یہ سورت مکہ میں اتری ہے۔ یہ قول ابن مسعودؓ، عطاء اور عمرہ اور دوسرے مفسرین کا ہے۔ اس قول کی بنیاد پر شیعہ مصنف کا بیان کردہ واقعہ صاف ظاہر طور پر جھوٹا ہے۔

❁ دوسرا قول یہ ہے کہ: یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ سے مروی ہے۔ یہ قول ان لوگوں کے قول کے ساتھ مناسب ہے جو کہ ﴿الْعَادِيَات﴾ کی تفسیر مجاہدین کے گھوڑوں سے کرتے ہیں۔

لیکن اس آیت کی تفسیر میں مشہور اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ﴿الْعَادِيَات﴾ سے حاجیوں کے اونٹ مراد ہیں جو مزدلفہ اور منی کے درمیان بھاگتے ہیں۔ یہ تفسیر پہلے قول کے موافق ہے۔ اس کی رو سے حضرت علی کا فرمان خود شیعہ دعویٰ کو جھٹلا رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین اس سے مجاہدین کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔

❁ اس روایت کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کی خیر خواہی سے کام لیا۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ اپنے ساتھی کے پاس واپس چلے جائیے چونکہ ہم بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بات جنگجو [یا پیش معرکہ] کفار کی عادت کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کبھی بھی پسپا نہیں ہوئے۔ بعض دروغ گواہی طرف یہ بات گھڑ لیتے ہیں کہ حنین کے موقع پر یہ حضرات فرار ہو گئے تھے؛ حقیقت میں یہ حضرات شیخین پر جھوٹا الزام ہے۔ نیز یہ کہ احد اور خندق کے علاوہ کسی بھی موقع پر کسی ایک نے بھی مدینہ پر حملہ کا ارادہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی ان دو غزوات کے علاوہ کبھی کفار مدینہ کے اتنے قریب پہنچے ہیں۔ غزوہ غابہ میں بعض لوگوں نے مدینہ کی چراگااہوں پر حملہ کیا تھا۔ جو کچھ غزوہ سلسلہ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے وہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ جس کا ذکر جہلاء اور کذابین ہی کر سکتے ہیں۔

❁ جب کہ ذات سلاسل ایک سریہ تھا جس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔ اس لیے کہ یہاں پر ہدف بنو عذرہ کے لوگ تھے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اور بنو عذرہ کے مابین قرابت تھی۔ تو آپ نے انہیں اس لیے روانہ فرمایا کہ شاید یہ لوگ اسلام لے آئیں۔ پھر ان کے پیچھے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو روانہ فرمایا۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر تک نہیں۔ یہ جگہ شام کے قریب اور مدینہ سے بہت دور تھی۔

[غزوہ بنی مصطلق اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنی مصطلق میں سے مالک اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ ان جملہ قیدیوں میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث بن ابی ضرار بھی تھیں۔ جنہیں نبی کریم ﷺ نے اپنے لیے اختیار کر لیا۔ آپ کا والد اس دن رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض گزار ہوا: یا رسول اللہ! میری بیٹی انتہائی شریف خاتون ہے؛ اسے قیدی نہیں بنایا جاسکتا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے حکم دیدیا کہ اسے اختیار دیا جائے۔ اس کے والد نے کہا: آپ نے بہت اچھی اور خوبصورت بات کہی ہے۔ پھر اس نے کہا: اے میری بیٹی اپنی قوم کو رسوا نہ کرنا۔ اس پر حضرت جویریہ نے کہا: ”میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔“ [اتھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: سب سے پہلے جس بھی منقول سے احتجاج کیا جائے اس کی سند بیان کرنی ضروری ہوتی ہے۔ یا پھر اسے ایسی کتاب کی طرف منسوب کیا جائے جس سے حجت قائم ہو سکتی ہو۔ ورنہ اس واقعہ کا علم کیسے ہوگا۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں: یہ واقعہ روافض کی بے اصل و بے اسناد من گھڑت مرویات میں شامل ہے۔ [شیعہ کی بیان کردہ روایات یا تو بلا اسناد ہوتی ہیں یا ان کے راوی مجہول، کذاب اور متهم بالکذب ہوتے ہیں]۔ یہ واقعہ کسی سیرت نویس نے نہیں لکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوہ بنی مصطلق میں یہ کارنامہ سرانجام دیا؛ اور نہ ہی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو قیدی بنایا تھا۔ جویریہ رضی اللہ عنہا کو جب قیدی بنایا گیا تو انھوں نے بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ رقم ادا کر کے ان کو آزاد کرالیا اور پھر ان کے ساتھ عقد نکاح باندھا۔ نبی ﷺ کے رشتہ مصاہرت کے احترام میں سب لوگوں نے اپنے اپنے قیدی رہا کر دیے۔ اور کہنے لگے: رسول اللہ ﷺ کے سسرال ہیں۔^①

نہ ہی ان کا والد آیا اور نہ ہی کسی چیز میں کوئی اختیار دیا۔

سنن ابو داؤد میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث بن المصطلق (جنگ میں پکڑنے کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں) حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ یا ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں آئیں۔ انہوں نے اپنے نفس (کو آزاد کرانے پر) بدل کتابت دینے کا معاہدہ کر لیا۔ اور وہ ایک خوبصورت ملاحت والی عورت تھیں جن پر نظریں پڑتی تو نظروں میں بھا جاتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ”وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بدل کتابت کے بارے میں سوال کرتی ہوئی آئیں۔ جب وہ دروازہ میں کھڑی ہو گئیں تو میں نے انہیں دیکھا اور ان کے کھڑے ہونے کو ناپسند کیا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو دیے ہی دیکھیں گے جیسے میں نے دیکھا ہے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا رضی اللہ عنہا کہنے لگی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں جویریہ بنت الحارث ہوں اور جو میرا پہلے حال تھا، وہ آپ پر مخفی نہیں ہے۔ اور میں ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئی ہوں؛ اور میں نے اسے اپنے نفس (کی آزادی پر) معاہدہ کتابت کر لیا ہے۔ پس میں آپ کے پاس اپنے بدل کتابت کے بارے میں سوال کرنے آئی ہوں۔ رسول

① سنن ابی داؤد، کتاب الخراج۔ باب فی خبر بنی نضیر (ج: ۴، ۳۰۰۴، ۳۰۰۵)، مصنف عبد الرزاق (۹۷۳۳)۔

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تمہارے لیے اس سے بہتر کچھ اور نہیں ہے؟ وہ کہنے لگیں کہ: وہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کہ: ”میں تمہارا بدل کتابت ادا کروں اور تم سے نکاح کر لوں۔“ وہ کہنے لگی میں نے بیشک کر لیا (یعنی میں بخوشی راضی ہوں)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب لوگوں نے یہ سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تو انہوں نے وہ تمام قیدی (بنی مصطلق کے) جو ان کے قبضہ میں تھے، انہیں چھوڑ دیا اور انہیں آزاد کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ: ”یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسرال والے ہیں۔“

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:] ہم نے کوئی عورت اتنی برکت والی نہیں دیکھی اپنی قوم پر جویریہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کہ ان کے سبب سے سوقیدی بنی المصطلق کے آزاد ہو گئے۔“ [سنن ابوداؤد ج 5402]

فصل:

[غزوہ خیبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ خیبر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی۔ نبی کریم ﷺ نے باری باری ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جھنڈا عنایت فرمایا مگر دونوں نے شکست کھائی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم عطا کیا؛ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی؛ آپ ﷺ نے اپنا لعاب ان کی آنکھوں میں لگایا۔ آپ جب نکلے تو مرحب کو قتل کیا؛ باقی لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے۔ انہوں نے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ امیر المؤمنین نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر اس کا پل بنالیا۔ اس دروازہ کو بیس آدمی بند کیا کرتے تھے۔ مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت حاصل کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! علی رضی اللہ عنہ نے یہ دروازہ جو پانچ سو افراد کی قوت سے نہیں اکھاڑا جاسکتا تھا یہ صرف تائید ربانی سے اکھاڑا گیا ہے۔ فتح مکہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بسالت کی رہین منت تھی۔“ [آہ رافضی]

[جواب:] ہم کہتے ہیں: سب سے پہلے تو جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ ان سے پوچھا جائے کہ علماء میں سے کس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے؟ اور اس کی سند اور صحت کہاں ہے؟ یہ ایک صریح جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ خیبر کی فتح ایک ہی دن میں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ خیبر کے متعدد قلعے تھے، بعض جنگ سے فتح ہوئے تھے اور بعض مصالحت سے۔ یہود نے مصالحت کے بعد صلح کی چیزوں میں سے کچھ چیزیں چھپا دیں اور پھر جنگ چھیڑ دی۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ہزیمت نہیں اٹھائی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دروازہ اکھاڑا تھا؛ مگر شیعہ کا یہ بیان کہ اسے پل بنالیا تھا جھوٹ ہے۔ [یہ بھی بے اصل ہے کہ بیس آدمی اسے بند کیا کرتے تھے]۔

❦ شیعہ کا دعویٰ کہ: ”فتح مکہ آپ کی ہی رہین منت ہے۔“

❦ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اتنا ہی حصہ لیا تھا جتنا دیگر صحابہ نے۔ فتح مکہ کی بہت ساری روایات متواترہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی بہن ام ہانی کے دو دامادوں کو قتل کرنے کی کوشش تھی؛ جنہیں ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پناہ دے رکھی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پناہ کو برقرار رکھا؛ [اور فرمایا: جسے ام ہانی نے پناہ دی ہے ہم بھی اسے پناہ دیتے ہیں]۔ اور پھر آپ نے ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا؛ جس پر رسول

اللہ ﷺ غضبناک ہوئے تو آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”ہم فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کیساتھ تھے۔ سرور کائنات ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دائیں بازو پر اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بائیں بازو اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لشکر کے پچھلے حصہ اور یثرب وادی پر متعین کیا تھا۔ پھر آپ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر انصار کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انصار بھاگتے ہوئے آئے۔ فرمایا: اے انصار کی جماعت! کیا تم قریش کے کینوں کو دیکھ رہے ہو؟
عرض کیا: ”ہاں۔“

فرمایا: جب میدان جنگ میں کل ان سے ملو تو انھیں تہس نہس کر دو۔“

آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ کر بتایا کہ یوں انھیں ملایا میٹ کر دو۔ اور فرمایا کہ صفا کے قریب یہ مقابلہ ہو گا۔ اگلے روز جو شخص بھی نظر آیا انصار نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ نبی کریم ﷺ کو صفا پر چڑھ گئے۔ انصار کوہ صفا کے ارد گرد گھومنے لگے۔ اسی دوران ابوسفیان آئے اور کہا: یا رسول اللہ! قریش کا نام و نشان مٹ گیا۔ آج کے بعد قریش کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گا وہ بائیں رہے گا، جو ہتھیار ڈال دے اس سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ جو اپنا دروازہ بند کر لے گا ہم اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔“ (صحیح مسلم (ح: ۱۷۸۰)، سنن ابی داؤد (ح: ۳۰۲۴)۔

صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے سال روانہ ہوئے تو قریش کو اس کی خبر پہنچ گئی ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء (قریش کی جانب سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر لینے کے لئے نکلے یہ تینوں چلتے چلتے (مقام) مراظہر ان تک پہنچے۔ وہاں بکثرت آگ اس طرح روشن دیکھی جس طرح عرفہ میں ہوتی ہے۔ ابوسفیان نے کہا یہ آگ کیسی ہے؟ جیسے عرفہ میں ہوتی ہے۔ بدیل بن ورقاء نے جواب دیا: بنو عمرو کی آگ ہوگی۔ ابوسفیان نے کہا: بنو عمرو کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ ان تینوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محافظوں نے دیکھ کر پکڑ لیا اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا ابوسفیان تو مسلمان ہو گئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روانہ ہوئے تو آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ابوسفیان کو لشکر اسلام کی تنگ گزرگاہ کے پاس ٹھہراؤ، تاکہ یہ لشکر اسلام کا نظارہ کر سکیں۔

انہیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے وہاں کھڑا کر دیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قبل گزرنے شروع ہوئے تو لشکر کا ایک ایک دستہ ابوسفیان کے پاس سے گزرنے لگا۔ چنانچہ جب ایک دستہ گزرا تو ابوسفیان نے پوچھا اے عباس! یہ کون سا دستہ ہے؟ انہوں نے کہا یہ قبیلہ غفار ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ: ”میری اور قبیلہ غفار کی تو لڑائی نہ تھی۔ پھر قبیلہ جہینہ گزرا تو اسی طرح کہا۔ پھر سعد بن ہذیم گزرا تو

اسی طرح کہا۔ پھر سلیم گزرا تو اسی طرح کہا۔ پھر ایک دستہ گزرا کہ اس جیسا دیکھا ہی نہ تھا؛ ابوسفیان نے کہا: یہ کون ہے؟ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یہ انصار ہیں ان کے سپہ سالار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کے پاس پرچم ہے۔“

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابوسفیان! آج کا دن جنگ کا دن ہے؛ آج کعبہ (میں) کافروں کا کشت و خون (حلال) ہو جائے گا۔ ابوسفیان نے کہا: اے عباس! ہلاکت کا دن کتنا اچھا ہے؟ پھر ایک سب سے چھوٹا دستہ آیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے (مہاجر) اصحاب رضی اللہ عنہ تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرچم حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو ابوسفیان نے کہا: ”آپ کو معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کیا کہا ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا کہا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ایسا ایسا کہا ہے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعد نے صحیح نہیں کہا؛ لیکن آج کا دن تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کعبہ کو عظمت و بزرگی عطا فرمائے گا۔ اور کعبہ کو آج غلاف پہنایا جائے گا۔ عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پرچم کو (مقام) حجون میں نصب کرنے کا حکم دیا۔“ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۴۴۸]

فصل:

[غزوہ حنین اور بسالت حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”غزوہ حنین میں آپ دس ہزار کا لشکر لے کر نکلے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں نظر لگائی اور فخریہ انداز میں کہا: آج ہماری کثرت کی وجہ سے ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ صرف نو ہاشمی اور ایمین بن ام ایمن باقی رہ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے تلوار چلا رہے تھے؛ آپ نے مشرکین کے چالیس آدمی قتل کر دیے، باقی مشرک بھاگ گئے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس واقعہ کی کوئی صحیح سند دکھائی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نظر لگانے کا قصہ بھی خود ساختہ جھوٹ ہے۔ ہمارے سامنے کتب مسانید اور سیر اور تفاسیر پڑی ہیں، کسی ایک کتاب میں بھی یہ مذکور نہیں کہ مسلمانوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر لگ گئی تھی۔ جب کہ ماثور الفاظ جو بعض مسلمانوں نے کہے تھے وہ یہ ہیں کہ:
”آج ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔“^①

❖ ایسے ہی یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ: ”آپ کے ساتھ بنی ہاشم کے نو آدمی باقی رہ گئے تھے۔“
ابن اسحاق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مہاجرین و انصار اور آپ کے اہل بیت کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے ساتھ باقی رہی تھی۔ مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما؛ اہل بیت میں سے حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما و ابوسفیان بن الحارث اور اس کا بیٹا؛ فضل بن عباس؛ ربیعہ بن الحارث؛ أسامہ بن زید ایمین بن ام ایمن رضی اللہ عنہم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نبی کریم ﷺ کی رفاقت میں ثابت قدم رہے تھے۔ [مسند احمد ۱/ ۴۵۳]

① سیرۃ ابن ہشام (ص: ۵۶۵)، طبقات ابن سعد (۲/ ۱۵۰) مجمع الزوائد (۶/ ۱۷۸)، دلائل النبوة (۵/ ۱۲۳)۔

بعض لوگوں نے قسم بن عباس کو ان میں شمار کیا ہے، ابن ابی سفیان کو شمار نہیں کیا۔ یہ علامہ ابن اسحاق رحمہ اللہ کا کلام ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا قول کہ: "علی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے سامنے تلوار چلاتے ہوئے چالیس آدمیوں کو قتل کیا تھا۔"

[جواب]: یہ صریح کذب ہے۔ اور اس کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل معرفت محدثین سیرت نگاران اور اصحاب المغازی کا اتفاق ہے۔ [کسی قابل اعتماد شخص نے یہ بات نہیں کہی]۔ اس قصہ میں اتنی بات ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اور مسلمان بوقت فجر وادی حنین میں پہنچے تو یہ لوگ بڑے تیر انداز تھے؛ انہوں نے یکبارگی تیروں کی برسات کردی۔ اس وجہ سے لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ نبی کریم ﷺ آپ کیساتھ آپ کے چچا عباس اور ابوسفیان بن الحارث ثابت قدم رہے۔ یہ شاعر تھے؛ نبی کریم ﷺ کی ججو کیا کرتے تھے؛ مگر پھر بعد میں مسلمان ہوئے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے؛ اس دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اور ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چپک گئے تھے، ہم نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ لوگوں کو آواز دیکر جمع کریں۔ آپ بلند آواز والے تھے۔ آپ نے آواز لگائی: اے اہل شجرہ! اے اہل سورت بقرہ! یعنی ایسے لوگو جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی۔ آپ نے انہیں بیعت یاد دلوائی جس میں انہوں نے پیچھے نہ ہٹے اور جانیں نثار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی بقرہ کا تذکرہ کیا کیونکہ گائے اپنے بچے پر بڑی مہربان ہوتی ہے۔ پھر ان لوگوں نے قتال کیا یہاں تک مشرکین کو شکست ہوئی۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نے ریت کی ایک مٹھی بھر کر مشرکین کے منہوں پر دے ماری تھی اور فرمایا تھا: "رب کعبہ کی قسم! یہ لوگ شکست پا گئے۔"

بخاری و مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ فخر پر تھے اور یہ شعر پڑھ رہے تھے:

"أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ - أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ -"

"میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔"

صحیحین میں حضرت براء سے روایت ہے؛ ان سے ایک شخص نے کہا: اے ابوعمارہ! کیا تم لوگ حنین کے دن بھاگ گئے تھے؟ انہوں نے کہا نہیں اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بھاگے۔ [بلکہ آپ کے نو عمر اصحاب جن کے پاس ہتھیار نہ تھے وہ چلے گئے تھے]۔ اور وجہ یہ ہوئی کہ ان کا واسطہ قبیلہ ہوازن کے تیر اندازوں سے پڑا۔ وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کا کوئی تیر خالی نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے ان کو تیروں پر رکھ لیا اس وجہ سے وہ ہٹ گئے۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اس وقت آپ اپنے سفید فخر پر سوار تھے، جس کو آپ کے چچا کے بیٹے، ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہا تک رہے تھے۔ پس آپ اترے اور آپ نے ارحم الراحمین سے مدد مانگی اس کے بعد فرمایا:

"أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ - أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ -"

"میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔"

حضرت براء فرماتے ہیں شدید جنگ کی حالت میں ہم نبی کریم ﷺ کی اوٹ میں بچاؤ حاصل کیا کرتے تھے۔ ہم اس

شخص کو بہادر سمجھا کرتے تھے جو آپ کے برابر ہوا کرتا تھا۔^①
 صحیح مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ حنین میں جب کفار نے آپ کو گھیر لیا تو آپ نے سواری سے اتر کر مٹی کی ایک مٹھی لی؛ پھر کفار کی طرف متوجہ ہوئے [اور ان پر مٹی پھینکتے ہوئے] فرمایا: ”شَاهَتِ الْوُجُوهُ“ اللہ کرے یہ چہرے ذلیل ہوں۔“ ان میں کوئی بھی انسان اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں پیدا کیا تھا مگر ان سب کی آنکھیں اس ایک مٹی سے بھر گئیں اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دیے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دی؛ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کئے۔“

فصل:

[غیبی خبریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ غیب کے اور وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے قبل از وقت آگاہ کر دیا کرتے تھے۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے جب عمرہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ: ”اللہ کی قسم! آپ کا مقصد عمرہ کرنا نہیں، بلکہ بیشک آپ بصرہ جانا چاہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد بجا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ذی قار کے مقام پر بیعت لے رہے تھے تو آپ نے فرمایا تھا: کوفہ کی طرف سے ایک ہزار آدمی آئیں گے۔ نہ کم ہوں گے نہ زیادہ؛ وہ موت پر میری بیعت کریں گے۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔ ان میں سے آخری شخص اُویس قرنی تھے۔ آپ نے بیتان والے خارجی کے قتل کی خبر دی تھی۔ چنانچہ ویسے ہی ہوا۔ نہروان کے قصہ میں ایک شخص نے قوم کے نہر کو عبور کر جانے کی خبر دی۔ تو آپ نے فرمایا: ”وہ ہرگز اسے عبور نہیں کر سکیں گے۔“ پھر ایک دوسرے نے آکر یہی خبر دی تو آپ نے فرمایا: ”وہ ہرگز عبور نہیں کر سکیں گے؛ بلکہ یہی جگہ ان کے موت کا گھاٹ ثابت ہوگی“ پس ویسے ہی ہوا۔“

آپ نے قبل از وقت اپنے قتل سے آگاہ کر دیا تھا۔ آپ نے ابن شہر یار ملعون کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے؛ اور اسے سولی دی جائے گی۔ چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے سولی چڑھا دیا۔ آپ نے میثم کھجور فروش سے کہا تھا کہ دارِ بابِ عمرو پر دس آدمیوں کو پھانسی دی جائیگی، ان میں دسواں شخص میثم ہوگا۔“ اور وہ ان کے تختہ سے چھوٹا ہوگا۔ آپ نے اسے وہ کھجور کا درخت بھی دکھایا تھا جس پر اسے پھانسی دی جانے والی تھی اور اسی طرح وقوع میں آیا۔

آپ نے زبیر بن العوجی کو بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور اسے پھانسی دی جائے گی؛ اور اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ آپ نے خبر دی تھی کہ حجاج کُمیل بن زیاد کو قتل کرے گا؛ اور قنبر کو ذبح کرے گا۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔

”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: ”میرے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا جائے گا اور تم اس کی مدد

① صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب من قاد دابة غیرہ فی الحرب (ح: ۲۸۶۴)، صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

باب غزوہ حنین (ح: ۱۷۷۶)۔ صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد، باب غزوہ حنین (حدیث: ۱۷۷۷)۔

نہیں کرو گے؛ اور اسی طرح ہوا۔ اور آپ نے اپنے بیٹے کی قتل گاہ کے بارے میں خبر دی تھی۔

✽ نیز آپ نے فرمایا تھا کہ: ”بنو عباس آسانی سے اقتدار سنبھال لیں گے۔ اور پھر ترک ان سے ملک چھینیں گے۔ آپ نے فرمایا: ”بنی عباس کی شاہی آسان ہوگی؛ اس میں کوئی سختی نہیں ہوگی۔ اور اگر ترک و وِیلیم اور ہندو سندھ؛ بربر [افریقہ] اور طیلان [فارس] کے لوگ مل کر ان کی سلطنت چھیننا چاہیں تو اس پر قادر نہ ہوں گے؛ جب تک کہ ان کے موالی اور ارباب دولت ان سے الگ نہ ہو جائیں۔ ترک کا ایک بادشاہ ان پر مسلط ہوگا وہ اس جگہ سے آئے گا جہاں سے ان کی سلطنت کا آغاز ہوا تھا۔ جس شہر پر سے اس کا گزر ہوگا اسے فتح کرے گا۔ اس کے مقابلہ کے لیے جو جھنڈا بلند کیا جائے گا وہ اسے سرنگوں کر دے گا، جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے لیے ہلاکت و تباہی ہے۔ وہ برابر ان سب پر کامیابی حاصل کرتا رہے گا۔ پھر یہ کامیابی میرے اہل بیت کے ایک شخص کو سونپ دیگا۔ [یعنی اس کی کامیابی کا انصار میرے اہل بیت کے ایک شخص پر ہوگا] جو حق کی بات کہے گا اور حق پر عمل پیرا ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس طرح فرمایا تھا اسی طرح ہوا اور ہلاکو خان خراسان کے علاقہ سے نکل کر حملہ آور ہوا۔“ اور آپ سے ہی بنی عباس کے اقتدار کی ابتداء ہوئی۔ یہاں تک کہ ابو مسلم خراسانی نے ان کی بیعت کر لی۔“ (شیخ مصنف کا بیان ختم ہوا۔)

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”بعض غیبی امور کی خبریں دینا تو جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کم درجہ کے صلحاء بھی اس طرح کی خبریں دیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان تو اس سے بہت زیادہ بلند و ارفع ہے۔ حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے اتباع کاروں میں ایسے لوگ تھے جو اس سے بڑھ کر خبریں دیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ امامت و خلافت کے اہل نہ تھے۔ اور نہ ہی وہ اپنے زمانہ کے باقی لوگوں سے افضل تھے۔ اسی کی مثالیں ہمارے اس دور میں بھی موجود ہیں؛ اور دیگر ادوار میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ و حذیفہ رضی اللہ عنہما و دیگر صحابہ سے اس سے کئی گنا زیادہ خبریں نقل کی گئی ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً ایسی روایات بیان کرتے اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کبھی مرفوع کرتے اور کبھی موقوف روایت کرتے ہیں۔ مگر اس کا حکم مسند کا ہوتا ہے۔ جن باتوں کی آپ نے خبر دی ہے؛ یا دوسری اس قسم کی باتیں یا تو انھوں نے نبی کریم ﷺ سے سن کر بیان کی ہیں یا وہ ان کے کشف پر مبنی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس طرح کی کئی خبریں دی ہیں۔

کرامات اولیاء اور ایسی خبروں کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں؛ ان میں؛ امام احمد کی کتاب الزہد۔ ابو نعیم کی حلیۃ الاولیاء؛ ابن جوزی کی ”صفۃ الصفوة“؛ اور ابن ابی الدنیا، ابو بکر بن خلال اور لاکانی کی کتابوں میں کرامات الاولیاء کا بیان ہے۔ ان میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیروکاروں کے قصے بھی ہیں جیسے حضرت علاء بن حضری رضی اللہ عنہ جو کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نائب تھے؛ اور ابو مسلم خولانی؛ اور اس کے بعض اتباع کار۔ اور ابی صہباء؛ عامر بن عبد قیس؛ اور ان میں دیگر لوگوں کے قصے ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہزار درجہ افضل ہیں۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ سکیں کہ یہ انسان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہے؛ پھر خلفاء راشدین کی تو شان ہی نرالی ہے۔

شیخہ مصنف نے غیبی خبروں سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو یہ واقعات تحریر کیے ہیں؛ ان میں سے کسی ایک واقعہ کی بھی کوئی سند ذکر نہیں کی جس کی وجہ سے اس کی صحت کا پتہ چل سکے۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا صحیح ہونا معلوم ہے؛

اور کچھ چیزوں کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر اور واضح ہے۔ اور کچھ باتوں کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا۔
 ترک بادشاہ کے بارے میں جو خبر ذکر کی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہے۔ اس لیے کہ آپ نے اپنی کامیابی اہل بیت کے کسی شخص کو نہیں سونپی تھی؛ یہ جھوٹ بعد میں آنے والے شیعہ نے گھڑ لیا ہے۔ [ہلاکونے کسی علوی کو ضرر نہیں پہنچایا تھا]۔
 غیب کی خبروں پر مشتمل کتب جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا اہل بیت کی طرف منسوب ہیں، یہ تمام جھوٹ ہیں؛ جیسے کتاب ”الحجر“؛ کتاب البطاقہ وغیرہ دیگر کتابیں۔ اور ایسے ہی جو علوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں کہ یہ علم رسول اللہ ﷺ نے باقی صحابہ کرام کو چھوڑ کر بطور خاص آپ کو بتایا تھا؛ [یہ بھی جھوٹی باتیں ہیں]۔

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جس کسی دوسرے صحابی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے باقی صحابہ کرام کو چھوڑ کر انہیں کوئی خاص علم سکھایا تھا؛ تو یہ سب باتیں جھوٹ ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

”کیا آپ کے پاس کوئی چیز ہے جو قرآن میں نہیں۔ اور بعض دفعہ اس طرح کہا گیا کہ جو لوگوں کے پاس نہیں؟
 تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو اگایا اور جان کو پیدا کیا! ہمارے پاس وہی چیز ہے جو قرآن میں ہے سوائے فہم کتاب کے جو کسی شخص کو دیا جاتا ہے اور اسکے جو صحیفہ میں ہے میں نے پوچھا صحیفہ میں کیا ہے، انہوں نے کہا کہ دیت اور قیدی کو آزاد کرنے کے متعلق احکام ہیں اور یہ کہ مسلم کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے گا۔ [صحیح بخاری ج 3: ح ۱۸۱۱]

اور ایسے ہی وہ تمام روایات جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر صحابہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں کوئی خاص علم باطن سکھایا تھا؛ یہ تمام باتیں باطل ہیں۔

یہ اس روایت کے منافی نہیں ہے جسے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں:

((حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم وعاءين فأما أحدهما فبثته وأما الآخر فلو بثته قطع هذا البلعوم))

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو ظرف (علم کے) یاد کر لئے ہیں، ان میں سے ایک کو تو میں نے ظاہر کر دیا، اور دوسرے کو اگر ظاہر کروں تو کھانے کی رگ کاٹ لی جائے۔“

بلا ریب یہ حدیث صحیح ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کوئی خاص علم سکھایا تھا۔ بلکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے۔ اس لیے آپ نے وہ چیزیں یاد رکھیں جو دوسرے صحابہ یاد نہ رکھ سکے۔

اور ایسے ہی صحیحین میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اللہ کی قسم! میں لوگوں میں سب سے زیادہ ان فتنوں کو جانتا ہوں جو میرے اور قیامت کے درمیان پیش آنے والے ہیں۔ اور مجھے ان فتنوں کے بتانے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض راز کی

باتیں مجھے بتائی ہیں جنہیں میرے علاوہ کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے بارے میں فرمایا اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تھے جس میں میں بھی موجود تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کو شمار کرتے ہوئے حذیفہ نے کہا: ”میرے علاوہ باقی سب قوم مجلس اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔“ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۱۲۷۶۳]

صحیحین میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے؛ اور اس کھڑے ہونے کے وقت سے لے کر قیام قیامت تک کے تمام حالات کو بیان کر دیا پس جس نے انہیں یاد رکھا اس نے انہیں یاد رکھا؛ اور جو بھول گیا سو بھول گیا۔“ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۲۷۶۴]

حضرت ابو زید عمرو بن اخطب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز فجر پڑھائی اور منبر پر چڑھے تو ہمیں خطبہ دیا یہاں تک کہ نماز کا وقت آ گیا؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اترے اور نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور ہمیں خطبہ دیا؛ یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ پھر اترے اور نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور ہمیں خطبہ دیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی خبر دی جو پہلے ہو چکی ہیں اور جو آئندہ پیش آنے والی تھیں پس ہم میں سے سب بڑا عالم وہی ہے جس نے ہم میں سے ان باتوں کو زیادہ یاد رکھا۔“ [صحیح مسلم: ج ۲، ص ۲۷۶۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فتح خیبر والے سال اسلام قبول کیا۔ آپ کو چار سال سے بھی کم عرصہ نبی کریم ﷺ کی صحبت میسر آئی۔ ان کی اس تھیلی میں علم دین، ایمان؛ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سے کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ اس میں مستقبل کے امور کی خبریں تھیں۔ مثال کے طور پر وہ فتنے جو مسلمانوں کے مابین پیش آئے؛ جیسے جنگ جمل اور صفین کا فتنہ؛ ابن زبیر کا فتنہ؛ مقتل حسین رضی اللہ عنہ اور اس طرح کی دیگر خبریں تھیں۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں کے ساتھ فتنوں میں شریک نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اگر ابو ہریرہ تم سے یہ حدیث بیان کرتے کہ تم اپنے خلیفہ کو قتل کرو گے اور تم ایسے ایسے کام کرو گے تو تم لوگ کہتے: ”ابو ہریرہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

اور وہ حدیث جسے رازدان نبوت حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے جسے ان کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا؛ صحیح بخاری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے: حضرت علقمہ شام گئے؛ جب آپ وہاں پہنچے تو ایک مسجد میں آئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی کہ یا اللہ ہمیں کوئی اچھا ہم نشین عطا کر۔ پھر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گئے۔

حضرت ابودرداء نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

انہوں نے کہا کہ: کوفہ کا رہنے والا ہوں۔ علقمہ نے کہا: کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے جو اس راز کا جاننے والا ہے کہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا؟ یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ۔ کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے؟ یا یہ کہا کہ کیا تم میں وہ شخص نہیں تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر شیطان سے پناہ دیدی ہے یعنی عمار رضی اللہ عنہ؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! ضرور ہیں..... [یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ (صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۲۱۵)]

یہ راز بعض ان منافقین کی شخصیات کا تعین تھا جو غزوہ تبوک میں شریک تھے۔ انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ رات کے

اندھیرے میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی رسی کھول کر آپ کو گرا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبردار کر دیا۔ اس وقت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ قریب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان لوگوں کے نام بتا دیئے۔ پس جب کوئی مجہول الحال انسان مرجاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک اس کا جنازہ نہ پڑھتے جب تک حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس جنازہ میں شریک نہ ہوں۔ اس لیے کہ آپ کو اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں منافقین کا جنازہ نہ پڑھا دیں۔

پس بعض صحابہ اور صالحین کا مستقبل کے بعض امور کو جان لینا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ وہ ان تمام امور کا عالم ہے۔ وہ غالی شیعہ جو مطلق طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عالم الغیب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ یہ دعویٰ صاف جھوٹ ہے۔ جب کہ بعض باتوں کا علم ہونے میں آپ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ تمام چیزوں کا علم پوری طرح نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امور مستقبل کے کلی عالم نہ ہونے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ آپ کی خلافت کے زمانہ میں کئی جنگیں پیش آئیں۔ آپ کے ذہن میں بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی تھیں کہ حقائق ان کے خلاف ظاہر ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بعض اوقات اپنی لڑائیوں اور دیگر معاملات کے بارے میں ایک رائے قائم کرتے اور وہ غلط ثابت ہوا کرتی تھی۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ لڑائیوں میں لاتعداد جانبیں ضائع ہوں گی اور مقصد بھی حاصل نہ ہوگا تو آپ لڑائی میں حصہ نہ لیتے۔ جنگ آزمائی سے کنارہ کش ہونے کی صورت میں آپ زیادہ کامیاب و کامران ثابت ہوتے۔ اس لیے کہ اکثر لوگ بھی آپ کے ساتھ تھے اور اکثر شہر بھی آپ کے ماتحت تھے۔ جب آپ نے جنگ کی تو کمزور ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سارے وہ شہر جو آپ کی خلافت میں شامل تھے؛ جیسے مصر؛ یمن اور حجاز؛ وہ آہستہ آہستہ خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ اگر آپ جانتے ہوتے کہ میرے مقرر کردہ حکم یہ فیصلہ صادر کریں گے تو آپ تکلیف پر راضی نہ ہوتے۔ اور اگر آپ کو علم ہوتا کہ ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو کہ بعد میں دیکھا گیا؛ یہاں تک انہیں معزول کر دیا گیا؛ تو آپ اپنی معزولی پر موافقت نہ کرتے۔ شروع میں آپ کے خیر خواہوں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی امارت پر باقی رہنے دیا جائے یہاں تک کہ معاملات صحیح دگر پر آجائے۔ آپ کے خیمین اور خیر خواہان کے ہاں یہ رائے زیادہ درست تھی۔ یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان کو نجران کا والی بنایا تھا۔ وہ وہاں کے والی ہی تھے کہ نبی کریم ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کی نسبت زیادہ اچھے مسلمان تھے۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی ایک نے بھی معاویہ رضی اللہ عنہ پر منافق ہونے کی تہمت نہیں لگائی؛ جب کہ ان کے والد کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کو شام کی فتح کے لیے حضرت خالد بن ولید اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ امیر لشکر مقرر کیا تھا۔ آپ اپنی امارت پر باقی رہے یہاں تک کہ شام میں ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا شمار فاضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ آپ بہت نیک انسان تھے؛ اپنے بھائی اور والد سے زیادہ اچھے تھے۔ یہ وہ یزید نہیں ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جانشین [و خلیفہ] ہوئے تھے۔ اس ثانی الذکر یزید کی پیدائش ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی تھی۔ اس کا نام اپنے چچا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جبلاء کا ایک گروہ اس یزید کو صحابی سمجھتا ہے؛ اور بعض غالی لوگ

اسے نبی تک کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ اسے کافر و مرتد قرار دیتا ہے۔ یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ اس کا صرف اتنا ہی مقام ہے کہ وہ بنی امیہ کا ایک خلیفہ ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔ ان کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کی خلافت کے دور میں بعض اختلافات کی بنا پر مظلوم شہید ہوئے۔ لیکن یزید نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس پر رضامندی کا اظہار کیا؛ اور نہ ہی ان لوگوں کی مدد کی جنہوں نے آپ کو قتل کیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر جب عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا تو اس نے آپ کے دانتوں پر لاشی سے مارا تھا؛ یہ بات صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ جب کہ سر کو یزید کے سامنے لے جا کر پیش کرنے کا واقعہ باطل ہے اور اس کی سند منقطع ہے۔

اس کے چچا یزید رضی اللہ عنہ کا شاربیکو کا صحابہ کرام میں سے تھا۔ اس کا انتقال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا۔ اس کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جگہ دوسرے بھائی معاویہ کو تعینات کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لوگوں سے زیادہ اہل لوگوں کے احوال جانتے تھے۔ اور سیاست میں بڑے ماہر تھے۔ خواہشات نفس سے بڑے دور تھے۔ آپ نے اپنی خلافت میں کسی ایک بھی قریبی رشتہ دار کو کوئی منصب تفویض نہیں کیا۔ آپ ولایت و امارت کے لیے صرف اسی انسان کا انتخاب فرمایا کرتے تھے جسے اس کا اہل سمجھتے تھے۔ آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی اسی لیے امیر بنایا تھا کہ ان کے نزدیک آپ اس منصب کے اہل تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی ولایت میں وسعت دیدی۔ یہاں تک کہ سارا شام آپ کے زیر نگیں ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شام کے چار حصے تھے: فلسطین، دمشق، حمص اور اردن۔ پھر اس کے بعد قسمرین اور دوسرے دار الحکومت کو ربع حمص سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد حلب آباد ہو گیا اور قسمرین ویران ہو گیا۔ اور یہ دار الحکومت مسلمانوں اور اہل کتاب کے مابین حکومتیں بن گئیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیس سال تک اس علاقہ میں نائب رہے۔ پھر بیس سال تک امام و خلیفہ رہے۔ آپ کی رعیت آپ کے احسانات اور حسن سلوک کی شکر گزرا اور آپ پر راضی رہی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ جیسے معاملہ میں انہوں نے آپ کی اطاعت کی۔

اور یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ آپ اپنے والد سے بہتر تھے اور والد سے بڑھ کر ولایت کے جواز کے حق دار تھے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ: آپ کو والی بنایا جانا حلال نہیں تھا۔ اگر یہ بات بھی مان لی جائے کہ کوئی دوسرا آپ سے زیادہ ولایت کا حق دار تھا؛ یا آپ ان لوگوں میں سے تھے جن کی وجہ سے ظلم کے کاموں پر تعاون ہوا تھا؛ تو پھر بھی آپ کی ولایت سے جس شر کا

یہ اثر حضرت انس بن مالک سے مروی ہے۔ البخاری ۵/۲۶ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ باب مناقب الحسن و الحسين؛ و سنن الترمذی ۵/۳۲۵ کتاب المناقب، باب مناقب الحسن و الحسين۔ البدایہ و النہایہ ۸/۱۹۰۔ علامہ ابن کثیر البدایہ و النہایہ ۸/۱۹۲ پر لکھتے ہیں: اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کے بارے میں علماء کرام کے دو قول ہیں۔ کیا ابن زیاد نے یہ سر یزید کے پاس بھیج دیا تھا یا نہیں؟ زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ اس نے آپ کا سر یزید کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس بارے میں بہت سارے آثار وارد ہوئے ہیں۔ حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

خاتمہ ہوا وہ آپ کے عہد میں حاصل ہونے والے شر سے بہت زیادہ ہے۔

مال لینا اور بعض لوگوں کو مناصب تفویض کرنا کہاں ہے؟ اور پھر صفین میں قتل ہونے والوں کو کس نے قتل کیا؟ اس میں نہ ہی کسی کو کوئی کامیابی حاصل ہوئی اور نہ ہی غلبہ ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دینے والے لوگ بڑے پکے لوگ تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی امام اور مجتہد تھے، آپ وہی کرتے تھے جس میں مصلحت سمجھتے تھے۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر آپ مستقبل کی خبریں جانتے ہوتے تو آپ کو علم ہوتا کہ جنگ صفین کی نسبت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس امارت پر باقی رکھنا ہی زیادہ مصلحت پر مبنی تھا۔ کیونکہ اس جنگ کی وجہ سے شر اور برائی کے زیادہ ہونے کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں ملا، اور نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی۔ جب کہ آپ کی ولایت میں خیر کی کثرت تھی اور آپ سے جنگ کی نسبت شر بہت کم تھا۔ جو انسان بھی یہ گمان کرتا ہے کہ آپ کی ولایت میں شر تھا؛ اسے جاننا چاہیے کہ آپ کے ساتھ جنگ کرنے میں شر اس سے زیادہ اور بڑا تھا۔

یہ مثال اور اس جیسی دیگر مثالوں سے ان لوگوں کی جہالت واضح ہو جاتی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غیبی امور جانتے تھے۔ بلکہ رافضی کا یہ دعویٰ متناقض ہے۔ ان منفی امور کے باوجود آپ کے بارے میں علم الغیب کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے لیے انتہائی شجاعت کے دعویدار ہیں؛ اور ان کا خیال ہے کہ آپ نے ہی غزوات میں نبی کریم ﷺ کی مدد کی تھی۔ اور شروع اسلام میں کمزوری کے ایام میں آپ کی تلوار کی وجہ سے اسلام کے قواعد پختہ ہوئے اور پھر اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی موت کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں عاجزی و درمانگی اور کمزوری بیان کرتے ہیں۔ یہ متناقض بیانات ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ لوگوں کو دیکران کے دل موہ لیتے؛ نہ ہی آپ کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور نہ ہی آپ کے موالین تھے جو آپ کی مدد کرتے اور نہ ہی آپ نے لوگوں کو اپنی بیعت کرنے کو کہا؛ نہ ہی کسی کو ڈرایا دھمکایا اور نہ ہی کوئی لالچ دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے دفاع پر ان کفار پر قادر ہونے کی نسبت زیادہ قادر تھے جنہوں نے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے جنگیں لڑیں اور آپ کو اذیتیں پہنچائی تھیں۔ اگر آپ ہی کفار سے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا کرتے تھے؛ اور آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی دفاع کرنا چاہتے تھے تو آپ اس بات پر زیادہ قادر تھے۔ لیکن شیعہ جمع بین نقیضین ہی کرتے ہیں۔

یہی حال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے آپ کی جنگ کا ہے۔ اس وقت آپ غالب بھی تھے آپ کے پاس بہت بڑا لشکر بھی تھا۔ اور آپ کے لشکر میں ایسے لوگ موجود تھے جو ان لوگوں سے بدرجہا افضل تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ پس اگر آپ ہی نے مسلمانوں کی کمزوری اور قتل کے وقت کفار کی کثرت کے باوجود نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت کی تھی تو پھر آپ کے لشکر کی کثرت اور لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قلت کے ساتھ آپ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو مغلوب کرنے پر ان کفار کو مغلوب کرنے کی نسبت زیادہ قادر تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنگیں کیں۔ [اہل عقل کے لیے غور کی بات یہ ہے کہ] اس بہادری و شجاعت اور قوت اور اس عاجزی و کمزوری کے مابین کسی جاہل کے علاوہ کوئی دوسرا بھی جمع کر سکتا ہے؟ بلکہ یہ اس

بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام نصرت اللہ کے رسول ﷺ کے لیے تھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اور اہل ایمان سے آپ کی تائید و نصرت فرمائی تھی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مومنین سے نبی کریم ﷺ کی تائید فرمائی تھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل ایمان سب شامل ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس شعر سے ان کے علم غیب کی نفی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

لَقَدْ عَجِزْتُ عَجْزَةً لَا أَعْتَدِرُ سَوْفَ أَكْبَسَ بَعْدَهَا وَاسْتَمَرَّ
وَاجْمَعُ الرَّأْيَ الشَّتِيتَ الْمُتَشَرِّ

”میں معذرت نہیں کر رہا، بلکہ یہ سچ ہے کہ میں عاجز آ گیا ہوں۔ اس کے بعد میں غور و فکر سے کام لوں گا اور (سیدھی راہ پر) چلتا رہوں گا۔ نیز نکھری ہوئی پرانگندہ رائے ایک جاکر لوں گا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ صفین کی راتوں میں فرمایا کرتے تھے:

”اے حسن! اے حسن! تیرے باپ کا یہ خیال نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔ اللہ کے لیے ہی سعد بن مالک اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت ہے، انہوں نے فتنہ سے الگ رہ کر کتنا اچھا موقف اختیار کیا تھا۔ اگر وہ نیک تھے تو انہیں بڑا اجر ملے گا اور اگر گناہ گار تھے تو اس میں چنداں خطرہ نہیں ہے۔“

مصنفین نے آپ سے یہ کلام ایسے ہی نقل کیا ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ: مستجاب الدعوات]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے۔ آپ نے بسر بن اریطہ کے حق میں بددعا کی کہ اللہ اسے پاگل کر دے۔“ چنانچہ اسی طرح ہوا اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ عیزار کے حق میں اندھا ہونے کی بددعا کی تو وہ اندھا ہو گیا۔ اور انس نے جب شہادت چھپائی تو اس کے حق میں برص کا عارضہ لاحق ہونے کی دعا کی؛ اور اسے برص کا مرض لاحق ہو گیا۔ اور ایسے ہی آپ نے زید بن ارقم کے حق میں اندھا ہونے کی بددعا کی جو مقبول ہوئی اور وہ اندھا ہو گیا۔“ [ابھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ صحابہ و ان دیگر صلحاء میں یہ وصف زیادہ کثرت کے ساتھ موجود تھا۔ اور جب تک اہل ایمان موجود رہیں گے یہ وصف بھی باقی رہے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی دعاء کبھی خالی نہیں جاتی تھی۔ صحیحین میں ہے کہ ان کے حق میں نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ: ”اے اللہ! ان کا ہر تیر نشانہ پر پڑے اور ان کی ہر دعا مقبول ہو۔“ چنانچہ آپ کی کوئی دعا مسترد نہیں کی جاتی تھی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ میں لوگوں کو بھیجا کرتے؛ جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرتے۔ لوگ ان کے بارے میں خبر کی بات کے علاوہ کچھ بھی نہ کہتے۔ یہاں تک کہ جب بنی عباس کے ایک آدمی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: ”جب آپ ہمیں سعد کے بارے میں حلفیہ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو پھر نہیں: وہ نہ ہی جہاد کے لیے نکلتے

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب ابی اسحاق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۷۵۱)

ہیں اور نہ ہی اپنی رعیت میں عدل کرتے ہیں اور نہ ہی برابری کیا تھ تقسیم کرتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی: ”اے اللہ! اگر یہ جھوٹا ہے تو ریا کاری اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے، تو اس کی عمر کو لمبا کر، اور اس کی تنگدستی کو زیادہ کر اور اسے کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔“

تو اس آدمی کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اس کی عمر بہت بڑی ہو گئی تھی؛ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی پٹلیں لٹک گئی تھیں؛ لیکن وہ گلیوں میں چھو کر یوں کو چھینرتا اور ان سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔ اور اپنے بارے میں کہا کرتا تھا: ”بڑی عمر کا بڑھا ہوں جو فتنہ میں مبتلا ہو گیا ہوں، اور مجھے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی ہے۔“^①

یہی حال حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا تھا۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔ حماد بن زید سے روایت کیا گیا ہے وہ ہشام بن عروہ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ: اروی بنت اوس نے مروان کے پاس حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے خلاف دعویٰ کیا کہ: ”انہوں نے میری زمین کا ٹکڑا ناجائز قبضہ کر کے اپنی زمین کے ساتھ ملا لیا ہے۔“ تو حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس پر ان الفاظ میں بددعا کی: ”اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے، تو اسے اندھا کر دے، اور اسے اس کی زمین میں قتل کر دے۔“ چنانچہ ایسا ہی ہوا؛ وہ اندھی بھی ہو گئی؛ اور اپنی ہی زمین میں مردار مر گئی۔“^②

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جب کسی بات پر اللہ کا نام لیکر حلف اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر حلف اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں۔“^③

حضرت علاء بن حضری رضی اللہ عنہ جو پہلے نبی کریم ﷺ اور بعد ازاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔ قبولیت دعا میں مشہور تھے۔

ابن ابی دنیا رضی اللہ عنہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ سہم بن منجاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم نے حضرت علاء بن حضری رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔ اس وقت آپ نے تین دعائیں فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ تینوں دعائیں قبول فرمائیں۔ آپ فرماتے ہیں: ”ہم آپ کے ساتھ سفر میں تھے؛ اور ہم نے ایک منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ ہم نے وضوء کے لیے پانی تلاش کیا؛ بسیار تلاش کے باوجود نہ پاسکے۔ تو آپ کھڑے ہو گئے اور دو رکعت نماز پڑھی؛ پھر آپ نے دعا کی:

”اللہ! یا علیم یا حکیم یا علی العظیم! إنا عبیدک! وفي سبيلک نقاتل عدوک؛ فاسقنا غيثاً نشرب منه وتنوذاً من الإحداث. وإذا ترکناه فلا تجعل فيه نصيباً لأحد غیرنا۔“

”اے اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! ہم تیرے بندے ہیں؛ اور تیری راہ میں تیرے دشمنوں سے جہاد کرتے ہیں، ہم پر بارش برسا دے جس سے ہم پیئیں بھی اور ناپاکی سے طہارت بھی حاصل کریں۔ اور

① عن جابر بن سمرۃ: البخاری ۱/ ۱۴۷۔ کتاب الأذان باب وجوب القراءة للإمام و المأموم۔ مسلم ۱/ ۳۳۴؛ کتاب الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر۔ سنن النسائی ۲/ ۱۳۵؛ کتاب الافتتاح، باب الركود بين الركعتين الأوليين۔
 ② مسلم ۳/ ۱۲۳۰؛ کتاب المساقاة، باب تحريم الظلم و غضب الأرض و غیرها۔
 ③ البداية و النہایۃ (۶/ ۳۲۸)، طبقات ابن سعد (۴/ ۷۸)۔

جب ہم اس پانی کو چھوڑ دیں تو اسے کسی بھی دوسرے کے لیے حصہ نہ بنانا۔“

آپ فرماتے ہیں: ابھی ہم تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ہم نے بارش کے پانی سے بھرا ہوا ایک تالاب دیکھا جس سے پانی اچھل کر بہہ رہا تھا۔ ہم نے وہاں پر پڑاؤ ڈالا؛ خوب سیر ہو کر پیا اور میں نے اپنے برتن بھی بھر لیے۔ اور پھر انہیں تالاب پر ہی چھوڑ دیا۔ میں نے کہا: میں ضرور دیکھوں گا کہ کیا آپ کی دعاء قبول ہوئی ہے؟ جب ہم وہاں سے چل کر ایک میل یا اس کے قریب فاصلے تک پہنچ گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”میں اپنے برتن بھول گیا ہوں۔“

جب میں واپس وہاں پر پہنچا تو وہ جگہ ایسے تھی جیسے یہاں پر کبھی بھی پانی نہیں تھا۔ میں نے اپنے برتن اٹھالے۔ جب میں دارین پہنچا تو ہمارے اور ان کے درمیان سمندر حائل تھا۔ تو آپ نے دعا کی:

”اللہ! یا علیم یا حکیم یا علی العظیم! إنا عبدك وفی سبيلك نقاتل عدوك؛ فاجعل لنا سبيلاً إلى عدوك۔“

”اے اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! ہم تیرے بندے ہیں؛ اور تیری راہ میں تیرے دشمنوں سے جہاد کرتے ہیں؛ ہمارے لیے اپنے دشمن تک پہنچنے کے راستے بنا دے۔“

آپ فرماتے ہیں: پھر حضرت علاء رضی اللہ عنہ ہمیں لیکر سمندر میں داخل ہو گئے۔ اللہ کی قسم! ہماری سواریوں کی کانٹھیاں تک گیہی نہیں ہوئیں۔ پھر ہم دشمن کی طرف جانکے۔ پھر جب ہم واپس ہوئے تو آپ کو پیٹ میں تکلیف ہوئی؛ اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ غسل دینے کے لیے ہمیں پانی نہیں ملا۔ ہم نے آپ کو آپ کے کپڑوں میں لپیٹ کر دفن کر دیا۔ جب ہم تھوڑی دور چلے تو ہمیں بہت زیادہ پانی ملا۔ ہمارے بعض ساتھی آپس میں کہنے لگے: چلو واپس چلتے ہیں اور آپ کو نکال کر غسل دیتے اور پھر دفن کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم واپس پلٹے تو ہمیں تلاش بسیار کے باوجود آپ کی قبر نہیں ملی۔ پھر ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ میں نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ہے:

”اللہ! یا علیم یا حکیم یا علی العظیم! اخف حُفرتی و لا تطلع علی عورتی أحدًا۔“

”یا اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! میری قبر کو خفیہ رکھنا؛ اور کسی کو میرے ستر پر مطلع نہ کرنا۔“

تو پھر ہم آپ کو ایسے ہی چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بہت ساری دعائیں کیں جو کہ قبول ہوئیں۔ آپ بلال اور اس کے گروہ سے زمین کی تقسیم کے بارے میں تنازعہ ہو گیا تو آپ نے دعا کی: ”اے اللہ بلال اور اس کے گروہ کے لیے کافی ہو جا۔“

ابھی ایک سال کا عرصہ بھی اس دعا کو نہیں گزرا تھا کہ اس گروہ میں سے ایک آنکھ بھی کھلی نہیں رہی۔

اور آپ نے یہ دعا بھی کی تھی: ”اے اللہ! میری عمر بڑی ہو گئی ہے؛ اور میری رعایا پھیل چکی ہے۔ مجھے حقوق کے ضائع ہونے اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے پہلے اپنی طرف بلا لے۔“ تو پھر اسی سال آپ کو شہید کر دیا گیا۔

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ابن ابی دنیا نے مستجاب الدعوات لوگوں کے بارے میں ایک مکمل کتاب لکھی ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو قصے مذکور ہیں؛ ان کی کوئی ایسی سند نہیں ذکر کی گئی جس کی وجہ سے ان کا صحیح ہونا

معلوم ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض باتیں جھوٹی بھی ہیں جیسے حضرت انس کے لیے برص کی اور حضرت زید بن ارقم کے لیے اندھا ہونے کی بددعا۔

فصل :

[جنگ صفین]

[اشکال]: رافضی نے کہا ہے: ساتواں واقعہ: جب آپ صفین کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھیوں کو بہت سخت پیاس لگ گئی۔ آپ وہاں سے تھوڑا آگے نکلے تو آپ کو ایک ڈیرہ [گرجا] نظر آیا۔ آپ نے صاحب خانہ کو آواز دیکر پانی مانگا۔ اس نے جواب دیا: میرے اور پانی کے درمیان چھ میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اور اگر مجھے ہر مہینے بقدر کفایت چند قطرے نہ دیے جاتے تو میں پیاس سے مر جاتا۔ امیر المؤمنین نے اس ڈیرہ کے قریب ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا۔ (جب کھدائی شروع ہوئی تو وہاں پر بہت بڑی چٹان نکل آئی۔ لوگ اس چٹان کو ہٹانے سے عاجز آ گئے۔ تو آپ نے اکیلے ہی اس چٹان کو ہٹا دیا۔ پھر لوگوں نے وہاں سے پانی پیا۔ تو وہ راہب اتر کر ان کے پاس آ گیا اور کہا: آپ نبی رسول ہیں یا کوئی مقرب فرشتہ؟ آپ نے فرمایا: نہیں میں رسول اللہ ﷺ کا وصی ہوں۔ تو وہ راہب آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اور کہا: یہ ڈیرہ (گر جا گھر) اس چٹان کے طلب گار پر بنایا گیا ہے۔ اس کے نیچے سے پانی کا راستہ ہے۔ مجھ سے پہلے ایک جماعت گزر چکی ہے۔ مگر وہ اس کو نہیں پاسکے۔ یہ راہب بھی ان لوگوں میں سے ہے جو آپ کے ساتھ شہید کیے گئے تھے۔ اس قصہ کو سید حمیری نے اپنے قصیدہ میں نظم بند کیا ہے۔ [ابھی کلام رافضی]

[جواب]: یہ قصہ بھی اپنے سے ماقبل کے ان جھوٹے واقعات کی جنس سے ہے جنہیں جاہل لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مناقب میں سے شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بلکہ جس انسان نے یہ قصہ گھڑا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور مستحق مدح سرائی سے جاہل ہے۔ اس نے جو منقبت کی بات بنائی ہے کہ آپ نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نیچے پانی مل گیا اور آپ نے اکیلے ہی وہ چٹان وہاں سے ہٹا دی۔ ایسا تو باقی مخلوق میں سے بہت سارے لوگوں کے ساتھ پیش آ جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ان سے بہت افضل ہیں۔ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے خمین میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن کے لیے اس قسم کے کئی گنا زیادہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ اگر ایسے واقعات بعض صالحین کے ہاتھوں پر پیش آتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت اور ان کے لیے کرامت ہے۔ اور اس طرح کے واقعات ان لوگوں کے ہاتھوں بھی پیش آ جاتے ہیں جو صالحین میں سے بھی نہیں ہیں۔

باقی جو اس نے یہ گر جانے کا قصہ لکھا ہے کہ: اس چٹان کے طالب پر بنایا گیا ہے اور اس کے نیچے پانی کا راستہ ہے۔ سو یہ چیز مسلمانوں کے دین میں نہیں۔ گر بے کنیسے صومعات اور معبد اپنے پیش رو لوگوں کے نام پر بنانا نصاریٰ کا طریق کار ہے۔ جب کہ مسلمان اپنی مساجد جن کو بلند کرنے اور ان میں اللہ کے نام کا ذکر کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے صرف اللہ کے نام پر بناتے ہیں مخلوق میں سے کسی ایک کے نام پر نہیں بناتے۔

راہب کا یہ کہنا: آپ ”نبی مرسل ہیں یا ملک مقرب“ اس کی جہالت پر دلالت کرتا ہے نیز یہ کہ وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے جاہل اور گمراہ انسان تھا۔ (اس کو اتنا علم نہیں تھا کہ) فرشتے پانی نہیں پیتے اور نہ ہی اسے چٹان کے نیچے سے پانی نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ کہ محمد کے بعد کوئی بھی نبی نہیں۔ اور یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ اس راہب تک مسلمانوں کی خبر اس علاقے کے فاتحین کے ذریعہ پہنچ چکی ہوگی۔ اگر یہ پادری عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی رسول کے آنے کو جائز سمجھتا ہوتا تو پھر محمد ہی اللہ کے رسول تھے۔ اور آپ کے معجزات ظاہری و باطنی موجود تھے۔ اگر وہ ان کی تصدیق کرتا تو اسے علم ہوتا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس کی تصدیق نہیں کرتا تو پھر کسی دوسرے کے متعلق صرف چٹان کے نیچے پانی نکالنے کی بنا پر یہ اعتقاد کیسے رکھ سکتا ہے کہ وہ نبی مرسل ہے۔ یا یہ گرجا اسی کے نام پر بنایا گیا ہے۔ جب کہ وہ اپنے گرجا گھر بہت سارے ایسے لوگوں کے ناموں پر بناتے ہیں جو نہ ہی نبی ہیں اور نہ ہی رسول۔

نیز اس میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول درج ہے کہ: نہیں؛ لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی ہوں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ نہ ہی خلفاء ثلاثہ کی خلافت میں اور نہ ہی صفین کے لیل و نہار میں۔ بلکہ آپ اپنے مخالفین کے ساتھ مناظرے کیا کرتے تھے ان کے الزامات کا جواب دیتے۔ مگر آپ نے کبھی خود یہ دعویٰ کیا اور نہ ہی کسی نے آپ کے لیے یہ دعویٰ کیا۔ جب حکمین کو قاضی اور فیصل بنایا گیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کیساتھ مناظرہ کے لیے بھیجا تو وہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور سمبقت اسلامی بیان کی گئی مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔

یہ بات کبھی جانتے ہیں کہ اس وقت ہمت اور اسباب اس روایت کو بیان کرنے کے موجود تھے۔ اور اگر ان اسباب کے بغیر بھی اسے روایت کیا جاتا تو بھی حق تھا۔ تو پھر ان اسباب کی موجودگی اس کے بیان کا فائدہ ہی کچھ اور تھا۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب نقل کئے ہیں۔ مثلاً: رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ:

”لأعطين الراية غداً رجلاً يحب الله ورسوله و يحبه الله ورسوله“ [رواہ البخاری ۱۸/۵]

”کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔“

اور جنہوں کے موقع رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((ألا ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبي بعدي))

کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“

سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے فرمایا: ”تم مجھ سے ہو، اور میں تجھ سے ہوں۔“ [سبق تخریجہ]

ان کے علاوہ دیگر بھی فضائل ہیں؛ مگر انہیں انتہائی ضرورت کے باوجود یہاں پر نقل نہیں کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

منسوب جو دعویٰ ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں طے شدہ بات ہے کہ وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنات سے جنگ]

[اشکال] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”جمہور سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بنی المصطلق کی طرف روانہ ہوئے تو ایک دشوار گزار وادی میں سے گزرے۔ وادی وعر کے قریب انہیں رات ہو گئی۔ جبرائیل نے آکر اطلاع دی کہ اس وادی میں جنات کا ایک ٹولہ پوشیدہ ہے اور وہ آپ پر حملہ کرنا اور آپ کے اصحاب میں شر پھیلانا چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان پر تعوذ پڑھی: اس وادی میں اترنے کا حکم دیا اور آپ نے ان کو تہ تیغ کر دیا۔“ [آہ رافضی]

[جواب] ہم کہتے ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ: جنوں کو ہلاک کرنا انتابڑا کارنامہ نہیں، ہمارے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام اس سے کہیں بلند تھا: اس قسم کے کام وہ لوگ بھی کر لیتے ہیں جو بہت ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے جسے تمام اہل علم و محدثین جانتے ہیں کہ یہ واقعہ خود ساختہ اور جھوٹ ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ غزوہ بنی مصطلق میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

❦ شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ: ”اسے جمہور نے روایت کیا ہے۔“ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ثابت شدہ اسناد کے ساتھ مروی ہے یا پھر کسی ایسی کتاب میں ہے جس میں نقل شدہ روایات پر اعتماد کیا جاتا ہے، یا پھر کسی ایسے عالم نے اسے صحیح کہا ہو جس کی تصحیح قبول کی جاتی ہو تو پھر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ جمہور علماء نے اسے روایت کیا ہے تو پھر ایسا کہنا کورا جھوٹ ہے۔ اور اگر مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے روایت کیا ہے جن کی روایت سے حجت قائم نہیں ہو سکتی، تو پھر اس روایت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

❦ یہ اسی قسم کا من گھڑت واقعہ ہے جیسے شیعہ کا ساختہ پر داخستہ یہ قصہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چاہ ذات العلم میں جنوں سے لڑائی کی تھی۔ اہل علم کے ہاں یہ قصہ من گھڑت ہے۔ [اس قسم کے خود ساختہ واقعات ہمارے نزدیک قبول نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ شیعہ انہیں تسلیم کر لیں۔]

ہماری نگاہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منصب و مقام اس سے کہیں بلند تر تھا کہ جنات آپ کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے۔ کسی انسان نے کبھی جنوں سے مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ اہل ایمان جنات کفار جنات سے قتال کیا کرتے تھے۔

کسی شیعہ نے مشہور محدث ابو البقاء خالد بن یوسف نابلسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنوں سے لڑائی کے بارے میں دریافت کیا: تو انھوں نے کہا گروہ شیعہ عقل و خرد سے کس قدر بے گانہ ہے۔ تمہیں اتنی بھی عقل نہیں؟ اچھا یہ بتاؤ، عمر رضی اللہ عنہ افضل تھے یا علی رضی اللہ عنہ؟ شیعہ نے جواباً کہا ”علی“ وہ کہنے لگے، جب نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب عمر رضی اللہ عنہ ایک راہ پر چلتے ہیں تو شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے۔“ جب شیطان عمر رضی اللہ عنہ سے دم دبا کر بھاگتا تھا تو اس کی اولاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیوں کر لڑ سکے گی؟

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رجوع آفتاب اور اس پر رد]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”نواں واقعہ: ”دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے سورج کو لوٹایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ عہد رسالت میں پیش آیا۔ اور دوسری بار اس کے بعد۔“

پہلی بار: حضرت جابر وابوسعید رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل نازل ہو کر اللہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے۔ جب وحی نے آپ کو ڈھانک لیا تو نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ران پر سر رکھے لیٹے رہے، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ سے عصر کی نماز ادا کی۔ جب نبی کریم ﷺ بیدار ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو لوٹا دے تاکہ آپ کھڑے ہو کر عصر کی نماز پڑھ سکیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے آپ ﷺ کی دعا سے آفتاب واپس آ گیا اور آپ نے عصر کی نماز پڑھی۔

دوسری مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ بابل کے مقام پر دریائے فرات کو عبور کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے رفقاء اپنے مویشیوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ اسی دوران آپ نے چند ساتھیوں کے ساتھ نماز عصر ادا کر لی، جو ساتھی نماز ادا نہ کر سکے تھے جب انھوں نے شکوہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رجوع آفتاب کے لیے دعا کی۔ چنانچہ سورج لوٹ آیا۔ سعید حمیری نے یہ واقعہ نظم میں بیان کیا ہے:

رُدَّتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ لَمَّا فَاتَهُ
وَقْتُ الصَّلَاةِ وَقَدْ دَنَّتْ لِلْمَغْرِبِ
حَتَّى تَبْلَجَ نُورُهَا فِي وَقْتِهَا
لِلْعَصْرِ ثُمَّ هَوَتْ هَوَى الْكَوْكَبِ
وَعَلَيْهِ قَدْ رُدَّتْ بِبَابِلَ مَرَّةً
أُخْرَى وَمَا رُدَّتْ لِخَلْقٍ مَغْرِبِ

”جب آپ کی نماز عصر کا وقت فوت ہو گیا اور مغرب کا وقت قریب آ گیا۔ یہاں تک کہ سورج کا نور اپنے وقت عصر کے مطابق چمک گیا۔ پھر ستاروں کی طرح اتر گیا۔ اور آپ کے لیے ہی شہر بابل میں ایک بار پھر سورج کو لوٹایا گیا تھا؛ حالانکہ غروب ہونے کے بعد کسی پر سورج کو لوٹایا نہیں جاتا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضل و کمال پر جو یقین ہمیں حاصل ہے، واللہ الحمد اور یہ فضل و منزلت ایسی اسناد کے ساتھ ثابت ہے جو علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں۔ ان اسناد کی موجودگی میں کوئی اس دروغ گوئی کا محتاج نہیں۔ عہد رسالت میں رجوع آفتاب کا واقعہ طحاوی رضی اللہ عنہ اور قاضی عیاض رضی اللہ عنہ نے بالفاظ دیگر نقل کیا ہے اور اسے نبی کریم ﷺ کا معجزہ شمار کیا ہے۔ مگر محققین اہل علم اور ماہرین فن جانتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں۔ یہ روایت ابن الجوزی رضی اللہ عنہ نے موضوعات نقل کی ہے، اس نے ابو جعفر العقلی کی کتاب الضعفاء سے عبید اللہ بن موسیٰ کی سند روایت کی ہے۔ اس نے فضیل بن مزروق سے اور اس نے ابراہیم بن الحسن بن حسن سے اس نے فاطمہ بنت حسین سے اس نے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ:

”نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کی جا رہی تھی اور آپ کا سر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

غروب آفتاب تک عصر کی نماز ادا نہ کی۔ نبی ﷺ نے پوچھا: ”اے علی! کیا نماز پڑھ لی ہے؟“

تو انہوں نے عرض کی: نہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ! بیشک علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مشغول تھا تو اس کے لیے سورج کو لوٹا دے۔“ حضرت اسماء کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ آفتاب غروب ہو چکا تھا، پھر میں نے دیکھا کہ وہ غروب ہونے کے بعد دوبارہ طلوع ہو گیا۔“

ابن الجوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ”یہ روایت بلاشبہ موضوع ہے۔ اس کی سند کے راویوں میں اضطراب ہے۔

دوسری بار: باہل میں [سورج کی واپسی]۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ حمیری کے شعر کہنے میں کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ اس نے خود اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔ جھوٹ بہت پرانا ہے۔ اس نے بھی کسی سے یہ [جھوٹ] سن لیا ہوگا اور پر شعر کہہ دیے ہوں گے۔ غالی لوگ مدح و ذم میں ایسی چیزوں کو شعری شکل میں پرو دیتے ہیں کہ ان کی صحت تحقیق کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ حمیری غلو کرنے میں معروف ہے۔“

امت محمدیہ میں اس چیز کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور نہ ہی ایسا کرنے میں کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ ہل انگاری کی بنا پر جس کی نماز عصر فوت ہو جائے تو اس کا یہ گناہ توبہ سے معاف ہو جائے گا۔ اور توبہ کے لیے سورج کے واپس کئے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر اس میں وہ بے قصور ہے مثلاً سویار ہایا بھول گیا تو وہ بڑی آسانی سے بعد از غروب فوت شدہ عصر ادا کر سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ عصر کا وقت جاتا رہتا ہے بالفرض اگر سورج لوٹ آئے اور کوئی شخص رجوع آفتاب کے بعد نماز عصر ادا کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اس نے عصر کی نماز اصلی وقت پر ادا کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا﴾ [طہ ۱۳۰]

”اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور تحریف بیان کرتا رہ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتا رہ۔“

اس میں مغرب کا مشہور وقت مراد ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ اس غروب آفتاب سے پہلے مغرب کی نماز پڑھ لے۔ جب سورج طلوع ہو اور پھر غروب ہو۔ اسی طرح غروب آفتاب کے ساتھ روزہ کا افطار کرنا اور نماز مغرب ادا کرنا درست ہوتا ہے۔ اب بار ثانی آفتاب کے طلوع پذیر ہونے سے افطار کرنے والے کا روزہ فاسد نہیں ہوگا [اور اس کی نماز باطل نہیں ہو جائے گی] یہ ایک فرضی بات ہے جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ پھر اس کو مقدر ماننا ایسی چیز کو مقدر ماننا ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فروعات میں کلام کرنے والے علماء کے ہاں اس جیسی مثالوں کے بارے میں کوئی

حمیری: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ حمیری رافضی شاعر تھا ۱۰۵ ہجری میں پیدا ہوا اور ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ ابن حجر کہتے ہیں: انتہائی ضعیف رافضی تھا۔ دارقطنی کہتے ہیں: اپنے شعروں میں صحابہ کرام پر طعن کرتا اور حضرت علی کی مدح کیا کرتا تھا۔ شہرستانی نے اسے مختار یہ کہانیہ میں سے شمار کیا ہے۔ یہ مختار بن ابو عبیدہ ثقفی کے وہ ساتھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد محمد بن حنفیہ کی امامت کے قائل ہیں۔ اس کے حالات زندگی جاننے کے لیے دیکھیں: لسان المیزان ۱/ ۴۳۶۔ البدایہ والنہایہ ۱۰/ ۱۷۳۔ الملل والنحل ۱/ ۱۳۳۔

حکم نہیں ملتا۔

نیز غزوہ خندق میں نبی کریم ﷺ کی نماز عصر فوت ہو گئی تھی۔ آپ نے کثیر صحابہ کی معیت میں بصورت قضاء ادا کی تھی۔ اور رجوع آفتاب کی دعا نہ فرمائی، حالانکہ آپ کو اس سے بڑا دکھ ہوا، اور آپ نے اس سے روکنے والے کفار کے حق میں بددعا بھی فرمائی تھی۔^① اس بات کا احتمال ہے کہ آفتاب بادل کے نیچے چھپا ہوا اور پھر نمودار ہو گیا ہو تو انھوں نے سمجھا کہ دوبارہ طلوع ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے نبی کریم ﷺ نے جب غزوہ خندق کے بعد صحابہ کرام کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا تو فرمایا:

”تم میں ہر کوئی نماز عصر بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر پڑھے، مگر نماز کا وقت راستہ ہی میں آ گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا: ”ہم تو وہیں پہنچ کر نماز پڑھیں گے۔“ بعض نے کہا کہ: ”ہم تو پڑھ لیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نماز قضا کر دی جائے۔“ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ نہیں فرمایا۔“ (سبق تخریجہ)۔

پس یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے جنہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر ادا کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے افضل تو نہیں ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے غروب آفتاب کے بعد نماز عصر پڑھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ایسا کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔

اور اگر غروب آفتاب کے نماز جائز نہیں تھی یا ناقص تھی تو رسول اللہ ﷺ اس بات کے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کے لیے سورج کو واپس لایا جاتا۔ اور اگر نماز کامل اور جائز تھی تو پھر سورج کی واپسی کی ضرورت نہیں تھی۔

مزید برآں اس جیسے خارج از عادات قضایا اور امور عظیمہ جن کو نقل کرنے کے اسباب اور ہمتیں موجود ہوں، اگر پیش آئے ہوتے تو لوگ ضرور اسے نقل کرتے۔ جب ایک دو افراد کے علاوہ کسی نے بھی اس کو نقل نہیں کیا تو اس سے اس روایت کا جھوٹ ہونا معلوم ہو گیا۔

فصل:

[کوفہ کا سیلاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکان]: دسواں واقعہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”کوفہ میں ایک دفعہ اتنا سیلاب آیا کہ ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے خیر پر سوار ہوئے، لوگ بھی آپ کے ہم راہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ساحل فرات پر اترے، نماز پڑھی اور دعا کی۔ پھر ایک ٹہنی لے کر پانی کی سطح پر دے ماری۔ چنانچہ پانی خشک ہو گیا۔ بہت ساری مچھلیاں آپ کو سلام کرنے لگیں، مگر وہ خاص قسم کی مچھلیاں [جڑی اور مرہائی] خاموش رہیں، جب آپ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا جو مچھلیاں پاک تھیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی پیدا کر دی اور جو نجس تھیں انہیں گونگا اور خاموش کر دیا۔“ (اتقی کلام الرافضی)

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق (حدیث: ۴۱۱۱، ۴۱۱۲)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب الدلیل لمن قال الصلاة الوسطی..... (حدیث: ۶۲۷-۶۳۱)۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: ہم شیعہ سے اس کی صحیح اسناد اور ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بلا اسناد تو ایسی کہانیاں ہر شخص بیان کر سکتا ہے، مگر ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری بات: نبی کریم ﷺ کی خیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس نہ تھی۔

تیسری بات: [ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ جھوٹا ہے؛ کیونکہ] اسے کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا، ایسا قصہ اگر صحیح ہوتا تو لوگ کثرت سے اسے بیان کرتے؛ کیونکہ اسے نقل کرنے کے دوائی اور اسباب موجود تھے۔ اس کے نقل کرنے والے نے واقعہ کی کوئی سند بیان ہی نہیں کی تو پھر محض کہانی کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

چوتھی بات: مزید براں سب قسم کی مچھلیاں اجماعاً حلال ہیں، رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے آپ نے سمندر کے بارے میں فرمایا: ”سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار بھی حلال ہے۔“

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أُجِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيْرَةِ﴾ [المائدہ ۹۶]

”تمہارے لیے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا تمہارے لیے سامان زندگی ہے اور قافلے کے لیے۔“

ائمہ امت اور سلف کا اجماع ہے کہ تمام اقسام کی مچھلیاں حلال ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جب اسے حلال سمجھتے ہیں تو پھر نجس کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ مگر رافضی جہالت کی یہ انتہاء ہے کہ ایسی بے بنیاد روایتوں سے اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔

پانچویں بات: مچھلیوں میں قوت گویائی کا پیدا ہونا عادت کے مطابق ان کے بس میں نہیں ہے، مگر یہ ایک خارق عادت چیز ہے، جس چیز میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت پیدا کر دی وہ ناطق ہوگئی اور جس میں یہ قوت پیدا نہ کی؛ اسے خاموش رکھنا چاہا تو وہ حسب معمول خاموش رہی۔ یہ بھی اس صورت میں کہہ سکتے ہیں جب یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ اس میں مچھلی کا کیا گناہ ہے؟ کہ ہم اسے نجس قرار دیں۔ [ہم نقل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت ان موضوعات سے بے نیاز ہے]۔ جو کوئی بے زبان جانوروں کو اس وجہ سے گنہگار قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت گویائی نہیں بخشی تو حقیقت میں وہ ان جانوروں پر ظلم کر رہا ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا یہ بات کہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اسے قوت گویائی عطا کی تھی مگر وہ خاموش رہی؛ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر یہ واقعہ حقیقت میں پیش آیا ہے تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامت اور آپ کی تعظیم و قدر کی ہے۔ کرامت تو آپ کو سلام کرنے سے ظاہر ہوگئی تھی؛ قدرت حاصل ہونے کے باوجود کلام نہ کرنے میں کوئی کرامت نہیں ہے۔ جب مچھلی نے آپ کو قدرت ہونے کے باوجود سلام نہیں کیا تو اس میں پھر کیا کرامت ہوئی۔ بلکہ اس میں تو پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے والی بات ہے۔ اس لیے کہ مچھلی پاکیزہ اور حلال چیز ہے، مگر اس قصہ کی رو سے اسے حرام قرار دیا گیا ہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے عتوبت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّت لَّهُمْ وَ بَصَّيْنَاهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا﴾

”تو جو لوگ یہودی بن گئے، ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے۔“ [النساء ۱۶۰]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مچھلی کو حرام سمجھنا یہودیوں کے اخلاقیات میں سے ہے۔ اور رافضی چونکہ ان کے بھائی ہیں، اس لیے ان سے اس قسم کی باتیں بعید نہیں ہیں۔

چھٹی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: ”یہاں پر مقصود تو پانی کے خشک ہونے سے حاصل ہو گیا تھا۔ تو پھر مچھلی کے آپ کو سلام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور نہ ہی کوئی ایسا سبب موجود تھا جس کا تقاضا ہو کہ ایمان کی مضبوطی کے لیے کوئی خارق عادت واقعہ [یا کرامت] ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ پہلی بات سے حجت قائم ہوگئی اور ضرورت پوری ہوگئی؛ جب کہ دوسری بات میں نہ ہی حجت تھی اور نہ ہی ضرورت۔“

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر کے پھٹ جانے میں پانی کے خشک ہو جانے سے بڑا معجزہ تھا۔ لیکن پھر بھی مچھلیوں نے آپ پر سلام نہیں کیا۔ اور جب آپ خضر علیہ السلام کے پاس گئے تو آپ کے پاس تو شہ دان میں نمک لگی ہوئی مچھلی تھی؛ اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا، اور وہ ڈبے سے نکل کر پانی میں چلی گئی، اور اس کے جاتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسا کہ سمندر میں سرنگ بن گئی ہو۔ مگر اس نے نہ ہی موسیٰ علیہ السلام کو سلام کیا اور نہ ہی یوشع علیہ السلام کو۔ سمندر میں ہمیشہ مد و جزر رہتا ہے مگر اس کے بارے میں کہیں بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کبھی کسی مچھلی نے صحابہ یا تابعین رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو سلام کیا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس جیسی حکایات سے ان کے فضائل و مناقب ثابت کئے جائیں؛ جن کے جھوٹ ہونے کے بارے میں سبھی اہل علم و عقل جانتے ہیں۔

فصل:

[سانپ کا واقعہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: گیارہواں واقعہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”علماء کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک سانپ نکلا اور منبر پر چڑھ آیا۔ لوگوں نے ڈر کر اسے مارنا چاہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے روکا، اس کے ساتھ کچھ بات چیت کی تو وہ منبر پر سے اتر گیا۔ جب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو فرمایا وہ جنوں کا حاکم تھا اور ایک پیچیدہ مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا۔ میں نے وہ مسئلہ بتا دیا جس دروازے سے وہ سانپ داخل ہوا تھا اہل کوفہ اسے باب ثعبان (سانپ والا دروازہ) کہا کرتے تھے۔ بنو امیہ نے یہ نام مٹانے کے لیے اس دروازہ پر عرصہ تک بہت سے مقتولوں کو لٹکائے رکھا، اب لوگ اسے ”باب قتل“ (مقتولوں کا دروازہ) کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔“ [اہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جنات تو ان دوسرے علماء کے پاس بھی مسائل دریافت کرنے کے لیے آتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہزار درجہ کم مرتبہ کے ہیں؛ قدیم و جدید دور میں یہ بات ثابت ہے [اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، پھر اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت ہے؟ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام اس سے بہت بلند تھا، اور یہ آپ کے ادنیٰ فضائل میں سے ایک ہوگا۔ اور اگر یہ

واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالت میں کوئی قدر و ارزش نہیں ہوتی۔ ایسی کہانیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و نبی لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں جو آپ سے [اور علم سے] بہت دور ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جنہیں اہل علم و دین کی صحبت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ دیگر اہل علم کے اس سے بھی بڑے بڑے واقعات ہیں۔ یا انہوں نے اس سے بھی بڑی بڑی کرامات ملاحظہ کی ہوتی ہیں۔ ایسی روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ صحابہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت کم درجہ کے ہیں، لیکن ہم سے وہ درجہ بہا بہتر اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ جب ایسے واقعات سے ہم جیسے کسی ایک انسان پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت نہیں کی جاسکتی تو پھر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر آپ کی فضیلت کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کی جہالت، ظلم اور اولیاء اللہ متقین سے دوری کی وجہ سے ان کے پاس کوئی قابل اعتماد کرامت موجود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے علمی افلاس کی حالت یہ ہے کہ جب کسی خارق عادت واقعہ کا سنتے ہیں تو اس کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں جیسے کسی فلاں انسان کو چند ٹکڑے ل جائیں تو ان کی تعظیم کرتا ہے۔ اور بھوکے کو روٹی کے ٹکڑے مل جائیں تو وہ انہیں بہت بڑا جانتا ہے۔

رافضی اپنی جہالت اور اولیاء اللہ متقین کی راہ اور تقویٰ الہی سے دوری کی وجہ سے کرامات اولیاء میں اپنا کوئی حصہ و مقام نہیں رکھتے۔ اسی لیے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کی من گھڑت کہانیاں سنتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بات صرف انسان میں ہو سکتی ہے جو ساری مخلوق میں سب سے افضل ہو۔ بلکہ مذکورہ بالا خوارق ہی نہیں بلکہ اس سے بڑی بڑی خرق عادات امت محمدیہ کے بہت سارے ایسے لوگوں کو حاصل ہیں جن سے ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم ہزار درجہ افضل ہیں۔ جو کہ ان تمام صحابہ کرام سے محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے تقدیم بخشی ہے وہ ان کو مقدم جانتے ہیں۔ خصوصاً وہ حضرت ابوبکر صدیق کے مقام و مرتبہ سے اچھی طرح واقف ہیں؛ اور انہیں باقی تمام صحابہ پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس امت میں آپ کو تقویٰ اور ولایت الہی میں بہت خاص مقام حاصل تھا۔

فصل چہارم :

ائمہ اثنا عشرہ کی امامت کا اثبات

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”ہم کئی طریقوں سے بارہ ائمہ کی امامت ثابت کرتے ہیں۔ اس کا پہلا طریق نص ہے۔ چنانچہ شیعہ تمام بلاد و امصار میں خلفاء عن سلف نقل کرتے چلے آئے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ”یہ خود امام، امام کا بھائی اور امام کا بیٹا ہے اس کی نسل سے نو امام ہوں گے، امام قائم کا نام میرا نام اور کنیت بھی میری جیسی ہوگی۔ وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ جو و استبداد سے بھر چکی ہوگی۔“

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلا جواب یہ ہے کہ: یہ شیعہ پر بہتان ہے۔ تمام شیعہ نے یہ بات نہیں کہی، بلکہ یہ مختلف شیعہ گروہوں میں سے بعض شیعہ کا قول ہے۔ اکثر شیعہ خصوصاً تمام زیدیہ اس کو اسی طرح جھوٹا سمجھتے ہیں جیسے اہل سنت۔ زیدیہ کا فرقہ تمام شیعہ فرقوں میں زیادہ دانش مند صاحب علم اور مقابلہ بہتر ہے۔ تمام اسماعیلیہ کے نزدیک بھی یہ جھوٹ ہے۔ شیعہ کے تقریباً ستر فرقتے ہیں جو سب اس روایت کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ روایت اور مذکورہ بالا نظریہ متاخرین شیعہ اثنی عشریہ کی اختراع ہے۔
 جملہ طور پر شیعہ کے متعدد فرقے ہیں؛ ان میں سے ان کی بڑی اقسام بیس ہیں؛ ایک فرقہ کے علاوہ باقی تمام لوگ اس کا انکار کرتے ہیں؛ تو پھر شیعہ کے تو اتر کا دعویٰ کرنا کیا معانی رکھتا ہے۔

دوسرا جواب: یہ روایت شیعہ اثنا عشریہ کے علاوہ باقی شیعہ فرقوں کی نقل کردہ روایت کے معارض و منقض ہے۔ مثلاً جو لوگ بارہ ائمہ کو نہیں مانتے؛ اور راوندیہ کی نقول بھی اسی طرح کی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ اثنا عشری شیعہ کے دعویٰ کے برعکس ہے۔

تیسرا جواب: حنفیہ میں شیعہ علماء کرام نے اس نص کو اس طرح نہیں سمجھا؛ اور نہ ہی انہوں نے اپنی کتابوں میں کوئی ایسا ذکر کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے۔ جب کہ ان کے واقعات متواتر اور مشہور ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ متاخرین شیعہ کی اختراع ہے۔ یہ روایت اس وقت گھڑی گئی جب علی عسکری (بلا وارث) کا انتقال ہو گیا۔ اور پھر یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ: امام عسکری کا بیٹا محمد روپوش ہو گیا ہے۔ اس وقت یہ نص بھی ظہور میں آئی۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی وفات سے تقریباً دو سو پچاس سال کے بعد کا واقعہ ہے۔

چوتھا جواب: دوسری جانب اہل سنت اور علماء اہل سنت اور ناقلین آثار جو شیعہ سے [ہر لحاظ سے] کئی گنا زیادہ ہیں؛ وہ سبھی بغیر کسی شک و شبہ اور تردد کے علم یقینی کے طور پر جانتے ہیں کہ یہ رسول کریم ﷺ پر عظیم بہتان ہے۔ بلکہ اس پر مبالغہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر شیعہ علماء یہ دعویٰ کریں کہ وہ اس کے متواتر ہونے کا علم رکھتے ہیں۔ یہ بھی بالکل ایسے ہی ہے جیسے علماء اہل سنت اس روایت کے جھوٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

پانچواں جواب: تواتر کی شرط یہ ہے کہ کسی روایت کے ناقلین کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ طرفین اور وسط کے لوگوں کو یقینی علم حاصل ہو جائے۔ حسن عسکری کی موت سے پہلے کوئی بھی شخص امام منتظر کا قائل نہ تھا۔ اور نہ ہی حضرت علی اور بنو امیہ کے دور میں کسی ایسے انسان کے بارے میں علم ہو سکا ہے جس نے بارہ ائمہ اور امام غائب کے عقیدہ کا اعلان یا دعویٰ کیا ہو۔ اس وقت تو دعویٰ کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منصوب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ [البتہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے ائمہ کی امامت کے دعوے دار تھے]۔ بارہ اماموں کی امامت کا دعویٰ جن کا آخری امام ہنوز معدوم ہے؛ متقدمین میں سے کسی نے نہیں کہا تھا اور نہ کسی ناقل نے اسے نقل کیا۔ [پھر تواتر کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے؟]

چھٹا جواب: اصل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک بھی رافضی نہیں تھا۔ اگرچہ بعض دعویٰ کرنے والوں نے چند ایک صحابہ کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا بھی ہے، لیکن یہ صحابہ کرام پر محض جھوٹ ہے۔ اس صورت حال میں تو کوئی تواتر ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ایک تھوڑی سی تعداد ایک مذہب پر متفق ہو بھی جائے تو ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن ہوتا ہے [اس لیے تواتر ثابت نہیں ہو سکتا]۔ رافضہ جب جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جھوٹ بولنا جائز سمجھتے ہیں تو پھر اس روایت کے ناقلین پر قلت تعداد کے باوجود جھوٹ کو کیسے جائز نہیں سمجھ سکتے؟ اگر ان میں سے کسی ایک نے نقل بھی کیا ہو تو۔ پھر اگر صحابہ کرام کے دور میں اتنی تعداد نہیں پائی جاتی جس سے تواتر ثابت ہو سکے تو پھر یہ دعویٰ شروع سے اپنی جڑوں سے ہی کٹ گیا۔

ساتواں جواب: رافضی دعویٰ کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چند ایک کے علاوہ جن کی تعداد دس تک بڑی مشکل سے پہنچتی ہے؛ یا اس سے بھی کم رہتی ہے؛ باقی سارے لوگ مرد ہو گئے تھے۔ یہ ثابت علی الاسلام رہنے والے صحابہ: 'سلیمان'، 'عمار'، 'ابو ذر' اور 'مقداد' تھے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ باقی جمہور صحابہ کرام نے تو یہ نص نقل نہیں کی۔ شیعہ کے نزدیک ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ نص چھپالی تھی۔ تو پھر شیعہ کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اس نص کی روایت کو ان صحابہ کرام کی طرف منسوب کریں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شیعہ کا خیال ہے کہ ان سب کا موالات علی پر اجماع تھا۔ پس اس صورت میں وہ چھوٹی جماعت جن کا ایک بات پر جمع ہونا ممکن ہو ان کے نقل کرنے سے تواتر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن اور جائز ہوتا ہے۔

✽ جب رافضی جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر۔ ان کی کثرت کے باوجود۔ جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہیں، اور انہیں اسلام سے مرد قرار دیتے ہیں۔ اور ایسی باتیں چھپانے کا الزام لگاتے ہیں جن کا عادت کے مطابق چھپایا جانا ممکن نہیں؛ تو پھر ایک چھوٹے سے گروہ پر جھوٹا ہونے کا الزام زیادہ آسان اور آویں ہے۔ جب یہ لوگ اپنی خواہشات کے خلاف کوئی چیز نقل کرتے ہیں تو پھر کھل کر صحابہ کرام کو جھوٹے کہتے ہیں۔ تو پھر ایسے مسئلہ میں ان کی تصدیق کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ [جب کہ وہ صحابہ کو سچے نہیں مانتے]۔ جب روایت کے نقل کرنے والے ہی اپنی خواہشات کے مطابق نقل کر رہے ہوں۔

✽ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت میں اتباع ہوئی سے کام لیتے ہیں۔ تو پھر آپ کے بارے میں نص نقل کرنے میں کیسے ان لوگوں کی تصدیق کی جاسکتی ہے؟ جب کہ تمام اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے فرقوں میں شیعہ سے بڑھ کر عداوت جھوٹ بولنے اور حق بات کو جھٹلانے والا کوئی دوسرا فرقہ نہیں۔ جب باقی فرقوں کا معاملہ

ان کے برعکس ہے۔ خوارج اگرچہ دین سے نکل چکے ہیں؛ مگر وہ عداوت جھوٹ نہیں بولتے۔ معتزلہ سچائی کو دین سمجھتے ہیں۔ لیکن شیعہ پر ان کے ظہور کے وقت سے ہی جھوٹ غالب ہے۔

آٹھواں جواب: کہا گیا ہے کہ شیعہ امامیہ نے پہلی مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات میں بالنص کا دعویٰ خلافت راشدہ کے آخری دور میں کیا۔ عبداللہ بن سبأ^۱ اور اس کے ہم نوا کذابین کے ایک گروہ نے اس عقیدہ کا اختراع کیا تھا۔ اس بارے میں ہم حتمی طور پر جانتے ہیں کہ وہ اس سے پہلے اس دعویٰ اور ان لوگوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تو پھر تواتر کا دعویٰ کہاں سے آگیا؟ [اور اس کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے]۔

نواں جواب: وہ احادیث مبارکہ جو حضرات ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں؛ وہ عوام و خواص میں زیادہ اور اعظم تواتر کیساتھ پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ بات جائز ہے کہ ان فضائل کے نقل کرنے کی وجہ سے جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کی جائے؛ تو پھر شیعہ کے اس تواتر پر تنقید کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور اگر اس تواتر پر تنقید ممکن نہیں ہے تو پھر پہلے قسم کی روایات پر بدرجہ اولیٰ ممکن نہیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ان نصوص کثیرہ متواترہ کی روشنی میں ثابت ہوتے ہیں؛ تو پھر ان لوگوں کا اس نص کی مخالفت پر اجتماع و اتفاق محال ہے۔ اس لیے کہ اگر مخالفت کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو یہ سب سے بڑا گناہ اور اللہ کی نافرمانی و سرکشی ہوگی۔

دسواں جواب: شیعہ امامیہ میں سے کوئی ایک بھی متصل سند کے ساتھ اس روایت کو ثابت نہیں کر سکتا؛ اس کے تواتر کا دعویٰ کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ الفاظ تکرار کے محتاج ہیں۔ جب ان الفاظ کے نقل کرنے والوں نے انہیں پڑھنا نہیں ہوگا تو وہ انہیں یاد بھی نہیں رکھ سکیں گے۔ حالانکہ اس وقت میں قوی حافظہ والے لوگ موجود تھے جنہوں نے قرآن یاد کیا؛ [احادیث حفظ کیں] تشہد اور اذان کو رسول اللہ ﷺ کے بعد نسل در نسل نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ [تو اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہوتے جیسا کہ شیعہ کا دعویٰ ہے تو صحابہ کرام اور تابعین انہیں ضرور نقل کرتے؛ ان کا اس روایت کو نقل نہ کرنا اس کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے کی ایک نشانی ہے]۔

جب ہم فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں تواتر کا دعویٰ کرتے ہیں تو کبھی یہ دعویٰ تواتر معنوی کے لحاظ سے ہوتا ہے جیسے خلفاء اربعہ کی خلافت؛ جمل اور صفین کے واقعات؛ رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا۔ اور اس طرح کے دیگر واقعات جن کے نقل کرنے کے لیے متعین الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی؛ بلکہ واقعہ کا مشہور و معروف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام کی مسابقت اور ان کے اعمال کے بارے میں تواتر۔ اور کبھی یہ تواتر لفظی ہوتا ہے؛ یعنی راویان حدیث ایک ہی جیسے ایسے الفاظ میں روایت نقل کریں جن سے علم ضروری حاصل ہو۔

۱ بارہ اماموں کی امامت کو نص کے ساتھ ثابت کرنے میں شیعہ کا دعویٰ کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) سیدنا علی کی امامت و ولایت کی نص۔ امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں اس کے ابطال کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ باقی رہی یہ بات کہ سیدنا علی نے نص صریح کے مطابق اپنے بیٹے حسن کو امام مقرر کیا تھا ہم قبل ازیں اس کا بطلان ثابت کر چکے ہیں۔ (۲) شیعہ کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ سیدنا علی کا وصی ہونا نص سے ثابت ہے؛ مشہور شیعہ عالم الکشی نے اعتراف کیا ہے کہ اس عقیدہ کا موجد عبداللہ بن سبأ تھا ہم قبل ازیں یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں۔

گیارہویں وجہ: اہل بیت [مثلاً امام جعفر صادق، ان کے والد اور ان کے دادا امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ] سے منقول تو اتر خود اس روایت کو جھٹلا رہا ہے؛ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی امامت کو مبنی بر نص نہیں قرار دیتے تھے۔ بلکہ ایسا دعویٰ کرنے والوں کو جھٹلایا کرتے تھے۔ چہ جائے کہ وہ ایسی نصوص سے بارہ ائمہ کی امامت ثابت کریں۔

بارہویں وجہ: بارہ ائمہ کے متعلق وارد صحیح حدیث کو شیخینے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

”لوگ اس وقت تک امن و چین اور عزت سے زندگی بسر کرتے رہیں گے جب تک بارہ آدمی ان کے حاکم و امام رہیں گے۔ پھر آہستہ آواز سے ایک بات کہی جو مجھ سے پوشیدہ رہی۔ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ بارہ اشخاص سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔“ [متفق علیہ]۔

ایک روایت میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسلام اس وقت تک غالب رہے گا؛ یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہو گزریں۔“ ایک روایت میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ دین اس وقت تک غالب رہے گا؛ یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہو گزریں۔ پھر آپ نے آہستہ آواز سے ایک بات کہی جو مجھ سے پوشیدہ رہی۔ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ بارہ خلفاء سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔“ [متفق علیہ۔ البخاری ۹/۸۱، مسلم ۳/۱۵۲]

تورات کی عبارات اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث سے اثنا عشریہ کے بارہ امام مراد نہیں لیے جا سکتے۔ اس لیے کہ حدیث کے واضح الفاظ ہیں کہ: ”اسلام اس وقت تک غالب رہے گا؛ یا فرمایا: ”یہ دین اس وقت تک غالب رہے گا۔“ یا فرمایا کہ: ”لوگ اس وقت تک خوشحال رہیں گے۔“

یہ تمام روایات دلالت کرتی ہیں کہ ان ائمہ کی ولایت کے عہد میں اسلام کو قائم اور غالب ہونا چاہیے۔ اور جب ان کی مدت ولایت ختم ہو جائے گی تو اسلام کا بھی وہ غلبہ اور استحکام نہیں رہے گا۔

شیعہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک امام کے زمانہ میں بھی امت کا شیرازہ متحد نہ رہا بلکہ امت تفرق و انتشار کا شکار رہی، اور سرکش باغی ظالموں اور کافروں نے انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا؛ منافق اور کافران پر غالب رہے۔ اور اہل حق ان کے عہد امارت میں یہود سے بھی زیادہ ذلیل رہے۔ مزید براں امام منتظر کی امامت شیعہ کے نزدیک تاقیام قیامت باقی رہے گی۔ تو پھر اس صورت میں اثنا عشریہ کے نزدیک کوئی زمانہ بھی ان کے امام سے خالی نہیں رہے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر زمانہ و طرح کا نہیں رہے گا؛ ایک وہ زمانہ جس میں دین اسلام کا معاملہ غالب و قائم و دائم ہو اور دوسرا وہ زمانہ جب اسلام کو غلبہ و استحکام نصیب نہ ہو۔ بلکہ یہ ہر زمانہ میں ایک ہی جیسا رہے گا۔ یہ بات صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ نیز یہ اسلام مہدی کے قیام کے بعد راہ راست پر قائم ہوگا۔ یہ مہدی اہل سنت والجماعت کا مہدی ہے۔ جب کہ رافضیوں کے مہدی کی مدت بہت قلیل ہے؛ اس میں اس امت کے معاملات کی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔

نیز یہ کہ حدیث میں آتا ہے: ”یہ تمام ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔“

اگر یہ صرف اولاد علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہوتے تو پھر حدیث میں ضرور کوئی ایسا ذکر بھی ہوتا جس سے ان میں باہم تمیز

ممکن ہو جاتی۔ کیا آپ غور نہیں کر رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ ائمہ اولاد اسماعیل میں سے ہوں گے۔ اور نہ ہی عربوں کو خاص کیا ہے۔ اگرچہ یہ اولاد اسماعیل ہی میں سے ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ نے صرف اس قبیلہ کا بیان کیا جس کی وجہ سے یہ لوگ ممتاز ہوں گے۔ اگر یہ لوگ ہاشمی ہونے کی وجہ سے ممتاز ہوتے یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کی وجہ سے خاص ہوتے تو پھر اس کا ضرور ذکر بھی کیا جاتا۔ جب آپ نے اس خلافت و امامت کو مطلق طور پر قریش کے ساتھ رکھا ہے کسی ایک قبیلہ کے ساتھ خاص نہیں کیا تو پھر یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ بنو عدی، بنو تیم، بنو عبد شمس اور بنو ہاشم وغیرہ تمام ہی قریش میں سے ہیں اور خلفاء راشدین کا تعلق ان ہی قبائل سے ہے۔

فصل:

[خروج مہدی]

[اشکال]: شیخ مصنف لکھتا ہے: ”ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا، جس کا نام میرا نام اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی، وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دیگا جیسے وہ ظلم و استبداد سے بھر چکی تھی؛ یہ مہدی ہوگا۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ”وہ احادیث جن سے خروج مہدی پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ صحیح ہیں۔ ان کو احمد و ابوداؤد و ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اگر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دیں گے یہاں تک کہ میرے اہل بیت میں سے۔ یا فرمایا: ہم میں سے۔ ایک شخص نکلے گا جس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا، وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔“^①

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ”مہدی میری عترت میں سے اولاد و فاطمہ رضی اللہ عنہما میں سے ہوگا۔“^② ابوداؤد نے یہ روایت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں ذکر کی ہے: ”وہ سات سال تک زمین میں بادشاہی کرے گا۔“^③ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا: ”بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام رکھا ہے۔“ عنقریب اس کی نسل سے ایک شخص پیدا ہوگا، جو ہمارے نبی ﷺ کا ہم نام ہو گا، وہ سیرت و کردار میں ان جیسا ہوگا۔ مگر شکل و صورت مختلف ہوگی۔ وہ زمین کو عدل سے معمور کر دے گا۔“^④ ان احادیث کے بارے میں کئی ایک گروہ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو احادیث مہدی کا بالکل ہی انکار کر دیا۔

① سنن ابی داؤد، کتاب المہدی (ح: ۴۲۸۲)، سنن ترمذی کتاب الفتن، باب ما جاء فی المہدی (ح: ۲۲۳۰)

② یہ حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب المہدی؛ الباب الأول (ح: ۴۲۸۴)، سنن ابن ماجہ مختصراً، کتاب الفتن، باب خروج المہدی (ح: ۴۰۸۶)؛ اس روایت کے الفاظ ہیں: ”المہدی من ولد فاطمہ۔“ مہدی فاطمہ کی اولاد میں سے ہوگا۔ صصحہ الألبانی فی السلسلۃ الضعیفۃ ۱/۱۰۸۔

③ عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ؛ سنن أبی داؤد، کتاب المہدی؛ الباب الأول (حدیث: ۴۲۸۵)۔ وحسنہ الألبانی فی صحیح الجامع الصغیر ۶/۲۲۔ ④ سنن ابی داؤد، کتاب المہدی (حدیث: ۴۲۸۳، ۴۲۹۰)۔ یہ حدیث الفاظ میں معمولی سے اختلاف کیساتھ شعیب بن خالد نے ابواسحاق سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث منقطع ہے۔ ابوالخلیف سمعی کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ثابت نہیں ہے۔

اور وہ ابن ماجہ کی اس حدیث سے دلیل پیش کرتے ہیں:

”لَا مَهْدِيَّ إِلَّا عَيْسَىٰ بن مَرْيَمَ.“ ”عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے علاوہ کوئی مہدی نہیں۔“

✽ ایک تو یہ روایت ضعیف ہے۔ محمد بن ولید بغدادی اور کچھ دوسرے ایسے لوگوں نے اس روایت پر اعتماد کیا جو خود قابل اعتماد نہیں ہیں۔ نیز اس روایت کو ابن ماجہ نے یونس سے؛ انہوں نے شافعی سے اور وہ اہل یمن کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں۔ اس آدمی کا نام محمد بن خالد جندی تھا۔ اس کی روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی یہ روایت مسند امام شافعی میں موجود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: امام شافعی کا جندی سے سماع ثابت نہیں۔ اور یونس کا امام شافعی سے سماع ثابت نہیں۔

دوسری وجہ: جو شیعہ اس مہدی کو اپنا امام کہتے ہیں ان کے نزدیک امام منتظر کا نام محمد بن حسن ہے۔ احادیث مبارکہ میں جس مہدی کی صفات وارد ہوئی ہیں؛ ان کی رو سے اس کا نام محمد بن عبد اللہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ نے تو حدیث مبارک سے والد کے نام کا تذکرہ تک مٹا دیا تا کہ روایت ان کے جھوٹ سے متاثر نہ رہے۔ اور ایک گروہ نے اس میں تحریف کی۔ اور وہ کہنے لگے: اس کا دادا حسین ہوگا اور اس کی کنیت ابو عبد اللہ ہوگی۔ تو اس صورت میں معنی ہوگا: ”محمد بن ابو عبد اللہ“ اس طرح سے کنیت کو اسم علم بنا دیا۔

✽ گمراہی کی اس ڈگر پر چلنے والا ابن طلحہ بھی ہے جس نے اپنی کتاب ”غایۃ السؤل فی مناقب الرسول“ میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ جس انسان کو ان احادیث کی ادنیٰ سی بھی معرفت ہوگی تو وہ جان لے گا کہ یہ تحریف ہے اور رسول اللہ ﷺ پر کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ کیا ایسا بھی ہے کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ”جس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا“ سے آپ کے والد کا نام عبد اللہ کے سوا کچھ اور سمجھتا ہو؟ کیا کوئی انسان اس سے یہ بھی سمجھتا ہے کہ آپ کے دادا کی کنیت ابو عبد اللہ ہوگی؟ [ہرگز نہیں]۔

✽ پھر اس میں کوئی امتیازیت پائی جاتی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کے بیٹوں کے نام محمد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے دادا کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ: محمد بن ابو عبد اللہ؛ جس طرح اس مہدی کے دادا کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔ اور پھر جو کوئی لوگوں میں اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہو تو وہ کیسے محمد بن حسن کو محمد بن عبد اللہ بنائے گا اور کہے گا کہ: اس سے مراد آپ کے دادا ابو عبد اللہ ہیں۔

✽ اور یہ وصف ایسے بھی بیان ہو سکتا ہے: محمد بن الحسن یا ابن ابی الحسن؛ اس لیے کہ آپ کے جد اعلیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور آپ کی کنیت ابو الحسن ہے۔ یہ پہلے الفاظ سے زیادہ بہتر ہے اور ہدایت بیان چاہنے والوں کیلئے زیادہ واضح ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام مہدی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے نہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ گزر چکے ہیں۔^①

✽ [ابن ماجہ ۲/ ۱۳۴۰۔ کتاب الفتن، باب شدۃ الزمان۔ السلسلۃ الضعیفۃ برقم ۷۷؛ ج ۱/ ص ۱۰۳۔ أبو داؤد ۴/ ۱۵۳]۔

① سنن ابی داؤد، کتاب المہدی، (حدیث: ۴۲۹۰)

تیسری وجہ: بہت سارے طوائف میں سے ہر ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہی وہ مہدی ہے احادیث مبارکہ میں جس کی بشارت دی گئی ہے۔ مثلاً: قرامطہ باطنیہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا امام ہی مہدویت کا بانی تھا۔ ان لوگوں کی دعوت مغرب میں پھیلی۔ ﴿حالاںکہ اس کا دعویٰ مبنی بر کذب و دروغ ہے﴾۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میمون القدرج کی اولاد میں سے تھا۔ پھر باطنیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ میمون محمد بن اسماعیل بن جعفر کا بیٹا ہے، جس کی طرف اسماعیلیہ منسوب ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ باطن میں ملحد اور تمام ملتوں سے خارج ہیں۔ اور غالیہ اور نصیریہ سے بڑے کافر ہیں۔ ان کا مذہب مجوسیت فلسفہ اور صابئی مذہب کا عجون مرکب ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان کا اصل دادا یہودی تھا جو کہ ایک مجوسی کالے پالک اور پروردہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی، اور بہت سارے لوگ ان کے ماننے والے تھے۔ مختلف علماء مثلاً ابو بکر باقلانی و قاضی عبد الجبار ہمدانی اور امام غزالی نے ان کے نقائص و معائب پر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ان کے اسراروں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

ایسے ہی دعویداروں میں سے ایک محمد بن عبد اللہ بن تومرت بربری تھا؛ اس نے مغرب سے خروج کیا تھا۔ اس کے اصحاب کو موحدین کہا جاتا تھا۔ خطبات میں اس کا نام یوں لیا جاتا تھا:

”امام معصوم اور مہدی معلوم“۔ وہ جو زمین کو عدل و انصاف سے ایسے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔“

جس نے اپنے شجرہ نسب کو حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ملا لیا تھا۔ یہ محض رافضی نہیں تھا؛ بلکہ اسے احادیث کے بارے میں بھی کچھ علم تھا جس کی بنیاد پر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ کیا۔ جو کہ حدیث میں وارد مواصفات کے مطابق تھا۔ لیکن یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ یہ وہ مہدی نہیں تھا جس کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اور جیسا کہ دوسرے بہت سارے لوگوں نے ایسے دعوے کئے ہیں۔ ان میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ اور بعض لوگوں کے چاہنے والوں نے ان کے متعلق ایسے دعوے کئے ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں صحیح معنوں میں اللہ ہی جانتا ہے اور بسا اوقات ان میں سے کسی ایک وجہ سے لوگوں کو فائدہ بھی حاصل ہوا ہوگا۔ اگرچہ کچھ دوسرے لوگوں کو نقصان بھی پہنچا ہو جیسا کہ مغرب میں ظہور کرنے والے مہدی کی وجہ سے ہوا۔ اس سے بہت سارے لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا۔ اور بہت سارے گروہوں کو نقصان پہنچا۔ اس میں کئی قابل مذمت باتوں کے باوجود کئی ایک قابل مدح و توصیف باتیں بھی تھیں۔

بہر حال یہ مہدی اور اس جیسے دوسرے مہدی رافضیوں کے اس مہدی سے بہت بہتر تھے۔ جس کی نہ ہی کوئی شخصیت اور نہ ہی نام و نشان کا کوئی پتہ ہے۔ نہ ہی اس کا احساس ہے نہ ہی خبر۔ نہ ہی اس سے کسی کو کوئی دنیا کا فائدہ ملانہ ہی دین کا۔ بلکہ اس کے موجود ہونے کے اعتقاد کی وجہ سے اتنا بڑا شر و فساد پیدا ہوا جس کو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

فصل:

[امام معصوم کا وجوب]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود ضروری [واجب] ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ائمہ کے بغیر اور کوئی معصوم نہیں ہو سکتا؛ اس پر اجماع ہے۔“ [اُسی کام اراضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ ہمارے نزدیک امام معصوم کا وجود ہر زمانہ میں ضروری نہیں۔

دوسرا جواب: خود شیعہ کے کئی گروہ ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ [یعنی بارہ اماموں کو نہیں مانتے]۔

تیسرا جواب: اگر شیعہ کے دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہمارے دور میں تقریباً گیارہ سو اسی سال سے زائد عرصہ سے گم ہے [اس کا کوئی نشان ظاہر نہیں ہے]۔ ان کے نزدیک یہ امام دو سو ساٹھ ہجری میں سامراء کے غار میں گھس گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پانچ سال تھی۔ اور بعض کے نزدیک اس سے بھی کم عمر تھی۔ مزید برآں کہ امام غائب سے کوئی ایسا اثر ظاہر نہیں ہوا جو کسی ادنیٰ انسان سے بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کہ کسی ایک دوسرے حاکم، والی یا قاضی کے آثار ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ چہ جائے کہ وہ امام معصوم والے کام کرے۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ ایسے امام کے وجود سے کون سا فائدہ حاصل ہوا؟ اس کا وجود اور عدم برابر ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ معدوم ہے۔ جو لوگ اس معصوم پر ایمان لائے ہیں؛ انہیں ان کے دین یا دنیا میں کوئی مہربانی یا لطف اس امام کی وجہ سے حاصل ہوا۔ [ہم شیعہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ایسے امام سے انھیں قدیم و جدید زمانہ میں کیا مصلحت حاصل ہوئی؟]

❀ اور کیا یہ نظریہ [جہلاء] عوام الناس کے اس نظریہ سے بھی زیادہ فاسد نہیں ہے جس کے تحت وہ نام نہاد قطب و غوث وغیرہ فقط ناموں کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور ان ناموں کے متعلق ایسے دعوے کرتے ہیں جو کہ نبوت کے رتبہ سے بھی اعلیٰ تر ہوتے ہیں۔ جس میں کسی متعین شخص کو خاص نہیں کیا جاتا جس سے وہ فائدہ حاصل ہونا ممکن ہو جس کے متعلق ان ناموں کے تحت یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ جیسا کہ بہت سارے لوگ حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کا دعویٰ کرتے ہیں؛ مگر اس دعویٰ کی وجہ سے انہیں دین یا دنیا میں کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ ان کے دعویٰ کا منتہی یہ دوسرا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر بعض واقعات ظاہر کرتے ہیں جو کہ اس کی قدرت سے ان کیلئے مقدر ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود انہیں اسکی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ان کی معرفت کی کوئی ضرورت ہے۔ اور اگر یہ سب باتیں حق بھی ہوں تب بھی انہیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب کہ ان کا دعویٰ ہی باطل پر مبنی ہو۔

❀ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی حجت انسانی شکل میں آتا ہے اور کہتا ہے: میں خضر ہوں۔ حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی بعض لوگ رجال غیب کے دیدار کا ذکر کرتے ہیں؛ حالانکہ انہوں نے جنات کو دیکھا

ہوتا ہے۔

جس امام کا دعویٰ رافضی کرتے ہیں؛ وہ یا تو ان کے نزدیک مفقود ہے یا پھر عقلاء کے نزدیک معدوم ہے۔ دونوں صورتوں میں اس سے کسی ایک انسان کو بھی دین یا دنیا کا کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پھر جو کوئی اپنے دین کو ایسی مجہولات کیساتھ معلق کر دے جن کا کوئی ثبوت ہی نہ ہو تو وہ دین کے معاملہ میں بڑا ہی گمراہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے ساتھ اس نے اپنے دین کو معلق کیا ہے اس کے درست ہونے کا کوئی علم ہی نہیں۔ اور نہ ہی اس سے کوئی منفعت حاصل ہوئی۔ تو کیا کسی بڑے جاہل کے علاوہ بھی کوئی انسان ایسے کر سکتا ہے؟

حالانکہ جو لوگ حیات خضر کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ لوگوں پر ان کی اطاعت کو واجب نہیں کرتے۔ حالانکہ خضر تو [ایک وقت میں] زندہ اور موجود بھی تھے۔

فصل:

[فضائل سے امامت پر استدلال]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”تیسری چیز: وہ تمام فضائل جو آپ کی ذات میں پائے جاتے ہیں وہ آپ کی

امامت کو واجب کرتے ہیں۔“ [اسی کا نام الرافضی]

[جواب]: ”اس کا جواب کئی نکات پر مشتمل ہے:

پہلی بات: ان فضائل کی انتہاء یہ ہو سکتی ہے کہ یہ انسان اس بات کا اہل ہے کہ اس کے لیے عقد امامت باندھا جائے۔ لیکن صرف اہلیت کی بنا پر کوئی امام نہیں بن جاتا۔ جیسا کہ کوئی انسان اگر قاضی بننے کا اہل ہو تو وہ صرف اہل ہونے کی بنا پر قاضی نہیں بن جاتا۔

دوسری بات: امامت کی اہلیت قریش کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے ان حضرات کے لیے۔ اور وہ اس بات کے اہل تھے کہ انہیں ولایت تفویض کی جائے۔ مگر ان کی تخصیص کا کوئی موجب نہیں پایا جاتا۔ مگر اس اہلیت کی بنا پر وہ امام نہیں بن گئے۔

تیسری بات: ان کا بارہواں امام عقلاء کے نزدیک معدوم ہے۔ تو پھر یہ بات متنع ہے کہ وہ امام بھی ہو۔ چوتھی بات: عسکرین اور ان جیسے دوسرے ان کے طبقہ کے لوگوں میں علم اور دین کا کوئی ایسا نام و نشان نہیں جیسا کہ حضرت علی بن حسین؛ ابو جعفر؛ اور جعفر بن محمد کے پاس تھا۔

فصل پنجم:

شیعہ کی دروغ گوئی اور اصحاب ثلاثہ

اصحاب ثلاثہ کے بارے میں شیعہ کی دروغ گوئی:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”متعدد وجوہ کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے کے خلفاء ائمہ [برحق] نہ تھے۔ اس پر بہت سارے دلائل موجود ہیں۔“ [ابھی کام لڑائی]

[جواب]: میں کہتا ہوں: [شیعہ مصنف کا یہ بیان غلط ہے؛ بلکہ خلفاء ثلاثہ امام تھے]۔ اگر مذکورہ کلام سے مراد یہ ہے کہ باقی تینوں خلفاء مسلمانوں کے امیر مقرر نہیں ہوئے، اور نہ ہی مسلمانوں نے ان کی بیعت کی ہے؛ اور نہ ہی انہیں ایسا اقتدار حاصل تھا جس کے ذریعہ وہ شرعی حدود کو قائم کر سکیں؛ اور لوگوں کے حقوق ادا کر سکیں؛ اور دشمن سے جہاد کر سکیں؛ اور مسلمانوں کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھائیں۔ اور نہ ہی وہ ان امور پر قدرت رکھتے تھے جو امامت و خلافت کے ذیل میں آتے ہیں؛ تو یہ سراسر جھوٹ اور حق سے روگردانی ہے۔ کیونکہ یہ بات تو اتر کے ساتھ ثابت ہے جسے روافض اور دوسرے لوگ بھی جانتے ہیں۔ اگر وہ امامت کے مرتبہ پر فائز نہ ہوتے تو روافض ان پر یوں طعن و تشنیع بھی نہ کرتے۔

[حقیقت میں سابقہ خلفاء ثلاثہ ہر لحاظ سے منصب امامت کی اہلیت و صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام اکناف ارضی میں پھیلا اور مسلمانوں نے بلاد و اقائیم کو فتح کیا۔ یہ صحیح معنی میں خلفائے راشدین تھے۔ شیعہ کے سوا اس میں مسلمانوں کے سب فرتے متحد اخیال ہیں۔ وہ بہمہ وجوہ اس کے اہل اور حق دار تھے، ہمارا یہ حتمی و قطعی نقطہ نظر ہے، کوئی قطعی یا باطنی دلیل اس کی مخالف نہیں ہے جہاں تک قطعی دلائل و نصوص کا تعلق ہے ان میں تناقض کا احتمال نہیں ہے باقی رہے لفظی دلائل تو وہ قطعاً کما معارفہ نہیں کر سکتے]۔

لیکن روافض امامت کے اثبات و نفی مطلقاً ذکر کرتے ہیں، اور یہ تفصیل بیان نہیں کرتے کہ ان کی مراد امامت اور اس کے متعلقہ امور کا ثبوت ہے یا پھر امامت کے استحقاق کا ثبوت۔ وہ لفظ ”امام“ کا اطلاق دوسری صورت پر کرتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ لفظ دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ تو اگر ان کی مراد یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ امامت و خلافت کے لائق نہیں تھے؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے؛ یا پھر آپ ان سے بڑھ کر خلافت کے حق دار تھے؛ تو یہ بات کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اور یہی نکتہ مورد نزاع بھی ہے۔

ہم اس بارے میں ایک ضابطہ بیان کرتے ہیں جو کہ قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اسے تفصیل سے بیان کریں گے۔ کلی جواب تو یہ ہے کہ یہ بات تو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ خلافت و امامت کے لائق تھے۔ یہ بات ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے۔ اس مسئلہ میں روافض کے علاوہ کوئی بھی دوسرا فرقہ مسلمانوں سے اختلاف نہیں کرتا۔ بلکہ امت کے ائمہ اور جمہور سے یہ منقول ہے کہ وہ لوگ امامت کے زیادہ حق دار تھے اور یہ بھی منقول ہے کہ وہ اس امت کے سب سے زیادہ افضل لوگ تھے۔ جو بات ہمیں قطعی طور پر معلوم ہوئی ہے۔ اسے کسی قطعی یا ظنی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادلہ قطعیہ

کے مابین اختلاف نہیں ہوتا۔ اور اولہ قطعیہ کو اولہ ظنیہ سے رد نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی وہ اس کے معارض ہو سکتی ہیں۔
خلاصہ کلام یہ ہے کہ قادیان خلفائے ثلاثہ کے مخالف جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں۔
۱۔ یا تو وہ ایسے قطعی دلائل ہیں جن کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔

۲۔ یا وہ دلائل بجاے خود صحیح ہیں، مگر ان سے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا ابطال نہیں ہوتا۔ دلیل کے دونوں مقدمات میں سے جو مقدمہ بھی معلوم نہ ہو وہ دلائل و مقدمات معلومہ قطعیہ کا معارض نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اعتراض کے متعلق ثابت کر دیں کہ واضح اور قطعی نہیں ہے تو پھر کسی گمراہ کرنے والے شبہ کا جواب دینا ہمارے لیے ضروری نہ ہوگا۔ جیسے کوئی شخص اگر بدیہی طور پر معلوم ہونے والے حقائق کا انکار کر دے تو ہم پر اس کے احقانہ فعل کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہم کسی کو اس بات کا پابند نہیں بنا سکتے کہ جو بات دلائل قطعیہ سے ثابت ہو؛ اسے دلائل ظنیہ سے رد کرے؛ خواہ وہ محقق ہو یا مناظر۔ بلکہ اگر اس پر اس شبہ کا فاسد ہونا ظاہر ہو جائے اور اسے دوسروں کے سامنے بیان کر دے تو اس سے علم و معرفت اور حق کو تقویت ملے گی۔ تحقیق اور مناظرہ کے میدان میں اگر شبہ ظاہر نہ ہو تو یقین کو شک کی بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم شیعہ کے شکوک و شبہات کی وجہ فساد و بطلان بھی واضح کر دیں تو یہ علمی اضافہ کا موجب ہے اور مناظرہ کے دوران اس سے حق کی تائید بھی ہو جاتی ہے۔
ہم ائمہ ثلاثہ کے استحقاق امامت کے متعلق بہت سے دلائل عنقریب ذکر کریں گے۔ اور یہ ثابت کریں گے وہ امامت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔

فصل:

[قول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور استدلال باطل]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”سبب اول: ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: بسا اوقات میرا اور شیطان کا سامنا ہوتا ہے، اگر میں سیدھا رہوں تو میری مدد کیجیے؛ اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کیجیے۔ خلیفہ و امام کا اصلی کام رعیت کی تکمیل ہے بنا بریں وہ ان سے اپنے کمال کا مطالبہ کیوں کر سکتا ہے؟“ [ابن کلام الراضی]
[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

[پہلا جواب]: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: ”مجھے ایک شیطان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ غصہ ہے، جب میں اس میں گرفتار ہو جاؤں تو مجھ سے اجتناب کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم سے خندہ پیشانی سے پیش نہ آ سکوں۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جب تک میں اللہ کا مطیع رہوں، میری اطاعت کرتے رہوں، جب اللہ کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔“^①

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ صدیق کا یہ قول لائق صدمہ و ستائش ہے۔ ہم آگے چل کر اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

① سیرۃ ابن ہشام (ص: ۶۷۱)

[دوسرا جواب:] آپ ﷺ نے جس شیطان کا ذکر کیا ہے کہ وہ مجھے مغلوب کر دیتا ہے؛ اس سے مراد وہ شیطان ہے جو غصہ کے وقت لاحق ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ غصہ کی حالت میں اپنی رعایا کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ پس آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ غصہ کی حالت میں ان سے دور رہیں۔

آپ کا یہ فعل تو حدیث رسول اللہ ﷺ کے بالکل مطابق ہے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

”جب قاضی پر غصہ طاری ہو تو وہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ صادر نہ کرے۔“^①

سورسول اللہ ﷺ نے غصہ کے وقت دو افراد کے مابین فیصلہ کرنے سے منع کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مراد بھی یہی تھی۔ اسی لیے اس حالت میں رعایا کو متنبہ رہنے کا حکم دیا۔ اور سمجھایا کہ وہ غصہ کی حالت میں کسی فیصلہ کی طلب نہ کریں؛ اور نہ ہی اس حالت میں کوئی مقدمہ لے کر آئیں۔ یہ بات سراسر اللہ تعالیٰ اور اس رسول ﷺ کی اطاعت پر مبنی ہے۔

[تیسرا جواب:] غصہ سب بنی نوع انسان کو لاحق ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خود سید البشر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”یا اللہ! میں ایک بشر ہوں؛ اور مجھے بھی اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے دوسرے انسانوں کو؛ اور میں آپ سے عہد لیتا ہوں جس کے خلاف آپ نہیں کریں گے؛ میں جس مؤمن کو ایذا دوں؛ یا برا کہوں یا ماروں؛ تو آپ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیں؛ اور قیامت کے دن اسے اپنی نزدیک ہونے کا سبب بنا دیں۔“^②

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

”دو آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ناراض کیا، جس کے نتیجہ میں آپ نے ان پر لعنت بھیجی اور سخت ست الفاظ کہے۔ جب وہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ان دونوں کو کوئی خیر نہ ملی۔ آپ نے فرمایا: ”کیوں؟“ میں نے عرض کیا: ”اس لیے کہ آپ نے ان پر لعنت کی اور انہیں برا بھلا کہا۔“ تو آپ نے فرمایا:

”کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے اپنے پروردگار سے جو شرط رکھی ہے۔ میں نے یہ دعا کی ہے: ”[اے اللہ!] میں بھی ایک آدمی ہوں؛ جس مسلمان پر بھی میں لعنت کروں یا اسے برا بھلا کہوں تو تو اسے پاک کر دے؛ اور اجر عطا فرما۔“^③

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے اپنے پروردگار سے شرط رکھی ہے کہ میں بھی ایک آدمی ہوں؛ ایسے خوش ہوتا ہوں؛ جیسے کوئی بھی آدمی خوش ہوتا ہے؛ اور غصہ بھی ہوتا ہوں؛ جیسے کوئی بھی انسان غصہ ہوتا ہے۔ پس اپنی امت میں سے جس کسی پر میں بددعا کروں؛ اور وہ اس کا مستحق نہ ہو تو اس بددعا کو طہارت پاکیزگی اور قربت کا ذریعہ بنا دے۔“^④

① صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب هل يقضي القاضي او يفني و هو غضبان (حدیث: ۷۱۵۸)، صحیح مسلم، کتاب الأفضیة۔ باب كراهة قضاء القاضي و هو غضبان (حدیث: ۱۷۱۷)

② صحیح البخاری ۷۷/۸، کتاب الدعوات؛ باب: قول النبي ﷺ من أذيتك فاجعله له زكاة و رحمة۔ صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب من لعنه النبي ﷺ..... (حدیث: ۲۶۰۱/۹۱، ۲۶۰۳)۔ سنن أبي داود ۴/۲۹۸۔

③ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب من لعنه النبي ﷺ (حدیث: ۲۶۰۰)۔

④ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب من لعنه النبي ﷺ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں اور انکے غصہ کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے۔ [اعراف: 154]
جب غصہ کا واقع ہونا انبیاء کرام علیہم السلام میں عیب نہیں سمجھا جاتا تو امامت میں کیسے عیب ہو سکتا ہے؟ جب کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی نرمی اور بردباری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ قرار دیا تھا۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دینی امور میں ان کی سختی کے لحاظ سے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہم السلام کے مشابہ قرار دیا تھا۔ جب یہ سختی امامت کے منافی نہیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سختی امامت کے منافی کیونکر ہو سکتی ہے۔

چوتھی بات: اس اجتہاد کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غرض یہ تھی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تو اب بتائیں کہ کامل کون ہوا؟ وہ جو اپنی نافرمانی کرنے والے پر غیض و غضب کا اظہار کرے، اس سے برسر پیکار جنگ ہو اور قتال باسیف کرے؟ [یا پھر وہ انسان جو اپنی نافرمانی کرنے والے کو آرام سے سمجھا دے کہ مجھ سے دور رہتا کہ غصہ میں کسی تکلیف کا ارتکاب نہ ہو جائے]۔ پس اگر کہا جائے کہ امام کی نافرمانی اور اس کو غصہ دلانے کے سبب وہ اس بات کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان سے قتال کیا جائے تو ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے یا آپ کو تکلیف دے تو آپ اس کی سرزنش کر سکتے ہیں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے مخالف کی تادیب و سرزنش کے مجاز ہیں۔ [لیکن حضرت ابوبکر نے ایسا نہیں کیا]۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مستحق ہیں تو یہ کہنا درست نہیں کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے اور انہیں غصہ دلائے اس سے تو قتال جائز ہے، مگر جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے تو اس کی تادیب و تربیت جائز نہیں۔“
پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فعل کی نسبت زیادہ کامل ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوبرزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ کسی شخص سے ناراض ہوئے، تو وہ شخص درشت کلامی پر اتر آیا۔ میں نے کہا: اے خلیفہ رسول! آپ مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن اڑا دوں؟ میرے ان الفاظ سے ان کا سارا غصہ جاتا رہا، وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور مجھے بلا لیا:..... اور فرمایا: ”اگر میں تمہیں اجازت دیتا تو تم یہ کر گزرتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور کرتا: آپ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم یہ محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں۔ یعنی محض اپنی نافرمانی کی وجہ سے کسی مسلمان کو قتل کر دیا جائے۔“ ❶

علماء کرام رحمہم اللہ کے اس حدیث کی شرح میں دو قول ہیں:
پہلا قول یہ ہے کہ: نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کو گالی دینے والے کو قتل کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں۔
دوسرا قول یہ ہے کہ: ”کسی انسان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے علم و اجتہاد سے لوگوں کے خون کے فیصلے کرے سوائے رسول اللہ ﷺ کے۔“

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت نہ کی تو آپ نے اپنے ہاتھ سے تو درکنار اپنی زبان سے بھی انہیں تکلیف نہیں دی۔ اور دوسرے لوگ جیسے حضرت علی وغیرہ رضی اللہ عنہم نے بھی چھ ماہ تک آپ کی بیعت نہ کی تھی۔ مگر آپ نے ان میں

سے کسی ایک کو بھی ذرا بھر بھی تکلیف نہیں دی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو اپنی بیعت پر مجبور کیا۔ یہ سب ان کے کمال عدل اور معراج تقویٰ کی وجہ سے تھا۔ اور کمال احتیاط تھی کہ کہیں پر امت کو کوئی ذرہ بھر بھی تکلیف نہ پہنچے۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ جب مجھے غصہ لاحق ہو تو مجھ سے دور رہا کرو۔

پانچویں بات: صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کے ساتھی جن [شیطان] کو مسلط کیا گیا ہے۔“

صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کے ساتھ بھی جن ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ”ہاں! مگر میں بتوفیق الہی اس سے محفوظ رہتا ہوں، اور وہ مجھے اچھی بات ہی کا حکم دیتا ہے۔“ [مسلم ۲۱۶۷]

حدیث صحیح میں حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے آپ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا میرے ساتھ بھی شیطان ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر عرض کی: کیا وہ ہر انسان کے ساتھ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں! تو انہیں نے پھر عرض کی: کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! مگر میرے رب نے اسے میرے لیے مسخر کر دیا ہے؛ اور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔“ ❶

علماء کرام رحمہم اللہ کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ وہ میرا مطیع و فرمانبردار ہو گیا ہے۔ بعض علماء کرام نے یہ لکھ دیا کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ: یہاں تک کہ میں مسلمان ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے معنی بدل دیا۔ اور بعض علماء کرام نے لکھ دیا کہ: وہ شیطان مؤمن ہو گیا؛ تو انہیں نے لفظ کو بدل دیا۔

ایسے ہی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کر دیا تو آپ نے فرمایا:

﴿هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ﴾ [القصص ۱۵]

”یہ تو شیطانی کام ہے یقیناً شیطان دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے۔“

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم نے کہا تھا: ﴿وَمَا آتْسِنِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَكَ﴾ [الکہف ۶۳]

”اور مجھے تو شیطان نے ہی بھلا دیا کہ میں اسے یاد رکھتا۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا رضی اللہ عنہما کے قصہ میں فرمایا ہے:

﴿فَازَّ لَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾ [البقرة ۳۶]

”شیطان نے آدم و حوا دونوں کو ورغلا دیا۔ اور جس حالت میں وہ تھے انہیں وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیا۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَسَّوَسَ لَّهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا﴾ [اعراف ۲۰]

”پھر شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ان سے چھپائی گئی تھی انہیں کھول دکھائے۔“

پس جب شیطان کا لاحق ہونا انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت میں عیب شمار نہیں ہوتا؛ تو خلفاء کرام کی خلافت میں کیسے عیب شمار ہو

سکتا ہے؟

اور اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرے کہ مذکورہ نصوص میں تاویل کی گئی ہے [یعنی وہ اپنے ظاہر پر نہیں؟] تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ”پھر کسی دوسرے کے لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قول میں تاویل کرنا بھی درست ہے۔ اس لیے کہ آپ کے ایمان و علم و عمل، تقویٰ و طہارت پر بہت سارے دلائل موجود ہیں۔ اور جب کوئی ایسا مجمل لفظ وارد ہو جو کہ معلوم شدہ حقیقت کے خلاف ہو تو اس کی تاویل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

رہا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ: ”اگر میں راہ استقامت پر قائم رہوں تو میری مدد کرنا اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔“ آپ کے کمال عدل و انصاف اور تقویٰ کی دلیل ہے۔ اور ہر حاکم پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں آپ کی اقتداء کرے۔ اور رعایا پر بھی واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے ائمہ و حکام کے ساتھ اسی کی روشنی میں سلوک کریں۔ یعنی اگر حاکم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم ہو تو ان کی مدد کریں اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو رہی ہو اور وہ راہ حق سے ڈمگ رہے ہوں تو ان کی رہنمائی و اصلاح کا کام کریں۔ اگر وہ ظلم کا ارادہ کرے تو جہاں تک ہو سکے تو اسے روکیں۔ اگر حاکم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا حق کا پیروکار ہوگا تو عوام پر ترک نصیحت کے لیے کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور اگر ظلم کو روکنا کسی بڑے فساد کے بغیر ممکن نہ ہو تو پھر اس صورت میں چھوٹی برائی کو ختم کرنے کے لیے بڑی برائی کو اختیار نہ کیا جائے۔ پس چھوٹے اور کم شر کو بڑے شر سے ختم نہ کیا جائے۔

[اشکال]: رہا شیعہ کا یہ قول کہ ”امام کا کام رعیت کو کمال تک پہنچانا ہے۔ تو پھر امام رعایا سے طلب کمال کیسے کر سکتا ہے؟“

[جواب]: اس کے متعدد جواب ہیں:

پہلا جواب: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ امام کا کام رعایا کی تکمیل کرنا ہے، اور رعایا اس کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ یہ درست نہیں اس لیے کہ امام و رعیت دونوں باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور بڑ و تقویٰ میں ایک دوسرے کے معاون ہوا کرتے ہیں۔ اور گناہ اور نافرمانی کے کام میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؛ جیسے لشکر کا سالار؛ قافلہ کا امیر؛ نماز کا امام؛ حج کا امیر۔ دین کی معرفت تو رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی گئی ہے۔ لہذا امام کا کوئی الگ دین نہیں ہوتا جو اس کیلئے خاص ہو۔ البتہ جزئیات میں اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن جب حق بالکل واضح ہو تو پھر اس کے مطابق کا حکم بھی کرے۔ اور اگر یہ حکم صرف امام کے لیے واضح ہو تو اسے چاہیے کہ لوگوں کے سامنے بھی اسے واضح اور بیان کرے۔ اور لوگوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت بھی کریں۔ اور اگر حکم مشتبہ ہو تو ان پر واجب ہوتا ہے کہ آپس میں مشاورت کریں یہاں تک کہ حق ان کے سامنے واضح ہو جائے۔ اور اگر اجتہادی فیصلہ رعایا میں سے کسی ایک کا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ امام و حاکم کو بتادے۔ اور اگر سب کا اجتہاد مختلف ہو تو اس صورت میں امام کے اجتہاد کی اتباع کی جائے گی۔ کیونکہ امام کی رائے کو ترجیح دینا ضروری ہے اور اس کے برعکس کرنا ممتنع ہے۔

یہ اسی طرح ہے جیسے روافض میں سے امامیہ کا قول امام معصوم کے نائبین کے بارے میں ہے کہ انہیں کلیات معلوم ہو چکے ہیں تو ان پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ اجتہاد کے ذریعہ جزئیات معلوم کریں۔ اور اسی طرح ہر امام رسول اللہ ﷺ کا نائب

ہوتا ہے جس کی عصمت و پاکدامنی پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ کسی اور کے نائب کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے نائب اتباع کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور آپ کے نائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو نبھائیں جو ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے نبھائی تھی؛ یہاں پر خلیفہ بننا مراد نہیں۔ پس آپ ﷺ کی اطاعت ہر والی پر واجب ہوتی ہے۔ خواہ اس کو والی رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہو یا کسی اور نے۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جیسے آپ کی زندگی میں واجب تھی۔ پس جس کسی کو رسول اللہ ﷺ نے یا دیگر کسی نے والی بنایا ہو تو اس پر وہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو دیگر حکام و امراء پر واجب ہوتی ہے۔

دوسرا جواب: مخلوق کا ہر فرد اپنی تکمیل کے لیے دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ جیسے علمی بحث و مباحثہ کرنے والے؛ باہم مشورہ کرنے والے؛ اور دینی یا دنیاوی مصلحتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مشورہ کرنے والے [ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں]۔ لیکن خالق سبحانہ و تعالیٰ کے بارے میں یہ بات ممتنع ہے۔ اس لیے کہ ہر ممکن چیز اپنے وجود کے لیے کسی ایسے موجد کی محتاج ہوتی ہے جو اپنی ذات میں بے نیاز ہو اور اسے کسی دوسرے کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ تاکہ اس سے دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ جب کہ مخلوق کے ہر دو افراد میں ہر ایک فرد اپنی قوت و طاقت اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے؛ نہ ہی وہ اپنی ذات سے قوت حاصل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی دوسرے سے؛ پس اس میں کوئی دور و تسلسل والی بات نہیں۔

تیسرا جواب: یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے کہ ہمیشہ سے شاگرد بعض باتوں میں اساتذہ کو آگاہ کرتے ہیں۔ اور اساتذہ ان کی معلومات سے استفادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ شاگرد جن اصولوں کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے؛ وہ اس نے اساتذہ سے ہی حاصل کئے تھے۔ یہی حال صنعت کاروں اور دوسرے لوگوں کا بھی ہے۔

چوتھا جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہونے کے باوجود ان سے تین مسائل کا علم حاصل کیا۔ ہد ہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿أَحْطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ﴾ [النمل ۲۲] ”میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جس کا علم آپ کو نہیں ہے۔“

اب کہاں [اللہ کے نبی] حضرت سلیمان علیہ السلام اور کہاں میاں ہد ہد [ایک پرندہ]۔

ہمارے نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ان کی رائے کے مطابق رجوع کیا کرتے اور عمل بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس جگہ پڑاؤ ڈالنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ تو پھر ہم یہاں سے تجاوز نہیں کر سکتے؛ یا پھر یہاں پر پڑاؤ ڈالنا محض جنگی تدبیر اور ایک چال ہے؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ محض رائے؛ جنگی تدبیر اور ایک چال ہے۔“ اس پر حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تو پھر یہ جگہ جنگی پڑاؤ کے قابل نہیں ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ان کی رائے کے مطابق رجوع کیا۔

اسی طرح غزوہ خندق کے موقع پر آپ کی رائے یہ تھی کہ قبیلہ غطفان سے مدینہ کی آدھی کھجوروں کے بدلہ میں صلح کر لیں؛ اور لڑائی سے پیچھے ہٹ جائیں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا

کرنے کا حکم دیا ہے تو ہم نے سن لیا [اور مان لیا] ہم اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔ اور اگر آپ نے فقط ہماری مصلحت کی خاطر ایسا کیا ہے تو پھر وہ لوگ جاہلیت میں بھی ایک کھجور بھی خریدے یا اجرت پر لیے بغیر نہیں لے سکتے تھے؛ اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے عزت بخشی تو پھر کیا ہم انہیں اپنی کھجوریں دیں گے؟ اللہ کی قسم ہم انہیں اپنی تلواروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیں گے۔“ اور اس طرح کی دیگر باتیں بھی ہوئیں؛ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے قبول کر لیا۔“

غزوہ تبوک کے موقع پر [راستہ میں] جب آپ ﷺ نے سواری کے اونٹ ذبح کرنے کو کہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اس کے بجائے ایسا کیا جائے کہ: سب لوگوں کا توشہ جمع کیا جائے اور آپ ﷺ اس میں برکت کے لیے دعا کر دیں تو آپ ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرمایا۔

اور جب آپ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جوتی دیکر بھیجا کہ جو بھی اس دیوار کے پیچھے ملے اور وہ لا مالہ لا لہ اللہ کی گواہی بھی دیتا ہو تو اسے جنت کی خوشخبری سنا دو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ پھر لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے [اور عمل نہیں کریں گے] تو آپ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ انہیں منع کریں کہ ایسا اعلان نہ کیا جائے، تو آپ نے یہ مشورہ بھی قبول فرمایا۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر اس معاملہ میں ان کی رائے قبول نہیں کیا کرتے تھے جس میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی منصوص حکم نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جب ان پر حکم واضح ہو جاتا تھا تو پھر مخالفت کرنے والے کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب آپ نے مرتدین سے قتال کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچنے کے خوف و اندیشہ سے ایسا کرنے سے منع کیا؛ اور ان لوگوں سے قتال کرنے سے بھی منع کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی روک لی تھی۔ اور ایسے ہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو روانہ کرنے سے بھی منع کیا تھا؛ مگر آپ نے کوئی بات نہیں مانی؛ اور دلائل سے اپنے فعل کو درست ثابت کیا۔

اور جزئی امور میں جن کا منصوص ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اس سے محض علت یا مصلحت مراد ہوتی ہے؛ تو ان میں وہ بہر حال انبیاء کرام علیہم السلام کے درجہ سے بلند نہیں ہو سکتے۔

پانچویں بات: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس کلام نے امت کی نظروں میں آپ کی عزت اور مقام و مرتبہ کو بڑھایا ہے۔ اور امت نے نبی کریم ﷺ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی تعظیم کسی کی بھی نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی کی اس طرح اطاعت کی جس طرح آپ کی اطاعت کی۔ اس میں انہیں نہ ہی کسی چیز میں کوئی رغبت تھی اور نہ ہی کسی بات کا کوئی خوف تھا۔ بلکہ جن لوگوں نے بیعت رضوان کے موقع پر درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی؛ انہوں نے خوشی خوشی بیعت کی تھی۔ وہ آپ کی فضیلت اور استحقاق کا اقرار کرتے تھے۔ پھر یہ کہ ہمیں کسی ایک بھی ایسے مسئلہ کا علم نہیں ہو سکا کہ آپ کے عہد میں لوگوں کے مابین اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہو اور آپ کی وضاحت اور بیان سے؛ آپ کی طرف رجوع کرنے سے وہ مسئلہ حل نہ ہوا ہو۔ اس معاملہ میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے؛ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں آپ کے قریب تر تھے؛ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نمبر آتا ہے۔

جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی؛ نہ تو رعایا نے ان کو تقویت پہنچائی اور نہ ہی آپ رعایا کی اصلاح کر سکے۔ [اب انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ] ان دونوں میں سے کس حاکم کے ذریعہ مقصود امامت و حاکمیت حاصل ہوا؟ اور دونوں میں سے کس نے دین کو زیادہ قائم کیا؛ مرتدوں کی راہ میں بند باندھا؛ کفار سے قتال کیا؛ اور تمام اہل ایمان لوگ بھی آپ کے عہد مسعود میں متفق اور یکجا ہی رہے۔ اب ان دونوں انسانوں کو برابر وہی کہہ سکتا ہے جو انتہائی درجہ کا احق اور جاہل [و متعصب] اور بد دین ہو۔ [چہ جائے کہ مفضل کو افضل سمجھے]۔

[جہاں تک کامل بنانے کا تعلق ہے تو وہ اللہ غنی کا کام ہے، جو کسی کا دست نگر نہیں۔ نبی کریم ﷺ بھی صحابہ سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔]

فصل:

[بیعت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور شیعہ اعتراض]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: سبب دوم: اور ”عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا، جس کی برائی سے اللہ نے بچا لیا۔ اگر کوئی شخص پھر ایسا کام کرے تو اسے قتل کر دو۔ اس کا عاجلانہ [جلد بازی میں] ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بیعت کسی صحیح رائے سے وجود میں نہیں آئی۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگی۔ اور پھر اس کا اعادہ کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ یہ قول ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر طعن کے مترادف ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”مجھے پتہ چلا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں، اگر عمر رضی اللہ عنہ فوت ہو چکے ہوتے تو میں فلاں شخص کی بیعت کرتا۔ کوئی شخص دھوکہ میں آ کر یوں نہ کہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا، جو پایہ انجام کو پہنچا۔ بے شک بات یونہی تھی مگر اللہ نے اس کی برائی سے بچا لیا۔ تم میں سے ایک شخص بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں، جس کی خاطر گردنیں کٹوائی جائیں جیسا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے کیا جاسکتا تھا۔ جس شخص نے کسی کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر بیعت کر لی تو اس کی بیعت نہ کی جائے۔ اس خوف سے کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے جس وقت اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات دے دی تو اس وقت وہ ہم سب سے بہتر تھے۔“

پھر وہ روایت ذکر کی جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ تھے:

”میں تمہارے لئے ان دو آدمیوں میں سے ایک پر راضی ہوں ان دونوں میں کسی کی بیعت کر لو۔“ چنانچہ انہوں نے میرا اور ابو عبیدہ بن جراح کا ہاتھ پکڑا۔ آپ اس وقت ہم دونوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔

[عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں]: مجھے اس کے علاوہ انکی کوئی بات ناگوار نہ ہوئی؛ اللہ کی قسم! میں اس جماعت کی سرداری پر جس میں ابو بکر ہوں اپنی گردن اڑائے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ کہ میرا یہ نفس موت کے وقت مجھے اس چیز کو اچھا کر دکھائے جس کو میں اب نہیں پاتا ہوں۔ [یہ مکمل حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیعت اچانک ہو گئی تھی؛ اس کے لیے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے لیے متعین تھے؛ اس لیے انہیں لوگ جمع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس لیے کہ یہ بھی لوگ جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی ترجیح اور استحقاق پر لوگوں کا ایسا اجماع ہو جیسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تھا۔ پس جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہو کر کسی کی بیعت کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو۔ اور انہوں نے اس کے شر سے پناہ نہیں مانگی، بلکہ یہ بتایا ہے کہ اجماع کی بدولت اللہ تعالیٰ نے فتنہ کے شر سے بچالیا۔

فصل:

[خلفاء ثلاثہ پر کم علمی کا بہتان]

[اشکال]: رافضی کا کہنا ہے کہ: سب سوم: خلفاء ثلاثہ کا علم میں کم تر ہونا اور اکثر واقعات میں ان کا حضرت

علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ [اسی کلام اراضی]

[جواب]: یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ علم حاصل کیا ہو۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے روایات اخذ کیں؛ ان کی پیروی کی؛ اور ان کی سیرت کی اتباع کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ استفادہ کیا ہے؛ لیکن اس کی مقدار اس سے بہت کم ہے جو استفادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگرچہ علم میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کم تھے؛ لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کے محتاج نہ تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زکوٰۃ وصول کرنے والے کارندوں کی شکایت بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کی؛ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ [زکوٰۃ] اور صدقات کے مسائل پر مشتمل ایک کتاب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

انہوں نے سچ کہا تھا؛ اس لیے کہ زکوٰۃ کے نصابوں اور مقررہ مقدار مال جو زکوٰۃ میں ادا کیا جائے، یہ سب آپ ﷺ سے توقیفاً ثابت ہے۔ جس میں کسی رائے کو کوئی دخل نہیں۔ اور یہ چارمآخذ سے حاصل کیا گیا ہے۔ پہلامآخذ: اور اس میں علماء مسلمین کی نظر میں سب سے زیادہ صحیح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب ہے جسے انہوں نے انس بن مالک کے لیے لکھا تھا۔ اور اسی کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت بھی کیا ہے۔ اور اکثر ائمہ کے ہاں اسی پر عمل ہے۔ دوسرمامآخذ: اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب کا نمبر آتا ہے۔

تیسرمامآخذ: جو کتاب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھی تھی اس میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن پر علماء کرام رحمہم اللہ میں سے کسی ایک کا بھی عمل ثابت نہیں۔ مثلاً: ”ہر بچہ بیس برس کی پانچواں حصہ واجب ہے۔“ یہ قول آپ ﷺ سے مروی متواتر دلائل کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے، یا تو وہ منسوخ

ہو گیا تھا یا پھر اس کے نقل کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔

چوتھا مأخذ: حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب ہے۔ جو انہوں نے اس وقت لکھی تھی جب انہیں نجران بھیجا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب ان سب کے آخر میں لکھی گئی۔ تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اکابر احکام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ جب کہ آپ کے دور کے قاضی بھی آپ کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ قاضی شریح، عبیدہ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے عہد کے دوسرے قاضی اس علم کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے جو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام سے سیکھا تھا۔

قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا تھا۔ ایسے ہی عبیدہ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا۔ یہ حضرات اپنے عام قضایا میں آپ سے مشورہ تک بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے پاس موجود علم کی وجہ سے وہ اس چیز سے بے نیاز تھے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرو اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اپنے اکثر مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میری اور عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ام الولد کو نہ بیچا جائے؛ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ان کے بیچنے میں کوئی قباحہ نہیں۔“ اس پر عبیدہ سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

”آپ کی رائے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور باقی جماعت کیساتھ ہو وہ ہمارے نزدیک آپ کی انفرادی رائے سے بہتر ہے۔“ یہ تو آپ کے قاضی ہیں جو اس مسئلہ میں آپ کی رائے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ حالانکہ اکثر لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع میں ام الولد کی فروخت سے منع کرتے ہیں اس لیے کہ اس بارے میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس جب وہ اس جیسے مسئلہ میں آپ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے؛ پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان باقی امور میں آپ کی طرف رجوع کرتے ہوں گے جن میں کافی وشافی نصوص وارد ہوئی ہوں۔

آپ کے قاضی فیصلہ کرتے وقت بھی آپ سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ یہ قضاۃ کوئی فیصلہ کرتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تردید کر دیتے۔ کیونکہ وہ فیصلہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول کے مخالف ہوتا۔ جیسے: جب دو چچا زاد بھائی اور دو گئے بھائی؛ ان میں جب ایک دوسرے کا مال شریک بھائی ہو تو انہوں نے اس کے لیے سارے مال کا فیصلہ دیدیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کی اور فرمایا: ”اسے چھٹا حصہ ملے گا اور باقی مال میں وہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔“ حضرت زید وغیرہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ اس وقت میں لوگ کسی ایک کے قول کے مقلد نہیں ہوا کرتے تھے۔

دادا کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو فیصلہ ہے، حضرات علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم میں سے کوئی ایک بھی اس کا قائل نہیں ہے؛ سوائے ابن ابی لیلیٰ کے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ان کے کوئی شاگردوں نے لیا ہے۔ اسی طرح حضرت زید کا قول بھی علماء کرام کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول جمہور صحابہ کرام نے لیا ہے۔ امام شافعی اور امام محمد بن نصر المروزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی کتاب مرتب کی ہے جس میں انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال جمع کیے ہیں

جنہیں مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس لیے کہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول اس مسئلہ میں کتاب و سنت کے زیادہ قریب تر ہوتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرجوح اقوال کی تعداد حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کی نسبت زیادہ ہے؛ ان کے راجح اقوال زیادہ ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات اکثر مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

فصل:

اصحاب ثلاثہ کے واقعات

[اشکال]: رافضی مصنف نے لکھا ہے: ”سبب چہارم:“ اصحاب ثلاثہ سے صادر ہونے والے واقعات ہیں؛ ان میں سے اکثر کی تفصیل گزر چکی ہے۔“ [اٹھ کلام الرافضی]

[جواب]: ہم ان واقعات کے متعلق اجمال اور تفصیل سے جواب دے چکے ہیں۔ نیز یہ کہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کئے جانے والے اعتراضات کے جوابات کی نسبت بہت آسان ہے۔ کسی بھی عادل عالم کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ اصحاب ثلاثہ پر جرح کرے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کرے۔ بلکہ اگر کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کرتا ہے تو خلفاء ثلاثہ بطریق اولیٰ اس کے حق دار ہیں کہ ان کی صفائی بھی پیش کی جائے۔ اور اگر وہ حضرات خلفاء ثلاثہ پر جرح کرتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے نشتر سے محفوظ و مامون نہیں رہ سکتے۔

اگر رافضہ اپنے قول کی وضاحت کریں تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جرح اصحاب ثلاثہ کی جرح سے زیادہ وارد ہوتی ہے؛ اور اگر واضح نہ کریں تو اس کا تناقض اور فساد ثابت ہو جاتا ہے؛ حقیقت میں یہی بات تو صحیح بھی ہے۔ اور اسی طرح کی صورتحال یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ جب وہ آپ ﷺ کی نبوت پر تو عیب جوئی کرتے ہیں، مگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہیں کرتے۔ تو جب بھی وہ آنحضرت ﷺ کی نبوت پر اشکال پیش کرتے ہیں اس سے بڑا اشکال حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر خود بخود وارد ہو جاتا ہے۔ یہی حال رافضی کا ہے۔ اس کا جو اشکال حضرات خلفاء ثلاثہ کی خلافت پر ہوتا ہے؛ تو اس سے بڑا اشکال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر وارد ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح جب کوئی فلسفی اہل مذہب پر اعتراض کرتا ہے تو اس پر بذات خود اشکال وارد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر اس شخص کا معاملہ ہے جو حق بات سے دور ہو۔ جب وہ اس شخص پر اشکال وارد کرے جو حق سے قریب تر ہو تو خود اس پر اشکال وارد ہو جاتے ہیں۔

اس مناظرہ کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اہل باطل کی طرف سے اہل حق پر جس نوعیت کا اعتراض وارد کیا جائے تو جواب میں اسی نوعیت کا اعتراض اہل باطل پر کر دیا جائے؛ یا اس سے بھی مضبوط تر اعتراض۔ کیونکہ معارضہ مفید ہوتا ہے۔ اور اس طرح اگر ٹھیک جواب معلوم ہو جائے تو یہ جواب اس اشکال کا جواب بھی بن جائے گا جو اہل حق پر وارد کیا گیا ہے۔ اگر وہ گروہ حیرت اور پریشانی میں پڑ جائے تو اس کی برائی کو دور کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہو جائے گا؛ اور کہا جائے گا جو اس

بارے میں تمہارا جواب ہے، وہی ہمارا اس بارے میں جواب ہے۔

فصل:

[شیعہ کا اعتراض: خلفائے ثلاثہ کافر تھے.....]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: پانچواں سبب: ”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة: ۲۴) ”میرے عہد کو ظالم نہ پاکیں گے۔“ اس آیت میں بتایا کہ امامت کا عہد ظالم تک نہیں پہنچ سکتا؛ اور ظالم کافر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا: ﴿الْكَاْفِرُوْنَ هُمْ الظَّالِمُوْنَ﴾ (البقرة: ۲۵۴) ”کافر ہی ظالم ہوتے ہیں۔“ آپ کی بعثت سے پہلے بلاشبہ اصحاب ثلاثہ بتوں کی پرستش کرنے والے اور کافر تھے۔“ [انہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب متعدد طرق سے دیا گیا ہے:

پہلا جواب یہ ہے کہ کفر کے بعد جب کوئی شخص صحیح طور پر مشرف بہ اسلام ہو جائے تو وہ قابلِ مذمت نہیں ہوتا۔ یہ بات نہ صرف دین اسلام بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان سے معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ يَنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ [الانفال: ۳۸]

”ان لوگوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آجائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔“

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اسلام لانے سے پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔“

ایک اور روایت میں ہے: اسلام اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور ہجرت اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اور حج اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“

دوسرا جواب: یہ ایک مسلمہ بات ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلم پیدا ہونے والا شخص کفر کے بعد اسلام قبول کرنے والے سے افضل ہو۔ [ورنہ اس کا صحابہ سے افضل ہونا لازم آئے گا]۔ یہ بات بہت سارے دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ: ”سب زمانوں سے بہتر قرن اول ہے۔ [جس میں نبی کریم ﷺ مبعوث کیے گئے تھے] حالانکہ وہ سب بعد از کفر اسلام لائے تھے۔ مگر اس کے باوجود قرن اول کے لوگ قرن ثانی کے [مسلم پیدا ہونے والے] لوگوں سے افضل تھے۔

لیکن روافض کا یہ حال ہے کہ اس مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور دلائل عقلیہ کی مخالفت کرتے ہیں؛ اور پھر ایسے قول کو اپنے لیے لازم کر لیتے ہیں جس کا باطل ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر کے ایمان کا دعویٰ کرنا؛ اور رسول اللہ ﷺ کے والدین اور چچا ابوطالب کے ایمان کا دعویٰ کرنا۔

تیسرا جواب: جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے تو قریش میں سے چھوٹا بڑا کوئی بھی مومن نہ تھا، نہ ہی کوئی مرد نہ ہی کوئی عورت اور بچہ؛ نہ ہی اصحاب ثلاثہ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب بڑے مردوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے تو بچے بھی تو ویسے ہی کیا کرتے تھے [یعنی ان کے بچے بھی بتوں کے پرستار ہوں گے] جن میں علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں اور دوسرے بچے بھی۔

اگر کہا جائے کہ بچے کا کفر ضرر رساں نہیں ہے، تو ہم کہیں گے کہ بچے کا ایمان بھی مرد بالغ کے ایمان جیسا نہیں ہے۔ اگر اصحاب ثلاثہ کے لیے ایمان اور کفر کا حکم بلوغت میں ثابت ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ایمان اور کفر کا حکم بھی بلوغت سے پہلے کا ثابت ہے۔ اور بچہ جب کافر ماں باپ کے ہاں پیدا ہو تو اس پر دنیا میں کفر کا حکم ہی لگتا ہے۔ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر وہ بلوغت سے پہلے اسلام قبول کر لے تو کیا اس کے لیے اسلام کا حکم ثابت ہو جائے گا؟ اس بارے میں علماء کرام رضی اللہ عنہم کے دو اقوال ہیں۔ البتہ اگر بالغ انسان اسلام قبول کر لے تو امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔

پس اصحاب ثلاثہ کے اسلام پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ اسلام انہیں کفر سے نکالنے والا تھا؛ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کے بارے میں دو اقوال میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اسلام انہیں کفر سے نکالنے والا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں دو قول مشہور ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ: نابالغ بچے کا اسلام قبول کرنا اسے کفر سے نہیں نکال سکتا۔

البتہ کسی بچے کا نبوت سے پہلے کسی بت کو سجدہ کرنا یا نہ کرنا معلوم نہیں۔ یہ بات تو قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ حضرت زبیر اور علی رضی اللہ عنہما نے بھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ اور اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ انہوں نے کبھی بتوں کو سجدہ کیا۔ بلکہ ایسی کوئی روایت اصحاب ثلاثہ میں سے کسی ایک کے متعلق بھی منقول نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی بت کو سجدہ کیا ہو۔ ہاں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ زمانہ جاہلیت میں قریش بتوں کو سجدہ کیا کرتے تھے تو ممکن ہے یہ بات بچوں میں بھی پائی جاتی ہو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

چوتھا جواب: مذمت کے وہ القاب قرآن میں مذکور ہیں جیسے کفر، ظلم، فسق وغیرہ؛ یہ اسی انسان پر صادق آتے ہیں جو ان پر قائم ہو البتہ جو شخص کفر کے بعد اسلام قبول کر لے؛ اور ظلم کے بعد عدل و انصاف کرنے والا بن جائے؛ فسق و فجور کے بعد نیک و صالح بن جائے تو باجماع امت اسلامیہ اس پر مذمت کے اسماء صادق نہیں آئیں گے۔ [اسلام لانے کے بعد] ان پر مدح کے الفاظ صادق آئیں گے نہ کہ مذمت کے۔

پس اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة: ۲۴)

”میرے عہد کو ظالم نہ پاکیں گے۔“ کا مطلب یہ ہے کہ میرا عہد [امامت کا منصب] عادل کو ملے گا ظالم کو نہیں ملے گا۔

پس یہ معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص ظلم و تعدی کا مرتکب ہو اور پھر وہ توبہ کر لے اور عادل بن جائے تو اسے یہ عہد مل جائے گا [اور وہ امامت کا اہل ہو سکتا ہے]، جیسا کہ وہ آیات مدح و ستائش کا سزاوار ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الْآبِرَ أَرْ لَفِي نَعِيمٍ﴾ [المطففين: ۲۲]

”نیک لوگ نعمتوں سے لذت اندوز ہوں گے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ﴾ (الدخان: ۵۱)

”اللہ سے ڈرنے والے پر امن جگہ میں ہوں گے۔“

پانچواں جواب: جو شخص یہ کہے کہ: ایک شخص ایمان لانے کے بعد بھی کافر ہی رہتا ہے وہ باجماع مسلمین خود کافر ہے۔ تو پھر مخلوق میں سب سے افضل ایمان رکھنے والوں کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کافر ہیں۔ جیسا کہ گزر چکا۔

چھنا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيْ الْمُرْسَلُونَ﴾ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَلْ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿

”بیشک ہمارے پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔ لیکن جو لوگ ظلم کریں پھر اس کے عوض نیکی کریں تو اس برائی کے پیچھے تو میں بھی بخشنے والا مہربان ہوں۔“

ساتواں جواب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴿ [الأحزاب ۷۲-۷۳]

”ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں اور زمین پر پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اٹھا لیا وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔ (یہ اس لئے) کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں عورتوں اور مشرک مردوں عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں عورتوں کی توبہ قبول فرمائے۔“

پس انسان کی جنس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ظالم اور جاہل ہے۔ اور اس میں سے توبہ کرنے والوں کا استثناء فرما دیا۔ اور کتاب اللہ کی صریح آیات بتاتی ہیں کہ تمام بنی آدم پر توبہ کرنا لازم ہے۔ اور یہ مسئلہ مسئلہ عصمت کی مانند ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے اور انہیں توبہ کی ضرورت ہوتی ہے [یا نہیں]؟ اس بارے میں کلام بہت طویل ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

فصل:

[قول ابو بکر رضی اللہ عنہ سے غلط استدلال]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: چھٹا سبب: ”ابو بکر رضی اللہ عنہ“ کا قول ہے: میری بیعت واپس کر دو، میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر آپ سچے امام ہوتے [اور آپ میں امامت کی اہلیت ہوتی] تو یوں نہ کہتے۔“ [ابھی کلام اراضی]

[جوابات]: [پہلا جواب]: ہم اس روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو بات نقل کی جائے وہ صحیح بھی ہو [ورنہ ہر قسم کی روایت کو صحیح ماننا بڑے گا]۔ بغیر صحت استدلال کے اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔“

دوسرا جواب: بالفرض اگر اس سند کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہی قول ہے؛ تب بھی اعتراض کرنے والے کے محض اس قول کی بنا پر کہ: ”امام کے لیے اپنے فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار دینا درست نہیں“ اس کی مخالفت درست نہیں؛ اس لیے کہ یہ محض ایک ایسا قول ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے واقعی ہی ایسا کہا تھا تو ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کا یہ کہنا کیونکر جائز نہیں؟ اگر آپ نے ایسا کہا بھی ہے تو اس کے خلاف نہ ہی کوئی نص پائی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے؛ لہذا یقین کے ساتھ [دو ٹوک طور پر] ہم اسے باطل نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر آپ نے یہ کہا ہی نہیں تو پھر اس قول کے منسوخ ہونے کا کوئی نقصان بھی نہیں۔

رہا مسئلہ اس کو ثابت کرنے کا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے؛ اور پھر صرف محض اس دعویٰ کی بنیاد پر اس پر جرح کرنا؛ یہ ایسے لوگوں کا کلام ہے جسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: کہ آپ کہ یہ قول حکومت سے آپ کی بے رغبتی اور آپ کے ورع و تقویٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اور آپ کے خوف خدا کی علامت ہے کہ کہیں آپ سے رعیت کے حقوق میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ یہ [قول] خود روافض کے قول کی نقیض ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

”حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حکومت کے طلب گار تھے؛ اور آپ کو ولایت کے حصول میں دلچسپی تھی۔“

فصل:

[خلافت میں انصار کا حصہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”ساتواں سبب:“ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت کہا تھا: اے کاش کہ! میں نبی کریم ﷺ سے دریافت کر لیتا کہ انصار کا بھی خلافت میں حق ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ بذات خود اپنی خلافت کو مشکوک تصور کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے تقیہ بنی ساعدہ میں خود ہی انصار کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا تھا جب انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ: ”ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر آپ میں سے ہوگا“ اور آپ نے انہیں یہ حدیث بیان کی تھی:

”الْأَيْمَةُ مِنْ قُرَيْشٍ۔“ خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔“ [ابھی کلام اراغی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ”نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی“ الْأَيْمَةُ مِنْ قُرَيْشٍ“ خلفاء قریش میں سے ہوں گے“ یہ برحق ہے۔ اور جس نے یہ کہا کہ: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس حدیث کو یا پھر اپنی خلافت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ یقیناً اس نے جھوٹ بولا۔ اور جس نے یہ کہا کہ: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ: اے کاش! میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کر لیتا کہ کیا انصار کا بھی خلافت میں کوئی حق ہے؟ یقیناً یہ روایت صریح کذب ہے۔ یہ بات صحابہ کے نزدیک واضح اور شک سے بری تھی کہ امامت قریش کے ساتھ مختص ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں کثرت کے ساتھ روایات منقول ہیں۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ بات صحیح ہے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ گویا آپ کو حدیث نبوی ”الْأَيْمَةُ مِنْ قُرَيْشٍ“ خلفاء قریش میں سے ہوں گے“ کا علم نہ تھا۔ آپ نے اجتہاد کیا اور آپ کا اجتہاد موافق نص ثابت ہوا۔ پھر اس کے باوجود آپ تمنا کرتے تھے کہ اس اجتہاد کے ساتھ نص بھی موجود ہوتی تو اس موقف کو مزید تقویت ملتی۔ یہ آپ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ آپ کا اجتہاد نص کے بالکل موافق ٹھہرا۔ اور اس میں آپ کے ورع کی دلیل ہے کہ آپ کو نصوص کی خلاف ورزی سے ڈرتے تھے اسی لیے آپ کو یہ خوف تھا۔ پس اس میں قدرج یا اعتراض کی کون سی بات ہے؟ [بلکہ اس قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی کوئی نص موجود نہ تھی۔]

فصل:

[سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خانہ تلاشی کا واقعہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”آٹھواں سبب: ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت حسرت بھرے الفاظ میں کہا تھا کہ اے کاش! میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی تلاشی نہ لیتا۔ اور اے کاش! میں ثقیفہ بنی ساعدہ میں دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیتا، وہ امیر ہوتا اور میں وزیر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی وزیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی تلاشی لی تھی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔“ [ابھی کام اراغی]

[جواب]: ہم شیعہ مصنف سے کہتے ہیں: قدرح اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک اس کے الفاظ ایسی صحیح روایت سے ثابت نہ ہوں جو کہ واضح طور پر موجب قدرح ہوں۔ جب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی منقہ ہوگی تو پھر قدرح کا وارد ہونا خود بخود منقہ ہو جائے گا۔ تو اس وقت کیا کہہ سکتے ہیں کہ جب دونوں باتوں کا ہی کوئی بھی ثبوت ہی نہ ہو [لہذا پہلے وہ اس روایت کی صحت ثابت کرے]۔

ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ وزیر کو کسی قسم کا الم و رنج نہیں پہنچایا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا تھا جو آپ کی بیعت کیے بغیر فوت ہو گئے تھے۔ بفرض محال یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ معلوم کرنے کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خانہ تلاشی لی تھی کہ اس میں بیت المال کی کوئی چیز موجود نہ ہو جس کی تقسیم کرنے کا حکم آپ کو دیا گیا تھا۔ وفات کے وقت یہ خیال آیا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ رہ گیا ایذا رسائی کا معاملہ؛ تو اس پر تمام اہل دین و اہل علم کا اتفاق ہے کہ کوئی ایسا واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ جہلاء بیان کرتے ہیں کہ: ”صحابہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر منہدم کر دیا اور آپ کو اس قدر پینا اور پیٹ پر مارا تھا کہ آپ کا حمل ساقط ہو گیا۔“ اور جہاں بھر کے حقائق [بیوقوف لوگ] اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ [کیا کوئی سلیم عقل انسان باور کر سکتا ہے کہ امت کے چیدہ و برگزیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک معمولی بات کی وجہ سے اپنے پیغمبر ﷺ کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا؟] یہ دعویٰ جھوٹ گھڑنے والے کذابین کی کارروائیوں کا شاخسانہ ہے اور اس کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ قصہ ان لوگوں میں ہی پذیرائی اور مقبولیت پاسکتا ہے جو جانوروں کی جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ [اللہ اس واقعہ کو گھڑنے والے پر اور اس پر جس نے رفض کا عقیدہ ایجاد کیا لعنت بھیجے]۔

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ قول کہ: ”ہائے افسوس کہ! میں ان دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیتا، وہ امیر ہوتا اور میں وزیر۔“

ہم سب سے پہلے کہتے ہیں: مصنف نے اس قول کی کوئی سند ذکر نہیں کی اور نہ ہی اس کی صحت بیان کی ہے۔ بالفرض مان لیجیے کہ اگر آپ نے یہ کہا بھی ہے تو یہ آپ کے زہد و ورع اور خوف الہی کی نشانی ہے۔

فصل:

[جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”نویؒ نے جیش اسامہ کو تیار کرنے کا حکم دیا تھا؛ اور بار بار اس لشکر کو روانہ کرنے کا حکم دیا۔ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لشکر میں اس لیے روانہ نہ کیا تاکہ آپ کے بعد کوئی اور شخص خلافت پر قابض نہ ہو جائے؛ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بات قبول نہ کی۔“

[جواب]: اس کے جواب میں کئی پہلو ہیں:

پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے، یہ روایت صاف جھوٹ ہے۔ یہ واقعہ نہ ہی کسی معروف سند سے روایت کیا گیا ہے اور نہ ہی علماء کرام میں سے کسی ایک نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کسی نقلی دلیل سے احتجاج اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب اس کی صحت معلوم ہو جائے، ورنہ جس کی مرضی جو چاہے کہتا پھرے۔

دوسری بات: اس روایت کے جھوٹ ہونے پر تمام علماء کرام کا اجماع ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ یا عثمان رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں ہر گز شامل نہ تھے، البتہ ایک قول کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں موجود تھے۔ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام صلوٰۃ مقرر کیا تھا؛ وقت انتقال تک آپ ہی امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ جس روز آپ کی وفات ہوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو صبح کی نماز پڑھائی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے تھے آپ ﷺ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔^۱ پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شامل تھے؟

تیسری بات: اگر نبی اکرم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تو صحابہ آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ صحابہ کرام اللہ و رسول کے سچے اطاعت گزار تھے اور وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے تھے کہ بصراحت نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ خلیفہ کی جگہ از خود کسی اور کو مقرر کر دیں، اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کریں۔ حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر دو تہائی مسلمانوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑی؛ مگر ان میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے خلیفہ ہونے کی نص موجود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سارے صحابہ آپ کے ساتھ مل کر جنگ کرتے۔

چوتھی بات: پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نمازیں پڑھانے کا حکم دیا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہیں دیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا مقصود ہوتا تو آپ مرض الموت میں ان کو امام صلوٰۃ مقرر فرماتے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کی اجازت نہ دیتے۔ اور ایسے ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر نہیں کیا۔

① صحیح بخاری، کتاب الاذان۔ باب اهل العلم والفضل احق بالامامة، (حدیث: ۶۸۰)، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب استخلاف الامام اذا عرض له عذر (حدیث: ۴۱۹)۔

بلکہ صحیحین کی روایت میں ہے: جب رسول اللہ ﷺ بنی عمرو بن عوف کے مابین صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”جب نماز کا وقت ہو جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔ اور ایسے ہی اپنی بیماری کے دن میں بھی اور جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تب بھی۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ یہ تابع بن کر آئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امام تھے جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کو حکم دیتے اور وہ آپ کی اطاعت کرتے۔ سن نو ہجری کے حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا۔ باقی لوگوں پر بھی امیر آپ ہی تھے۔ اور آپ ہی انہیں نمازیں بھی پڑھاتے تھے۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ولایت منصب]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: دسواں سبب: ”نبی کریم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی منصب عطا نہیں کیا تھا، اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر کر کے بھیجا تھا۔“ [ابن کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ کا قول کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ: معاملہ اس دعویٰ کے برعکس ہے۔ جو ولایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تفویض کی گئی تھی؛ اس میں کوئی دوسرا آپ کا سہم و شریک نہیں۔ یہ ولایت حج ہے۔ یہ منصب عالی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تفویض کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا بہت سے لوگوں کو مختلف علاقوں کی امارت عطا کی گئی تھی۔

دوسری وجہ: اس بات پر شیعہ اور اہل سنت سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو بھی ولایت تفویض کی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت ہی فروتر تھے؛ مثلاً: عمرو بن عاص و ولید بن عقبہ اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہم۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل تھے اور ولایت و امارت نہ ملنے کی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے فروتر درجہ کے تھے۔

تیسری وجہ: امارت کا نہ ملنا نقص پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ کبھی ولایت اس لیے بھی ترک کر دی جاتی ہے کہ اس کے لیے جو دوسرا مقام ہے؛ وہ اس ولایت سے زیادہ نفع بخش و سودمند ہے۔ اور انہیں اپنے پاس رکھنے کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اور مسلمان دوسرے لوگوں کی وجہ سے ان سے بے نیاز ہو سکتے تھے۔ ولایت نہ دینے کی وجہ وجہ یہ تھی کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ کے وزیروں کے مقام پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے: میں اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے۔ میں اور ابوبکر و عمر باہر نکلے۔“ اکثر و بیشتر راتوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر مسلمانوں کے امور میں گفت و شنید کیا کرتے تھے۔ [اور آپ مہمات امور میں ان سے بے نیاز نہیں ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ بھی اس سے قریب قریب تھا۔] حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل شوریٰ جیسے: حضرت عثمان، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کو کوئی ولایت تفویض نہیں کرتے تھے۔ اور یہ آپ کے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ افضل تھے جنہیں ولایت تفویض کی جاتی تھی؛ مثلاً حضرت عمرو بن العاص، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ

جب کوئی وفد آتا تو رسول اللہ ﷺ ان دونوں سے مشورہ کرتے۔ ان میں سے ایک کوئی مشورہ دیتا اور دوسرا کوئی مشورہ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ان سے بدر کے قیدیوں کے بارہ میں بھی مشورہ کیا تھا۔ اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مشورہ غالب رہا۔ اور آپ ان کے ساتھ ہی اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ بات ہر اس انسان پر عیاں ہے جو صحیح احادیث میں تدبر کرے۔ ان کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امارت حج کا واقعہ:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”گیا رھواں سبب: ”نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورۃ توبہ دے کر روانہ کیا۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس مدینہ بھیج دیں، اور خود یہ ذمہ داری ادا کریں۔ جو شخص ایک سورت یا اس کا کچھ حصہ پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا وہ خلافت و امارت کا اہل کیسے ہوگا جس میں تمام احکام پوری امت تک پہنچانے کی ذمہ داری ہوتی ہے؟“ [نہی کلام الرافضی]

[جواب:] شیعہ کا یہ قول بھی کئی وجوہات کی بنیاد پر باطل ہے:

پہلی وجہ: اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ بات افتراء محض ہے اور روایات متواترہ کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ۹ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ [یہ غلط ہے کہ آپ واپس بلا لیے گئے تھے] نہ ہی آپ کو واپس بلا گیا اور نہ ہی خود واپس آئے۔ اس سال دوران حج آپ ہی امیر حج تھے، علی رضی اللہ عنہ ان کی رعیت کے ایک فرد۔^۱

۱ اس میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ سورہ توبہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش پر متضمن ہے نبی کریم چاہتے تھے کہ اس ثناء کا اظہار حج کے موقع پر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے ہوتا کہ اللہ کے دشمن ہمیشہ کے لیے شرم سار ہوں اور جب بھی اس پر غور و فکر کریں ان کا مصنوعی دین دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ حنفیہ میں شیعہ میں سے اللہ کے دشمن شیطان الطاق نے بدحواسی کے عالم میں کہا کہ یہ الفاظ ﴿فَإِنِّي أَنَسِيتُ إِذْ هَمَّا فِي الْغَارِ﴾ اللہ کے فرمودہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ مشہور ادیب جاحظ نے اپنے استاد ابراہیم نظام و بشر بن خالد سے سن کر بیان کیا۔ (دیکھیے الفصل امام ابن حزم: ۴ / ۱۸۱) تاخرین شیعہ میں سے طافوت الکاملیہ نے حواسِ باخہ ہو کر کہا کہ آیت قرآنی ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو شامل نہیں، بلکہ یہ خالص الامایان لوگوں کے لیے مختص ہے۔ (دیکھیے کاظمی کی کتاب احیاء الشریعة فی کتب الشیعة، ص: ۶۳-۶۴)۔ سیدنا علی کو سورہ توبہ دے کر مکہ بھیجنے کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم اور ابوبکر رضی اللہ عنہما علی ایک صف میں تھے اور اعداء صحابہ ان کے مقابل دوسری جانب، ان دونوں کا اتصال دین و دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔ (علامہ خطیب) درحقیقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کو جب رسول اللہ ﷺ نے امیر المومنین بنا کر روانہ فرمایا تھا اس وقت ابھی سورہ توبہ کی یہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ابھی اثنائے سفر میں ہی تھے کہ سورہ توبہ کی چالیس آیتیں نازل ہوئیں جس کا اعلان براءت حج میں ہونا ضروری تھا، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے چچھے ہی روانہ کر دیا تاکہ اعلانِ برودت ہو سکے، لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت کو تو ذرا نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر کیا، بلکہ امارت حج بدستور سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہی اور سیدنا علی کو ان کے ماتحت رہنے دیا۔

اور ان کی اقتداء میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ آپ جہاں جاتے وہ آپ کے ساتھ جاتے اور جس بات کا حکم دیتے آپ اس کی تعمیل کرتے۔ جیسا کہ آپ کے ساتھ موجود باقی تمام لوگ کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں؛ اور نہ ہی اس میں کسی دو نے اختلاف کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہی سن ۹ ہجری کا حج رسول اللہ ﷺ کے حکم سے کروایا۔ پھر شیعہ کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا تھا؟ البتہ مشرکین سے کیے ہوئے معاہدوں کے اختتام کا اعلان کرنے کیلئے نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔ اس لیے کہ عربوں کے یہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے یا توڑنے کا کام حاکم خود کرتا یا اس کے اہل بیت میں سے کوئی شخص یہ کام انجام دیتا۔ ہر ایک سے اس کی بات قبول نہیں کر لیتے تھے۔ [تاریخ اعلان براءت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔]

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے امیر حج ہونے کے دن بزمہ مؤذنین بھیجا تاکہ ہم منیٰ میں یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) طواف کرے۔ اور ایک روایت میں ہے: ”پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ وہ سورت براءت کا اعلان کریں، علی رضی اللہ عنہ نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ میں لوگوں میں اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) کعبہ کا طواف کرے۔“ [صحیح بخاری: ج 362]

آپ فرماتے ہیں: پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کا عہد اس سال واپس کر دیا۔ حجۃ الوداع کے سال جب نبی کریم ﷺ نے حج کیا تو اس سال کسی بھی مشرک نے حج نہیں کیا۔

ابو محمد ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”حج میں جو کچھ ہوا اس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بہت بڑے فضائل ہیں۔ اس لیے کہ اس سال اس عظیم الشان اجتماع سے آپ نے ہی خطاب کیا۔ اور لوگ خاموشی سے آپ کا خطبہ سنتے رہے۔ آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی جملہ رعیت میں سے ایک تھے۔ اس سورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان اور غار کا ذکر ہے۔ سو یہ سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پڑھ کر لوگوں کو سنائی۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں انتہائی حد اور قطعی حجت ہے۔

مزید بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر بنانے کا واقعہ اس فرمان کے بعد کا ہے:

”أَمَّا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى۔“

”کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ میرے لیے بلحاظ منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ۔“

مقام حیرت ہے کہ شیعہ مصنف نبی کریم ﷺ کے سیرت و سوانح اور عصر و عہد کے واقعات سے نااہل محض ہونیکے باوجود علم و فضل کا دعوے دار ہے۔ اور یہ ان متواتر واقعات سے بھی جاہل اور لاعلم ہے جنہیں وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہیں علوم سیرت سے ادنیٰ سی شناسائی ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسے واقعات تلاش کرتے ہیں اور پھر ان میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو خاموش رہنا زبان سخن دراز کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ مگر کیا کریں اس رافضی مصنف نے بھی وہی کچھ کیا ہے جو کہ اس کے ان اسلاف نے کیا ہے جن کا یہ مقلد ہے۔ اس نے ان کے کلام کی کوئی تحقیق نہیں کی۔ اور نہ ہی

ان چیزوں کا مراجعہ کیا ہے جو اہل علم کے ہاں صرف معلوم ہی نہیں بلکہ متواتر کی حد تک معروف ہیں۔ اور خاص و عام انہیں جانتے ہیں۔ [لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو اندھا کر دیا ہو اور اس کی نیت خراب ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ مصنف کٹر شیعہ ہے؛ اور اپنے اسلاف کی راہ پر گامزن ہے جو کہ تقیہ اور کذب و افتراء سے عبارت ہے۔]

[امام کی ذمہ داری اور شیعیت:]

[دوسری وجہ:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”امام جملہ احکام شرعی امت کی طرف پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔“
[جواب:] ہم کہتے ہیں: یہ قول باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تمام شرعی احکام امت کو سکھا دیے تھے۔ اس لیے امت اس ضمن میں امام کی اتنی ہی دست نگر ہے جتنی اس جیسے دوسرے علماء کی۔ البتہ امام رسول سے حاصل کردہ احکام کو امت تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عام شرعی مسائل و احکام سے آگاہ تھے۔ جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا وہ صحابہ سے دریافت کر لیتے، مثلاً آپ نے میراث جدہ کا مسئلہ صحابہ سے دریافت کیا تھا۔ صحابہ نے بتایا کہ آپ نے جدہ کو ۱/۶ حصہ دیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کوئی قول [فتویٰ] ایسا نہ تھا جو نص سے نکلے ہو۔ البتہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے بعض اقوال مخالف نص تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف نص اقوال کی تعداد عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے اقوال کی نسبت زیادہ ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ جس حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت ابعداً لا جلیین (عدتِ وفات اور وضع حمل میں سے جس کی مدت بعید تر ہو) ہے^۱ حالانکہ سُبَّعِہُ السُّلَمِیَّة کی روایت کردہ حدیث صحیحین میں موجود ہے کہ جب انہوں نے اپنے پہلے خاوند کی وفات کے تین دن بعد وضع حمل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اب تم حلال ہو چکی ہو، جس سے چاہے نکاح کرلو۔“

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اس عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: ”ابوساہل نے کہا ہے: ”تم اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتیں جب تک زیادہ لمبی مدت کی عدت پوری نہ کرلو۔“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ابوساہل نے جھوٹ بولا۔“ [یوں نبی کریم ﷺ نے اسے نکاح کی اجازت دے دی تھی۔]

امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے اختلافات کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال بھی تھے جن کو لوگوں نے نص یا معنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا تھا۔

ان کے بعد محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے اس سے زیادہ اختلافات جمع کیے۔ جب کوفہ کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کرتے تو آپ انھوں سے احتجاج کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ کہتے تھے: ”ہم نے علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کیا

سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الجدة، (ج: ۲۸۹۴)، سنن ترمذی کتاب الفرائض باب ما جاء فی میراث الجدة، (ج: ۲۱۰، ۲۱۰۱)، سنن ابن ماجہ، کتاب الفرائض۔ باب میراث الجدة (حدیث: ۲۷۲۴)۔

۱ کتاب الام، للامام الشافعی (۷/ ۱۷۳)، سنن کبری، بیہقی (۷/ ۴۳۰)، المغنی لابن قدامة (۱۱/ ۲۸۹)۔

۲ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب ﴿وَأُولَاتِ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ﴾ (حدیث: ۵۳۱۸-۵۳۲۰)، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدة المتوفی عنها زوجها (حدیث: ۱۴۸۴، ۱۴۸۵)۔

ہے، چنانچہ ان کے لیے حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے وہ اقوال جمع کیے گئے تھے جن کو انہوں نے خود یا لوگوں نے ترک کر رکھا تھا۔ اور کہا کرتے تھے: ”جب ان مسائل میں تم دونوں سے اختلاف کرو۔ نہ کو اس لیے جائز سمجھتے ہو کہ ان کے خلاف جہت قائم ہو چکی ہے تو باقی تمام مسائل میں بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی ایسی بات معروف نہیں۔“

تیسری وجہ: علاوہ ازیں سب صحابہ نے قرآن کریم نبی کریم ﷺ سے سن کر لوگوں تک پہنچا دیا تھا، لہذا یوں کہنا ممتنع ہو جاتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تبلیغ قرآن کے اہل نہیں تھے۔

چوتھی وجہ: یوں کہنا درست نہیں کہ تبلیغ قرآن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاصہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن خبر واحد کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ نقل متواتر سے ثابت ہو۔

پانچویں وجہ: اس سال [سن نوہری میں] حج کے موسم میں مسلمین اور مشرکین سبھی نے حج کیا تھا۔ اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ آپ حج میں اعلان کر دیں کہ: ”آج کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی زنگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے۔“ جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے۔ تو پھر مشرکین کو قرآن پہنچانے کی کوئی حاجت تھی۔

فصل:

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول: رسول اللہ ﷺ کا انتقال نہیں ہوا]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: بارہواں سبب: ”عمر نے کہا تھا کہ محمد فوت نہیں ہوئے، یہ بات ان کے قلیل العلم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حاملہ عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کیا، تب عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔ ان کے علاوہ دیگر کئی احکام و مسائل ہیں جن میں آپ نے غلطی کی اور کئی رنگ بدلے۔“

[جواب]: پہلی بات: صحیحین میں ثابت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

”اُمّ سائبہ میں کچھ لوگ منہم ہوا کرتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔“

آپ ﷺ نے ایسی کوئی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ارشاد نہیں فرمائی۔ اور سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے:

”حالت خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے

ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو دودھ بچ گیا وہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ پھر آپ نے اس

خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا: ”دودھ سے علم مراد ہے۔“ (البخاری ج: ۳۶۸۱، صحیح مسلم ج: ۳۶۹۱)

[قل ازیں بھی دلائل و براہین کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علمی مقام واضح کر چکے ہیں کہ] حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد اعلیٰ الناس تھے۔ باقی رہا یہ کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ گمان کیا کہ آپ فوت نہیں ہوئے، تو یہ ایک لمحہ کے لیے تھا۔ فوری طور پر ان پر منکشف ہو گیا تھا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔ ایسے واقعات حضرت علی رضی اللہ عنہ

کو بھی پیش آئے تھے کہ انھوں نے ایک رائے قائم کی اور وہ غلط نکلی؛ بلکہ آپ کے بہت سارے قصے ایسے ہیں جو خلاف واقعہ نکلے؛ اور آپ کا انتقال اسی حال میں ہو گیا۔ اس سے ان کی امامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر مفوضہ کے مہر کے مسئلہ میں آپ کا فتویٰ کہ اگر مفوضہ مر جائے اور اس کا مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ اور اس طرح کے دیگر مسائل جو کہ اہل علم کے ہاں معروف ہیں۔

جب کہ حامل کا مسئلہ بہت آسان ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا کہ وہ عورت حاملہ ہے۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی غلطی نہیں، ہو سکتا ہے کہ جب آپ نے رجم کرنے کا حکم دیا ہو تو آپ کو اس کے حامل ہونے کا علم نہ ہو؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے آگاہ کر دیا ہو۔ تو آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو میں اس کو رجم کر دیتا اور اس کا جنین بھی قتل ہو جاتا۔ اس چیز کا آپ کو خوف محسوس ہوا۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ آپ حامل کو رجم کرنا جائز سمجھتے تھے؛ تو یہ ایسا حکم ہے جو مخفی بھی رہ سکتا ہے۔ شریعت میں تو زانیہ کے قتل کرنے کا حکم ہے۔ حمل تو اس عورت کے تابع ہے۔ جیسا کہ اگر کفار کا محاصرہ کر لیا جائے تو پھر اس میں بچے بھی قتل ہو جاتے ہیں [جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کر کے ان پر منہیق سے پتھر برسائے تھے۔ جس میں عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے۔

صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ”اگر کافروں کی بستی پر خون مارا جائے اور ان کی عورتیں اور بچے قتل ہو جائیں تو؟“ آپ نے فرمایا: ”وہ انہی میں سے ہیں۔“

اور آپ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ خواتین اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات علماء کرام کی ایک جماعت پر مشتبہ ہو گئی؛ اس لیے انہوں نے شخون مارنے سے منع کر دیا؛ اس خوف سے کہ کہیں عورتیں اور بچے قتل نہ ہو جائیں۔

ایسے ہی یہ بات بعض ان لوگوں پر بھی مشتبہ رہتی ہے جو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: رجم ایسی حد ہے جسے فوراً نافذ کرنا چاہیے؛ اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔ لیکن سنت نے ان دونوں چیزوں میں تفریق کی ہے؛ جس میں تاخیر ممکن ہے جیسے حد؛ اور جسے فوری طور پر کر گزرتا چاہیے جیسے محاصرہ اور شخون وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو عام لوگوں کی طرف بھی رجوع کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مہر کے مسئلہ میں جب ایک عورت نے کہا: کیا ہم آپ کی بات سنیں یا اللہ تعالیٰ کی بات سنیں؟ آپ نے فرمایا نہیں: اللہ تعالیٰ کی بات سنو؛ تو اس عورت نے کہا: پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأْتَيْنَاكُمْ بِحُكْمٍ فَتَقَارَءُ فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا﴾ [النساء ۲۰]

”اور ان میں کسی کو تم نے خزانہ کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔“

تو آپ نے فرمایا: ”مرد سے خطا ہو گئی اور عورت حق کو پہنچ گئی۔“

ایسے ہی آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے؛ حالانکہ آپ خود

ان سب سے بڑے عالم تھے۔ سو جب کوئی بڑا اور علم والا انسان اگر اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کی طرف کسی چیز میں رجوع کرے تو اس سے اس کی شان میں اور بڑا عالم ہونے میں قدرح واقع نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے تین مسائل سیکھے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہد ہد بنے بلقیس کی خبر دی تھی۔

صحابہ کرام میں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو نبی کریم ﷺ کو بہت سارے معاملات میں مشورہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی طرف مراجعہ کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید و موافقت میں نازل ہوئیں؛ جیسے کہ پردہ، بدر کے قیدیوں کا مسئلہ؛ اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کا ارادہ؛ اور ﴿عسی ربہ ان ینزلک﴾ اور اس طرح کے دیگر مسائل میں موافقت۔

یہ مقام و شرف نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو۔

سنن ترمذی کی روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر میں تم لوگوں میں مبعوث نہ ہوتا تو عمر مبعوث ہوتا۔“

نیز سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔“^①

{ شہادت پانے کے بعد جب عمر رضی اللہ عنہ کو چار پائی پر رکھا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی تعریف فرمائی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اے

کاش! آخری وقت میں مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اعمال کیساتھ بارگاہ ربانی میں پیش کیا جائے۔“^②

شیعہ کے نزدیک نماز تراویح بدعت:

[اعتراض] شیعہ مصنف لکھتا ہے: تیرھواں سبب: ”عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی بدعت جاری کی۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، لوگو! رمضان کی راتوں میں نفل نماز باجماعت بدعت ہے۔ چاشت کی نماز بھی بدعت ہے۔ سنت میں سے بہت تھوڑی سی چیز بہت بڑی بدعت سے بہتر ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا راستہ جہنم کو جاتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں رات کو نفل تو مساجد میں چراغ جلتے دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم نفل نماز کے لیے جمع ہوئے ہیں، فرمایا: یہ ہے تو بدعت مگر بہت اچھی بدعت ہے۔ آپ نے اس کے بدعت ہونے کا اعتراف کیا۔“

[جواب] ہم کہتے ہیں: تمام گمراہ اور بدعتی فرقوں میں شیعہ رسول اللہ ﷺ پر کذب بیانی اور افتراء پردازی کرتے ہوئے نہیں جھجکتے اور انتہائی جرأت کے ساتھ شرم و حیاء کے جذبات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسی ایسی باتیں گھڑ لاتے ہیں جو کہ آپ ﷺ نے ارشاد نہیں فرمائیں۔ اور انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ان روایات کے جھوٹ ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اور جس کو انتہائی علم نہ ہو، وہ انتہائی پرلے درجہ کا جاہل ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

إن كنت لا تدري فتلك مصيبة وإن كنت تدري فالمصيبة أعظم

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب (۱۷/۵۲)، (ح: ۳۶۸۶)۔

② صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۳۶۸۵)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۸۹)۔

”اگر آپ نہیں جانتے تو یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ اور اگر جانتے ہیں تو پھر مصیبت اس سے بھی بڑی ہے۔“

اس اعتراض کا جواب کئی زاویوں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اس کی سند کہاں ہے؟ اور مسلمانوں کی کتابوں میں سے کس کتاب میں اس کو روایت کیا گیا ہے؟ اور اہل علم میں سے کس نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے؟

دوسرا جواب: تمام اہل علم محدثین کا اتفاق ہے، اور وہ علم ضروری کے طور پر جانتے ہیں کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ پر من گھڑت جھوٹ ہے۔ جس انسان کو حدیث کا ادنیٰ سا بھی علم ہو وہ اس حدیث کے جھوٹ ہونے کو جانتا ہے۔ مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی ایک کتاب میں بھی اس روایت کو نقل نہیں کیا۔ نہ ہی صحاح میں؛ نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مسانید اور معجمات میں اور نہ ہی اجزاء میں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی سند معروف ہے۔ نہ ہی ضعیف سند نہ ہی صحیح۔ بلکہ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

تیسرا جواب: احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ عہد رسالت میں لوگ رمضان کی راتوں میں نماز تراویح ادا کیا کرتے تھے۔^① احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے دو یا تین راتوں میں لوگوں کو باجماعت تراویح کی نماز پڑھائی تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رمضان کی) ایک رات آدھے حصہ میں نکلے۔ آپ نے مسجد میں نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ صبح کو لوگوں نے اس کا ایک دوسرے پر چرچا کیا۔ دوسرے دن اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے۔ اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر صبح ہوئی تو اس کو لوگوں نے ایک دوسرے سے بیان کیا۔ تیسری رات میں اس سے زیادہ آدمی جمع ہوئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ آپ نے نماز پڑھی تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب چوتھی رات آئی تو مسجد میں لوگوں کا اس میں سانا دشوار ہو گیا لیکن آپ صبح کی نماز کے لئے نکلے جب صبح کی نماز ادا کی تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”اما بعد! مجھ سے تم لوگوں کی موجودگی پوشیدہ نہیں تھی، لیکن مجھے خوف ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے، اور تم اس کے ادا کرنے سے عاجز آ جاؤ۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حالت یہی رہی۔“^②

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان بھر روزے رکھے۔ آپ ہمارے ساتھ ایک بھی تراویح میں کھڑے نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ رمضان کی سات راتیں باقی رہ گئیں۔ ساتوں شب کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام فرمایا حتیٰ کہ رات کا تہائی گزر گیا۔ اس کے بعد چوتھی رات قیام نہ فرمایا۔ پھر اسکے بعد پانچویں شب آدھی رات تک

① معرفة السنن والآثار للبيهقي (٢/٣٠٣، ح: ١٣٦٣)۔ ② صحيح بخاری، كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان (ح: ٢٠١٢)، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان (ح: ٧٦١)۔

قیام کیا۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ ہمارے ساتھ نفل پڑھیں (تو کیا خوب ہو)۔

آپ فرمایا: ”جس نے فارغ ہونے تک امام کے ساتھ قیام کیا تو اس کا یہ قیام رات بھر کے قیام کے برابر (موجب اجر و ثواب) ہے۔ پھر اسکے بعد چوتھی قیام نہ فرمایا پھر اسکے بعد والی یعنی شب کو آپ نے ازواج اور گھر والوں کو جمع فرمایا اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے ساتھ قیام فرمایا یہاں تک کہ ہمیں فلاح فوت ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ عرض کیا فلاح کیا چیز ہے؟ فرمایا: ”سحری کا کھانا۔ فرماتے ہیں پھر آپ نے باقی مہینہ ایک رات بھی قیام نہ فرمایا۔“^①

اسے امام احمد ترمذی نسائی اور ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان میں قیام کی ترغیب دیا کرتے تھے سوائے اس کے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت تاکید کی حکم فرماتے ہوں۔ اور فرماتے کہ جو آدمی رمضان میں ایمان اور ثواب سمجھ کر قیام کرے تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصال فرما گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم اسی طرح باقی رہا۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں اسی طرح یہ حکم باقی رہا۔“^②

امام بخاری نے عبد الرحمن بن عبد القاری سے روایت کیا ہے کہ میں رمضان کی ایک رات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد گیا۔ تو دیکھا لوگ ادھر ادھر منتشر تھے۔ کچھ لوگ انفرادی طور پر نماز میں مشغول تھے۔ چند آدمی نماز باجماعت ادا کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میرا خیال ہے کہ میں ایک قاری کو مقرر کر دوں، جس کی اقتداء میں سب لوگ مل کر نماز ادا کیا کریں تو یہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ پھر میں ان کے ساتھ دوسری رات نکلا تو لوگ قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا: ”یہ بڑی اچھی بدعت ہے، جس نماز سے تم سو رہتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو تم ادا کرتے ہو، آپ کا مطلب یہ تھا کہ رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا افضل ہے۔“^③

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیام رمضان کو بدعت قرار دیا؛ اجتماع اس سے پہلے اس طرح سے نہیں ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جو کام شروع میں کیا جائے لغت کے اعتبار سے اسے بدعت کہتے ہیں۔ یہ شرعی بدعت نہیں ہے۔ اس لیے کہ شرعی بدعت جو کہ گمراہی ہے؛ وہ بدعت ہے جس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ جیسا کہ کسی ایسی چیز کو مستحب قرار دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ پسند نہ کرتے ہوں۔ اور ایسی چیز کو واجب کہنا جو اللہ تعالیٰ نے واجب نہ کی ہو۔ اور ایسی چیز کو حرام قرار دینا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام نہ ٹھہرایا ہو

① سنن ابی داؤد ۶۸/۲۔ کتاب تفریع أبواب شهر رمضان باب فی قیام فی شهر رمضان۔ سنن الترمذی ۱۵۰/۲؛ کتاب الصوم باب: ماجاء فی قیام شهر رمضان۔ وقال الترمذی: حسن صحیح۔ سنن النسائی ۲۰۲/۳؛ کتاب قیام اللیل باب: قیام شهر رمضان۔ [سنن ابن ماجہ: ح ۱۳۲۷] صحیح مسلم: ح ۱۷۷۴؛ کتاب صلاة المسافرين وقصرها؛ باب: الترغیب فی قیام رمضان هو التراویح۔ [البخاری کتاب التراویح؛ باب: فضل من قام رمضان ۳/۴۴۔

② صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۲۰۱۰)۔ اسد الغابۃ (۴/۱۸۳)۔

اس لیے کہ ان افعال کے بجالانے کے لیے خلاف شریعت اعتقاد کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ اگر کوئی انسان کوئی حرام کام کر رہا ہو اور اس کے حرام ہونے کا اعتقاد بھی رکھتا ہو تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جاسکتا۔

چوتھا جواب: اگر قیام رمضان باجماعت کوئی مذموم اور قبیح فعل ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ جب امیر المؤمنین بن گئے تھے؛ اور کوفہ آپ کا دار الخلافہ تھا تو کم از کم آپ کوفہ میں اسے بند کر دیتے۔ جب کوفہ میں بھی یہ فعل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی طرح ہی جاری رہا تو یہ اس کے مستحب ہونے کی دلیل ہے۔ بلکہ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

”اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قبر کو ایسے منور کرے جیسے آپ نے ہماری مسجدوں کو روشن کر دیا۔“^①

ابو عبد الرحمن السلمی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قاریوں کو بلا کر ان میں سے ایک قاری کو حکم دیا کہ وہ انھیں بیس رکعات پڑھائے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انھیں وتر پڑھایا کرتے تھے۔^② عرفہ ثقفی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قیام رمضان کا حکم دیا کرتے تھے، ایک امام آدمیوں کے لیے مقرر کرتے اور ایک عورتوں کے لیے، میں عورتوں کا امام ہوا کرتا تھا^③۔ امام بیہقی نے یہ دونوں روایتیں سنن میں نقل کی ہیں۔

قیام رمضان کے متعلق علماء کرام میں اختلاف ہے؛ کیا یہ نماز مسجد میں باجماعت ادا کرنا افضل ہے؟ یہ اس کا گھر میں پڑھنا افضل ہے؟ اس میں دو قول مشہور ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رضی اللہ عنہما سے بھی یہی دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ مسجد میں باجماعت تراویح پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ان میں امام لیث رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اور فقہاء کا ایک گروہ گھر میں یہ نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مبارک ہے:

”فرائض کے علاوہ مرد کی افضل ترین نماز وہ ہے جو گھر پر ادا کی جائے۔“^④

امام احمد اور دیگر علماء کرام رضی اللہ عنہم کی دلیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے فارغ ہونے تک امام کیساتھ قیام کیا تو اس کا یہ قیام رات بھر کے قیام کے برابر [موجب اجر و ثواب] ہے۔“

پہلی حدیث: ”فرائض کے علاوہ مرد کی افضل ترین نماز وہ ہے جو گھر پر ادا کی جائے“ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک اس نماز کے لیے جماعت مشروع نہ ہو مگر جب جماعت مشروع ہو جائے جیسے: نماز کسوف وغیرہ۔ تو پھر اس نماز کا مسجد میں ادا کرنا افضل ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

نیز ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اس خوف کے تحت جمع نہ کیا تھا کہ کہیں یہ نماز باجماعت ادا کرنا فرض نہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد اب اس قسم کا کوئی احتمال باقی نہ رہا۔ تو اب یہ بھی ایسے ہی ہے جیسے قرآن کا جمع کرنا وغیرہ [اس طرح کے دیگر امور]۔

جب اس نماز میں جماعت اصل میں مشروعیت کا ثبوت رکھتی ہے تو پھر اسے باجماعت ادا کرنا ہی افضل ہے۔

① اسد الغابۃ (۴/ ۱۸۳)۔ سنن کبریٰ بیہقی (۲/ ۴۹۶)، وسندہ ضعیف۔ اس کی سند میں حماد بن شعیب راوی ضعیف و منکر الحدیث ہے۔ دیکھئے: لسان المیزان (۲/ ۳۴۸)۔ سنن کبریٰ بیہقی (۲/ ۴۹۴)، مصنف عبد الرزاق (۵۱۲۵)۔

② البخاری کتاب الأذان، باب صلاة اللیل۔ صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب: استحباب صلاة النافلة فی بیتہ و جوازها فی المسجد۔

رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ: ”جو لوگ اس نماز سے سو جاتے ہیں وہ افضل ہیں“ اس سے مراد آخری رات ہے۔ کیونکہ لوگ پہلے وقت میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ یہ کلام بالکل درست اور صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس نماز کے لیے رات کا آخری حصہ افضل ہے جیسے عشاء کی نماز کے لیے پہلا وقت افضل ہے۔ اور مفضل وقت کے ساتھ کبھی کوئی ایسا عمل خاص ہو سکتا ہے جس کا دوسرے وقت کی نسبت اسی وقت میں کرنا افضل ہو۔ جیسا کہ عرفات اور مزدلفہ میں دو دو نمازیں جمع کر کے پڑھنا ہی افضل ہے؛ کیونکہ اس کے سبب نے ایسا کرنا واجب کر دیا ہے۔ اگرچہ اصل یہ تھا کہ ظہر کو اس کے پہلے وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے لیکن گرمیوں کی شدت کی صورت میں اسے ٹھنڈا کر کے پڑھنا افضل ہے۔

جب کہ جمعہ کے دن زوال کے بعد نماز جمعہ پڑھ لینا افضل ہے۔ جمعہ کے دن ٹھنڈی ہونے تک کا انتظار کرنا افضل نہیں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے میں لوگوں پر مشقت ہے۔ عشاء کی نماز میں ایک تہائی رات تک تاخیر کرنا افضل ہے۔ ہاں اگر لوگ جمع ہو جائیں اور ان پر انتظار کرنا شاق گزر رہا ہو تو پھر اس سے پہلے وقت میں ادا کر لینا افضل ہے۔ ایسے ہی اگر رمضان کے نصف کے بعد لوگوں کے اجتماع کا مسئلہ بھی ہے۔

سنن میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”دو آدمیوں کا مل کر نماز ادا کرنا اکیلے ادا کرنے کی نسبت زیادہ پاکیزہ ہے۔“ اور تین آدمیوں کا ملکر نماز پڑھنا اس

سے زیادہ بہتر ہے۔ اور جتنا ہی یہ تعداد زیادہ ہوگی اللہ کے ہاں اتنی زیادہ محبوب ہے۔“^①

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب صبح کی نماز پڑھاتے تو اسے خوب روشنی تک جاری رکھتے؛ تاکہ لوگوں کی زیادہ تعداد جمع ہو جائے؛ اگرچہ افضل اندھیرے میں ہی نماز پڑھا لینا تھا۔

یہ بات نص اور اتباع سے کہ کبھی مفضل وقت کسی ایسے فعل کے ساتھ خاص ہوتا جس کا کرنا اسی وقت میں افضل ہوتا ہے۔

جب کہ نماز چاشت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ: ”رسول اللہ ﷺ نے مجھے وصیت کی کہ میں ہر ماہ تین دن کے روزے رکھا کروں اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھا کروں اور سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کروں۔“^②

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسی روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ہر صبح تم میں سے ہر ایک کے ہر جوڑ پر صدقہ ہوتا ہے۔ ہر تیج کہنا صدقہ ہے، اللہ کی حمد بیان کرنا صدقہ ہے؛ لا اِلهَ

اِلا اللہ کہنا صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے؛ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے؛ برائی سے منع کرنا صدقہ ہے۔ اور ان تمام کی

جگہ چاشت کی دو رکعت نماز کفایت کر جاتی ہیں۔“^③

① سنن أبي داود 'كتاب الصلاة' باب فضل صلاة الجماعة ١/ ١٥١ - وسنن النسائي كتاب الإمامة باب: الجماعة إذا كانوا اثنين ٢/ ١٠٤ - وصححه الألباني في صحيح الجامع الصغير ٢/ ٢٥٤ - ② البخاري 'كتاب الصوم' باب صيام أيام البيض ٢/ ٥٧ - ومسلم 'كتاب صلاة المسافرين وقصرها' باب استحباب صلاة الضحى ١/ ٤٩٩ - سنن أبي داود ٢/ ٨٩ - كتاب الوتر 'باب في الوتر قبل النوم' - ③ مسلم 'كتاب صلاة المسافرين وقصرها' باب استحباب صلاة الضحى ١/ ٤٩٩ - سنن أبي داود ٢/ ٨٩ - كتاب الوتر 'باب في الوتر قبل النوم'.

فصل:

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات]

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”چودھواں سبب: ”عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت سے ناروا کام کیے تھے، ان کا کرنا ہرگز جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ سب مسلمان آپ پر اعتراض کرنے لگے اور آپ کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے۔ آپ کے قتل کرنے پر یہ اجتماع آپ کی امامت اور صحابیت کے اجتماع سے زیادہ تھا۔“ [اسی کلام ارفضی]۔

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

اول : یہ دعویٰ ایک کھلا ہوا جھوٹ [شیعہ کے جہل و افتراء کی کرشمہ سازی] ہے۔ اس لیے کہ تمام لوگوں نے مدینہ میں اور باقی شہروں میں کامل اتحاد اور یکا گت کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ آپ کی بیعت پر کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا؛ اور کوئی شخص بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ آپ کی بیعت دوسروں کی نسبت زیادہ پختہ اور مؤکد تھی۔ اس لیے کہ تمام لوگوں کا آپ پر اتفاق تھا۔ [بخلاف ازیں بہت سے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی]۔

[یہ جھوٹ ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے بارے میں متحد ان خیال تھے]، آپ کو قتل کرنے والے چند باغی اور ظالم لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وہ چوروں کی طرح ہستی کی بچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ اللہ ان کو ہر طرح سے عارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات بھاگ گئے تھے [اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی]۔“

یہ بات تو تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ شہروں کے رہنے والے آپ کے قتل میں شریک نہ تھے۔ اور جتنے لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی؛ انہوں نے تو آپ کو قتل نہیں کیا تھا۔ اور سابقین اولین صحابہ میں سے کوئی بھی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک نہ تھا۔ حالانکہ یہ سبھی لوگ آپ کی بیعت میں شریک ہوئے تھے۔ بلکہ آپ کو قتل کرنے والوں کی تعداد بیعت کرنے والوں کی تعداد کا سوواں حصہ بھی نہ تھی۔ تو پھر یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ آپ کو قتل کرنے پر بیعت سے زیادہ بڑا اجتماع ہوا تھا۔ یہ بات صرف وہی انسان کہہ سکتا ہے جو تاریخی حقیقت سے بالکل جاہل ہو اور سب سے بڑا جھوٹا اور مکار ہو۔

دوم : حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے اور ان پر طعن و تشنیع کرنے والوں کی تعداد قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اور جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگیں لڑیں؛ ان کی تعداد بھی قاتلین عثمان سے کئی گنا زیادہ تھی۔ آپ کے لشکر کے ہزاروں آدمی ان ہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آپ کو کافر قرار دیا اور آپ کے خلاف خروج کیا تھا۔ اور کہنے لگے: آپ اسلام سے مرتد ہو چکے ہیں۔ ہم اس وقت تک آپ کی اطاعت نہیں کریں گے جب تک آپ دوبارہ اسلام میں داخل نہ ہوں۔ آخر کار ان ہی لوگوں میں سے آپ کو قتل کرنے کی حلت کا اعتقاد رکھتے ہوئے؛ اور اس قتل سے اللہ تعالیٰ کی قربت کے حصول کی امید پر آپ کو قتل کیا۔ [چنانچہ آپ بھی اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح شہادت حاصل کی۔ اللہ ان کے قاتل کو عارت کرے]۔ آپ کے قاتل کا عقیدہ قاتلین عثمان کے عقیدہ سے بھی زیادہ برا تھا۔

جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا، وہ آپ کے کفر کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ظلم کا دعویٰ [اور شکایت] کرتے تھے۔ جب کہ خوارج علی الاعلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے تھے۔ ان کی تعداد بھی ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھی جن لوگوں نے آکر مدینہ کا محاصرہ کر لیا تھا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا۔

اگر یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قدح کرنے میں حجت ہو سکتی ہے؛ تو خوارج کا دعویٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل میں بطریق اولیٰ حجت ہو سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں باطل دعوے ہیں۔ لیکن قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی حجت قاتلین علی رضی اللہ عنہ کی حجت سے زیادہ بودی اور بے کار ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین اور آپ سے لڑنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین و قاتلین سے کئی گنا زیادہ تھے۔ بلکہ جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ لڑی وہ با اتفاق مسلمین قاتلین و محاصرین عثمان سے کئی درجہ افضل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑنے والوں میں عابد و زاہد لوگ بھی تھے۔ قاتلین عثمان میں نہ ہی دیندار لوگ تھے اور نہ ہی وہ مقاتلین علی رضی اللہ عنہ کی طرح تکفیر کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت خلیفہ راشد ہیں اور ان کے خون کو حلال جاننے والے ظالم و سرکش باغی تھے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین ان سے بڑے ظالم و سرکش تھے۔

سوم: یہ کہ یہ بات تو اترا کیساتھ معلوم ہے کہ تمام مسلمانوں نے اتفاق کیا تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اور کوئی ایک بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے نہ ہی آپ کی اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تخلف آپ کی خلافت میں قاذر نہیں ہو سکتا؛ اس لیے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خود ان پر کوئی تنقید نہیں کی؛ اور نہ ہی آپ کے افضل المہاجرین ہونے کا انکار کیا ہے۔ بلکہ یہ ساری چیزیں وہ لوگ جانتے تھے؛ مگر ان کا مطالبہ تھا کہ ایک امیر انصار میں سے ہو۔ یہ بات نصوص متواترہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”الائمة من قريش“۔ ”ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔“

اس معلوم شدہ نص کی بنا پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا گمان غلط تھا۔ تو نص سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کا بیعت سے پیچھے رہنا غلطی تھا۔ اور جب نص سے غلطی ثابت ہو جائے تو پھر اجماع میں اس سے حجت نہیں لی جاسکتی۔

جب کہ حضرت عثمان کے دور میں خلافت اسلامیہ کے افریقہ سے لیکر خراسان تک؛ اور شام کے ساحلوں سے لیکر یمن کی آخری حدوں تک پھیلے ہوئے ہونے کے باوجود کوئی ایک بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ اس وقت مسلمان اپنے اپنے اہل کتاب و مشرکین پر غالب تھے اور ان سے جنگیں بھی لڑ رہے تھے۔ اس سے فتح و نصرف میں اضافہ ہوا۔ ملک کو دوام ملا۔ اور چھ سال یعنی خلافت کے نصف عرصہ تک مسلمان آپ کی بیعت پر قائم رہے؛ آپ کی مدح اور ثنا کرتے اور تعظیم سے پیش آتے تھے۔ اس دوران کسی ایک نے بھی آپ کی شان میں کوئی ایک کلمہ تک بھی نہیں کہا۔

پھر اس کے بعد کچھ لوگ آپ پر باتیں کرنے لگے۔ جب کہ جمہور مسلمین خیر کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ آپ کی امارت کا عرصہ لوگوں پر طویل ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ آپ بارہ سال تک امیر المؤمنین رہے۔ خلفاء اربعہ میں سے کسی ایک کو بھی اتنا عرصہ خلافت کرنے کا موقع نہیں ملا جتنا لمبا عرصہ آپ کو موقع ملا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت دو سال چار ماہ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دس سال اور کچھ ماہ رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چار سال اور کچھ عرصہ رہی۔ آپ کے عہد

خلافت میں وہ لوگ بھی پروان چڑھے جو مجبوراً اسلام کا اظہار کر رہے تھے؛ مگر حقیقت میں وہ منافق تھے۔ جیسا کہ عبداللہ بن سباؓ اور اس کے امثال و ہمنوا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو آپ کے قتل کی سازش کے پیچھے بطور محرک کام کر رہے تھے۔ ادھر اہل ایمان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے [جو بغیر کسی تحقیق] منافقین کی باتیں سن لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمان الہی ہے:

﴿لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا أُضْعِفُوا خِلْلَكُمْ يَبْغُونَكُمْ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَعُونَ لَهُمْ﴾ [التوبة ۴۷]

”اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرورتاً تمہارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں۔“

یعنی تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور ان کی باتیں مان لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان پر کلام کو ملتبس کر دیتے ہیں۔

یہ منافقین کا کردار رہا ہے کہ انہوں نے بحین عثمان رضی اللہ عنہ پر معاملہ ملتبس کر دیا۔ اور بغض رکھنے والے بغض میں بڑھ گئے؛ یہاں تک کہ لوگ آپ کی نصرت کرنے کے لیے کما حقہ کھڑے نہ ہو سکے۔

جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، وہ بعض قبائل کے اوباش نو جوان تھے۔ جن کا اسلام میں کوئی ذکر خیر تک نہیں تھا۔ اگر یہ فتنہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب سے مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ کی بیعت سے آدھے سے زیادہ مسلمان سابقین اولین مہاجرین و انصار اور دوسرے لوگ پیچھے رہے۔ جو لوگ بالکل بیٹھے گئے تھے اور انہوں نے آپ سے جنگ نہیں اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر جنگ کی، ان میں حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے آپ سے جنگ لڑی۔

پھر آپ کی بیعت کرنے والے لوگوں میں سے بھی بہت سارے لوگوں نے اس بیعت سے رجوع کر لیا۔ اور ان میں سے بعض نے آپ کی تکفیر شروع کر دی؛ اور آپ کو حلال الدم کہنے لگے۔ اور ان میں سے بعض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے جیسے آپ کے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔ اور شیعان عثمان ہمیشہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے رہے۔ اور اس سے وہ دلیل لیتے رہے کہ آپ خلیفہ راشد نہیں ہیں۔ ان کی حجت بھی رافضیوں کی حجت سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اگر ان لوگوں کی دلیل بودی اور بیکار ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مظلوم شہید کئے گئے ہیں تو حضرت عثمان بطریق اولیٰ مظلوم شہید ہوئے ہیں۔

فصل ششم:

امامت و خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[اعتراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: چھٹی فصل: ابوبکر کی امامت کے دلائل فسخ ہونے کے بارے میں: انہوں [اہل سنت] نے کئی طرح سے استدلال کیا ہے۔

[اجماع پر رد؟]

سب سے پہلی دلیل اجماع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع منعقد ہوا تھا: اس لیے کہ بنو ہاشم کی ایک جماعت ان کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اکابر صحابہ میں سے حضرت سلمان، ابو ذر، مقداد، عمار، حذیفہ، سعد بن عبادہ، زید بن ارقم، أسامہ، اور خالد بن سعید العاص رضی اللہ عنہم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا والد بھی آپ کی خلافت کا منکر تھا۔ اس نے پوچھا: لوگوں نے کس کو خلیفہ منتخب کیا؟ لوگوں نے کہا: ”تیرے بیٹے کو۔“ اس نے پوچھا: ”ان دونوں کمزوروں کو کیا ہوا؟“ یہ حضرت علی اور عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اشارہ تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ: وہ نبی کریم ﷺ کی تجویز و تکفیل میں مشغول ہو گئے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عمر میں بڑا سمجھ کر لوگوں نے امام بنالیا۔ تو اس نے کہا: میں عمر میں اس سے بھی بڑا ہوں۔ بنو حنیفہ کا قبیلہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا منکر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو مرتد قرار دے کر ان کو قتل کیا اور قیدی بنایا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی اور اپنی خلافت کے زمانہ میں ان لوٹڈی غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔“ [ابھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: الحمد للہ کہ اس ذات نے ان مرتدین کے بھائیوں کی حقیقت کو بھی آشکار کر دیا۔ اب عوام و خواص میں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ لوگ ان ہی مرتدین کے سچے بھائی ہیں۔ اور ان کی زبان سے ہی ان کے اسرار چاک کر کے انہیں رسوا کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان خائنوں کے چھپے رازوں سے آگاہ ہے؛ اور اللہ اور اس کے رسول؛ اور اللہ کے نیک بندوں؛ اہل اللہ؛ متقیین سے ان کی عداوت کو وہ آشکار کرتا رہتا ہے۔ [جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے]:

﴿وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾ [المائدہ ۴۱]

”جس کا خراب کرنا اللہ کو منظور ہو تو آپ اس کے لئے خدا کی ہدایت میں سے کسی چیز کے مختار نہیں۔“

ہم کہتے ہیں: سیرت النبی ﷺ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جب ایسی بات سنے گا تو وہ کہے گا: اس کلام کا کہنے والا یا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال سے جاہل مطلق ہے یا پھر لوگوں میں سب سے زیادہ بہتان طرازی کا مرتکب ہے۔ میرا خیال ہے کہ: یہ مصنف اور اس کے امثال دیگر روافض جاہل اور اندھے ہیں، جو اپنے اسلاف کی کتابوں سے بغیر کسی تحقیق و اعتبار کے کلام نقل کر دیتے ہیں۔ ان کی اسلامی تاریخ پر کوئی نظر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں

کے متعلق انہیں صحیح معنوں میں کوئی آگاہی ہوتی ہے۔ پس یہ مصنف اور اس کے امثال جاہل کے جاہل ہی ہیں۔ نہ ہی انہیں معقول کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی منقول کا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روافض کے شیوخ بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ خواہش پرست اور جاہل ہوتے ہیں۔ پس ان کی خواہشات کے مطابق جو کوئی بھی بات کہے وہ اسے مان لیتے ہیں اور اس کی تصدیق کرنے لگ جاتے ہیں۔ [خواہ کہنے والا دجال ہی کیوں نہ ہو]۔ اس کے سچ اور جھوٹ ہونے کی تحقیق نہیں کرتے۔ بخلاف ازیں جو ان کے افکار و معتقدات کے خلاف کوئی بات کہے وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی حق گو کیوں نہ ہو، مگر انہیں سچ اور جھوٹ کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ [ایسے لوگ کیوں کر فلاح پائیں گے اور جو اس مرض کا شکار ہو اس کی عافیت کی کیا امید کی جاسکتی ہے؟]۔ شیعہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ﴾ (العنکبوت: ۲۸)

”اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب اس کے پاس حق آئے تو اس کی تکذیب کرے۔“

اہل علم و دین [اہل سنت] بحمد اللہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (الزمر: ۳۳)

”جو شخص حق کو لایا اور اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں۔“

✽ مصنف کی سب سے بڑی جہالت اور گمراہی یہ ہے کہ وہ کفر پر بنی حقیقہ اتفاق کو اجماع قرار دے رہا ہے۔ اور کہتا ہے: بنو حنیفہ کو قتل کرنے اور قیدی بنانے اور مرتد قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی مصنف کا اس قسم کا کلام گزر چکا ہے۔

✽ ہر خاص و عام صاحب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ بنو حنیفہ کافر تھے اور ایمانہ سے نبوت کا دعویٰ کرنے والے مسیلمہ کذاب کی پیروی کرتے تھے۔ اس مسیلمہ کذاب نے اپنے ایک خط میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نبوت میں برابر کا شریک ہے۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کے آخری ایام میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ پس یہ مسیلمہ اور یمن کے شہر صنعاء میں اسود عنسی جس کا اصل نام عبیدلہ تھا اور خلق کثیر نے اسود عنسی کی اتباع کر لی تھی؛ یہ لوگ قتل کئے گئے۔ اسود عنسی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت فیروز دہلی کے ہاتھ پر قتل کیا۔ اور اس کے اعوان و انصار بھی قتل ہوئے۔ اس کے قتل کا واقعہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا۔ اس قتل کی رات ہی نبی کریم ﷺ نے اس کے قتل ہونے کی خبر دیدی تھی اور فرمایا تھا: ”اسے نیک گھر والوں میں سے ایک نیک انسان نے قتل کیا ہے۔“^۱

اسود عنسی نے علیحدہ سے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا؛ اس نے صرف شراکت داری پر اکتفاء نہیں کیا تھا۔ اور یمن پر غلبہ پاکر وہاں سے رسول اللہ ﷺ کے عمال کو نکال دیا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قتل کیا، اور مسلمانوں کو کئی معرکوں کے بعد

۱ اس کا ذکر ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الاستیعاب“ میں کیا ہے، علی ہاشم الاصابہ ۲/۳۰۲۔ ابن عمر سے روایت ہے: جس رات اسود عنسی قتل ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس آسمانوں سے خبر پہنچ گئی۔ آپ ہمیں بشارت سنانے کے لیے باہر نکلے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ”آج رات اسود قتل ہو گیا اور اسے ایک مبارک گھرانے کے مبارک انسان نے قتل کیا ہے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ اسے کس نے قتل کیا؟ آپ نے فرمایا: فیروز الدہلی نے۔“

اس پر فتح عطا فرمائی۔ یہ واقعات اہل علم کے ہاں مشہور و معروف ہیں۔

جب کہ مسیلہ کذاب نے نبوت میں شراکت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور یہ انسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام تک زندہ رہا۔ صحیح بخاری میں ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”میں سورہا تھا تو میں نے اپنے ہاتھ میں سونے کے دو ٹکڑے دیکھے تو مجھے فکر ہوئی اور خواب میں وحی آئی کہ آپ ان کو پھونک دیجئے، میں نے ان کو پھونک دیا تو وہ اڑ گئے میں نے اس کی تعبیر ان دو کذابوں سے لی جو میرے بعد ظاہر ہوں گے پس ان میں سے ایک صنعاء [کاسوئسی] اور دوسرا یمامہ [رہنے والا مسیلہ کذاب] تھا۔“ [بخاری: ج ۱ ص ۸۴۱]

مسیلہ کے واقعات؛ اس کا نبوت کا دعویٰ کرنا، بنی حنیفہ کا اس کا اتباع کرنا اتنی مشہور خبریں ہیں جو صرف ایسے انسان سے مخفی رہ سکتی ہیں جو علم و معرفت سے انتہائی دور اور بیگانہ ہو۔

مسیلہ کذاب کی خبریں مسلمان تو مسلمان یہود و نصاریٰ تک جانتے ہیں۔ اور اس نے اپنا جو قرآن پیش کیا تھا اس کی کئی سورتیں آج تک لوگوں کو یاد ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے:

جس میں یہ کہتا ہے:

۱..... ”يَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَعٍ نَقِيٌّ كَمْ تَنَقِّينَ ، لَا الْمَاءَ تُكَدِّرِينَ وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِينَ ، رَأْسُكَ فِي الْمَاءِ وَذَنْبُكَ فِي الطِّينِ۔“

”اے میند کی دو میند کوں کی بیٹی! تم چلاؤ کتنا چلاؤ گی۔ نہ ہی تم پانی کو گدلا کرتی ہو اور نہ ہی پینے والے کو روکتی ہو تمہارا سر پانی میں ہے اور دم مٹی میں ہے۔“

اس کی جھوٹی وحی میں یہ بھی تھا:

۲..... ”الْفَيْلُ مَا أَرْدَاكَ مَا الْفَيْلُ ، لَهُ زُلُومٌ طَوِيلٌ ، إِنَّ ذَلِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا لَقَلِيلٌ“

”ہاتھی! ہاتھی کیا ہے اور تمہیں کیا پتہ ہاتھی کیا ہے اس کی ایک لمبی سونڈ ہے۔ بیشک یہ ہمارے رب کی تخلیق میں بہت کم ہے۔“

۳..... ”إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْجَمَاهِرَ فَصَلْ لِرَبِّكَ وَهَاجِرْ وَلَا تَطْعُ كُلَّ سَاحِرٍ وَكَافِرٍ۔“

”بیشک ہم نے آپ کو جماہر عطا کئے ہیں۔ آپ اپنے رب کی نماز پڑھو اور ہجرت کرو؛ کسی بھی جادوگر اور کافر کی بات مت مانو۔“

۴..... ”وَالطَّاحَنَاتُ طَحْنًا فَالْعَاجِنَاتُ عَجْنًا فَالْخَابِزَاتُ خَبْزًا إِهَالَةً وَسَمْنًا إِنَّ الْأَرْضَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَرِيْشٍ نَصْفَيْنِ ؛ وَلَكِنْ قَرِيْشًا قَوْمٌ لَا يَعْدِلُونَ ۔“

”اور قسم ہے چٹکائے زمین کے کہ زمین دو حصوں میں ہے اور قریش قوم لا یعادلون۔“

مسیلہ نے جو قرآن مرتب کیا تھا، وہ حد درجہ مضحکہ انگیز اور اس کی حماقت و سفاقت کا آئینہ دار تھا۔ جب مسیلہ کے قتل کے بعد بنو حنیفہ کا وفد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے ان سے مسیلہ کا کچھ کلام سنانے کو کہا۔ جس پر انہوں نے یہ کلام سنایا تو آپ نے فرمایا:

”تمہارے لیے ہلاکت ہو! مسیلہ تمہاری عقلوں کو کہاں لیے جا رہا ہے، یہ کلام اللہ کا نازل کردہ نہیں۔“

اس مسیلہ کذاب نے نبی کریم ﷺ کو آپ کی زندگی میں یہ خط بھی لکھا تھا:

”مسیلہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف: اما بعد:

”بیشک میں اس امر [نبوت و رسالت] میں آپ کا شریک ہو چکا ہوں۔“

رسول اللہ ﷺ نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ خط تحریر فرمایا:

”محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلہ کذاب کی جانب۔“

جب مسیلہ کذاب کا نمائندہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: کیا تم بھی یہ گواہی دیتے ہو کہ مسیلہ اللہ کا رسول ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔ پھر ان دو سفیروں میں سے ایک کوفہ میں ملا جسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے اس قول کی بنیاد پر قتل کر دیا۔^①

مسیلہ کذاب اس سے پہلے بنو حنیفہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر جب واپس اپنے علاقہ میں چلا گیا تو اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگا: ”مجھے محمد نے اپنے ساتھ نبوت میں شریک کر لیا ہے۔“ اور اس پر دو آدمی گواہ بھی پیش کئے۔ ان میں سے ایک رحال بن عنقہ تھا۔ اس نے اس بات کی گواہی دی۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین آدمیوں سے جن میں ایک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرا یہی رحال بن عنقہ تھا؛ فرمایا تھا: ”تم میں سے ایک آدمی کی داڑھیں جہنم میں فلاں اور فلاں سے بڑی ہیں۔“^②

ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو گئی۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح لرزاں و ترساں رہے یہاں تک کہ مسیلہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اس رحال نے اس کے نبی ہونے کی گواہی دی اور اس کی اتباع اختیار کر لی۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہ رہا ہے فرمان نبوت سے مراد یہی رحال بن عنقہ تھا۔

① اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: سیرت نبوی از ابن کثیر ۹۷/۴۔ سیرت ابن ہشام ۲۴۷/۴۔ إمتاع الأسماع ۵۰۸۔ زاد المعاد ۳/۶۱۰۔

② علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیرت نبویہ ۳/۹۷ پر لکھا ہے: ”امام اسماعیل اور دوسرے سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ: اس رحال بنو عنقہ کا اصل نام نہار تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا اور کچھ قرآن بھی سیکھا؛ اور ایک مدت تک رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بھی رہا۔ نبی کریم ﷺ کا ان پر گزر ہوا تو یہ تین افراد بیٹھے ہوئے تھے: فرات بن حیان، ابو ہریرہ اور رحال بن عنقہ۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے ایک آدمی کی داڑھیں جہنم میں فلاں اور فلاں سے بڑی ہیں۔“ پس یہ دونوں مخلص صحابی ڈرنے لگ گئے۔ یہاں تک کہ رحال بھی مسیلہ کذاب کے ساتھ مرتد ہو گیا۔ اور نبی کریم ﷺ پر جھوٹی گواہی دی کہ آپ نے مسیلہ کو اپنے ساتھ نبوت میں شریک کر لیا ہے۔ اور جو کچھ قرآن اسے یاد تھا اسے لوگوں میں سنا کر مسیلہ کی طرف منسوب کرنے لگا۔ اس طرح بنی حنیفہ میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔ جنگ یمامہ کے موقع پر زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کیا۔

مسيلمہ کا مؤذن جب اذان دیتا تو کہتا: ”أشهد أن محمداً و مسيلمہ رسولاً اللہ۔“
 ”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اور مسيلمہ دونوں اللہ کے رسول ہیں۔“

[بنو حنیفہ کا ارتداد اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:]

امت کے اولین و آخرین کے نزدیک بنو حنیفہ کا قتل اور ان کا قیدی بنانا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس لیے کہ لوگوں میں سب سے بڑے مرتد بنی حنیفہ تھے۔ آپ نے عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر ان کو قتل نہیں کیا تھا، بلکہ اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ مسيلمہ کذاب پر ایمان لائے تھے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنیفہ کی ماں بنو حنیفہ ہی میں سے آپ کی باندی تھی۔ اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہ مرتد خواتین کو قیدی بنانے کو جائز کہتے ہیں؛ جب کہ مرتدین اہل حرب میں سے ہوں۔ اگر یہ لوگ مسلمان اور معصوم الدم تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کیسے یہ جائز ہو گیا کہ ان کی عورتوں کو قیدی بھی بنائیں اور پھر ان سے ہم بستری بھی کریں۔

جن قبائل کے خلاف حضرت صدیق عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر نبرد آزما ہوئے تھے وہ بنو حنیفہ کے علاوہ دیگر قبائل تھے۔ انھوں نے بالکل ترک زکوٰۃ کو مباح قرار دیا تھا؛ اور کلایہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار کر دیا تھا؛ اس لیے ان کے خلاف اس بات پر جنگ آزمائی کی نوبت آئی۔ جنگ کی وجہ یہ نہیں تھی کہ زکوٰۃ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچائی جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اتباع کا جیسے حضرت امام ابو حنیفہ و احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ رحمہم علیہم کا خیال ہے کہ جب کوئی قوم یہ کہے کہ ہم زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہیں، مگر ہم فلاں امام کو نہیں دیں گے، تو ان کے خلاف صف آرائی جائز نہیں۔ اور یہ بھی علم میں ہونا چاہیے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جنگ کرنے کی وجہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا بالکل انکار تھا۔ یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کر رہے۔

بلکہ اگر یہ شیعہ مصنف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے والوں کو یہود و مجوس اور نصاریٰ کے برابر کرتا؛ تو یہ بھی ایسا ہی ہوتا جیسے وہ بنو حنیفہ کو شمار کر رہا ہے۔ بلکہ بنو حنیفہ بعض وجوہات کی بنا پر یہود و نصاریٰ اور مجوس سے بڑے کافر تھے۔ اس لیے کہ وہ پیدائشی کافر ہیں اور یہ مرتد کافر تھے۔ پیدائشی کافر کو جزیہ پر برقرار رکھا جاسکتا ہے؛ جب کہ انہیں جزیہ پر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ اور ان لوگوں کے پاس کتاب یا شبہ کتاب موجود ہے، اور ان کے پاس کوئی کتاب نہیں۔ یہ لوگ ایک جھوٹے مفتری کے پیروکار تھے؛ لیکن ان کا مؤذن یہ نداء لگایا کرتا تھا: ”أشهد أن محمداً و مسيلمہ رسولاً اللہ۔“

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اور مسيلمہ دونوں اللہ کے رسول ہیں۔“

اس طرح یہ لوگ محمد ﷺ کو اور مسيلمہ کذاب کو برابر کر دیتے تھے۔

مسيلمہ کذاب کا معاملہ تمام ان کتابوں میں مشہور و معروف ہے جن میں ایسے واقعات ذکر کئے جاتے ہیں؛ مثلاً کتب تفسیر؛ حدیث؛ مغازی؛ فتوح؛ فتنہ اور اصول اور علم کلام وغیرہ۔ حتیٰ کہ تاریخ اسلام میں یہ واقعہ اس قدر مشہور ہے کہ پردہ نشینان حرم بھی اس سے آگاہ ہیں۔ [پھر شیعہ مصنف کی اس واقعہ سے بے خبری بڑی حیرت کی موجب ہے]۔ تاریخی واقعات جمع کرنے والوں نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں؛ سیف بن عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب الردۃ اور الواقدی کی کتاب الردۃ؛ اور

دوسرے مصنفین کی کتابیں جن سے سب لوگ واقف ہیں، جن میں اہل ارتداد کے ساتھ جنگوں اور ان واقعات کا ذکر ہے۔ ایسے واقعات مغازی رسول اور فتوح شام جیسی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ {مگر یہ شیعہ ان کتب سے بھی نااہل ہے، ورنہ بنو حنیفہ کے ارتداد سے جاہل نہ بنتا}۔

ان میں سے بعض واقعات ایسے ہیں جو کہ خواص و عوام کے ہاں تواتر کے ساتھ مشہور ہیں؛ اور بعض واقعات نقد راویوں نے نقل کئے ہیں۔ اور بعض ایسی مراہیل اور منقطع اخبار ہیں جن کے بچ یا جھوٹ ہونے کا احتمال ہے؛ اور بعض روایات کے متعلق صاف واضح طور پر معلوم ہے کہ یہ جھوٹے اور من گھڑت واقعات ہیں۔

لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مسیلہ کذاب سے قتال اور جنگیں ایسے مشہور ہیں جیسے ہر قل، قیصر اور کسری اور دیگران اقوام کے ساتھ جنگوں کے واقعات مشہور ہیں جن سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عمر فاروق یا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جنگیں کیں اور جیسے ان مشرکین و یہود لوگوں کے کفر کا تواتر کیا تھا مشہور ہے جن سے نبی کریم ﷺ نے جنگیں لڑیں مثلاً: عتبہ، ابی بن خلف، جہی بن اخطب وغیرہ۔ اور جیسے عبداللہ بن ابی ابن سلول اور دیگر کے نفاق کا تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔

بلکہ مسیلہ کے ارتداد اور حضرت صدیق اکبر کے اس کے ساتھ قتال کا تواتر لوگوں میں جمل اور صفین؛ اور طلحہ دزیر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال؛ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ جانے کے تواتر سے بڑھ کر مشہور ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسیلہ کذاب نے آپ کو عرض کیا کہ: ”اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد مجھے خلافت عطا کر دیں تو میں ان کا تابع ہو جاتا ہوں اور وہ اپنی قوم کے بہت لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف چلے آئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسیلہ کذاب کے پاس مع اصحاب جا کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

”اگر تو مجھ سے بقدر اس لکڑی کے ٹکڑے کے طلب کرے تو میں تجھ کو نہ دوں گا اور خدا تعالیٰ کا جو حکم تیرے بارے میں ہو چکا ہے تو اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اور اگر تو کچھ روز زندہ رہا تو خدا تجھ کو ہلاک کر دے اور یقیناً میں تجھ کو وہی شخص سمجھتا ہوں جس کی نسبت میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ اور یہ ثابت رضی اللہ عنہ ہے جو تمہیں میری طرف سے جواب دے گا۔

پھر آپ وہاں سے پلٹ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ”اور یقیناً میں تجھ کو وہی شخص سمجھتا ہوں جس کی نسبت میں نے خواب میں دیکھا ہے“ کے بارے میں پوچھا؛ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ:

”میں سو رہا تھا تو میں نے اپنے ہاتھ میں سونے کے دو ٹکڑے دیکھے تو مجھے فکر ہوئی اور خواب میں وحی آئی کہ آپ ان کو پھونک دیجئے، میں نے ان کو پھونک دیا تو وہ اڑ گئے میں نے اس کی تعبیر ان دو کذابوں سے لی جو میرے بعد ظاہر ہوں گے پس ان میں سے ایک عیسیٰ اور دوسرا یمامہ کا رہنے والا مسیلہ کذاب تھا۔“ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۸۴۱]

[مرتدین کے خلاف جنگ اور موقف فاروقی]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”عمر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہونے پر اعتراض کیا تھا“ [یعنی کلام اراغی]

[جواب]: یہ بہت بڑا جھوٹ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر صریح بہتان ہے۔ بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا [مرتدین] مسئلہ

اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ پر اتفاق تھا۔ لیکن ایک دوسرا گروہ تھا جو اسلام کا اقرار کرتے تھے؛ مگر زکوٰۃ ادا کرنے کا انکار کرتے تھے ان کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلاشبہ توقف کیا تھا۔ اس لیے کہ شروع میں آپ کے دل میں شبہ تھا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تبادلہ افکار کرنے پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے قتال کے واجب ہونے کو واضح کیا؛ تو بعد میں آپ نے اپنے زاویہ نگاہ سے رجوع کر لیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق ہو گئے تھے۔ یہ قصہ بڑا مشہور ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا:

((كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله؛ فإذا قالوا عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحقها وحسابهم على الله .")) قال أبو بكر رضي الله عنه: ألم يقل بحقها؟ فإن الزكوة من حقها - والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم على منعها)). قال عمر رضى الله عنه فوالله ما هو إلا أن رأيت الله قد شرح الله صدر أبي بكر رضى الله عنه: فعرفت أنه الحق))

”آپ ان لوگوں سے کس طرح جنگ کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں؛ جب وہ یہ کلمہ کہہ دیں تو مجھ سے اپنا جان و مال بچالیں گے مگر اس کے حق کے عوض اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔“ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”کیا آپ رضي الله عنه نے یہ نہیں فرمایا: ”مگر اس کلمہ کے حق کے ساتھ۔“ بیشک زکوٰۃ بھی اس کلمہ کا حق ہے۔ واللہ اگر انہوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو اس کے نہ دینے پر میں ان سے جنگ کروں گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا تھا۔ تو میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے استدلال کیا جو آپ تک پہنچی تھی یا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ واضح کر دیا ”کلمہ طیبہ کا حق“ زکوٰۃ کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ مالی حق ہے۔“ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: ألا إله إلا الله وأني رسول الله، ويقيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحقها))

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو مجھ سے

اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ۔“

یہ دوسرا لفظ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فقہ پر دلالت کرتا ہے۔ جو کہ مانعین زکوٰۃ سے قتل کے بارے میں صریح اور قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوا حُزْمَهُمْ وَأَحْصُوا حُزْمَهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ فَإِنْ تَأَبَّوْا وَآقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾ [التوبة: ۵]

”تم قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی انہیں پاؤ انہیں پکڑو، ان کا گھیراؤ کرو، اور ان (کی خبر لینے) کیلئے بیٹھ جاؤ ہر گھات میں، پھر بھی اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور (اسلام لا کر) نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، تو تم خالی کر دو ان کا راستہ۔“

یہاں راستہ خالی کرنے کو ایمان؛ قیام نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے زکوٰۃ وصول کر لی تھی؛ مگر جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو وصول کردہ زکوٰۃ واپس کر دی۔ اور بعض لوگ حالات کے منتظر تھے۔ پھر ان میں سے جن لوگوں کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تو پھر سے نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک کے عاملین زکوٰۃ ویسے ہی زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے لگ گئے جیسے آپ کے عہد میں کیا کرتے تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عاملین زکوٰۃ کے نام ایک خط لکھا تھا؛ جس میں انہوں نے لکھا تھا:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“

”زکوٰۃ وہ فریضہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے فرض کیا ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔“

یہ خط اور اس جیسی دوسری دستاویز سے تمام علماء اسلام مسائل اخذ کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہیں لیا اور نہ ہی اپنے کسی قریبی کو کوئی عہدہ تفویض کیا؛ اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی بات کی؛ بخلاف حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما؛ ان دونوں حضرات نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بڑے بڑے منصب تفویض کئے تھے۔

اگر یہ جائز ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما پر اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے مال لینے کے لیے ان سے قتال کیا تھا تو پھر کسی بھی دوسرے پر اس کی بہ نسبت بہت آسانی سے اعتراضات کئے جاسکتے ہیں۔ اور اگر حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کا دفاع واجب ہے تو پھر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دفاع اس سے بھی بڑا واجب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس لیے جنگ و قتال کیا کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں، اور آپ ان کے جانوں اور اموال کے بارے میں فیصلے کر سکیں۔ پھر اس قتال کو کیسے دین پر قتال کہا جاسکتا ہے؟ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو ان لوگوں سے جنگیں لڑی تھیں جو اسلام چھوڑ کر مرتد ہو چکے تھے؛ اور اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ ترک کر رہے تھے۔ آپ کی جنگ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگ جائیں۔ تو پھر کیا یہ دین پر قتال نہیں ہو سکتا؟

شیعہ مصنف نے جن اکابر صحابہ کا نام لیکر بتایا ہے کہ انہوں نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی؛ یہ ان لوگوں پر بہتان ہے؛ ان لوگوں کا بیعت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میں شرکت کرنا اظہر من الشمس ہے، البتہ سعد بن عبادہ نے حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس پر تمام سیرت نگاروں، مؤرخین، محدثین اور دیگر اہل علم کے سلف و خلف کا اتفاق ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ اس وقت روانہ ہوئے تھے جب آپ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اسی لیے آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یا خلیفہ رسول اللہ ﷺ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

باقی جن لوگوں کا ذکر رافضی مصنف نے کیا ہے، انہوں نے بیعت کر لی تھی سوائے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے۔ آپ نبی اکرم ﷺ کے نائب تھے۔ جب آپ نے وفات پائی تو خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میں اور کسی کا نائب نہیں بننا چاہتا۔“ یہ کہہ کر آپ نے ولایت چھوڑ دی؛ ورنہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔ یہ بات تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سوا سب صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر بنو ہاشم کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کیے بغیر فوت نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ بعد آپ کی بیعت کی تھی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق انہوں نے آپ کے انتخاب کے دوسرے دن، بخوشی بغیر کسی سختی کے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سوا سب صحابہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت کی تھی۔ بنو ہاشم یا کوئی دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو گیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں فوت ہوئے تھے۔ اس لیے بیعت عثمانی کے دور کو نہیں پاسکے۔ بیعت سے پیچھے رہنے کا سبب معروف ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ ایک امیر انصار میں سے ہو [اور وہ امیر منتخب ہو جائیں] اور ایک امیر مہاجرین میں سے ہو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا مطالبہ رسول اللہ ﷺ کی نص اور اجماع امت کی روشنی میں صحیح نہیں تھا۔ جب اجماع کے خلاف ان میں سے کسی ایک کی غلطی ثابت ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اجماع حق اور درست تھا۔ اور یہ فرد واحد جس کی غلطی کتاب و سنت کی روشنی میں معلوم ہو جائے اس کی غلطی شاذ ہوتی ہے؛ اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ بخلاف اس شخص کے جو کتاب و سنت سے اپنی حجت کا اظہار کرے۔ اس انسان کا خلاف معتبر ہوتا ہے۔ کبھی حق اسی کے پاس ہوتا جس کی طرف دوسروں کو بھی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

جیسا کہ جیش اسامہ کی تنفیذ؛ مانعین زکوٰۃ سے قتال اور اس طرح کے دیگر امور کے بارے میں حق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی رائے کا درست ہونا بعد میں واضح ہو گیا۔

شیعہ مصنف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقافہ رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے؛ اس کے باطل اور جھوٹ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت ابوقافہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تھے۔ آپ ایک عمر رسیدہ انسان تھے۔ آپ نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے، آپ کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر آپ اس بزرگ کو اپنی جگہ پر ہی چھوڑ دیتے تو ہم خود اس کے پاس چلے جاتے۔“ آپ نے ایسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اکرام کی وجہ سے فرمایا۔

صحابہ کرام میں کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جس کی والدہ، والد اور اولاد سب نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ ان سب نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا۔ بلکہ آپ کے نو سوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا۔ آپ کے علاوہ مردوں اور عورتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی چار نسلوں نے رسول اللہ ﷺ کا دور پایا ہو اور وہ سب اہل ایمان بھی ہو گئے

ہوں۔ محمد بن عبدالرحمن بن ابی بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ؛ اور عبداللہ بن زبیر [اسماء بنت ابی بکر کے بیٹے] یہ چار تسلیس سبھی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ اور انہیں شرف صحابیت حاصل تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام خیر رضی اللہ عنہا بھی اسلام لے آئی تھیں۔ یہ ایمان والوں کا گھرانہ تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی منافق نہیں تھا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی اور کا گھر اس گھر جیسا نہیں تھا۔

ضرب المثل ہے کہ ایمان کے لیے کچھ گھر ہوتے ہیں اور نفاق کے لیے کچھ گھر ہوتے ہیں۔ مہاجرین میں سے ابوبکر کا گھر ایمان کا گھر تھا۔ اور انصار میں سے بنو نجار کا گھر انہ ایمان کا گھر تھا۔

رافضی کا یہ کہنا کہ: ”لوگوں نے ابوقحافہ سے کہا: ”تیرا بیٹا ابوبکر عمر میں سب لوگوں سے بڑا تھا۔“

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر میں سب صحابہ سے بڑے نہ تھے۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سارے لوگ عمر میں آپ سے بھی بڑے تھے۔ مثلاً حضرت عباس۔ آپ نبی کریم ﷺ سے تین سال بڑے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے تھے۔

ابو عمر بن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات کے وقت تریسٹھ سال کے تھے۔ یہی عمر [بوقت وفات] رسول اللہ ﷺ کی بھی تھی۔ بعض آثار میں حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب سالار انبیاء ﷺ کا انتقال ہوا تو مکہ کے شہر پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ آواز سنی تو لوگوں سے دریافت کیا: کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ آنحضرت ﷺ فوت ہو گئے۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ بولے: ”بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔“

ان کے بعد کون شخص خلیفہ قرار پایا۔“ لوگوں نے کہا: ”تیرا بیٹا“ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا بنو عبد مناف اور بنو مغیرہ اس پر راضی ہو گئے؟ لوگوں نے کہا: ”ہاں“ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا، جس کو اللہ دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے؛ اور جس سے وہ روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں۔“ [طبقات ابن سعد (۳/۱۸۴)]

پس درایں صورت اجماع کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: جن لوگوں کا رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے، ان میں سے سوائے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کوئی بھی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ وگرنہ باتفاق اہل نقل تمام لوگوں نے بیعت کر لی تھی۔ بنو ہاشم کے ایک گروہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شروع میں یہ لوگ بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے مگر چھ ماہ کے بعد ان لوگوں نے بھی بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی خوف کے بیعت کر لی۔ وہ خط جس کا ذکر بعض اہل نقل کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا؛ اہل علم کے ہاں وہ سراسر من گھڑت جھوٹ ہے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت سے پیچھے رہنے کے متعلق اپنا موقف پیش کیا، اور پھر بیعت کر لی۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ]:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وفات فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی]:

بخاری و مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ مدینہ میں

جو مال غنیمت نبی ﷺ کے پاس موجود تھا، نیز خیر اور فدا کے خمس میں سے جو مال باقی ہے وہ آپ کی میراث کے طور پر مجھے دے دیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”ہم کسی کو وارث نہیں بناتے، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔“

یہ درست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اہل بیت بسر اوقات کیلئے اس میں سے کھا سکتے ہیں، اللہ کی قسم! میں صدقہ کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا، بلکہ اسے اسی حالت پر رہنے دوں گا جس پر وہ عہد رسالت میں تھا۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جس بات پر عمل کیا جاتا تھا میں اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کروں گا، ورنہ اندیشہ ہے کہ میں راہ حق سے منحرف ہو جاؤں گا۔“

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس بات سے حقیقت کو پا گئیں؛ اور اس مسئلہ میں گفتگو کرنا چھوڑ دی۔ اور تا وفات پھر دوبارہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اس مسئلہ میں گفتگو نہ کی، آپ کی وفات کے بعد وہ چھ ماہ بقید حیات رہیں۔ جب فوت ہو گئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو راتوں رات دفن کر دیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود ہی ان کا جنازہ پڑھایا۔

جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بقید حیات تھیں تو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ بات نہ رہی۔ آخر کار آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مصالحت و مباہلت کی سلسلہ جنابی شروع کی۔ ہنوز آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ آپ تنہا میرے گھر آئیں۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے ہم راہ نہ ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ”آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں۔“

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے اللہ کی قسم! میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں ضرور جاؤں گا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کلمہ شہادت پڑھ کر کہا کہ: ابو بکر رضی اللہ عنہ! ہم آپ کی اللہ داد صلاحیتوں سے آگاہ ہیں اور آپ کی امامت و خلافت پر شک نہیں کرتے۔ مگر آپ نے ہم پر زیادتی کی۔ ہم قربت رسول ﷺ کی بنا پر اپنے آپ کو خلافت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مصروف گفتگو رہے۔ یہاں تک کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قربت رسول ﷺ کا مجھے اپنے رشتہ داروں کی نسبت زیادہ پاس ہے۔ جہاں تک ہمارے مابین مالی تنازعات کا تعلق ہے میں نے ان میں حق سے انحراف نہیں کیا، بلکہ نبی کریم ﷺ کو اس ضمن میں جو کچھ کرتے دیکھا وہی کیا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں آج بعد دو پہر آپ کی بیعت کروں گا۔“

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ظہر کی نماز پڑھ کر منبر پر کھڑے ہوئے۔ مسنون خطبہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت اور بیعت نہ کرنے کی وجہ بیان کی۔ اور جو عمر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیش کئے تھے وہ لوگوں کے سامنے پیش کئے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے استغفار کی اور ان کے لیے عظمت و فضیلت کی گواہی دی۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ رشک کی وجہ سے میں نے بیعت میں تاخیر نہیں کی تھی۔ نہ میں آپ کے اللہ داد فضائل کا منکر ہوں۔ بات یہ تھی کہ میں

اپنے کو خلافت کا اہل خیال کرتا تھا؛ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ خلافت پر فائز ہو گئے تو ہم سمجھے کہ آپ نے ہمارا حق مارا ہے؛ یہ بات ہمارے دلوں میں تھی؛ اس لیے ہم آپ سے ناراض ہو گئے۔ مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا: ”آپ نے ٹھیک کیا“ جب آپ نے امر بالمعروف کی طرف رجوع کر لیا تو اس بات سے مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ ❁

[انفرادی اختلاف اور خلافت]:

[ایک یا دو اشخاص کی مخالفت انعقاد خلافت کے لیے مضر نہیں]:

اس میں شبہ نہیں کہ امامت کے لیے جو اجماع معتبر ہے اس میں ایک یا دو آدمیوں کا یا کسی چھوٹے گروہ کا تخلف ضرر رساں نہیں ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو کسی خلیفہ کی امامت و خلافت کبھی منعقد نہ ہوتی۔ امامت ایک امر معین ہے۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان ایسی کسی خواہش کی وجہ سے بھی پیچھے رہ سکتا ہے جس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت سعد نے بیعت نہ کی تھی۔ اس لیے کہ آپ کی خواہش یہ تھی کہ انصار کے امیر آپ ہوں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا؛ تو یہ بات آپ کے دل میں رہ گئی۔

جو انسان خواہش نفس کی وجہ سے کوئی چیز چھوڑ دے؛ تو اس کا یہ فعل کوئی مؤثر نہیں ہوتا۔ بخلاف اجماع عام کے۔

عام شرعی احکام جیسے: واجب، حلال و حرام اور مباح و غیرہ کے بارے میں جو اجماع منعقد ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے کہ آیا ایک یا دو اشخاص کی مخالفت معتبر ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دو قول منقول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کی مخالفت معتبر نہیں ہے، محمد بن جریر طبری وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔

امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ احکام میں ایک یا دو شخصوں کی مخالفت معتبر ہے۔ اکثر علماء اسی قول پر ہیں۔

امامت پر اجماع میں اور عام اجماع میں فرق ہے۔ شرعی مسئلہ کا حکم سب کے لیے عام ہوتا ہے۔ جب کہنے والا کسی چیز کے واجب ہونے کا کہتا ہے تو وہ اسے اپنی ذات پر بھی واجب کر رہا ہوتا ہے اور دوسرے پر بھی اور ایسے ہی اسے حرام کہنے والا اسے اپنی ذات کے لیے اور دوسروں سب کے لیے حرام کہہ رہا ہوتا ہے۔ جب کہ اختلاف کرنے والا ان دونوں میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ: کسی انسان کی روایت نبی کریم ﷺ سے منقول کسی واقعہ میں قبول کی جاتی ہے بھلے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ حدیث نبی تمام لوگوں کو شامل اور ان کے لیے عام ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حدیث کو بیان کرنے والے کو آج اس کی روشنی میں فائدہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو؛ کل اسی حدیث کی روشنی میں اس کے خلاف بھی فیصلہ ہو سکتا ہے؟

❁ صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب غزوہ خیبر (حدیث: ۴۲۴۰، ۴۲۴۱)، صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

باب قول النبی ﷺ ”لا نورث ما ترکنا“..... (حدیث: ۱۷۵۹)۔

اس کے برعکس اگر کوئی انسان اپنی ذات کی حق میں کوئی گواہی دے تو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ خود جھگڑے میں فریق ہے؛ اور فریق مشارک کی گواہی اس کی ذات کے حق میں قبول نہیں کی جاتی۔
پس کسی متعین کی امامت و خلافت پر اجماع عام اور کلی حکم نہیں ہے؛ جیسا کہ احکام میں کسی خاص اور متعین مسئلہ پر اجماع ہوتا ہے۔

ایسے ہی جب ایک شخص معلوم شدہ نص کی مخالفت کرے تو اس کے قول کو شاذ قرار دیا جائے گا، مثلاً سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں، جب وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے تو صرف نکاح کرنے ہی سے وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ سے منقول صحیح سنت کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

امردوم: اگر ان لوگوں کے اختلاف کو تسلیم بھی کر لیا جائے جن کا تذکرہ رافضی نے کیا؛ اور اس سے دو یا تین گنا زیادہ لوگوں کو بھی ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو تب بھی خلافت کے اثبات میں قدح واقع نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ خلافت کے انعقاد میں اہل شوکت و سطوت اور اس جمہور کا اختلاف معتبر ہوتا ہے جن کی وجہ سے نظام چل رہا ہوتا ہے۔ یعنی ان کی اتباع کے بغیر امامت کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے:

”جماعت سے وابستہ رہیے، اس لیے کہ جماعت پر اللہ کا فضل و احسان ہوتا ہے۔“^①

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

”بیشک شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے؛ اور دو سے دور ہوتا ہے۔“ [سنن الترمذی ۳/۳۱۵]

ایک دوسری حدیث میں ہے:

”بیشک شیطان انسانوں کے لیے ایسے بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے۔ اور بھیڑیا اسی بکری کو شکار کرتا

ہے جو ریوڑ سے علیحدہ اور دور ہوتی ہے۔“ [مسند احمد ۱/۲۰۴؛ تحقیق احمد شاکر]

ایک حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سواد اعظم کا دامن نہ چھوڑیے، جو جماعت سے الگ ہو واوہ الگ ہو کر جہنم میں جائے گا۔“^②

امردوم: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر امت کا جو اجماع ہوا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے کہ ایک تہائی بلکہ اس سے کم و بیش لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ ایک تہائی لوگوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ آ رہے نہیں ہوئے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اور جن لوگوں نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی ان میں سے کچھ آپ سے برسر پیکار ہوئے؛ اور کچھ نے عزت نشینی اختیار کر لی۔

① معجم کبیر طبرانی (۱۲/۴۴۷)، الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعة (ح: ۲۱۶۶)، لیکن اس میں ”جماعت سے وابستہ رہیے“ کے الفاظ نہیں ہیں، وہ دوسری روایت (ح: ۲۱۶۵) میں ہیں۔

② مستدرک حاکم (۱/۱۱۵-۱۱۶) [مسند ۴/۲۷۸]

اگر امت کے چند افراد کی عدم شرکت سے کسی شخص کی خلافت میں قدرح وارد ہوتی ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت جرح و قدرح کی زیادہ مستحق ہوگی۔

اور اگر شیعہ کہیں کہ: ”جمہور امت نے آپ سے کوئی جنگ نہیں کی؛ یا جمہور اہل شوکت نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔“ تو انہیں کہا جائے گا کہ: یہی بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں کہنا زیادہ مناسب ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ نص سے ثابت ہے، لہذا اجماع کی ضرورت نہ تھی۔“

تو ہم کہیں گے کہ قبل ازیں ذکر کردہ نصوص سے صراحۃً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت واضح ہوتی ہے؛ نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں [کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجماعاً آپ کی بیعت کی تھی اور آپ کو خلیفہ رسول کا لقب بخشا تھا]۔ اور آگے چل کر بھی ہم انشاء اللہ اس چیز کو واضح کریں گے کہ نصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلالت کرتی تھیں۔ اور یہ کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہرگز خلیفہ نہ تھے۔ خلافت صدیقی کے لیے کسی اجماع کی ضرورت نہ تھی؛ اس لیے کہ نصوص کی روشنی میں آپ کی خلافت کی صحت ثابت تھی۔ اور اس کے منافی کوئی متناقض چیز بھی نہیں تھی۔

امر سوم: خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو طرح سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔

۱۔ پہلا موضوع کلام یہ ہے کہ فی الواقع حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تھے یا نہیں؟

۲۔ دوسرا یہ کہ آپ خلافت کی صلاحیت و اہلیت استحقاق سے بہرہ ور تھے بھی یا نہیں؟

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے آپ کا خلیفہ ہونا تو اثر اور لوگوں کے اتفاق سے ثابت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نائب رسول تھے؛ آپ رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام اور خلیفہ بنے۔ آپ نے شرعی حدیں قائم کیں۔ واجب الوصول حقوق وصول کیے۔ کفار و مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہوئے، اعمال مقرر کیے، مال تقسیم کیا۔ اور امیر و خلیفہ سے متعلق جملہ امور انجام دیے، بلکہ آپ اولین شخص تھے جو امامت پر فائز ہوئے۔

باقی رہا امر دوم یعنی آپ کا مستحق امامت ہونا تو اجماع کے سوا اور بھی کثیر دلائل موجود ہیں۔ شیعہ جس طریقہ سے بھی امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات کرتے ہیں، ہم اسی طریقہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مستحق امامت ہونا ثابت کرتے ہیں۔ بہر کیف اجماع کی حاجت امر اول میں ہے امر دوم میں نہیں۔ تاہم امر ثانی پر بھی اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

حجیت اجماع کی بحث:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”اجماع کسی مسئلہ پر دلالت کرنے میں اصل شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اجتماع منعقد کرنے والوں کو اس حکم کے لیے دلیل عقلی یا نقلی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس پر ان کا اتفاق ہو سکے۔ جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے کوئی عقلی دلیل ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت پر دلالت نہیں کرتی۔ باقی رہی نقلی دلیل تو اہل سنت کے نزدیک نبی کریم ﷺ نے کوئی امام مقرر کیے بغیر وفات پائی تھی۔ اور اس مسئلہ میں کوئی نص بھی موجود نہیں؛ اور قرآن اس کے بیان سے خالی ہے۔ بنا بریں اگر اجماع منعقد ہوا بھی تو غلط ہوگا؛ وہ کسی مسئلہ پر دلالت نہیں کرتا۔“ [نہجی کلام الرافضی]

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ”اجماع دلالت میں اصل شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا۔“

تو ہم کہتے ہیں: اگر اس قول سے تمہاری مراد یہ ہے کہ ارباب اجماع کی اطاعت بذات خود واجب نہیں ہے، بلکہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ و رسول کا حکم معلوم ہوتا ہے تو یہ صحیح ہے۔ مگر اس سے ہمارے نظریہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا، کیونکہ رسول ﷺ بھی بذات خود مطاع نہیں ہیں، بلکہ آپ کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ ان کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہوتی ہے، کیوں کہ اسلام میں مطاع حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الاعراف: ۵۴) ”اور اللہ کے لیے ہی ہے پیدا کرنا اور حکم چلانا۔“

نیز فرمایا: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (الانعام: ۵۷)

”بیشک حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔“

اللہ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلتا۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اس لیے واجب ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ممکن نہیں۔ اور اہل اجتماع اصحاب العلم والایمان کی اطاعت اس لیے واجب ہے کہ ان کی اطاعت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔

صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔“

(البخاری ۶۱/۹؛ مسلم ۱۴۶۵)

اور اس پر بہت ساری دلیلیں قائم ہیں کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جس کا حکم یہ امت اجتماعی صورت میں دے وہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہوتا ہے۔ امت نے امامت کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا اللہ اور اس کے رسول نے بھی اسی چیز کا حکم دیا ہے۔ اور جس نے آپ کی نافرمانی کی؛ اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

اور اگر تمہارا (شیعہ کا) مقصد یہ ہے کہ اجماع کبھی حق کے موافق ہوتا ہے اور کبھی مخالف۔ تمہاری یہی مراد ہے تو یہ حجت اجماع پر طعن ہے۔ جس میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ پوری امت خطا پر جمع ہو سکتی ہے؛ جیسا کہ روافض اور ان کے ہمنوا نظام کا خیال ہے۔

تو اس صورت میں انہیں کہا جائے گا کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا اور پھر آپ کا معصوم ہونا اور اس طرح کے دیگر اصول تو خود رافضی اجماع سے ثابت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ خود ان کے دعویٰ کے مطابق ان کے دین کی بنیاد عقلیات اور اجماع پر ہے۔ جیسا کہ ان کے بڑے نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ”عقل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے لیے ایک منصوص علیہ امام معصوم کا ہونا بہت ضروری ہے؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تو معصوم ہے اور نہ ہی منصوص علیہ۔“ اس کے علاوہ بھی ان کے دیگر مقدمات اور تجتہیں اسی طرح کی ہیں۔

پس ان سے کہا جائے گا: ”اگر اجماع حجت نہیں ہے، تو تمہاری ساری دلیلیں باطل ہو گئیں۔ پس تمہارے وہ اصول بھی باطل ہوں گے جن کی بنیاد اجماع پر رکھی گئی تھی۔ جب ان کے عقیدہ کا بطلان ثابت ہو گیا تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ خود بخود ثابت ہو گیا۔“

اور اگر اجماع حق ہے، تو پھر بھی اہل سنت والجماعت کا مسلک ثابت شدہ ہے۔ تو پھر بھی ان کے مذہب کا بطلان ثابت ہوتا ہے، خواہ یہ لوگ اجماع کو حجت مانیں یا نہ مانیں۔ جب ان کا عقیدہ باطل ہوا تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ثابت ہو گیا، یہی چیز ثابت کرنا مطلوب ہے۔

اور اگر شیعہ کہیں: ”ہم اجماع کا دعویٰ نہیں کرتے، اور نہ ہی اپنے مذہب کا کوئی اصول اجماع سے ثابت کرتے ہیں۔ بیشک ہماری بنیاد عقل اور ائمہ معصومین سے نقل کردہ اقوال ہیں۔“

ان سے کہا جائے گا: ”اگر تم اجماع سے دلیل نہیں لیتے تو تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ سے منقول روایات کے علاوہ کوئی بھی سچی دلیل باقی نہیں رہتی۔ بیشک جو کچھ آپ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے ائمہ سے نقل کرتے ہیں وہ اس وقت تک حجت نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ ہمیں ان ائمہ میں سے کسی ایک کا معصوم ہونا معلوم نہ ہو جائے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا معصوم ہونا بھی کسی معصوم سے منقول روایت کی بنیاد پر ہی ثابت ہو سکتا ہے۔ اور جس کا معصوم ہونا معلوم ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ جب تک ان کا کوئی دعویٰ رسول اللہ ﷺ سے مروی حدیث سے ثابت نہ ہو تو ان کے پاس دین کے اصول یا فروع میں کوئی دلیل سچی باقی ہی نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلیفہ منصوص علیہ ہونے کے دعویٰ کو دیکھنا چاہیے۔ اگر تم نص کو اجماع سے ثابت کرو تو یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ خود ہی اجماع کے حجت ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو اور تم اپنے بعض لوگوں کے قول کے مطابق نقل خاص سے یہ نص ثابت کرنے کی کوشش کرو تو پھر بھی اس کا باطل ہونا کئی وجوہات کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ تو واضح ہوا کہ جمہور اور اکثر شیعہ کی نقل کردہ روایات کی روشنی میں علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے کہ رافضی مصنف کا یہ دعویٰ جھوٹ ہے۔“

غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس سے ایک دوسری بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ جن امور میں جمہور اہل اسلام سے علیحدہ ہوئے ہیں، ان میں وہ کسی بھی دلیل کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ نہ ہی عقلی دلیل اور نہ ہی سمعی؛ نہ ہی نص اور نہ ہی اجماع۔ بلکہ اس میں ان کا اصل سرمایہ اور بنیادی چیز جھوٹ پر مبنی وہ روایات ہوتی ہیں جن کا کذب و بطلان ہر ایک اہل علم کے لیے واضح و آشکار ہوتا ہے۔ اور یہ دعویٰ کرنا کہ نص و روایات کرتی ہے، باقی اس سے معلوم ہوتا ہے؛ تو خود یہ دعویٰ ہی ایسا ہے جس کا باطل ہونا معلوم شدہ ہے۔

شیعہ کے علاوہ دیگر تمام اہل بدعت جیسے خوارج اور معتزلہ کا بھی یہی حال ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کسی بھی صحیح عقلی یا سمعی دلیل کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا سارا سرمایہ چند شبہات ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دلائل و روافض کے عقلی و سمعی دلائل سے قوی تر ہوتے ہیں۔

سمعی دلائل اس لیے قوی ہوتے ہیں کہ: یہ لوگ جھوٹ پر اعتماد نہیں کرتے؛ جیسا کہ روافض جھوٹ پر ہی اعتماد کرتے ہیں۔ اور صحیح نصوص میں ان کا شبہ روافض کے شبہ سے زیادہ قوی تر ہے۔

مزید برآں کہ تمام اہل بدعت روافض کی نسبت احادیث رسول اور آثار صحابہ کے زیادہ عالم و ماہر ہوتے ہیں۔ آثار و احوال نبی ﷺ روافض سے بڑھ کر کوئی جاہل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور کلام سے جہالت چھلکتی ہے۔ اور ان کی روایات میں اتنا زیادہ جھوٹ ہے کہ کسی دوسرے فرقہ کے پاس اتنا زیادہ جھوٹ نہیں ہوگا۔ ایسے ہی باقی اہل بدعت معقولات میں ایسا قیاس کرتے ہیں جو کہ اپنے ضعف و فساد کے باوجود روافض کے قیاس سے زیادہ عمدہ اور بہتر ہوتا ہے۔ مزید برآں ہم کئی مواقع پر تفصیل دلائل کے ساتھ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اجماع کیسے جنت ہوتا ہے۔ اور مقام کے لیے اس کے مناسب حال گفتگو ہوتی ہے۔

ہم امامت صدیق بنی اللہ کے اثبات میں ایسے دعویٰ کے محتاج نہیں ہیں، اور ہمیں کسی کی امامت کے لیے یہ شرط لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ: ”جب رافضی نے یہ ذکر چھیڑا کہ اہل سنت والجماعت اجماع پر اعتماد کرتے ہیں تو ہم نے اس مسئلہ پر گفتگو کر دی کہ اجماع سے جو حکم ثابت ہوتا ہے اس پر دلالت کرنے والی نص موجود ہوتی ہے، اجماع سے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے بارے میں نص موجود ہے جو کہ ائمہ کے ہاں معلوم شدہ ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم ختم ہو چکا ہو۔

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ اجتہاد کی اساس پر اجماع منعقد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہم اسے جائز کہتے ہیں کہ بعض اجماع کرنے والے اپنے اجتہاد سے کوئی بات کہہ دے؛ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام اہل اجماع پر نص مخفی رہ جائے۔ کوئی بھی حکم ایسا نہیں ہوتا جس کے بارے میں اجماع ہو؛ مگر بعض لوگوں کو اس کی نص کا علم بھی ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں اجماع نص پر دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ﴾

(النساء: ۱۱۵)

”جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے علاوہ دوسری راہ پر چل دیتا ہے تو جدھر کا رخ کرتا ہے، ہم اسے اسی جانب پھیر دیتے ہیں۔“

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے وعید کو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور مومنین کی راہ سے روگردانی کے ساتھ معلق کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے سے بھی وعید لاحق ہو سکتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اہل ایمان کے راستہ کی پیروی آپس میں لازم و ملزوم ہیں؛ اسی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ وعید کو معلق کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہی وعید اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر معلق کی گئی ہے؛ اس لیے کہ یہ دونوں امور آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

خلافت صدیقی اسی قبیل سے ہے اس کے بارے میں بہت ساری نصوص موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی

اہمیت و خلافتِ نبوی برحق و صواب تھی۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیا خلافت کا انعقاد نصِ عہد [خاص] کی بنا پر ہوا ہے؛ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد ہوا تھا؛ یا پھر اجماع اور اختیار کی اساس پر؟ جہاں تک ولایتِ نصوص کا تعلق ہے، تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حق اور صواب یہی ہے۔ ہمیں علماء اہل سنت والجماعت میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہو سکا جس نے اس میں اختلاف کیا ہو۔ سبھی اس کے درست ہونے پر نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔ جب ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ جس چیز پر اجماع منعقد ہو جائے وہ منصوص علیہ ہوتی ہے۔ پس اس موقع پر اجماع کا ذکر اس لیے ہوتا ہے کہ یہ نص موجود ہونے کی دلیل ہے؛ یہ کبھی باہم جدا نہیں ہو سکتی۔ ہمارا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ نص و اجماع باہم لازم ملزوم ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم وہ نصوص ذکر کریں گے جن سے مطلقاً اجماع پر ولایت کی جاتی ہے۔ اور ان نصوص سے وہ لوگ بھی استدلال کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کبھی کبھار اجماع نص سے خالی بھی ہو سکتا ہے۔ اسکی دلیل یہ آیت ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین جماعت ہو، جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔“

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہر نیکی کی بات کا حکم دیتے ہیں اور برائی کی بات سے منع کرتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت پر واجب ہے اس میں قطعی طور پر سب واجبات و محرمات شامل ہیں۔ اور واجب وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے واجب ٹھہرایا ہو؛ اور حرام وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کہا ہو۔ لہذا امت کو چاہیے کہ تمام ان واجبات کو ضروری ٹھہرائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے اور اللہ کی تمام محرمات کو حرام سمجھیں اور ان سے لوگوں کو باز رکھیں۔ پس ورائیں صورت ضرورت کے تحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممنوع ہے کہ یہ لوگ حرام کو حلال ٹھہرائیں اور حلال کو حرام قرار دیں۔ اس لیے کہ ان کے لیے حق بات بیان کرنے سے خاموش جائز نہیں۔ پھر حق کی نفیض باطل کی تائید میں بولنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کریں گے تو برائی کا حکم دینے والے اور بھلائی سے منع کرنے والے ہو جاتے۔ یہ بات صریح نص کے خلاف ہے۔

نظر بریں اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت حرام اور آپ کی اطاعت منکر ہوتی تو اس سے لوگوں کو باز رکھنا امت پر واجب اور اس سے خاموش رہنا ناروا ہوتا۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب ہوتی تو یہ ایک بہت بڑی نیکی تھی، جس کا حکم دینا نہایت ضروری بلکہ واجب تھا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت و اطاعت اس وقت میں نہ واجب تھی اور نہ ہی مستحب۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت میں کوئی برائی نہیں تھی۔ یہی چیز ثابت کرنا مطلوب ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبہ: ۷۱)

”مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ہم و رو ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرہ: ۱۴۳)

”اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا تاکہ تم دوسروں پر نگاہ رکھو۔“

جب اس امت کو شاہد کا درجہ دیا گیا ہے تو ان کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس بات کی شہادت دیں گے۔ اگر یہ امت اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام اور محرّمات کو حلال قرار دینے والی ہوتی تو اس کو شاہد نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اگر اس امت کے افراد قابل مدح اشخاص کی مذمت کرتے اور مذموم اشخاص کی مدح میں رطب اللسان ہوتے تب بھی وہ اس منصب پر فائز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ بنا بریں جب یہ امت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے استحقاق خلافت کی گواہی دے تو اس کا صادق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جب یہ بالاتفاق کسی کے نیک یا بد ہونے کی شہادت دیں تو ان کی یہ گواہی قبول کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَ نُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَ سَاءَ أَتْمَصِيرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

”جو شخص بھی ظہور ہدایت کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا، اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چلے گا تو جدھر کو وہ مڑے گا ہم اس کو اسی طرف موڑ دیں گے اور اسے جہنم رسید کریں گے۔“

اس آیت میں مخالفت رسول اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلنے کی ممانعت کی گئی ہے، یہ دونوں باتیں مذموم ہیں، جب اس امت کے لوگ کسی چیز کی حلت یا حرمت پر متفق ہوں اور کوئی شخص ان کی مخالفت کرے تو اس نے مومنین کے سوا دوسروں کی راہ اختیار کی۔

قرآن پاک میں فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

”سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور فرقے فرقے نہ بنو۔“

اگر حالت اجتماع میں بھی مسلمانوں کے درمیان کامل اتحاد و یگانگت موجود نہ ہو تو پھر اجتماع و انتشار میں کیا فرق ہوا؟ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ (البائدة: ۵۵)

”اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور اہل ایمان تمہارے دوست ہیں۔“

اس آیت میں مومنین کی دوستی کو اللہ و رسول کی دوستی کی طرح قرار دیا گیا ہے یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو ضلالت پر جمع نہیں ہونے دیتا، اس کے سب سے زیادہ حق دار صحابہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرنا ایک جائز اقدام تھا۔ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

”جس کی تم مدح بیان کرتے ہو، اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے، اور جس کی مذمت کرتے ہو، اس کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔“^۱

۱ صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت (حدیث: ۱۳۶۷)، صحیح مسلم، کتاب الجنائز۔ باب فیمن یشی علیہ خیر او شر من الموتی (حدیث: ۹۴۹)۔

اجماع پر شیعہ کے اعتراضات:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”اجماع میں امت کے سب لوگوں کا قول معتبر ہوتا ہے اور یہ بات موجود نہ تھی۔ اور نہ ہی تمام اہل مدینہ یا بعض کا اجماع ہو سکا تھا۔ اکثر لوگ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق تھے۔“ [ابھی کام اراضی]

[جواب]: ہم قبل ازیں اس کا جواب دے چکے ہیں۔ جہاں تک امامت پر اجماع کا تعلق ہے؛ اگر اس سے مراد وہ

اجماع ہو جس سے امامت و خلافت کا انعقاد ممکن ہوتا ہے، تو ہم نے بیان کیا تھا کہ اس میں ارباب حل و عقد کا اجماع اور موافقت ضروری ہوتی ہے؛ تاکہ امامت کے مقاصد پورے کرنے پر قدرت حاصل ہو جائے۔ بھلے ارباب حل و عقد تعداد میں چند ایک ہوں اور باقی لوگ ان کے موافق وہم خیال ہوں؛ جب وہ کسی کی بیعت کر لیں تو امامت منعقد ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حق مسئلہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت گامزن ہیں۔ ائمہ اہل سنت جیسے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔

جب کہ اہل کلام میں سے ہر ایک نے اس کے لیے کچھ عدد متعین کیا ہے۔ یہ تمام باطل قیاس ہیں۔

اور اگر اس سے مراد خلافت کے استحقاق اور اولویت پر اجماع ہے، تو اس میں یا تو تمام لوگوں کا؛ یا پھر اکثریت کا اجماع

معتبر ہوتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی بات ہے؛ تو یہ بات غلط ہے کہ اکثر لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے

تھے۔ آپ کی قاتل ایک باغی و ظالم جماعت تھی جو کہ کل امت کا ہزارواں حصہ بھی نہیں بنتے۔ یہ بات کوئی عقلمند کیسے کہہ سکتا

ہے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے اکثر لوگ؛ اور جنہوں نے آپ سے جنگیں لڑیں، اور جو لوگ ان جنگوں میں شریک نہیں

ہوئے؛ ان کا شمار قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں نہیں ہوتا۔ آپ کو قتل کرنے والے ایک چھوٹے سے گروہ کے لوگ تھے جو کہ [بعد میں

جان بچانے کے لیے] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں امت کی تعداد لاکھوں کو پہنچ چکی تھی۔ جب کہ آپ کو قتل کرنے والے ایک ہزار

سے کچھ زیادہ لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

”اللہ تعالیٰ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرے، وہ چوروں کی طرح بستی کی کچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ اللہ ان کو ہر

طرح سے غارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات تاروں کی روشنی میں؛

بھاگ گئے تھے اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی۔“

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”جب امت کے ہر شخص سے غلطی کا صدور ممکن ہے تو اجماع میں کذب کے

احتمال سے کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟“ [ابھی کام اراضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ جب بھی اجماع ہوتا ہے تو اجماع سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو احاد سے نہیں ہوتے۔

بنابرین فرد واحد کے حکم کو اجماع کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً: احاد میں خبر دینے والے ہر ایک سے خطا و کذب کا صدور ممکن

ہے۔ مگر جب یہی خبر احاد پہنچانے والے تواتر کی حد کو پہنچ جائیں تو یہ احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ جتنے لقمے

کھائے جاتے ہیں؛ پانی کے گھونٹ پئے جائیں؛ ان میں سے کسی ایک لقمہ یا گھونٹ سے بھی سیری حاصل نہیں ہوتی، مگر ان کے مجموعہ سے آدمی سیر ہو جاتا ہے؛ پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تنہا ایک آدمی دشمن کے مقابلہ سے قاصر ہوتا ہے، لیکن جب افراد جمع ہو جائیں اور ایک گروہ بن جائے تو وہ آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کثرت قوت و علم کی موجب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حساب میں کبھی ایک یا دو انسان تو غلطی کر سکتے ہیں؛ مگر جب ان کی تعداد کثرت میں ہو جاتی ہے تو وہی بات جو فرد واحد سے ممکن تھی یہاں پر متمنع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اضطراری طور پر معلوم ہے کہ دو کا علم ایک سے علم سے زیادہ ہوتا ہے؛ جب کہ وہ اکیلا ہو۔ اور دو کی قوت بھی ایک کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پس انفرادی حالت میں خطاء کے واقع ہونے سے اجتماعی حالت میں خطاء کا صدور لازم نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى﴾ (البقرة: ۲۸۲)

”اس لیے کہ اگر ایک عورت بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلادے گی۔“

پس حساب میں بھولنے والا؛ ایک انسان تو غلطی کر سکتا ہے؛ مگر ایک جماعت سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ہلال کا مسئلہ ہے۔ ایک انسان تو یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ ہلال ہے؛ جب کہ بہت بڑی تعداد سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سارے لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ جب مسلمان کثرت کے ساتھ جمع ہو جائیں؛ ان میں فواحش اور ظلم کے دوائی اس کی نسبت کم ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ کم تعداد میں ہو۔ اس لیے کہ اجتماع کی صورت میں شریعت اسلام کی مخالفت میں ان لوگوں کا اجماع نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک یا دو انسانوں سے ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اجتماع اور تمدن عادلانہ قانون کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی شہر کے رہنے والوں سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مطلق طور پر ایک دوسرے پر ظلم کرنے پر متفق ہو جائیں۔ کیونکہ اس صورت میں تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ بلکہ ہم ایسے بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی حاکم یا امیر اپنی بعض رعیت پر ظلم کرتا ہے تو اس کے بعض ساتھی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس ظلم میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔ جس چیز میں سارے برابر ہوں اس میں کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اجماع کی مخالفت کرنے والے کا حکم افراد اور شاخ کا حکم ہوتا ہے۔ بھلے اس اجماع کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اس کی ایک مثال یوں بیان کی جاتی ہے: یہ ایک بدیہی بات ہے کہ انسان ایک تیر کو باسانی توڑ سکتا ہے، مگر بہت سے تیروں کو توڑنا مشکل ہے۔ اور ایک انسان پر دشمن غالب آ سکتا ہے اسے شکست سے دوچار کر سکتا ہے؛ مگر جب یہی لوگ کثرت تعداد میں ہو جاتے ہیں تو پھر وہ بات ممکن نہیں رہتی جو انفرادی حالت میں ممکن تھی۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اجماع میں خطا کا امکان ہوتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت ثابت نہیں ہو سکے گی؛ جیسا کہ شیعہ مذہب میں ان کا عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ [ان کا کہنا ہے کہ] عصمت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات اور غیروں سے عصمت کی نفی بھی [شیعہ عقیدہ کے مطابق] اجماع کے رہن منت ہیں۔ اگر شیعہ اجماع پر معترض ہو کر کہیں گے: اجماع میں خطاء ممکن ہے

تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے لوگ بھی معصوم ہو سکیں گے۔ اور عصمت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تک خاص نہ رہے گی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اجماع پر قدح کرنے سے ان کے عقیدہ کی ان بنیادوں پر وار ہوتی ہے جن پر انہوں امامت معصوم کی عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ جب آپ کی عصمت کا بطلان ثابت ہو گیا تو ان کا ایک مذہبی قاعدہ باطل ٹھہرا؛ اور اگر اسے حجت قرار دیکر تسلیم کریں گے [تو اصحاب ثلاثہ کی خلافت پر منعقد شدہ اجماع کو تسلیم کرنا پڑے گا]۔ ہر دو لحاظ سے ان کا سارا مذہب باطل ثابت ہوگا۔

[اعتراض:] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ”ہم وہ نصوص ذکر کر چکے ہیں جن سے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات ہوتا ہے، لہذا اس کے خلاف جو اجماع بھی انعقاد پذیر ہوگا وہ غلط ہوگا۔ اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک خلاف نص واقع ہونے والا اجماع غلط ہوتا ہے۔“ (انہی کلام الرافضی)

[جواب:]

پہلی بات: ہم قبل ازیں خلفاء ثلاثہ سے پہلے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں شیعہ کے دلائل کا ابطال کر کے اس کے خلاف براہین و دلائل قائم کر چکے ہیں۔

دوسری بات: نصوص دلالت کرتی ہیں کہ خلفاء ثلاثہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے خلیفہ بنے تھے۔

تیسری بات: مزید براں ہمارے پیش کردہ دلائل مؤید بالا اجماع قطعی ہیں؛ سمعی نہیں۔ خصوصاً جب کہ بہت ساری نصوص اس کے موافق بھی ہیں۔ بغرض محال اگر کوئی دلیل خلاف اجماع ہوگی تو وہ باطل ہوگی یا اس سے مدعا کا اثبات نہیں ہوگا۔ اس کی دو جوہات ہیں: یا تو وہ نبی کریم ﷺ کا فرمان نہیں ہوگا۔ یا پھر اس میں سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہوگی۔

چوتھی بات: نص معلوم اور اجماع معلوم کے مابین تعارض ممتنع ہے، اس لیے کہ یہ دونوں حجت قطعی ہیں اور قطعیات میں تعارض جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان کی مدلولات کا موجود ہونا واجب ہوتا ہے؛ ورنہ اجتماع تقيضین لازم آئے گا۔

جو کوئی بھی ایسے اجماع کا دعویٰ کرتا ہے جو نص کے خلاف ہو تو اس سے دو میں سے ایک بات لازم آتی ہے:

۱۔ یا تو وہ اجماع باطل ہوگا۔ ۲۔ یا پھر وہ نص باطل ہوگی۔

جس نص کی مخالفت پر پوری امت جمع ہو جائے اس کا کسی دوسری نص سے منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امت میں ایک نص معلوم باقی ہو، وہ منسوخ بھی نہ ہو اور اس کے خلاف اجماع بھی منعقد ہو جائے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص اجماع کے وجود سے ان دلائل کا ابطال ہوتا ہے جو شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ اور ہمیں شیعہ کے پیش کردہ دلائل باطل ہونا کثرت نصوص کی روشنی میں معلوم ہے۔



فصل:

[شیعہ اقتداء شیخین رضی اللہ عنہما کے منکر]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: "امروم: "اہل سنت یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"ان دو کی پیروی کرو جو میرے بعد ہوں گے" یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو۔" اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید براں اس حدیث سے ان کی امامت و خلافت ثابت نہیں ہوتی۔ اس حدیث میں ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم فقہاء کی بھی اقتداء کرتے ہیں، اس سے ان کا امام ہونا لازم نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین بہت سارے مسائل و احکام اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے دونوں کی پیروی ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ روایت مشہور حدیث "أَصْحَابِي كَأَلْبَجُومِ" کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ان دونوں کے امامت کے منفي ہونے پر اجماع بھی ہے۔" [نہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اہل علم محدثین کا اجماع ہے کہ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے متعلق شیعہ کی پیش کردہ نص سے ہر حال میں اقویٰ ہے۔ محدثین کی معتد کتابوں میں یہ روایت معروف ہے؛ اسے امام احمد نے مسند میں؛ ابوداؤد نے سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے۔^①

بخلاف ازیں امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں پیش کردہ نصوص محدثین کی کسی بھی قابل اعتماد کتاب میں نہیں پائی جاتیں؛ محدثین یک زبان ہیں کہ: یہ سب باطل روایات ہیں۔ حتیٰ کہ محدث ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ہم نے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نص ایک مجہول راوی سے پائی ہے، جو دوسرے مجہول راوی سے نقل کرتا ہے، اس کی کنیت ابوالحرء ہے ہمیں نہیں معلوم کہ مخلوق خدا میں وہ کون ہے؟" [الفصل ۴ / ۱۶۱]

اب یہ بات متفق ہے کہ اس روایت کو تو جھٹلادیا جائے اور امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کی تصدیق کی جائے۔

✽ جہاں تک اس روایت سے دلالت کا تعلق ہے؛ تو اس حدیث میں اپنے بعد دو لوگوں کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے؛ اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دونوں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ظالم و مرتد نہ تھے کیوں کہ ظالم و مرتد دوسروں کا پیشوا نہیں بن سکتا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَا يَتَّخِذُ الظَّالِمِينَ﴾ (البقرة: ۲۴) "میرے عہد کو ظالم نہ پاسکیں گے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم کی اقتداء نہیں کی جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد ان دو حضرات کی اقتداء کا حکم دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام و پیشوا ہونگے۔ اور ساتھ یہ بھی خبر دیدی کہ یہ میرے بعد ہونگے۔ تو یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کے بعد اس امت کے امام ہوں گے اور ان کی اتباع و پیروی کرنی ہوگی۔ یہی

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب (۱۶/۳۵)، (حدیث: ۳۶۶۲، ۳۶۶۳)، سنن ابن ماجہ۔ المقدمة۔ باب فضل ابی بکر الصديق ﷺ (حدیث: ۹۷)، مسند احمد (۵/۳۸۲، ۳۹۹)۔

چیز مطلوب ہے۔

❁ رافضی کا یہ کہنا کہ: ”ان کے مابین بہت سارے مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔“ حقیقت میں معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف شاذ و نادر چند ایک مسائل ہی میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ غالب طور پر ایسے ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے ایک مسئلہ میں دو روایتیں منقول ہوتی ہیں۔ مثلاً: اس مسئلہ میں کہ جب میت کا دادا زندہ ہو اور اس کے بھائی بھی بقید حیات ہوں تو ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں منقول ہیں ایک روایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہے۔

❁ نیز یہ مسئلہ کہ مال غنیمت کی تقسیم مساوی طور پر کی جائے گی یا اس میں تفاوت درجات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات تو جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ مال فتنے اور غنیمت کی تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپ غنیمت اور فتنے کے مستحقین کو برابر دیا کرتے تھے۔ لیکن اختلاف کسی کو فضیلت دینے کے جواز میں ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے دو قول ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مصلحت کے تحت کسی کو زیادہ دینا جائز ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھار مصلحت کے تحت غنیمت اور فتنے کی تقسیم میں بعض لوگوں کو فضیلت دیا کرتے تھے۔

❁ حضرت خالد بن ولید کے عزل و نصب میں بھی ان کے مابین اختلاف پیدا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے وہی کیا جو اس وقت کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت نرم مزاج تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ آپ کا نائب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نائب کی نسبت قوی تر ہو۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہی مناسب تھا کہ آپ کا نائب اور سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جیسا شفیق انسان ہو۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

❁ شرائع کلیہ کے احکام میں ان دونوں حضرات کا اختلاف نادر بلکہ معدوم ہے۔ یا پھر ان میں سے کسی ایک کے ایک مسئلہ میں دو قول ہیں۔

❁ زیر تبصرہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کی جانی چاہیے خواہ وہ متحد الخیال ہوں یا مختلف الخیال۔ پس اس صورت میں یہ مسئلہ نکلتا ہے جس مسئلہ میں کسی ایک کے دو قول ہوں تو اس قول کی پیروی کی جائے جس میں دونوں متحد الخیال ہوں۔

❁ باقی رہی حدیث ”أَصْحَابِي كَالنَّجُومِ بِأَيِّهِمْ أَقْتَدَيْتُمْ أَهْتَدَيْتُمْ۔“

تو یہ روایت ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے، اس لیے قابل احتیاج نہیں۔^①

امام بزار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں اور نہ ہی حدیث کی معتمد کتابوں میں اس کا کوئی اتہ پتہ ملتا ہے۔“

① تفصیل کے لیے دیکھیں۔ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ للشیخ الالبانی رحمہ اللہ (رقم: ۵۸)

مزید برآں اس روایت میں: ”بعدي“ یعنی میرے بعد کے الفاظ نہیں ہیں؛ یہاں پر حجت اسی لفظ میں ہے۔ نیز اس روایت میں ان کی اقتداء کا حکم نہیں ہے؛ جب کہ دوسری روایت میں شیخین کی اقتداء کا حکم ہے۔

فصل:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر رافضی اعتراضات

❖ رافضی مصنف کہتا ہے: امر سوم: ”جو کچھ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں وارد ہوا ہے جیسا کہ آیت غار؛ اور آیت قرآنی ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقِيُّ﴾ [اللیل ۷۱]؛ اور آیت: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولَىٰ بِأَنْسِ شَيْدِي﴾ [الفتح ۱۶]؛ ”دیہاتیوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والوں سے کہہ دیجیے: غنقریب تم ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے۔“ یہاں پر داعی سے مراد ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور یہ کہ آپ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کے خیمہ میں آپ کے ساتھ تھے۔ اور آپ نے نبی کریم ﷺ پر اپنا مال خرچ کیا؛ اور نماز میں آپ کو مقدم کیا گیا۔“ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: غار کے قصہ میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انہیں اس خوف کے پیش نظر ساتھ لے لیا ہو کہ کہیں وہ آپ کا معاملہ ظاہر نہ کر دے۔ نیز یہ کہ یہ آیت اس کے نفیض پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ آیت میں ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کے الفاظ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری؛ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان؛ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدم رضامندی؛ ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ غم و حزن اگر اطاعت کا کام تھا تو پھر یہ بات محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے منع کر دیں۔ اور اگر یہ معصیت کا کام تھا تو پھر جس چیز کو یہ لوگ فضیلت ظاہر کر رہے ہیں؛ حقیقت میں وہ ذلت و رسوائی ہے۔“

نیز کہ آیت کریمہ ﴿فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۖ وَالْمُؤْمِنِينَ﴾ ”پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اپنا سکون نازل فرمایا۔“ قرآن میں جب بھی رسول اللہ ﷺ پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر ہوا ہے تو واضح طور پر اہل ایمان کو سکون و اطمینان کا مورد [اور اس سکون میں آپ کا شریک] قرار دیا گیا ہے، مگر آیت زیر تبصرہ میں یہ صراحت موجود نہیں۔“ اس سے بڑھ کر کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔

❖ نیز یہ کہ آیت قرآنی ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقِيُّ﴾ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے [حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے متعلق نہیں]۔ اس لیے کہ آپ نے اپنے پڑوسی کے لیے کھجور کا درخت خرید کر وقف کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کھجور کے مالک کو جنت میں کھجور کے ایک درخت کی پیشکش کی تھی؛ مگر وہ نہ مانا۔ یہ بات حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے سن لی؛ تو انہوں نے پورا باغ خرید کر اپنے پڑوسی کو ہبہ کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے عوض جنت میں ایک باغ کی خوشخبری سنائی۔

❖ رہی یہ آیت: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولَىٰ بِأَنْسِ شَيْدِي﴾؛ یہاں مراد یہ ہے کہ: ہم تمہیں ایک قوم کی طرف بلائیں گے۔ یہاں پر مراد وہ لوگ ہیں جو صلح حدیبیہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور یہ لوگ

چاہتے تھے کہ خیر کا مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا؛ اور فرمایا: ﴿قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا﴾ آپ فرمادیجیے: تم ہرگز ہماری اتباع نہ کرو گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیر کے اموال غنیمت کو ان لوگوں کے لیے خاص کر دیا تھا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ پھر فرمایا: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَعُدُونَا﴾ یہاں پر مراد یہ ہے کہ: ہم غنیمت تمہیں سخت لڑاکا قوم سے جنگ کرنے کے لیے بلائیں گے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بہت سارے غزوات کی طرف بلایا تھا؛ جن میں غزوہ مؤتہ، غزوہ حنین، تبوک اور دوسرے غزوات۔ پس یہ داعی رسول اللہ ﷺ تھے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ ان لوگوں کا آپ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنا ہی اصل اسلام تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”اے علی! تیرے ساتھ جنگ کرنا میرے ساتھ جنگ کرنا ہے۔“ اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنا کفر ہے۔

✽ جب کہ بدر کے موقع پر جھونپڑے میں آپ ﷺ کے ساتھ ہونے میں کوئی فضیلت نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مونس و غمخوار سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اگر آپ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جنگ لڑنے کا حکم دیں گے تو اس سے فساد پیدا ہوگا؛ اس لیے کہ آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات میں بھاگ چکے تھے۔ پس یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد فی سبیل اللہ کرے۔

✽ اور یہ جھوٹ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے، اس لیے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ مال دار نہ تھے۔ آپ کا باپ فقیر انسان تھا جو کہ ہر دن چند ککڑوں کے عوض عبداللہ بن جدعان کے دسترخوان پر منادی کیا کرتا تھا۔ اگر ابو بکر واقعی مال دار ہوتا تو وہ اپنے باپ کی ضرورت پوری کرتا۔

✽ اور یہ کہ ”ابو بکر رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد درزی کا کام کیا کرتے تھے۔ جب آپ مسلمانوں کے دلی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو درزی کا کام کرنے سے روک دیا۔ تو آپ کہنے لگے: مجھے تو اپنی روزی کے لیے ضرورت ہے۔ تو اس پر آپ کے لیے بیت المال سے یومیہ تین درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال کی وجہ سے غنی تھے اور اس وقت جنگوں یا لشکروں کی تیاری کے لیے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہجرت کے بعد تو کوئی چیز قیمتی ہی نہیں۔ پھر اگر آپ نے کچھ خرچ کیا ہوتا تو ضرور اس کی تعریف میں قرآن بھی نازل ہوتا؛ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى﴾

✽ اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ جن لوگوں پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے خرچ کیا، رسول اللہ ﷺ ان سب سے افضل و اشرف تھے۔ جس مال کے خرچ کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں، وہ بہت زیادہ ہے۔ مگر پھر بھی اس بارے میں قرآن کا نازل نہ ہونا ان کی روایات کے جھوٹ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

جہاں تک نماز کے لیے امام بنانے کا تعلق ہے: یہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اذان دی تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ: ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے آگے کیا جائے۔ جب نبی کریم ﷺ کو افاقہ ہوا تو آپ نے تکبیر کی آواز سنی! آپ نے پوچھا: نماز کون پڑھا رہا ہے؟ تو لوگ کہنے لگے: ابو بکر رضی اللہ عنہ۔ تو آپ نے فرمایا: مجھے لے چلو! تو آپ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان چلتے ہوئے آئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو قبلہ سے ہٹا کر نماز سے معزول کر دیا۔ اور خود نماز پڑھائی۔“

[پھر] رافضی نے کہا ہے: ان لوگوں کے دلائل کا یہ عالم ہے۔ عقلمند کو انصاف کی نظر سے دیکھنا چاہیے تاکہ وہ حق کی اتباع کا قصد کر سکے! اور خواہشات کے پیچھے نہ پڑا رہے۔ اور اپنے آباء و اجداد کی تقلید کو ترک کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس سے منع کیا ہے۔ اور انسان کو اس کی دنیا حق دار تک حق پہنچانے سے غافل نہ کر دے۔ اور نہ ہی مستحق کو اس کے حق سے روکے۔ یہ آخری بات ہے جو ہم اس مقدمہ میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔“ [ابھی کام رافضی]

جوابات:

ہم شیعہ مصنف کے اعتراضات کے جواب میں کہتے ہیں کہ: اس کلام میں اتنا جھوٹ، بہتان اور افتراء پر دازی ہے کہ اتنا جھوٹ اسلامی گروہوں میں سے کسی ایک کے ہاں بھی نہیں دیکھا گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی قوم میں یہودیوں کی بہت زیادہ قوی مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے نور کو پورا کرنا چاہتا ہے بھلے وہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

ہر عقلمند انسان کے لیے حضرات شیخین اسلام جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل کھلے ہوئے اور صاف واضح ہیں۔ اور ان کی فضیلت دوسرے صحابہ کرام پر عیاں راچہ بیاں کے مصداق ہے۔ جب کہ یہ رافضی چاہتے ہیں کہ حقائق کو تبدیل کر ڈالیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مصداق چل رہے ہیں:

﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَبَ بِالْصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ﴾ [الزمر ۳۲]

”پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچی بات اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلادیا۔“

نیز اللہ تعالیٰ کہ یہ فرمان بھی ان لوگوں پر صادق آتا ہے:

﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ﴾ [یونس ۱۴]

”پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے ایسے مجرم کبھی فلاح نہیں پاتے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی حق کی تکذیب اور باطل کی تصدیق کرنے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں امت میں کوئی دوسرا ان کے برابر نہیں ہو سکتا۔

[اب جملہ اعتراضات کا تفصیلی جواب ملاحظہ فرمائیں:]

واقعہ غار کی فضیلت:

[پہلا اعتراض]: غار کے واقعہ میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔

✽ غار کے واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت نص قرآنی سے واضح ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰]

”جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

یہاں پر رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ: بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ اللہ

تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام سے فرمایا تھا: ﴿إِنِّي مَعَكُمْ أَسْمِعُ وَأُذِي﴾ (طہ: ۴۶)

”بیشک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔“ یہ معیت خاصہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم غار میں تھے تو میں نے دیکھا کہ دشمنوں کے پاؤں ہمارے سر کے اوپر تھے۔

میرے جی میں آیا کہ اگر کفار میں سے کوئی اپنے پاؤں پر نظر ڈالے تو ہم کو دیکھ لے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ابوبکر! ان دو

آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔“^۱

اس حدیث کے متفق علیہ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام اہل محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہے؛ اور اسے قبول و تصدیق

حاصل ہے۔ اور اس میں کبھی بھی دو آدمیوں نے اختلاف نہیں کیا۔ یہ بالکل معنوی لحاظ سے قرآنی دلالت کے عین مطابق

ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰]

”جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

کتاب اللہ میں معیت کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ خاص معیت اور عام معیت۔

معیت عامہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ

وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحديد: ۴)

”اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی، اسے بھی جانتا

ہے اور جو نکلتی ہے اسے بھی (اسی طرح) جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس میں

چڑھتا ہے اسے بھی۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب مناقب المهاجرین و فضلہم (ج: ۳، ۳۶۵۳، ۳۹۲۲)،

صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ج: ۲، ۲۳۸۱)۔

﴿أَلَمْ تَرَى أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا آذَنِي مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (المجادلة ۷)

”کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں موجود ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں مشورہ ہو تو چوتھا وہ (اللہ) نہ ہو یا پانچ آدمیوں میں مشورہ ہو تو ان کا چھٹا وہ نہ ہو۔ (مشورہ کرنے والے) اس سے کم ہوں یا زیادہ، وہ یقیناً ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ پھر وہ قیامت کے دن انہیں بتا بھی دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“

یہاں پر معیت کا لفظ عام ہے جو ہر سرگوشی اور مشورہ کرنے والے کو شامل ہے؛ اور ایسے ہی پہلی آیت میں معیت عام ہے جو تمام خلق کو شامل ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنی معیت کے اعتبار سے تین کیساتھ چوتھا ہوتا ہے۔ اور پانچ کیساتھ چھٹا ہوتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے بھی یہی فرمایا کہ: ”ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔“ اس لیے کہ جب اللہ ان کے ساتھ تھا تو وہی تیسرا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم اس حدیث کے معانی پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ یہ معیت خاص ہے؛ اور آیت میں مذکور معیت عام ہے۔

جب کہ معیت خاصہ؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام سے فرمایا تھا: ﴿إِنِّي سَمِعْتُ وَآرِي﴾ (طہ ۴۶) ”بیشک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں“ سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔“ یہ معیت خاصہ ہے۔ جس میں فرعون اور اس کی قوم کو چھوڑ کر ان دو انبیاء کرام علیہ السلام کی تخصیص کی گئی ہے۔ جب کہ پہلی معیت عام ہے۔ یہاں پر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کی تخصیص ہے۔

ایسے ہی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿لَا تَخْزَنْ لَإِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ تو اس سے مراد یہ ہوئی کہ: اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، ان مشرکین کے ساتھ نہیں جو آپ سے دشمنی رکھتے ہیں، اور ان دونوں کی طلب میں لگے ہوئے ہیں جو غار کے منہ تک پہنچ گئے تھے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا تو وہ انہیں دیکھ لیتا۔

یہاں پر رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ سے مقصود خاص معیت ہے۔ جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف تائید اور کامیابی حاصل ہوگی؛ اور دشمن کے خلاف نصرت ملے گی۔ گویا کہ رسول اللہ ﷺ یہ بتا رہے ہیں کہ: اے ابوبکر! بیشک اللہ تمہاری میری بھی مدد کرے گا اور تیری بھی مدد کرے گا؛ اور ہمیں ان کے خلاف کامیابی عطا فرمائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد اکرام و محبت کی مدد ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [غافر ۵۱]

”یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگی دنیا میں بھی کریں گے۔“

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدح کی انتہاء ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے صاحب ایمان ہونے کی

گواہی دی ہے۔ اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی اور رسول اللہ ﷺ کی مدد کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوق سے بے نیاز کر دیا تھا۔ جیسا کہ فرمان الہی ہے:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة: ۴۰]

”اگر تم آپ کی مدد نہیں کرتے، تو کچھ مضائقہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی تھی۔ جب کافروں نے آپ کو نکال دیا تھا۔ جب آپ دو کے دوسرے تھے۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔“

اسی لیے محدث سفیان ابن عیینہ رحمہ اللہ اور دیگر محدثین فرماتے ہیں:

”نبی ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا سب لوگوں کو معتب کر تے ہوئے فرمایا ہے۔ اور آپ یہ بھی فرماتے ہیں: جو کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے کا انکار کرے، وہ کافر ہے۔“

امام ابوالقاسم سبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ معیت خاصہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے لیے ثابت نہیں ہوئی۔“

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ: ”ما ظنك باثنين الله ثالثهما۔“ ”ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ

کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔“ یہاں پر اختصاص لفظی اور معنوی طور پر ہر دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے کہا جاتا تھا: ”محمد رسول اللہ۔“ پس آپ کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند ولایت پر جلوہ افروز ہوئے تو کہا جانے لگا: ”خليفة رسول اللہ۔“ پس لوگ خلیفہ کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی طرف کیا کرتے تھے۔ جن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف تھی۔ اور یہی اس کلمہ کی تحقیق ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَكَ﴾ اور اس کلمہ: ”ما ظنك باثنين الله ثالثهما۔“ کی حقیقی تفسیر تو ضیح اسی صورت میں ممکن ہے۔

پھر جب آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو کہا جانے لگا: ”امير المؤمنين۔“ پس وہ اختصاص ختم ہو گیا جو حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص تھا۔

[صحابی کی تعریف]:

اور مزید اس چیز سے یہ موقف واضح ہوتا ہے کہ اس صحبت میں عموم و خصوص پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ:

”فلاں کو ایک گھڑی کی صحبت نصیب ہوئی؛ فلاں کو ایک دن کی صحبت نصیب ہوئی؛ ایک ہفتہ کی؛ ایک ماہ کی؛ اور سال

کی صحبت نصیب ہوئی۔ اور فلاں نے تمام عمر صحبت میں گزاری۔“

جب یہ معلوم ہو گیا کہ صحبت کا لفظ عام ہے جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہے؛ اس کی سب سے ادنیٰ مقدار یہ ہے کہ کچھ تھوڑا

سازمانہ صحبت حاصل رہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابیت کی اعلیٰ بلندیوں پر ہیں۔ آپ کا مرتبہ سب سے

اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ آپ اس وقت صحابی بنے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا؛ اور مرتے دم تک آپ کی صحبت میں

رہے۔ اور تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آزاد مردوں میں سے نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی جناب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جیسا کہ اس بات پر بھی اجماع ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی شخصیت

جناب ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اور بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور غلاموں میں سے پہلے مؤمن حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے کلمہ توحید کس نے پڑھا۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اقرار توحید حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے ثابت ہو جائے تو پھر آپ صحبت میں بھی مقدم ہوئے۔ جیسا کہ آپ کو ایمان میں سبقت حاصل ہے۔ اور اگر پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو پھر بھی اس بات میں کوئی شک نہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحبت زیادہ کامل اور نفع بخش تھی۔ کیونکہ آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ امور دعوت میں شریک ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ پر اکابر اہل شوری اسلام لائے۔ جیسا کہ حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہم۔ نیز آپ رسول اللہ ﷺ کا ایذا رسالوں سے دفاع کرتے تھے۔ اور آپ کے ساتھ قبائل کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے؛ اور امور دعوت میں آپ کے معین و مددگار ہوتے۔

آپ ان لوگوں کو خرید کر آزاد کرتے جنہیں ایمان لانے کی پاداش میں عذاب دیا جا رہا ہوتا؛ جیسا کہ حضرت بلال، حضرت عمار اور دیگر مظلوم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ آپ نے سات ایسے لوگوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں اللہ پر ایمان لانے کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔ آپ علی الاطلاق اپنی صحبت میں سب سے زیادہ نفع بخش انسان تھے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال جاننے والے اہل علم کے مابین اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کئی وجوہات کی بنا پر باقی تمام صحابہ کرام کی صحبت سے مکمل تھی۔

۱۔ ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ آپ دن اور رات؛ سفر اور حضر میں ہر وقت سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ آپ فرماتی ہیں:

”جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت میرے والدین اسلام لا چکے تھے؛ ہم پر کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب صبح و شام نبی کریم ﷺ ہمارے گھر میں تشریف نہ لاتے ہوں۔“

سو نبی کریم ﷺ شروع شروع میں صبح و شام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس وقت اسلام بہت کمزور تھا؛ اور دشمنان دین بہت زیادہ تھے۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انتہاء درجہ کی فضیلت اور صحبت میں خصوصیت کی علامت ہے۔

[ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مشاورت رسول اللہ ﷺ]:

مزید برآں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عشاء کے بعد بیٹھ کر گفتگو کیا کرتے تھے؛ اور مسلمانوں کے مختلف امور میں مشاورت اور بات چیت ہوتی۔ یہ خصوصیت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہے کسی دوسرے صحابی کو نہیں۔

مزید برآں جب رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کرتے تو شوری میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کلام کرتے۔ بسا اوقات کوئی دوسرا پہلے بول پڑتا؛ اور بسا اوقات کوئی بھی آپ کے علاوہ نہیں بولتا۔ تو پھر صرف آپ کی رائے کے مطابق ہی عمل کیا جاتا۔ اور جب کسی کی رائے آپ کی رائے کے خلاف ہوتی تو رسول اللہ ﷺ آپ کے مخالف کی رائے کو ترک کر دیتے اور صرف آپ کی رائے کے مطابق عمل کرتے۔

پہلے واقعہ کی مثال: جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا؛ تو سب

سے پہلا مشورہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہی دیا۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ: جب حدیبیہ کے موقع پر مشورہ کیا گیا کہ: کیا ان لوگوں کے اہل و عیال پر شیخون مارا جائے جنہوں نے قریش کی مدد کی یا پھر بیت اللہ کی طرف سفر جاری رکھا جائے۔ اور پھر جو کوئی اس راہ میں رکاوٹ بنے، اس سے لڑائی کی جائے۔ اہل علم: اصحاب تفسیر و حدیث، مغازی و سیر و فقہ کے ہاں یہ حدیث معروف ہے۔ اسے امام بخاری و احمد بن حنبل رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت گزاری]:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے اطاعت گزار تھے۔ آپ سے کبھی بھی مخالفت نبوت میں کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ بلکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کے بعد آپ سے مناظرہ کیا تو آپ نے وہی جواب دیا جو اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا تھا۔ حالانکہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ جواب نہیں سنا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی موافقت اور مطابقت پر سب سے واضح دلالت ہے۔ اور یہ کہ آپ کا قول و عمل: علم اور حال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ اس لیے کہ آپ وہی بات فرمایا کرتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی بات ہوتی۔ اور وہی کام کیا کرتے تھے جو آپ کا کام ہوتا۔ خصوصاً ان مواقع پر جب دوسرے لوگوں پر آپ کی فضیلت ظاہر ہوئی۔ تو کہاں آپ کا مقام و مرتبہ اور کہاں دوسرے لوگوں کا مقام و مرتبہ؟

ایک آپ سے مناظرہ کر رہا ہے تاکہ آپ اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔ دوسرے کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ کا نام مٹا دے مگر وہ ایسا نہیں کر رہا۔ دوسرا کہہ رہا ہے: اگر میں رسول اللہ ﷺ سے ان کا فیصلہ واپس کروا سکتا تو ضرور ایسا کروا دیتا۔ آپ لوگوں کو قربانیاں کرنے کا حکم دے رہے ہیں تو لوگ توقف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ جن لوگوں نے ایسے کیا اس کے پیچھے بھی اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور کفار سے بغض و نفرت کا عنصر شامل تھا۔ اور انہیں یہ بات محبوب تھی کہ ایمان کفر پر غالب اور سر بلند رہے۔ اور یہ کہ اہل ایمان پر اہل کفر کی وجہ سے کوئی بزدلی، کمزوری یا رسوائی داخل نہ ہو۔ اور ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان سے لڑ پڑیں تاکہ مسلمانوں کو اس دہلی ہوئی صلح کی وجہ سے بزدلی اور دب جانے کی عار لاحق نہ ہو۔

یہ بات تو معلوم شدہ ہے کہ نص کو رائے پر تقدیم حاصل ہوتی ہے؛ اور شریعت کو خواہشات نفس پر۔ وہ بنیادی اصول جس میں انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والے اور ان کا انکار کرنے والے متفرق ہو گئے؛ وہ اصول یہی تھا کہ نصوص کو آراء پر شریعت کو اہواء پر تقدیم حاصل ہے۔ اور شرکی اصل بنیاد رائے کو نص؛ اور خواہشات کو شریعت پر مقدم کرنا ہے۔ پس جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے روشن کر دیا ہو، تو اسے نصوص و شریعت میں موجود خیر و بھلائی نظر آنے لگ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی نص رسول اللہ ﷺ اور حکم شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ رائے یا خواہش نفس کی وجہ سے ٹکرایا نہیں جاسکتا۔

لیکن یہاں مطلوب یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے زیادہ اکمل و افضل اور خیر و بھلائی کے کاموں میں

سبقت لے جانے والے تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی دوسرا انسان آپ کا ہم پلہ اور مثل نہیں تھا۔

یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے احوال سے جاہل کے علاوہ کوئی دوسرا انسان شک نہیں کر سکتا۔ یا پھر کوئی ایسا خواہشات پرست انسان ہو جس کو اس کی خواہشات نے قبول حق سے روک رکھا ہو۔ وگرنہ جس انسان کے پاس علم اور عدل ہو؛ وہ کسی طرح بھی اس معاملہ میں شک کا شکار نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس مسئلہ میں اہل علم و ایمان شک نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ اس دور کے تمام لوگ باقی صحابہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور تقدیم پر متفق تھے؛ اور بعد میں آنے والے اہل اسلام اور بہترین لوگ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کا بھی اس پر اتفاق تھا۔

جس کسی کا یہ خیال ہو کہ حدیبیہ کے موقع یا پھر دیگر مواقع پر مخالفین کی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت؛ ایسا گناہ ہے جو کہ توبہ سے کبھی معاف نہیں ہو سکتا، تو یقیناً ایسا انسان غلطی کا شکار ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی بات بھی غلط ہے جو مخالفت حکم نبوی کے مرتکبین کی طرف سے عذر پیش کرتے ہوئے اور ان سے ملامت کو ختم کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ: انہوں نے حلق اور قربانی میں تاخیر اس لیے کی کہ یہ لوگ انتظار کر رہے تھے کہ شاید اس کی منسوخی کا حکم آجائے یا پھر اس کے خلاف وحی نازل ہو جائے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ: ”آپ کی اطاعت سے پیچھے رہ جانے والے اس وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے کہ یا تو آپ ﷺ کے مرتبہ کی تعظیم کا لحاظ تھا، اس لیے آپ کا نام نہیں مٹایا۔ یا پھر مشرکین سے صلح کے مسئلہ پر تکرار کرنے والوں کا مقصد کفر پر اسلام کا غلبہ اور اسلام کے ظہور و پذیرائی کا تھا۔ یہ اس طرح کی دیگر توجہات تھیں۔

تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کی طرف سے امر جازم سے مراد ایجاب تھا۔ جو کہ باتفاق اہل ایمان موجب اطاعت تھا۔ اس میں بعض ان لوگوں نے تنازعہ کیا جن کا یہ خیال تھا کہ یہ ایسا حکم جازم نہیں جس کا ماننا واجب ہو۔ اگر اس کا واجب اطاعت ہونا ظاہر ہوتا تو پھر کوئی ایک بھی اس کی تعمیل میں شک تک بھی نہ کر سکتا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: آپ ﷺ کی طرف سے سر منڈوانے اور قربانیاں کرنے کا حکم صادر ہونا حکم جازم تھا؛ جس کا تقاضا یہ تھا کہ فی الفور اس کی اطاعت کی جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے تین بار ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب ان میں سے کوئی ایک بھی اس حکم کی تعمیل کے لیے نہیں اٹھا تو آپ ﷺ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے؛ اور ان کے سامنے لوگوں کے اس رد عمل کا ذکر کیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ غصہ میں تھے؛ اور فرمایا: ”میں غصہ کیونکر نہ ہوں“ جب میں کسی بات کا حکم دیتا ہوں تو اس کی اجاع نہیں کی جاتی۔“^①

اور یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ یہ جملہ آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب آپ نے حجة الوداع کے موقع پر لوگوں کو حلال ہونے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ عمرہ محصورہ سے تحلل کا حکم حج کے موقع پر عمرہ کے بعد تحلل کے حکم سے زیادہ مؤکد تھا۔

مزید برآں یہ کہ آپ کو اس موقع پر تحریر نامہ سے اپنا نام مٹانے کی ضرورت تھی تاکہ صلح اپنی منطقی انجام کو پہنچ سکے۔ اسی لیے آپ نے اپنے دست مبارک سے اسے مٹا دیا۔ اور یہ حکم ایک امر جازم تھا؛ اس حکم کی مخالفت کرنے والا اگرچہ متاویل تھا؛

① صحیح بخاری، کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجہاد، (ح: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

اور اس کا گمان یہ تھا یہ حکم ماننا واجب نہیں؛ اس لیے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے احترام میں کمی آتی ہے۔ یا پھر اس میں عمرہ کا انتظار اور صلح کا عدم اتمام تھا۔ متاؤل کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اجتہاد میں غلطی پر تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا پختہ حکم دیا تھا؛ اور بات نہ ماننے والوں کی شکایت بھی کی تھی اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں غصہ نہ ہوں جب کہ میں ایک بات کا حکم دے رہا ہوں اور میری بات نہیں مانی جا رہی۔“ تو ایسے موقع پر آپ کے حکم کی مخالفت کرنے کی گنجائش کسی ایک کے لیے بھی نہ تھی۔ لیکن یہ ایسی لغزش تھی جس سے صحابہ نے توبہ کر لی جیسا کہ دوسرے گناہوں سے توبہ کر لی تھی۔

پس کسی ایک کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے کو معصوم ثابت کرے جو کہ حقیقت میں معصوم نہیں ہے۔ پھر اس سے حقیقی معصوم ﷺ کی شان میں قدح وارد ہو۔ جیسا کہ ان توبہ کرنے والوں کے متعلق کیا گیا۔ اس گناہ کی وجہ سے انہیں ایک قسم کی سزا ملی؛ اور ان لوگوں سے اس چیز کی نفی کرنے لگ گئے جس کی وجہ سے ان پر ملامت واجب ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے گناہ گاروں کو ملامت کیا ہے [یعنی اس کے بعد پھر ان لوگوں نے توبہ کر لی؛ اور ان سے ملامت ختم ہو گئی] مگر یہ بشریت کی تعظیم میں اتنا آگے نکل گئے کہ اللہ رب العالمین کی شان میں قدح کرنے لگے۔ [یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا اعتبار نہ رہا؛ اور گنہگار کو غیر گنہگار شمار کرنے لگے۔]

فضائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ:

اس سے بڑھ کر یہ کہ محدثین و فقہاء کے سوا جملہ ارباب فنون سے غلطی صادر ہو سکتی ہے۔ محدثین و فقہاء کسی باطل مسئلہ پر جمع ہو سکتے ہیں نہ بیچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو بیچ قرار دے سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام! یہ کہ جو شخص بھی زحمت فکر و تامل گوارا کرتا ہے اس پر حضرت صدیق کے فضائل روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ فضائل آپ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں۔ مثلاً یہ آیات و احادیث نبویہ:

① آیت قرآنی: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ①

② حدیث نبوی: "إِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيلُ اللَّهِ" ②

③ یہ حدیث کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کو سب مردوں سے محبوب تر تھے۔ ③

④ وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو فرمایا کہ: "اگر مجھے زندہ نہ پاؤ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہونا۔" ④

⑤ وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے عہد نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ ⑤

⑥ وہ حدیث جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سب سے پہلے ایمان لانے اور اسراء کی تصدیق کرنے کی وجہ سے لقب صدیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ⑥

② صحیح مسلم (۷/۲۳۸۳)

④ البخاری (۳۶۵۹)، صحیح مسلم (۲۳۸۶)

⑥ مستدرک (۳/۶۲)، مجمع الزوائد (۹/۴۱)

① صحیح بخاری (۳۶۵۲)، مسلم (الزہد: ۷۵/۲۰۰۹)

② صحیح بخاری (۳۶۶۲)، صحیح مسلم (۲۳۸۴)

⑤ صحیح بخاری (۵۶۶۶)، صحیح مسلم (۲۳۸۷)

⑦ یہ حدیث ”فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوا لِي صَاحِبِي“^①

⑧ جس حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب عقبہ بن ابی معیط نے نبی ﷺ کے گلے میں چادر ڈالی تھی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو چھڑایا۔ اور آپ نے اس وقت فرمایا تھا: ﴿أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ﴾ [غافر ۲۸]
”کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔“^②

⑨ جس حدیث میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امام صلوٰۃ^③ اور امیر حج مقرر کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔^④

⑩ وہ حدیث جس میں وفات رسول کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صبر و ثبات اور استقلال اور امت کی فرماں برداری کا ذکر کیا گیا ہے۔^⑤

⑪ وہ حدیث جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ان اعمال صالحہ کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ نے ایک دن میں انجام دیے تھے؛ جس بھی انسان میں یہ تمام فضائل پائے جائیں، اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔^⑥

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے کچھ فضائل ایسے بھی ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے سہیم و شریک ہیں، چنانچہ یہ احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے: ”میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم آئے ہیں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم گئے۔“^⑦

② وہ حدیث جس میں کنوئیں سے پانی کھینچنے کا ذکر ہے۔^⑧

③ وہ گائے والی حدیث کہ: جس میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ”میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔“^⑨ ان کی مثالیں اور بھی ہیں۔

صحاح ستہ میں فضائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیثیں صحیح ہیں:

۱۔ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو کہ حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے بس یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۲۔ غزوہ خیبر کے موقع پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ کل میں ایک شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوگا، اور جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں گے۔“

۳۔ اور یہ صفت جو کہ ہر مومن اور مسلمان کے لیے واجب اور باعث فضیلت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ عہد ہے کہ:

”صرف مومن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کریں گے اور صرف منافق آپ سے بغض رکھیں گے۔“

۴۔ اور وہ روایت جس میں اراکین شوریٰ کا ذکر ہے۔

② صحیح بخاری (۳۶۷۸)

① صحیح بخاری (۳۶۶۱)

④ البخاری (۴۳۱۳)، صحیح مسلم (۱۳۴۱)

③ صحیح بخاری (۶۷۸)، صحیح مسلم (۴۱۸)

⑥ صحیح مسلم (۱۰۲۸)

⑤ صحیح بخاری (۳۶۶۸، ۳۶۶۷)

⑦ البخاری، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ (ح: ۳۷۰۶)، مسلم، باب من فضائل علی بن ابی طالب (ح: ۲۴۰۴)۔

⑧ صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث: ۳۷۰۱)، صحیح مسلم۔ حوالہ سابق (حدیث: ۲۴۰۹)۔

⑨ صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی رضی اللہ عنہ (حدیث: ۷۸)۔

۵۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خبر دینا کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو وہ حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد اور حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہم سے راضی تھے۔^۱

خاص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب و فضائل کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہونے والی احادیث کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر روایات ہیں مگر وہ آپ کے ساتھ مختص نہیں۔ صحاح میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل سے متعلق بیس احادیث مذکور ہیں، ان میں سے اکثر میں آپ کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔

جو انسان یہ کہتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے صحیح سند کے ساتھ اتنے فضائل ثابت ہیں جو کسی دوسرے کے لیے نہیں؛ تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بات امام احمد اور دوسرے ائمہ و محدثین نے نہیں کہی۔ آپ کے حق میں بھی وہی روایات وارد ہوئی ہیں جو کہ آپ جیسے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہیں۔ لیکن ان میں اکثر روایات ایسی ہیں جن کا جھوٹ اور غلط ہونا سب کو معلوم ہے۔ ایک ایسی دلیل جو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو؛ اور کسی بھی معارض سے خالی ہو؛ وہ ان بیس دلیلوں سے بہتر ہے جن کے مقدمات باطل پر اور اسناد کمزور ہوں۔ اور وہ ایسی صحیح احادیث سے ٹکراتی ہو جو کہ اس کے متناقض ہو۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صحبت ایمانی میں وہ اختصاص حاصل ہے جس میں مخلوق میں سے کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ نہ ہی قدر کے اعتبار سے نہ ہی صفت کے اعتبار سے اور نہ ہی نفع مندی کے اعتبار سے۔ اس لیے کہ اگر وہ وقت جمع کیا جائے جس میں نبی کریم ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل بیٹھا کرتے تھے؛ اور پھر حضرت عثمان و علی اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اجتماع کا وقت جمع کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دیا جانے والا وقت ان سب کے اوقات سے دو گنا ہی نہیں بلکہ کئی گنا زیادہ ہے۔

جب کہ ان سب کے مابین مشترک اوقات کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔

جب کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کمال محبت، معرفت؛ اور ہر معاملہ میں آپ کی تصدیق یہ سب پرایسے غالب اور ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال کی معرفت رکھنے والے کسی بھی انسان پر مخفی نہیں اور جس انسان کو اس قوم کے احوال کی معرفت نہیں ہے تو اس کی گواہی ناقابل قبول اور مردود ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کو دینی امور میں حاصل ہونے والی معاونت اور نفع کا بھی یہی حال ہے۔

ان امور کا شمار صحبت کے ان مقاصد اور محامد میں سے ہوتا ہے جن کی وجہ سے کسی صحابی کو دوسروں پر فضیلت دی جاسکتی ہو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ہر لحاظ سے وہ اقدار و صفات و خصوصیات ثابت ہیں جن میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں۔

اس کی دلیل: بخاری و مسلم میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

۱ یہ روایت بخاری میں تو نہیں ملی مگر دوسری کتابوں میں ہل یوسف بن کھل کی سند سے روایت کی گئی ہے۔ اس روایت میں ہے: ”جب رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع سے واپس مدینہ تشریف لائے؛ تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے؛ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا: ”ارے لوگو! ابو بکر رضی اللہ عنہ کی قدر پہچانو، اللہ کی قسم اس نے کبھی مجھے اہم و رنج نہیں پہنچایا۔ ارے لوگو! میں ابو بکر و عمر و عثمان اور علی طلحہ و زبیر اور عبدالرحمن بن عوف اور مہاجر بن اولین سے رضی اللہ عنہم سے راضی ہوں ان کی قدر پہچانو۔“ معجم الصحابة لابن قانع ج ۱: ۴۹۶۔ المعجم الكبير للطبرانی ج ۱: ۵۵۶۔ معرفة الصحابة لابی نعیم الأصبہانی؛ حدیث: ۲۹۳۳۔ سیرت نبویہ از ابن کثیر ۴/ ۴۲۶۔

”میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا، اسی دوران ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے کا کنارہ پکڑے ہوئے آئے اور اپنے دونوں زانوئیں گنے کر دیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگو! تمہارا ساتھی کسی سے جھگڑ پڑا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سلام کے بعد عرض کیا: میرے اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تنازع تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لیا، پھر مجھے مذمت کا احساس ہوا تو میں نے کہا: ”معاف کر دیجیے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، میں اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا اے ابو بکر! اللہ تمہیں معاف فرمائے۔“

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نام ہوئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کو آئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نہ پا کر وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ذکر کر دو بار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے میری ہمدردی کی۔ اب کیا تم میرے رفیق کو میرے لیے رہنے دو گے یا نہیں؟“

آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے رنج نہ پہنچایا۔^❶

ایک دوسری روایت میں ہے: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر غصہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے چل دیے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی پیچھے ہوئے اور معافی چاہی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاف نہیں کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ اس حدیث کے آخر میں ہے: یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ذکر کر دو بار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی۔“ [بخاری]

یہ صحیح حدیث ہے! اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کی تخصیص ہے۔ جیسا کہ خود فرمان نبوت سے ظاہر ہے:

”اے لوگو! کیا تم میرے لیے میری ساتھی کو نہیں چھوڑو گے۔“ اور پھر اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

”جب اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا تو میں نے نبوت کا اعلان کہ: ”اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔“ تم نے مجھے جھٹلایا۔ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی بات کو نہیں جھٹلایا۔ اور جب تمام لوگ آپ ﷺ کو جھٹلا رہے تھے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی تصدیق کر رہے تھے۔“

یہ تو ایک کھلا ہوا معاملہ ہے۔ آپ نے ان تمام لوگوں سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی جن تک رسالت پہنچی تھی۔ یہ حق بات ہے کہ آپ پہلے انسان ہیں جن تک جب اللہ کا پیغام پہنچا تو فوراً ایمان لے آئے۔ یہ حضرت عمرو بن عیسہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے موافق ہے جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”لو كنت متخذاً خليلاً (ح: ۳۶۶۱)“

کے ساتھ اس معاملہ میں اور کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ایک غلام اور ایک آزاد۔ اس دن آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما تھے۔“ [مسلم ۱/۵۶۹، نسائی ۱/۲۸۳]

جہاں تک حضرت خدیجہؓ حضرت زید اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا تعلق اس حدیث کے حوالے سے ہے، تو ان حضرات کا شمار آپ کے کنبہ کے افراد میں ہوتا تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہا کو تمام ماجرا سنایا۔ تو آپ نے تبلیغ کا حکم نازل ہونے سے قبل ہی آپ نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ پر ایمان لانا ابھی واجب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ آپ پر ایمان لانا اس وقت سے واجب ہوا ہے جب سے تبلیغ رسالت کا حکم ملا۔ پس تبلیغ رسالت کا حکم ملنے کے بعد آزاد مردوں سب سے پہلے تصدیق کرنے والے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے کہ اس وقت ابھی یہ واجب نہیں ہوا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بچے تھے، اور بچے پر کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔

کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تبلیغ رسالت اور ایمان کی دعوت سے پہلے کسی کو تبلیغ کی ہو یا پھر ایمان کی دعوت دی ہو۔ لیکن یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں پرورش پا رہے تھے؛ جب آپ کو حضرت خدیجہ رضی اللہا کے ذریعہ سے اس معاملہ کی خبر ملی ہوگی تو آپ بھی تبلیغ رسالت سے قبل ایمان لے آئے ہوں گے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

”اے لوگو! میں تمہاری طرف مبعوث ہوا؛ میں نے اعلان کیا: ”اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کی طرف سے رسول ہوں۔ تو تم لوگوں نے مجھے جھٹلایا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی۔“

صحیحین میں بھی اس طرح کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تبلیغ رسالت پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام لوگوں نے شروع میں آپ کی تکذیب کی تھی۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہا اور حضرت زید و علی رضی اللہا آپ کے گھر میں تھے۔ خدیجہ رضی اللہا نے آپ کی تکذیب نہیں کی؛ اس لیے آپ کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جن کو تبلیغ کی گئی ہو۔

یہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کہ: یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ اس معاملہ میں اور کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ایک غلام اور ایک آزاد۔“

یہ مسلم شریف کی دوسری روایات کے موافق ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ: جن کو دعوت دی گئی اور جن تک تبلیغ رسالت کی گئی ان میں یہ دو حضرات شامل تھے۔ اور پھر آپ ﷺ نے ذکر کیا: ”اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مال و جان سے میری عنفوانی کی۔“ یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے، جس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک و سہم نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ سے اس طرح کی دیگر متواتر روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ پڑھا، تو فرمایا:

”یقیناً سمجھو کہ اللہ سبحانہ نے ایک بندہ کو دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا (چاہے جس کو پسند کرے) اس نے اس چیز کو اختیار کر لیا، جو اللہ کے ہاں ہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ (یہ سن کر) رونے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ: ایسی کیا

چیز ہے، جو اس بوڑھے کو رلا رہی ہے، اگر اللہ نے کسی بندہ کو دنیا کے اور اس عالم کے درمیان میں، جو اللہ کے ہاں ہے، اس نے اختیار دیا اور اس نے اس عالم کو اختیار کر لیا، جو اللہ کے ہاں ہے (تو اس میں رونے کی کیا بات ہے، مگر آخر میں معلوم ہوا کہ)۔ وہ بندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب میں زیادہ علم رکھتے تھے، پھر آپ نے فرمایا کہ اے ابوبکر تم نہ روؤ کیونکہ یہ بات یقینی ہے سب لوگوں سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والا اپنی صحبت میں اور اپنے مال میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں اپنی امت میں اگر کسی کو ظلیل بناتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوتے لیکن اسلام کی محبت (کافی ہے) مسجد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازہ کے سوا کسی کے دروازہ کو بے بند نہ چھوڑا جائے۔ [صحیح بخاری: ح ۴۵۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض میں جس مرض میں آپ نے وفات پائی ہے، اپنا سر ایک پٹی سے باندھے ہوئے باہر نکلے اور منبر پر بیٹھ گئے، پھر اللہ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا کہ: ”لوگو! ابوبکر سے زیادہ اپنی جان اور اپنے مال سے مجھ پر احسان کرنے والا کوئی نہیں اور اگر میں لوگوں میں سے کسی کو ظلیل بناتا، تو یقیناً ابوبکر کو ظلیل بناتا، لیکن اسلام کی دوستی افضل ہے۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ح ۱۴۵۳]

دوسری روایت میں ہے: ”میں اپنی امت میں اگر کسی کو ظلیل بناتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوتے لیکن اسلامی بھائی چارہ ہی کافی ہے۔“ اور ایک روایت میں ہے: ”لیکن آپ میرے بھائی اور میرے صحابی ہیں۔“

ان تمام روایات سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کے فضائل و اختصاص آپ کے مناقب، دعوت میں کردار اور ادائے حقوق میں آپ کی وہ خصوصیات واضح ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم و شریک نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گونا گوں اوصاف و حماد کی بنا پر ظلیل رسول (آپ کے گہرے دوست) تھے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان میں آپ کا کوئی ظلیل موجود ہو۔ یہ تمام نصوص صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کہ: جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام مخلوق خدا میں سے رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب اور آپ کے نزدیک سب سے افضل تھے۔ جیسا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ نبی کریم ﷺ آپ کو غزوہ ذات السلاسل پر بھیجا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

”یا رسول اللہ ﷺ! ازواج مطہرات میں سے آپ کو کون عزیز تر ہے؟ آپ نے جواب فرمایا: ”عائشہ رضی اللہ عنہا۔“

میں نے عرض کیا اور مردوں میں سے آپ کس کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ فرمایا: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔“

میں نے عرض کیا ان کے بعد اور کس سے؟ فرمایا: ”عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔“

اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دریافت کرتے چلے گئے۔ اور نبی کریم ﷺ نے درجہ بدرجہ متعدد صحابہ کا ذکر کیا۔^①

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے: حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں اس اندیشہ کے تحت خاموش ہو گیا کہ کہیں آپ مجھے سب سے آخر میں نہ کر دیں۔ [بخاری ۵/۵؛ مسلم ۱۸۵۶/۴]

① صحیح بخاری۔ باب غزوة ذات السلاسل، (ح: ۴۳۵۸) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ح: ۲۳۸۴)۔

زیر تبصرہ آیت کی مزید توضیح:

اس کی مزید وضاحت اس آیت قرآنی میں غار کے واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس وقت میں جب کہ باقی تمام مخلوق آپ کی مدد سے عاجز آگئی؛ اس وقت اس شخصیت نے آپ ﷺ کی مدد کی جنہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل تھی۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے:

﴿إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا إِثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة: ۴۰]

”اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔“
یعنی اس حالت میں آپ کو نکالا گیا جب آپ کے ساتھ صرف ایک آدمی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایک سب سے آخری کم عدد ہے جو کہ انتہائی قلت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰]

”جب آپ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

آیت کھل کر دلالت کر رہی ہے کہ آپ کے ساتھی کو آپ کے بارے میں خوف تھا؛ وہ آپ سے سچی محبت کرنے والے اور سچے مددگار تھے؛ اسی لیے آپ کے معاملہ میں غمگین ہو رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالت خوف میں انسان اسی چیز پر غمگین ہوتا ہے جو اسے محبوب ہو۔ جب کہ اگر دشمن کی ہلاکت کے اسباب پیش ہو رہے ہوں تو پھر اس پر کوئی غمگین نہیں ہوتا۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے دشمن ہوتے، جیسا کہ روافض کہتے ہیں، تو وہ دشمن کی آمد پر ہم غم کی بجائے فرح و سرور کا اظہار کرتے۔ اور رسول اللہ ﷺ بھی آپ سے یہ نہ فرماتے: ”غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اظہار غم کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت ان کے شامل حال ہے۔“^①
پس یہ خبر دی جا رہی ہے کہ:

اللہ تعالیٰ ان دونوں کیساتھ ہے اور ان کی مدد کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ اور اہل ایمان کے لیے اس حالت میں نصرت الہی کی خبر دیں کہ وہ باطن میں منافق ہوں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی بھی خبر دینے میں معصوم ہیں۔ آپ حق کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ بات اگرچہ جائز ہے کہ آپ پر بعض لوگوں کا حال مخفی رہ جائے؛ مگر اس سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ لوگ منافق ہی ہیں۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَمَنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدْيَنَةِ مَرَدُوا عَلَى الْبَيْتِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبة: ۱۰۱]

”اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے ان کو ہم جانتے ہیں۔“

① صحیح بخاری (۳۶۵۲)، مسلم (الزهد: ۲۰۰۹)

پس ان لوگوں کے متعلق ایسی خبر دینا جائز نہیں جو ان کے ایمان پر دلالت کرتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تبوک والے سال جب پیچھے رہ جانے والے اپنے عذر پیش کرتے ہوئے تسمیں اٹھاتے ہوئے آئے؛ تو رسول اللہ ﷺ ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرماتے رہے۔ اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کرتے رہے۔ لیکن آپ نے ان میں سے کسی ایک کی بھی تصدیق نہیں فرمائی۔ مگر جب حضرت کعب بن لؤیؓ پیش خدمت ہوئے اور اپنا معاملہ سچائی کے ساتھ پیش کر دیا تو آپ نے فرمایا:

”اس انسان نے سچ کہا۔“ یا یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ”اس نے تم سے سچی بات کہی۔“ [بخاری ۷/۶؛ مسلم ۴/۲۱۲۰]

تو پھر آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیسے یہ فرما سکتے تھے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے؛ اور اس کا کوئی علم آپ کو نہ ہوتا۔ بغیر علم کے بات کرنا جائز نہیں۔ مزید برآں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کے کلام کو برقرار رکھا ہے؛ اس کا انکار نہیں کیا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ: یہ فرمانا: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ”بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ وہ سچی خبر ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور اس پر راضی رہا۔ ان اخبار میں سے نہیں جن کا انکار کیا ہو اور عیب لگایا ہو۔

ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ ایک شخص جو ہر طرف سے دشمنوں کے زرعہ میں ہو، اور تمام لوگ اس کے دشمن ہو، اور اسے قتل کرنا چاہتے ہوں؛ اس انسان کے عزیز و اقارب و رشتہ دار اس کی مدد و نصرت پر قادر نہ ہوں؛ ایسا شخص دوران سفر اپنی رفاقت کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیسے کر سکتا ہے جو باقی لوگوں میں سے اکیلا محبت و دوستی اور غم و پریشانی کا اظہار کر رہا ہو، لیکن باطن میں وہ پکا دشمن ہو۔ اور ساتھ لے جانے والا یہ گمان کر رہا ہو کہ وہ میرا دوست اور غمخوار ہے۔ ایسا تو کوئی بیوقوف ترین انسان بھی نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی پھینکا رہا ہو جو اپنے کامل و اکمل با علم و خبردار و ہوشیار رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی جہالت و حماقت منسوب کرتے ہیں جس کا ارتکاب کوئی ادنیٰ اور جاہل انسان بھی نہیں کر سکتا۔ [یا پھر رسول کریم ﷺ کو جاہل و غبی تصور کرتے ہیں] [نعوذ باللہ من ذلک]۔

مغل بادشاہ خدا بندہ کا عجیب قصہ:

مجھے مغل بادشاہ خدا بندہ؛ جس کے لیے رافضی مصنف نے یہ کتاب تالیف کی تھی؛ اس کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ: جب اس کتاب کے رافضی مصنف نے اس کے سامنے اپنا جھوٹا کلام پیش کیا؛ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کی؛ اور کہا: ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے اور آپ سے بغض رکھتے تھے؛ مگر اس کے ساتھ رافضی یہ بھی کہتے تھے: رسول اللہ ﷺ نے اپنے سب سے عظیم سفر ہجرت میں آپ کو خوف کی وجہ سے اپنے ساتھ ہمراہی بنایا۔ تو اس کے جواب میں اس بادشاہ نے ایسی بات کہی جس کے بعد ان روافض کو ایسے بیہودہ جھوٹ گھڑنے اور بولنے سے رک جانا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسی باتوں سے مبرا و منزہ رکھا ہے۔ لیکن رافضیوں کے اس من گھڑت جھوٹ نے اسے یہ کلمہ کہنے پر مجبور کیا: اس نے کہا: ”پھر تو رسول اللہ ﷺ بہت کم عقل تھے۔“ [معاذ اللہ]۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کوئی رافضیوں کی بتائی ہوئی باتوں پر چلتا ہے وہ قلیل العقل ہی ہوتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایسی باتوں سے بری رکھا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ رافضیوں کے کلام سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں تدرج لازم آتی ہے۔

رفاقت نبوت و صداقت اور رافضی حسد:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

”ممکن ہے نبی ﷺ نے اس لیے رفیق سفر بنایا ہو کہ مبادا وہ آپ کے معاملہ کو ظاہر کر دے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں یہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

پہلی وجہ: قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے الفت و محبت کا سلوک کرتے تھے۔ ان کے مابین کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس سے رافضی کا [دشمنی اور بغض کا] دعویٰ باطل ثابت ہو گیا۔

دوسری وجہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مومن و محب رسول ہونا تو اتر معنوی کے ساتھ معلوم ہے۔ اور یہ کہ آپ کو تمام مخلوق میں خصوصیت حاصل تھی۔ یہ تو اتر اور اس کی شہرت حاتم طائی کی سخاوت اور عمرہ کی شجاعت؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اور موالات کے تو اتر سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ دیگر بھی معنوی تو اترات ہیں جن میں تمام اخبار و روایات کا ایک مقصود پر اتفاق ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت میں شک کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی بھی دوسرے کی محبت میں شک کرنا؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

مگر روافض کے تعصب و عناد کا کیا علاج؟ روافض کے عناد کا یہ عالم ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حجرہ نبویہ میں مدفون ہیں۔ اور بعض آپ کے ساتھ غار میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے موجود ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ مگر رافضی قوم سے اس طرح کی بہتان تراشی کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ روافض بہتان تراش قوم ہیں جو ایسی چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن کا ثابت ہونا ضرورت کے تحت معلوم ہے؛ اور معقولات و منقولات ایسی چیزوں کو ثابت کرنے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جن کا منقہ ہونا ضرورت کے تحت معلوم ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باقی تمام لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے موالات اور دوستی رکھنے والے تھے۔ یہ بات اتنی مشہور ہے کہ اسے مسلمان اور کافر نیک اور بد ہر کوئی جانتا ہے۔ حتیٰ کہ میں زنادقہ کے ایک ایسے گروہ کو بھی جانتا ہوں جو کہتے ہیں: دین اسلام میں اندرون خانہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اتفاق ہو گیا تھا؛ ان کے ساتھ تیسرے عمر رضی اللہ عنہ بھی مل گئے۔ لیکن انہیں ان دو حضرات کے راز کی پوری طرح خبر نہ تھی۔

شیعہ مصنف نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے، یہ اس کی جہالت کا بین ثبوت اور انتہائی بڑا بہتان ہے؛ خصوصاً واقعہ ہجرت کے بارے میں اس نے جو ہرزہ سرائی کی ہے وہ بھی اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔

پھر اس بہتان تراش سے اگر یہی باتیں [الزامی جواب میں] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہی جائیں کہ: رسول اللہ ﷺ کو باطن کا علم تھا کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے دشمن رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ خلفاء ثلاثہ کے دور حکومت میں آپ اپنی ملت کو بتلائے فساد کرنے سے عاجز تھے۔ جب اکابر صحابہ اس دنیا سے چلے گئے تو انہوں نے ملت میں فساد پیدا کرنا شروع کر دیا۔ امت کو ہلاک کیا، مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کیا۔ اور آپ چاہتے تھے کہ باقی لوگوں کو بھی ہلاک و برباد کر دیں مگر

ایسا نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھنے والے زندیق جیسے، قرامطہ، اسماعیلیہ اور نصیریہ آپ کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ آپ کوئی بھی اسلام کا دشمن نہیں پائیں گے مگر وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے محبت علی بن ابی طالب کی آڑ کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے لیے ایسا کوئی کام حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت و موالات کا اظہار کرتے ہوئے ممکن نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب کی موالات کا شبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دشمنی کے شبہ سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ ان کا فاسد ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے دعویٰ کو باطل کرنے والے دلائل موالات علی بن ابی طالب کے دلائل سے زیادہ قوی اور صحیح ہیں۔ اور آپ کی دشمنی کے دلائل بھی باطل ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دشمنی کے دلائل باطل اور موالات و محبت کے دلائل درست اور صحیح ہیں۔

سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت:

تیسری وجہ: [اشکال] رافضی کا یہ احتمال کہ: ممکن ہے آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس خوف سے ساتھ لے لیا ہو کہ آپ کا معاملہ ظاہر نہ کر دے۔“

جواب: یہ حالات و واقعات سے بہت بڑے جاہل انسان کا کلام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا مکہ سے ہجرت کا واقعہ صاف ظاہر اور واضح ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اہل مکہ کو بھی اس کا پتہ چل گیا اور انھوں نے دونوں کو تلاش کرنے کے لیے ہر طرف آدمی بھیج دیے۔ اس لیے کہ جس رات رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی اس کی صبح ہی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ ابوبکر بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہیں۔ لہذا قریش مکہ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص دونوں میں سے کسی کو پکڑ لائے گا اسے [دیت کے برابر] انعام دیا جائے گا۔ پس انہیں کس چیز کا خوف تھا؟ مشرکین کے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لانے پر انعام کے اعلان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حب رسول سے آگاہ تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ظاہری و باطنی طور پر مشرکین سے دشمنی رکھتے تھے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں آپ مشرکین کے ساتھ اور آپ ﷺ کے دشمن ہوتے تو قریش مکہ آپ کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان نہ کرتے۔

چوتھی وجہ: مزید برآں آپ رات کے وقت نکلے تھے جب کہ کوئی شخص اس سے آگاہ نہ تھا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر شیعہ یہ کہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غالباً آپ کے گھر سے نکلنے کا علم ہو گیا تھا۔ تو ہم کہیں گے کہ: آپ کے لیے کسی ایسے وقت میں نکلنا ممکن تھا جب کسی کو علم نہ ہو پاتا۔ جس طرح مشرکین مکہ کو آپ کے گھر سے نکلنے کا علم نہ تھا اسی طرح آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی اس ارادہ کو پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے لیے بھی ممکن تھا کہ آپ سے کوئی مدد نہ لیتے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ بخاری و مسلم میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت نہ دی؛ بلکہ فرمایا ذرا صبر کیجیے، آپ میرے ساتھ ہجرت کریں گے۔ پھر ان دونوں حضرات نے اکٹھے ہجرت کی۔ پس نبی کریم ﷺ خلوت کی حالت میں پہلے سے آپ کو ہجرت کی اطلاع دے دی تھی۔

پانچویں وجہ: جب آپ غار میں تھے تو آپ کا بیٹا عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ تک مشرکین کی خبریں پہنچایا کرتا تھا۔^۱ اور آپ کے ساتھ ایک غلام عامر بن فہیرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ قریش کو آپ کے بارے میں خبر دے دیں۔

چھٹی وجہ: اگر معاملہ ایسے ہی تھا جیسے رافضی خبیث کا دعویٰ ہے، تو پھر ایسا ہو سکتا تھا کہ: جب دشمن غار تک پہنچ گیا، اور غار کے منہ پر پھیلنے لگا۔ تو اس وقت آپ کے لیے ممکن تھا کہ باہر نکل آتے اور دشمن کو آپ کی خبر کر دیتے۔ پس اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی دوسرا فرد و بشر نہیں تھا جو آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یا دشمن سے بچا سکتا۔ پس اس حالت میں غور کرنا چاہیے کہ اصل دشمن کون ہے وہ جو آپ کو ہلاک کرنا چاہتا ہو، اور ایسے موقع کو غنیمت جانے جب کوئی بھی دشمن اپنے حریف پر قابو پالیتا ہے تو پھر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ غار میں اکیلے تھے۔ اور دشمن غار کے دہانے تک پہنچ چکا تھا۔ اور غار والے کو بچانے والا یا ان کا دفاع کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اور دشمن بھی معمولی نہ تھے؛ ایسے لوگ تھے جو اس وقت مکہ میں غالب تھے۔ اور اگر وہ آپ کو پکڑ لیتے تو مکہ بھر میں کوئی انہیں آنکھ دکھانے والا بھی نہیں تھا۔ اور اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں مشرکین کے ساتھ ملے ہوئے تھے؛ تو یہاں پر اسباب اور وسائل و حالات اس قدر بھرپور تھے کہ آپ کو پکڑ کر دشمن کے حوالے کر دیا جاتا۔ جب قدرت کامل ہو، اور فعل کے دواعی موجود ہوں تو اس فعل کو پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جب ایسا کچھ ہوا نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے دواعی موجود نہیں تھے یا پھر اس پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت تو موجود تھی؛ تو معلوم ہوا کہ دواعی اور اسباب موجود نہیں تھے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس بات کو ہر انسان جانتا ہے۔ سو اللہ کی ذات پاک ہے جس نے روافض کو بصیرت و فراست سے محروم کر دیا۔

✽ ان بہتان تراشوں کا حال یہ ہے کہ: ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی انگلی سے دشمن کی طرف اشارہ کر رہے تھے تو سانپ نے آپ کو ڈس لیا۔ تو آپ نے انگلی پیچھے کھینچ لی۔ اور آپ سے درختم ہو گئی۔ تو نبی کریم ﷺ نے آپ سے فرمایا:

”اگر تم نے دوبارہ عہد توڑا تو وہ تمہارا ہاتھ توڑ دے گا۔“ اور آپ نے دوبارہ اس عہد کو توڑا؛ پھر اسی سبب سے آپ کی موت واقع ہوئی۔“

✽ اس بات کا جھوٹ ہونا کئی وجوہات کی بنا پر ظاہر ہے۔ ہم ان میں سے بعض کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

✽ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ: آپ نے اپنا لٹخنہ ظاہر کیا تھا تا کہ دشمن کو پتہ چل سکے؛ تو سانپ نے آپ کو ڈس لیا۔ یہ بھی پہلے جھوٹ کی طرح کا ایک دوسرا جھوٹ ہے۔

① صحیح بخاری؛ حوالہ سابق، لیکن اس میں خبریں لانے والے عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ تو اس وقت مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے حدیبیہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ واللہ اعلم۔

فصل:

[حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر بے صبری کی تہمت]

[اعتراض] شیعہ کا یہ قول کہ: یہ آیت آپ کے نقص پر دلالت کرتی ہے؛ اس لیے کہ آیت میں: ﴿لَا تَحْزَنُوا﴾ اللہ مَعَنَا کے الفاظ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری؛ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان؛ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدم رضامندی؛ اور بے صبری کو ظاہر کر رہے ہیں۔“ [اچھی کلام (الرائس)]

[جواب:]

پہلی بات: ہم کہتے ہیں: شیعہ کے اقوال باہم متناقض ہیں، وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو غار میں اپنے ساتھ اس لیے رکھا تھا کہ اگر وہ مکہ میں رہا تو آپ کے راز کو واضح گف کر دے گا، اس لیے کہ ابو بکر آپ کے دشمن تھے اور در پردہ ان لوگوں سے ملے ہوئے تھے جو آپ کو تلاش کر رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر آپ رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھتے تھے؛ تو جب آپ کی تلاش میں وہاں پہنچ گیا تھا؛ تو آپ کو خوش و سرور ہونا چاہیے تھا؛ اور آپ کو اطمینان ملتا۔ نیز یہ کہ دشمن غار کے دہانے تک پہنچا؛ اور اوپر اوپر ادھر ادھر تلاش کرتے رہے؛ تو یہ ایک بہترین موقع تھا کہ انہیں خبر کر دی جاتی۔ نیز یہ کہ: آپ کا بیٹا عبداللہ قریش کی خبریں آپ تک پہنچایا کرتا تھا؛ آپ کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ذریعہ سے دشمن کو خبر کر دیتے۔

نیز آپ کے غلام عامر بن فہیرہ کے پاس آپ دونوں کی سواریاں تھیں۔ آپ کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنے غلام سے ہی کہہ دیتے کہ دشمن کو خبر کر دو۔

اور اب کہہ رہا ہے کہ وہ ضعیف قلب اور قلیل صبر تھے۔ اس کا یہ قول اس قول سے متناقض ہے جس میں وہ کہتا ہے: کہ ابو بکر منافق تھے۔ اور اب ثابت کر رہا ہے کہ آپ مؤمن تھے۔ [اللہ کی قسم! شیعہ کے کس وصف پر رشک کیا جائے وہ علم و فہم دونوں سے یک سرے گانہ تھے۔]

جان لینا چاہیے کہ مہاجرین صحابہ میں کوئی بھی منافق نہ تھا۔ [بلکہ یوں کہیے کہ نفاق کا وجود ان میں محال تھا۔ اس لیے کہ مشرکین مکہ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور جو شخص مشرف باسلام ہوتا اسے جی بھر کر سزا دیتے۔ اس لیے جو شخص بھی دین اسلام کو قبول کرتا تھا وہ رضائے الہی کے لیے یہ خطرہ مول لیتا تھا کسی کے ڈر سے نہیں۔]

نفاق [کا آغاز اسلام میں مدنی زندگی سے ہوا؛ اور مدینہ کے [بعض انصاری قبائل میں تھا۔ کسی بھی مہاجر نے اپنے اختیار کے بغیر ہجرت نہیں کی۔ مکہ کے کفار ہجرت کو اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی وہ اپنا وطن اور اہل و عیال چھوڑ کر اپنے دشمن کی مدد کے لیے کہیں جاتے تھے۔ بلکہ ہجرت کو ان لوگوں نے اختیار کیا تھا جن کا وصف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛ فرمایا:

﴿لِّلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا

وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿٨﴾ (العشر: ۸)

”(فئے کا مال) ان مہاجر مکینوں کیلئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا مندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ لِلَّذِينَ يَقْتُلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلْمًا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۖ﴾ (الحج ۳۹-۴۰)

”ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔ وہ جنہیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاتفاق مہاجرین [والنصار] میں سب سے افضل تھے۔

جب اس کلام کی روشنی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا صاحب ایمان ہونا لازم آتا ہے۔ تو پس یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتہائی اہم اور پر خوف و خطر سفر ہجرت، وہ سفر جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا تھا؛ لوگوں کے دلوں میں آپ کا جلال و قدر گامزن ہوئے اسلام کا پرچم بلند کیا؛ ایسے سفر کے لیے رسول اللہ ﷺ صرف ایسی ہستی کا ہی انتخاب کر سکتے تھے جو آپ کے خاص الخواص میں سے ہو۔ اور جس پر آپ کو بھرپور اعتماد اور اطمینان و بھروسہ حاصل ہو۔ اس لیے کہ تاریخ اسی چیز کو عزت کے ساتھ جگہ دیتی ہے جو تمام لوگوں کے سامنے عزت کے ساتھ عیاں و بیان ہو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل اور دوسرے لوگوں سے امتیازیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ایسی خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم و شریک نہیں۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل و اشرف تھے۔

غم و حزن ناقص ایمان نہیں:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ ”غم زدہ ہونا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ناقص ہونے پر دلالت کرتا ہے۔“

[جواب]: ہم کہتے ہیں: پہلی بات: ناقص کی دو اقسام ہیں۔ [اول]: وہ نقص جو ایمان کے منافی ہو۔

[دوم]: اور وہ نقص جو کامل کی نسبت کم ہو۔

اگر مصنف کی مراد پہلی قسم ہے، تو پھر یہ باطل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ﴾ (النحل: ۱۷)

”آپ غم نہ کریں اور جو تدبیریں وہ کر رہے ہیں ان سے تنگ دل نہ ہوں۔“

عام اہل ایمان کے حق میں فرمایا: ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

”سستی نہ کرو اور غم زدہ نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے۔“

نبی ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۖ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَاهُ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَخَفَضْنَا جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (الحجر: ۸۷-۸۸)

”نیز ہم نے آپ کو سات ایسی آیات دی ہیں جو بار بار دھرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی دیا ہے۔ لہذا ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو سامان حیات دے رکھا ہے اور نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور نہ ہی ان کے لئے غمزدہ ہوں اور ایمان لانے والوں سے تواضع سے پیش آئیے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کریم ﷺ کو کئی ایک مواقع پر غمزدہ ہونے سے اور حزن و ملال کرنے سے منع کیا ہے۔ اور اہل ایمان کو بھی جملہ طور پر حزن و ملال سے منع کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حزن ایمان کے منافی نہیں ہے۔

اور اگر رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے سے اکمل کی نسبت ناقص ہیں؛ تو پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب سے بڑے کامل ہیں؛ اس میں اہل سنت والجماعت میں سے کسی ایک کا بھی کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اس میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو حضرت علیؓ یا حضرت عثمانؓ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہم یا پھر کسی دوسرے صحابی کے آپ سے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر آپ کے ساتھ ہوتے بھی؛ تو پھر بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان لوگوں کا حال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حال سے زیادہ اکمل ہوتا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام کے احوال اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حالت کے متعلق معروف یہ ہے کہ: خوف و خطرہ کے وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باقی تمام لوگوں کی نسبت زیادہ کامل ایمان والے، یقین والے اور صبر و ثبات والے ہوا کرتے تھے۔ اور شک و شبہ کے اسباب کے وقت آپ کا ایمان و اطمینان سب سے بڑھ کر ہوا کرتا تھا۔ اور جب کبھی اگر نبی کریم ﷺ کو کسی چیز سے کوئی تکلیف پہنچتی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی رضامندی و خوشنودی کے متلاشی ہوتے۔ اور آپ کے لیے بھی تکلیف وہ چیز سے سب سے بڑھ کر دور رہنے والے ہوتے۔

یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں اور وفات کے بعد کے احوال صحابہ کرام سے واقفیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی؛ تو آپ کی وفات اہل ایمان کے لیے بہت بڑی مصیبت اور آزمائش تھی۔ حتیٰ کہ اکثر اعراب مرتد ہو گئے۔ پھر ایمان جناب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حواس پر قابو نہ رکھ سکے؛ حالانکہ آپ قوی ایمان اور یقین محکم رکھنے والے انسان تھے۔ مگر ان حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ثابت قدم رکھا؛ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ایمان میں دوسروں کی نسبت زیادہ کامل تھے۔ آپ کے یقین میں اطمینان ہوا کرتا تھا۔ اور آپ کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کی نسبت زیادہ کامل تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

”تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَكُن مِّنَ أَفْكَانٍ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَ

مَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ﴿١٣٣﴾ [آل عمران ۱۳۳]

” (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔“

بخاری کی روایت میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتی ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقامِ سَخ پر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ”اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا انتقال نہیں ہوا۔ آپ فرماتی ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ”اللہ کی قسم! میرے دل میں یہی بات آئی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو دوبارہ مبعوث فرمائے گا“ اور آپ منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے۔ پس اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد کیا۔ آپ کے چہرہ انور سے چادر اٹھائی پھر آپ پر جھکے اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا پھر روئے اور فرمایا اے اللہ کے نبی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپ نے پاکیزہ زندگی گزاری اور پاکیزہ موت پائی۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا۔“

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ اوگوں سے گفتگو کر رہے تھے! ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: اے قسم اٹھانے والے! جلدی نہ کرو۔

چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو شروع کی تو عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تشہد پڑھا! اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی! اور فرمایا:

”تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ [الزمر ۳۰]

”یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنَّ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾

” (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا غفریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔“

سب لوگ (یہ سن کر) بے اختیار رونے لگے۔ [بخاری ۶/۵]

مزید برآں یوم بدر میں جھوپڑے کا قصہ؛ اور حدیبیہ کے دن آپ کا اطمینان و سکون معروف تھے ہیں؛ جن کی وجہ سے آپ کی خصوصیت تمام صحابہ سے نمایاں ہوتی ہے۔ پھر آپ کی طرف بزدلی [یا ایمانی کمزوری] کو کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ نیز آپ کا مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا؛ اہل ایمان کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنا؛ اور اس کے ساتھ ہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو روانہ کرنا؛ ایسے امور ہیں جن سے آپ کا سب سے بڑا اہل ایمان و یقین ہونا واضح ہوتا ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: آپ سے کہا گیا: ”آپ پر وہ مصائب آئے کہ اگر پہاڑ پر آتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا؛ اور سمندر پر آتے تو وہ خشک ہو جاتا؛ لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ آپ کمزور ہوئے ہوں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: ”غار والی رات کے بعد کبھی بھی میرے دل میں رعب داخل نہیں ہوا۔ بیشک جب نبی کریم ﷺ نے میرا حزن و ملال دیکھا تو ارشاد فرمایا: ”اے ابوبکر تم پر کوئی غم نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو پورا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔“

پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: جو کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یقین و صبر کو دوسرے صحابہ کرام جیسے: حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم سے تشبیہ دے؛ یقیناً وہ بہت بڑا جاہل ہے۔ اہل سنت کے ہاں حضرت عمرؓ و عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن رافضی نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ ان صفات میں دوسرے تنیوں صحابہ کرام سے اکمل و افضل ہیں؛ یہ محض بہتان، جھوٹ اور افتراء پر دازی ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی بھی حضرت عمرؓ و عثمانؓ رضی اللہ عنہما کی سیرت پر غور کرے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ مصائب و مشکلات میں یہ حضرات حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ کامل صبر و ثبات اور استقلال و استقامت والے ہوا کرتے تھے۔

لوگوں نے حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا؛ آپ سے مطالبہ کیا کہ یا خلافت چھوڑ دیں یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں اور وہ برابر آپ کا محاصرہ کئے رہے یہاں تک کہ آپ کو قتل کرویا۔ اس حالت میں بھی آپ لوگوں کو اپنے دفاع میں لڑنے سے منع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ مظلومیت کی حالت میں شہید ہو گئے مگر اپنی ذات کا دفاع نہیں کیا۔ تو کیا مصیبت میں اس سے بڑھ کر صبر کی بھی کوئی مثال ہو سکتی ہے۔

یہ بات سمجھی جانتے ہیں کہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کا صبر حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے صبر کی طرح نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے اہل لشکر اور آپ سے لڑنے والوں کو آپ کی وجہ سے بعض ایسی تکالیف بھی پہنچیں کہ ایسی تکالیف حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہم سے نہیں پہنچی تھیں۔ حالانکہ جن لوگوں سے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لڑ رہے تھے وہ کافر تھے۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے؛ وہ دشمن کی تعداد کے مقابلہ میں حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھے۔ اور ان کا دشمن کئی گنا بڑی تعداد کا تھا۔ جن کفار سے ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ رضی اللہ عنہم نے جنگیں لڑیں وہ مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھے۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھا۔

اور یہ بھی سمجھی جانتے ہیں کہ: امام کو درپیش خوف کہ کفار مسلمانوں پر غلبہ نہ حاصل کر لیں؛ اس خوف سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ آپس میں ایک دوسرے پر غالب آجائیں۔ اس لحاظ سے ائمہ ثلاثہ کا دشمن سے خوف حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے

خوف سے کئی گنا زیادہ تھا۔ اور اس خوف کا مقتضی بھی بہت بڑا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنے دشمن اور پیش جنگ لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں یقین و صبر و استقامت اور ثابت قدمی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے دشمن کے ساتھ برتاؤ میں نہ صرف کامل بلکہ اکمل تھے۔ تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یقین و ثبات اور صبر و استقامت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اور کامل تھے۔ کیا یہ صرف حماقت و تکبر اور اخبار متواتر سے معلوم حقائق کے علاوہ بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

حزن و ملال ایمان کے منافی نہیں:

﴿اعتراض﴾: رافضی مصنف نے کہا ہے: ”یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری: اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان: نبی کریم ﷺ کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدم رضا مندی: ظاہر کر رہی ہے۔“

﴿جواب﴾: رافضی کی یہ تمام باتیں ایک کھلا ہوا جھوٹ ہیں۔ آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس دعویٰ پر دلالت کرتی ہو۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: کسی چیز سے روکنا اس کے وقوع پذیر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ [یعنی ”لَا تَحْزَنُ“ سے وقوع حزن لازم نہیں آتا]۔ بلکہ نبی کے الفاظ جہاں کہیں بھی وارد ہوئے ہیں ان سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ فعل ممنوع ہے تاکہ کہیں بعد میں اس فعل کا وقوع نہ ہو جائے۔ اس کی مثال سمجھنے کے لیے یہ آیات ملاحظہ ہوں:-

۱..... ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ (الاحزاب: ۱۰)

”اے نبی! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو؛ کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو۔“

یہاں پر یہ دلیل کہیں بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کافروں کی اطاعت کرتے تھے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۲..... ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ (القصص: ۸۸)

”اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکارنا۔“

۳..... ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾ (القصص: ۸۸)

”اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنانا۔“

رسول اللہ ﷺ نے تو کبھی بھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ خصوصاً نبوت کے بعد تو شرک سے معصوم ہونے پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ آپ کو شرکیہ اعمال سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿لَا تَحْزَنُ﴾: کہیں بھی اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ آپ واقعی غمگین ہوئے بھی تھے۔ لیکن عقلی طور پر یہ ممکن ہے کہ آپ غمگین بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس قسم کی نبی اس لیے وارد ہوتی ہے کہ اس فعل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

دوسری بات: اگر فرض کیجیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غم زدہ ہوئے بھی تھے تو محض اس لیے کہ کفار کہیں نبی کریم ﷺ کو قتل نہ کر دیں۔ آپ نبی کریم ﷺ پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ہجرت کے اس سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو دوران سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کے پیچھے چلے گئے کبھی آگے۔ جب آپ ﷺ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ دشمن عقب سے آپ پر حملہ آور ہوگا تو پیچھے چلا

ہوں اور جب اگلی جانب سے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں۔“ جب غار کے قریب پہنچے تو عرض کیا کہ ٹھہریے! تاکہ میں غار میں داخل ہو کر اس کو صاف کر لوں۔^①

امام احمد رحمہ اللہ نے ”مناقب الصحابہ“ میں ذکر کیا ہے: فرماتے ہیں: ہم سے وکیع نے حدیث بیان کی: وہ نافع سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے: وہ ابن ابی ملیکہ سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں:

”جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی تو غار ثور کے راستہ پر چل پڑے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے اس سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ دوران سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کے پیچھے چلنے لگتے کبھی آگے۔ جب آپ ﷺ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ دشمن عقب سے آپ پر حملہ آور ہو گا تو پیچھے چلتا ہوں اور جب اگلی جانب سے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں۔“ جب غار کے قریب پہنچے تو عرض کیا کہ ٹھہریے! تاکہ میں غار میں داخل ہو کر اس کو صاف کر لوں۔“

امام نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھ سے ایک آدمی نے بیان کیا کہ: ابن ابی ملیکہ نے یہ بھی کہا ہے: اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار میں ایک سوراخ دیکھا، اس کے آگے اپنا پاؤں رکھ کر اسے بند کر دیا؛ اور عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! اس میں اگر سانپ یا بچھو وغیرہ ہو تو آپ ﷺ کے بجائے مجھ کو کاٹے۔^②

اس صورت میں واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مساوات پر راضی نہ تھے۔ نہ ہی ان معنوں میں جیسا کہ رافضی خبیث افتراء پرداز نے ذکر کیا ہے؛ اس لیے کہ آپ ہرگز اس بات پر راضی نہ تھے کہ وہ زندہ رہیں اور رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیا جائے۔ اور نہ ہی اس بات پر راضی تھے کہ ان دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ بلکہ آپ چاہتے تھے کہ اپنی جان و مال اور اہل عیال رسول اللہ ﷺ پر قربان کر دیں مگر آپ پر آنچ نہ آئے۔ ایسا کرنا ہر مومن پر واجب ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام مومنین میں سے پختہ ایمان والے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿النَّبِيُّ أَوْلىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ [الأحزاب: ۶]

”پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں۔“

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے والدین و اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر مجھے عزیز تر نہ سمجھے۔“^③

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غم زدہ ہونا آپ کے کمال ایمان و محبت اور موالات و خیر خواہی؛ آپ کی حفاظت پر حرص آپ کے دفاع؛ اور آپ سے ہر قسم کی تکلیف و پریشانی دور کرنے پر مستعد ہونے کی دلیل ہے۔ اگرچہ اس صورت میں غم کی وجہ سے انسان

① سیرۃ النبی لابن کثیر (۱/ ۴۵۲)، مستدرک حاکم (۳/ ۶)، دلائل النبوة (۲/ ۴۷۶)۔

② سیرۃ النبی لابن کثیر (۱/ ۴۵۲)، مستدرک حاکم (۳/ ۶)، دلائل النبوة (۲/ ۴۷۶) [فضائل الصحابة ۱/ ۶۲]۔

③ البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان (ح: ۱۴)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ (ح: ۴۴)۔

پر ایک گونہ کمزوری آ جاتی ہے۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ عدم حزن کے ساتھ ان صفات سے موصوف ہونا ہی آپ کے حق میں مامور بہ تھا۔ ورنہ صرف غم و حزن سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اور اس میں کوئی ایسی دلالت نہیں جس سے اس فعل کا گناہ ہونا لازم آتا ہو جس پر ملامت کی جاسکتی ہو۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر غمگین ہونا انسان کی اپنی اولاد پر غمگین ہونے سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی انسان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی محبت اس کی اولاد کے لیے محبت سے بڑا واجب ہے۔

✽ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ آپ اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام پر غمگین ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا سَعْدَى عَلَى يَوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۖ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَوْا تَذْكُرُ يَوْسُفَ حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ۖ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُوا بَثْنِي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ...﴾ [یوسف ۸۴، ۸۶]

”ہائے میرا غم یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، یہاں تک کہ گھل کر مرنے کے قریب ہو جائے، یا ہلاک ہونے والوں سے ہو جائے۔ اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔“

یہ اللہ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں؛ وہ اپنے بیٹے پر اس قدر غمگین ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے آپ پر طعن و تشنیع کی جائے۔ تو پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر قتل کے خوف سے غمگین ہوں؛ تو آپ کو کیسے گالی و طعن و تشنیع کی جاسکتی ہے؛ حالانکہ آپ ﷺ کے ساتھ دنیا و آخرت کی سعادت مطلق ہے۔

پھر شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد محترم ﷺ کی وفات پر انتہائی غم و ہم کا اظہار کیا تھا اور ایک غم خانہ بنایا؛ شب و روز اس ”بیت الاحزان“ (غم خانہ) میں گزارا کرتی تھیں۔ لیکن اس چیز کو قابل مذمت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ غم ایک ایسی چیز پر ہے جو گزر چکی ہے؛ اور پھر کبھی واپس آنے والی نہیں۔ جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس بات پر خوف زدہ اور غمگین تھے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کو قتل نہ کر دیا جائے۔ یہ ایسا غم و حزن ہے جو آپ کی حفاظت و چوکیداری کو متضمن ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ اس طرح سے غمگین نہیں ہوئے؛ جیسے پہلے ہوئے تھے؛ اس لیے کہ اب غمگین ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غم و ملال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غم و ملال سے زیادہ اکمل تھا۔ اگر آپ کا غم زدہ ہونا مذموم فعل تھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تو غمگین ہوئی تھیں۔ ورنہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر غم و اندوہ کا اظہار کیا ان کی نسبت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس بات کے سب سے بڑے حق دار ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت کے معاملہ میں غم و اندوہ میں مبتلا ہونے پر آپ پر کوئی ملامت نہ کی جائے۔ [حقیقت یہ ہے کہ جاہل اپنے طور پر کسی کی مدح کرتا ہے دراصل وہ مذمت ہوتی ہے]

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے قتل کیے جانے کا غم تھا۔“

تو ہم کہیں گے: یہ تمہارے اس قول کے متناقض ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے؛ اور آپ ﷺ نے اس لیے انہیں ساتھ لے لیا تھا کہ کہیں آپ کا معاملہ ظاہر نہ کر دیں۔“

اور یہ بھی کہا جائے گا کہ: جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر واجب کیا ہے؛ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جو برتاؤ تو اتر کے ساتھ معلوم ہے؛ اس کی روشنی میں تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔

پھر یہ بھی کہا جائے گا: مان لیجیے! آپ اپنی جان پر اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق غمگین ہوئے تھے؛ تو کیا اس وجہ سے اس بات کے مستحق ہو گئے کہ آپ پر گالم گلوچ کی جائے۔ بالفرض یہ مان بھی لیں کہ آپ کو اپنے قتل کئے جانے کے خوف کی وجہ سے غم و ملال تھا تو پھر بھی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے آپ پر سب و شتم کیا جائے۔

پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غمگین ہونا گناہ کا کام تھا؛ تو تب بھی آپ اس پر مصر نہیں رہے؛ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا تو آپ رک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو بہت ساری چیزوں سے منع کیا تھا اور وہ ان باتوں سے رک گئے تھے۔ اور اس نہی سے پہلے جو کام انہوں نے کئے ان پر کوئی مذمت نہیں کی گئی۔

مزید برآں روافض کہتے ہیں: حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما جاگیر فدک اور دوسری میراث کے چھوٹ جانے پر غم سے نڈھال ہو گئے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ دنیاوی فوائد کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحديد: ۲۳]

”تا کہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمہیں عطا فرمائے۔“

اللہ تعالیٰ تو لوگوں کو اس طرف بلا رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹ جانے پر انہیں کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ سبھی جانتے ہیں کہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غم کرنے سے منع کرنا اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ کسی کو دین کے چھوٹ جانے پر غم کرنے سے منع کیا جائے۔

اور اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ آپ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوئے تھے؛ تو کسی انسان کا اپنے جان پر قتل کئے جانے کے خوف سے غمگین ہونا اس بات کا زیادہ حق دار ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی انسان ایسی دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہو جو اسے ملی بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رافضی سب سے بڑے جاہل لوگ ہوتے ہیں؛ جن سے محبت کرتے ہیں ان کی مدح میں اور جن سے بغض رکھتے ہیں ان کی مذمت میں ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو حقیقت میں اس کے برعکس ہوتی ہیں۔ پس آپ نہیں دیکھیں گے جب بھی یہ لوگ کسی معاملہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے ہیں؛ اگر وہ معاملہ واقعی مذموم ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زیادہ صادق آتا ہے۔ اور مدح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح کرنا چاہتے ہوں؛ اور وہ حقیقت میں بھی مدح کا پہلو ہو تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ تمام مدوح امور میں زیادہ کامل ہیں اور تمام مذموم امور میں سب سے زیادہ بری ہیں؛ خواہ یہ امور حقیقی ہوں یا خیالی۔

[حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر بے یقینی کی تہمت:]

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ”یہ آیت آپ کی بے صبری پر دلالت کرتی ہے۔“

[جواب]: رافضی کا یہ قول باطل ہے۔ آیت صبر کے معدوم [یا ناقص] ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ اس لیے کہ مصائب پر صبر کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں واجب ہے۔ اور دل کا غمگین ہونا اس کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

”یشک اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو پر نہیں پکڑتا؛ اور نہ ہی دل کی غمگینی اور حزن و ملال پر پکڑتا ہے؛ لیکن وہ زبان [سے نکلنے والی آہ و بکا] پر پکڑتا ہے؛ یا پھر رحم فرمادیتا ہے۔“ [البخاری ۸۴/۲، مسلم ۶۳۶/۲]

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ”یہ آیت عدم یقین باللہ پر دلالت کرتی ہے۔“

[جواب]: یہ بات جھوٹ اور بہتان ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام بھی غمگین ہوتے رہے ہیں۔ یہ ان کے عدم یقین باللہ کی دلیل ہرگز نہیں۔ جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور صحیحین میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر فرمایا تھا:

”یشک آنکھیں بہہ رہی ہیں؛ اور دل غمگین ہے؛ اور ہم صرف وہی بات کہتے ہیں جو رب کو راضی کر دے۔ اے ابراہیم! ہمیں تیری جدائی کا صدمہ ہے۔“ ❶

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو غم کھانے سے منع کیا ہے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ [النحل ۱۲۷] ”اور ان پر غم نہ کھائیے۔“

[اعتراض]: رافضی نے کہا ہے: ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدم رضامندی؛ ظاہر کر رہے ہیں۔“

[جواب]: سابقہ کلام کی طرح یہ بھی جھوٹ اور باطل کلام ہے۔

فصل:

[غم کا محال ہونا؟]

[اعتراض]: رافضی نے کہا ہے: ”یہ غم و حزن اگر اطاعت کا کام تھا تو پھر یہ محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے منع کر

دیں اور اگر یہ معصیت کا کام تھا تو پھر جس چیز کو یہ لوگ فضیلت ظاہر کر رہے ہیں؛ حقیقت میں وہ ذلت و رسوائی ہے۔“

[جواب]: پہلی بات: کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ محض غمگین ہونا کوئی فضیلت کا کام تھا۔ بلکہ اصل فضیلت تو

اس چیز میں ہے جس پر قرآنی آیت دلالت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

❶ سیرۃ النبی لابن کثیر (۱/۴۵۲)، مستدرک حاکم (۳/۶)، دلائل النبوة (۲/۴۷۶) [فضائل الصحابة ۱/۶۲]۔

❷ البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان (ح: ۱۴)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ (ح: ۴۴)۔

❸ البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ ”انا بک لمحزونون“ (حدیث: ۱۳۰۳)، صحیح مسلم، کتاب الفضائل۔ باب رحمته ﷺ الصبیان و العیال (حدیث: ۲۳۱۵)۔

﴿لَا تَخْصِرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيًا أَثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

”اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب آپ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

سوفضیلت اس بات میں ہے کہ آپ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلے۔ اور آپ کی خصوصی صحبت میں رہے۔ آپ کو مطلق طور پر صحبت نبوت میں کمال حاصل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مبارک: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال موافقت کو متضمن ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی محبت، اطمینان، نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال معاونت و موالات؛ اور اس حالت میں کمال ایمان اور تقویٰ آپ کی فضیلت کے دلائل میں سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی کمال محبت و نصرت آپ کے لیے حزن و ملال کا موجب تھی؛ اگر آپ نے حزن و ملال کا اظہار کیا ہو۔ حالانکہ قرآن میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ آپ غمگین ہوئے بھی تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ دوسری بات: قرآن مجید میں بعینہ یہ بات نبی کریم ﷺ کے لیے بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيهِمْ حَاسِبٌ﴾ (النحل ۱۲۷)

”اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔“

اور ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْتَهُمْ آزْوَاجًا مِنْهُمْ﴾ [وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ] (الحجر ۸۸)

”اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف ہرگز نہ اٹھائیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو فائدہ دیا ہے [اور نہ ان پر غم کریں]۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيَرَتَهَا الْأُولَىٰ﴾ (طہ ۲۱)

”اسے پکڑو اور ڈرو نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔“

اس شیعہ سے کہا جائے گا: اگر یہ خوف اطاعت کا کام تھا؛ تو یقیناً اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر [تم شیعہ کے بقول] نافرمانی کا کام تھا تو پھر [پیغمبر کی طرف سے] نافرمانی کی گئی۔

نیز یہ بھی کہا جائے گا کہ: آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ مطمئن اور ثابت قدم رہیں۔ اس لیے کہ خوف تو اہل ان کے اختیار کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب امن کے اسباب و موجبات نہیں تھے تو خوف لاحق ہوا۔ اور جب امن کے اسباب پیدا ہو گئے تو خوف زائل ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمانا کہ:

﴿وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيَرَتَهَا الْأُولَىٰ﴾ (طہ ۲۱)

”اور ڈرو نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔“

اس حکم میں ساتھ ہی اس چیز کی خبر بھی دی گئی ہے جس سے خوف زائل ہو جائے گا۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَىٰ ۖ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ﴾ (طہ ۶۷-۶۸)

”تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔ ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے۔“

یہاں پر خوف کھانے سے منع کیا گیا اس کے ساتھ ہی خوف ختم ہونے کے موجبات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

یہی حال اس آیت میں وارد رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا بھی ہے: ﴿لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنا﴾ ”غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ یہاں پر غمگین ہونے سے منع کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی غم نہ کرنے کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ سبب ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنا﴾ ”بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ جب ایسی بشارت مل جائے جس سے غم و حزن ختم ہوں تو یہ امور ختم ہو جاتے ہیں۔ ورنہ انسان کو غم و حزن بغیر اختیار کے لاحق ہوتے ہیں۔

تیسری بات: حزن و ملال سے منع کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی غم و حزن پائے بھی جاتے ہیں؛ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بلکہ یہ ممانعت اس لیے بھی وارد ہو سکتی ہے تاکہ جب غم و حزن کے اسباب پیدا ہو جائیں تو اس وقت غم و حزن نہ کیا جائے۔ اس صورت میں غم اگر معصیت اور گناہ کا کام بھی ہو تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور اگر غم ہو بھی تو پھر بھی ہم کہتے ہیں: ”اگر منیٰ عنہ گناہ اور نا فرمانی کا کام نہ ہو تو کبھی نہی تسلی و تعزیت اور ثابت قدمی کے لیے آتی ہے؛ اس لیے کہ بیشتر اوقات بعض چیزیں غیر اختیاری طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ غم و حزن بھی اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔

پس اس صورت میں ممانعت ایک مستحق ازالہ چیز سے ممانعت ہوگی؛ اگرچہ وہ گناہ کا کام نہ بھی ہو۔ جیسا کہ انسان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دشمن سے اپنا دفاع کرے یا نجاست کا ازالہ کرے۔ اور اس طرح کی دیگر چیزیں اگرچہ گناہ کا کام نہ بھی ہو مگر ان کے تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے ان سے منع کیا جاتا ہے۔ غم و ملال سے انسان کے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ پس اس لیے ایسی چیز کا حکم دیا گیا جس سے غم کا ازالہ ہو سکے؛ جیسا کہ گند کی دور کرنے کے لیے ایسی چیز کا حکم دیا جاتا ہے جس سے یہ کام ممکن ہو۔ یہ غم بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ملا تھا؛ یہ اطاعت تھی رسول اللہ ﷺ کی محبت اور خیر خواہی۔ اس میں کوئی گناہ کا کام نہیں جو کہ قابلِ مذمت ہو۔ بلکہ اس غم کا سبب اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دل کی کمزوری تھی جس پر کسی انسان کی مذمت نہیں کی جاسکتی اور اس چیز کا حکم دیا گیا جس سے دل میں استقامت و استقلال پیدا ہو؛ اور اس پر ثواب مل سکے۔

چوتھی بات: اگر مان لیا جائے کہ: غمگین ہونا گناہ کا کام ہے؛ تو پھر بھی آپ اس کی ممانعت کا حکم آنے سے پہلے غمگین ہوئے تھے۔ اور جب اس سے منع کر دیا گیا تو دوبارہ آپ سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اور جو کام حرام ہونے سے پہلے ہو گیا، اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ لوگ شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پیا کرتے تھے؛ اور جو ابھی کھیتے تھے؛ مگر جب ان کاموں کی ممانعت کا حکم نازل ہو گیا تو لوگ ان سے رک گئے؛ اور سچی توبہ کر لی۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غمگین ہونا رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے سے پہلے تھا۔ اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول تھا؛ اس لیے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں غمگین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے ساتھ نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کے خلاف ہوتا ہے۔ جب سے رسول اللہ ﷺ نے آپ کو منع کیا تو اس کے بعد کبھی بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ غمگین نہیں ہوئے۔ اگر اعتراض کرنے والے ان کینوں کو کوئی ذرا بھر بھی حیا ہوتی تو اس قسم کے اعتراض نہ کرتے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غمگین ہونا عیب ہے تو یہی عیب محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر بھی لازم آتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

﴿قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِأَيِّتِنَا أُنْتَمَا وَمَنِ اتَّبَعُكُمَا الضَّالُّونَ﴾ (القصص ۳۵)

”کہا ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے، ہماری نشانیاں کے ساتھ تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب آنے والے ہوں۔“

پھر جادوگروں کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

﴿أَنْ تُلْقِيَا إِنَّمَا أَنْ تَكُونَا أَوَّلَ مَنْ أَلْقَى﴾ (..... آگے تک.....) ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَى﴾ ﴿قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَى﴾ (طہ ۶۵-۶۸)

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو یہ کہ تو پھینکے اور یا یہ کہ ہم پہلے ہوں جو پھینکے۔..... ”تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔ ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے۔“

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول اور اس کے کلیم ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر بھی دی تھی کہ فرعون اور اس کے لشکر آپ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اور آپ ہی غالب رہیں گے۔ پھر اس کے بعد بھی آپ کے دل میں خوف محسوس ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف محسوس کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے جو وعدہ کیا تھا کہ آپ ہی غالب رہیں گے؛ اس وقت یہ بات آپ کے ذہن سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غم کرنا اس کی ممانعت کا حکم آنے سے پہلے تھا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنُكَ كُفْرُهُ﴾ (لقمان ۲۳)

”اور جو کوئی کفر کرے پس اس کا کفر آپ کو غمگین نہ کرے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَلٰلٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ﴾ (النحل ۱۲۷)

”اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا يَحْزُنُكَ قَوْلُهُمْ﴾ (یس ۷۶)

”ان کی باتیں آپ کو ٹمگین نہ کریں۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ﴾ (فاطر ۸)

”سو آپ کی جان ان پر حسرتوں کی وجہ سے نہ جاتی رہے۔“

اور ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ﴾ (الأنعام ۳۳)

”ہم جانتے ہیں بیشک آپ کو وہ بات ٹمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ آپ کو کفار و مشرکین کا کلام ٹمگین کرتا ہے۔ اور اس سے منع بھی کیا گیا۔ اگر شیعہ قول کے مطابق دیکھا جائے تو جیسے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ٹمگین ہونے پر اعتراض اٹھاتے ہیں: [یہی اعتراض رسول اللہ ﷺ پر بھی وارد ہوتا ہے؛ مگر ہم کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں کے کفریہ کلام پر ٹمگین ہونا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام تھے؛ اور یہ حزن و ملال کی ممانعت آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس ممانعت کا حکم آنے سے پہلے ٹمگین ہونا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کام تھا۔ اور جب نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کر دیا تو اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی بھی ٹمگین نہیں ہوئے۔ پس یہ کیفیت بھی ممکن ہے کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ ٹمگین نہ ہوئے ہوں۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اس لیے منع کیا ہو کہ کہیں آپ ٹمگین نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تُطْع مِنْهُمْ آيَةً أَوْ كَفُورًا﴾ (الإنسان ۲۴)

”اور ان میں سے کسی گناہ گار یا بہت ناشکرے کا کہنا مت مان۔“



فصل:

[روافض کی کج فہمی]

[کج فہمی]: بعض روافض کہتے ہیں کہ: ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزُنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

”جب آپ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ کے الفاظ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ”صاحب“ رفیق اور ساتھی کو کہتے ہیں۔ ساتھی کبھی ایماندار بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کافر بھی۔ [یہ ضروری نہیں کہ وہ ایماندار ہو]۔ جیسا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَأَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلًا رَجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِحَدِيثِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَغْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بَنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا ۖ كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ اتَّأْتَا كُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ۖ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَآعَزُ نَفَرًا ۖ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ قَالَ مَا

أَظُنُّ أَنَّ تَبَيَّنَ هَذِهِ آيَاتُكَ آگے تک ﴿قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّيَكَ رَجُلًا﴾ (الكهف ۳۲-۳۷)

”اور ان کے لیے ایک مثال بیان کیجیے، دو آدمی ہیں، جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ہم نے ان دونوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کچھ کھیتی رکھی۔ دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا اور اس سے کچھ کمی نہ کی اور ہم نے دونوں کے درمیان ایک نہر جاری کر دی۔ اور اس کے لیے بہت سا پھل تھا تو اس نے اپنے ساتھی سے، جب اس سے باتیں کر رہا تھا، کہا میں تجھ سے مال میں زیادہ اور نفی کے لحاظ سے زیادہ باعزت ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہا میں گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا۔“..... ”اس کے ساتھی نے، جب کہ وہ اس سے باتیں کر رہا تھا، اس سے کہا کیا تو نے اس کے ساتھ کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ کے ایک قطرے سے، [پھر تجھے ٹھیک ٹھاک آدمی کر دیا]۔“

[جواب:] ان سے کہا جائے گا: یہ بات معلوم شدہ ہے کہ: ”صاحب کا لفظ ساتھی اور دوسروں سب کو شامل ہے۔ [اس آیت میں صاحب کا لفظ مطلق ساتھی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے]۔ محض اس لفظ کے استعمال میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ کوئی دوست ہو یا دشمن؛ یا پھر کافر ہو یا مؤمن۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ وصف کو بھی ملا کر بیان کیا جائے۔ فرمان الہی ہے: ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنُبِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾ یہاں پر صاحب کا لفظ بیوی اور رفیق سفر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے؛ اس میں کافر اور مؤمن کی کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ اور نہ ہی اس فرق کی کوئی دلیل موجود ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۖ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾ [النجم ۲۰]

”قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے اتمھارا ساتھی نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِبَجُنُونٍ﴾ [التکویر ۲۲]

”اور تمھارا ساتھی ہرگز کوئی دیوانہ نہیں ہے۔“

یہاں پر ساتھی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے بشر کی مصاحبت کی تھی۔ بیشک جب آپ لوگوں کے ساتھی تھے؛ اور آپ کے اور لوگوں کی مابین مشارکت تھی؛ تو جو جی آپ لیکر آتے اس کا نقل کرنا ممکن ہوا۔ اور ایسے ہی آپ کی جو بات سنتے اس کے معانی سمجھ سکتے۔ بخلاف فرشتہ کے جو کہ ان کے ساتھ نہیں رہا؛ اس لیے کہ لوگوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ براہ راست اس سے تعلیمات اخذ کریں۔

نیز یہ آیت اس بیان کو بھی متضمن ہے کہ یہ نبی ﷺ ان ہی کی جنس سے ایک بشر ہیں۔ اور اس سے بھی خاص بات یہ ہے کہ آپ عربی ہیں؛ اور اسی قوم کی زبان میں مبعوث ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ﴾ [التوبة 128]

”(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف انکو گراں معلوم ہوتی ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ [ابراہیم 3]

”ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تاکہ ان کے لیے بیان کر دے۔“

جب آپ ان کی صحبت میں رہے تھے تو ان لوگوں کی زبان بھی سیکھی تھی۔ اور آپ کے لیے یہ ممکن تھا کہ ان لوگوں کی زبان میں ان سے بات کر سکیں۔ تو اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی طرف ان کی زبان میں ہی رسول بنا کر بھیجا تاکہ لوگ آپ کی بات سمجھ سکیں۔ پس اس لحاظ سے یہاں پر صحبت کا ذکر کرنا ان پر مہربانی اور احسان کے باب سے تھا۔ بخلاف اس کے کہ صحبت کی جو اضافت آپ ﷺ کی طرف کی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿لَا تَخْزَنَ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ”گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

صحیح مسلم میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے

برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔“ [سبق تخریجہ]

اور جیسا کہ اس حدیث مبارک میں ہے: ”اے لوگو! کیا تم میرے لیے میری ساتھی کو نہیں چھوڑو گے۔“ اس کی مثالیں

بہت زیادہ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے خطاب میں یا مسلمانوں کے خطاب میں صحبت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف مضاف کرنا آپ ﷺ سے موالات اور دوستی کی صحبت کو متضمن ہے۔ یہ دوستی اور موالات آپ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں۔ پس صحابی کے لفظ کا اطلاق اس انسان پر نہیں ہو سکتا جو سفر میں آپ کا ساتھی بنا ہو اور وہ حالت کفر پر ہو [جیسا کہ عبد اللہ بن اریقظ]

قرآن آپ کے بارے میں کہتا ہے: ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنَ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾

”جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے: گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

پس رسول اللہ ﷺ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے ساتھی کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ساتھ نصرت اور تائید کو متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دشمن پر اور ان حضرات کے دشمن ہر کافر پر کامیابی عطا فرمائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نبی کے ساتھ بھی ہو اور اس کے دشمن کے ساتھ بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کے دشمن کے ساتھ ہوتا تو یہ بات موجب حزن و ملال تھی جس کی وجہ سے اطمینان و سکون ختم ہو جاتا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ ”صَاحِبِهِ“ کا لفظ محبت اور دوستی کی صحبت کو متضمن ہے جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر آپ کا ایمان لازم آتا ہے۔

❀ ایسے ہی یہ لفظ: ﴿لَا تَخْزَنَ﴾ دلالت کرتا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے سچے دوست تھے؛ اور یہ کہ آپ ان کے

دشمن سے خوف زدہ ہوئے تھے۔ اسی لیے آپ سے کہا گیا:

﴿لَا تَخْزَنَنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ”گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اگر آپ رسول اللہ ﷺ کے دشمن ہوتے تو پھر صرف اسی صورت میں تمکین ہوتے جب رسول اللہ ﷺ کے قہر و جلال کے سامنے مغلوب ہو جاتے؛ ورنہ نہیں۔ تو پھر ہرگز یہ بھی نہ کیا جاتا:

﴿لَا تَخْزَنَنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ”گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی کے ساتھ ہونا ایسی بات ہے جس سے نبی کریم ﷺ کو خوشی پہنچتی ہے۔ اور آپ کے دشمن کے ساتھ ہونا ایسا معاملہ ہے جس سے آپ کو تکلیف متوقع ہو سکتی تھی۔ پس یہ بات ممتنع ہے کہ اللہ ایک ہی وقت میں آپ کے ساتھ بھی اور آپ کے دشمن کے ساتھ بھی۔ خصوصاً جب کہ یہ کہا جا رہا ہے: ﴿لَا تَخْزَنَنَّ﴾ پھر یہ فرمان:

﴿إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة ۴۰]

”اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ کی مدد اس صورت میں نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ کے دشمن کو آپ کے ساتھ ملا دیا جائے۔ نصرت و مدد تو اسی صورت میں تھی کہ آپ کے دوست کو آپ کے ساتھ ملایا جائے اور دشمن سے نجات عطا کی جائے۔ دشمن پر آپ کی مدد و نصرت اس صورت میں کیسے ممکن ہے کہ دشمن مسلسل آپ کے ساتھ لگا رہے۔ ون اور رات میں کسی وقت بھی آپ سے جدا نہ ہوتا ہے؛ خصوصاً جب کہ آپ اتنے اہم ترین اور خطرناک سفر میں تھے۔ یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ کفار نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کو نکالا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار اپنے دشمنان کو ہی نکال رہے تھے؛ اپنے کافروں میں سے کسی ایک کو بھی انہوں نے نہیں نکالا۔ پس اس سے بھی ظاہر ہو گیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت صحبتِ محبت و ایمان موالات و دوستی تھی۔ کفر کی صحبت نہیں تھی۔

کسی انسان کے باطن میں اہل ایمان یا کافر یا یہودی اور عیسائی یا پھر مشرک ہونے کا علم طویل صحبت کی صورت میں کسی پر مخفی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ کبھی بھی کوئی انسان اپنی اندر کی بات نہیں چھپاتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے آثار اور زبان کی بول چال سے اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کافران ہے:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ [محمد ۳۰]

”اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو وہ لوگ دکھا دیں، سو یقیناً آپ انہیں ان کی نشانی سے پہچان لیں گے۔ اور آپ انہیں بات کے انداز سے ضرور ہی پہچان لیں گے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر چھپانے والا اپنے میزھے اور کمزور قول کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ جب کہ چہرہ کے آثار سے کبھی کوئی پہچان سکتا ہے اور کبھی نہیں۔

پہلی بات: نبی کریم ﷺ سے روایت میں جو صحابہ معروف و مذکور ہیں اور جن کی دینداری کی وجہ سے مسلمان ان کی تعظیم کرتے ہیں؛ یہ تمام رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والے سچے مومن تھے۔ الحمد للہ کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی منافق کی

تعظیم نہیں کی۔ کسی انسان کے ایمان کا بھی ایسے ہی پتہ چل جاتا ہے جیسے اس باقی تمام احوال قلب دشمنی اور دوستی، غم و خوشی، بھوک و پیاس اور دوسرے امور کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان امور کے کچھ ظاہری لوازم ہیں۔ اور ظاہری امور باطنی امور کو سترزم ہوتے ہیں۔ یہ بات وہ تمام لوگ جانتے ہیں جنہوں نے اس کا تجربہ کیا ہو اور اسے آزمایا ہو۔

ہم اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عباسؓ، انسؓ بن مالکؓ، ابوسعید خدریؓ، اور جابرؓ رضی اللہ عنہم ان کے امثال دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سچا ایمان رکھنے والے؛ آپ کی تعظیم کرنے والے اور آپ سے سچی محبت کرنے والے تھے۔ ان میں کوئی بھی منافق نہیں تھا۔ تو پھر ان خلفاء راشدین کے یہ احوال کیونکر معلوم نہیں ہو سکتے تھے جن کے ایمان بالرسول اور آپ ﷺ سے محبت اور نصرت کی خبریں زمین کے مشرق و مغرب میں معروف ہیں۔

ایسی باتیں تو معروف ہونی چاہیے۔ منافقین کا وجود ان پاکباز لوگوں کے ایمان میں شک و شبہ کا موجب و سبب نہیں بن سکتا جنہیں امت میں صداقت و امانت کے ساتھ قبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ بلکہ ہم ضروری طور پر سعید ابن مسیبؓ، حسن بصریؓ، علقمہؓ، اسودؓ، مالکؓ، شافعیؓ، احمد بن حنبلؓ، فضیلؓ اور جنیدؓ رضی اللہ عنہم اور جو لوگ ان سے بھی کم مرتبہ کے ہیں، ان کا مسلمان اور صاحب ایمان ہونا جانتے ہیں۔ تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اہل ایمان ہونا کیونکر معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور ان بہت سے لوگوں کا صاحب ایمان ہونا بھی جانتے ہیں جو ہمارے اصحاب میں سے ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔

دوسری بات: نیز ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے علماء کرام نے لکھا ہے: ہمیں اس بارے میں کسی اختلاف کا کوئی علم نہیں ہو سکا کہ مہاجرین میں ایک بھی منافق نہیں تھا۔ اس لیے کہ مہاجرین نے اس وقت اپنے اختیار سے ہجرت کی تھی جب مکہ میں ان پر ایمان لانے کی پاداش میں تکالیف ڈھائی گئیں۔ اس وقت مکہ میں کوئی اپنے اختیار کے بغیر اسلام قبول نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہاں مشکلات اور تکلیف کے احتمال کے باوجود کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ایمان کا اظہار کرتا ہو اور اس کے دل میں کفر پوشیدہ ہو۔ خصوصاً جب کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی ہجرت تک کرنا پڑی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ ہجرت کی تو وہاں پر آپ کو قوت و طاقت حاصل ہو گئی۔ جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا؛ اور انصاری قبائل میں اسلام پھیل گیا تو بعض وہ لوگ جو کہ صدق دل سے ایمان نہیں لائے تھے وہ اپنی قوم کے ساتھ موافقت کے لیے اسلام کا اظہار کرنے لگے۔ اس لیے کہ اہل ایمان و قوت و سطوت حاصل ہو گئی تھی۔ اور ان کے ہاتھ میں اب تلوار بھی آ گئی تھی؛ اور یہ کفر کی وجہ سے لوگوں سے جہاد بھی کرتے تھے۔

تیسری بات: عام طور پر بنی آدم کے اہل خرد و دانش اور اصحاب عقل لوگ جب کچھ عرصہ تک دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں تو انہیں دوسرے انسان کی محبت اور دوستی یا نفرت اور دشمنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تیرہ برس تک ان کی صحبت میں رہے۔ تو کیا رسول اللہ ﷺ کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ابوبکر آپ کے دوست ہیں یا دشمن؟ اور پھر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر ایک دار خوف میں اکٹھے بھی ہیں۔ کیا یہ بات رسول اللہ ﷺ کی شان میں قدح نہیں ہے؟

پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: تمام لوگ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے لیکر وقت و فات تک

آپ کا سب سے بڑا دوست اور آزاد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے دوسرے لوگوں کو بھی یہ دعوت پیش کی حتیٰ کہ وہ بھی ایمان لے آئے۔ آپ نے کمزور مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے اپنا مال خرچ کیا۔ جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ نیز آپ موسم حج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے اور مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ اور رسول اللہ ﷺ روزانہ صبح یا شام کو آپ کے گھر تشریف لاتے۔ آپ کو کفار نے ایمان لانے پر مشق ستم بھی بنایا۔ حتیٰ کہ آپ ہجرت کی غرض سے نکلے تو راستہ میں عرب امراء میں سے ایک امیر ابن دغنه سے ملاقات ہوئی۔ یہ اپنے علاقہ کا بڑا انسان تھا۔ اس نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟..... یہ پوری روایت پہلے گزر چکی ہے۔

تو کیا پھر جس انسان کے پاس ادنیٰ سی عقل بھی ہو؛ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دوستی و محبت جاٹاری اور فدائیت میں معمولی سا شک بھی کر سکتا ہے؟ حالانکہ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت اور دوستی کی وجہ سے آپ نے اپنی قوم اور خاندانی سے دشمنی مول لے رکھی تھی۔ اور ان کی طرف سے ملنے والی تکلیفوں پر صبر کیا کرتے اور اہل ایمان بھائیوں میں سے ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کیلئے اپنا مال خرچ کرتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو رات یا دن میں یا غلوت یا جلوت میں اجتماعی یا انفرادی حالت میں کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ حالانکہ - معاذ اللہ - [جیسے رافضی خباثت کہتے ہیں] - اگر آپ چاہتے تو زہر دینا یا قتل کرنا یا کوئی اور چال چل کر آپ ﷺ کو تکلیف دینا حضرت کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

✽ مزید برآں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت اور تائید حاصل تھی؛ اس کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی برائی کا ارادہ کرنے والے انسان سے آپ کو مطلع کر دیتے؛ اگر کسی کا کوئی برا ارادہ ہوتا۔ جیسا کہ:

۱:..... اللہ تعالیٰ نے ابی عزہ کے ارادہ سے رسول اللہ ﷺ کو مطلع کر دیا تھا جب وہ ایمان کا اظہار کرتے ہوئے برے ارادہ سے رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنا تو ایک ہی مجلس میں ہو گیا۔

۲:..... ایسے ہی حنین کے موقع پر جب مسلمان پسا ہو گئے تو تجھی برے ارادہ سے آگے بڑھا؛ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں خبر دیدی۔

۳:..... فتح مکہ کے موقع پر عمر بن وہب جب آپ ﷺ پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی طرف آگے بڑھ رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے آگاہ کر دیا۔

۴:..... غزوہ تبوک سے واپسی پر جب منافقین نے چاہا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار کاٹ کر آپ پر حملہ کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ارادہ سے آگاہ کر دیا [اور ان لوگوں کے نام بھی بتا دیے]۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں دن و رات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ غلوت و جلوت میں آپ کے ساتھی تھے۔ بدر کے دن آپ اکیلے ہی جھوپڑے میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھر بھی کوئی میل ہوتی تو پھر کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بارے میں خبر نہ ہوتی۔ جس انسان کو ادنیٰ ذہانت بھی حاصل ہو وہ اس سے بہت کم وقت کی ہمراہی میں ایسی باتوں کا ادراک کر لیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں

ایسا گمان صرف وہی انسان کر سکتا ہے جو لوگوں میں سب سے بڑا جاہل اور سب سے بڑا بیوقوف ہو اور نبی کریم ﷺ کی شان میں سب سے بڑا گستاخی کرنے والا اور عیب لگانے والا ہو۔ اس سے بڑا کوئی طعن رسول اللہ ﷺ کی شان میں نہیں ہو سکتا۔ بھلے ایسا کہنے والا محبت رسول اللہ ﷺ کا دعویدار ہو۔ جس انسان کو دین اسلام کے متعلق ادنیٰ سا علم بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ رافضی مذہب دین اسلام کے متناقض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندیق لوگ جو دین اسلام میں فساد پیدا کرنا چاہتے تھے وہ اپنے پیروکاروں کو شیعیت کے اظہار کا حکم دیتے تھے۔ اور وہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے شیعیت کا راستہ ہی استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ ”بلاغ اکبر“ اور ناموس اعظم کے مصنف نے ذکر کیا ہے۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ: اس آیت میں مذکور صحبت:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنِ إِنَّ اللَّهَ مَغْنَمٌ﴾ [التوبة ۴۰]

”جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے: گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

اپنے ساتھی کے ساتھ محبت و الفت اور موالات اور اس کی سچی اتباع کی صحبت ہے۔ جس کا نفاق سے یا محض سفر کے ساتھی کی صحبت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہی صحبت ہے جو کوئی بھی انسان کسی کو اپنا دوست بناتے ہوئے پیش نظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ علم ضروری کے طور پر تمام خلائق کے ہاں مشہور و معروف ہے۔ اور کئی امور کی بنا پر اسے تواتر کی حیثیت حاصل ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت و موالات اور آپ پر صدق ایمان [کمال کی معراج پر تھے]؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ابن عم کی محبت و الفت سے بہت بڑھ کر تھے۔



فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یقین و ثبات]

[اعتراض]: شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ: اس آیت کریمہ ﴿فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ”

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اپنا سکون نازل فرمایا“۔ میں سکینہ نازل کرنے کا ذکر فرمایا تو اس میں واضح طور پر اہل ایمان کو سکون و اطمینان کے مورد میں آپ کا شریک قرار دیا ہے، مگر آیت زیر تبصرہ میں یہ صراحت موجود نہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور نقص نہیں ہو سکتا۔“

[جواب]: پہلی بات: رافضی مصنف اپنے تئیں یہ تصور کروانا چاہتا ہے کہ سکون نازل ہونے کا ذکر متعدد بار ہوا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ تذکرہ صرف حنین کے موقع پر ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَ ضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُذِيرِينَ﴾ ﴿لَقَدْ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [التوبہ ۲۵-۲۶]

”اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جب کہ تمہیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔ پھر اللہ نے اپنی طرف کی تسکین اپنے نبی پر اور مومنوں پر اتاری اور اپنے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے۔“

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے پیٹھ پھیر کر چلے جانے کے بعد اہل ایمان اور اپنے نبی پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر فرمایا

ہے۔ پھر دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ کیساتھ اہل ایمان پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا..... هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ.....﴾ [الفتح ۱۳]

”(اے نبی) بیشک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے..... وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور اطمینان ڈال دیا۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح ۱۸]

”یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا جبکہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کر لیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا۔“

دوسری بات: علماء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ اس آیت: ﴿فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ میں ضمیر کس کی طرف راجع ہے۔ بعض کہتے ہیں: ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ کی طرف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: بلکہ ضمیر کا مرجع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے کہ ابوبکر اقرب المذکورین ہیں اور آپ کو اطمینان و سکون کی ضرورت زیادہ تھی۔ تو آپ پر بھی ایسے

ہی سکون نازل ہوا جیسا کہ بیعت رضوان کے موقع پر درخت کے نیچے اہل ایمان پر سکون و اطمینان نازل ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ اس حال میں اس سے مستغنی تھے؛ اس لیے کہ آپ کو کمال اطمینان حاصل تھا۔ بخلاف یوم حنین کے؛ اس لیے کہ اس دن آپ کو اس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ جمہور صحابہ پسپا ہو چکے تھے؛ اور دشمن آپ کی طرف بڑھ رہا تھا اور آپ اپنی خچر کو دشمن کی طرف ہانک رہے تھے۔

پہلے قول کی بنیاد پر ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی ہے:

﴿وَإِذْكَ بَجْنُودٌ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ”اور ایسے لشکر سے ان کی مدد کی جسے تم نے نہیں دیکھا۔“

اس لیے کہ سیاق کلام میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر تھا؛ اس لیے جداگانہ طور پر نزول سیکنہ کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ آپ نبی ﷺ کے تابع و مطیع اور رفیق و مصاحب تھے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ: جب آپ نے اپنے ساتھی سے کہا: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ ”یشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے“ [تو اللہ تعالیٰ کی معیت دونوں کو حاصل تھی]۔ نبی کریم ﷺ متبوع و مطاع تھے۔ اور ابو بکر تابع و مطیع۔ اور یہی آپ کے ساتھی بھی تھے۔ بنا بریں جب متبوع کو سکون و اطمینان اور ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی تو لازماً تابع بھی اس میں شریک ہوگا۔ اس لیے یہاں جداگانہ طور پر نزول سیکنہ کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کمال مصاحبت و ملازمت حاصل تھے جو کہ اس تائید و سکون میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی مشارکت کو واجب کرتے تھے۔

بخلاف حنین کے دن پسپا ہونے والوں کے احوال کے۔ اس لیے کہ اس موقع پر اگر اللہ تعالیٰ اتنا ہی فرماتے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنا سکون اپنے پیغمبر پر نازل کیا، اور اس سے آگے کچھ نہ فرماتے تو یہاں پر کوئی ایسا قرینہ نہیں تھا جس کی وجہ سے ہم کہہ سکتے کہ یہ سکون اہل ایمان پر بھی نازل ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ جب پسپا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور ان کے لیے ایسی مطلق صحابیت بھی ثابت نہیں تھی جو ابو بکر جیسے کمال صحبت و ملازمت پر دلالت کرتی ہو۔

چونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مطلقاً صاحب کامل کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ اور ہر حال میں نبی کریم ﷺ کے وابستہ رہا کرتے تھے۔ خصوصاً ایسے نازک وقت اور انتہائی خوف کے حالات میں جب کہ دوسری نہایت بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تو اس سے بطریق دلالت النص واضح ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نصرت و تائید ربانی کے وقت بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک و سہم ہوں گے۔ اس لیے کہ جو کوئی بھی انتہائی سختی اور خوف و شدت کے حالات میں دوسری نبھائے؛ وہ ضروری طور پر نصرت اور تائید و مدد کے احوال میں بھی ساتھ نبھاتا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ احوال کلام خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔

جب اس بات کا علم ہو گیا کہ آپ اس حال میں بھی آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی اور مؤید تھے؛ تو یہ بات بھی بدیہی طور پر معلوم ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ پر جو سیکنہ نازل ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا لشکر اتار کر آپ کی تائید کی گئی؛ جس کو آپ کے مذکورہ ساتھی و دوست نہیں دیکھ سکے؛ اس میں باقی لوگوں کی نسبت بہت بڑی فضیلت ہے؛ اور یہ قرآن کی بلاغت اور حسن بیان کی دلیل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ﴾ [التوبة ۶۲]

”اللہ اور اس کا رسول رضا مند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔“

یہاں پر اس جملہ: ﴿أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ﴾ میں اگر ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی رسول اللہ ﷺ کی رضا مندی کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اگر اس کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے تو رسول اللہ ﷺ کی رضا مندی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو جائے۔ جب ان دونوں میں سے کسی ایک کی رضا مندی دوسرے کی رضا مندی کے حصول کے بغیر ممکن نہیں؛ تو ان دونوں کی رضا مندی ایک ہی چیز سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب پہلا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہو تو رسول اللہ ﷺ کی رضا مندی اس کی اتباع میں ہو جائے گی۔ جیسے یہاں پر ﴿أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ﴾ میں اللہ تعالیٰ واحد کی ضمیر لائے ہیں۔ ایسے ہی یہاں پر: ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا﴾ میں واحد کی ضمیر لائے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں پر کسی ایک پر اطمینان و سکون کا نزول دوسرے کی مشارکت کو مستلزم ہے۔ یہ محال ہے کہ ایک ساتھی پر اطمینان نازل ہو اور ساتھ دینے والے پر نہ ہو یا ساتھ دینے والے پر نازل ہو اور اس ساتھی پر نازل نہ ہو جو کہ ہمیشہ سے جزء لاینفک اور ملازم ہے۔ جب اس سکینہ کا حصول ان دونوں کے ساتھ ہی ممکن تھا تو ضمیر کو واحد لایا گیا۔ اور اس ضمیر کا اصل مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، اور آپ کا صاحب و ساتھی آپ کے اتباع میں اس میں شریک ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر سکون نازل کیا اور ان کی تائید کی؛ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی شریک نبوت ہوں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعُلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا﴾ [القصص ۳۵]

”ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا باز و مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے۔“

اگر یہ کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر سکون نازل فرمایا اور ان کی تائید کی؛ تو اس سے شرارت کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ [تو اس کا جواب یہ ہے:] بلکہ یہاں پر ضمیر کا مرجع رسول متبوع ہے۔ اور آپ کی تائید و نصرت آپ کے ساتھی کی تائید و نصرت بطور لازم ضرورت کے تحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موقع پر بھی نبی کریم ﷺ کو تائید و نصرت سے نوازا گیا نبی کریم ﷺ کے بعد اسی قسم کے حالات میں تائید و نصرت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے شامل حال ہوئی، اسی بنا پر خوف و شدت کے مقامات پر تمام صحابہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یقین و ثبات میں سب سے آگے تھے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

”اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب انسانوں کے ایمان کے ساتھ تولد جائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان بڑھ جائے گا۔“^①

① شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسے حدیث نبوی نہیں، بلکہ بصیغہ تمییز ”قُلْ“ ذکر کیا ہے۔ نیز احادیث القصاص (ح: ۱۸)، میں ان الفاظ کو موضوع قرار دیتے ہوئے معنادار قرار دیا ہے جیسا کہ آگلی حدیث ہے۔ تاہم یہ روایت مرئوفاً الکامل لابن عدی (۴/۱۵۱۸)، میں بسند ضعیف مروی ہے۔ تاہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مؤثفاً ثابت ہے۔ دیکھئے فضائل الصحابة للامام احمد (۶۵۳)، السنة لعبد اللہ بن احمد (۸۲۱)، شعب الایمان (۳۶)، اس معنی کی مرئوفاً روایت مسند احمد (۷۶/۲)، الشريعة للأجری (۱۳۳۳)، میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

سنن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ سے پوچھا:

”کیا تم میں سے کسی نے آج خواب دیکھا ہے؟“ ایک صحابی نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک ترازو اترا جس میں آپ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تولایا گیا تو آپ بڑھ گئے، پھر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو تولایا گیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو تولایا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر ترازو کو آسمانوں میں اٹھایا گیا۔ پھر نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ”یہ خلافت نبوت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اپنا ملک عطا کر دے گا۔“ ❶

ابو بکر بن عیاش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باقی صحابہ کرام پر روزہ اور نماز کی وجہ سے سبقت نہیں لے گئے تھے، بلکہ آپ کی سبقت کا سبب دل میں موجود ایمان تھا۔

آیت ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ اور شیعہ کا استدلال:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: آیت قرآنی ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ حضرت ابودھراح رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ آپ نے اپنے ایک پڑوسی کے لیے ایک کھجور کا درخت خریدا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس انسان کو اس کھجور کے درخت کے بدلہ میں جنت میں ایک درخت کی بشارت سنائی۔ جسے ابودھراح رضی اللہ عنہ نے سن لیا ❷ اور ایک پورا باغ خرید کر اپنے پڑوسی کے لیے ہبہ کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کے بدلہ میں جنت میں ایک باغ کی خوشخبری سنائی۔ [اچھی کام رائیض]

[جواب]: ایسا کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ آیت حضرت ابودھراح رضی اللہ عنہ کیساتھ مختص ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین قرآنی علوم کے ماہرین اور اسباب نزول جاننے والے تمام علماء کرام کا اتفاق ہے کہ مذکورہ سورت مکی ہے۔ اور ابودھراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ بالاتفاق مدینہ منورہ میں پیش آیا۔ کیونکہ آپ انصار میں سے ہیں۔ اور انصار کو شرف صحابیت مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اور باغ و بستان وغیرہ مدینہ میں ہی تھے۔ پھر یہ بات ممتنع ہو جاتی ہے کہ یہ آیت حضرت ابودھراح رضی اللہ عنہ کے قصہ کے بعد نازل ہوئی ہو۔

❶ سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی الخلفاء (حدیث: ۴۶۳۴)، سنن ترمذی، کتاب الروایا۔ باب ماجاء فی رؤیا النبی ﷺ، المیزان والدلو (حدیث: ۲۲۸۷)۔

❷ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاصابۃ ۴/ ۵۹ میں حضرت ابودھراح انصاری رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی تحریر کئے ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام لغوی اور حاکم نے حماد بن سلمہ کی سند سے حضرت انس سے یوں روایت کیا ہے: ”ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! فلاں انسان کے پاس کھجور کا ایک درخت ہے اور میں اپنی دیوار بنانا چاہتا ہوں۔ آپ اسے حکم دیں کہ وہ درخت مجھے دیدے۔ تاکہ میں دیوار بنا سکوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ درخت اسے جنت میں ایک درخت کے بدلہ میں دیدو۔ مگر اس آدمی نے انکار کر دیا۔ پھر حضرت ابودھراح رضی اللہ عنہ اس کے پاس چلے گئے اور فرمانے لگے: یہ درخت مجھ پر میری چار دیواری کے بدلہ میں بیچ دو۔ تو وہ اس پر راضی ہو گیا۔ حضرت ابودھراح واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں نے وہ کھجور اپنی چار دیواری کے بدلہ خرید لی ہے اور وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اوہ! ابودھراح کے لیے جنت میں کتنی زیادہ اور ٹٹھی کھجوریں ہیں۔“ آپ نے یہ کلمہ کئی بار ارشاد فرمایا۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم؛ کتاب البیوع؛ ح ۲۱۳۷۔

اگر کسی مفسر نے یہ کہا بھی ہے کہ یہ آیت ابو دحداح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت ابو دحداح کے واقعہ کو بھی شامل ہے۔ بعض صحابہ و تابعین جب کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کو شامل ہے اور اس کے حکم پر دلالت کرتی ہے، یا یہ واقعہ بھی اس کے عموم حکم میں شامل ہے۔ بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت دو مختلف اسباب کی بنا پر دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ اس سبب کی بنا پر اور دوسری بار اس سبب کی بنیاد پر۔

اس قول کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ آیت دو بار نازل ہوئی ہو۔ ان میں سے ایک بار حضرت ابو دحداح رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہو۔ وگرنہ اہل علم میں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت ابو دحداح کے مسلمان ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

بہت سارے علماء کرام رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ: یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایسے ہی ابن ابی حاتم اور شعبی رحمہ اللہ نے بھی حضرت عبداللہ اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ: ہم سے ہمارے والد نے حدیث بیان کی: ان سے محمد بن ابی عمر عدنی نے وہ محدث ابن عیینہ سے: وہ حضرت عروہ رحمہ اللہ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سات ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

بلال۔ عامر بن فہرہ۔ نہدیہ۔ بنت نہدیہ۔ زہیرہ۔ ام عقیس رحمہ اللہ۔ بنی مؤمل کی ایک لڑکی۔^①

محدث سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”زہیرہ رومی الاصل اور بنی عبدالدار کی مملوک تھی۔ جب اسلام لائیں تو ان کی بصارت جاتی رہی۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ لات و منات نے اسے اندھا کر دیا۔ زہیرہ نے کہا میں لات و منات کو معبود نہیں تصور کرتی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ قوت بینائی عطا فرمائی۔“^②

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدا تو وہ پتھروں میں دبے ہوئے تھے۔ ان کے مالک نے کہا اگر کوئی شخص مجھے ایک اوقیہ بھی دے تو میں بلال رضی اللہ عنہ کو فروخت کر دوں گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر آپ ایک سو اوقیہ بھی طلب کریں تو میں دے کر انہیں خرید لوں گا۔“ فرماتے ہیں اسی ضمن میں مذکورہ صدر آیت: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقَى﴾ آخر سورت تک نازل ہوئی۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو اس وقت آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، وہ سب آپ نے راہ الہی میں صرف کر دیے۔ کئی اور وجوہات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے:

پہلی وجہ: فرمان الہی ہے: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقَى﴾ اور یہ بھی فرمایا ہے: ﴿إِنْ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ﴾ بیشک تم میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ ”تو یہ ضروری ہے کہ امت کا سب

① مستدرک حاکم (۲۸۴/۳) سیرۃ ابن ہشام (ص: ۱۴۶-۱۴۷)۔ ② سیرۃ ابن ہشام (ص: ۱۴۷)۔

سے بڑا متقی اس آیت کے ضمن میں داخل ہو؛ اور وہی اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا بھی ہوگا۔ کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں کہ حضرت ابودھراحؓ سابقین اولین مہاجرین؛ حضرت ابوبکر و عمر عثمان و علیؓ چھ تھیں سے زیادہ افضل اور عزت والے تھے۔ بلکہ تمام امت کیا اہل سنت اور کیا غیر اہل سنت سب کا اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا صحابہ کرام اور ان کے امثال مہاجرین حضرت ابودھراحؓ سے افضل ہیں۔ تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بڑا متقی جس نے زکوٰۃ ادا کر کے تزکیہ نفس کیا ہے وہ ان ہی میں سے ایک ہو۔

✽ اس بات کا دعویدار کہتا ہے کہ: یہ آیت حضرت ابودھراحؓ کی شان میں نازل ہوئی۔ جب کسی مسئلہ میں دو قول ہوں۔ ایک کہنے والا کہہ رہا ہو کہ یہ ابودھراحؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور دوسرا کہہ رہا ہو: حضرت ابوبکرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ تو یہ دوسرے قول والے کی تائید قرآن سے ہوتی ہے۔ اور اگر اس آیت کو ان دونوں حضرات کے لیے عام سمجھا جائے تو حضرت ابوبکرؓ اس آیت کی فضیلت میں داخل ہونے کے حضرت ابودھراحؓ سے زیادہ حق دار ہیں۔ [لہذا ان مفسرین کا قول زیادہ قرین صحت و صواب ہے جو کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس لیے آپ امت بھر میں اچھی و اکرم تھے۔] [دلدار]۔

اور یہ کیونکر نہیں ہو سکتا جب کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا، جتنا ابوبکرؓ کے مال سے ہوا۔“ ✽

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تمام امت کے مال سے ایسا فائدہ حاصل ہونے کی نفی کی ہے جیسا فائدہ آپ کو حضرت ابوبکرؓ کے مال سے حاصل ہوا تھا۔ تو پھر اصلی اور فائدہ بخش اموال کو چھوڑ کر فاضل اموال کو اس آیت کے عموم میں کیسے داخل کیا جاسکتا ہے؟

✽ دوسری وجہ: جب سب سے بڑا متقی وہی تھا جس نے اپنا مال دیا اور تزکیہ نفس کیا؛ وہ مخلوق میں سب سے بڑا باعزت اور متقی تھا؛ تو وہی لوگوں میں سب سے افضل بھی ہوا۔ اس آیت میں دو قول مشہور ہیں۔ اہل سنت و الجماعت کا عقیدہ ہے کہ [رسول اللہ ﷺ کے بعد] مخلوق میں سب سے زیادہ عزت والے حضرت ابوبکرؓ ہیں۔ اور شیعہ کا یہی عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ کے متعلق ہے۔ پس پھر یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوق میں ان دو حضرات سے بڑھ کر کوئی متقی اور عزت والا ہو۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ایسا نہیں جو اس آیت کے موجب میں داخل ہو۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور ایسا ہونا چاہیے جو اتنی کے معنی و مفہوم میں داخل ہو تو واجب ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی اس آیت کے موجب میں داخل ہوں۔ حضرت علیؓ کی نسبت آپ اس تعریف و تفسیر کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کے کئی ایک اسباب ہیں:

✽ پہلا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى﴾ [اللیل ۱۸] ”جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ

① سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب (۱۵/۳۴)، (حدیث: ۳۶۶۱)، سنن ابن ماجہ۔ المقدمة۔ باب فضل ابی بکر الصدیقؓ (حدیث: ۹۷)، من طریق آخر۔

پاک ہو جائے۔“ صحاح ستہ اور دوسری کتابوں میں تو اتر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور اس باب میں آپ سب صحابہ سے بڑھ کر پیش پیش رہتے تھے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ مرض الموت میں اپنے سر پر ایک کپڑا باندھے ہوئے گھر سے نکلے؛ مسجد میں آئے اور منبر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور پھر فرمایا:

”کسی شخص نے اپنی جان و مال سے مجھ پر اتنا احسان نہیں کیا جتنا ابوبکر بن ابی قافہ رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔“ اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا، مگر دین اسلام کی بنا پر جو دوستی استوار کی جائے وہی اچھی ہے۔ مسجد کی جانب کھلنے والی سب کھڑکیاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کے سوا بند کر دی جائیں۔“^①

یہ نصوص صحیح، متواتر اور صریح ہیں، اور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اس کی رسول ﷺ کی رضامندی میں اپنا مال خرچ کرنے میں سب لوگوں سے پیش پیش رہتے تھے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ایسا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آپ پر احسانات تھے؛ جب مکہ میں بھوک کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے آپ کو حضرت ابوطالب سے لیکر اپنی کفالت میں تربیت کی۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ فقیر ہی رہے۔ یہ بات اہل سنت اور شیعہ کے ہاں معروف ہے۔ آپ نبی کریم ﷺ کے عیال میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے پاس اخراجات کے لیے کچھ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ کے پاس مال ہوتا تو آپ ضرور خرچ کرتے؛ مگر آپ پر مال خرچ کیا جاتا تھا؛ آپ [ابھی تک] انفاق والوں میں سے نہیں تھے۔

❁ دوسرا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا رَآ حَيْدٍ عِنْدَكَ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى﴾ [اللیل ۱۹] ”حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔“ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان ہے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یہ احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بدولت انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ یہ ایسی نعمت ہے جس پر مخلوق میں سے کوئی ایک بھی بدلہ نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس نعمت کے لیے رسول اللہ ﷺ کا اجر صرف اللہ تعالیٰ پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾ (ص ۸۶)

”کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔“

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (السباۃ ۴)

”فرما دیجئے: جو بدلہ تم سے مانگوں وہ تمہارے لئے ہے میرا بدلہ تو اللہ ہی کے ذمے ہے۔“

❁ پس ربی وہ نعمت جس پر کوئی بدلہ دے سکتا ہے وہ دنیا کی نعمت و احسان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ ﷺ کا کوئی دنیاوی احسان نہیں تھا۔ بلکہ دینی احسان تھا۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ آپ پر [دینی احسان کے ساتھ ساتھ] دنیاوی

① صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ ”سدوا الابواب الا باب ابی بکر“ (ح: ۳۶۵۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق ﷺ (ح: ۲۳۸۲)۔

احسان بھی تھا؛ جس پر بدلہ دیا جانا ممکن تھا۔

تیسرا سبب: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کوئی ایسا سبب نہیں تھا جس کی وجہ سے دوستی رکھتے اور پھر اپنا مال خرچ کرتے [جان و مال سے نثار ہوتے] سوائے ایمانی سبب کے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی ایسے نصرت نہیں کی جیسے ابوطالب نے قرابت کی وجہ سے نصرت کی تھی۔ بلکہ آپ کا عمل کامل اخلاص کے ساتھ صرف اور صرف اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ [اللیل ۷۱-۲۱]

”وہ تو صرف اپنے رب بلند و برتر کی رضامندی کے لیے دیتا ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔“

ایسا ہی معاملہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی بیوی تھیں۔ اور کبھی بیوی کو اپنے شوہر پر خرچ کرنا پڑتا ہے؛ بھلے وہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی ہو۔

اور بالفرض اگر مان بھی لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ خرچ کیا کرتے تھے؛ کبھی ان اسباب کی طرف فعل کو مضاف کیا جاتا ہے۔ بخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے: اس لیے کہ آپ کے لیے ایمان باللہ کے سوا کوئی دوسرا سبب نہ تھا۔ تو آپ اس فرمان الہی کی روشنی میں سب سے بڑے اور سچے متقی تھے۔ فرمان الہی ہے:

﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ﴾ [اللیل ۲۰]

”وہ تو صرف اپنے رب بلند و برتر کی رضامندی کے لیے دیتا ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَسَيَجْزِيَنَّهَا اللَّهُ الَّذِي يُوْتِي مَالَهُ يَتَزَوَّدُ ۚ وَمَا لَاحِدٍ عَبْدُهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ﴾ [اللیل ۷۱-۲۰]

”اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار و درور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر وہ تو اپنے بزرگ و برتر رب کی رضامندی طلب کرنے کے لیے دیتا ہے۔“

یہاں پر استثناء منقطع ہے۔ اس کا معنی یہ ہے: اس کی عطاء صرف اس انسان تک نہیں جس کا اس پر کوئی احسان ہے کہ اسے کوئی بدلہ دے۔ سو بیک آہٹ میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کرنا تو لوگوں پر عدل واجب میں سے ہے جو کہ ابجاریا خرید و فروخت میں معاوضہ کی منزلت پر ہے۔ ایسا کرنا ہر ایک کے حق میں دوسرے پر واجب ہے۔ اور جب کسی ایک پر کسی کا کوئی احسان نہ ہو جس کا وہ بدلہ دے رہا ہو؛ تو اس وقت یہ معاوضہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں دینے والے کی عطاء صرف اللہ رب العالمین کی رضامندی کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ بخلاف اس انسان کے جس پر کسی کا احسان ہو تو اسے اس احسان کا بدلہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ باہم بدلہ دینا ضروریات میں سے ہے۔

چوتھا سبب: اگر مان لیا جائے کہ اس آیت کے مصداق میں کئی ایک صحابہ داخل ہیں؛ تو یہ بھی حق ہے کہ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ پوری امت میں سے اس آیت کے مصداق میں داخل ہونے کے سب سے پہلے حق دار ہیں۔ آپ ہی اس امت کے سب سے بڑی متقی ہیں۔ پس اس بنا پر آپ ان سب میں سے افضل ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ”المتقی“ سب سے بڑے متقی کی جو صفات بیان کی ہیں؛ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان میں پوری امت میں سب سے بڑے کامل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۖ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَكَ مِن تَعَمُّعَةٍ تُجْزَىٰ ۖ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ﴾

”جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر وہ تو اپنے بزرگ و برتر رب کی رضامندی طلب کرنے کے لیے دیتا ہے۔“ [اللیل ۱۸: ۲۰]

جہاں تک مال خرچ کرنے کا تعلق ہے؛ تو صحاح ستہ میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اتفاق فی سبیل اللہ دوسروں کے اتفاق سے افضل تھا۔ اور یہ کہ اپنی جان و مال کیساتھ آپ نے جو رسول اللہ ﷺ کی معاونت فرمائی دوسروں کی معاونت سے اکمل و افضل تھی۔

رہا ایسے احسان کی تلاش میں رہنا جس پر بدلہ دیا جائے؛ سو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی نبی کریم ﷺ سے کسی قسم کا کوئی دنیاوی مال طلب نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی دنیاوی حاجب کی چاہ میں رہے۔ بلکہ آپ رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کرنے کی تلاش میں رہتے تھے؛ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہو:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ الْعَفُوْرُ الرَّحِیْمُ))

”اے اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا بہت زیادہ ظلم؛ اور تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں؛ تو مجھے بخش دے بخشش تیرے پاس سے؛ اور مجھ پر رحم فرمایا بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔“ [بخاری: ۸۳۴۔ مسلم: ۲۷۰۵]

ساری زندگی رسول اللہ ﷺ نے آپ کو کوئی ایسا مال نہیں دیا جو صرف آپ کے ساتھ خاص ہو۔ بلکہ جب آپ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت حاضر ہوتے تو آپ کی بھی وہی حیثیت ہوتی جو کسی بھی غنیمت پانے والے مجاہد کی حیثیت ہوا کرتی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے آپ سے سارا مال لے لیا تھا۔ جب کہ آپ کے علاوہ جو دوسرے لوگ خرچ کرنے والے ہوا کرتے تھے۔ خواہ انصار میں سے ہوں یا بنی ہاشم میں سے۔ رسول اللہ ﷺ ان کو کچھ ایسے عطیات بھی دیا کرتے تھے جو دوسروں کو نہیں دیتے تھے۔ آپ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو خُس کے مال میں سے وہ مال دیا جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری لگائی اور اس پر انہیں وظیفہ دیا۔ جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کبھی بھی کچھ بھی نہیں دیا۔ سو ابوبکر رضی اللہ عنہ بدلے والے احسان سے لوگوں میں سب سے زیادہ دور تھے اور ایسی چیز سے سب سے زیادہ قریب تھے جس پر کوئی بدلہ نہیں دیا جاتا۔

جہاں تک اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے آپ کے اخلاص کا تعلق ہے؛ تو آپ کا اخلاص پوری امت میں سب سے زیادہ کامل و اکمل تھا۔ پس معلوم ہوا کہ آپ ان لوگوں میں سب سے زیادہ کامل ہیں جو ان آیات میں مذکور اوصاف کے

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (الزمر ٣٣)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

”تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے میں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

”اور جو مہاجرین اور انصار میں سے سابق اور مقدم ہیں.....“

اور ان کی امثال دیگر وہ آیات جن میں اس امت کے اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے؛ سو اب بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان صفات میں سب سے زیادہ کامل و اکمل ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان کی تعریف کی گئی۔ اور آپ ان آیات کے مصداق میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ اور جو لوگ ان آیات کے مصداق میں داخل ہیں، ان میں سب سے اکمل ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

فصل :

آیت ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ﴾ سے شیعہ کا استدلال

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ”یہ آیت: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ﴾؛ مراد یہ ہے کہ: ہم تمہیں ایک قوم کی طرف بلائیں گے۔ یہاں پر مقصود وہ لوگ ہیں جو صلح حدیبیہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ خیبر کا مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا؛ اور فرمایا: ﴿قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا﴾ آپ فرما دیجیے: تم ہرگز ہماری اتباع نہ کرو گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر کے اموال غنیمت کو ان لوگوں کے لیے خاص کر دیا تھا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ پھر فرمایا: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولَىٰ بِأَمْرِ شَدِيدٍ﴾ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بہت سارے غزوات کی طرف بلایا تھا؛ جن میں غزوہ مؤتہ؛ غزوہ حنین؛ تبوک اور دوسرے غزوات۔ پس یہ داعی رسول اللہ ﷺ تھے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ ان لوگوں کا آپ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنا

ہی اصل اسلام تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ”اے علی! تیرے ساتھ جنگ کرنا میرے ساتھ جنگ کرنا ہے۔“ اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنا کفر ہے۔“ [ابھی کام ادا نہیں]

[جواب]: اس آیت سے بعض علماء کرام رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور آپ کی اطاعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ ان علماء میں امام شافعی، امام اشعری اور ابن حزم وغیرہ رحمہم شامل ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے:

﴿فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُفَاقِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا﴾ (التوبة: ۸۳)

”پھر اگر اللہ آپ کو ان منافقوں کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور وہ آپ سے جہاد پر نکلنے کی اجازت مانگیں تو ان سے کہیے کہ: تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ہمراہ دشمن سے جنگ کرو گے۔“
ان حضرات کا کہنا ہے: ”اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ فرمادیں: ”تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ کبھی میرے ہمراہ دشمن سے جنگ کرو گے۔“

اس آیت کے مضمون پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ قتال کے داعی و محرک نبی کریم ﷺ نہیں ہیں، بلکہ آپ کے بعد آنے والے خلیفہ و نائب ہیں جو ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ہی ہو سکتے ہیں، جنہوں نے نبی کریم کے بعد فارس و روم اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنگیں لڑیں، یا ان کے ساتھ معاہدے کئے؛ جیسا کہ آیت میں ہے: ﴿تُفَاقِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ﴾ ”تمہیں ان سے لڑنا ہوگا یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔“

ان کے نزدیک سورۃ الفتح میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ توبہ میں بھی انہی سے خطاب کیا گیا ہے، اسی بنا پر یہ دلیل محل نظر و تامل ہے، یہ مسلمہ بات ہے کہ سورۃ الفتح بالاتفاق صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو اس آیت سے وجہ استدلال صاف ظاہر ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَعُدْ عَوْنِي إِلَى قَوْمِ أُولَىٰ بِأُسْ شِدْدِي تَفَاقِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ﴾

”عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کیلئے بلایا جائے گا۔ تمہیں ان سے لڑنا ہوگا یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔“

یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ سخت لڑاکے ہوں گے۔ اور یہ کہ وہ جنگ لڑیں گے یا تابع فرماں ہو جائیں گے۔ ان علماء کرام کا کہنا ہے: یہ ممکن نہیں کہ آپ نے عام فتح کے فوراً بعد اہل مکہ یا ہوازن کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلایا ہو۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی طرف ہی تو صلح حدیبیہ والے سال بلایا گیا تھا۔ پس جو کوئی ان میں سے نہ تھا، وہ ان ہی کی جنس میں سے تھا۔ وہ ان سے زیادہ سخت جنگجو نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام عرب اہل حجاز تھے۔ ان سے جنگ ایک ہی جنس کی جنگ تھی۔ اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح والے بدردا اور خندق اور دیگر مواقع پر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام سے اس سے بڑھ کر جنگ و قتال کرنے والے تھے۔

پس یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہو؛ وہ حدیبیہ والے سال جن لوگوں سے پالا پڑا

تھا؛ ان سے بڑھ کر جنگجو اور قتال کرنے والے ہوں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿أُولَئِكَ بَأْسٌ شَدِيدٌ﴾ ”سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کے لئے۔“

یہ دو گروہ ہی ہو سکتے ہیں:

پہلا گروہ: بنی امصر: جن سے جنگ کے لیے سن نو ہجری میں تبوک والے سال لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ لوگ سخت جنگجو تھے۔ یہ لوگ اس صفت کے دوسروں سے زیادہ حق دار تھے۔ ان لوگوں سے جنگ کا پہلا واقعہ مؤتہ والے سال پیش آیا۔ یہ تبوک سے پہلے سن آٹھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس معرکہ میں مسلمان امراء: حضرت زید بن حارثہؓ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ شہید ہو گئے تھے۔ اور مسلمان پسپا ہو کر واپس پلٹے تھے۔

پس ان لوگوں نے واپس آنے پر نبی کریم ﷺ سے عرض کی تھی: ”ہم میدان جنگ سے بھاگنے والے ہیں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں بلکہ تم پلٹ کر آنے والے ہو؛ میں تمہاری جماعت ہوں؛ اور ہر مسلمان کی جماعت ہوں۔“

لیکن بعض علماء نے ان الفاظ: ﴿تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ﴾ ”تم ان سے جنگ کرتے ہو یا پھر صلح کرتے ہو“ پر اعتراض کیا ہے؛ ان کا کہنا ہے کہ: اہل کتاب سے تو اس وقت تک لڑا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کر دیں۔ لیکن دوسرے گروہ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ یہ آیت مرتدین کے متعلق ہے۔ جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جنگیں لڑیں۔ یہ مرتدین مسئلہ کذاب کے ساتھی تھے۔ بلاشبہ وہ شبہ یہ لوگ انتہائی سخت جنگجو تھے۔ اور ان کے ساتھ معرکوں میں مسلمانوں کو بہت زیادہ سختیاں اور پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ سخت خونریز جنگیں ہوئیں؛ قرآن کی ایک جماعت شہید ہو گئی۔ یہ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے مابین بہت بڑی جنگیں تھیں۔ مرتدین کو یا تو قتل کیا جاتا ہے یا پھر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اور ان سے سب سے پہلے جنگ لڑنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی تھے۔ پس دلیل سے اس قتال کی طرف بلانے پر آپ کی اطاعت کا وجوب ثابت ہوا۔

قرآن بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کو ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لیے بلایا جائے گا جس میں دو میں سے ایک صفت پائی جائے گی۔ یا تو وہ لوگ ان سے جنگ کریں گے۔ یا پھر مسلمان ہو جائیں گے۔ ان دو میں سے ایک کام ہونا لازمی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ قوم سخت جنگجو بھی ہے۔ یہ اس کے خلاف ہے جو کچھ حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ اس میں نہ ہی قتال ہوا؛ اور نہ ہی وہ لوگ مسلمان ہوئے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر جنگ کے اور بغیر ان کے اسلام کے ان لوگوں سے صلح کر لی۔ اور واضح کر دیا کہ جن لوگوں سے لڑنے کے لیے انہیں بلایا جائے گا وہ ان کے بعد ہوں گے۔

پس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ﴾ ”تمہیں ان سے لڑنا ہوگا“ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان کو اسلام پر لانے یا جزیہ ادا کرنے کے لیے لڑنے کے معانی میں مانع ہو۔ لیکن ان سے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿سَتَذَعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولَئِكَ بَأْسٌ شَدِيدٌ﴾

”عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کے لئے بلایا جائے گا۔“

اس کلام سے فاعل حذف کر دیا گیا ہے۔ پس یہاں پر فاعل یعنی جہاد و قتال کی طرف بلانے والے کو متعین نہیں کیا گیا۔

پس قرآنی دلالت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ جو بھی [امام و حاکم] کسی سخت قوم سے لڑنے کے لیے بلائے کہ یا تو ان سے قتال کیا جائے یا پھر وہ اسلام قبول کر لیں، تو اس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مرتدین کے ساتھ جنگ و قتال کی طرف بلایا؛ پھر روم اور فارس سے جنگ کی دعوت دی۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روم و فارس سے قتال کرنے کی دعوت دی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے برابر دوسری قوموں سے جہاد کی طرف بلایا۔ یہ آیت ان تمام لوگوں کو شامل ہے۔

لیکن اس دعوت کو صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص کرنا جیسا کہ آپ کی خلافت استدلال کرنے والے ایک گروہ کا کہنا ہے؛ یہ غلط ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت ان تمام حضرات کو شامل ہے تو یہ بات بہت مناسب ہے۔ اور ممکن ہے کہ آیت سے یہی مراد ہو، اور اس پر استدلال کیا جاسکتا ہو۔ پس اس لیے ہر امیر کے ساتھ جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے جو کفار سے جنگ و قتال کے لیے لوگوں کو بلائے۔ پس اس سے مراد یہ ہوگی کہ آپ کو ایسی قوم سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا جو عربوں سے زیادہ سخت جنگجو ہوں گے۔ پس اس وقت دو باتوں میں سے ایک کا ہونا لازمی ہے؛ یا تو وہ اسلام قبول کر لیں یا پھر جنگ کریں [اور قتل کر دیئے جائیں]۔ یہ حدیبیہ کے واقعہ کے برعکس ہے۔ اس لیے کہ اہل حدیبیہ کا جنگی زور ان جیسا نہیں تھا۔ اور اس موقع پر نہ ہی قتال ہوا اور نہ ہی کافروں نے اسلام قبول کیا؛ [بلکہ ان کے ساتھ صلح کر لی گئی]۔

فتح مکہ والے سال بھی ایسے ہی ہوا۔ شروع میں ان لوگوں نے نہ ہی اسلام قبول کیا اور نہ ہی جنگ کی۔ مگر آخر کار انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ لوگ اہل روم و فارس ہیں۔ اگر یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں تو ان سے قتال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ قتال کی پہلی دعوت سر یہ مؤتہ وغزوہ تبوک کے موقع پر دی گئی۔ تبوک والے سال ان لوگوں نے نہ ہی جنگ کی اور نہ ہی اسلام قبول کیا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مبارک زمانے میں دو میں سے ایک کام کا ہونا ضروری تھا؛ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان لوگوں نے قتال کے بعد جزیہ ادا کیا۔ انہوں نے شروع میں ایسے صلح نہیں کی جیسے حدیبیہ کے موقع پر مشرکین نے صلح کر لی تھی۔ پس حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا لوگوں کو ان لوگوں کے خلاف جنگ و قتال کیلئے بلانا اس آیت میں شامل ہے۔ اور یہی ثابت کرنا مقصود ہے۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس کا معنی و مفہوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کو شامل نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں سے آپ نے جنگ لڑی؛ وہ آپ کے ساتھیوں سے زیادہ سخت جنگجو نہیں تھے۔ بلکہ وہ ان کے ہم جنس لوگ ہی تھے۔ اور آپ کیساتھ ان سے زیادہ سخت جنگ لڑنے والے تھے؛ نیز ان پر قتال یا اسلام قبول کرنے کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ سبھی مسلمان تھے۔ پس رافضی مصنف نے جو لکھا ہے کہ: ”حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تیری جنگ میری جنگ ہے“ اس کی سند اس نے ذکر نہیں کی۔ پس اسے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ حقیقت میں یہ روایت من گھڑت ہے۔ اور اس کے موضوع ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔“

[زیر تبصرہ آیت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: رافضی مصنف نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہو سکتا ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ یعنی اہل جمل و صفین و حروریہ اور خوارج۔ [یعنی کلام الرافضی]

[جواب]: رافضی کا یہ دعویٰ کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

❦ پہلی وجہ: یہ لوگ کسی بھی طرح اپنی ہی جنس کے لوگوں سے زیادہ سخت جنگجو ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ جن لوگوں سے جمل کے دن واسطہ پڑا وہ آپ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھے۔ اور آپ کا لشکر ان کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ ایسے ہی خوارج کی نسبت آپ کا لشکر کئی گنا زیادہ تھا۔ ایسے ہی اہل صفین سے بھی آپ کا لشکر بڑھ کر تھا۔ اور ان لوگوں کا تعلق ان ہی کی ایک ہی جنس سے تھا۔ سخت جنگجو ہونا ان کا وصف ہرگز نہیں ہو سکتا؛ جس کی بنا پر انہیں دوسروں سے جدا کیا جاسکتا ہو۔

❦ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ بنو حنیفہ اور اہل فارس و روم ان لوگوں سے کئی درجہ زیادہ سخت جنگجو اور لڑاکے تھے۔ اور اصحاب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خوارج کی طرف سے وہ مشکلات اور تکلیفیں اٹھانی پڑی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اصحاب کو میلہ کذاب کے لشکر کی طرف اٹھانا پڑی تھیں۔ روم اور فارس کے متعلق تو کوئی عاقل شک کر ہی نہیں سکتا کہ ان سے جنگ کرنا عرب مسلمانوں کے برسر پیکار ہونے کی نسبت بہت زیادہ سخت تھا۔ اگرچہ شروع میں عرب مسلمانوں نے جو عرب کفار سے جہاد کیا وہ بہت ہی افضل اور عظیم الشان تھا۔ اس لیے کہ اس وقت مسلمان تھوڑی تعداد میں اور کمزور تھے؛ اس لیے نہیں کہ ان کا دشمن اہل فارس و روم کی نسبت بہت سخت جنگجو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ [آل عمران ۱۲۳]

”اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔“

ان لوگوں کو باہم جمع کرنے والی چیز دعوت اسلام اور محابست تھی۔ پس ان کے مابین جنگ کی وجہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جیسے اہل فارس و روم اور مجوس عرب اور نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کی وجہ تھی۔ یہ لوگ عرب مسلمانوں کو اپنے سب سے کمزور پڑوسی اور رعایا گمان کرتے تھے۔ اور انہیں انتہائی حقیر سمجھتے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ان لوگوں کے سامنے ایسے ثابت قدم نہ رکھتے اور تائید سے نہ نوازتے جیسا کہ اس سے پہلے انبیاء اور اہل ایمان کی نصرت کی جاتی رہی ہے؛ تو یہ عرب مسلمان ان اہل فارس و روم کے سامنے ٹک نہ پاتے؛ اور نہ ہی ان کے ملک اور شہر فتح کر سکتے۔ ان کے پاس فوجی تعداد بہت زیادہ تھی؛ اور بے پناہ اسلحہ اور قوت بھی حاصل تھی۔ لیکن اہل ایمان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے قوت ایمانی سے نوازا ہوا تھا جو صرف ان لوگوں کے ساتھ ہی خاص تھی۔

❦ دوسری وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دور دراز کے لوگوں کو اہل جمل اور خوارج کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نہیں بلایا تھا۔ جب آپ بصرہ تشریف لائے تو آپ کے دل میں کسی سے جنگ کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ بلکہ جنگ جمل حضرت

علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین غیر اختیار اور غیر ارادی طور پر پیش آئی۔ جب کہ خوارج کے لیے آپ کے لشکر کا کچھ حصہ ہی کافی تھا۔ آپ نے حجاز کے اعراب میں سے کسی ایک کو ان جنگوں میں شرکت کرنے کے لیے نہیں بلایا۔

تیسری وجہ: اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ ان لوگوں سے جنگیں لڑنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب تھی تو یہ بات متنع ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کی اطاعت واجب کر دے جو نمازیوں کو صرف اس بنا پر قتل کر رہا ہو کہ وہی امر کی اطاعت میں داخل ہو جائیں؛ اور ایسے لوگوں کی اطاعت کا حکم نہ دے جو کفار سے اس لیے جنگ لڑ رہے ہوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔

یہ بات معلوم شدہ ہے کہ: جو انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے نکل جائے وہ اس انسان کی نسبت اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے دور نہیں ہو سکتا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم کی تکذیب کرتا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات میں سے کسی بھی چیز کا اقرار نہ کرتا ہو۔ بلکہ ان لوگوں کا گناہ بہت بڑا ہے؛ اور انہیں اسلام کی دعوت پیش کرنا اور ان سے قتال کرنا افضل ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی وہ کافر تھے۔ تو اگر یہ کہا جائے کہ: وہ مرتد تھے؛ جیسا کہ روافض کا عقیدہ ہے۔

[جواب]: یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جو مرتد محمد رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رسول مانتا ہوں جیسے مسیلمہ کذاب اور اس کے ہمنوا؛ تو یہ لوگ ان کی نسبت بڑے مرتد تھے جو امام کی اطاعت کا اقرار نہیں کرتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے تھے۔ بہر حال کچھ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے والوں کا کوئی بھی گناہ ذکر نہیں کیا جاسکتا مگر جن لوگوں نے اس سے قبل خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے قتال کیا ان کا گناہ اس سے بڑھ کر تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر لڑنے والوں کے لیے کوئی فضیلت اور ثواب بھی ذکر کیا جائے تو وہی اجر و ثواب اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے لیے ہوگا جنہوں نے حضرات خلفاء ثلاثہ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑیں۔

یہ اس صورت میں ہوگا جب یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑنے والے کافر تھے۔ لیکن سبھی لوگ جانتے ہیں کہ یہ قول باطل ہے۔ یہ بات صرف ردی قسم کے شیعہ ہی کہہ سکتے ہیں [کوئی دوسرا نہیں]؛ ان کے اہل عقل لوگ ایسی بات نہیں کہتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت سے تو اتر کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کو کافر نہیں کہتے تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑیں۔ یہ تمام باتیں اس وقت ہو سکتی ہیں جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ قتال مامور یہ تھا۔ اور یہ تسلیم کیا جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد علماء کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف مشہور و معروف ہے کہ کیا یہ جنگیں اہل بغاوت کے ساتھ جنگیں تھیں کہ جب ان کی شرائط پائی جائیں تو جنگ لڑنا واجب ہو جاتا ہے۔ یا پھر موجب قتال شروط کے انقضاء کی وجہ سے بغاوت کی جنگیں نہیں تھیں۔ اور یہ کہ ان جنگوں میں داخل ہونے سے بہتر و افضل یہ تھا کہ انسان ان سے بچ کر اور دور رہے۔ اور بعض علماء کرام نے انہیں فتنہ کی جنگیں شمار کیا ہے۔ جمہور محدثین اور جمہور ائمہ و فقہاء رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ: باغیوں سے جنگ کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ خود جنگ نہ چھیڑ دیں۔ قدوری میں ایسے ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اہل صفین نے حضرت

علیؑ سے جنگ نہیں چھیڑی تھی۔

ایسے ہی مدینہ، شام، بصرہ؛ کے بڑے بڑے فقہاء اور بڑے بڑے فقہاء حدیث جیسے امام مالک، ایوب، اوزاعی، اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے کہ یہ جنگیں مامور بہ نہیں تھیں۔ اور ان سے ہاتھ کھینچ لینا جنگ لڑنے سے بہتر تھا۔ جمہور ائمہ اہل سنت والجماعت کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ بخلاف حروریہ اور خوارج اور اہل نہروان کے۔ رسول اللہ ﷺ سے مشہور سنت و احادیث کی روشنی میں ان لوگوں سے جنگ کرنا واجب تھا۔ اس پر صحابہ کرام اور ائمہ اہل سنت کا اتفاق ہے۔

صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے قلعوں میں سے ایک قلعہ پر چڑھے پھر ارشاد فرمایا کیا تم وہ دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں کی جگہوں میں فتنے ایسے گر رہے ہیں جیسے بارش کے قطرات گرتے ہیں۔“

[صحیح بخاری: ج ۱: ح ۱۷۷۳]

سنن میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”عنقریب ایک فتنہ ہوگا جو عرب کو گھیر لے گا، اس کے مقتولین جہنم میں جائیں گے اور اس میں زبان کا استعمال کموار کے استعمال سے زیادہ سخت ہوگا۔“ [سنن ابوداؤد: ج ۳: ح ۸۷۳]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”عنقریب ایک اندھا، بہرا، گونگا فتنہ ہوگا پس جو اس کی طرف توجہ کرے گا وہ اس کے نزدیک ہو جائے گا اور زبان کو اس کی طرف متوجہ کرنا ایسا ہے جیسے تلوار سے اس میں شریک ہونا۔“ [سنن ابوداؤد: ج ۳: ح ۸۷۲]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

”رات کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ: ”سبحان اللہ! آج رات کس قدر فتنے نازل کئے گئے ہیں اور کس قدر خزانے کھولے گئے ہیں۔“ [صحیح بخاری: ج ۱: ح ۱۱۶]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

”عنقریب فتنے ہوں گے ان میں بیٹھنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے افضل ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا اور جو آدمی گردن اٹھا کر نہیں دیکھے گا تو وہ اسے ہلاک کر دیں گے اور جسے ان میں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے تو چاہئے کہ وہ پناہ لے لے۔“

[صحیح بخاری: ج ۳: ح ۱۹۷۴۔ صحیح مسلم: ج ۳: ح ۸۷۴، ۲۷۴، ۲۷۸۔ ۲۷۹]

صحیحین میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے: اس میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”[عنقریب فتنے برپا ہوں گے۔ آگاہ رہو پھر فتنے ہوں گے۔ ان میں بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا ان کی طرف دوڑنے والے سے بہتر ہوگا آگاہ رہو] جب یہ فتنے نازل ہوں یا واقع ہوں تو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے ساتھ ہی لگا

رہے اور جس کی زمین ہو وہ اپنی زمین سے ہی چننا رہے۔“

ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں جس کے پاس نہ اونٹ ہوں اور نہ بکریاں نہ ہی زمین۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وہ اپنی تلوار لے کر اس کی دھار پتھر کے ساتھ رگڑ کر کند اور ناکارہ کر دے۔ پھر اگر وہ نجات حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو نجات حاصل کرے۔ اے اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا؛ اے اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔“

ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں: ”اگر مجھے ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود ان دونوں صفوں میں سے ایک صف یا ایک گروپ میں کھڑا کر دیا جائے پھر کوئی آدمی اپنی تلوار سے مجھے مار دے یا کوئی تیر میری طرف آ جائے؛ جو مجھے قتل کر ڈالے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ آدمی اپنے گناہ اور تیرے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور دوزخ والوں میں سے ہوگا۔“ [صحیح مسلم: ج ۳: ح ۲۷۵۱]

ان احادیث کی طرح دیگر روایات بھی حضرت سعد بن ابی وقاص اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معروف ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن لوگوں نے یہ احادیث روایت کی ہیں ان میں سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوبکرہ؛ اسامہ بن زید؛ محمد بن مسلمہ؛ ابو ہریرہ؛ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ یہ حضرات جنگ جمل اور صفین کو فتنہ کی جنگیں قرار دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے: اسلام میں فتنہ کی یہ پہلی جنگیں تھیں۔ یہ لوگ ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے اور اپنے ماننے والے دوسرے لوگوں کو بھی جنگ میں شرکت سے منع کرتے رہے۔ یہ روایات مشہور و معروف ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن لوگوں نے جنگیں لڑیں وہ اپنے حق میں کتاب و سنت سے کوئی ایسی مضبوط دلیل پیش نہیں کر سکے جس کی روشنی میں ان جنگوں میں لڑنا واجب ہو۔ بلکہ انہوں نے اقرار کیا تھا کہ یہ لڑائیاں ان کی رائے تھی۔ جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی خبر دی ہے۔ ان دونوں لشکروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لحاظ سے جو لوگ آپ سے فردِ مرتبہ کے تھے؛ وہ اتباع کے زیادہ حقدار تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی کبھار ان جنگوں پر اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خوارج کے ساتھ جنگوں کے برعکس آپ کے پاس ان لڑائیوں کے حق میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں تھی جس کی بنا پر آپ خوشی و سرور کا اظہار کر سکیں۔ جب کہ خوارج کی جنگوں پر آپ اپنی خوشی و سرور اور رضامندی کا اظہار کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جنگیں تھیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے۔ اس لیے کہ ایسی نصوص نبویہ اور اہل شرعیہ موجود ہیں جن کی روشنی میں ان لوگوں سے لڑنا واجب تھا۔

چوتھی وجہ: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ لڑنے کو شامل نہیں۔ اس کہ آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿تَقَاتِلُوهُمْ أَوْ يُسْلِمُوا﴾ ”تم ان سے جنگ کرتے ہو یا پھر صلح کرتے ہو۔“

یہاں پر دو وصف بیان کئے گئے ہیں جن میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ جن لوگوں کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کے لیے بلایا تھا؛ ان میں سے خلقت کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جنہوں نے آپ سے کوئی جنگ نہیں کی۔ بلکہ یہ لوگ جنگ سے دستبردار رہے۔ نہ ہی انہوں نے آپ سے جنگ کی اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ یہ لوگ ایک تیسرا گروہ تھے۔ جنہوں نے نہ ہی آپ کے ساتھ جنگ کی اور نہ ہی آپ سے مل کر۔ اور نہ ہی آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے۔ یہ سبھی لوگ مسلمان تھے۔ ان کے مسلمان ہونے پر کتاب و سنت اور اجماع صحابہ بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور باقی لوگوں کے؛ دلائل موجود ہیں۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَائَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (الحجرات: ۹)

”اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرادیا کرو پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا وصف لڑائی و جنگ و جدال کے باوجود مؤمن ہونا بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی خبر دی ہے کہ یہ سبھی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھائی چارہ اہل ایمان کے مابین ہی ہو سکتا ہے؛ مؤمن و کافر کے مابین نہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن کے متعلق فرمایا:

”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور شاید اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرادے گا۔“

پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ اور لشکر علی رضی اللہ عنہ کے مابین صلح کروائی۔ پس یہ حدیث ان سبھی لوگوں کے اہل ایمان ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے مابین صلح و صفائی کو پسند فرماتے ہیں۔ اور یہ کام کرنے والوں کی ثنائے خیر کرتے ہیں۔ پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو کام حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا؛ وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا مندی کا کام تھا۔

رافضی مصنف اور اس جیسے دوسرے شیعہ کا ان لوگوں کو کافر کہنا؛ اور ان حضرات کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنے کو اسلام قرار دینا؛ اس لیے کہ ان کے گمان کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے: ”اے علی! تیرے ساتھ جنگ میرے ساتھ جنگ ہے۔“

اس کے جواب میں کہا جائے گا: ”بڑی ہی عجیب بات ہے۔ اور ان پر بہت بڑی مصیبت یہ ہے کہ رافضی مصنف اور جیسے دیگر خسیس لوگ اس عظیم اصول کو ثابت کر سکیں۔ اس لیے کہ رافضی کی پیش کردہ حدیث ایک من گھڑت روایت ہے جس کا حدیث کی معتمد کتابوں میں کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ نہ ہی صحاح میں نہ ہی سنن میں اور نہ ہی مسانید و فوائد

میں۔ اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی دوسری ایسی کتاب میں جن سے محدثین روایات نقل کرتے ہیں۔ اور ان کے مابین وہ کتب رائج ہیں۔ اور محدثین کے ہاں یہ روایت نہ ہی صحیح نہ ہی حسن اور نہ ہی ضعیف۔ بلکہ یہ ایک گروی ہوئی روایت ہے [جسے رافضی ٹوکہ نے گھڑ لیا ہے]۔ اور اس کا من گھڑت ہونا صاف واضح ہے۔ اس لیے کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے منقول اس مشہور و متواتر سنت کے خلاف ہے جس میں آپ نے دونوں گروہوں کو مسلمان قرار دیا تھا۔ اور یہ کہ اس فتنہ کے دور میں جنگوں میں شرکت کرنے سے دستبرداری اختیار کرنے کو آپ نے بہتر بتایا تھا۔ اور اس صورتحال میں دو گروہوں کے مابین صلح کروانے والے کی تعریف کی تھی۔ اگر ان دو گروہوں میں سے کوئی ایک دین اسلام سے مرتد ہوتا تو یقیناً وہ گروہ یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر ہوتے جو کہ کسی قدر اپنے دین پر باقی ہیں۔ اور وہ قتل کیے جانے کے سب سے بڑے مستحق ہوتے۔ جیسا کہ مسیلہ کذاب کے مرتد ساتھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے؛ جن سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قتال کیا اور ان کے ساتھ جنگیں لڑنے پر ان کا اتفاق تھا۔ بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے بچے اور خواتین قیدی بنائے۔ ان ہی میں سے ایک لوہڑی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی جس سے آپ کا مشہور نیکو کار بیٹا حضرت محمد بن حنفیہ پیدا ہوا۔

جہاد سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فرار؟

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ”بدر کے موقع پر جھوٹے بڑے میں آپ ﷺ کے ساتھ ہونے میں کوئی فضیلت نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مونس و غمخوار سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اگر آپ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جنگ لڑنے کا حکم دیں گے تو اس سے فساد پیدا ہوگا؛ اس لیے کہ آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات میں بھاگ چکے تھے۔ پس یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد فی سبیل اللہ کرے۔“ [اپنی کلام رافضی]

[جواب]: اس رافضی کا بیان کھلا ہوا جھوٹ اور کئی وجوہات کی بنا پر محض باطل ہے:

پہلی وجہ: شیعہ مصنف کا یہ بیان: ”ابو بکر رضی اللہ عنہ متعدد مرتبہ غزوات سے بھاگ گئے تھے۔“

ہم کہتے ہیں: رافضی کا یہ دعویٰ محض کذب، دروغ اور فریب دہی پر مبنی ہے۔ اور ایسی بات وہی انسان کہہ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے غزوات و احوال سے سب سے بڑا جاہل ہو۔ رافضی کی جہالت کوئی اچھوتی چیز نہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کے احوال سے سب سے بڑے جاہل؛ جھوٹ کی تصدیق کرنے والے اور حق بات کی تکذیب کرنے والے رافضی ہی تو ہوتے ہیں۔

غزوہ بدر اسلام کا سب سے پہلا معرکہ ہے؛ اس سے پہلے کفار کے ساتھ نبی کریم ﷺ یا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ جن غزوات میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا؛ ان کی تعداد نو ہے: بدر، أحد، خندق، بنی مصطلق، غزوہ ذی قرد، خیبر، فتح مکہ، جنین اور طائف۔ جب کہ وہ غزوات جن میں قتال کی نوبت نہیں آئی ان کی تعداد پندرہ بنتی ہے۔ جب کہ سرایا میں سے بعض ایسے تھے جن میں قتال ہوا اور بعض میں کوئی قتال نہیں ہوا۔

بہر حال جو بھی ہو؛ غزوہ بدر پہلا معرکہ تھا جس میں قتال کی نوبت پیش آئی؛ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ یہ ایسا عام

علمی پہلو ہے جسے رسول اللہ ﷺ کے احوال سے باخبر ہر انسان: محدث و مفسر، سیرت نگار و فقیہ؛ مغازی نگار و مؤرخ ہر ایک جانتا ہے کہ غزوہ بدر وہ پھلا معرکہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا۔ اس سے پہلے قتال کی نوبت پیش نہیں آئی۔ اس سے پہلے کسی غزوہ یا سریہ میں قتال کی نوبت نہیں آئی؛ سوائے ابن حضری کے قصہ کے۔ اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شریک نہیں تھے۔ تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ: آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات سے بھاگ چکے تھے؟

❖ دوسری وجہ: یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی لڑائی سے نہیں بھاگے تھے۔ غزوہ احد میں بھی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں تھے جو ثابت قدم رہے تھے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جو لغزش ہوئی تھی؛ اسے اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ [یہ بات بدلیل نص بیان کی جا چکی ہے]۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ آپ پسپا ہونے والوں کے ساتھ پسپا ہو گئے تھے۔ بلکہ آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو غزوہ حنین میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے تھے۔ سیرت نگار حضرات نے ایسے ہی بیان کیا ہے۔ لیکن کذاہین نے یہ جھوٹ گھڑ لیا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے غزوہ حنین کے موقع پر پرچم اسلام لیا تھا؛ مگر پھر ان کے ہاتھوں پر فتح نہ ہوئی؛ اس لیے کہ حضرات واپس آ گئے۔ اور بعض نے اس میں اس جھوٹ کا بھی اضافہ کر دیا ہے کہ اس موقع پر یہ دونوں حضرات بھی پسپا ہونے والوں کے ساتھ پسپا ہو گئے تھے۔ یہ تمام باتیں من گھڑت جھوٹ ہیں۔

اس سے قبل کہ انسان اس رافضی کے دعویٰ کا جھوٹ ہونا جان لے، یہ جاننا چاہیے کہ جس نے ان حضرات کے خلاف اس قسم کا دعویٰ کیا ہے وہ اس کا مدعی ہے، اسے چاہیے صحیح اور سچی روایات کی روشنی میں اپنا دعویٰ ثابت کرے۔ مگر رافضی اس کی راہ ہرگز نہیں پائے گا۔ کوئی ایک بھی ایسی صحیح اور سچی روایت ثابت کر دیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی ایک غزوہ میں بھی بھاگے تھے؛ کئی ایک غزوات میں بھاگنا تو بہت دور کی بات ہے۔

❖ تیسری وجہ: اگر واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بزدل ہوتے تو نبی کریم ﷺ غزوہ بدر کے ساتہان میں باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑ کر آپ کو خصوصی شرف رفاقت سے مشرف نہ کرتے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو معرکوں میں لیکر جانا ہی جائز نہیں۔ اس لیے کہ امام کے لیے جائز نہیں کہ وہ معرکہ میں ایسے لوگوں کو ساتھ لیکر جائے جو رسوائی کا سبب بننے والے یا پھر جھوٹی خبریں اڑانے والے ہوں۔ چہ جائے کہ انہیں باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر تقدیم بخشی جائے اور اپنے ساتھ ساتہان میں بطور خاص رکھا جائے۔ ❶

❶ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر رافضی مصنف یہ کہتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بزدل تھے، اور لڑائیوں سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مفلس و قلاش تھے۔ وہ درزی تھے، ان کی پشت پناہی کے لیے کوئی قبیلہ نہ تھا۔ ان کا خاندان بنی عبد مناف اور بنو مخزوم کی طرح معزز نہ تھا یا یہ کہ ان کے خدم و حشم نہ تھے۔“ ہم پوچھتے ہیں کہ سابقین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم نے کس کے سامنے گردن تسلیم کر لی اور اسے خلیفہ رسول کہہ کر پکارا؟ آخر نص شرعی کے سوا کون سی چیز ان کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ سب امت میں افضل نہ ہوتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یوں نہ فرماتے: ”اللہ کی قسم! جس قوم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا شخص موجود ہو، مجھے اس کا امیر مقرر کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے تہ تیغ کر دیا جائے۔“ [صحیح بخاری]۔

چوتھی وجہ: بخاری و مسلم میں ثابت شدہ صحیح روایات اس بہتان رافضی کے کذب کو واضح کرتی ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان و یقین اور ثبات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس، حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے دن مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تین سو سترہ تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ فرما کر اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور اپنے رب سے پکار پکار کر دعا مانگنا شروع کر دی: ”اے اللہ! میرے لئے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا فرمایا۔ اے اللہ! اپنے وعدہ کے مطابق عطا فرما۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگی تو زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اپنے رب سے ہاتھ دراز کئے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک آپ کے شانہ سے گر پڑی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کو اٹھایا اور اسے آپ کے کندھے پر ڈالا پھر آپ ﷺ کے پیچھے سے آپ سے لپٹ گئے اور عرض کیا: ”اے اللہ کے نبی آپ کی اپنے رب سے دعا کافی ہو چکی عنقریب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرے گا۔“ تب اللہ رب العزت نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَبَ لَكُمْ﴾ [الأنفال 9]

”جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کی۔“ [اور پوری حدیث بیان کی]

پانچویں وجہ: یہ کہا جائے گا: جو انسان بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ آپ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے مضبوط دل کے مالک تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کے قریب بھی نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مبعوث فرمایا اس وقت سے لے کر دم وفات تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ثابت قدم بہادر مجاہد اور پیش پیش رہے۔ کبھی بھی آپ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دشمن کے مقابلہ میں آپ نے کوئی بزدلی یا کمزوری دکھائی ہو۔ بلکہ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو اس وقت اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل کمزور ہو گئے تھے۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے جو لوگوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین فرما رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم لومڑی کی طرح بزدل ہو گئے تھے آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔“

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا تھا: ”اے نائب رسول اللہ! لوگوں پر رحم کیجیے۔“ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی دائرگی پکڑ لی اور کہا: اے ابن خطاب! جاہلیت میں تو بڑے سخت اور اسلام میں یہ خواری دکھا رہے ہو۔ اور میں ”کس بات پر رحم کروں آیا کسی جھوٹی بات پر یا کسی خود ساختہ شعر پر۔“

چھٹی وجہ: رافضی کا یہ کہنا کہ: ”کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد

فی سبیل اللہ کرے۔“

تو اس کا جواب یہ ہے: بلکہ اس حال میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور رہنا افضل ترین جہاد ہے۔ اس لیے کہ دشمن کا اصل ہدف آپ ﷺ کی ذات گرامی تھی۔ لشکر کا ایک تہائی حصہ رسول اللہ ﷺ کے گرد آپ کی حفاظت پر مامور تھا۔ اور ایک تہائی حصہ بھاگنے والے دشمنان کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور ایک تہائی حصہ کے لوگ مال غنیمت جمع کر رہے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ اموال ان تمام لوگوں کے مابین تقسیم کئے گئے۔

ساتویں وجہ: رافضی مصنف کا یہ دعویٰ کہ: ”اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مؤنس و غنخور سے بے نیاز کر دیا تھا۔“

اس کا جواب یہ ہے: کہنے والے کا یہ کہنا: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سائبان میں آپ کے مؤنس و غنخور تھے“ یہ قرآن و حدیث کا کلام نہیں ہے۔ اور جس نے یہ کہا ہے وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اس لحاظ سے مؤنس نہیں تھے کہ آپ کو کوئی وحشت نہ ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قتل میں آپ کے معاون تھے۔ جیسا کہ آپ سے فردوز مرتبہ کے لوگ بھی جہاد میں آپ کی مدد کر رہے تھے۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِصَبْرٍ وَإِلْمٍ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الأنفال ۶۲]

”اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان تمام اہل ایمان میں سے افضل تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [النساء ۸۴]

”اللہ کی راہ میں جہاد کیجئے۔ آپ پر صرف اپنی ہی ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کو جہاد کی رغبت دلائیے۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جہاد اور اپنی مدد کی ترغیب تمام امکانات کی انتہاء تک پہنچی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیں تاکہ ان کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑنا ممکن ہو۔ اور ان کی دعائے افعال سے اور دیگر جس طرح بھی ممکن ہو سکے دشمن کے خلاف ان سے مدد حاصل کی جائے۔

آٹھویں وجہ: یہ بات کہی جائے گی کہ: تمام اہل عقل کے ہاں یہ بات معلوم ہے کہ جنگ میں اصل مطلوب سربراہ ہوتا ہے جو کہ دشمن کو قتل کرنا اور ان سے لڑنا چاہتا ہے۔ جب یہ قائد سائبان میں: یا قبا میں یہ کسی بھی پناہ کی جگہ پڑاؤ والے اور اپنے ساتھ تمام ساتھیوں میں سے صرف فرد واحد کو ہی اختیار کرے اور باقی تمام لوگ اس سائبان سے باہر ہوں۔ تو یہ انسان تمام لوگوں میں سے خاص الخاص ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کی دوستی سب سے گہری دوستی اور اس سے حاصل ہونے والا فائدہ بہت بڑا ہو سکتا۔ جہاد میں یہ نفع اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے ساتھ قوت قلب اور ثابت قدمی بھی ہو۔ کمزوری اور پسپائی کے ساتھ یہ ممکن نہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان تمام لوگوں میں سب سے بڑے مؤمن و مجاہد تھے۔ تمام مخلوق

میں افضل ترین لوگ اہل ایمان اور اہل جہاد ہوتے ہیں۔ پس جو اس میدان میں افضل ہو تو اس کی فضیلت مطلق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَجْعَلْنَاهُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ﴾ آگے تک ﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ [التوبة ۱۹-۲۰]

”کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر بنا دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے؟ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہو سکتے۔ اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔“

ان اہل جہاد کا مقام و مرتبہ اللہ کے ہاں اہل حج و صدقہ و خیرات سے بڑھ کر تھا۔ اور ان میں سب سے اکمل و کامل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جہاد ہاتھ کا جہاد تھا؛ اس میں وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ شریک تھے جو بدر کے دن جہاد میں مصروف تھے۔ اور یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بدر یا احد کے موقع پر یا دیگر کسی موقع پر باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت زیادہ لڑائی لڑی ہو۔

پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ان کے ساتھ خاص ہے اس میں کوئی دوسرا آپ کا سہم و شریک نہیں؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل آپ کے اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین مشترک ہیں۔

❦ نوویس وجہ: بلاشبہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سائبان سے باہر نکلے اور مٹھی بھر کر مٹی پھینکی جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ [الأنفال ۱۷]

”اور جب آپ نے مٹھی پھینکی تھی تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔“

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے قتال کیا تھا؛ یہاں تک کہ آپ کے بیٹے عبدالرحمن نے کہا: میں نے آپ کو بدر کے دن دیکھا تھا؛ مگر میں آپ سے منہ موڑ کر چلا گیا۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”لیکن اگر میں تمہیں دیکھ لیتا تو ضرور قتل کر دیتا۔“ ❦

فصل:

[احوال ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جھوٹا دعویٰ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

❦ اور یہ جھوٹ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے، اس لیے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ مال دار نہ تھے۔ آپ کا باپ

❶ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ عزم و ثبات و قوت ایمان و ایقان کا زندہ پیکر تھے، نیز یہ کہ نبی کریم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ اصحاب بدر میں سب سے افضل تھے، حالانکہ دونوں نے لڑائی میں عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والا نہ لڑنے والے سے افضل ہو۔ [آغا دلدار]

انتہائی درجہ کا فقیر انسان تھا جو کہ ہر دن چند ٹکڑوں کے عوض عبد اللہ بن جدعان کے دسترخوان پر منادی کیا کرتا تھا۔ اگر ابو بکر واقعی مال دار ہوتا تو وہ اپنے باپ کی ضرورت پوری کرتا۔

✽ اور یہ کہ ”ابو بکر رضی اللہ عنہ“ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد روزی کا کام کیا کرتے تھے۔ جب آپ مسلمانوں کے ولی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو روزی کا کام کرنے سے روک دیا۔ تو آپ کہنے لگے: مجھے تو اپنی روزی کے لیے ضرورت ہے۔ تو اس پر آپ کے لیے بیت المال سے یومیہ تین درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔ [یعنی کام رافضی]

[جواب:] ہم کہتے ہیں کہ: کسی انسان کا قطعی و متواتر روایات جو کہ خاص و عام کے درمیان مشہور ہوں؛ اور ان سے کتابیں جیسے: کتب صحاح، مسانید، تفاسیر، فقہ اور فضائل و سیرت کی کتب بھری پڑی ہوں؛ کا انکار کرنا ایک عظیم مصیبت ہے۔ اور پھر ایسی روایات کا دعویٰ کیا جائے جن کا علم محض رافضی دعویٰ کی بنیاد پر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اسے کسی معروف سند سے نقل کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اسے کسی معروف اور ثقہ کتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اسے یہ سمجھ آرہی ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ انسان مخلوق میں سے کسی جاہل ترین انسان سے بھی مناظرہ کرے تو اس کے لیے یہ کہنا بہت آسانی سے ممکن ہوگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ [ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں کہ] آخر کس ثقہ یا ضعیف راوی نے کہا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مفلس آدمی تھے؟

پھر اس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنا مال خرچ کرنے کے قصے تو اتر کے صحیح احادیث میں کئی کئی اسناد سے منقول ہیں حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مجھے کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا فائدہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال سے۔“ [سبق تخریجہ]

اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

”ہم پر اپنی جان و مال سے لوگوں میں سب سے زیادہ احسان کرنے والے حضرت ابو بکر ہیں۔“ [سبق تخریجہ]

صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ اسی مال سے آپ نے حضرت بلال؛ عامر بن فہیرہ اور دیگر سات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خرید کر آزاد کیا۔

✽ رافضی کا یہ قول کہ: آپ کا باپ ہر دن چند ٹکڑوں کے عوض عبد اللہ بن جدعان کے دسترخوان پر منادی کیا کرتا تھا“

[جواب:] رافضی نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی جس سے اس کی صحت کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اور اگر ایسا ثابت

بھی ہو جائے تو اس میں کوئی ضرر والی بات نہیں۔ اس لیے کہ ایسا کیا جانا جاہلیت میں تھا اسلام میں نہیں۔ اس لیے کہ ابن جدعان کا انتقال اسلام سے پہلے ہوا ہے۔ جب کہ عہد اسلام میں ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے پاس اتنا مال تھا جو ان کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ یہ بات ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے دست نگر رہتے ہوں۔ اور حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے لمبی زندگی پائی؛ یہاں تک کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو آپ کو ان کی میراث میں سے چھٹا حصہ ملا۔ جو کہ آپ نے اولاد ابو بکر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا، اس لیے کہ آپ کے پاس بقدر کفایت مال ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات

معلوم شدہ ہے کہ اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ضرور آپ کی مدد کرتے۔
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دور کی قربت کی وجہ سے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ مسطح بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے واقعہ انک میں کلام کیا تھا۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھائی کہ وہ آئندہ ان کی مالی امداد نہ کریں گے۔ سو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولَى الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيُغْفِرُوا أَلَا يُحِبُّونَ أَنْ يُغْفَرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (النور: ۲۲)

”تم میں سے فارغ البال اشخاص اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ وہ اپنے اقارب اور مساکین [مہاجرین پر خرچ نہیں کریں گے۔ چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے] اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔“

یہ سن کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمائے، چنانچہ پھر مسطح کی مالی امداد شروع کر دی۔“^①

سات اشخاص جو غلام تھے، اسلام کے جرم میں ان کو بیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔^②
نبی کریم ﷺ نے جب ہجرت کی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جتنا مال تھا سب ساتھ لے لیا۔^③
حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ آئے اور پوچھنے لگے: ابو بکر خود تو چلا گیا، کیا اس نے اپنا مال تمہارے لیے چھوڑا ہے یا اسے بھی ساتھ لے گیا؟

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے کہا: نہیں آپ مال چھوڑ گئے ہیں۔ اور میں نے ایک کونے میں کوئی چیز رکھ کر ان سے کہا: ان کا مال یہ پڑا ہوا ہے۔“ تاکہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے کہ آپ اپنے عیال کے لیے کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ یہ تمام باتیں دلالت کرتی ہیں کہ آپ مالدار انسان تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ معلمی؟

❁ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ”حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے۔“
❁ [صاف جھوٹ ہے]۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا بھی تو اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ علم و معرفت رکھنے والے انسان تھے۔ مسلمان علماء کرام و صلح کی جماعت تھی جو لوگوں کو آداب سیکھایا کرتے تھے۔ ان میں: ابوصالح، جوکلی کے ساتھی تھے؛ بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

① صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک (حدیث: ۴۱۴۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافک (حدیث: ۲۷۷۰)۔

② مستدرک حاکم (۲/۲۸۴)، سیرۃ ابن ہشام (ص: ۱۴۷)۔

③ سیرۃ ابن ہشام (ص: ۲۲۵)۔ ایک قول کے مطابق آپ کے پاس اس وقت چھ ہزار درہم تھے۔ آپ اس مال سے تجارت کیا کرتے تھے۔

اور ابو عبد الرحمن السلمي ان کا شارح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خواص میں سے ہوتا ہے۔ امام سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ضحاک بن مزاحم اور عبد اللہ بن الحارث بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مگر اس پر کوئی اجرت نہیں لیتے تھے۔“ ان ہی لوگوں میں سے ایک حضرت قیس بن سعد بھی تھے۔ اور عطاء بن ابی رباح؛ عبد الکریم ابو امیہ؛ حسین المعلم ابو ذکوان؛ قاسم بن عمیر ہمدانی؛ حبیب المعلم مولیٰ معقل بن یسار بھی تھے۔ نیز حضرت علقمہ بن ابی علقمہ؛ ان سے حضرت مالک بن انس بھی روایت کرتے ہیں؛ آپ کا ایک مکتب تھا جہاں پر لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان میں سے ابو عبیدہ القاسم بن سلام بھی ہیں۔ جن کی فضیلت و امامت پر اجماع ہے۔

تو پھر جب یہ بات ہی خود ساختہ جھوٹ ہے تو ہم اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں۔ [ابوبکر رضی اللہ عنہ اگر پیشہ در معلم ہوتے تو قریش کے بہت سے لوگ لکھ پڑھ ہوتے۔ حالانکہ لکھنے والوں کی قریش میں بڑی قلت تھی]۔

بلکہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام سے قبل نچلے درجہ کے لوگوں میں سے بھی ہوتے تو پھر بھی یہ بات آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ حضرت سعد، عبد اللہ بن مسعود، صہیب، بلال رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ دیگر کمزور لوگ بھی تھے جن کے متعلق قریش نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں اپنی مجلس سے نکال دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا۔ فرمان الہی ہے:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوَةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾..... آگے تک..... ﴿الْيَسَّ اللَّهُ بِالْعُلَمَاءِ بِالشَّكِرِينَ﴾ [الانعام ۵۲-۵۳]

”اور ان لوگوں کو نہ نکالے جو صبح شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، خاص اس کی رضا مندی کا قصد رکھتے ہیں۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور آپ کا حساب ذرا بھی ان کے متعلق نہیں..... کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو خوب جانتا ہے۔“

لیکن رافضیوں کا کلام عہد جاہلیت کے مشرکین کے کلام کی جنس سے ہوتا ہے۔ یہ اپنے باپ دادا اور نسب کی وجہ سے تعصب برتتے ہیں دین کی وجہ سے نہیں۔ اور انسان پر کسی ایسی وجہ سے عیب لگاتے ہیں جس سے اس کے ایمان و تقویٰ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ تمام جاہلیت کے افعال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روافض پر جاہلیت غالب ہوتی ہے۔ اور خود کوئی ایک ان وجوہات کی بنا پر کفار سے مشابہت رکھتے ہیں؛ جن میں انہوں نے اہل ایمان و اسلام کی مخالفت کی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ سلائی؟

[اعتراف]: رافضی کا یہ کہنا ہے کہ: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد درزی کا کام کیا کرتے تھے۔ جب آپ مسلمانوں کے ولی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو درزی کا کام کرنے سے روک دیا۔“ [بھی کام رافضی]

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ درزی تھے۔ اس دعویٰ کا جھوٹ ہونا ہر معرفت رکھنے والے انسان پر عیان ہے۔ اور اگر حقیقت میں ایسا ہوتا بھی تو اس میں کوئی عیب والی بات نہیں تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تاجر تھے درزی نہ تھے۔ آپ کبھی اپنا مال تجارت لیکر خود سفر کرتے اور کبھی خود نہ بھی جاتے۔ آپ نے عہد اسلام میں تجارت کی غرض سے شام

کا سفر کیا۔ تجارت قریش کے ہاں افضل ترین ذریعہ آمدن تھا۔ ان کے مالداروں میں سے بہترین لوگ تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ اور عرب انہیں تاجروں کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اس وقت بھی تجارتی مشاغل جاری رکھنا چاہتے تھے، مگر مسلمانوں نے اس سے روک دیا؛ اور عرض گزار ہوئے کہ: یہ کام آپ کو مسلمانوں کی مصلحت کے کاموں سے روک دے گا۔“

درزی کا یہ پیشہ قریش میں بڑا کم یاب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش عام طور سے تہ بند باندھتے اور اوپر چادر اوڑھ لیا کرتے تھے۔ [اس لیے کپڑے سینے کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوا کرتی تھی]۔

مدینہ طیبہ میں ایک درزی ہوا کرتا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھر پر بھی بلایا تھا۔^①

جب کہ مہاجرین میں سے کسی ایک کے متعلق ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ وہ درزی کا کام کرتا ہو۔ حالانکہ درزی کا پیشہ بڑا ہی اچھا اور باعزت پیشہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی راہ میں خرچ کرنا تو اتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اسے ہر خاص و عام جانتا ہے۔ اسلام سے قبل آپ بڑے مال دار تھے۔ قریش آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے آپ کی تعظیم کرتے اور آپ سے محبت کرتے تھے۔ آپ کو عربوں کے نسب اور ان کی لڑائیوں کے بارے میں بہت علم حاصل تھا۔ لوگ آپ کے علم و احسان اور تجارتی مقاصد کی وجہ سے آپ کے پاس آتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ مکہ سے نکلے تو ابن دغنے نے کہا: ”آپ جیسا آدمی نہ نکل سکتا اور نہ نکالا جاسکتا ہے۔“

اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قریش یا کسی دوسرے نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کسی قسم کا کوئی عیب لگایا ہو۔ نہ ہی کسی نے آپ میں کوئی نقص نکالا اور نہ ہی آپ کو حقیر سمجھا؛ جیسا کہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ رہتا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے علاوہ کوئی قابل عیب بات نہیں تھی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق قریش کے ہاں کسی قسم کی کوئی عیب یا نقص والی بات یا مذموم چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ بلکہ آپ خاندان اور گھربار کے لحاظ سے قابل صد تکریم و تعظیم تھے۔ آپ کے مکارم اخلاق صدق و وفاء اور امانت داری مشہور تھی۔ ایسے ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے ہاں کوئی عیب والی بات نہیں تھی۔

ابن دغنے علاقہ کا سردار اور اپنے قبیلہ کا رئیس تھا۔ اسے قریش میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا؛ اس کی عزت و احترام کی وجہ قریش اس کو پناہ دیدیتے تھے جس کو یہ پناہ دیدیتا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ:

”جب قریش مکہ نے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکلے

① حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مدینہ میں ایک درزی تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی۔ میں بھی رسول اللہ ﷺ کیساتھ چلا گیا۔ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ پیٹ سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے تھے۔ تو اس وقت سے مجھے کدو سے محبت ہو گئی۔

[صحیح بخاری، کتاب الاطعمہ باب من تتبع حوالی القصصہ۔ و کتاب البیوع، باب ذکر الخیاط۔ نیز دیکھیں صحیح مسلم،

جب برک غماد پہنچے تو ان سے علاقہ کے سردار ابن دغنه کی ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا: ابو بکر رضی اللہ عنہ! کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ: ”مجھ کو میری قوم نے نکال دیا ہے؛ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ زمین کی سیر کروں اور اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔“

ابن دغنه نے کہا کہ: ”تم جیسا آدمی نہ تو نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ تم فقراء کے لئے کماتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو اور عاجز و مجبور کا بوجھ اٹھاتے، مہمان کی ضیافت کرتے ہو اور حق (پر قائم رہنے) کی وجہ سے آنے والی مصیبت پر مدد کرتے ہو؛ میں تمہیں پناہ دیتا ہوں تم لوٹ چلو؛ اور اپنے ملک میں اپنے رب کی عبادت کرو۔“

چنانچہ ابن دغنه روانہ ہوا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر واپس ہوا؛ اور کفار قریش کے سرداروں میں گھوما اور ان سے کہا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی نہ تو نکل سکتا ہے نہ نکالا جاسکتا ہے جو تنگدستوں کے لئے کماتا ہے صلہ رحمی کرتا ہے، عاجزوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ راہ حق میں پیش آنے والی مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ چنانچہ قریش نے ابن دغنه کی پناہ منظور کر لی۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امان دے کر ابن دغنه سے کہا: ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کہہ دو کہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر میں کریں، نماز پڑھیں، لیکن ہمیں تکلیف نہ دیں اور نہ اس کا اعلان کریں، اس لئے کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہمارے بچے اور عورتیں فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔“

ابن دغنه نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ دیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کرنے لگے اور نہ تو نماز اعلانیہ پڑھتے اور نہ قرأت اعلانیہ کرتے۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا، تو انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنالی اور باہر نکل کر وہاں نماز اور قرآن پڑھنے لگے، تو مشرکین کی عورتیں اور بچے ان کے پاس جمع ہو جاتے، ان لوگوں کو اچھا معلوم ہوتا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے رہتے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسے آدمی تھے کہ بہت روتے اور جب قرآن پڑھتے تو انہیں آنسوؤں پر اختیار نہیں رہتا تھا۔ مشرکین قریش کے سردار گھبرائے اور ابن دغنه کو بلا بھیجا وہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے ابن دغنه سے کہا کہ ہم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے گھر میں اپنے پروردگار کی عبادت کریں، لیکن انہوں نے اس سے تجاوز کیا اور اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنالی۔ اعلانیہ نماز اور قرآن پڑھنے لگے اور ہمیں خطرہ ہے کہ ہمارے بچے اور ہماری عورتیں گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان کے پاس جا کر کہو کہ اگر وہ اپنے گھر کے اندر اپنے رب کی عبادت پر اکتفا کرتے ہیں تو کریں اور اگر اس کو اعلانیہ کرنے سے انکار کریں تو ان سے کہو کہ تمہارا ذمہ واپس کر دیں، اس لئے کہ ہمیں پسند نہیں کہ ہم تمہاری امان کو توڑیں اور نہ ہم ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اعلانیہ عبادت کرنے پر قائم رہنے دے سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ابن دغنه ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا ذمہ ایک شرط پر لیا تھا، یا تو اسی پر اکتفا کرو یا میرا ذمہ مجھے واپس کر دو، اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ عرب اس بات کو سنیں کہ میں نے ایک شخص کو اپنے ذمہ میں لیا تھا، اور میرا ذمہ توڑا گیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں تیرا ذمہ تجھے واپس دیتا ہوں اور اللہ کی پناہ پر راضی ہوں۔“

اس روایت میں ابن دغنه قبائل قریش کے سرداروں کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وہ اوصاف بیان کرتے ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے اوصاف اس وقت بیان کئے تھے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: ”مجھے اپنی جان کا خوف محسوس ہونے لگا۔“ تو آپ فرمانے لگیں:

”اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو پریشان نہیں کرے گا؛ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں؛ کمزور کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ مہمان کی میزبانی کرتے ہیں؛ بے آسرا کا سہارا بنتے ہیں۔ اور حق کے کاموں پر مدد کرتے ہیں۔“

یہ صفات اس نبی کی صفات ہیں جو افضل الانبیاء ہیں اور اس صدیق کی صفات ہیں جو افضل صدیقین ہے۔

فصل:

[ابوبکر رضی اللہ عنہ پر عدم انفاق کا الزام]

❦ رافضی کا کہنا ہے کہ: ”رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال کی وجہ سے غنی تھے۔ اس وقت جنگ یا لشکر کی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔“

[جواب]: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ پر ایسے نہیں خرچ کرتے تھے کہ آپ کو کھانے پینے کے لیے یا کپڑا پہننے کے لیے دیتے ہوں۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے اپنی نبی کریم ﷺ کو تمام مخلوق کے مال سے بے نیاز و غنی رکھا ہوا تھا۔ بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ امداد اور تعاون دین و ایمان کے قائم کرنے کے سلسلہ میں تھا۔ آپ اپنا مال ان امور میں خرچ کیا کرتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول کے پسندیدہ تھے۔ نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات پر خرچہ کرتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کی پاداش میں عذاب دیا جاتا تھا جیسے: حضرت بلال؛ عامر بن فہیرہ؛ زبیرہ؛ اور ان کے علاوہ ایک جماعت کو خرید کر آزاد کیا۔ رضی اللہ عنہم۔

فصل:

[ابوبکر رضی اللہ عنہ کا افلاس؟]

❦ رافضی کا کہنا ہے کہ: ”اور ہجرت کے بعد تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بالکل کچھ بھی نہیں تھا۔“

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ بلکہ جب رسول اللہ ﷺ جہاد کے لیے صدقہ کرنے کی ترغیب دی تو آپ اپنے گھر کا سارا مال لیکر آ گئے۔ ایسے ہی اصحابہ صفہ فقراء لوگ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی تو آپ اپنے ساتھ تین صحابہ کو لیکر چلے گئے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر، روایت کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ غریب لوگ تھے اور نبی ﷺ نے فرمادیا تھا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اس میں سے لے جائے اور اگر چار کا ہو تو پانچواں یا چھٹا ان میں سے لے جائے ابوبکر تین آدمی لے گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس لے گئے۔“

[صحیح بخاری: جلد ۱: ح: ۵۷۵]

حضرت زید بن اسلم، اپنے والد سے وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: ”ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔ اتفاق سے ان دنوں میرے پاس مال بھی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گیا تو لے گیا۔ چنانچہ میں اپنا آدھا مال لے کر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا اتنا ہی جتنا ساتھ لایا ہوں۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو سب کچھ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”اس پر میں نے کہا میں کبھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔“ [جامع ترمذی: ج ۲: ح ۱۶۴۱۔ یہ حدیث صحیح ہے۔]

فصل:

[صدقات ابوبکر رضی اللہ عنہ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: ”اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوتے تو ان کے بارے میں اسی طرح قرآن نازل ہوتا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیت ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ اتری تھی۔ [جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ: جس حدیث میں مذکورہ آیت: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہونے کا ذکر ہے؛ اس کے موضوع [من گھڑت] ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس کا تذکرہ وہی مفسرین کرتے ہیں جن کی عادت ہے کہ وہ موضوع روایات کو بھی [بغیر کسی تحقیق و بیان] کے جمع کر دیتے ہیں۔ اس کے جھوٹ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ کی سورہ ہونے پر لوگوں کا اتفاق ہے؛ جو کہ ہجرت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس وقت ابھی تک حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس مسئلہ پر ہم کئی ایک مقامات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی خصوصی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتفاق نے سبیل اللہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس وقت میں آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا۔ بلکہ ہجرت سے پہلے آپ کا شمار بھی عیال نبوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور ہجرت کے بعد کبھی کبھار آپ مزدوری بھی کیا کرتے تھے۔ ایک کھجول کے بدلے ایک ڈول پانی نکالا کرتے تھے۔ جب آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو آپ کے پاس مہر دینے کے لیے سوائے ایک درع کے کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ نے اپنی شادی پر وہ مال خرچ کیا جو آپ کو غزوہ بدر میں مال غنیمت سے آپ کو ملا تھا۔ صحیحین میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ فرماتے ہیں:

”مجھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر کے دن غنیمت میں ایک اونٹنی ملی، اور مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک اونٹنی اور دی۔ جب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا چاہی تو نبی قیقاق کے ایک سار کے ساتھ وعدہ طے کیا کہ وہ میرے ساتھ چلے گا؛ تاکہ ہم اذخر لا کر سناروں پر بیچیں گے اور اس پیسہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ولیمہ کی دعوت میں مدد لوں گا۔ جب میں اپنی اونٹیوں کے لیے ساز و سامان تیار کر رہا تھا اور ان دونوں اونٹیوں کو میں نے ایک انصاری کے

دروازے پر بٹھایا تھا۔ اور فرمایا: حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اسی گھر میں شراب پی رہے تھے ان کیساتھ ایک گانے والی تھی جو گارہی تھی ”أَلَا يَا حَمَزُ لِلشَّرَفِ النِّوَاءُ“ اے حمزہ! آگاہ ہو: دو فریادیں اٹھیں گی۔ حمزہ ان دونوں اونٹنیوں کی طرف تلواریں لے کر چھپ پڑے ان کی کوہان کاٹ ڈالے اور کولہے کاٹ دیئے۔۔۔۔۔۔“ پھر پوری حدیث بیان کی۔ یہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ [صحیح بخاری: ج ۲۲۳۷]

جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف ہے، ہر وہ آیت جو اتفاق فی سبیل کرنے والوں کی مدح میں نازل ہوئی ہے تو اس امت میں اس آیت کے سب سے پہلے مقصود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلٌ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتِلُوا﴾ [الحديد: ۱۰]

”تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجْهَهُدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ﴾۔ ”جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کیساتھ جہاد کیا۔“ [التوبة: ۲۰]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقِيُّ﴾ الَّذِي يُوْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿[الليل: ۱۸]

”اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔“

مشہور مفسرین جیسے ابن جریر الطبری، عبد الرحمن بن ابی حاتم، اور دوسروں نے اسناد کیساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر عروہ بن زبیر اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔ [طبری: ۳۰/۲۲۸]۔

فصل:

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کا جواب]

شیعہ کا یہ قول ہے کہ: ”نماز میں آپ کو امامت کے لیے آگے بڑھانے کی بات غلط ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اذان دیدی؛ تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنایا جائے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو کچھ راحت ہوئی تو آپ نے تکبیر کی آواز سنی۔ تو آپ نے پوچھا: لوگوں کو نماز کون پڑھا رہا ہے۔ کہنے لگے: ابوبکر۔ آپ نے فرمایا: ”مجھے باہر لے چلو۔“ حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہما کے درمیان چلتے ہوئے باہر نکلے۔“ آپ نے ابوبکر کو قبلہ سے ہٹا دیا۔ اور انہیں امامت سے معزول کر کے خود نماز پڑھانے لگے۔“ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب اول]: حد درجہ کی افتراء پر دازی پر مبنی ہے۔ تمام محدثین کے ہاں اس روایت کا جھوٹ ہونا معلوم ہے۔ [علاوہ ازیں یہ مکابرہ اور انکار متواتر کی بدترین قسم ہے]۔ ہم شیعہ مصنف سے اس کی صحت ثابت کرنے اور اس کی اسناد ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ روایت مرسل صرف روافض کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے جو کہ سب سے بڑے جھوٹے اور رسول

اللہ ﷺ کے احوال سے جاہل ترین لوگ ہیں۔ یہ واقعہ [ابن المطہر رافضی کے اساتذہ] مثلاً شیخ المفید و کراچکی اور ان کے نظائر و امثال نے بیان کیا ہے جن کی تصانیف جھوٹ کا پلندہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے احوال و اقوال اور اعمال کی معرفت سے سب سے بیگانے و بعید ہیں۔

جواب دوم: یہ ایسے جاہل انسان کا کلام ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت صرف ایک نماز سے تعلق رکھتی تھی [جس کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا جاسکے]۔ اہل علم اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبوی کریم ﷺ کی بیماری کے شروع سے [وفات تک نمازیں پڑھائی تھیں]۔ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق آپ کے حکم سے آپ کی نیابت میں لوگوں کو نمازیں پڑھا رہے تھے۔ اس بارے میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے بات بھی کی تھی۔ آپ نے کئی دن تک نمازیں پڑھائیں۔ اس سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ آپ کو نماز پڑھانے کے لیے اپنا نائب مقرر کر چکے تھے۔ جب آپ ﷺ بنی عمرو بن عوف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے گئے تھے تو حضرت ابوبکر کو ہی نماز پڑھانے کے لیے امام مقرر کیا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ سے کہیں بھی یہ منقول نہیں ہے کہ سفر کے علاوہ اپنی عدم موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو امامت سونپی ہو۔ ہاں غزوہ تبوک والے سال ایک بار قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور آپ کو دیر ہو گئی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے لوگوں کو فجر کی نماز پڑھا دی۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لائے تو آپ کے ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ایک رکعت نماز جماعت کے ساتھ پڑھی؛ اور ایک رکعت جو فوت ہو چکی تھی؛ اسے پورا کیا۔ نماز کے بارے میں لوگوں کا یہ اہتمام آپ کو بہت پسند آیا؛ اور آپ نے اسے برقرار رکھا۔ یہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر بھی آپ کا اقرار ہے۔^①

اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ سے باہر کا سفر کرتے تو مدینہ میں کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے جو لوگوں کو نمازیں پڑھاتا۔ تو کبھی آپ نے عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا تو کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو اپنا نائب بنایا۔

جب کہ مدینہ میں موجود ہوتے ہوئے اپنی عدم موجودگی میں اور بیماری کی حالت میں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی نماز پڑھانے پر مامور فرمایا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور کو نہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تو اتر سے ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی اجازت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے اثبات میں صحاح و سنن اور مسانید وغیرہ متعدد و نصوص موجود ہیں۔ امام بخاری و مسلم اور ابن خزیمہ و ابن حبان نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے:

((مرض النبی ﷺ فاشتد مرضه فقال: مروا أبا بكر فليصل بالناس -)) قالت عائشة: "يا رسول الله! أن أبا بكر رجل رقيق متى يقيم مقامك لا يستطيع أن يصل بالناس -"
قال: مري أبا بكر فليصل بالناس - فإنكن صواحب يوسف .))

① الحديث عن المغيرة بن شعبه رواه مسلم كتاب الصلاة باب تقديم الجماعة من يصلي بهم إذا تأخر الإمام. اس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: تم نے بہت اچھا کیا۔ یا یہ فرمایا کہ: تم نے حق کو پایا۔

”جب نبی ﷺ بیمار ہوئے اور آپ کا مرض بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا: ”ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھادیں۔“ حضرت عائشہ نے کہا: یا رسول اللہ! بیشک حضرت ابوبکر نرم دل آدمی ہیں جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہ پڑھا سکیں گے۔“ لیکن پھر بھی آپ نے فرمایا: ”ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھادیں“ اور تم تو وہ عورتیں معلوم ہوتی ہو جنہوں نے یوسف کو گھیر رکھا تھا۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے تین بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ ﷺ سے تکرار کا ذکر کیا ہے۔^①

اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی بیماری کا پورا عرصہ نمازیں پڑھاتے رہے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ وفات سے قبل رسول اللہ ﷺ کئی دن بیمار رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی ایک نے بھی نمازیں نہیں پڑھائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا حجرہ شریفہ مسجد کے پہلو میں تھا۔ جب احوال یہ ہیں تو پھر یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ اس عرصہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کے علاوہ کسی اور کو نمازیں پڑھانے کا حکم دیا ہو؛ یا کسی نے آپ سے اس بارے میں بات کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے گھر میں داخل ہوا کرتے تھے۔ اور ان دنوں میں سے کسی ایک دن میں ان کے ساتھ باہر نکلے بھی تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیماری کے ابتدائی دنوں میں جنمات کے دن کی بات ہے۔ اور آپ ﷺ کا انتقال بلا خلاف دوسرے ہفتہ میں پیر کے دن ہوا تھا۔ اس طرح آپ کی بیماری کے کل بارہ دن بنتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے مرض کے بارے میں نہیں بتائیں گی؟ فرمایا کیوں نہیں:

”نبی کریم ﷺ کو بیماری سے افاقہ ہوا تو فرمایا کیا لوگوں نے نماز ادا کر لی ہے؟ ہم نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ! وہ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لئے برتن میں پانی رکھ دو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ نے اس سے غسل فرمایا؛ پھر آپ چلنے لگے تو بے ہوشی طاری ہو گئی۔ پھر افاقہ ہوا تو فرمایا: کیا لوگوں نے نماز ادا کر لی ہے؟

ہم نے عرض کیا: نہیں؛ بلکہ یا رسول اللہ ﷺ وہ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد میں بیٹھے رسول اللہ ﷺ کا عشاء کی نماز کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تو اس نے جا کر کہا: رسول اللہ ﷺ آپ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اور ابوبکر نرم دل آدمی تھے اس لئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: ”آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”پھر ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دنوں میں نماز پڑھائی۔“

① صحیح بخاری: ج ۶، ۶۴۵۔ مسلم: کتاب الصلاة باب تقديم الجماعة من یصلی بہم إذا تأخر الإمام ۱/۳۱۷۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں کچھ کمی محسوس کی تو دو آدمیوں کے سہارے ظہر کی نماز کے لئے نکلے، ان میں ایک حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آتے دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے؛ تو نبی کریم ﷺ نے ان کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے نہ ہوں۔ اور آپ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: ”مجھے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بٹھا دو؛ تو آپ ﷺ کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر نبی ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کرتے رہے؛ اور لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کر رہے تھے؛ رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔

عبید اللہ نے کہا میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا: ”کیا میں آپ کی خدمت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نبی ﷺ کے مرض کے بارے میں حدیث پیش نہ کروں جو آپ نے مجھ سے بیان کی ہے؟ تو انہوں نے کہا: لے آؤ۔ تو میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان پر پیش کی؛ تو انہوں نے اس میں سے کسی چیز کا انکار نہیں کیا؛ سوائے اس کے کہ انہوں نے فرمایا: ”کیا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے تجھے عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو آدمی تھا اس کا نام بتایا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ”وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔“^①

یہ حدیث جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اتفاق ہے؛ اس میں یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ کی بیماری کے بارے میں خبر دے رہے ہیں؛ اور امامت نماز میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جانشین رسول اللہ ﷺ ہونے کو بیان کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کے باہر نکلنے سے کئی دن پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ اور جب آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لیے تو آپ کو حکم دیا کہ پیچھے نہ ہئیں؛ بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ آپ کے پہلو میں بیٹھ گئے؛ لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء۔ تمام علماء کرام کا اس حدیث کی صحت اور قبولیت پر اتفاق ہے۔ یہاں پر مقصود یہ بتانا ہے کہ نماز میں جانشینی کئی دن تک رہی۔ جیسا کہ اس روایت پر صحابہ کرام کا اتفاق ہے؛ اور یہ روایت صحاح ستہ کے مؤلفین نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اور صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے خادم اور صحابی تھے اسے روایت ہے:

((نبی ﷺ کے مرض وفات میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب دو شنبہ کا دن ہوا اور لوگ نماز میں صف بستہ تھے تو نبی ﷺ نے حجرہ کا پردہ اٹھایا اور ہم لوگوں کی طرف کھڑے ہو کر دیکھنے لگے اس وقت آپ کا چہرہ مبارک گویا مصحف کا صف تھا پھر آپ بشارت سے مسکرائے ہم لوگوں نے خوشی کی وجہ سے چاہا کہ نبی ﷺ کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ابو بکر اپنے پچھلے پیروں پیچھے ہٹ آئے تاکہ صف میں مل جائیں۔ وہ سمجھے کہ نبی ﷺ نماز کے لئے آنے والے ہیں لیکن آپ نے ہماری طرف اشارہ کیا کہ اپنی نماز پوری کر لو؛ اور آپ

① یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری میں مروی ہے۔ ۱۳۸/۱۔ کتاب الآذان، باب إنما جعل الإمام ليؤتم به مسلم ۱/۳۱۳۔ کتاب الصلاة، باب استخلاف الإمام إذا عرض له عذر، (صحیح مسلم: ج ۹۳)

نے حجرہ میں داخل ہو کر پردہ ڈال دیا اسی دن آپ نے وفات پائی (ﷺ)۔ [صحیح بخاری: ج ۶۴۷]
 اور بخاری شریف کی بعض روایات میں ہے: ”مسلمانوں نے خوشی کے باعث یہ قصد کیا کہ اپنی نمازوں کو توڑ دیں۔“ مگر آپ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ تم اپنی نمازوں کو پورا کرلو اور آپ نے پردہ ڈال دیا۔ یہ نماز فجر کا واقعہ ہے۔ [صحیح بخاری: ج ۷۲۰]۔
 صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نے آخری نظر رسول اللہ ﷺ کو پیر کے روز اس وقت دیکھا جب آپ نے پردہ ہٹایا۔“ [اس کی تخریج گزرجی ہے]۔

صحیحین میں حضرت انس سے روایت ہے کہ مرض وفات میں نبی ﷺ تین دن باہر نہیں نکلے۔ ایک دن نماز کی اقامت ہوئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھنے لگے اتنے میں نبی ﷺ نے پردہ کو پکڑا اور اس کو اٹھایا۔ پس نبی ﷺ کا چہرہ نظر آتے ہی ہمارے سامنے ایسا خوش کن منظر آگیا کہ اس سے زیادہ خوش کن منظر کبھی میسر نہ آیا تھا۔ پھر نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ابوبکر کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ جائیں اور نبی ﷺ نے پردہ گرا دیا پھر آپ کو قدرت نہ ہوئی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔“ [صحیح بخاری: ج ۶۴۸، مسلم، ج ۹۸]

اس روایت میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے تین روزہ وقفہ کے بعد دوسری بار حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لانے کی خبر دے رہے ہیں۔ ان تین دنوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ان لوگوں کو نمازیں پڑھاتے رہے۔ جیسا کہ پہلی بار حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ یعنی اس سے پہلے بھی کئی دن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ تمام روایات صحیح ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ آخری نماز تھی جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مسلمانوں نے ادا کی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے نماز کے دوران یا اس سے پہلے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

یہی رسول اللہ ﷺ کا پہلا حکم بھی تھا جس کا پیغام لیکر آپ کا قاصد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حکم نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی اپنے والد سے کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے۔ جیسا کہ یہ رافضی جھوٹے اپنی طرف سے افتراء پرداز کر رہے ہیں۔

ان جھوٹوں کا یہ کہنا کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے آگے بڑھائیں! ایک کھلا ہوا اور واضح ترین جھوٹ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کوئی حکم نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے کیا جائے۔ اور نہ ہی آپ حکم دیا کرتی تھیں اور نہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ سے احکامات وصول کیا کرتے تھے۔ بلکہ آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو نماز کے وقت کی اطلاع دی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے تمام حاضرین بشمول حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ یہ خطاب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ اور نہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ سے کوئی ایسی بات سنی تھی۔

رائضی کا یہ کہنا: ”جب آپ ﷺ کو ہوش آیا تو آپ نے بکیر سی‘ آپ نے پوچھا: ”نماز کون پڑھا رہا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ اس پر آپ نے فرمایا: ”مجھے باہر لے چلو۔“

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ وہ مشہور روایات جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے ان سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے باہر تشریف لانے سے کئی روز قبل بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ کے باہر تشریف لانے کے بعد بھی آپ ہی نمازیں پڑھاتے رہے۔ آپ کی بیماری کے دوران کسی ایک دوسرے نے کوئی نماز نہیں پڑھائی۔

پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: یہ تو اتر کے ساتھ معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کئی دن تک بیمار رہے؛ اور کئی دن تک آپ لوگوں کو نماز نہیں پڑھا سکے۔ تو پھر اس دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کون تھا جو لوگوں کو نمازیں پڑھاتا رہا؟ کسی بھی سچے یا جھوٹے نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے نے نمازیں پڑھائی ہیں، نہ ہی عمر نہ ہی علی اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ رضی اللہ عنہم۔ اور یہ لوگ باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے، پس معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔

یہ بات ممتنع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم نہ ہوا ہو۔ اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی ہو۔ بلکہ یہ بات عادتاً ممتنع ہے۔ تو پتہ چلا کہ آپ کی اجازت سے ہی لوگوں کو نماز پڑھائی جا رہی تھی۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں یہ بات ثابت ہے؛ اور یہ بھی ثابت ہے کہ اس بات پر آپ سے تکرار بھی کیا گیا تھا۔ اور کہا گیا: اگر آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو نماز پڑھانے کا حکم دیں؟ تو آپ نے اس تکرار کرنے والے کو ملامت کی۔ اور اس بات کو ایک برائی شمار کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استحقاق کا علم ہونے کے باوجود اس مسئلہ میں تکرار کیا جا رہا ہے۔ جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اس کا مستحق نہیں۔

امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ اور بشارت نبوت:

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

”اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں انھیں ایک تحریر لکھ دوں، مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی خواہش کنندہ اپنی خواہش کا اظہار کرے اور کہنے والا کہے کہ میں خلافت کے لیے موزوں تر ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے۔“ [البخاری ۷/۱۱۹؛ مسلم ۴/۱۸۵۷]

بخاری میں حضرت قاسم بن محمد سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”ہائے میرا سر۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تو اسی درد میں مبتلا رہ کر مرگئی تو میرے لئے دعائے مغفرت کروں گا اور دعا کروں گا۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ”افسوس! اللہ کی قسم! میرا تو خیال ہے کہ آپ میرا مرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے دوسرے ہی دن آپ اپنے دوسری بیویوں کے ساتھ رات گزاریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں بلکہ میں خود بھی درد میں مبتلا ہوں۔ اور میں نے چاہا کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلا بھیجوں اور ان کو

وصیت کروں تاکہ کوئی کہنے والا کچھ کہہ نہ سکے اور نہ کوئی آرزو کرنے والا اس کی آرزو کر سکے۔ پھر میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے کی خلافت کو ناپسند کرتا ہے اور مومن بھی اس کو نامنظور ہی کریں گے یا یہ فرمایا کہ: ”اللہ تعالیٰ دفع کرے گا اور مسلمان بھی پسند نہ کریں گے۔“ [صحیح بخاری: ج ۶۳۲]

یہ صحیح حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے ایک تحریر لکھوا دیں۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں ان سے زیادہ حق دار ہوں۔ پھر فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان اس کا انکار کرتے ہیں۔“ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب (بنابر وحی) معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی اختیار کریں گے؛ اور اہل ایمان آپ کو بالاتفاق خلیفہ تسلیم کر لیں گے اور آپ کی بیعت پر راضی ہو جائیں گے، تو آپ نے دستاویز لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ سو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوری ہوئی جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے اختیار پر راضی نہیں۔ [آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔]

نبی کریم ﷺ نے اپنی بیماری میں دوبار اس بات کا ارادہ کیا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا بھی تھا کہ اپنے والد اور بھائی کو بلا لو۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شکایت سے پہلے کا معاملہ ہے۔ اس وقت تو آپ نے فرمایا تھا: میرا ارادہ تھا کہ میں ابوبکر کے لیے ایک تحریر لکھوا دوں۔“

پھر آپ نے جمعرات کے دن اس چیز کا دوبارہ ارادہ کیا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: آپ فرماتے ہیں:

”جمعرات کا دن؛ اور آہ! جمعرات کا دن بھی کیسا تھا؟ اور پھر اتار دئے کہ ان کے آنسوؤں سے سگریزے تک بھیگ گئے اور پھر کہنے لگے کہ جمعرات کے دن [رسالت مآب ﷺ کے مرض میں شدت ہوئی تو آپ نے فرمایا: ”لکھنے کے لیے کوئی چیز لاؤ کہ میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہی میں کبھی نہ پڑ سکو گے۔ پھر لوگوں نے اختلاف کیا حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اختلاف نہ کرنا چاہیے۔ لوگ بولے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ سے دوبارہ پوچھو لوگوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم لوگ مجھے بلا رہے ہو۔“ اور آپ نے بوقت وفات تین وصیتیں کیں مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دینا قاصدوں کو اسی طرح انعام دینا جس طرح میں انعام دیا کرتا تھا اور تیسری وصیت میں خود بھول گیا۔“ [صحیح بخاری: ج ۳۰۶]

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہر طرح کی بدبختی اس انسان کے لیے ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تحریر میں حائل ہوا؛ اس سے اختلاف ختم ہو جاتا۔ ہاں یہ بدبختی اس انسان کے حق میں ہے جو کوئی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک اور قرح کرے۔ اگر رسول اللہ ﷺ وہ تحریر لکھوا دیتے تو اس کی وجہ سے شک کرنے والوں کا یہ شبہ بھی ختم ہو جاتا۔ اور یہ قول حق کے ساتھ کہا جاسکتا کہ: آپ کی خلافت صریح نص جلی سے ثابت ہے۔ جب یہ نص موجود نہیں ہے تو پھر یہ بدبختی بغیر کسی افراط و تفریط کے شک کرنے والے انسان کے حق میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کھل کر

پہنچا دی تھی۔ اور بہت ساری ادلہ کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے حق دار اور دوسروں سے افضل تھے۔

یہ بدبختی ان اہل تقویٰ کے حق میں نہیں ہے جو کتاب و سنت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے لیے بدبختی ہے جس کے دل میں مرض پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کے وہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے منسوخ کئے اور قرآن نازل کیا، احد کے دن مسلمانوں کو پسپائی ہوئی۔ اور اس طرح کے دیگر واقعات اور دنیاوی مصائب ان لوگوں کے حق میں مصیبت ہیں جن کے دل مرض سے بھرے پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾

”پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی تشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے۔“ [آل عمران ۷۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ امور ان لوگوں کے حق میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہو، ان کے علم و ایمان میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے انسانوں اور جنات کے ساتھ شیاطین کا وجود؛ اللہ تعالیٰ ان کی مخالفت کرنے اور ان کے ساتھ مجاہدہ کرنے کی وجہ سے اہل ایمان کے درجات بلند کرتے ہیں؛ حالانکہ ان شیاطین کا وجود بھی ایک فتنہ اور آزمائش ہوتی۔ بہت سارے لوگوں کو یہ بہکا تے اور گمراہ کرتے ہیں۔

فصل:

[خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ارشاد نبوت]

اس سے پہلے یہ تنبیہ گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف رہنمائی کی تھی اور یہ واضح کر دیا تھا کہ آپ دوسروں سے زیادہ اس کے حق دار ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کی روایت میں ہے حضرت جابر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی؛ اور اس نے کسی چیز کا سوال کیا۔ آپ نے اسے دوبارہ حاضر ہونے کیلئے مامور فرمایا۔ وہ بولی: ”اگر میں آؤں اور آپ کو موجود نہ پاؤں [تو]۔“ (یعنی آپ وفات پا جائیں) آپ نے فرمایا: ”اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری دیجیے۔“ [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

رسول اللہ ﷺ کو جب (بنابر وجہ) معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی اختیار کریں گے؛ اور اہل ایمان آپ کو بالاتفاق خلیفہ تسلیم کر لیں گے [کسی دوسرے کو نہیں]؛ اسی لیے آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان اس کا انکار کرتے ہیں۔“

آپ کی اس رہنمائی و دلالت میں شرعی ادلہ موجود ہیں۔ اور آپ کو جو علم ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ خیر کو آپ کی رضا اور چاہت کے مطابق مقدر کر دے گا۔ جس سے خلق و امر میں اس کی حکمت قدراً و شرعاً پوری ہو جائے گی۔

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اختیار اس امت کے حق میں کئی وجوہات کی بنا پر بہت بہتر تھا۔ اس لیے

کہ جب امت نے اپنے علم اور اختیار سے آپ کو یہ منصب تفویض کیا؛ اور ان کو علم تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک آپ ہی اس منصب کے اہل ہیں۔ تو اس میں اتنی شرعی مصلحتیں تھیں جو اس کے بغیر کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

صحیحین میں حضرت بھل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنو عمرو بن عوف کے درمیان صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ جب نماز کا وقت ہو گیا تو مؤذن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کیا آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں گے تو میں اقامت کہوں؟ فرمایا: ہاں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔

پھر جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ وہ نماز کو پورا کریں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ادب کے راستے پر گامزن ہوتے ہوئے واپس پیچھے ہٹ گئے۔ اس لیے کہ آپ جانتے تھے آپ کا یہ حکم حکم عزت و احترام و اکرام ہے؛ اس کا ماننا لازمی یا واجب نہیں۔ اور نہ ہی اس کے نہ ماننے میں نافرمانی کا کوئی پہلو ہے۔ پس جب رسول اللہ ﷺ اپنی موجودگی میں اور بحالت صحت آپ کو اس نماز کے پورا کرنے کیلئے امام بقرار رکھا جو آپ شروع کر چکے تھے؛ اور خود رسول اللہ ﷺ نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی؛ جیسا کہ غزوہ تبوک کے موقع پر فجر کی ایک رکعت حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑی؛ اور دوسری رکعت کو پورا کر لیا۔ تو پھر یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیماری کی حالت میں خود آپ کو امامت پر مامور کر کے پھر باہر نکلیں کہ آپ کو لوگوں کی امامت سے منع کریں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے نزدیک اس سے یکسر مختلف ہے جو ان جھوٹے اور کذاب روافض منافقین و مرتدین اور کفار کے بھائیوں نے گھڑ لیے ہیں جو اللہ کے دشمنوں سے تو دوستی رکھتے ہیں؛ مگر اس کے دوستوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان و انصار اس میں سب سے زیادہ کفار و منافقین و مرتدین سے جہاد کرنے میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ ان ہی کی شان بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُجِبُونَهُ أَذِلَّةَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةَ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ [المائدة ۵۴]

”اے ایمان والو! تم میں سے کوئی اگر اپنے دین سے پھر گیا تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لایگا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہو گئے مسلمانوں پر سخت اور تیز ہو گئے کفار پر، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دیدے۔“

آپ کے اعوان و انصار اس امت کے سب سے بہترین اور افضل ترین لوگ تھے۔ یہ بات سلف و خلف سب میں معلوم ہے۔ مہاجرین و انصار کے بہترین لوگ آپ کو محبت میں دوسروں پر مقدم رکھتے تھے۔ اور آپ کے حق کا خیال رکھا کرتے تھے اور آپ کو اذیت دینے والوں سے آپ کا دفاع کرتے تھے۔

قدیم و جدید میں ہمیشہ سے خیار المسلمین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا ایمان بھی کامل تھا اور آپ کی ذات بھی کامل تھی۔ اور آپ رسول اللہ ﷺ کی قرابت داری اور اہل بیت کا سب سے زیادہ خیال کرنے والے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال محبت نے آپ کے دل میں اہل بیت کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اور اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ اہل بیت کی رعایت اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مامور بہ تھی۔ آپ [لوگوں کو اہل بیت اور آل رسول ﷺ سے محبت رکھنے کی وصیت کیا کرتے اور] فرمایا کرتے تھے: ((ارْقُبُوا مُحَمَّدًا فِي أَهْلِ بَيْتِهِ)) ❶

”حضرت محمد ﷺ کو آپ کے اہل بیت میں تلاش کرو۔“

[یعنی آپ ﷺ کے اہل بیت کا ادب و احترام مد نظر رکھا کرو۔]

امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ آپ قسم اٹھا کر فرمایا کرتے تھے:

”اللہ کی قسم! اہل بیت کی قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کرنا مجھے میرے اپنے قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔“

[اللہ کرے ہمارا خاتمہ اصحاب اربعہ اور اہل بیت کی الفت و محبت پر ہو۔ اس لیے کہ] ”الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ“ ❷

”انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہوگا۔“

”وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى الْاِسْلَامِ وَالسُّنَّةِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهِ وَصَحْبَاتِهِ وَ اَزْوَاجِهِ وَ ذُرِّيَّتِهِ الطَّاهِرِينَ وَسَلَّم تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا اِلَى يَوْمِ الدِّيْنِ۔“

انتہی کتاب الإمام الہمام شیخ الإسلام مجدد أهل السنة والجماعة إمام ابن تیمیہ

الدمشقی الحرانی الحنبلی۔ [۶۶۱-۷۲۸ھجری]

یلوح الخط فی القرطاس دھراً و کاتبہ رمیم فی التراب

مترجم

ابو شرحبیل پیرزادہ شفیق الرحمن شاہ الدراوی

آل عبدالکبیر الکشمیری

مراجعة سے فراغت یکم اکتوبر رات دس بجے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ما رخص للمریض ان یقول انی وجع، (حدیث: ۵۶۶۶)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق، (حدیث: ۲۳۸۷)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب علامة الحب فی اللہ (حدیث: ۶۱۶۸، ۶۱۶۹)، صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب المرء مع من احب (حدیث: ۲۶۴۰)۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے خیالات یہاں درج کیجئے



منہاج النبوة



- دفاع سنت پر آج تک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب **منہاج النبوة** جیسی کوئی دوسری تصنیف سامنے نہیں آئی۔
- اگر کوئی شخص یورپ سے چین تک سفر کرے اور اُسے وہاں پر **منہاج النبوة** مل جائے تو سمجھ لو کہ وہ اپنے سفر میں کامیاب رہا۔
- **منہاج النبوة** راہ ہدایت کے متلاشیوں کے لیے ایک روشنی ہے جس سے وہ اندھروں سے نکل سکتے ہیں۔
- **منہاج النبوة** ایک راستہ ہے جس پر چلنے سے بھٹکا ہوا مسافر بھی حق کی منزل پر پہنچ جائے گا۔
- میں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب **منہاج النبوة** کو سونے کے بار جیسا پایا اور پھر اس پر دن رات محنت کر کے سلف صالحین کی معتبر کتابوں سے حواشی تلاش کر کے اس پر سجادیئے۔ جو اس سے جتنا استفادہ کرے گا وہ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ (الدرادبی)

مظفر آباد آزاد کشمیر

مکتبہ امام احمد بن حنبلؒ



ISBN 978-969-9852-07-7

الفضل مارکیٹ
اردو بازار لاہور

0321-4210145

دار المعرفۃ

پاکستان